

Title - TAREEKH ADAB URDU .

Location - Ram Baksh Saxeena, Mutafijenna Mirza Mohd .
Askari .

Publishing - Matlo, Mumli Naurel Kishore (Lucknow)

Date - D.A .

Pages - 531+217 .

Subjects - Urdun Adab - Tareekh ; Tareekh -

Urdun Adab .

Date

تاریخ ادب اردو

(مصور)

(یعنی)

ہستری آف اردو لٹریچر

مصنفہ

عالی جناب رام بابو صاحب سکینہ ایم۔ اے ایل ایل
بی۔ ایف۔ آر۔ ایس۔ اے (لندن) ایم۔ آر۔ اے۔ ایس ایم بی
ایس۔ بی۔ ممبر ہندوستانی اکیڈمی یو پی۔ ڈپٹی کلکسٹر
مفت اردو شعراء زمانہ حال و اوراق پریشان

مترجمہ

جنابہ امجد عسکری صاحب بی۔ اے سابق میڈیکل انسٹیٹیوٹ گورنمنٹ آف انڈیا

باتھام کیسریس سیٹھ سپرنٹنڈنٹ

مطبع فنی لکھنؤ واقع لکھنؤ میں طبع ہو کر شائع ہوئی



مسٽر رام دايو سسٽم مصنف اصل ڪتاب (هسٽري آف اردو لٽريچر)



فہرست مضامین

مضامین	نمبر صفحہ	مضامین	نمبر صفحہ
فہرست مضامین	۱۶-۱	نثر اور نظم کی زبان	۱۰
فہرست تصاویر حصہ نظم	۱۷	ادبی اردو	۱۱
تمہید مصنف	۱۸	زبان اردو کے قدیم نام	۱۲
تقریط سر تیج بہادر سپرو	۲۱	اردو کا رسم الخط	۱۳
التماس مترجم	۳۲-۲۵	نظم اردو	۱۴
باب		باب	
زبان اردو اور اس کی اصل		ادب اردو کی ترقی کے ابتدائی دور	
۱	اردو سے کیا مراد ہے -	۱۷	نظم کا تقدم نشر پر اس کے وجہ
۳	اردو اور ہندی کا تعلق	۱۸	اور اس کا تعلق خاص ادب دو
۴	زبان اور ادب اردو فارسی کا	۱۹	کے ساتھ
۵	احسان مند ہے -	۲۰	سب سے پہلا اردو شاعر
۶	اردو میں فارسی الفاظ اور	۲۱	امیر خسرو دہلوی
۷	فارسی ترکیبوں کی کثرت کے	۲۲	اردو کی پختگی کا زمانہ
۸	اسباب	۲۳	زریں عہد کبری
۹	یورپ کی زبانوں کا		
۱۰	اردو پر اثر		

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
قدیم شعراے دکن اور دربار شاہان گول کنڈیہ و بیجا پور دہلی دکنی ۱۶۶۵ء تا ۱۷۵۷ء	۲۱	مابعد کے شعرا آسیر و داغ کا زمانہ جدید رنگ۔ آزاد اور حالی کا زمانہ اُن کی خدمات زبان کے ساتھ	۳۲
قدیم شعراے دہلی۔ حاتم اکبر، آرزو میر و سودا کا زمانہ۔ اُس زمانہ کی ترقیات۔ زبان اور شاعری میں اصلاحیں	۲۳	نثر اردو۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ نثر مقفے۔ رجب علی بیگ سرور » دریائے لطافت «	۳۴
انشا اور صحافی کا دور۔ انکی خدمات زبان اور شاعری میں اصلاحیں رہنمائی	۲۴	» اردو کے معنی « اور عود ہندی عیسائی پادریوں کی تحریروں کا اثر سر سید اور اُن کے رفقاء کے کار کا	۳۵
غالب اور ذوق کا زمانہ اور اُسکی خصوصیات شعرا و لکھنؤ کا نیا دور اور اُسکی خصوصیات۔ نسخ اور آتش کا زمانہ۔ انکی خدمات زبان کے ساتھ مراثی اور اُن کا تعلق زبان کے ساتھ	۲۸	زریں عہد تعلیم انگریزی کا اثر اردو پر۔ چھاپہ کی ابتدا۔ اردو سرکاری زبان قرار دی گئی۔	۳۸
	۲۹	ناول نویسی کی ابتدا۔ اردو ڈراما	۳۹
	۳۰		۴۰
	۳۲		۴۱

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
باب ۳		تصانیف مشہورہ	۵۳
اُردو شاعری کے عام خصوصیات		عطیہ	۵۴
		دام بادو سکسینک	۵۵
اُردو شاعری فارسی کی تقلید ہے	۳۱	قطعہ اور رباعی	"
تقلید کے بُرے نتائج	۳۲	استاد و شاگرد کا تعلق	۵۶
اُردو شاعری محض نقالی ہے	"	مشاعرے	"
اُردو شاعری صرف ریکی رہ گئی	۳۳	تخلص	"
قافیہ پیمائی	۳۴	اُردو شاعری کی خصوصیات	"
خلافت نیمچر مضامین	"		
اصناف سخن	۳۷	باب ۴	
نغزل اور اس کا رنگ	"	قدیم شعرا کے دکن	
تصوف	"	دکھنی کیا چیز ہے	۵۷
عاشقانہ	۳۸	زبان و کھنی کی ابتدا	۵۸
اہل دربار کا اثر اُردو شاعری پر	۳۹	دکن میں اُردو شاعری کی ابتدا	
دیہاتی اور قدرتی مناظر کی اُردو		کے اسباب	۵۹
شاعری میں کمی	۵۱	شاہان بہمنی کا زمانہ	
اُردو شاعری خزنِ یاس کی شاعری ہے	۵۲	۴۸ء لغایت ۱۳۳۷ء	۶۲

نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ	مضمون
۷۳	نوری	۶۳	قطب شاہیوں کا عہد
"	فائر	"	۹۱۶ء تا ۱۰۹۸ء
"	شاہی	"	سلطان محمد قلی قطب شاہ
"	مرزا	"	۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء عیسوی
	عادل شاہیوں کا زمانہ ۹۵۰ء		سلطان محمد قطب شاہ
"	لغایت ۹۷۰ء	۶۷	۱۶۱۱ء لغایت ۱۶۲۵ء
	ابراہیم عادل شاہ ثانی ۱۵۸۰ء	۶۸	سلطان عبداللہ قطب شاہ
۷۴	لغایت ۱۶۲۶ء		۱۶۲۵ء لغایت ۱۶۴۲ء
۷۵	۱۶۷۲ء علی عادل شاہ ثانی ۱۶۵۲ء لغایت	۶۹	ابن نشاطی
۷۶	رسمی	"	غواصی کا قصہ "سیف الملوک"
"	نصرتی	۷۰	سیر مصنفہ مولانا وہبی
۷۸	ہاشمی	۷۱	تحسین الدین
۷۹	دولت	۷۲	ملا قطبی
"	شاہ ملک	"	جھنیدی
"	شاہ امین	"	طبعی
۸۰	دکن میں مرثیہ کی ابتدا		ابوالحسن تانا شاہ ۱۶۴۳ء
"	شعراے دکن مغلوں کے عہد حکومت میں	۷۲	لغایت ۱۶۸۷ء عیسوی

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
عاجز	۸۰	سراج	۸۸
بھری	۸۱	دیگر شعرا اس دور کے	۹۱
امین	"	احاطہ مدراس وارکٹ	۹۲
دلی دکنی	"	کے شعرا	
وجہی	"		
آزاد	۸۲	باب ۵	
شعرا اورنگ آباد		اساتذہ دہلی	
دلی ۱۶۶۸ء تا ۱۷۲۲ء	۸۳	حصہ اول طبقہ ممتقذین	
نام کے متعلق اختلاف	"	حاتم و آبرو کا زمانہ	
مقام پیدائش اور خاندان			
کے متعلق اختلاف	۸۴	دہلی میں اردو زبان کی	۹۳
حالات زندگی	"	ابتدا و ترقی	
دلی کے دو سفر	۸۵	اردو لغات کی ترتیب	۹۵
"دہ مجلس"	۸۶	دلی کے پرانے شاعر	"
وفات	"	زبان کے ساتھ انکی خدمات	"
کلام پرانے	۸۷	صنعت ایہام	۹۶
داؤد	۸۸	تصوف	۹۷
		سپاہی پیشہ شعراء	"

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
کلام میں یونانی کی کمی اور	۹۷	یک رنگ	۱۱۰
سبک بتزل الفاظ		نفاں متوفی ۱۰۷۷ھ	۱۱۱
اس عہد کے شعرا کا		باقی اور شعر	۱۱۲
طرز بیان اور ان کے	۹۸	باب	
کلام کی خامیاں		اساتذہ دہلی	
عربی و فارسی الفاظ		حصہ دوم طبقہ مشوین	
و خیالات کا داخلہ اور		میر و سودا کا زمانہ	
نسکرت و بھاشہ قدیم			
دکنی الفاظ کا اخراج	۹۹	۱۱۳	۱۱۳
شاہ مبارک آبرو متوفی ۱۰۷۷ھ	۱۰۰	۱۱۴	۱۱۴
خان آبرو متوفی ۱۰۷۷ھ	۱۰۱	۱۱۵	۱۱۵
شاہ حاتم متوفی ۱۰۷۷ھ	۱۰۲	۱۱۶	۱۱۶
میان مضمون متوفی ۱۰۷۷ھ	۱۰۳	۱۱۷	۱۱۷
میرزا مظہر جانجاناں متوفی ۱۰۷۷ھ	۱۰۴	۱۱۸	۱۱۸
الغایت ۱۰۷۷ھ	۱۰۵	۱۱۹	۱۱۹
ناجی	۱۰۶	۱۲۰	۱۲۰
تا باب	۱۰۷	۱۲۱	۱۲۱

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
میر سوز سلسلہ ۱ تا ۱۳۱	۱۲۴	میر حسن کے صاحبزادے	۱۴۵
طرز کلام	۱۲۵	تصانیف	"
سودا کا مرتبہ شاعری میں	۱۲۶	اختصار ثنوی میر حسن سلسل	۱۴۷
سودا سلسلہ ۱۱۲ تا ۱۹۵	۱۲۷	بصورت افسانہ	
تصانیف	۱۳۰	مراثی	۱۶۴
سودا کا مرتبہ شاعری میں		تذکرۃ الشعراء	"
انکی خدمات زبان کے ساتھ	۱۳۱	نمونہ ثنوی گلزار ارازم	۱۶۵
انکی خدمات شاعری کے ساتھ	۱۳۳	رباعی اور ہجو اور قصائد	۱۶۶
تصدیدہ اور مرثیہ	۱۳۴	کے نمونے	
ہجو	"	میر تقی میر	۱۶۹
کلام پر راس	۱۳۸	روانگی لکھنؤ	۱۷۳
سودا کا اثر بعد کے شعرا پر	"	میر صاحب کی عمر	۱۷۵
مرزا کے کلام پر شعرا کی رائیں	۱۴۱	ذکر میر	۱۷۶
کلام میں کمی	۱۴۲	سیادت میں اختلاف	۱۷۷
میر حسن متوفی سلسلہ ۱۲۷	۱۴۳	نکات الشعراء	۱۸۰
تعلیم و شاعری	۱۴۴	میر صاحب کا کیر کٹر	۱۸۳
طرز کلام	۱۴۵	نازک دماغی	"

نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ	مضمون
۲۰۹	ہزل گویان اردو	۱۸۶	کلام میں یلوسی و درد
۲۱۰	انشار دستونی سلسلہ ۲۳۳ ہجری	۱۸۹	تصانیف
	مطابق سلسلہ اعیسوی	۱۹۲	میر صاحب کی ایجادیں
۲۱۱	انشار کی تقریب نواب	۱۹۳	میر صاحب کی خدمت زبان
	سعاد تعلیخاں کے دربار میں		اور شاعری کے ساتھ
۲۱۳	انکے کلام کی خصوصیات	۱۹۳	میر جہانپور شاعر کے
۲۱۴	تصانیف	۱۹۶	نیر دروود کا مقابلہ
۲۱۵	کہانی ٹھٹھہ ہندی میں	۲۰۳	اس عہد کے دیگر شعرا
۲۲۲	دریائے لطافت	باب اساتذہ دہلی طبقہ متاخرین	
۲۲۵	جرات (متونی سلسلہ ۲۲۵ھ)		
۲۲۶	تصانیف		
	جرات کی خصوصیات	انشا اور مصحفی کا زمانہ طبقات کی ترتیب اس دور کی ترقیاں	
۲۲۷	اور ان کا مقابلہ میر کا		
۲۲۹	جرات اور داغ	۲۰۵	
۲۳۰	مصحفی (۱۱۶۴ھ تا ۱۲۴۰ھ)	۲۰۶	شاعری دربار سے وابستہ ہو گئی
	تصانیف	۲۰۷	اس وابستگی کے خراب نتائج
۲۳۱	تذکرہ شعراے اردو	۲۰۸	ریختی
	مصنفہ ۱۲۹۳ھ		

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
خصوصیات کلام	۲۳۱	ہدایت	۲۵۲
مصحفی و رسد انشا کے معرکے	۲۳۲	فراق	"
انگین ۶۹ سالہ ۱۲۵۱ھ	۲۳۴	ضیا	"
تصانیف	۲۳۸	بقا	۲۵۳
رخیتی سے کیا مطلب ہے	۲۳۹	حزین	۲۵۴
اور اسکی ایجاد کے اسباب	۲۴۲	بیان	۲۵۵
شاعر شاہان دہلی	"	ناسخ	۲۵۶
شاہ عالم ثانی ۱۰۶۱ھ تا ۱۰۸۶ھ	"	<p style="text-align: center;">باب اسانڈہ لکھنؤ ناسخ و آتش کا زمانہ</p>	
میرزا سلیمان شکوہ متخلص بن سلیمان	"		
اکبر شاہ ثانی ۱۰۶۱ھ تا ۱۰۸۳ھ	۲۴۳		
بہادر شاہ ثانی متخلص بن ظفر	۲۴۴		
قائم چاند پوری	۲۴۵	مرکز شاعری لکھنؤ میں منتقل ہوتا ہے	۲۵۷
منت	۲۴۶	لکھنؤ کا طرز شاعری	۲۵۹
تعمنون	۲۴۷	طرز دہلی اور طرز لکھنؤ کا فرق	۲۶۲
حسرت دہلوی	"	ان کا تقابل	۲۴۷
قدرت	۲۴۹	تحقیق الفاظ اور رعایت لفظی کا کام	۲۶۲
بہیدار	۲۵۱	شیخ المصطفیٰ ناسخ متوفی ۱۲۵۱ھ	۲۶۳
		مطابق مشہور ۱۲۵۱ھ	۲۶۳

نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ	مضمون
۲۸۳	آتش متوفی سال ۱۲۶۱ھ	۲۶۷	تصانیف
۲۸۵	طرز کلام		ناسخ کا اثر شاعری اور
۲۸۶	تصانیف	۲۶۸	زبان پر
"	نقائص کلام	"	ناسخ کی غزلیں
"	ناسخ اور آتش کا مقابلہ	۲۷۰	تاریخیں
۲۸۸	شاگرد	"	قصیدہ نہیں کہا
۲۸۹	زند	۲۷۱	نقائص کلام
۲۹۱	خلیل	"	ناسخ کے کارنامے
"	نسیم	۲۷۳	شاگرد
۲۹۲	صبا	"	برق
۲۹۳	آغا جموں شرف	۲۷۴	بحر
"	اس دور میں زبان میں کیا تغیرات	۲۷۵	آباد
"	ہوے -	۲۷۶	خواجہ وزیر
	باب ۹	۲۷۷	رشتک
	دربار لکھنؤ اور اس کے شعرا	۲۷۹	مہر
	واجد علی شاہ اختر کا عہد	۲۸۰	تصانیف
		۲۸۱	منیر
۲۹۴	آصف الدولہ آصف	۲۸۲	تصانیف

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
نواب وزیر علی خاں وزیر	۲۹۶	اُردو مرثیہ کی ابتدا	۳۱۲
نواب سعاد علی خاں سعادت	"	بزرگان انیس اور انکی خدمات	
غازی الدین حیدر	۲۹۷	مرثیہ کے ساتھ	۳۱۳
نصیر الدین حیدر	"	خلیق	"
نضر (واجد علی شاہ)	۲۹۸	میر انیس	۳۱۵
تصانیف	۳۰۰	میر انیس بحیثیت شاعر	۳۱۷
طرز کلام	۳۰۲	تصانیف	۳۱۸
اسیر	۳۰۳	انیس کی خدمت زبان	
آمانت	۳۰۵	کے ساتھ	۳۱۹
آفتاب الدولہ قلع	۳۰۶	مرقع نگاری	۳۲۰
نکی	۳۰۷	اظہار جذبات	۳۲۱
درخشاں	"	میر انیس کا طرز	۳۲۲
اختر	"	دبیر	۳۲۳
باب مرثیہ اور مرثیہ گو		دبیر بحیثیت مرثیہ گو	۳۲۵
		انیس و دبیر کا مقابلہ	۳۲۶
		مرثیہ کی مقبولیت کے اسباب	۳۲۸
مرثیہ کی تعریف	۳۱۰	مرثیہ سے کیا کیا فائدے پہونچے	۳۲۹
مرثیہ کی قدامت	۳۱۱	دیگر مرثیہ نویس	۳۳۱

نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ	مضمون
۳۳۱	نظیر حشیت حقیقی ہندستانی	۳۳۱	خاندان انیس
۳۳۲	شاعر کے	۳۳۲	میرولس
۳۳۳	ان کی خدمت بان کما تھ	"	میفیس
۳۳۵	نظیر جدیدنگ کے پیشرو تھے	"	عارف
	نظیر کا طریقہ نگارنگ ان کا	۳۳۳	جلسیں
۳۳۶	مقابلہ انشا کے ساتھ	"	سید میرزا آئیں کا خاندان
۳۳۸	نظیر حشیت مصور کے	"	سید میرزا آئیں
"	اردو کا ٹیکسیر ہمارا	۳۳۴	عشق
"	کون شاعر ہو سکتا ہے۔	"	تعلیق
۳۵۱	شاہ نصیر دہلوی متوفی ۱۸۴۷ء	۳۳۵	احمد میرزا صابر
۳۵۲	تصانیف	"	پیارے صاحب رشید
۳۵۳	ان کا مرتبہ شاعری میں	۳۳۶	خاندان دبیر مرزا دج
		۳۳۷	نعت
	باب ۱۲		باب ۱۱
	طبقہ متوسطین شعراء دہلی		نظیر اکبر آبادی و شاہ نصیر دہلوی
	ذوق و غالب کا زمانہ		
۳۵۵	دلی کی شاعری کا دوبارہ عروج	۳۳۸	نظیر اکبر آبادی
۳۵۶	مومن ۱۵۱۷ء لغایت ۱۸۶۷ء	۳۳۹	نظیر حشیت و اعظاف صاحب

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
تصانیف	۳۵۹	عام حالات و طبعی عادات	۳۷۸
رنگ کلام	"	غالب بحیثیت شاعر کے	۳۸۱
مومن کا مرتبہ بحیثیت	۳۶۰	تصانیف	۳۸۳
شاعر		مرزا صاحب کے مباحثے	۳۸۴
شیفۃ السلاسلۃ ۱۲۲ تا ۱۲۶ء	۳۶۱	غالب کی شاعری کے تین دور	۳۸۵
تسکین السلاسلۃ ۱۲۸ تا ۱۲۹ء	۳۶۳	غالب کے خصوصیات پہلی خصوصیت	
نسیم دہلوی السلاسلۃ ۱۴۹ تا ۱۸۶۴ء	"	جذبات پسندی	۳۸۹
طرز کلام	۳۶۴	دوسری خصوصیت نظر فریب	
فدوق السلاسلۃ ۱۸۹ تا ۱۸۵۳ء	۳۶۵	طرز تحریر	۳۹۰
شاہ نصیر سے معرکہ	۳۶۷	تیسری خصوصیت ذاتی	
تصانیف	۳۶۹	جذبات کا ادا کرنا	۳۹۱
فدوق کی خدمت زبان		چوتھی خصوصیت فلسفیت	
کے ساتھ	۳۷۰	اور حقیقت طرازی	"
انداز کلام	۳۷۱	پانچویں خصوصیت جذبات نگاری	۳۹۲
شاگرد	۳۷۲	کلام میں ظرافت و شوخی	۳۹۳
ظہیر متوفی السلاسلۃ ۱۹۱ء	"	غالب کا مقابلہ اپنے معاصرین سے	۳۹۵
انور	۳۷۴	غالب کے شاگرد	۳۹۶
غالب السلاسلۃ ۱۸۶ تا ۱۸۶۹ء	"	میر ہمدی مجروح متوفی السلاسلۃ ۱۹۰ تا ۱۹۰۲ء	۳۹۷

۳۰۸	ٹونک	۳۹۷	سالک متوفی ۱۸۹۳ء
۳۰۹	منگروں	۳۹۸	زکی متوفی ۱۹۰۳ء
"	بھوپال	۳۹۹	رفشان متوفی ۱۳۸۵ھ
۳۱۱	رام پور	۴۰۰	آررہ ۱۲۰۳ھ لغایت ۱۲۸۵ھ
"	نواب یوسف علیخان	باب ۱۳ دربار رام پور و حیدرآباد امیر و داغ کا زمانہ	
۳۱۲	نواب کلب علیخان ۱۲۵۰ھ تا ۱۳۰۳ھ		
۳۱۶	موجودہ فرمانروائے رام پور		
۳۱۷	امیر بنیانی ۱۲۳۳ھ لغایت ۱۳۱۳ھ	۴۰۲	مٹیا برج ککلتہ میں شعرا کا مجمع
۳۲۰	تصانیف	۴۰۳	شعراے دہلی اپنا وطن چھوڑ کر نکلتے ہیں -
۳۲۲	شاگرد	۴۰۴	فرخ آباد
"	امیر کی شاعری		عظیم آباد
۴۲۳	اخلاق و عادات	۴۰۵	مرشد آباد
۴۲۴	چند شعرا بطور نمونہ	"	ٹانڈہ
۴۲۶	داغ دہلوی ۱۸۳۱ء عیسوی لغایت ۱۹۰۵ء		حیدر آباد
۴۲۹	عام عادات و اخلاق	۴۰۶	فیض آباد و لکھنؤ
۴۳۰	داغ کی شاعری		شعراے دہلی و لکھنؤ کا دوسرے مقامات پر منتشر ہو جانا
	تصانیف	۴۰۷	
۴۳۲	طرز کلام		

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
کلام پر اعتراض	۳۳۲	ہمارا چہ چند لال شاداں	۳۵۵
شاگرد	۳۳۵	راجہ گرو حاری پر شاد باقی	۳۵۶
امیر و داغ کا مقابلہ	"	ہمارا چہ سرکش شاد تخلص	۳۵۷
جلال لکھنوی شہید ۱۲۵۵ھ تا ۱۳۳۵ھ	۳۴۰	انجمن ترقی اُردو	۳۵۸
تصانیف	۳۴۲	عثمانیہ یونیورسٹی	۳۶۰
مزاج کی کیفیت	۳۴۳	دارالترجمہ	۳۶۱
خصوصیات کلام	۳۴۴	<p style="text-align: center;">باب ۱۴</p> <p style="text-align: center;">اُردو شاعری کا جدید رنگ</p> <p style="text-align: center;">آزاد اور حالی کا زمانہ</p>	
شاگرد	۳۴۵		
آرزو	"		
احسان	"		
تسلیم شدہ ۱۸۵۶ء تا ۱۹۱۶ء	۳۴۶	طرز جدید کے پیرو	۳۶۳
تصانیف	۳۴۸	انقلاب کا اثر	۳۶۴
انداز کلام	"	انگریزی تعلیم کا اثر	۳۶۵
عرش	۳۵۰	جدید رنگ کے خصوصیات	۳۶۶
دربار حیدر آباد	۳۵۱	اصناف سخن میں جدتیں	۳۶۷
نظام الملک صفحہ اول	۳۵۲	جدید رنگ کے اثرات	۳۶۹
میر تقی علی خان تخلص آصف	"	جدید ادب اُردو کے تین طرز	۳۷۰
موجودہ فرانرولے دکن	۳۵۴	پہلا طبقہ	"

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
سرور جہاں آبادی	۳۹۹	دوسرے طبقہ	۳۷۱
انگلی شاعری کی خصوصیات	۵۰۰	تیسرے طبقہ	۳۷۲
انگریزی نظموں کے ترجمے	۵۰۲	خواجہ حالی	۳۷۳
اکبر الہ آبادی	۵۰۳	حالی کی شاعری اور اس پر	۳۷۷
اخلاق و عادات	۵۰۴	غالب اور شفیقہ کا اثر	۳۷۹
اکبر کی شاعری	۵۰۵	سرسید کا اثر	۳۷۹
پہلا دور ابتداء سے ۱۸۵۹ء تک	۵۰۶	تصانیف	۳۸۰
دوسرا دور ۱۸۵۹ء سے ۱۸۵۹ء تک	۵۰۶	شعرواں	۳۸۱
تیسرا دور ۱۸۵۹ء سے ۱۸۵۹ء تک	۵۰۷	مدرسہ حالی	۳۸۱
چوتھا دور ۱۸۵۹ء سے ۱۸۵۹ء تک	۵۰۷	شکوہ ہند	۳۸۳
پانچواں دور ۱۸۵۹ء سے ۱۸۵۹ء تک	۵۰۸	مراثی	۳۸۳
اکبر کی غزلیات	۵۰۹	مناجات بیوہ	۳۸۴
رنگ قدیم	۵۱۰	چُپ کی داد	۳۸۵
رنگ متوسط	۵۱۰	دیوان حالی	۳۸۵
رنگ آخر	۵۱۱	مقدمہ شعور شاعری	۳۸۶
اکبر کی خوش طبعی و طرائف	۵۱۳	اولیات حالی	۳۸۸
اقسام نظرائف	۵۱۶	نفاکص حالی	۳۸۹
اکبر کی سیاسی نظمیں	۵۲۲	محمد حسین آزاد	۳۹۰
اکبر بحیثیت مکہ چین	۵۲۲	انگلی شاعری	۳۹۰
سوسائٹی	۵۲۵	تصانیف منظوم	۳۹۲
اکبر کے مذہبی عقائد	۵۲۹	آزاد کا قدیم و جدید رنگ	۳۹۳
نادر کا کودی	۵۳۰	آزاد و حالی کا فرق	۳۹۶
		محمد اسماعیل میرٹھی	۳۹۷

فہرست تصاویر حصہ نظم

صفحہ	تصویر	صفحہ	تصویر	صفحہ	تصویر
۳۳۷	تسلیم	۳۳۱	مومن دہلوی	۳۳۱	مصنف
۳۵۴	میر محبوب علی خاں	۳۷۶	غالب	۳۳۱	سرتیج بہادر سپہ
۳۵۵	موجودہ نظام حیدر آباد	۳۷۷	میر مجروح	۳۳۱	مترجم
۳۶۰	مہاراجہ بکشن شہزاد	۳۹۸	مہر	۲۲	خانخاناں
۳۹۰	حالی	۳۹۹	فکی	۱۲۸	سودا
۳۹۱	مولوی محمد اسماعیل	۴۰۰	طہا طبائی	۲۹۴	آصفیہ الدولہ
	میٹھی	۴۰۱	طالب	۲۹۵	راجہ علی شاہ اختر
۵۰۰	سرور جهان آبادی	۴۱۲	نواب یوسف علی خاں	۳۱۶	میر انیس
۵۰۱	نوبت رائے نظر	۴۱۳	نواب کلب علی خاں	۳۱۷	میر مونس
۵۱۰	اکبر الہ آبادی	۴۲۰	آمیر منائی	۳۳۲	عارف
۵۱۱	شاہ عظیم آبادی	۴۲۱	داغ دہلوی	۳۳۳	مجلس حیدر آباد
۵۲۰	مرزا جعفر علی خاں	۴۲۲	بیان یزدانی	۳۳۴	تعلیق
	آثر	۴۲۳	ڈاکٹر اقبال	۳۳۵	پیائے صاحب شید
۵۲۱	حسرت موہانی	۴۲۴	جلال	۳۴۰	نظیر اکبر آبادی

تمہید

(از مصنف)

اس کتاب کی تصنیف کی اصلی غرض یہ ہے کہ ادبِ اردو کی تدریجی ترقی کا خاکہ زمانہ قدیم سے لیکر زمانہ حال تک مع مشہور شعرا اور شاعروں کے مختصر حالات زندگی اور ان کے کلام اور تصانیف پر ایک مختصر تنقید کے کھینچا جائے۔ یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ ایک طبقہ کے تعلقات دوسرے طبقہ کے ساتھ اور ایک فرد کے تعلقات دوسرے فرد کے ساتھ ہمیں وضاحت سے بیان کیے جائیں اور نیز مختلف تحریکوں اور طرزوں کی ابتدا اور ترقی اور زوال کے اسباب بتائے جائیں اور اُس دور کے تاریخی حالات و واقعات بھی نظر انداز نہ کیے جائیں جس میں کہ وہ شعرا اور شاعر گذرے۔ یہ کتاب محض کسی زمانہ کے واقعات کا ایک ذخیرہ نہیں بلکہ اُن خیالات اور خصوصیات کے دکھانے کی ہمیں پوری کوشش کی گئی ہے جن کا اثر اُس زمانہ پر تھا۔ اس کی تصنیف میں میرے پیش نظر یہ رہا ہے کہ یہ زمانہ حال کے تنقیدی اصولوں کے مطابق بطور کسٹ بک تیار کیا جائے تاکہ انگریزی داں جانت بھی ادبِ اردو سے کما حقہ واقف ہو جائے۔

مصنف اپنی خامیوں سے بخوبی واقف ہے تقریباً چار برس کا عرصہ گزرا کہ اُسے باوجود اپنی سرکاری مشغولیوں کے اس کتاب کو ختم کر دیا تھا مگر بعد کو کچھ ابواب میں رد و بدل کرنا پڑا تاکہ وہ زمانہ موجودہ کی تحقیق و تنقید کے مطابق ہو جائیں یہی وہ سبب ہے کہ باہماری کی ہے جو کتاب کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہے۔

ابتدائی قصد تو یہ تھا کہ ادب اردو کی ایک پرائمر (ابتدائی کتاب) کالج کے طلباء اور عام پبلک کے فائدہ کے لئے تیار کی جائے اسی وجہ سے فٹ نوٹ اور حوالوں سے کتاب کو زنی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ ہر چند کہ حسب ضرورت اصل کتابوں کا بخوبی مطالعہ کر لیا تھا مگر بالآخر یہ اپنے مقررہ حجم سے بڑھ گئی جب قدر میں آگے بڑھتا گیا اور اسکی غرض بدلتی گئی حوالے دینے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی گئی مگر بعد کو عملاً یہ کام مشکل معلوم ہوا۔ میں امید کرتا ہوں کہ نقص آئندہ ایڈیشن میں دور کر دیا جائیگا۔

اس بات کی بھی شکایت کا موقع ہو سکتا ہے کہ تیشی اقتباسات دوسری کتابوں سے نہیں دیے گئے ہیں نے یہ فرد گزاشت جان بوجھ کر کی ہے اور سند میں پروفیسر سٹیمپ کی کتاب "مختصر تاریخ انگریزی علم ادب" کی مثال پیش کر سکتا ہوں جسکے طرز پر میں نے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ مختصر اقتباسات میرے مفید مطلب نہ ہوتے اور طویل اقتباسات سے کتاب کا حجم بڑھ جاتا۔ اس کمی کے رفع کرنے کی یہ تدبیر مناسب معلوم ہوتی ہے کہ آئندہ کسی موقع پر ایک علیحدہ کتاب بطور ضمیمے کے مرتب کی جائے جس میں ہر دور کے خاص خاص مصنفین کی کتابوں کے اقتباس مع انکے انگریزی ترجمہ کے اور اگر ممکن ہو انونٹم ترجمے کے تفصیل دیے جائیں۔ نقص بھی ضرور دیا گیا ہے کہ ماخذ کے نام نہیں دیے جاسکے۔ اسکی تلافی انشاء اللہ دیں ہو جائیگی کہ اک علمی رسالہ تنقیدی نوٹوں کے ساتھ جس کا نام "ماخذ ادب اردو" ہوگا شائع کیا جائیگا۔

ایک دوسرا فرد گزاشت قابل ذکر یہ ہے کہ درموجودہ کے اردو شعرا کا اس کتاب میں ذکر نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ ان کا حال ایک علیحدہ کتاب میں قلمبند کیا گیا ہے جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ اس کتاب کے متعلق میں پروفیسر سٹیمپ کا یہ مذاقیہ مگر نہایت صحیح قول ضرور نقل کرونگا۔

اگر کوئی یہ دعوے کرے کہ میں نے ایسی کتاب لکھی ہے جس میں کوئی غلطی نہیں ہو تو وہ مسخرہ
 جھوٹا ہے اور جو شخص کسی دوسرے سے ایسی کتاب لکھنے کی امید رکھے جس میں کوئی غلطی
 نہ ہو وہ اس سے بڑھ کر نفوس ہے، مجھ کو اس کتاب میں بہت سی فراغتوں کا اعتراف
 ہے جنکی اصلاح افسوس ہے کہ نہیں کی جاسکی۔

اب میں اپنی اس مختصر تالیف کو پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ مجھ کو اپنی محنت
 اور کاوش کی پوری داد مل جائیگی اگر میں اس کے ذریعہ سے لوگوں کے دلوں میں اس تالیف
 یعنی ادب اردو کا صحیح فہم پیدا کروں جو میری رائے میں ہندو مسلم اتحاد کا بہترین ذریعہ ہے
 اور انکو شوق دلاؤں کہ وہ اس تصنیف کو جسکی میں نے صریح بنیاد ڈالی ہو تکمیل تک پہنچا دیں۔
 میں تہ دل سے ممنون ہوں (۱) ان تمام مصنفین کی جنکی کتابوں کو میں نے نہایت شوق
 سے پڑھا اور ان سے فائدہ اٹھایا اگر اسکا اعتراف متن میں نہ کر سکا (۲) ان تمام صحابہ
 جنہوں نے مجھ کو کتابیں پڑھنے کے لئے مرحمت فرمائیں اور میرے تفسیرات کا جواب نہایت
 فراخ دلی سے دیا (۳) ان حضرات کا جنہوں نے مسودہ کتاب پڑھا اور صحیح پڑت میں
 میری مدد کی (۴) ان کا جنہوں نے میل دل بڑھایا اور نیک صلاح سے اپنی ہمدردی
 کا ثبوت دیا۔ مگر چونکہ میرے محسنوں کی فہرست طویل ہے اور ان میں سے بعض کا
 انتخاب کرنا ایک کو دوسرے پر ہیجا ترجیح دینا ہے لہذا میں ان سب کا مجموعی حیثیت
 سے تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

رام بابو سکسینہ

از ہری (یو پی)

تقریظ

راثر عالیشان فصاحت انتساب سر تیج بہادر سپہ و صاحب علم۔ اے ال ال ٹوی۔ کے سی ایس آئی

لکھنؤ یونیورسٹی کے جلسہ کانووکیشن کی تقریر میں میں نے اس بات پر اظہار
افسوس کیا تھا کہ ہم لوگ زبان اردو سے بے توجہی اور غفلت کر رہے ہیں۔ ہمارے
صوبہ کے اکثر تعلیم یافتہ لو جوان اپنی اس ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتے جو کہ ان پر ان کی زبان
اور ادب کی ترقی کی نسبت عائد ہوتی ہے۔ افسوس ہے مگر صفائی سے کہنا پڑتا ہو کہ شہنائی
کی ایسی زبانوں کو جتنی قدر ہمارے نام نہاد نیشنلزم (قوم پرستی) کے غلط مفہوم نے جو دراصل
کیونلزم (فرقہ بندی) کا مراد ہے، نقصان پہنچایا اتنا اور کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔
ہمارے صوبہ کے اکثر مقامات پر ایسے ہندو گریجوٹریوں اور انڈیگر گریجوٹریوں کو دیکھ کر سخت
افسوس آتا ہے جن کا یہ خیال ہے کہ ہندی کی ترقی کے لازمی طور پر یہ معنی ہیں
کہ دلوں سے اُس زبان اور ادب کی محبت اور خیال بالکل نکال دیا جائے جس میں خود
اُن کے بزرگ ابھی دو ہی ایک نسل کا زمانہ گذرا کہ کمال رکھتے تھے۔ اسی طرح ایسے
مسلمانوں سے فکر بھی نہایت صدمہ پہنچتا ہے جو ہندوؤں کی زبان اردو سے
بے توجہی اور بے پروائی کی شکایت سے تو لبریز ہیں لیکن اپنا کوئی قابل تعریف کا نامہ
اُس میدان ادب میں نہیں پیش کر سکتے جس کا محافظ خاص وہ اپنے تئیں سمجھتے ہیں
تعلیم و تربیت اور علمی مذاقوں کے اختلافات جو گذشتہ بیس پچیس سال کے عرصہ میں بہت
بڑھ گیا ہے، فرقہ بندی کے مضر اثرات کو اور قوی کر دیا ہے جس سے سرخرو اتحاد

مسموم اور ایک دوسرے کے خیالات کو صحیح طور پر سمجھنا معدوم ہوتا جاتا ہے۔
 میں اس سے بے خبر نہیں ہوں کہ زمانہ حال میں لوگوں کو ایک قسم کا ادبی اشتغال
 ضرور ہے مگر ہمارے اس قسم کے کاموں سے ہماری زندگی کتنی مالا مال ہوگی یا کہ وہ کام
 کتنے دیر پا ہونگے یہ ایسے سوالات ہیں کہ جن کا جواب صرف مرورِ ایام سے ملے گا۔ جب قدر
 نظمیں فی زمانہ لکھی جاتی ہیں اُن کا زیادہ تر حصہ ایک منظوم شعر سے زیادہ وقعت
 نہیں رکھتا اُن میں کوئی الہامی اثر مطلق نہیں پایا جاتا اور نہ کوئی اعلیٰ ایڈیل ہوتا
 ہے بلکہ بعض نظمیں تو میں نے ایسی دیکھیں جن پر "بدنام کنندہ کنوئیںے چند" کی مثال
 پوری طرح صادق آتی تھی اور اُن کو ایک اعلیٰ درجہ کی بدذاتی کا نمونہ پایا۔ ہماری نشر
 کی بھی یہی حالت سمجھنا چاہیے۔ چلتی ہوئی کتابیں اس صنف میں ہرگز ایسی نہیں
 ہوتیں جن سے ہمارے خیالات میں بلندی یا ہماری دیکھپیوں میں کوئی اضافہ ہو
 بلکہ وہی کجمنت پُرلے عشق و عاشقی کے قصے ہیں جن میں یا تو کسی عورت کی بیوفائی
 اور کمکاری اور یا ادنیٰ درجہ کی رکیک سازشوں اور چالاکوں کا ذکر ہوتا ہے۔ میرے
 اس خیال میں تمام ادبا و اُردو بالکل دیہ اخل نہیں ہیں لہذا میں اس بات کا اعتراف
 کرنے کو تیار ہوں کہ احمد شہزاد میں چند افراد ایسے ضرور ہیں جنکے ادبی کارنامے گو
 مقدار میں کم سہی مگر بلا شک نہایت اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں۔ شعرا و اُردو کی پوری
 تعداد کا حال تو خدا ہی کو معلوم ہے مگر وہ جو اپنا نام صفحہ ہستی پر چھوڑ جائے والے
 ہیں اُنکی تعداد فی الحقیقت بہت کم ہے۔ میلز ذاتی خیال ہے کہ اگر ہندوستان
 میں کسی مقام پر ادب اُردو کی قرار واقعی دیر پا اور مفید خدمت انجام دیتا ہے تو
 وہ حیدر آباد دکن ہے۔

انھیں اسباب سے یہ میرے لئے خاص طور پر قابل مسرت ہے کہ ہمارے اسی
صوبہ کے ایک گزرجوئی کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ اُن کو اتنا دقت ملا کہ باوجود اپنی
سرکاری مصروفیتوں کے انھوں نے ایک کتاب زبان انگریزی میں زبان اور ادب اردو
کی تاریخ پر تیار کر دی مولانا آزاد کی مشہور و معروف کتاب ”آبجیات“ سے کوئی تعلق
نہیں لیکن یہ ضروریاتِ زمانہ حال کے مطابق نہیں ہو۔ اسکے علاوہ بعض اور کتابیں نام نہ موجود
میں بھی اسی بحث پر بہت عمدہ تصنیف ہوئیں مگر اُن کے مصنفین مجھے معاف
فرمائیں اگر میں یہ کہوں کہ اُن میں قوتِ امتیاز اور روشن خیالی کے ساتھ تنقید کی بھی کمی ہے
اس کتاب کے مسودہ کو میں نے بڑی خوشی کے ساتھ پڑھا تھا اور ہر جہد کہ بعض باتوں
میں مصنف کی تجاویز سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر قابلِ مصنف کی اس بارہ میں
خبر و داد دینا پڑتی ہے کہ کیسے مسلسل اور مربوط طریقہ سے انھوں نے زبان اور ادب اردو
کی ترقی اور نشوونما کا حال قدیم زمانہ سے لیکر زمانہ حال تک کا لکھا ہے ممکن ہے کہ اس
کتاب کے آئندہ ایڈیشنوں میں وہ خود اس بات کی ضرورت محسوس کریں کہ اپنی تجاویز
پر نظر ثانی کریں مگر جو بات مجھے اُن میں نہایت امید افزا معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ
اپنی رائے قائم کرنے میں آزاد اور اپنے اظہار خیال میں بیباک ہیں مثلاً میں اس کتاب کے
بائے کو پیش کرتا ہوں۔ اور بھی بہت سی مثالیں دیگر مقامات سے پیش کی جاسکتی ہیں مگر
میں اسی پر اکتفا کروں گا۔ مختصر یہ کہ کتاب نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے جس کے واسطے تمام
بہی خواہانِ اردو کو لائقِ مصنف یعنی رام بابو سکسینہ صاحب کا احسان مند ہونا چاہیے۔
یہ کتاب یقیناً اُن تمام صحاب کو پسند آئے گی اور میری رائے میں ضرور آنا چاہیے، جو
اس بات کی تحقیق چاہتے ہیں کہ زبانِ اردو کس طرح عالم وجود میں آئی مختلف استادوں کے

ہاتھ سے اُٹھیں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں اور ترقی کے مختلف ادوار نے اُس پر کیا کیا
اثرات کیے۔ آخر میں میں یہ ضرور کہوں گا کہ سول سروس صوبہ کے حکام اتنے خوش نصیب
نہیں ہیں کہ ان کو اپنے فرائض مذہبی کی انجام دہی میں اتنا وقت مل جائے کہ وہ اُسکو
کسی ادبی خدمت میں صرف کر سکیں مگر رام بابو صاحب نے اس کلیہ کو توڑ دیا اور دنیا
کو دکھلا دیا کہ ڈپٹی کلکٹر ایک مصنف بھی ہو سکتا ہے اور قانون و انتظام کے فرائض کے
ساتھ ساتھ ادبی فرائض کو بھی بخوبی انجام دے سکتا ہے

(ڈاکٹر سر) تیج بہادر سپرو



مورزا محمد عسکري ٻي — اے مترجم ڪتاب ھذا

التماس مترجم

ادب اُردو دشمن تھا کہ اُسکی قدیم تاریخ یعنی اُسکی ابتدا اُسکی نشوونما، اُسکی تدریجی ترقیاں اور وہ تغیرات جو اُس میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں ان سب چیزوں کے حالات کسی ایسے شخص کی بھی زبان سے سُنے جائیں جو اُن لوگوں سے بالکل مختلف ہونچھوں نے اسے پہلے اس قسم کے حالات و واقعات پر بہت کافی روشنی ڈالی ہے۔ اسیس کوئی شک نہیں کہ اُسمنون پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت خوب لکھا جا چکا ہے صد ہا نہیں تو بیسیوں تذکرے ایسے موجود ہیں جن سے مذکورہ امور بہت وضاحت معلوم ہو جاتے ہیں۔ اگر تم مذکورہ نویسی کو تین درجوں پر تقسیم کریں تو قدما میں میر تقی میر جن کے تذکرے ہمارے واسطے شمع ہدایت کا کام دیتے ہیں متاخرین میں کب حیات اور جلوہ خضر کو ہم لے سکتے ہیں جن سے ہم کو بہت کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور ہو سکتی ہیں۔ اور اول الذکر تو اوج دست تغیرات کے جو اُسکی نسبت وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہیں جن سے بعض واقعات فی حقیقت معرض شک میں ضرور پڑ گئے ہیں پھر بھی اپنی صنف میں ایک لا جواب اور متغیر کتاب ہو جسکا نظیر علی الخصوص اس زمانہ میں جگہ ہم اپنی زبان کی طرف سے اتنی بے پروائی برتتے ہیں محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ قدیم مذکورہ نویسون کے بس اسی پر اکتفا کی ہے کہ اپنے معاصرین اور بعض قدیم شاعروں کے وہ حالات جو اُن کو کبرانی معلوم ہو سکے قلم بن کر دیے اور کچھ نمونے اُنکے کلام کے پیش کر دیے اور مختصر طور پر اپنی رائے اُنکے کلام کی نسبت ظاہر کر دی اور بس۔ زبان کی تدریجی ترقیوں کا حال اُردو تغیرات جو اُنکے عہد تک کے باغین میں تھے اسکے بیان کرنے کے شوق شائق اور نہ سکودہ ضروری سمجھتے تھے میری رائے میں اسکا سہرا مولانا آزاد کے سر ہے کہ انھوں نے اُردو زبان کی ابتدا و ارتقا اور اسکے مختلف ادوار کی تاریخ زمانہ حال کی روش کے مطابق سب سے پہلے قلمبندی کی مگر میری ناچیز رائے میں

اتنی بات اُن سے ضرور رہ گئی کہ اس قسم کی کتاب میں اپنی عبارت کا طرزِ ادا بجا سے
سادہ اور سائنٹفک رکھنے کے اُنھوں نے نہایت نگین اور پرتھو رکھا جیسا کہ اُن کی
تصانیف کا ہوا اور اس کا خیال نہیں کھا کہ تصنیف ایک خاص انداز کی ادا کی دیگر تصانیف سے
مختلف ہے۔ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ اُن کی کتاب اس قدر عجیب ہو گئی کہ اگر
ایک مرتبہ اُس کو شروع کیجئے تو پھر اچھے سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور ایک دفعہ کے
پڑھ لینے کے بعد طبیعت اُس سے اکتاتی نہیں۔ اور یہ بات گلستانِ سعدی کے ہوا کسی
دوسری کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ مگر حق یہ ہے کہ جو اعتراضات فی زمانہ اُس پر سردی
سے کیے جا رہے ہیں یہ بھی اُسی عبارت کی نگینی کا نتیجہ ہے کہ کتاب کو برہنہ بنانے
کی غرض سے اور دل کو خوش کرنے کے لئے اظہارِ واقعات میں ایک مورخ کی نہیں
بلکہ ایک افسانہ گو کی حیثیت اختیار کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر ایسے واقعات غلط ملط ہو گئے
جس کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ یا ایسے پرزور اور نگین الفاظ استعمال کئے گئے
جو اُس موقع کے حسبِ حال نہ تھے تنقید کی گہری نگاہیں جو اس کتاب پر لپٹ رہی ہیں
اور اعتراضات کی بوچھا جو اُس پر ہو رہی ہے میری جگہ میں ایک نتیجہ لازمی بلکہ خمیازہ
اُس غلطی کا سمجھنا چاہیے جو مصنفِ سرور نے اپنی عبارت اور طرزِ ادا کے اختیار کرنے میں
شروع میں کی تھی۔

مذکورہ فہرستی کا تیسرا دور ہم کو اپنے ہی زمانہ میں ملتا ہے حسین اللہ سرپرہ صاحب
کی مشہور و معروف تصنیف نغمائے جاوید ہے حسین سلاست عبارت، روانی بیان اور
مستانت کے ساتھ سچید گوشتِ نگینی ہے کہ ہندوستان کے نامی گرامی شعرا کے ساتھ
اُن لوگوں کا بھی تذکرہ کیا جائے جو گوشہ گنہامی میں زندگی گزار رہے ہیں مگر افسوس ہے

کونسی تذکرہ کی اب تک صرف چار جلدیں چھپی ہیں اور شین منقوطہ سے آگے نہیں بڑھا۔
اسکے ساتھ ہی تذکرہ گل رعنا مولوی حکیم عبدالکلی صاحب مرحوم کا اور شعر المند مولوی
عبدالسلام صاحب ندوی اور میرا مصنفین جناب تنہا (نثارون کا تذکرہ) بھی ہرگز نظر انداز
کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ بلکہ ان تذکروں کے شائع ہونے سے بہت سی وہ باتیں جو
اب تک پردہ خفایں تھیں معرض ظہور میں آگئیں۔

مگر غالباً غلط نہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ ان سب میں کوئی نہ کوئی مخصوص انداز رکھا گیا ہو
اور انہیں وجوہات سے ان تذکروں کو مکمل کہنا ایک حد تک غیر ذمہ دارانہ حیثیت
رکھتا ہے چنانچہ تذکرہ نمحانہ جلوس میں صرف اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ ادنیٰ سے
ادنیٰ شاعر بھی چھوٹ نہ جائے۔ اسی طرح تذکرہ گل رعنا کی بنیاد آزاد کی غلط بیانیوں کے
پر اوپر ہے اسکے ساتھ ہی کسی طرح سے مکمل نہیں اور بہت سی باتوں اور بہت سے بالکالوں
کو اس میں نظر انداز کر دیا گیا ہے یا نظر انداز ہو گئے ہیں شعر المند بحیثیت مجموعی شعرا ردو کی ایک
سیراخی ہے مگر تولیدہ بیانی نے اسکو بھی حدود معین سے نکال دیا ہے میرا مصنفین انشیرنگار کا
تذکرہ یہ مخصوص نشر کے لئے ہے۔ اگرچہ یہ بھی ادب اردو کے واسطے نہایت قابل قدر اور
گرانہا اضافی ہیں مگر سب میں ایک نہ ایک انفرادی خصوصیت موجود ہے۔

”ہمٹری آف اردو لطیف“ جناب رام بابو صاحب سکینہ کے دل و دماغ کا نتیجہ ہے
جو انھوں نے انگریزی میں تصنیف فرمائی ہے اور اس سے زیادہ ترمیم غرض تھی کہ انگریزی
تعلیم یافتہ طبقہ اس سے مستفیض ہو۔ مگر اول سے آخر تک اس کتاب کے دیکھنے والے جانتے
ہیں کہ مصنف موصوف نے جس کاوش جس کوشش زور مطالعہ اور وسعت نظر سے
اس میں کام لیا ہے اور سلوب بیان و تنقید وغیرہ میں جو صفائی نظر رکھی ہے شعر اور

انشادوں کے کلام کا توازن کر کے اُن چھپسی صحیح بیابانہ اور بے لاگ رائیں قائم کی ہیں وہ
 اس کتاب کو جہنیت سے منفرد صورت میں پیش کرتی ہیں تلاش و تجسس کا یہ عالم ہے کہ اُن
 واقعات کو اظہر من الشمس کر دیا ہے جن سے ابھی تک لوگ نا آشنا تھے ایک ایک لفظ سے
 ایک ضخیم دفتر کا فائدہ اٹھایا ہے اسکے ساتھ کہیں توازن و انصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔
 قدامت و متاخرین کو تو کھل نظر انداز کیجئے زائد حال میں حقدار کتابیں زبان اردو کی تحقیق یا اسکی
 نظم و نشر کے متعلق یا بطور تذکرہ وغیرہ کے نکلتی ہیں اُنکے مصنفین ان انگریزی سے کما حقہ
 واقفیت تقریباً پندرہ بیس فیصدی سے زیادہ نہیں رکھتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو طریقہ تحقیق
 تدقیق (ریسچ) اور اعلیٰ مخصوص ترتیب مضامین کا مطبوعات یورپ میں اختیار کیا جاتا ہے
 اُس سے ہماری اکثر ادبی تصانیف بالکل خالی ہوتی ہیں اور شاید اسی وجہ سے وہ پرانے
 رنگ کی کتابیں جن میں فہرست مضامین و انڈکس تک کا پتہ نہیں ہوتا موجودہ انگریزی اُن
 طبقہ کو مطلق پسند نہیں آتی اور انکی آنکھیں اُنھیں باتوں کو دھوڑا دیتی ہیں جو زبان انگریزی اور
 دیگر یورپین زبانوں میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اور جن سے اور کچھ نہیں تو کتاب کی سہولت
 اور دلچسپی میں ضرورت ترقی ہو جاتی ہے اور پڑھنے والے کا بہت سا ضروری وقت فضول اور
 غیر ضروری باتوں سے بچ جاتا ہے۔ فیاض مصنف نے اصل کتاب کی ترتیب میں اسی
 روش کا خیال رکھا ہے جو ادب انگریزی کے مشہور مؤرخین پروفیسر سنڈس بری اور گامس وغیرہ
 نے اپنی تصانیف میں اختیار کی ہے جس سے علاوہ جدت ترتیب و مخصوص اسلوب بیان کے
 یہ فائدہ بھی ضرور ہوا کہ کتاب اُن صحاب کے واسطے بہت مفید ہوگی جنھوں نے بی سارے یا کم از کم
 کی دگری یا آئی سی ایس کی واسطے ادب دولیا ہو تب قدر و االات کہ امتحان مذکور میں پوچھے جاسکتے
 ہیں وہ سب اس کتاب کے مطالعہ سے بخوبی اور آسانی حل ہو سکتے ہیں اور ترتیب مضامین خود

سوالات بنانے میں بھی بہت معین ہوگی۔ مگر چونکہ اردو دان طبقہ اس سے محروم تھا۔ نیز یہ کہ ایسی کتاب کو عام ہونا چاہیے اور اس سے ہر شخص کو مستفیض ہونا چاہیے اور موجودہ صورت میں وہ محض ایک فرقہ کے لیے مخصوص تھی اسوجہ سے ضرورت محسوس ہوئی کہ اسکا ترجمہ کر دیا جائے۔ مگر ترجمہ جسکو تحقیقی ترجمہ کہہ سکیں اسکے لیے میرے نزدیک اسی مطالعہ اسی تعمق نظر اسی وسعت معلومات کی ضرورت ہے جو مصنف کی نظر اور عبارت میں ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک زبان کے خیالات کو دوسری زبان میں لانا اور پھر انکی معنی خوبیاں قائم رکھنا محال نہیں تو دشوار ضرور ہے مگر چونکہ اصل خیالات کا ماخذ اردو ہے اور اردو ہی کے جامہ میں اسکو پھر منتقل کرنا تھا اس لیے بہت ممکن ہے کہ باوجود ان مشکلات کے میں کچھ اس فرض سے عہدہ برآ ہوا ہوں۔ اس موقع پر میں اپنے قدیم عنایت فرما اور مخلص دوست اے بہادر کنور مہاراجہ صاحب بالقابہ کا ممنون ہوں کہ انھیں کے اصرار سے مجھ کو موقع ملا کہ اس کتاب کے ذریعہ سے کچھ ادب اردو کی خدمت کر سکوں۔

ترجمہ کی مشکلات کے علاوہ بعض دوسری مشکلوں سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ بعض باتیں ایسی تھیں کہ وہ اگرچہ اول اردو ہی میں تھیں مگر قدیمی تذکرہ نویسوں نے اسکو فارسی میں بیان کیا ہے پھر انھیں کو اردو میں بیان کیا اور پھر اردو سے انگریزی میں بیان کی گئیں اس لیے ان میں کچھ نہ کچھ تباہی ہو گیا۔ ان میں مصنف ایک حد تک معذور تھے مگر ان کو اردو میں دوبارہ پھر اسی حیثیت سے لانا مشکل تر تھا جسکی زیادہ سے زیادہ کوشش کی گئی ہے۔ اور جہاں انھیں مضامین ماخوذہ کا اعادہ کرنا پڑا تو ان کے الفاظ کو نیا جامہ پہنا دیا گیا جو بعض اوقات ایسے تھے جنھیں شاید مصلحتاً اصل کتاب میں مجمل بیان کیا گیا تھا مگر اردو میں انکی کسیت قدردانی ضروری تھی ان کو بھی ہمیں بیان کیا گیا۔ اور ہمیں تحقیق و تنقیح

کی بنی بنی گئی۔

چونکہ انگریزی میں نمونہ کلام دینا کچھ زیادہ ضروری اور وسیع نہ تھا اس لئے اصل کتاب میں اس طرف توجہ نہیں کی گئی لیکن اس میں سب کا نہیں مگر اکثر کا نمونہ کلام دیا گیا ہے۔
 کسی دوسری زبان میں اگر یہ بات ضروری نہ بھی ہو تب بھی اردو کے لئے نقد و تبصرہ میں مسامحت اور ملائمت کی ضرورت ہے اسی لئے اکثر اس بات کو نظر انداز نہیں کیا گیا ورنہ ظاہر ہے کہ گلشن بیاں میں نظیر الکبریا دی پر کوئی بڑا اعتراض نہیں کیا گیا تھا بلکہ مصنف نے اپنی رائے کو بے لوث ظاہر کر دیا تھا۔ اسی پر قطب الدین باطن کا پورا تذکرہ لکھا گیا جس میں وہ سب سا تذکرہ دہلی معرض تحفہ میں لائے گئے جنھیں مصنف گلشن بیاں یعنی نواب مصطفیٰ خان شفیقہ اسے برائے نام بھی تعلق تھا۔ اسی طرح نے برہان قاطع دیکھنی اور قاطع برہان مرزا غالب نے اپنے زمانہ میں جو بے پایاں طوفان برپا کیا تھا اس کی مہربانیں آج تک کانوں میں آرہی ہیں۔

اکثر جگہ ترجمہ میں کوہ کندن دکاہ برآوردن کا معاملہ پیش آیا ہے یعنی بعض معمولی اور ادنیٰ باتوں کے لیے پوری پوری کتابیں اور تاریخیں پڑھنی پڑی ہیں جسکے بعد کوئی صحیح نتیجہ نکالا جاسکا ہے یا کوئی ایسے قائم کی ہو۔ اصل کتاب کے علاوہ مصنف صاحب بھی اکثر جگہ حذف و اضافہ کرتے رہے اس لئے آپس میں بہت سی باتیں دوسری شکل میں نظر آئیں گی جو اصل کتاب میں تھیں کہیں کہیں مترجم اور مصنف کی رائے میں اختلافات تھا جس کو فٹ نوٹ کے تحت میں ظاہر کر دیا گیا ہے غرض کہ یہ ایک کوشش دکاوش ہر جوار باب نظر کی خدمت میں ہدیہ ناز بنا کر پیش کی جاتی ہے اور نگاہ منتظر طفرای قبول کی مستی ہو۔
 مجموعی حیثیت سے آج جب اس کتاب کو دیکھا جاتا ہے تو تنہا اسکے اندر وہ نام نہاں

نظر آتی ہیں جو ایک ادب کی معلومات کے لئے سُرخیے ناز ہیں۔ یعنی زبان اردو کی پیدائش۔
 ہندی بھاشا اور دوسری زبانوں سے اُسکا ارتباط و اتحاد۔ دوسری زبانوں کا اُس سے
 سرنگوں ہونا اور مٹ جانا۔ نظم کے ادوار مختلفہ اُن کے مشہور و معروف افراد۔ اُن پر تنقیدیں۔
 موجودہ اساتذہ کے حال۔ تمام صنواف نظم پر روشنی۔ انکی ابتداء و انتہا کے تاریخی نقطہ نظر
 انکشافات بشر اردو کے مشہور مصنفین اُسکی عہد بعد کی ترقیاں۔ انکی تصانیف پر نقد و تبصرہ
 مشہور آثار و فن کا ذکر اور شکر کے صنواف وغیرہ پر سبب راہیں غرض کہ سبھی کچھ ان اور اوراق پر نشان
 میں موجود ہے۔ اردو سے جدید کی جو روش بعض نا عاقبت اندیشوں نے نکالی ہے۔ اصولی طریقہ
 پر خواہ اُسکا کوئی بھی موجد اور ذمہ دار ہو۔ مگر موجودہ صورت اس بات کی معین معلوم ہوتی ہے
 کہ وہ سلاست اشیرینی روانی بیان کا خاتمہ کر کے چند ہی روز میں زبان کو ایک خازن
 بنا دیگی میں نے اس بات کی خصوصیت سے کوشش کی ہے کہ نہ تو متعارفات و تشبیہات
 اغراق و غلو سے مطلب کا خاتمہ ہو جائے اور نہ وہ ہتھکڑی ہو جائے کہ قدم قدم پر
 لغت دیکھنا پڑے۔ بلکہ عبارت سلیس اور سادہ ہے اور کہیں سے گنجلک نہ ہو۔
 کتاب کا فائدہ اور کچھ پیڑھانے کے لیے اسکے آخر میں ایک مفصل اندکس شامل
 کیا گیا ہے تاکہ ہر اُس چیز کو جسکا اُس میں ذکر ہے بلکہ سانی ڈھونڈ سکیں۔

ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُس میں مشہور شعرا و فنکاروں کی تصاویر بھی دیدی گئی ہیں جس سے
 کتاب کی کچھ پیڑھ گئی ہے۔ ہر چیز کے یہ ضروری نہیں کہ تصاویر کے شمول سے کسی کتاب کی
 اصل قدر و قیمت میں کوئی معتد بہ اضافہ ہو مگر جبکہ فی زمانہ دوسری کتابوں کے ادبی تذکرے
 اور ہسائیکلو پیڈیا اپنے مشاہیر کی تصویروں سے خالی نہیں ہوتے تو یہ بھی مناسب معلوم ہو کہ اس طرح
 ہم اپنے ادبی پیشواؤں کے روحانی اور باطنی فیوض سے اپنے دل و دماغ کو مسرور و منور کرتے ہیں

اُسی طرح اُنکے خدخال اور ظاہری جمال سے اپنی آنکھوں کو بھی روشن کریں۔ جی چاہتا تھا کہ تمام مشہور شہوریاں ان کی تصاویر دیکھ سکیں مگر فرانس ہو کہ قدما کی تصویریں دستیاب نہیں ہوئیں اور جو ایک آدمی بھی اس کا بھی اعتبار نہیں علی الخصوص سودا کی تصویر جو ابھی تھوڑا عرصہ ہوا زمانہ میں شائع ہوئی تھی اور اس کتاب میں بھی اُسی سے لی گئی ہے نہایت جلدی اور بھونڈی تصویر ہے۔ اور ہرگز دل نہیں لیتا کہ میرزا رفیع سودا کی شبیہ ہوگی۔ بہ طور حقد رعدہ اور معتبر تصاویر ہم پہنچ سکیں اس کتاب میں دی گئیں۔ اور اسکے واسطے ہم اپنے مکرّم و محترم دوست منشی دیاندراج صاحب گم کے ممنون ہیں کہ انھوں نے بعض تصاویر کے بلاک فراہم کئے اور خود مصنف صاحب مولوی عبدالباری صاحب اسی کے بھی شکر گزار ہیں جنکی کوشش سے بعض دیگر تصاویر دستیاب ہوئیں۔ اول الذکر نے ایک بہت بڑا ذخیرہ تصاویر کا بھیج دیا جس میں سے اکثر کام آئیں۔

آخر میں بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں بعض حضرات کا جن سے اس کتاب کی تیاری میں بہت کچھ مدد ملی دلی شکر یاد کروں۔ سب سے پہلے میں اپنے مددگار اور دوست مولوی عبدالباری اسی کا نام اس فہرست میں لینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جنھوں نے مجھ کو اسکی تکمیل و تیاری میں بڑی مدد دی مجھ میں ایک سخت عیب ہے کہ اپنے ہاتھ سے لکھنے سے قاصر ہوں بلکہ اپنے ڈکٹیشن سے کسی دوسرے شخص سے لکھواتا جاتا ہوں۔ یہ کتاب نام و کمال مولوی صاحب موصوف کی اس اعانت قلمی کا نتیجہ ہے۔ اور آہیں کوئی شک نہیں کہ اگر ان کا سا کا تب مجھے نہ ملتا تو اسکا اتمام و ختم نام دشوار تھا۔ مولوی جعفر علی صاحب صحیح مطبع کا بھی میں شکر ہوں کہ انھوں نے نہایت مستعدی اور ہوشیاری سے میرے ساتھ پردہ پڑھے اور سینئر ٹیڈنٹ مطبع یعنی ڈاکٹر اس صاحب ٹیڈنٹ کا بھی شکر یہ میں نہیں بھول سکتا جنھوں نے اس کتاب کی طباعت و اشاعت میں دیکھپی لیکر کافی مدد دی۔

مرزا محمد عسکری۔ لکھنؤ۔ ۱۵۔ فروری ۱۹۲۹ء

باب

زبان اردو اور شکی اصل

اردو سے کیا مراد ہے عام طور پر لوگ اردو کو فارسی کی ایک شاخ خیال کرتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ اسکی ابتدا مسلمان حملہ آوروں کی فوج میں اور مسلمان سلاطین ہندی کی دارالسلطنتوں میں پڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اردو کے فارسی نثر ادب ہونے کی غلطی عام لوگوں کو تو اس وجہ سے بھی محسوس ہوتی ہے کہ انہیں فارسی لفظ بکثرت ہیں اور شکی شاعری کی بحر میں اور اس کا رسم الخط بھی مثل فارسی کے ہے۔ اسی غلطی کی بنا پر عام لوگ خیال کرتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے بمقابلہ ہندی کے جو ہندوؤں کی مخصوص زبان سمجھی جاتی ہے اور اسی غلط فہمی سے ایک عرصہ دراز سے سخت مقابلہ اور مباحثہ درمیان معانین اردو اور طرفداران ہندی کے ان دونوں زبانوں کی عمدگی اور خوبی اور نیز انکی استعداد قبولیت عامہ کی نسبت چلا آتا ہے اور اس بحث میں لوگ ایک معمولی بات یعنی زبان اردو کی اصل کو نظر انداز کر جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ زبان اردو اس ہندی یا بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں تک ہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی اور جس کا تعلق شوریانی پرکرت سے بلاواسطہ تھا۔ یہ بھاشا جسکو مغربی ہندی کہنا بجا ہے زبان اردو کی اصل اور ماں سمجھی جاسکتی ہے۔

گوکہ ”اُردو“ کا نام اُس زبان کو ایک عرصہ دراز کے بعد دیا گیا۔ زبان اُردو کی صرف
و نحو محاورات اور کثرت سے ہندی الفاظ کا اُنہیں استعمال ہونا اس بات کی بین دلیل
ہے کہ اُس کی ابتدا ہندی سے ہوئی اور محض اتفاق تھا کہ وہ ہندوستان کی زبان عام
بن گئی جسکی وجہ یہ ہوئی کہ دہلی جو اس زبان کا ابتدائی مرکز تھا مسلمان حملہ آوروں اور
بادشاہوں کی جاے ورود اور ان کا دار السلطنت بنا ہوا تھا۔ پس یہ خیال کرنا جیسا کہ
میر تقی اور بعض اور قدیم اُردو نثریوں کا خیال معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ایک مخلوط زبان ہے
جس میں وہ سب زبانیں داخل ہیں جو کسی زمانے میں دلی کے بازاروں میں بولی جاتی
تھیں صحیح نہیں ہے۔ یہ ضرور سچ ہے کہ لشکر یا بازار سے اس زبان کی نشوونما اور ترقی کو
اس قدر تعلق ضرور تھا کہ اس کا نام ہی ”اُردو“ ہو گیا جسکو زبان ترکی میں ”لشکر“ کہتے
ہیں۔ زبان میں ہنوز بچگی نہیں آئی تھی اور وہ بحالت تشکیل تھی اور اجنبی الفاظ اور جملوں
کے قبول کر لینے کا مادہ اُس میں بہت تھا جیسا کہ اب بھی ہے۔

اس زمانہ میں انگریزی تقلید میں اُردو کو ”ہندوستانی“ کہتے ہیں مگر لفظ ہماری
راے میں گویا اعتبار لفظ صحیح ہو مگر حقیقت میں صحیح نہیں ہے کیونکہ اس لفظ میں مشرقی
ہندی اور مغربی ہندی اور راجستانی سب شامل ہیں۔ اسی طرح ہمارے خیال میں
برج بھاشا کو اُردو کا ماخذ قرار دینا جو کہ مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے اور جیسا کہ
مولانا محمد حسین آزاد نے بھی سمجھا ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس وجہ سے کہ برج بھاشا
جو تھرا اور اُس کے جوانب میں بولی جاتی تھی۔ گو اُس بھاشا سے جو اطراف دہلی میں
بولی جاتی تھی بہت مشابہت رکھتی ہے مگر برکرت کی ایک علیحدہ شاخ ہے اور یہی شاخ
یعنی دہلی بھاشا ہمارے خیال میں زبان اُردو کی اصل سمجھی جاسکتی ہے۔

اُردو ادب ہندی کا تعلق جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا اُردو کا اصلی ماخذ وہ زبان ہے جو دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی جسکو مغربی ہندی کی ایک شاخ سمجھنا چاہیے اور مغربی ہندی اپنی جگہ پر شوشینی پرکرت سے پیدا ہوئی اور مندرجہ ذیل زبانیں اُسکی خاصیت ہیں یعنی بنگارو، برج بھاشا، تنوچی، اور وہ زبان جو دہلی کے اطراف میں مروج تھی مگر زائد حال کی اعلیٰ ہندی اُردو سے پیدا ہوئی اس طرح کہ فارسی الفاظ کمال کرانگی جگہ سنسکرت لفظ رکھ دیے گئے۔ اسی اعلیٰ ہندی میں نثر کی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں کہ مصنفین نے سنسکرت کے بڑے بڑے الفاظ استعمال کیے ہیں مگر سچ پوچھیے تو اُردو ادب ہندی اپنے ماخذ اور نیز اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی زبان ہیں اور ان دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے اگر کچھ ہے بھی تو نشوونما اور ترقی کے طریقے میں ہے۔ اُردو چونکہ مسلمانوں کے سایہ عاطفت میں پئی اس لیے اُس میں فارسی الفاظ کی کثرت ہو گئی برخلاف ہندی کے کہ جو اپنے اصلی ماخذ یعنی سنسکرت کی طرف عود کر گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانے کی ادبی اُردو اور ادبی ہندی میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا یعنی اول الذکر میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت ہے اور آخر الذکر غیر مانوس سنسکرت الفاظ سے بھری ہوئی ہے۔

زبان ادب اُردو فارسی کلاسیک ادب ہے شروع میں زبان نہایت سادہ اور بے تکلف تھی اور عوام الناس کی معمولی ضروریات کے پورا کرنے کے واسطے بالکل کافی تھی۔

ہوں جو اُس میں ترقی ہوتی گئی اور وہ ایک ادبی زبان بنتی گئی اُسی قدر اُس میں فارسی اور عربی اور ترکی الفاظ شامل ہوتے گئے۔ فارسی الفاظ سنسنے میں بہت بھلے معلوم ہوتے تھے اس وجہ سے مصنفین نے اپنی کتابوں میں حدت کی چاشنی دینے کے لئے اُن کو بے تکلف استعمال کرنا شروع کیا اور اس طرح فارسی ترکیبیں جو اصلی زبان سے اہل حدیث میں

اور اُس کے ساتھ میل نہیں کھاتی تھیں زبان میں داخل ہونے لگیں۔ اسی کے ساتھ فارسی رسم الخط بھی کچھ تھوڑی سی تزئین کے ساتھ ہندی کی جگہ پر رائج ہو چلا اس وجہ سے کہ فارسی الفاظ فارسی خط میں نسبت ہندی کے زیادہ آسانی سے اور صحت کے ساتھ لکھے جاسکتے تھے۔ اردو شاعری پر بھی فارسی کا بڑا اثر پڑا اور وہ بھی فارسی شاعری کے قدم قدم چلنے لگی۔ فارسی بحر استعمال ہونے لگیں۔ ان کے علاوہ مضامین طرز بیان تکمیل، تلمیحات خاص خاص محاورے اور مثلیں یہ سب کچھ زبان فارسی سے لیا گیا۔ اردو کا علم عروض بھی فارسی عروض کے تابع اور زیر اثر ہو گیا۔ شعر کا بھی یہی حال تھا وہی عبارت کی نگینی، الفاظ کا توازن اور قافیہ بندی جو قدیم فارسی شعر کی جان تھی اردو میں ان کی پوری نقل کی جاتی تھی۔ الغرض زبان فارسی اردو پر اس قدر حادی اور غالب ہو گئی کہ دونوں ایک ہو گئیں، اظہار خیالات، مضامین اور طرز ادب میں فارسی اردو پر اتنی غالب ہو گئی کہ اردو کی ابتدائی شان اُس سے بالکل غائب ہو گئی یہاں تک کہ اکثر لوگوں نے اردو کی صرف دھجی کتابیں تک فارسی کے طرز پر لکھنا شروع کر دیں۔

اردو میں فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کی کثرت کے اسباب

مسلمان بحیثیت فاتح ہندوستان میں آئے اور قدما زبان فارسی جو ان کی مادری زبان تھی ہندوستان کی «شاہی» زبان بن گئی جس کا نتیجہ ہوا کہ دیسی زبان مثل خادمہ کے دب کر اور مغلوب ہو کر اپنی مالکہ زبان فارسی کی خدمت کرنے لگی اور اُسی کے طرز ادا اور محاورات وغیرہ کی متبع اور ناقل ہو گئی۔ لوگوں کو نئی زبان سیکھنے کا شوق ہوا کرتا ہے اسی وجہ سے اس وقت کے لوگ بھی پُرانا طرز چھوڑنے اور نئے الفاظ اور جدید محاورات اختیار کرنے لگے۔ دیسی زبان میں جواب شرف اور مغز شہری لوگوں سے چھوٹی جاتی تھی اور اطراف شہر

دیہات میں محدود ہوتی جاتی تھی اب لوگوں کو کوئی مزا نہیں آتا تھا لہذا جدت پسند طبیعتوں نے نئی زبان کی طرف رخ کیا اور اسکو نہایت شوق و ذوق اور انہماک سے سیکھنے لگے۔ اسی وجہ سے قدیم ہندی شعرا کی تصانیف میں فارسی الفاظ کی کثرت تعجب خیز معلوم ہوتی ہے مثلاً چند کوئی کی ”پر تھی راج راسو“ کو دیکھیے جو فارسی الفاظ سے بھری ہوئی ہے دیسی زبان کی تنگی اور کم وسعتی بھی اسکا باعث ہوئی کہ نئے نئے الفاظ اور خیالات کے اظہار کے لئے ہنکو اصلی لفظ اور طرز را جذب کر لینا پڑا شروع میں دیسی زبان میں ایسے الفاظ بکثرت شامل تھے جو یا تو سنسکرت کے لفظ تھے یا انھیں سے برگزیدہ کسی دوسری صورت میں زبان پر چڑھ گئے تھے جب مسلمان آئے تو زبان میں بھی ایک بڑا انقلاب ہوا۔ مسلمان حملہ آور بادشاہ بن گئے اور دہلی ان کا پایہ تخت ہو گیا اب وہ یہاں بسنے اور آباد ہونے کے لئے آئے نہ کہ جس طرح سابق میں وہ سال بسا آتے تھے اور مال غنیمت لیکر واپس چلے جاتے تھے۔

جب دہلی پایہ تخت ہو گیا اور بادشاہ مع لاؤ لشکر کے وہاں رہنے لگا تو باشندوں اور غیر ملکی سپاہیوں میں میل جول اور ربط و ضبط بڑھنے لگا۔ ایک دوسرے کی زبان اور خیالات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہوا کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے الفاظ سیکھے اور ان کو اپنے طرز پر استعمال کرے اور ظاہر ہے کہ فاتح کا اثر مفتوح پر زیادہ ہوا کرتا ہے پس مفتوح قوم کی دیسی زبان یعنی ہندی پر فارسی کا بہت بڑا اثر پڑنے لگا۔ اسی وجہ سے اردو میں فارسی الفاظ اور ترکیبیں بکثرت شامل ہو گئیں مگر ہندی نے اپنا اثر فارسی پر کم ڈالا کیونکہ فارسی کے زباں داں اپنی زبان کو اس قسم کی آمیزش سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ یہ تقییر گو کہ ابتدا میں بہت غیر محسوس طریقے سے شروع ہوا تھا مگر جوں جوں مسلمانوں کی بڑھتی مضبوط

ہوتی گئی اور وہ اس ملک میں آباد ہوتے گئے یہ زبانی تغیر برابر ترقی کرتا گیا اور یہ ترقی کی رفتار
برابر قائم رہی یہاں تک کہ اکبر کے زمانہ میں ایک ہندو وزیر مال کی تاکید سے ایک حکم جاری
کیا گیا کہ ہر سرکاری ملازم کو فارسی سیکھنا ضروری ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان کی جڑ مضبوط
ہو گئی اور اس کی عظمت اہمیت بڑھ گئی۔ لوگ فارسی، عربی، ترکی الفاظ بڑے شوق سے بولنے لگے
کیونکہ وہ صنف میں اچھے معلوم ہوتے تھے اور زوردار تھے اور ان کے بولنے والے خواہ مخواہ تعلیم یافتہ
سمجھے جاتے تھے اس کے علاوہ فارسی دانی سے سرکاری ملازمین بھی آسانی سے ملتیں اور اقرب
شاہی کا بھی یہ ایک اچھا ذریعہ تھا۔ ایسی حالتوں میں ابتداء ہر زبان کا ہی حال ہوا کرتا ہے
جب قدیم اہل ہندوستان کو نازن لوگوں نے فتح کیا تو انگریزوں کی قدیم زبان "انگلو سیکسن"
کی بھی "نازن فرینج" کے ہاتھوں ہی حالت ہوئی تھی پس جس طرح زبان انگریزی میں دوطرح کی
زبانیں بولی جاتی ہیں وہی صورت اردو کی بھی سمجھنا چاہیے۔

اردو میں فارسی الفاظ کی کثرت کے کئی اسباب ہیں مسلمان جب بحیثیت فاتح اس
ملک میں آئے تو اپنے ساتھ بہت سی نئی چیزوں کے نام لائے جن کے مراد سنسکرت یا دیو بھاشا
میں نہیں مل سکتے تھے چونکہ ایسے نام کسی شرح یا گھوم بھیر سے بتائے نہیں جاسکتے تھے
اس لیے بحیثیت ہی فارسی الفاظ جن سے وہ چیز ظاہر ہوتی تھی زبان میں داخل کرنا پڑے
مثلاً ایسے نام جو لباس، طعام، مذہب اور بعض اسی قسم کی دوسری چیزوں سے تعلق رکھتے
ہیں پھر چونکہ فارسی فاتح قوم کی زبان تھی اور ایک ایسی زبان تھی جو زرم نرم، حسن و عشق
کے افسانوں کے لئے نہایت موزوں تھی اس لیے لوگ ایسے موقعوں پر فارسی الفاظ ہی
بولنا پسند کرتے تھے اس وجہ سے کہ وہ نہایت شیریں اور شاندار معلوم ہوتے تھے ایسے پرزور
لفظوں کے سامنے پڑنے دیسی الفاظ اور محاوروں کو خواہ مخواہ پیچھے ہٹنا پڑا اس لیے کہ زمانہ

اُن کو پسند ہی نہیں کرتا تھا زبان انگریزی کی بھی ہی داستان ہے۔ جب یونانی اور لاطینی علوم کا احیا اور دوبارہ ترقی ہوئی تو اُس زمانہ میں بھی موٹے موٹے عالمانہ لفظ بولنے کا فیشن ہو گیا تھا بہر حال جب فاتح اور مفتوح دونوں قوموں کا میل جول بڑھا تو ایک ایسی مخلوط زبان یا بولی کی سخت ضرورت محسوس ہوئی کہ جو دونوں قوموں کے اُچھی طرح سمجھ میں آ سکے اور چونکہ مفتوح اپنے مالکوں کو زیادہ خوش رکھنا چاہتے تھے لہذا انھوں نے اُن کو خوش کرنے کے لیے اُنکی زبان سے زیادہ اخذ کیا نسبت اُسکے کہ اُن کے مالکوں نے اُنکی زبان سے فائدہ اُٹھایا۔

اظہار قابلیت کے لیے بھی عربی فارسی الفاظ کثرت سے بولے جانے لگے۔ اردو ادب کی ابتدا شاعری سے ہوئی اور شاعری فارسی داں لوگوں کے ہاتھ میں گویا ایک کھلونا تھی۔ جس کو وہ فارسی الفاظ و محاورات ہی کے لباس میں آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ نہ بان ہندی بہت کم جانتے تھے اور سکریت سے بالکل ناواقف تھے۔ اسی وجہ سے یہ ہونا بھی اپنے حقیقی والدین سے جدا ہو کر اپنے مصنوعی والدین کی آغوشِ محبت میں تربیت پاتا رہا جنھوں نے بلا شک اُسکے ساتھ بہت کچھ کیا۔ اُنکی آغوشِ تربیت میں رہ کر اردو کا نشوونما بالکل فارسی کی روش پر ہوتا رہا نہ صرف فارسی الفاظ کا ایک کافی ذخیرہ زبان میں جمع ہو گیا بلکہ فارسی ترکیبیں بھی کثرت سے شامل ہونے لگیں مثلاً جار مجرور، صفت موصوف کی ترتیب بدل گئی ایسے سیکڑول فقرے جو حرف ربط ”بہ“ سے معمولاً شروع ہوتے ہیں اردو میں بے تکلف استعمال ہونے لگے جو درسی مردہ قواعد صرف و نحو سے بالکل خلاف تھا آج بھی ہماری ادبی دسی زبان میں اسی قسم کی فارسی ترکیبیں کثرت سے موجود ہیں یہ ضرور ہو کہ فارسی کے اثر سے اردو ایک مستقل زبان کی شکل میں آج ہمارے سامنے موجود ہے لیکن اسکا افسوس بھی ہوتا ہے کہ اصل زبان کی خوبیاں جن سے اردو کی ابتدا ہوئی تھی

بہت کچھ فنا ہو گئیں۔

یورپ کی زبانوں کا اردو پر اثر فارسی زبان اور فارسی ادب کا تو اردو پر بہت گہرا اثر پڑا ہی تھا لیکن پرتگالی اور انگریزی کا بھی کچھ کم اثر نہیں پڑا البتہ زبان ٹچ اور فریج کے حملے سے نقوش یا ٹوٹ گئے یا ہیں تو اس قدر دھندلے کہ معلوم نہیں ہوتے۔ پرتگالی اور انگریزی دونوں نے اردو لغات میں معتد بہ اضافہ کیا۔ ۱۵۴۷ء میں ہندوستان کے مشہور بندہ گلوں پراہل پرتگال قابض تھے اور مالک مشرق میں گویا تجارت انھیں کے ہاتھ میں تھی۔ انکی آبادیاں ہندوستان کے سوا حل پر اور اندرون ملک میں بھی تھیں ان کا تعلق ہندوستان سے عارضی نہ تھا بلکہ وہ بحیثیت اجرو حاکم اور مبلغ کے یہاں رہتے تھے انھوں نے بہت ترقی کی تھی اور سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں انکی زبان ہندوستان کے ایک بڑے حصے کی زبان عام ہو گئی تھی جو محض ہندوستانیوں اور اہل یورپ کے درمیان تبادلہ خیالات کا ذریعہ ہی نہ تھی بلکہ خود یورپ کے یہودی اگر بھی آپس میں اسی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ اسی میں عیسائی پادری اپنے مذہب کی اشاعت اور تبلیغ کرتے تھے چنانچہ اسی وجہ سے اُس کو بہت ایسے موقع ملے کہ وہ اپنا اثر یہاں کی ایسی زبانوں پر ڈال سکے۔ سب سے زیادہ اثر بنگلہ زبان پر پڑا۔ اسی طرح دراوڑی زبانیں مثلاً مرٹھی، اسامی، اور اڑیا بھی اُس سے بہت کچھ متاثر ہوئیں۔ اردو بھی اُس کے لغات سے بہت متمتع ہوئی۔ یہ اثر اتفاق سے شمالی ہندوستان میں اُس وقت پڑ رہا تھا جب دکنی زبان جو پرتگالی کے اثر سے بسبب قربت کے بہت کچھ متاثر ہو چکی تھی اور نیز اسی طرح کی دوسری زبانیں اردو پر اپنا اثر اچھی طرح ڈال رہی تھیں۔ پرتگالی الفاظ ایسی زبانوں میں اصلی حالت پر باقی نہیں رہے بلکہ جس بگڑی ہوئی شکل میں وہ ہندوستان میں بولے جاتے تھے اور ہندوستانی زبانیں ان کو قبول

کر سکتی تھیں اُسی مہیت پر وہ اب بھی بکثرت موجود ہیں۔ اہل پرتگال نے محض اپنی زبان کے الفاظ ہندوستانی زبانوں میں داخل نہیں کیے بلکہ بہت سے عربی، فارسی اور ہندی الفاظ بھی اکثر یورپی زبانوں میں پہنچا دیے۔ اس کے علاوہ اکثر عربی اور فارسی لفظ پرتگالی سے منسوخ ہو کر داخل ہوئے مثلاً وہ الفاظ جو عربوں کے فتح اندلس کے زمانے میں اُن ممالک میں رائج ہو گئے تھے، پرتگالی الفاظ ہماری زبان میں بکثرت بولے جاتے ہیں مثلاً از قسم میوہ جات و اشیاے طعام۔ اچار۔ انناس۔ افس (قسم انبہ) بسکٹ۔ سا جو۔ پیمفرے۔ (قسم مچھلی) پیتیا۔ تباکو، ترنج، چاء۔ ساگو۔ گو بھی وغیرہ از قسم سامان آرائش و آلات و اسلحہ۔ الپین الماری، ارغنون، بھرا، بالٹی، بوتل، پیما، پستول، پرگ، چای، صابون، کوچ، کپتان، کاربن، کارتوس، میز تولیہ، کار دو وغیرہ۔

مذہبی الفاظ۔ پادری۔ گرجا، کلاس وغیرہ
لباس میں۔ سایہ، قمیص، کاج، اسپٹ وغیرہ
متفرق الفاظ مثلاً انگریز، آیا، بمبا، پاگر (تنخواہ) پاو روٹی، چھاپہ، نیلام
ستری، اکہ، روپیہ وغیرہ

اہل پرتگال ہی نے سب سے پہلے یورپ کی اکثر چیزوں کی اشاعت ہندوستان میں کی لہذا ان کے نام بھی اُسی طرح رائج ہو گئے جس طرح کہ وہ لوگ اپنی زبان میں بولتے تھے مرزا غالب شہر پرتگالی کا اکثر ذکر کرتے ہیں۔ زبان انگریزی ایک زندہ اور حاکموں کی زبان ہے اس نے اپنا اثر بہت کچھ ڈالا ہے اور ڈالتی رہیگی۔ انگریزی علم ادب نے اردو نظم و نثر کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا جس کا ذکر مفصل طور پر آئندہ کسی باب میں کیا جائیگا۔

لیکن اتنا اس موقع پر ضرورتاً دینا چاہیے کہ زبان انگریزی نے وہ الفاظ اُردو میں داخل کیے جنکی جگہ پر کوئی دوسرا لفظ موجود نہ تھا اور وہ الفاظ اب زبان اُردو ہو گئے۔ ترجمہ کا بھی یہ نتیجہ ہوا کہ اکثر انگریزی الفاظ اسکی بدولت اُردو میں شامل ہو گئے۔ اُردو میں انگریزی الفاظ بکثرت داخل کرتے ہیں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اسی طرح وہ انگریزی الفاظ جو اضرت اُردو میں داخل اور مستحکم ہو گئے ہیں خارج کرنا بھی اندیشہ سے خالی نہیں ہے۔ اُردو کو مالدار ہونا چاہیے اور ہر طرح کے الفاظ جو اسکی اصل سے میل کھاتے ہوں اسیں ضرور داخل ہونے چاہئیں خواہ وہ انگریزی ہوں یا فارسی ہوں یا سنسکرت صرف یہی ایک طریقہ زبان اُردو کی تکمیل اور اسکی ترقی کا ہے اور اسی طرح وہ ایک اعلیٰ درجہ کی زبان اور ہندوستان کی عام زبان بن سکے گی۔

نثر اور نظم کی زبان ہر زبان میں نظم و نثر کی عبارت میں فرق ہوتا ہے عبارت میں متانت اور سنجیدگی پیدا کرنے کے لیے اور نثر اس خیال سے کہ نثر اور نظم میں فرق معلوم ہو نظم کی عبارت نسبت نثر کے زیادہ شاندار ہوتی ہے اسی وجہ سے وہ معمولی اور سادہ الفاظ اور معمولی بول چال کی ترکیبیں جو نثر میں عام طور پر پائی جاتی ہیں نظم میں ناجائز سمجھی جاتی ہیں یہی وجہ تھی کہ فارسی محاورات اُردو نظم میں بکثرت شامل کر دیے گئے اگر اُردو نثر کی ابتدائی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ شروع میں مقفے عبارت بہت پسند کی جاتی تھی جس میں سجدہ تکلف اور تصنع ہوتا تھا۔ بہترین طرز وہ تھا جس میں ظہوری اور بیدل کی مہر صغہ نگاری کی تقلید کی جاتی تھی۔ ہماری پُرانی نثر نگاری کی مثال باعتبار عبارت کی رنگینی اور قافیہ بندی کے بعینہ دہی ہے جو انگلستان میں ملکہ الزبتھ کے زمانہ میں انگریزی نثر کی تھی۔

مرزا غالب بلکہ سر سید احمد خاں کے زمانے سے ایک نیا دور شروع ہوا جبکہ مغربی

تعلیم کے اثر سے وہ پرانا رنگ بدل گیا اور مقفی عبارت اور فارسی کی رنگینیت کی جگہ اب بے تکلف اور سادہ عبارت پسند کی جانے لگی۔ دور جدید میں شہزنگاری کی وہ شان باقی بھی نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ عملی دُنیا میں سیدھے سادے صاف اور زوردار الفاظ کی ضرورت ہے۔ اب بھی فارسی الفاظ کی کثرت ضرور ہے لیکن اس سے عبارت کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ کسی قسم کا تصنع پیدا ہوتا ہے۔ ہندی محاورات خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں اور پیچیدہ بندشوں سے گریز کیا جاتا ہے لیکن گلستانِ نظم کی آبپاشی اب بھی چشمہٴ فارسی ہی سے ہوتی ہے اور اس کا چمن اب بھی انھیں صنعتوں سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ ہندی الفاظ و محاورات استعمال ہوتے ہیں مگر کمی کے ساتھ اور صرف اُستِ قِسمت جب وہ فارسی الفاظ کے ساتھ میل کھاتے ہیں۔

شہزادی کی طرح نظم میں بھی کچھ تغیر ہو چلا ہے اور موجودہ رنگ میں بجائے پُرانی لفاظی اور تصنع کے سادگی اور بے تکلفی بہت پسند کی جاتی ہے لیکن باوجود اس کے اکثر اہل ادب اب بھی فارسی الفاظ اور ترکیبوں کے دلدادہ ہیں مگر انکی کثرت اور جاوید استعمال کو جہاں تک ممکن ہو کم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ہماری رائے میں نظم اور شہزادی عبارت اور انشا پر دازی میں کوئی اصولی اور اہم اختلاف نہیں ہے۔

ادبی اُردو تقریری زبان تحریری زبان سے بالکل علیحدہ ہے۔ سادہ اور روزمرہ کے سچے جوہرِ وقت زبان پر چڑھے ہوتے ہیں تحریر میں آتے وقت فارسی الفاظ سے بدل جاتے ہیں جسکی وجہ انکی جذباتِ عظمت اور شاندار ہے۔ ابتدا میں بیشک زبان کا دائرہ بہت تنگ اور الفاظ کا ذخیرہ کم تھا اور وہ ایک متقل زبان کہلانے کی مستحق نہ تھی کیونکہ اُس وقت تک اس میں بھونڈاپن تھا۔ نہ اُس پر جلا ہوئی تھی اور نہ اتنی صلاحیت اُس میں تھی کہ

اُس کے ذریعہ سے باریک اور نازک خیالات ادا ہو سکیں یا مختلف خیالات کا اظہار اچھی طرح کیا جاسکے۔ اُنہیں ایک قسم کا لوح اور الفاظ اور بندشوں کے جذب کرنے کا مادہ ضرورت تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو الفاظ اور بندشیں اُنکو ملتی گئیں وہ سب اُس میں شامل ہوتی رہیں۔ رفتہ رفتہ زبان میں سختگی اور صفائی آتی گئی۔ دور اول کے شاعر ایسی زبان میں لکھتے تھے جس میں آدھی اردو اور آدھی فارسی ہوتی تھی رفتہ رفتہ اردو کا عنصر غالب ہو گیا اور غالب نے مغلوب کو جذب کر لیا۔ فارسی الفاظ اور غیر مانوس فارسی ترکیبیں اس طرح اردو میں گئیں کہ اب وہ ہماری زبان کا جزو بن گئیں جن کو اب ہم کمال نہیں سکتے بعض حضرات جو اس زمانہ میں سکرٹ الفاظ کے دلدادہ ہیں وہ فارسی الفاظ اور ترکیبوں کو زبان سے بھالنے کی کوشش میں ہیں۔ ہماری رائے میں یہ ایک فضول اور عبت کوشش ہے کیونکہ ہی اکثر الفاظ جو اردو کا مایہ ناز ہیں اُنکو اتنا لوچدار اور مضبوط بنائے ہوئے ہیں کہ ہر اپنی کام اُس کے ذریعہ سے نکل سکتا ہے۔

زبان اردو کے قدیم نام آدیہ انگریز مؤرخ جنھوں نے ہندوستان کے حالات لکھے ہیں اردو کو لفظ "ہندوستان" سے تعبیر کرتے تھے شروع اٹھارھویں صدی کے مصنفوں نے زبان لاطینی میں اُس کو "لنگوا ہندوستانی" کا لکھا ہے۔ اس سے بھی پہلے کے انگریز مورخین اُس کو "مورز" کہتے تھے جان گلکرسٹ نے سترہویں صدی میں سب سے پہلے لفظ "ہندوستانی" زبان اردو کے واسطے استعمال کیا اور چھٹی صدی سے یہ لفظ مروج ہو گیا۔ گوکہ اس کا پتہ بعض قدیم کتابوں میں سترہویں صدی تک ملتا ہے جبکہ سٹریول نے سب سے پہلے اس کو استعمال کیا تھا "اردوئے معلیٰ" کا معزز خطاب شاہجہاں نے اس کو دیا جب کہ زبان ادبی خدمات انجام دینے کے قابل اچھی طرح ہو گئی تھی۔

لفظ ”ریختہ“ (یعنی وہ زبان جس میں ایسی الفاظ کے ساتھ فارسی الفاظ بھی بکثرت استعمال ہوں) بعد کے مصنفین نے اس غرض سے استعمال کیا کہ ادبی زبان ریختہ اور بول چال کی زبان (اُردو) میں جو بازاروں اور جاہل فوجی سپاہیوں میں مروج تھی فرق ہو جائے۔ لفظ ریختہ زبان کے متعلق اب بہت کم استعمال ہوتا ہے ابتدا میں نظم کے واسطے ہی لفظ استعمال کیا جاتا تھا اس وجہ سے کہ شکرارواج اُس زمانے میں بہت کم تھا میرا در مصحفی تک کے زمانے میں اُردو کو بمقابلہ فارسی کے ”ہندی“ کہتے تھے جس سے لٹاک کی دیسی زبان مراد تھی۔

اُردو کا ہم الخط اُردو کے حروف تہجی بالکل وہی ہیں جو فارسی اور عربی کے ہیں۔ البتہ بعض مخصوص حروف جن سے ہندوستانی زبان کی خاص خاص آوازیں نکلا ہوتی ہیں جو فارسی اور عربی میں نہیں پائی جاتیں اضافہ کر دیے گئے ہیں مثلاً ٹ۔ ٹھ۔ ڈ۔ ڈھ۔ ڈ۔ ٹھ۔ ان حروف کے لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ت۔ د۔ ر پر یا تو چھوٹی سی (ط) بنا دیتے ہیں یا چار نقطے دیدیتے ہیں۔

نظم اُردو نظم اُردو کا عروض فارسی اور عربی کے عروض کا تابع ہے لفظ کے کسی جزو پر زور دے کے پڑھنا جس کو انگریزی میں ”مکینڈ“ کہتے ہیں اُردو میں نہیں ہے البتہ قدیم یونانی اور رومی شاعری کی طرح اُردو میں بھی حروف علت کی آوازیں کھینچ کر پڑھی جاتی ہیں اور اُس کو ”اشباع“ کہتے ہیں۔ نظم اُردو میں ردیف اور قافیہ بہت ضروری چیز ہے مروجہ بحر اُنیس ہیں جن میں سے بعض عربی کے لیے مخصوص ہیں اور بعض میں اتنی ترمیم ہو گئی ہے اور اُن کی صورت ایسی بدل گئی ہے کہ وہ بالکل نئی معلوم ہوتی ہیں۔ وزن شعر کے لیے خاص ارکان جو قدما نے مقرر کر دیے تھے اُن کی تکرار یا

تفسیر تبدیل سے مختلف بحر یا قائم ہو گئی ہیں۔ یہ الفاظ عموماً عربی افعال کے مانے ہوتے ہیں اور انہیں سے اشعار کی تقطیع کی جاتی ہے اور بڑی یا چھوٹی بحر یا انہیں سے قائم ہیں تقطیع کا طریقہ یہ ہے کہ یا تو وہی رکن بار بار دہرایا جاتا ہے مثلاً فَعُولُنْ فَعُولُنْ فَعُولُنْ ۴۔ بار بار کنوں میں رد و بدل ہوتا ہے جیسے مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن تقطیع کے خاص قواعد مقرر ہیں تحریر شدہ حروف کے ساتھ اُن حروف کا بھی شمار ہوتا ہے جو پڑھے جاتے ہیں گو تحریر میں نہیں آتے وہ حروف جو پڑھے نہیں جاتے بلکہ محض تحریر میں آتے ہیں تقطیع میں شمار نہیں کیے جاتے۔ الف مدد و شروع لفظ میں جب آتا ہے دو حروف کے برابر اور اضافت جو کھینچ کے پڑھی جائے ایک حرف کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ اُن الفاظ کو جن سے تقطیع کی جاتی ہے ”رکن“ کہتے ہیں جسکے معنی ستون کے ہیں جیسے عمارت یا خیمہ قائم ہوتا ہے۔ پورے شعر کو ”بیت“ اور نصف شعر کو ”مصرع“ کہتے ہیں مصرع کے لغوی معنی ”دروازے کا ایک پٹ“ ہیں نظم کی مختلف قسمیں جو فارسی میں متداول ہیں اور جو اردو میں اختیار کی گئی ہیں حسب ذیل ہیں۔

غزل اور قصیدہ یہ سب سے زیادہ مشہور اصناف نظم ہیں ان دونوں میں فرق صرف مضمون اور طول کا ہوتا ہے مگر بحر اور ردیف و قافیہ کی پابندی دونوں میں یکساں طور پر ہوتی ہے۔ غزل کا رنگ عموماً عاشقانہ یا صوفیانہ ہوتا ہے اور تعداد اشعار عموماً ۱۰ سے ۱۲ تک گو کہ اسکی پابندی بہت کم کی جاتی ہے قصیدہ میں عموماً کیسی مہج یا ہجو ہوتی ہے اور صحت آمیز یا فلسفیانہ رنگ کا بھی ہو سکتا ہے۔ تعداد اشعار عموماً کم از کم ۲۵۔ اور زیادہ سے زیادہ ۷۰ تک مگر اسکی بھی پابندی کون کر سکتا ہے۔

قطعہ جس کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں اور اُس کو قصیدے یا غزل کا ایک حصّہ

سمجھنا چاہیے۔ تعداد اشعار کم سے کم دو اور زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں۔ پہلے دو مصرعوں کے لیے ہم قافیہ ہونا ضروری نہیں لیکن اشعار میں قافیہ کی پابندی لازمی ہے قطعات میں اکثر بند و نصاب کے مضمون بیان کیے جاتے ہیں اور مطلب پورا ہو جاتا ہے۔ رباعی۔ اس میں دو شعر یا بیت ہوتے ہیں اسی وجہ سے انکو دو بیت بھی کہتے ہیں پہلا، دوسرا، اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں اور زیادہ تر ایک ہی سی بحر میں لکھی جاتی ہے۔ رباعی کے لیے خاص کسی مضمون کی تخصیص نہیں لیکن چوتھے مصرع کو عموماً مؤثر معنی خیز اور زور دار ہونا چاہیے۔

ثنوی۔ چھ نصف رزم و نغم، حسن و عشق، قصے اور افسانہ نگاری کے لیے مخصوص ہے۔ اس میں ہر شعر کے دونوں مصرعوں کو ہم قافیہ ہونا چاہیے۔ روایت ہو یا نہ ہو تعداد محدود نہیں ہے ثنوی کے لیے عموماً پانچ بحر میں مروج ہیں مگر بعض کے نزدیک سات ہیں، مستزاد اس کو کہتے ہیں کہ جب ہر مصرع کے آخر میں کچھ زائد لفظ بڑھائے جائیں یہ زائد لفظ اسی بحر میں ہوتے ہیں جو اصلی مصرع کے دو آخری رکنوں کی ہوتی ہے مگر ان کا قافیہ ہمیں علیحدہ بھی ہوتا ہے۔ ترجیع بند اور ترکیب بند یہ بھی نظم کی قسمیں ہیں ان میں بہت سے بند ہوتے ہیں اور ہر بند میں برابر یا بعض وقت مختلف تعداد ابیات کی ہوتی ہے جو ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ ہر بند کے آخر میں ایک بیت ہوتا ہے جو اوپر کے بند کو نیچے کے بند سے جدا کرتا ہے اور قافیہ میں بھی ان سے علیحدہ ہوتا ہے اگر ہر بند کے بعد ایک ہی بیت بار بار آئے تو ایسی نظم کو ترجیع بند کہتے ہیں ورنہ اگر بیت بدلتا جائے تو ترکیب بند کہلاتی ہے ترجیع بند یا ترکیب بند میں تمام اشعار ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں مگر جو مصرع نظم کو کہتے ہیں جس میں سب مصرع ہم قافیہ ہوں،

خمیس میں بجائے چار کے پانچ مصرع ہوتے ہیں یا پنجویں مصرع کا قافیہ بدلا ہوتا ہے اور باقی صورت برتنے کی سی ہے سدس کی شکل بھی قریب قریب ایسی ہی ہے فرق اتنا ہے کہ پہلے چار مصرع یا دو بیت ہم قافیہ اور باقی دو مصرع علیحدہ ہوتے ہیں یا ان کے علاوہ دیگر اصناف سخن سبع وغیرہ بھی اسی طرز کے ہیں۔

داسوخت - نظم کی وہ قسم ہے جس میں عاشق اپنے معشوق کی بے وفائی، ظلم و ستم، رقیب کے ساتھ بیجا محبت اور جدائی کی مصیبت و تکلیف کی شکایتیں کرتا ہے۔ گویا معشوق کو دھمکتا ہے کہ اگر اُس کا طرزِ تغافل اور ستم شکاریاں اسی طرح باقی رہیں تو پھر اُس کے ہاتھ سے عنان صبر چھوٹ جائے گی اور وہ معشوق سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

تاریخ نظم کی وہ قسم ہے جس میں کسی واقعہ کے اعداد و سنہ حروف ابجد کے حساب سے نکالے جاتے ہیں۔

فرد کسی تمام یا تمام غزل کے کسی ایک شعر کو کہہ سکتے ہیں جو کبھی مثلاً پیش کیا جاتا ہے۔ قصیدہ اور غزل کا پہلا شعر مطلع اور آخری شعر مقطع کہلاتا ہے جس میں شاعر اپنا تختہ نظم کرتا ہے۔ نظم کی کتابوں میں اکثر پہلے حمد و نعت پھر بادشاہ یا ممدوح کی تعریف اس کے بعد سببِ الیف اور کچھ فخریہ شعرا آخر میں مناجات و خاتمہ ہوتا ہے مجموعہ نظم کو کلیات کہتے ہیں جسکی ترتیب عموماً اس طور پر ہوتی ہے۔ قصائد - غزلیات - قطعات رباعیات - ثنویات - وغیرہ

نثر کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) عاری جو بالکل سادہ اور بے تکلف ہوتی ہے۔ (۲) مزخرف جس میں بھر ہوتی ہے مگر قافیہ نہیں ہوتا (۳) سجع جس میں بھر نہیں ہوتی مگر

قافیہ کی پابندی ہوتی ہے۔ تشریح کی بھی تین قسمیں ہیں (۱) متوازی (۲) مطرف (۳) متوازن۔ تشریح متوازی میں دو فقروں کے آخری الفاظ ہمزون اور ہم قافیہ ہونے چاہئیں۔ مطرف میں آخری الفاظ کے ہمزون اور ہم قافیہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ متوازن میں ہمزون ہوتے ہیں مگر ہم قافیہ نہیں ہوتے۔ یہ تمام قسمیں اب متروک ہیں کیونکہ انیسویں صدی کے آخر میں اس قسم کی مصنوعی عبارت اور قافیہ پیمائی کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ ”تذکرہ“ میں شعرا کے سوانح و حالات مختصر بیان کیے جاتے ہیں اور ”گلدستہ“ مجموعہ نظم کا نام ہے۔

باب ۲

ادب اردو کی ترقی کے ابتدائی دور

دنیا کے تمام ادبوں کی ابتدا شاعری سے ہوئی۔ شعر ایک زندہ قوت ہے جس کا وجود بشر سے بہت پیشتر معلوم ہوتا ہے۔ قافیہ پیمائی اور تک بندی انسان میں ایک فطری چیز ہے۔ انسان کو پہلے جذبات کا حس ہوتا ہے پھر وہ دماغ کو کام میں لاتا ہے اور سوچتا ہے اسی وجہ سے ارتقاے تہذیب انسانی میں جو منظر جذبات ہے تشریح مقدم ہے جو فکر دماغی کا نتیجہ ہے سب سے پہلے جب کہ فن تحریر کی ایجاد نہیں ہوئی تھی شعر ہی اپنے زبردست اثر سے دماغ میں محفوظ رہ سکتے تھے اور قوت حافظہ کی مدد سے مجمع میں سننے (انشاد) کے قابل بھی شعر ہی ہو سکتے تھے گو کہ نظام ہر نشر ہمارے اظہار خیالات اور گفتگو کا آسان ترین اور فطری ذریعہ معلوم ہوتی ہے مگر غور کرنے کے بعد اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف ضبط خیالات اور رسمی تحریریں کی واسطے موزوں ہے

نظم کا تقدم تشریح اس کے وجہ اور اس کا تعلق خاص ادب کے ساتھ

زبان اُردو کی دیوی اپنے سائے طرب سے آراستہ و پیراستہ اس طرح نمودار ہوئی کہ ادب اُردو جو اصل فارسی کا منبع اور ناقل ہے اُنکو اپنے پیشرو کی تقلید نسبتِ نشر کے نظم میں زیادہ آسان اور سبب معلوم ہوئی کیونکہ نقل و ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں نشر میں اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا کہ فی حقیقت نظم میں ہوتا ہے اور چونکہ اُردو اپنی ارتقائی منزلوں میں جبکہ اُسکا ادب ہنوز عالم طفلی میں تھا قوتِ تخیل اور اظہارِ جذبات کے واسطے ایک زبردست سرمایہ الفاظ کا اپنے پاس محفوظ رکھتی تھی لہذا جب اُسکی پیدائش کا وقت آیا تو وہ اپنے استادوں کے دماغوں سے منروا کی طرح دفعتاً کُل آئی اور اظہارِ خیالات و جذبات کے لیے چونکہ نشر عام طور پر نہیں پسند کیا جاتا ہے - لہذا مستقدمین اُردو نگار بھی اس صنف کے استعمال سے شروع میں پرہیز کرتے رہے -

سب سے پہلا اُردو شاعر
اُمیر خسرو دہلوی

زبان اُردو کی ترقی کا ابتدائی زمانہ اتنا دھندلا نظر آتا ہے کہ اُس کے خط و خال صاف طور پر نمایاں نہیں مگر اس میں کوئی

شک نہیں کہ سب سے پہلا شاعر زبان اُردو کا اس دھندلے میں جو صاف طور پر نمایاں نظر آتا ہے وہ حضرت امیر خسرو دہلوی ہیں جنکی شہرت بحیثیت ایک فارسی شاعر کے کسی تعریف و توصیف کی محتاج نہیں - ان کا لقب اسی شاعری کی مناسبت سے "طوطی ہند" ہے انھوں نے سب سے پہلے اردو الفاظ ادبی اغراض سے استعمال کیے اور سب سے پہلے اُردو میں شعر کہا۔ سب سے پہلی غزل اردو بھی امیر خسرو ہی کی طرف منسوب ہے مگر اُسکی ترکیب اس طرح ہے کہ اس کا ایک مصرع فارسی اور

۱۔ یہ یونانی دیوانی کی طرزِ اشارہ ہے جس میں مرقوم ہے کہ منو جو یونانیوں میں عقل و علم اور جنگ کی دیوی مانی جاتی تھی جو پٹیر کے سر سے نہایت کمال اور آراستہ دفعتاً پیدا ہوئی تھی -

ایک اردو ہے اور بھارسی ہے۔ اس کے علاوہ اکثر پہیلیاں، مکرمیاں۔ انملیاں۔
 دو سخنے دوسرے وغیرہ جو آج تک مشہور ہیں انکی طرف منسوب ہیں۔ بعض شعرا سے بھی ہیں
 جس میں ٹھیکہ ہندی الفاظ جو بمشکل اردو کہے جاسکتے ہیں سنسکرت بھروں میں بندھے
 ہیں، گو فارسی الفاظ بھی کہیں کہیں استعمال ہوئے ہیں حضرت امیر خسرو تیرھویں
 صدی عیسوی میں ضلع ایٹہ (مالک متحدہ آگرہ و اودھ) میں پیدا ہوئے اور متعدد شاہانِ دہلی
 مثلاً غیاث الدین بلبن، معز الدین کیقباد وغیرہ کے درباروں میں مختلف عہدوں پر
 ممتاز رہے۔ وہ مشہور صوفی و مرشد حضرت نظام الدین اولیا کے مرید و محبوب خاص
 تھے جن سے اُن کو اتنی محبت و عقیدت تھی کہ جب پیر کے انتقال کا حال سنا تو ایسی
 غم میں چند روز کے بعد ۷۳۲ھ میں سفر آخرت اختیار کیا۔ بلبن اُن کی بڑی قدر کرتا تھا
 اور اُن کے کلام کا دلدادہ تھا۔ امیر خسرو فن موسیقی میں بھی کہاں رکھتے تھے۔
 انھوں نے سب سے پہلے فارسی بجز اردو میں استعمال کیں اور اُن کی کتاب "خالق باری"
 جس کے مطلع کے ابتدائی الفاظ یہی دو لفظ "خالق" اور "باری" ہیں اب تک ہمارے
 یہاں ایک مشہور درسی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ جس کو بچے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔
 امیر خسرو کی شہرت زبان اردو کے شاعر یا ادیب ہی کی حیثیت سے نہیں ہے بلکہ وہ
 اسکے موجد و مخترع کہے جاسکتے ہیں۔ اُن کے زمانہ میں زبان میں روانی پیدا ہو چلی تھی
 مگر خستگی ہنوز نہیں آئی تھی اور تنانت الفاظ بھی بہت محدود تھی۔ مختصر یہ کہ اُن کا دور
 ابتدائی دور ہے اور گو اسوقت تک زبان میں کوئی ترقی نہیں ہوئی مگر آئندہ ترقیوں کی
 ۱۔ فارسی میں ایک نئی صنعت ایجاد کی ہے جسکا نام ترجمہ لفظ رکھا ہے یعنی فارسی لفظ کا ترجمہ اردو میں
 کر دیا ہے مثلاً "دوسو داسے" "تو کشت مارا" "کشت کے معنی اردو میں مارا کے ہیں۔
 ۲۔ مقام ولادت پٹیالی ضلع ایٹہ ہے اور سنہ ولادت ۷۳۲ھ ہے۔

داغ بیل اسی زمانہ میں پڑ گئی تھی ۔

اُردو کی پہلی کتاب کا زمانہ امیر خسرو کے زمانہ سے لیکر دکن کے شہزائے اُردو کے عہد تک بڑا
 فصل ہے مگر زبان نے گو اس طویل عرصہ میں جو تین صدیوں سے کم نہ تھا کوئی نمایاں
 ترقی نہیں کی پھر بھی یہی مدت اُس کے حقیقی نشوونما اور مضبوطی کی کہی جاسکتی ہے ۔
 زبان اب تک غیر منظم حالت میں تھی اور قوتِ لوح اور وسعت کی اُسکو سخت ضرورت
 تھی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بلند انشا پر دازی کی اغراض کے لئے اُسکے لغات
 میں معتد بہ اضافہ ہونا چاہیے تھا اسی وجہ سے مناسب فارسی الفاظ کو اُس نے اپنے
 آغوشِ محبت میں بے تکلف اور بڑے شوق سے جگہ دی جتنا چاہے ملکِ محمد جاسی (۱۵۴۰ء)
 کی پادشہ جو فارسی حروف میں تحریر ہوئی تھی کبیر (۱۵۴۰ء لغایت ۱۵۸۰ء) کے
 بھجن اور ابوالکسی داس (۱۵۸۰ء لغایت ۱۶۲۰ء) کی تصانیف میں ایسے
 الفاظ کا بخوبی پتہ چلتا ہے ۔

زیرِ عہدِ اکبری زبانِ اُردو کی توسیع کے جو لوگ شائق تھے انھیں اس زبان کو مختلف
 طبقوں کے لوگوں تک پہنچانے اور اُس کو پھیلانے کے لیے دونوں قسموں کے
 الفاظ یعنی ملکی اور غیر ملکی دونوں کے استعمال کرنے کی ضرورت تھی ۔ اس کوشش
 کی رفتارِ عہدِ اکبری میں بہت تیز تھی شہنشاہِ اکبر کا دل چاہتا تھا کہ ملک کی مفتوح
 رعایا اور باہر کے فاتح زبان کے ذریعہ سے شیر و شکر ہو جائیں جتنا چاہے وہ خود بھی کچھ
 دیسی زبان یعنی ہندی میں شعر کہتا تھا اور اُس کے اہل دربار بھی اُسکی متبع میں ہندی
 میں کہتے تھے اور ہندی شاعروں کی بڑی قدر کرتے تھے ۔ اُس کے درباری شاعر
 سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرتے تھے فیضی نے اکثر ہندی دوہرے کہے اور

عبدالرحیم خاں خانخاناں دربار اکبری کا رکن اعظم اور فارسی کا مشہور شاعر ہندی کا بھی اچھا خاصہ شاعر تھا۔ چونکہ فاتح اور مفتوح دونوں قوموں میں دلی سمجھتی اور اتحاد تھا اسوجہ سے زبانوں میں بھی اتحاد پیدا ہوا اور کئی زبانوں سے مل کر ایک نئی زبان پیدا ہو گئی۔ اسی زمانہ میں راجہ ٹوڈرمل نے ایک بڑا کام کیا جو اردو کی اشاعت کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ ملک کے مالی حسابات پہلے دیسی زبان میں لکھے جاتے تھے جن کو مسلمان افسرانِ صیغہ مال اچھی طرح نہیں سمجھتے تھے اور حساب کی جانچ پڑتال میں اُن کو مجبوراً مترجم سے مدد لینا پڑتی تھی اور اس طرح دیسی حسابیوں اور غیر ملکی حساب فصول میں ایک بُد رہتا تھا جس کو راجہ ٹوڈرمل نے اس طرح رفع کیا کہ مسلمان افسروں کو ہندی زبان اور ہندو محاسبوں کو زبان فارسی سیکھنے کی سخت تاکید کی اور اسکا حکم دیدیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان فارسی کی تعلیم حصولِ ملازمت اور ترقی کی منرلیں طے کرنے کے واسطے بہت ضروری قرار پا گئی۔ کسی قسم کی ترقی اور درباری بغیر بادشاہ کی زبان جانے ہوئے ممکن نہ تھی۔ ٹوڈرمل نے حکم دیدیا کہ صیغہ مال میں جو لوگ ملازمت کرنا چاہیں اُن کے لئے زبان فارسی کی تحصیل لازمی ہے پس جس چیز کی ابتدا اکبر کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی وہ شاہجہاں کے عہد میں درجہ تکمیل کو پہنچی اور اب زبان اس قابل ہو گئی کہ وہ ادبی اغراض میں کام آسکے۔ ترقی اور درستی اور صلاح کا کام بیشک زبان میں برابر جاری رہا بلکہ ہمارے نزدیک اب تک جاری ہے۔

قدیم شعرے دکن اور دربار
شاهان گول کنڈہ و بیجا پور

امیر خسرو کے زمانہ کو زبان اردو کی نمود کیواسطے صبح کا دہ
سمنا بجا ہے جبکی صبح صادق ہمارے نزدیک ملک دکن

کے مطلع پر مسلمان شاہان بجا پور دگول کنڈہ کے عہد میں نمودار ہوئی جس کے اسباب کو ہم نے اس کتاب میں آگے چل کے وضاحت سے لکھا ہے۔ بادشاہان مذکورہ خود صاحبان علم و فضل اور اہل علم کے بڑے قدردان تھے۔ محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۱-۱۶۱۱ء) سلطان محمد قطب شاہ (۱۶۱۱-۱۶۲۵ء) عبدالعزیز قطب شاہ (۱۶۲۵-۱۶۴۲ء) ابوالحسن قطب شاہ (۱۶۴۲-۱۶۸۲ء) جو سنہ ۱۶۸۲ء میں قید میں مرا، یہ سب خود بھی شاعر اور شاعروں کے بڑے مہربان اور قدردان تھے۔ محمد قطب شاہ عبدالعزیز قطب شاہ اور ابوالحسن زبان دکنی میں شعر کہتے تھے جو اردو ہی کی ایک شاخ ہے جس کی تفصیل آگے آئیگی ان سب نے غزل، رباعی، مثنوی، قصیدے اور مرثیے لکھے جو اس زمانہ میں موجود مگر بہت کمیاب ہیں۔ اسی طرح بجا پور کے ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰-۱۶۲۶ء) اور علی عادل شاہ اول (۱۵۵۸-۱۵۸۰ء) خود بھی قابل بادشاہ تھے اور اہل فن کے بڑے قدردان تھے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے فن موسیقی پر زبان ہندی میں ایک مشہور کتاب لکھی ہے جس کا دیباچہ زبان فارسی اُس کے دربار کے مشہور شاعر و شارح ملا نظموںی ترشیزی متوفی ۱۱۷۷ھ کا لکھا ہوا زبان فارسی کی ایک بے مثال تحریر سمجھا جاتا ہے اور آگے چل کر اکثر اردو شارحوں نے اس کی نقل کی بڑی کوشش کی ہے۔ اسی طرح علی عادل شاہ اول بھی بڑا قابل بادشاہ تھا جس کے دربار کے مشہور شاعر نصرتی کی اکثر تصانیف موجود ہیں جن میں مثنوی گلشن عشق اور علی نامہ یادہ مشہور ہیں۔ ان میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے بلکہ کثرت سے زبان دکنی کے الفاظ اور قدیم متروک الفاظ کے خلط ملط سے اکثر جگہ مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کتابوں کی وقعت اس قدر ضرور ہے کہ وہ زبان و ادب اردو کی مدیحی ترقی کی قابل قدر مثالیں ہیں۔



نواب خان خانان

دلی دکھنی سلسلہ ۱۶۶ تا ۱۷۴ء جب دلی کا تیر اقبال چمکا تو چھوٹے چھوٹے تارے جو

افق شاعری پر اسوقت ضیا فگن تھے سب باند پڑ گئے۔ دلی کو رنجیتہ کا موجد گویا اردو کا چاس

خیال کرنا چاہیے۔ اسی زمانہ میں اردو شاعری کا سنگ بنیاد باقاعدہ طور سے رکھا گیا۔

دلی کا کلام شمالی ہند کے تمام نظم نگاروں کے واسطے نمونہ بن گیا اور اُسی کو دیکھ کر اور

اپنے سامنے رکھ کر اسوقت کے تمام شعراء دہلی نے ترقی کرنا شروع کی۔ دلی کا کلام

نہایت صاف سادہ فصیح اور سچیدہ استعارات اور دوراز کار تشبیہوں سے پاک ہے۔

تصوف کا بھی رنگ جھلکتا ہے۔ فارسی الفاظ اور خیالات کی کثرت ضرور ہے مگر غلبہ

نہیں ہے۔ ہندی لفظ بھی فارسی الفاظ کے ساتھ جا بجا ملے جلتے ہیں جو بعد کو متروک ہو گئے۔

دیوان دلی کی اشاعت کے ساتھ ہی مرکز شاعری گویا دکھن سے

منتقل ہو کر دہلی میں آگیا اس وجہ سے کہ یہاں کے لوگوں کو ایک

قدیم شعراء دہلی
حاتم، آبرو، آرزو

خاص دلچسپی شعر و شاعری کے ساتھ پیدا ہو گئی۔ سیکڑوں قبیع دلی کے پیدا ہو گئے جو

اُن کے کلام کی بڑی قدر کرتے تھے اور اُسی طرز پر کہتے تھے۔ اب اردو شاعری

فارسی کے دوش بدوش ترقی کرنے لگی گویا اسکی مد مقابل اور حریف بن گئی گویا ابھی تک

اُس میں وہ کمنگی اور پستی نہیں پیدا ہوئی تھی جس سے اسکی حریف زبان فارسی کو

کوئی اندیشہ ہوتا۔ نظم اردو اب تک ایک کھلونا سمجھی جاتی تھی جس کو لوگ پسند ضرور

کرتے تھے اور فارسی کلام کی محنت و دماغ سوزی کے بعد اُسی سے دل بہلاتے تھے

سلطنت مغلیہ کو بہت کمزور ہو گئی تھی مگر اب تک اُس میں جان باقی تھی اور درباری

۱۷ چار زبان انگریزی کا بہت قدیم شاعر سلسلہ ۱۷۴ تا ۱۸۴ء اسکی تصنیف کنٹریریٹس (کنٹریری

کے قصے) کی زبان قدیم ہے اور مروجہ زبان سے بہت مختلف ہے۔

زبان اب تک فارسی ہی تھی۔ اردو کے کمزور اور نوزخیز بچہ کو اتنی قوت کہاں تھی کہ فارسی کے شہر و ریختہ کا پہلو ان سے مقابلہ کر سکے۔ اس لیے اُسے مقابلہ کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ قدیم شعرے اردو سب بڑے بڑے فارسی داں اور فارسی کے کہنہ مشق شاعر تھے۔

ولی کے متبع ظہور الدین حاتم (۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۲ء ع) خان آرزو (سنہ ۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۲ء ع) ناجی ہضمون، آبرو اور بہت سے اور شعرا پیدا ہوئے جن کو اردو شاعری کے آباؤ اجداد سمجھنا چاہیئے۔ ان کا کلام تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا بہت صاف و سادہ اور تصنع و تکلف سے بہت کچھ پاک و صاف ہے۔ نشست الفاظ میں بہت زور طبع دکھایا گیا ہے اور فارسی الفاظ اور ترکیبیں بکثرت ملتی ہیں۔ ولی کے یہاں جو ہندی الفاظ تھے وہ ان لوگوں کے یہاں نہیں یا بہت کم ہیں ان کی جگہ فارسی لفظوں نے لے لی ہے۔ فارسی بھرس اردو نظم میں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور بہت خوبی سے بندھی ہیں۔ ان کے زور طبیعت اور قدرت کلام میں کسی کو کلام نہیں اور انکی مشاقی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور نقش اول سے نقش ثانی یقیناً بہتر ہے گو فارسیت کا رنگ اور تصنع بہ نسبت دکنی شعرا کے ان میں زیادہ ہے مقامی رنگ گو بالکل غائب نہیں مگر رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے۔ ہندی دوسروں کا بھی کچھ اثر اشعار میں پایا جاتا ہے۔ قدیم شعرے دہلی کا کلام اردو کی تدریجی ترقیوں کی منزل میں ایک نمایاں نشان ہے۔

یہ زمانہ اردو شاعری کی سب سے بڑی ترقی کا زمانہ ہے۔ اس میں محبوبہ شاعری مع اپنی تمام کرشمہ سازیوں کے زینت الفاظ اور جدت خیال سے آراستہ دیراستہ ہو کر

میر و نود کا زمانہ
ہندوستان کی ترقیاں
زبان اور شاعری میں
جہلا حین

دنیا کے سامنے نمودار ہوئی۔ یہ میر اور سودا کا زمانہ ہے جو اردو شاعری کے رکن کین اور استاد عظیم مانے جاتے ہیں یہ دونوں بزرگ اپنے حسن و احلاوت زبان قدرت الفاظ اور نزاکت زبان کی وجہ سے اپنے تمام ہم عصر و نیز مابقی حریفوں پر گویے سبقت لیکئے ان کے مبارک زمانہ میں غزل اور قصیدہ دونوں معراج ترقی پر پہنچ گئے۔

مرزا مظہر جانجاناں، میر درد، سوز، قائم، یقین، بتیان، ہدایت، قدرت اور ضیا ان کے ہم عصر ہیں جو سب علاوہ اردو کے نظم فارسی کے بھی استاد تھے۔ چونکہ ان سب پر فارسی کا رنگ غالب تھا لہذا وہ قدرتاہندی الفاظ پر فارسی کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ وہی ان کو اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اسی زمانہ میں زبان بہت کچھ ایسے الفاظ اور بندشوں سے پاک ہو گئی جو ولی اور ان کے ہم عصر شعرائے دہلی کے یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف زبان کو صاف کیا بلکہ بہت سے خوبصورت اور مناسب فارسی لفظ اور محاورے خواہ کنبسہ یا بصورت ترجمہ زبان میں داخل کر لیے۔ ان کا کلام اردو اور فارسی کی آمیزش سے گنگا جمنی ہے حسن و عشق کے معاملات جس خوبصورتی اور موثر طریقہ سے ان حضرات نے باندھے اس سے پیشتر کسی نے نہیں باندھے تھے۔ ان کے کلام کو دیکھ کے تعجب ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ فارسی لغات کا خزانہ انھوں نے کھنگال ڈالا جس میں صد ہا جواہر ریزے منتخب کر کے زبان میں داخل کئے گئے ہیں گل و بلبل اور قمری شمشاد کے عشق کے افسانے جس کو فارسی شعرا مدت سے باندھتے چلے آتے تھے اب اردو میں بھی دخل ہوا اور جدید خیالات اور نئی ترکیبوں کے ساتھ بڑے حسن و خوبی سے برتے گئے۔ فن شعر میں بھی ایک نمایاں ترقی ہوئی نقائص اور معائب

سے کلام پاک ہونے لگا۔ غزلیں ایسی بھروں میں کسی جانے لگیں جو اس سے پیشتر مروج نہ تھیں اور کانوں کو بہت اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے اور صنائع بدائع جن کو اب تک کلام میں جگہ نہیں ملی تھی بکثرت استعمال ہونے لگے مگر اسی حد تک کہ اُن سے شعر کے حسن اور ادائے مطلب میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ وہ کلام میں گھل مل جاتے تھے اور بدنام نہیں معلوم ہوتے تھے۔ نئے نئے اصناف شعر بھی اسی عہد میں رائج ہوئے مثلاً واسوخت، مرثیہ، مخمس، ہجو، مثلث، مرقع، رسترد وغیرہ اور یہ سب فارسی سے لئے گئے اور خوب خوب کہے گئے۔ جو اصناف سخن پیشتر سے مروج تھے اُن میں بھی ترقی ہوئی صنعت ایہام جو قدما میں جاری تھی اس زمانہ میں کم ہو گئی گو بعد کو پھر رائج ہو گئی۔ میر کو یہ صنعت کم پسند تھی مگر اگر بلا تکلف اور کسی دوسری صنعت کے ساتھ بندھتی اور کلام کا حسن بڑھتا تو مضائقہ بھی نہ تھا۔ مظهر اور اُن کے اکثر معاصرین اور متبعین نے بھی اس معاملہ میں میر ہی کا مسلک اختیار کیا۔ اس زمانہ کے شعرا بعض صنائع سخن کے محض موجد ہی نہ تھے بلکہ انھوں نے اُس میں بڑی بڑی ترقیاں کیں اور آئندہ ترقی کی راہ بتا گئے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کی ایجادیں فارسی ترکیبوں سے ماخوذ تھیں اور انھیں پرہیزی تھیں۔ اس عہد میں زبان اردو نے علی العموم زبردست ترقی کی اُس میں قوت، وسعت اور رونج با حسن وجہ پیدا ہوا اور نئے نئے لفظ اور محاورے اور ترکیبیں زبان میں داخل ہوئیں جن سے آئندہ ترقی کا دروازہ کھل گیا۔

انشاء اور محفلی کا دور
اُن کی خدمات زبان
اور شاعری کے ساتھ

ایک دوسرا دور بعد کے شعراء دہلی سے شروع ہوا۔
جس میں اثر، میسر، جرات، انشاء، مصحفی، راسخ، بقا،
حسرت، رنگین اور فراق مشہور زمانہ ہوئے۔ اس زمانہ میں بھی

وہی پرانی ترکیب ہندی الفاظ خارج کرنے اور اُن کی جگہ فارسی اور عربی الفاظ داخل
کرنے کی برابر جاری رہی۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ہندی اور بھاشا لفظ جو
خارج کیے گئے بدنام اور ثقیل ضرور تھے اور نظم کی صنف نازک اُن کی متحمل نہیں ہوتی
تھی مگر اُن کے یک قلم نکال دیے جانے سے دہلی زبان کی ترقیوں کو سخت نقصان پہنچا
ایسے جواہر ریزے جو سنسکرت اور پراکرت کے خزانوں سے زبان اردو کے قبضے میں
ایک عرصہ دراز سے چلے آتے تھے فارسیت کے غلبہ سے اب خارج ہو گئے۔

قدیم اردو شاعر سنسکرت اور ہندی سے ناواقف تھے اسی لیے انھوں نے ہندی
الفاظ کی کوئی قدر نہیں کی اُن کو زبان سے خارج کر دیا اور اُن کی جگہ پر فارسی اور
عربی الفاظ رکھ دیے۔ اس کا ردوائی کو وہ لوگ اور نیز اُس زمانے کے مسلمان
مصنفین جو فارسی کا ذوق رکھتے تھے ”زبان کی اصلاح اور پختگی“ سے تعبیر کرتے ہیں
اسی عہد میں ایک اور ترقی یہ بھی ہوئی کہ پرانے متردکات جو میر و سودا کے زمانہ میں
باقی رہ گئے تھے نکال دیے گئے اور اُن کی جگہ جدید خوبصورت لفظ اور ترکیبیں داخل
کی گئیں۔ ہندی اور فارسی محاورے اور ترکیبیں باہم ملا دی گئیں۔ طرز عبارت میں
کچھ فرق نہیں ہوا۔ مضامین میں بھی کوئی خاص جدت نہیں ہوئی البتہ ابتذال اور
شہوت پرستی کا رنگ پیدا ہو گیا۔ اس دور کی شاعری اُس زمانہ کی اخلاقی حالت اور
دہلی کی بگڑی ہوئی سوسائٹی کا پورا نمونہ ہے۔ معشوق کے حسن ظاہری کی تو عام طور پر

تعریف کی جاتی تھی مگر بعض شعرا نے کھلم کھلا ایک اور رنگ اختیار کیا جس کو اصطلاح میں ”معاملات“ یا ”معاملہ بندی“ کہتے ہیں۔ جرأت، انشا اور نگین اس خاص رنگ کے بادشاہ تھے۔

ریختی [یہ حسن پرستی اور شہوت پرستی بعد کو ایک خاص طرز میں ظاہر ہوئی جس کا نام ”ریختی“ یعنی عورتوں کی زبان رکھا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ ریختی سے نکلا ہے اور اسکا مؤنث ہے عورتوں کی زبان بالذات کوئی مذموم بات نہیں مگر خرابی یہ ہوئی کہ اس قسم کے اشعار جذبات نفسانی براہِ نیگتہ کرنے کی غرض سے کہے جاتے تھے اور اسی وجہ سے وہ نہایت فحش اور منحرب اخلاق اور شرفا کے کانوں تک کونا گوار ہوتے تھے۔ ایسی کل چیزیں جو عورتوں کے پڑھانے کے قابل نہیں ہوتیں غیر مہذب اور فحش ہوتی ہیں۔ عورتوں کی تعلیمی ترقی ہر ملک اور ہر قوم میں زبان کی اصلاح اور ترقی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہوتی ہے۔ ریختی کی مثالیں پُرانے شعرا کے کلام میں بھی کمیں کمیں ملتی ہیں مثلاً مولانا ہاشمی سیالپوری اور سید محمد قادری معصرونی کے کلام میں بھی اس رنگ کا کچھ پتہ چلتا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو یہ بالکل متروک ہو گیا تھا۔ اس کو دوبارہ سعادت یار خان نگین اور آن کے دوست انشا نے زندہ کیا۔ سب سے بڑے ریختی گو میرزا علی خان متخلص بہ جان صاحب سمجھے جاتے ہیں انشا مختلف طرز کے شعر کہتے تھے۔ کبھی ریختی بھی کہہ جاتے تھے مگر جان صاحب نے اس کو ایک فن قرار دیا اور سوائے اس رنگ کے کچھ نہیں کہا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ صنف شاعری زمانہ کے ساتھ بہت کچھ بدل گئی ہے

اور اب تقریباً متروک ہے ۔

اس دور کے شاعر غزل کے استاد تھے اور شنوی اور قصیدہ بھی خوب کہتے تھے۔ لوگوں میں شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ بزم مشاعرہ اکثر گرم ہوتی تھی۔ اس عہد کے اکثر شاعر اپنا وطن مالون دہلی چھوڑ کر ادھر ادھر نکل گئے اکثر لکھنؤ پہنچے جہاں دربار شاہی میں شعر کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ اس زمانہ کی مشہور یادگاریں میر حسن و خواجہ میر درد کے بھائی میر اثر کی شنوایاں ہیں۔ علی الخصوص میر حسن کی مشہور آفاق شنوی ”سحرالبیان“ جسکی روانی، سادگی، شیرینی اور نگینی کا جواب نہیں۔

اس دور کی ابتدا شاہ نصیر ذوق، غالب، مومن اور ظفر سے ہوتی ہے۔ اس میں وہ رہے سے ہندی

غالب و رذوق کا زمانہ
اور اس کے خصوصیات

الفاظ بھی جو قدمائے باقی رہ گئے تھے نکل گئے اور فارسیت کو اور ترقی ہوئی۔ غالب و مومن فارسی میں بھی خوب کہتے تھے۔ چنانچہ ان کی اکثر تصانیف اس زبان میں موجود ہیں۔ غالب ایسی وجہ ہوگی کہ اس زمانہ میں زبان میں فارسی الفاظ کی بھرمار ہو گئی جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوا۔ شاہ نصیر کو دور سابق (صحفی و نشا) اور دور حال (ذوق و غالب) کے بیچ کی کڑی سمجھنا چاہیے۔ یہی زمانہ نظیر اکبر آبادی کا بھی ہے جن کا رنگ سب سے علیحدہ ہے اور ادب اردو میں ایک نہایت نمایاں اور خاص رنگ ہے۔ غالب و مومن کے یہاں ہم کو ان مشکل اور دقیق فارسی ترکیبوں اور محاوروں کی ابتدا ملتی ہے جو استادوں کے قلم سے تو بڑے نہیں معلوم ہوتے مگر معمولی قابلیت والوں کے ہاتھ میں وہ بالکل غارت ہو جاتے ہیں۔ اچھا ہوا کہ اس قسم کی زبان جس پر فارسی کا اتنا رنگ غالب تھا زیادہ رواج پذیر نہیں ہوئی۔

ورنہ پھر اردو اور فارسی میں فرق ہی کیا رہ جاتا۔ اسی فارشیت کے غلبہ کی وجہ سے
 مؤمن اور غالب کا اکثر کلام سمجھ میں نہیں آتا۔ ذوق گو بلحاظ شاعری غالب سے
 ذہانت و طباعی میں کم ہیں مگر زبان پر ان کی قدرتِ مُسلم ہے اور محاورات و امثال
 میں تو ضرب المثل ہیں۔ ان کا کلام نہایت صاف اور بہت مزے کا ہوتا ہے۔
 ظفر کے یہاں کچھ خاص خوبیاں ہیں وہ غالب و ذوق کے ہم پلہ نہیں بلکہ ان سے
 اصلاح لیتے تھے۔ ظفر اور ذوق کے کلام میں بہت مشابہت ہے جس سے بعض
 لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ یہ ظفر کا کلام ہی نہیں بلکہ ان کے اُستاد ذوق کا کہا ہوا
 ہے۔ اس زمانے میں غزل اور قصیدے میں بڑی ترقی ہوئی۔ چنانچہ ذوق
 اور غالب کی غزلیں اور قصیدے اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے سنگدلانہ
 زمیوں میں اشعار کہے گئے اور جدید اور مشکل بحر جس جواب تک رائج نہیں ہوئی تھیں
 استعمال ہونے لگیں شعر اپنا کمال فن دکھانے کے لیے مشکل قافیے اور روغیں بڑھتے
 اور غیر معمولی بحریں اختیار کرتے اور ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتے
 تھے۔ مگر اس قسم کا کلام حقیقی شاعری کی لطافت و معنویت سے خالی ہوتا تھا۔
 الغرض اس زمانہ میں ہندی الفاظ زبان سے اکثر نکل گئے۔ فارسی ترکیبیں کثرت
 داخل ہو گئیں خیالات میں حدت اور مضامین میں ندرت پیدا ہوئی جس کا بہترین
 نمونہ غالب کے کلام کو سمجھنا چاہیے۔

تاسخ اور آتش کے زمانہ سے لکھنؤ میں ایک

جدید دور شروع ہوتا ہے۔ دہلی پر جب زوال آیا تو
 وہاں کے اکثر اہل کمال نے لکھنؤ کا رخ کیا اور

شعراے لکھنؤ کا نیا دور اور اس کے

خصوصیات تاسخ اور آتش کا زمانہ۔

ان کی خدمات زبان کے ساتھ۔

یہاں اگر پناہ لی۔ دہلی کی شمع سخن سے لکھنو کی شاعری کا چراغ جلا اور وہاں بھی کثرت شاعر پیدا ہونے لگے۔ ناسخ اور آتش کا تعلق بالکل لکھنؤ سے تھا وہاں کے شاہی دیوان میں شاعری کی اتنی عزت اور ایسی قدر ہوئی کہ اس سے پیشتر کبھی نہ ہوئی تھی۔ لوگ شاعری کے پیچھے دیوانے ہو رہے تھے۔ مشاعرے گھر گھر ہوا کرتے تھے۔ قدرت دانوں کی تعریفیں دل بڑھاتی اور نئی اُننگیں پیدا کرتی تھیں۔ مشاعرے ماہوار و ہفتہ وار کیا بلکہ اکثر روزمرہ ہوتے تھے۔ اسی کثرت اور مشافی نے شاعری کو درجہ کمال تک پہنچا دیا اور اُس میں طرح طرح کی جذبتیں اور رنگینیاں پیدا کی۔ مختلف اصناف سخن پر قدرت حاصل ہو گئی۔ شاعری کے ساتھ ظاہر ہے کہ زبان بھی صاف ہوتی گئی اور ترقی کرتی گئی۔ جو ہندی الفاظ پیشتر کی تراش خراش اور قطع و برید سے بچ گئے تھے وہ بھی اب نکل گئے اور اُن کی جگہ فارسی و عربی الفاظ نے لی۔ اسی طرح پرانی بندشیں اور ترکیبیں بھی جو زبانوں پر جاری تھیں ترک کی گئیں۔

ناسخ کو یہ فخر حاصل ہے کہ تکمیل زبان کے آخری مدارج اُنہی کے مبارک ہاتھوں سے پورے ہوئے واقعی اُن کو متروکات کا "ناسخ" کہنا بالکل سجا ہے۔ اُن کے زمانہ سے ایک نیاز نگ شاعری شروع ہوا جسکی خصوصیات یہ ہیں۔ الفاظ شان دار۔ عبارت میں تعقید و تکلف۔ صنائع و بدائع اور دوز کا تشبیہوں اور استعاروں کی کثرت فضول مبالغے۔ فرسودہ تشبیہیں۔ جذبات اور اثر کی بہت کمی۔ مگر باوجود اسکے اس رنگ کے بھی بعض شعر مزے کے ہوتے ہیں۔ یہ رنگ بھی اپنے زمانہ میں بہت مقبول ہوا۔ علاوہ ناسخ کے تاجر، وزیر، صبا، اسحر، رشک وغیرہ اپنے زمانہ کے

اُستاد مانے جاتے تھے قبولیت کا سہل اسی رنگ کے سر برابر دم یہاں تک کہ رنگ
ایک مرتبہ پھر بدلا اور اشعار میں بے تکلفی بسادگی - نیچر کی جھلک سوز و گداز
اور اثر پسند کیے جانے لگے۔

ناسخ ہی کے ہم عصر آتش بھی تھے جن کا رنگ بالکل علیحدہ تھا۔ وہ غزل کے
مسلم الثبوت اُستاد مانے جاتے ہیں۔ ہر چند اُن کی درسی تعلیم اور وسعت معلومات
ناسخ سے کم کسی جاتی ہے مگر اُن کا کلام ناسخ کے کلام سے کہیں زیادہ شیریں اور
مؤثر ہے۔ وہ اپنے خاص رنگ یعنی شستگی الفاظ جستی بندش، بندی مضامین
میں قدام کے متبع کہے جاسکتے ہیں۔ اُن کے اشعار سوز و گداز اور اثر سے ملبو ہیں۔
بحاظ علمیت وہ ناسخ سے کم ہوں مگر شاید یہ کمی علم ہی زیادتی اثر و کیفیت کا باعث
ہے۔ صفائی زبان پر اُن کا بھی بہت بڑا احسان ہے مگر حق یہ ہے کہ اس معاملہ
میں ہم کو ناسخ کا زیادہ ممنون احسان ہونا چاہیے۔ ان دونوں پہلوانان سخن کے
شاگردوں اور پیروں میں بھی اکثر زور آزمائیاں اور مقابلے ہوا کرتے تھے جو ترقی
زبان کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوئے۔

مرثیہ ایک قدیم صنف شاعری ہے۔ اُردو مرثیہ گوئی کو
مرثیہ اور اُن کا تعلق
زبان کے ساتھ۔
قدما نے نظر احسان سے نہیں دیکھا اس وجہ سے وہ
عرصہ تک ایک کس مہر سی کی حالت میں پڑی رہی یہاں تک کہ میر خلیق اور اُن کے
لائق فرزند میر انیس اور انیس کے معاصر دبیر کے زمانہ میں وہ از سر نو زندہ ہوئی
اور اُن کے بعد سے تو مرثیہ کو بکثرت پیدا ہونے لگے۔ مرثیہ بہت پرانی چیز ہے
عربوں میں یہ پیشتر سے موجود تھی وہاں سے یہ اہل فارس میں آئی اور فارسی سے

اُردو میں اُس نے رولج پایا۔ قدیم شعراے دکن نے بھی اُردو میں مرثیے کہے مگر اُن کی زبان کچی اور ابتدائی حالت میں تھی۔ مرثیہ گوئی کی اصل ترقی لکھنؤ میں ہوئی جہاں اُس میں ایک نئی روح چھوئی گئی۔ لکھنؤ کے اکثر اُمراء و وسائیعہ مذہب رکھتے تھے جو اعتقاداً شہدائے کربلا کے مصائب پر گریہ و بکا اور اظہارِ غم و الم کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ زمانہ عزا داری اب بجائے دس دن (عشرہ) کے چالیس دن (اربعین) ہو گیا تھا اور اس زمانہ میں پورا لکھنؤ رنج و غم اور حسرت و ماتم کی ایک زندہ تصویر بن جاتا تھا۔ اِس غم و الم اور حسرت و ماتم کے اظہار کا بہترین ذریعہ شعرا کے پُر زور اور درواغیز مراثنی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ اسی وجہ سے فنِ مرثیہ گوئی نے جو ترقی اس دور میں کی وہ اس سے پیشتر کبھی نہیں ہوئی تھی خود بادشاہ بھی مرثیے کہتے تھے اور مجلسوں میں اپنا پُر اثر اور رقت خیز کلام سناتے تھے۔ فلکِ مرثیہ گوئی کے سب سے درخشاں تارے میزائیس اور مرزا دبیر تھے جن کا کلام نہایت مؤثر اور قدرتی شاعری کا پر تو ہے۔ ان دونوں بزرگواروں کا کلام اُردو شاعری کے سرکا تاج ہے۔ اُنکی چند خصوصیتیں یہ ہیں۔ کلام میں اخلاقی تعلیم کوٹ کوٹ کے بھری ہے۔ ناسخ اور اُن کے زمانہ کی بد اخلاقیوں سے بالکل پاک ہے۔ قصائد کی سی بیکار لفاظی اور درواز کار مبالغے اُس میں مطلق نہیں۔ مناظر قدرت جس کو سماں باندھنا کہتے ہیں اور جذبات قلبی کے سچے فوٹو مؤثر الفاظ میں کھینچے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ نگاری کو اُردو شاعری کا ایک نیا دور سمجھنا چاہیے۔

معزولی سلطان عالم و اجد علی شاہ اور زمانہ غدر کے بعد اکثر نامور شاعر مثل امیر داغ، جلال اور تسلیم وغیرہ کے اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر

باز کے شعرا
آئینہ دارغ
کا زمانہ۔

اسلامی ریاستوں میں چلے گئے بعض نے رامپور اور حیدرآباد کا مہج کیا۔ اس وجہ سے کہ وہ زبان اردو کے قدرداں سمجھے جاتے تھے۔ اس زمانہ کے شعرا کا کوئی خاص رنگ نہیں بلکہ قدامت کے متبع تھے۔ دربار میں اور روسا کے گھروں پر مشاعرے بکثرت ہوتے تھے غزلیں، رباعیاں، قصیدے، قطعات اس زمانہ میں اکثر کہے گئے۔ امیر مینائی اپنے پیش روؤں کے مقلد تھے اُن کا کلام ناسخ کے زمانہ کی اکثر بے اعتدالیوں سے پاک ہے۔ داغ کے یہاں طباعی بیباختگی اور روزمرہ بہت ہے مگر متانت اور بلندی مضامین کم ہے جلال کا کوئی خاص رنگ نہیں مگر وہ فن عروض کے استاد اور صحت الفاظ کا بہت خیال رکھتے تھے اور قدامت کے پیرو تھے۔ اس دور میں اردو شاعری نے بحیثیت شاعری کوئی نمایاں ترقی نہیں کی۔

جدید رنگ -	زمانہ حال میں نظم اردو نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔
آزاد اور حالی کا زمانہ اُن کی خدمات زبان کے ساتھ۔	اس کے رکن رکن آزاد، سرور، اور حالی ہیں۔ نئے مضامین اور نیا طرز انشا زبان میں داخل ہوا۔ قومی

نظمیں، خیالی نظمیں اور بیانیہ نظمیں لکھی گئیں جو پرانی قیود اور قواعد کی جکڑ بند یوں سے آزاد ہیں۔ نظم کا دائرہ وسیع ہوا میدان شاعری کو دست دی گئی۔ سادگی، بے تکلفی اثر اور جذبات اس رنگ کی نظموں کے خاص جوہر ہیں۔ نئی چیزوں پر طبع آزمائی کی جانے لگی۔ ہمارے نزدیک اس تغیر کا بڑا سبب انگریزی تعلیم اور انگریزی علم ادب کا شوق نقل ہے۔ حالی قومی شاعر ہیں۔ آزاد نیچل شاعری کے موجد ہیں۔ سرور کا تخیل اور طرز بیان بہت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ اکبر کا رنگ خاص ہے جس کو اُنھوں نے شروع کیا اور اُنہی پر ختم ہو گیا۔ اقبال کے کلام میں فلسفہ

اور پچھلے مضامین کا لطف ہے۔ حسرت میں زمانہ حال کی بہت سی خوبیاں ہیں اس جدید دور میں غزل گوئی میں بھی بہت کچھ اصلاح ہوئی۔ مختصر یہ کہ اس رنگ نے نظم اردو کو پرانی قیدوں اور پابندیوں سے بہت کچھ آزاد کر دیا اور آئندہ ترقی کے واسطے نئے راستے کھول دیے۔

نثر اردو
فورٹ ولیم کالج کلکتہ

جدید نثر اردو کی ابتدا انیسویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے اس نئی تعمیر کا سنگ بنیاد ڈاکٹر جان گلکٹر سٹ کے اہتمام سے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں رکھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اُس وقت فورٹ ولیم کالج کے افسر اعلیٰ تھے۔ انھوں نے شمالی ہند سے قابل قابل لوگوں کو اس غرض سے اپنے یہاں جمع کیا تھا کہ انگریزی افسروں کے واسطے جو تازہ وارد ہوتے تھے ایسی کتابیں تیار کی جائیں جن سے انتظام ملکی اور ہندوستانیوں کے ساتھ میل جول اور ربط و ضبط بڑھانے میں آسانی ہو۔ اس مشہور کالج کے قیام کے پیشتر بھی نثر اردو کی بعض کتابیں موجود تھیں مگر وہ مذہبی رنگ کی یا قصے کہانیاں تھیں اور کچی اور اور ابتدائی زبان میں فارسی سے ترجمہ کی گئی تھیں۔ عبارت کی درستی اور قواعد صرف و نحو کا ان میں کچھ خیال نہ تھا۔ ”دہ مجلس“ اور ”نوطر مضع“ اسی عہد کی یادگاریں ہیں۔ وہ خاص لوگ جو انگریزوں کے واسطے سنسکرت اور فارسی سے ترجمہ کرنے یا نئی کتابیں سادہ اور بے تکلف زبان میں لکھنے کی غرض سے جمع کئے گئے تھے سید محمد حیدر بخش حیدری، بہادر علی حسینی، میرامن، غنیظ الدین احمد، منظر علی ولا، اکرام علی، اور مرزا علی لطف وغیرہ ہیں جنکی تصانیف نہایت صاف سادہ اور دلکش عبارت میں ہیں۔ ان کتابوں سے اکثر ثقیل اور غیر مانوس فارسی

اور منسکرت الفاظ نکال دیے گئے ہیں یہی کتابیں نصف صدی تک نشر اردو کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی تھیں اور زمانہ حال کی جو ترقیاں زبان میں ہو رہی ہیں ان کا بھی زیادہ تر دار و مدار انھیں پر ہے ”ڈاکٹر گلکرسٹ ہی کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ دیسی زبان (اردو) سرکاری زبان ہو گئی اور یہ استعداد اس کو حاصل ہو گئی کہ بجائے مروجہ فارسی کے وہ عدالتوں اور گورنمنٹ کی زبان قرار دی جائے؛ ڈاکٹر گلکرسٹ کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اردو لغات اور صرف و نحو کی کتابیں بھی ان کے زمانہ میں تیار ہوئیں۔

نثر مقفے سادہ نثر کے مقابلہ میں جسکی ابتدا کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج سے رجب علی بیگ سردار ہوئی تھی وہ نثر مقفے ہے جو ظہوری اور سیدل کی فارسی نثر کے طرز پر لکھی جاتی تھی۔ اسکی عبارت مقفے اور جملے بالکل نپے تلے ہوتے تھے جنمائع بالغ استعاروں اور تشبیہوں سے بہت کچھ کام لیا جاتا تھا۔ جملے طولانی پیچیدہ اور قافیہ بندی کی رعایت کی وجہ سے اکثر جگہ مطلب سمجھنے میں دقت واقع ہوتی تھی اسی وجہ سے پوری عبارت کے پڑھنے اور مطلب سمجھنے میں بھی دقت ہوتی تھی۔ عرصہ تک اسی قسم کی نگین اور مقفے عبارت لکھنو اور دہلی میں مقبول عام رہی خطوط تک اسی قسم کی مریض اور با تکلف عبارت میں لکھے جاتے تھے کتابوں کے دیباچے، مہتدیں، تقریظیں، خواہ بزبان فارسی یا اردو سب اسی قسم کی رنگین عبارت میں لکھنے کا دستور تھا۔ اس عبارت کے بہترین نمونے مرزا رجب علی بیگ سردار کے یہاں ملتے ہیں۔ ان کی مشہور تصنیف ”فسانہ عجائب“ جس طرح اپنی انشا پر دازی میں مشہور ہے اسی طرح لکھنو کی اس زمانہ کی معاشرت کی بھی ہو ہو تصویر ہے۔

دریائے لطافت

آئنا اور قتل کی ”دریائے لطافت“ کو گویا فارسی اور اردو کا مجموعہ کہنا چاہیے۔ وہ ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ وہ نہ صرف صرف و نحو اردو کی پہلی کتاب ہے جو ایک ہندوستانی کے قلم سے نکلی ہے بلکہ اُس میں یہ بھی خوبی ہے کہ مختلف قسم کی زبانیں اور بولیاں جو اُس وقت ملک میں رائج تھیں اور جن کا اثر زبان اردو پر پڑ رہا تھا اور نیز وہ محاورے اور اصطلاحیں جو بعض مخصوص طبقوں اور جماعتوں میں مروج تھیں ان سب کے نمونے بھی اُس میں کثرت موجود ہیں۔

اردوئے معلیٰ اور عود ہندی

ایک بہت بڑی شخصیت شراردو کی تاریخ میں مرزا غالب کی ہے ان کی مشہور تصانیف ”اردوئے معلیٰ“ اور ”عود ہندی“ ایک دلچسپ مجموعہ اردو خطوط کا ہیں جسکی عبارت نہایت سادہ سلیس بے تکلف اور نہایت دلآویز ہے ان میں ایک خاص قسم کی پُر لطف ظرافت اور عبارت میں شگفتگی ہے دونوں کتابیں شراردو کی سادگی و سلاست کا بہترین نمونہ ہیں مصنف کے ذاتی حالات کی طرف جا بجا جو اشارے ہیں اُن کو پڑھ کر دل بہت مخطوط ہوتا ہو غالب کے طرز نے اردو کی شہکاری میں ایک انقلاب عظیم پیدا کیا اور ایک نئی روح پھونکی جس کا اثر زمانہ مابعد کے شہکاروں پر بھی بہت کچھ پڑا غالب بھی اپنے زمانہ کے مروجہ رنگ سے نہ بچ سکے کیونکہ انکی اکثر تحریروں میں وہی پُرانے رنگ کی مُقفے اور مستحج عبارت پائی جاتی ہے جو اُن کے زمانہ میں عام تھی۔

عیسائی پادریوں کی

عیسائی پادریوں کی تصانیف نے بھی شراردو پر ایک خاص اثر ڈالا۔ ان لوگوں نے عموماً اور خاص کر اُن پادریوں نے جو سیرم پور واقع بنگال میں قیام گزیرے تھے بائبل کا ترجمہ ملک کی دیسی زبانوں میں

کر کے انکی اشاعت عوام الناس میں بکثرت کی۔ اس کے علاوہ صد ہا مذہبی چھوٹے چھوٹے رسالے اور کتابیں اردو میں شائع کیں۔ ہمارا خیال ہے کہ قوسی زبان میں اخبار نویسی کی ابتدا بھی اسی زمانہ سے ہوئی۔ سب سے قدیم ترجمے بائبل کے جو ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۰ء تک شائع ہوئے وہ زیادہ تر اردو ہی میں ہوئے تھے۔

نشر اردو کی ترقی کا اڑیس عہد اسی صدی عیسوی کے نصف آخر کو سمجھنا چاہیے جس میں سرسید اور اُن کی جماعت کے لوگوں نے اردو نشر نگاری میں ایک خاص رنگ پیدا کیا۔ اس زمانے میں جب قدر مذہبی مناظرے خواہ مسلمانوں کے آپس میں یا مسلمانوں اور عیسائیوں اور ہندوؤں کے درمیان ہوتے تھے اُن سے بھی اردو کو ترقی اور ایک خاص قسم کی تقویت حاصل ہوئی۔ ایسی جملہ کتابیں اور رسائل علی العموم نہایت سادہ اور پر زور عبارت میں لکھے جاتے تھے اور گو کہ وہ ایک عارضی اور وقتی اثر اور دلچسپی رکھتے تھے مگر پھر بھی اُس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اردو نشر نویسی میں سادگی اور پختگی پیدا ہو گئی۔ مولوی سید احمد شہید بریلوی کی مذہبی مہلا ص ۱۲۸ لغات سلسلہ اور وہ مختلف دینی مسائل جن کو وہ ملک میں پھیلانا چاہتے تھے اُن کے اوپر متعدد رسالے اور کتابیں لکھی گئیں۔ قرآن مجید کا سب سے پہلا ترجمہ زبان اردو میں سلسلہ ۴ میں شائع ہوا۔ جو مہلا ص ۱۲۸ کہ مولوی سید احمد شہید بریلوی کے زمانہ سے شروع ہوئی تھیں اُن کی ترقی نمایاں طور پر سرسید احمد خاں کے ہاتھوں ہوئی جنکی متعدد تصانیف سے جو تعلیمی، اخلاقی، معاشرتی، فلسفیانہ مذہبی، سیاسی، جریدہ نگاری، غرض کہ ہر صنف و قسم کی تحریر سے تعلق رکھتی تھیں

سرسید اور اُن کے رفقاء کا کار

کا اڑیس عہد

زبان اُردو کو اتنا فائدہ پہونچا اور وہ اس قدر مال مال ہوئی کہ اور کسی چیز سے نہیں ہوئی تھی۔ سرسید مرحوم ایک ایسے طرز تحریر کے موجد ہوئے جو جامع تھا اور جمیع قسام مذکورہ بالا کے مجبوری کام آسکتا تھا۔ اُن کی تمام تصانیف اور علی الخصوص وہ بیش بہا مضامین جو تہذیب الاخلاق اور اُس وقت کے دیگر مشہور جرائد میں چھپے ہیں ہزار ہا تعریف و توصیف کے مستحق ہیں۔

سرسید مرحوم کے رفقاءے کار نے، جن کو زبان اُردو کا نور تن سمجھنا چاہیئے زبان اور ادب اُردو کے ساتھ احسانِ عظیم کئے اور بیش بہا خدمتیں انجام دیں۔ مولانا حالی کی قومی نظمیں اور نقیہ مضامین علامہ شبلی اور مولوی ذکاء اللہ کی تاریخی تصانیف، مولوی چراغ علی اور نواب محسن الملک کے اخلاقی اور پولیٹیکل مضامین و لکچر، مولانا نذیر احمد کے اخلاقی ناول اور دیگر تصانیف جنہیں ادب آموزی کے ساتھ ایک لطیف ظرافت کا بھی رنگ ہے، ان سب سے نہ صرف لائقِ مہتممین کے اہل قوم و مذہب ہی کو فائدہ پہونچا بلکہ وہ تمام ملک کے واسطے کیساں طور پر مفید ثابت ہوئے۔ اسی طرح مولانا محمد حسین آزاد کی جاوید نگاری جس کا ان سب سے جُدا اور ایک خاص رنگ ہے، درحقیقت نہایت ہی لطیف اور دل آویز ہے۔ ان کی تصانیف کو خزانہ اُردو کے بیش بہا جواہر سمجھنا چاہیئے۔

انیسویں صدی کے نصفِ آخر سے انگریزی تعلیم کا نمایاں اثر زبان اُردو پر پڑنے لگا۔ اس سے ادب اُردو کی وسعت اور معلومات اور بڑھ گئی اور مختلف اصنافِ سخن اُس میں داخل ہونے لگے۔ چھاپہ کی وجہ سے اشاعتِ کتب کو بہت مدد ملی قدیم و جدید

تعلیمِ انگریزی کا اثر اُردو پر۔
چھاپہ کی ابتدا۔ اُردو
انگریزی زبان قرار دی گئی۔

ہر قسم کی کتابیں چھپنے لگیں اور اُن کی نشر و اشاعت آسان ہو گئی۔ سلسلہ ۱۶ میں بجائے فارسی کے اُردو سرکاری دفاتر کی زبان قرار دی گئی جس سے اُس کا پایہ اعتبار اور بلند ہوا اور عدالتی دفاتر کی نئی نئی اصطلاحات کے شمول سے اُس کے لغات و معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔

نادل نویسی کی ابتدا افسانہ نویسی، تاریخی ناول اور اخبار و جرائد کو تعلیم انگریزی کا لازمی نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ یہ مضمون ضروری اور اہم ہے چنانچہ اسکی تفصیل آئندہ ابواب میں مناسب مقامات پر لکھی ہے۔ زمانہ حال میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد جس نے زبان اُردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا ہے اور مولانا شبلی مرحوم کے دارالعلوم ندوہ کا قیام اس امر کی بہن مثالیں ہیں کہ زبان کس قدر ترقی کر رہی ہے۔ نیز یہ کہ اُردو کو ہندوستان کی ادبی زبان بننے کا فخر احسن وجوہ حاصل ہو گیا۔

اُردو ڈراما یہ بالکل نئی اور مقامی چیز ہے اس وجہ سے کہ فارسی میں اسکا وجود ہی نہ تھا۔ اس صنف جدید کا ابھی بچپن ہے۔ ہنوز اس کو نختگی اور کمال حاصل نہیں ہوا۔ ہمارے ملکی ڈراما نگاروں میں ابھی نختہ کاری نہیں آئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے کرکٹیر نامکمل اُن کے پلاٹ اکثر ناقص اور ناتمام ہوتے ہیں اُن کی تحریروں میں صرف لفاظی اور سطحی باتیں ہوتی ہیں ٹیکسیلیہ اور دیگر یورپی جادو نگاروں کے ڈراما البتہ ترجمہ ہو گئے ہیں اور ہندوستانی اسٹیج کے حسب حال اُن میں کچھ تغیر و تبدل بھی ہو گیا ہے۔ اُردو ڈراما نویسی کے سامنے ایک درخشاں مستقبل ضرور ہے۔

باب ۳

اُردو شاعری کی عام خصوصیات

اُردو شاعری فارسی
شاعری کی تقلید ہے

اُردو شاعری ویسی پیداوار نہیں ہے وہ فارسی سے پیدا ہوئی اور فارسی کے نمونے اُس کے پیش نظر تھے۔ فارسی علم

عروض نے جو عربوں کی ایجاد تھا اُردو شاعری پر بہت بڑا اثر کیا۔ اسی طرح فارسی بجز اور قواعد عروض میں بھی فارسی کا اتباع کیا گیا۔ رفتہ رفتہ یہ غیر ملکی پودھا جڑ پکڑ گیا اور اس کو اس ملک کی آب و ہوا اس آئی۔ بحروں کے علاوہ

شعر اے اُردو نے فارسی ہی تشبیہیں اور وہی مضامین اخذ کیے اور یہ سب چیزیں

الاحاظ ملکی ضروریات کے اور بلا امتیاز اس کے کہ اُردو زبان کی اصل کیا تھی اور

اس میں استعداد کس قدر تھی داخل زبان ہو گئیں اور ہمارے شعر اے اُردو کا مایہ ناز

بن گئیں۔ اس تتبع میں فائدہ اور نقصان دونوں مضمر تھے۔ نقصان یہ کہ اُردو

شاعری کو وہ مدارج ارتقا طے کرنا نہیں پڑے جنکی رفتار تو ضرور سست تھی مگر

ایک نئی زبان کی ترقی کے واسطے وہ از بس ضروری تھے مثال کے لیے انگریزی

شاعری کو دیکھو کہ جس نے یہ منازل ارتقا بتدریج طے کر کے معراج ترقی حاصل کی۔

اُردو میں اسی کمی کی وجہ سے وہی پُرانی فرسودہ باتیں اور وہی مضامین جو فارسی

شاعری میں کثرت پائے جاتے تھے اور جن کو کوئی تعلق اس ملک سے نہ تھا

دفعتاً سنگ بنیاد بن گئے شروع میں تو اکثر اُردو اشعار فارسی اشعار کا لفظی ترجمہ

ہوتے تھے اور اب بھی ہمارے شعرا صاحب حافظ نظیری اور بیدل وغیرہ کی تقلید کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔

تقلید کے بُرے نتائج اس حریصانہ جذب اور کورانہ تقلید سے یہ بُرا نتیجہ پیدا ہوا کہ اردو شاعری سے صلیت مفقود ہو گئی اور بسا اوقات ابتذال پیدا ہو گیا۔ سرزمین ہندوستان ان مضامین سے نا آشنا ہے۔ یلی مجنوں کا عشق، شیریں فرہاد کی محبت، رستم و اسفندیار کی بہادری، مانی اور ہزار کی نقاشی، جیموں و سچوں کی طغیانی، میتون اور الوند کی بلندی وغیرہ یا جانوڑوں میں بلبل، دختوں میں سنبل وغیرہ سب غیر ملکی چیزیں ہیں جنکو یہاں کے لوگوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ اسی تتبع کی وجہ سے شاعری اردو شاعری محض نقالی ہے۔

واقعیت سے ہٹ کر صرف نقالی رہ گئی، ہندوستانی بادشاہوں کے عدل کی جب تعریف کی جاتی ہے تو ان کا مقابلہ نوشیرواں سے کیا جاتا ہے سخاوت میں وہ حاتم بتائے جاتے ہیں۔ حرماء نصیب عاشقوں کی مثال کے واسطے سوائے مجنوں کے کوئی نہیں ملتا اور انکی معشوقہ ہمیشہ لیلی ہوتی ہے ایک حسین آدمی کی تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ وہ یوسف کی طرح ماہ کنعاں ہو اور معشوق کے سخت احکام کی تعمیل کرنے والا کوہن خطاب پاتا ہے۔ قد کی تشبیہ کے لئے سرو و شمشاد آنکھوں کے واسطے رگس زلف کے لئے سنبل۔ بیرحمی اور سفاکی کے لئے ترک گُل کی عاشق بلبل، سرو کی دلدادہ فاختہ، باد صبا کی اٹھیلیاں، چاند کو دیکھ کر کتاں کا پارہ پارہ ہونا، سب فارسی سرمایہ اردو کے واسطے مخصوص بلکہ اُسکی ملک ہو گیا اور ان کی وہ بھرا رہی کہ شاعری اپنی صلیت کو بھول گئی اُس کو اپنے ملک کی تشبیہات سے نفرت پیدا ہو گئی اور اپنے وطن کی حسین سے حسین چیزوں کی

قدر کرنے کا احساس تک اُس سے فنا ہو گیا۔ مثلاً ہندوستان کی بہار اسکا موسم بہات ہے مگر افسوس کے ساتھ کہتا پڑتا ہے کہ ہماری اُردو شاعری میں اُس کے صحیح اور دلکش مناظر کا کہیں تپا نہیں ایسے ہی ہندوستان کا موسم گرا، موسم بہار، ہمالیہ کی سرفراک برف زار چوٹیاں گنگا اور جمنا کے خوبصورت گھاٹ، ان کا ہمارے قدیم شاعروں نے کوئی خیال نہیں کیا۔ زبان بھاشا کی خوبصورتی اور شیرینی کو دوسری زبان کی دلفریبیوں پر قربان کر دیا۔ مختصر یہ کہ اُردو شاعری نے فارسی شاعری کی تقلید آنکھ بند کر کے جزئیات تک میں کی سرچا پس لائل اسی تقلید کی نسبت لکھتے ہیں "اُردو شاعری فارسی شاعری کا کامل اتباع کرتی ہے اور وہی مضمون بار بار دہراتی ہے جن کو خود اساتذہ فارس نے بار بار پا مال کیا ہے۔ مضامین اور الفاظ دونوں ابتداء سے آج تک جیسے تھے ویسے ہیں۔ اُن میں کوئی جدت یا اصیلت نہیں پائی جاتی۔ اور اسی کمی کی وجہ سے اُن کو ایک نہایت اہم نام نشان اور مستقل علم معنی و بیان کی بنیاد رکھنا پڑی۔ جبکہ کوئی چیز جو کسی شاعر کو کہنا ہو اور اُس کو اُس سے پیشتر سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کہہ گئے ہوں تو اظاہر ہے کہ اُس کے واسطے یہ بہت ضروری ہے کہ اُس چیز کے کہنے کا اپنے واسطے ایک خاص اسلوب مقرر کرے۔ پس یہی اسلوب یا بالفاظ دیگر علم معنی و بیان نہ کہ جذبات شعر اُردو شاعری کا مایہ ناز ہو گئے۔ اسی وجہ سے نہایت دلچسپ دلچسپ مبالغے نہیں بنائے اور ترکیبیں، صنعت تضاد اور اسی قبیل سے دیگر صنائع و بدائع اُردو شاعری کی روح رواں بن گئیں۔

اُردو شاعری صرف یہی رہ گئی اُردو شاعری میں نہ صرف تکلفات ظاہری ہی کی

اکثر ہے بلکہ وہ محض رسمی اور لکیری فقیر ہے۔ وہی ہتھارے وہی تشبیہیں جو بار بار لکھی جا چکی ہیں پھر دہرائی جاتی ہیں۔ آئینہ فطرت کے مشاہدہ کا ایسے کہیں تپہ نہیں اسی وجہ سے مضامین میں کسی قسم کی تازگی نہیں اور نہ کوئی نیا پیام ہوتا ہے۔ پُرانے شعرا کی شکوئیں مضامین کی تلاش میں بار بار ڈھونڈھی جاتی ہیں۔ اور مقررہ قواعد کے بموجب پھر انھیں باتوں کا اعادہ کیا جاتا ہے شاعری محض نئی نئی چیز ہو گئی نہ کبھی کم ہوتی ہے نہ زیادہ۔ ہر شاعر اپنے کلام میں اُسی آموختہ کوڑتا ہے اور اسی وجہ سے اردو شاعری کا بازار تصنیفات اور بزمِ گلی سے بھرا ہوا ہے۔

قافیہ پائی فارسی کی تتبع میں اردو میں بھی ایک قافیہ بعض اوقات دو قافیوں کی پابندی لازمی ہے۔ قافیہ گو کہ کافوں کو اچھا معلوم ہوتا ہے مگر اظہار خیال میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مدت ہوئی کہ یورپ کی شاعری اس بارگراں سے سبکدوشی حاصل کر کے آزاد ہو گئی۔ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ قافیہ پہلے ذہن میں آتا ہے جو مضمون کی طرف رہبری کرتا ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ مضمون خود قافیہ پیدا کرے غرض کہ انھیں قیود سے اردو شعرا کے تمام دواہیں بھرے پڑے ہیں اب اس بزمِ گلی کا احساس خود ہمارے شعرا کو پیدا ہو چلا ہے۔

خلافِ نچر مضامین علاوہ نقائص مذکورہ بالا کے سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اردو شاعری میں اکثر مضامین فطرت کے خلاف باندھے جاتے ہیں مثلاً مرد کا عشق مرد کے ساتھ جس کے لیے کوئی معقول وجہ یا عذر بھی نہیں پیش کیا جاتا۔ ایک لڑکے کو معشوق تصور کر کے اُس کے گھونگر والے بال اُسکی زلفیں اُسکا سنہرے خط اُسکی بھینگیں میں اُس کے خدو خال اس لطف سے بیان کیے جاتے ہیں

کہ جسکی تہذیب حال کبھی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس رنگ کو ہمارے قدیم شعراے اُردو
 نے شروع کیا جس کا تتبع آج تک کیا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں تہذیب اور
 متانت کے اعتبار سے بھاشا کو اُردو پر اس معاملہ میں فوقیت حاصل ہے
 بھاشا میں شاعر اپنے کلام میں عشق اس طرح ظاہر کرتا ہے جیسے ایک عورت اپنے شوہر
 یا عاشق کے فراق میں گریہ کرتی ہے یا جیسے اُس کا خیالی معشوق اُس کے جذبات
 کا احترام نہیں کرتا برخلاف اس کے ہمارے اُردو شعرا بسا اوقات عشق کا اظہار
 اپنے ہمجنس کے لیے کرتے ہیں اسی اختلاف کی وجہ سے بھاشا کی شاعری حقیقی اور
 موافق فطرت ہے اور دل میں گھر کرتی ہے اور خیالات میں بلندی اور رفعت پیدا
 کرتی ہے۔ بخلاف اسکے اُردو کے اکثر عاشقانہ اشعار میں زنان بازی کے
 حسن و دلفریبی کا ذکر ہوتا ہے جس سے خیالات میں سستی اور عبارت میں ابتذال
 پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی ایک چیز اس امر کے ثبوت کے
 لیے کافی ہے کہ اُردو شاعری فارسی کی سلسلہ پر دس ہے یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری
 اور زبان کو پھسکنے اور ترقی کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہ وجہ بھی ہوئی کہ لوگوں نے
 اُردو شاعری کو محض تفلن طبع سمجھا اور جب کبھی فارسی شعر گوئی سے اُن کو فرصت ہوئی
 تو تھوڑا سا وقت دل بہلانے کے لئے اس میں بھی صرف کر دیا۔ بڑی قباحت ہے
 ہوئی کہ وہ لوگ عموماً ہندی اور سنسکرت سے ناواقف تھے جس کی وجہ سے وہ
 ان دونوں زبانوں کی برکتوں سے نفع نہوسکے۔ فارسی چونکہ سرکاری اور درباری
 زبان تھی اور اُس وقت کے بڑے بڑے رئیس و امیر عالم و فاضل اور شاعر سب
 اسی کو پسند کرتے تھے اور یہی زبان رائج تھی لہذا قدرتی طور پر ہندی الفاظ

اُس کے مقابلہ میں اُن کو بھدے اور اجنبی معلوم ہوئے اور اسی وجہ سے وہ ترک کر دیے گئے۔ ہمارے ذہن میں فارسی تتبع کی بڑی وجہیں صرف دو ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ زبان فارسی کا بازار اُس وقت گرم تھا دوسرے یہ کہ وہ لوگ سنسکرت اور بھاشا سے ناواقف تھے انھیں وجہ سے زمانہ قدیم میں اُردو کی بھیدی تھی۔ چنانچہ متقدمین اساتذہ اُردو سب فارسی گو شاعر تھے یہاں تک کہ مرزا غالب بھی فارسی کے مقابلہ میں اپنے اُردو کلام کو بیچ سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں ۷

فارسی میں تابینی نقشہائے نگ رنگ بگذرا ز مجموعہ اُردو کہ ہر رنگ من است

گزشتہ زمانہ کے عربوں میں یہ دستور تھا کہ عاشق اپنی معشوقہ کو نبت العرم کے خطاب سے یاد کرتا تھا اور اپنے عشقیہ اشعار اُسکی شان میں نظم کرتا تھا اور بالآخر اُسی کے ساتھ اس کا عقد ہو جاتا تھا۔ اس رسم کا ایک نکتہ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اوقات معشوقہ کا نام ظاہر ہو جانے سے جھگڑا اور فساد برپا ہوا اور کبھی کشت بخون تک نوبت پہنچی، لہذا اس خرابی کے دور کرنے کے لیے محض فرضی اور خیالی عورتوں کے نام تجویز کئے گئے۔ پردہ کے رواج نے عورتوں کے کھلم کھلا نام لینے کو ممنوع قرار دیا۔ جسکی وجہ سے یا تو اُن کے واسطے کسی مشہور معشوقہ سلف کا نام لیا جانے لگا اور یا وہ صیغہ تذکیر کے ساتھ یاد کی جانے لگیں۔ فارسی میں صیغہ تذکیر و تانیث میں فرق نہ تھا اسی وجہ سے شاید یہ صورت ابتری ظاہر ہوئی۔ یہ عذر بار د

فارسی میں جہاں تذکیر و تانیث کا کوئی امتیاز نہیں ہے مقبول ہو سکتا ہے۔ مگر اُردو میں جس میں کہ افعال و اسماء سب میں تذکیر و تانیث کی تفریق موجود ہے اور پورا لحاظ رکھا جاتا ہے یہ عذر لنگ قبول نہیں کیا جاسکتا۔ دُنیا کے

ہر ملک کا ادب وہاں کی سوسائٹی کے اخلاق کا آئینہ ہوتا ہے یعنی سوسائٹی کی اخلاقی خرابیاں کسی ملک کے ادب سے بخوبی ظاہر ہوتی ہیں۔ ان سب باتوں کے جواب میں یہ عذر پیش کیا جاسکتا ہے کہ اگرچہ بظاہر تذکیر کے صیغے استعمال کیے جاتے ہیں مگر حقیقتاً ان سے مراد وہی فرقہ انات ہوتا ہے جس میں حقیقی معشوقہ بننے کی قابلیت موجود ہے مگر سچ پوچھیے تو ہندوئی و اخلاقی نقطہ نظر سے یہ جواب بھی ٹھیک نہیں ہے اس لیے کہ پردہ کی وجہ سے شریف عورتیں سامنے نہیں آسکتیں پس لامحالہ جس حُسن کا ذکر ہوگا وہ بازاری عورتوں کا شمار کیا جائے گا

اصنافِ سخن اردو شاعری میں اصنافِ ذیل پر طبع آزمائی کی جاتی ہے :-
غزل، قصیدہ، رباعی، قطع، مثنوی، مرثیہ، وغیرہ۔

غزل اور سکارنگ ان میں سب سے مشہور صنفِ شاعری غزل ہے جس کا رنگ زیادہ تر عاشقانہ یا صوفیانہ ہوتا ہے۔ اساتذہ متقدمین کے کلام میں تصوف کا رنگ سب رنگوں پر غالب تھا قرونِ وسطیٰ میں مذہبی بیداری کی ایک لہر تمام ہندوستان میں دوڑ گئی تھی۔ بھگتی کا عقیدہ اور رام و کرشن کے روایات جنھوں نے ادبِ ہندی پر بہت بڑا اثر ڈالا اسی مذہبی بیداری کے علامات ہیں۔

تصوف تمام قدیمی شعراے اردو صوفی تھے اور ان بزرگوں کی اولاد میں تھے جو مجاہدینِ اسلام کی فوجوں کے ہمراہ خود آئے تھے یا اس زمانہ کے چند روز بعد ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ان میں مذاقِ تصوف ان کے اسلاف سے ورثاً چلا آتا تھا۔ اور لوگ ان کی تعظیم و تکریم کرتے تھے چنانچہ اردو کا سب سے پہلا شاعر دلی دکنی ایک بہت بڑا صوفی تھا اور دلی کے ایک مشہور بزرگ شاہ سعد اللہ گلشن کے

حلقہٴ ارادت میں داخل تھا۔ اسی طرح شاہ مبارک ابرو شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں تھے جو ہندوستان میں ایک بہت مقدس بزرگ گزرے ہیں۔ شیخ شرف الدین مضمون گوا ایک سپاہی پیشہ شخص تھے مگر آخر میں دنیا چھوڑ کر فقیر ہو گئے تھے شاہ حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں بھی مشہور صوفیائے کرام سے گزرے ہیں خواجہ میر درد جو کہ خواجہ بہار الدین نقشبند کی اولاد میں تھے علاوہ شاعری کے دولت نقر سے بھی مالا مال تھے۔ ان کے علاوہ مشہور پہلوانان سخن میر۔ سودا اور اسی طرح ان کے معصروں کے کلام میں بھی تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ فارسی شاعری چونکہ مضامین تصوف سے ملوث تھی لہذا یہ بہت قدرتی بات تھی کہ اردو نے منجملہ اور چیزوں کے اس میں بھی انکی پیروی کی تقدس یا سنت نفس ترک ماسوی اسد دنیاوی نمائش اور ریاکاری سے اجتناب، تعمیش اور حصول دولت و اقتدار سے بیزاری کہ ان چیزوں کے لیے اہل دنیا ساعی رہتے ہیں۔ عزت گزینی اور اپنی ہستی کو عبادتِ آسمی کے لیے وقف کر دینا۔ ان کو تصوف کا بنیادی اصول سمجھنا چاہیے شعرے صوفیہ حسن مجازی کی تعریف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اسکو حسن حقیقی کا زینہ سمجھتے ہیں اور عشق حقیقی کا ذوق لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنے کے واسطے انھیں ظاہری نقوش و علامات سے کام لیتے ہیں۔ اُن کا مقولہ ہے ستاب از عشق رو گر چہ مجازی است کہ آن بہر حقیقت کار سازی است ایران اور ہندوستان کی عاشقانہ شاعری میں روحانی اور شہوانی جذبات کی عجیب آمیزش انھیں نکات تصوف کی بدولت ہے۔

عاشقانہ نثر میں عاشقانہ رنگ کی بنیاد تصوف اور اہل دربار کی حدیث پرستی

اور فارسی شاعری کے متبع پر پڑی۔ غزل اُردو شاعری کی جان ہے انگریزی میں اگر اُس کے مقابل کوئی چیز ہے تو سنانٹ ہے۔ غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا ہیں۔ غزل میں چند اشعار ہوتے ہیں اور ہر شعر بہ اعتبار مطلب کے مکمل ہوتا ہے یہی چیز غزل اور سنانٹ میں ماہِ الامتیاز ہے یعنی غزل میں ہر شعر بجائے خود مکمل اور ایک دوسرے سے بے نیاز ہوتا ہے اور سنانٹ میں سب اشعار مربوط و مسلسل کسی ایک مضمون پر ہوتے ہیں۔ اصناف شاعری میں سب سے سہل اور اسی وجہ سے سب سے زیادہ برتے جانے والی چیز غزل ہے۔ غزل میں تسلسل کا لحاظ کم رکھا جاتا ہے۔ مضامین غزل محدود ہیں اور اسی وجہ سے شاعر کو ایک شعر اپنی پوری قوت صرف کر کے طبع آزمائی کا موقع ملتا ہے اگرچہ بلحاظ مضامین تنوع بھی ہوتا ہے جن مضامین میں غزلیں عام طور پر کہی جاتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔ عاشق کی حرام نصیبی، وصل کی جستجو، معشوق کے جور و جفا، گل و بلبل کے راز و نیاز، وحشت و جنون، عشق کی بلا انگیزی، معشوق کے سراپا کی تعریف، باغ و بہار کے مناظر، بادِ گلغام کی تعریف و طلب، رقیبوں کے شکوے، عاشقانہ شاعری دنیا کی تمام ادبی تصانیف میں موجود ہے۔ کیونکہ عشق ایک فطرتی جذبہ ہے جس کا اظہار ہر زبان سے ہوتا ہے تصوف حسن مجازی کو عشق حقیقی کی اول منزل سمجھتا ہے جیسا کہ چند سطور پیشتر بیان کیا گیا۔

اُردو شاعری اہل دربار میں ہمیشہ مرغوب اور ہر دل عزیز رہی اور اُمرا اور رؤسا کے درباروں میں اُسکی ترقی اور نشوونما ہوئی۔ دلی، حیدرآباد، لکھنؤ، اور رامپور شاعری کے مرکز رہے ہیں اور یہیں کے فرمانرواؤں نے

اہل دربار کا اثر
اُردو شاعری پر

اُردو شاعری کو پروان چڑھایا۔ مگر درباری اثر شاعری پر دو حیثیت یعنی نفع اور نقصان کی صورت میں مترتب ہوا۔ نفع اس معنی میں کہ شعر کو اُن کی جانکاہی کے صلہ میں انعام و اکرام خوب دیا گیا اور اُن کی محنت ٹھکانے لگی۔ نقصان اس صورت میں کہ مضامین شاعری محدود ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ شعرا کو رئیس و اہل دربار کے مذاق کی پیروی کرنا پڑی۔ دلی اور لکھنؤ کی سلطنت کا میٹ جانا اُردو شاعری کے زوال یا کم از کم اُس کے ضعف کا خاص باعث ہوا۔ عاشقانہ رنگ فرمانروایان اودھ کے دربار میں خصوصیت کے ساتھ مقبول تھا اس وجہ سے کہ اُن لوگوں کے دلوں میں خود تعیش کے جذبات موجود تھے۔ اِس لئے کوئی تعجب نہیں اگر اُس زمانہ کے شاعروں کے کلام کا بیشتر حصہ اِس رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ قصائد اور غزل دونوں بکثرت کہے جاتے تھے ایک میں کسی نواب یا وزیر کی تعریف تو دوسرے میں کسی صلی یا فرضی معشوق کا ذکر ہوتا تھا۔ چونکہ اُن لوگوں کو خوش کر کے شعر کو اپنی کار برآری کرنا ہوتی تھی اسی لئے وہ ان دونوں رنگوں میں مشغول رہتے تھے۔ انگریزی شاعر اسکاٹ کے یہ دونوں شعرا سی حالت کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں۔

اپنے رنگ عیش عشرت کے لیے سب بادشاہ و شاعرانِ نکتہ رس سے لیتے ہیں محنتِ لدم
تھوڑی سی تنخواہ کے لالچ میں تکرے میں مرجھ جاتا لیکن اپنی روح کو کر لیتے ہیں پابندِ دام

۱۷ سر رابرٹ اسکاٹ گزشتہ صدی کا نہایت نامور انگریزی شاعر اور ناولست گزرا ہے اُس کے اکثر ناول اور نظمیں داخل درس ہیں اور اُن کا ترجمہ بھی مختلف زبانوں میں ہو گیا ہے۔ اسکی نچول باریز شاعری زبان انگریزی میں بہت پسند کی جاتی ہے۔ اُس کے وطن صلی یعنی اسکاٹ لینڈ میں اسکی اقدار شہرت اور قدر ہے کہ وہاں کے بڑے بڑے شہروں میں اُس کے کسی ناول یا کیرئیر کے نام سے کوئی چیز بطور یادگار منسوب ہے ۱۲

اسی درباری و استگی اور ہم آہنگی کا یہ بڑا نتیجہ ہوا کہ ہماری اردو شاعری سے وہ تنوع
پیرکاری، وسعت اور جدت مفقود ہو گئی جو دنیا کے شاعری کی جان ہے۔

اردو شاعری کا دائرہ محدود ہے قدرتی مناظر جو شعر مغرب
کے دلوں میں عجب عجب انگلیں پیدا کرتے ہیں ہمارے

دہائی اور قدرتی مناظر کی
اردو شاعری میں کمی ہے

اردو شاعروں پر وہ اثر نہیں کرتے۔ اردو میں برائنٹ، ہاٹس اور ٹامسن کی طرح کے
شعرا کا پتہ نہیں اور نہ ورد سورتھ کا ایسا کوئی نیچر کا عاشق ہے۔ اردو شاعری میں

برائنٹ امریکہ کا شاعر اور اخبار نویس تھا اکثر مشہور اخباروں اور رسالوں کا ایڈیٹر، ہومر کی الیڈ اور اسی کا
منظوم ترجمہ اس نے کیا ہے۔

ہاٹسیر بھی امریکن شاعر اور جدید نگار ہے اسکا بڑا کام یہ ہے کہ اسے اپنی پرزد نظموں کے ذریعہ سے اسناد
علامی میں بڑی مدد کی چنانچہ اس کو دواں اسناد علامی کا ملک الشعراء کہتے ہیں۔

ٹامسن (سائنس لغات مشاعر) انگلستان کا خوشگونیچل شاعر ہے اسکا مجموعہ نظم موسوم بہ نینرس (موسم)
مشہور ہے جس میں زمستان تابستان بہار خزاں چاروں فصلوں کا حال نہایت شاعرانہ پیرایہ میں لکھا ہے چند ڈرامے

بھی لکھے مگر وہ مقبول نہیں ہوئے ایک دیگر تصانیف میں ول برٹانیا اور کسٹل آف انگلینڈ بہت مشہور ہیں۔
ولیم ورد سورتھ (سائنس لغات مشاعر) نہایت مقبول انگریزی شاعر ہے اس کا ان لوگوں میں شمار ہے جنکو

زبان انگریزی میں "لیک پوسٹ" یعنی جھیل کے شعر کہتے ہیں اس وجہ سے کہ ورد سورتھ اور اسکی بہن ڈاروتھی
اور کولرج وغیرہ ایک ایسے مقام پر رہتے تھے جس کا نام گرامیر ہے اور چھاپے نام کی ایک جھیل کے پاس

واقع ہے۔ ورد سورتھ کو انقلاب فرانس کے زمانہ میں آزادی پسند جماعت سے جو "جانرلڈسٹ" کہلاتے تھے
بہت ہمدردی تھی مگر جب پولن نے اصول جمہوریت کو توڑ کر جبر و استبداد شروع کیا تو اسکی ہمدردی اس

جماعت سے بالکل منقطع ہو گئی۔ ورد سورتھ کی تصانیف کثرت سے ہیں منجملہ جن کے ایک فلسفیانہ نظم رکلوں
(راہب) بڑی اعلیٰ پایہ کی ہے اس کے علاوہ ایک سکرشن (گلگشت) اوڈ ٹو ڈیوٹی (غزل) فیض انسانی (

ڈو آئیڈی ٹیمپیشن آف مارٹلی (راز کی یاد) وغیرہ حال کی انگریزی شاعری میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔
کولرج کا قول ہے کہ ورد سورتھ نے خاص کام یہ کیا کہ دنیا کی معمولی چیزوں کو ایک فلسفی شاعر کی نظر سے

دیکھا اور ان میں وہ باتیں پیدا کیں جو شخص کو نہیں سوچتیں دوسری بڑی خصوصیت اسکی یہ ہے کہ
وہ عالم نباتات میں ایک روح کا قائل تھا اور ان کو ذی حیات تصور کرتا تھا۔ ورد سورتھ علاوہ شاعری
کے فن نقیہ کا بھی استاد تھا۔ سودے کے بعد خطاب ملک الشعراء کی اسی کو ملا تھا۔

اصلی قدرتی مناظر مثلاً بہتا ہوا دریا لہلہاتے کھیت۔ گاتی ہوئی چڑیاں۔ اس قسم کی چیزوں کا ذکر بہت کم ہوتا ہے گوکہ مصنوعی اور فرضی مناظر باغوں چشموں بلبل و گل آفری و سرو وغیرہ کا ذکر کثرت سے ہے۔ شعراے اردو کے سرو میں صرف ایک ہی تار ہے اور وہی بار بار بجایا جاتا ہے یہاں تک کہ بے سزا ہو جاتا ہے۔ سمندر کی نظمیں آزادی کے راگ احسن کی صحیح تصویریں اردو شاعری میں نہیں ہیں۔ وہی پامال مضامین جن کو بادشاہ اور اہل دربار پسند کرتے تھے مثلاً شراب و کباب، رقیبوں کے شکوہ و شکایات، عاشقوں کی حیران نصیبی، فلک کے جور و ستم، تقدیر کی گردشیں بکثرت ہیں۔ البتہ تھوڑے دنوں سے جب سے کہ انگریزی تہذیب و تعلیم کا چرچا پھیلا نیچرل مضامین پر بھی طبع آزمائی کی جانے لگی اور ان کی مقبولیت سے اُمید ہے کہ اس صنف جدید میں بہت جلد ترقی ہوگی۔

اردو شاعری حزن و یاس کی شاعری ہے۔
کُل مشرقی شاعری جس میں اردو کی شاعری بھی داخل ہے۔
حزن و یاس کے مضامین سے مملو ہے ایک یورپین نقاد

کی رائے ہے کہ اہل مشرق اپنی طبیعت کی اُفتاد سے افسردہ خاطر پراسرار سوچ بچار میں دقت گزارنے والے اور تقدیر کے قائل واقع ہوئے ہیں۔ دُنیا کے عمل میں وہ بہت کم حصہ لیتے ہیں انکی زندگی میں زیادہ تر حزن و یاس درماندگی و بچپاری زندگی سے تنفر دنیا کی بے ثباتی کا ہر دم تصور دنیاوی ترقی اور مرفہ اعلیٰ سے اجتناب شامل ہے اسی دُنیا کی بیزاری کی وجہ سے وہ کثرت اوقات باوجود اپنے ارادوں کے بھی مذہب اور تصوف کی طرف کھینچ جاتے ہیں۔ بارگاہِ ایزدی میں گڑ گڑا کر گڑا کر دُعائیں مانگنا تقدیر سے مقابلہ کرنے کو بیکار سمجھنا انسانی قوتِ ارادی کو بالکل معطل

دیکھا سمجھنا زمانہ اور آسمان کی شکوہ و شکایات یہ سب باتیں اہل مشرق کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ علاوہ مذکورہ بالا باتوں کے جو تمام مشرقی مصنفین کے یہاں بالعموم پائی جاتی ہیں، ہندوستان میں اس پابندی قسمت اور مجبوری کا ایک اور بھی سبب ہے جو اُن کی فطری حُزن و یاس کی رنگ کو اور گہرا کر دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اُنیسویں صدی کے شروع میں مسلمانوں کا اختراع و اقبال غروب ہو گیا۔ اور اُن کی گزشتہ عظمت و جبروت کے واقعات خواب و خیال ہو گئے۔ اُردو میں خوشی اور مسرت کے نغمہ سرائی کرنے والے مثل براؤننگ بہت کم ہیں مگر کہا جاسکتا ہے کہ اسی مایوسی اور مجبوری کی وجہ سے مشرقی شعرا کے کلام میں ایک خاص قسم کا درد و اثر پیدا ہو گیا ہے جسکی وجہ سے اُن کا کلام مقبول خاص و عام ہے۔

قصائد قصائد نویسی میں بڑے بڑے اساتذہ فارس مثلاً انوری و خاقانی، عربی و قافانی اور ظہیر فاریابی وغیرہ کی پیروی کی گئی۔ اُردو کے مشہور قصیدہ گو سودا و ذوق اور امیر وغیرہ ہیں۔ قصیدہ کے انداز میں بھی فارسی کا متبع کیا جاتا ہے۔ چنانچہ

دربارِ بزازنگ (سلیم لغایت شمسہ) اور دیگر کٹوریہ کا نہایت نامور شاعر تھا۔ اُنیسویں صدی یعنی کون و کٹوریہ کے عہد میں جبکہ انگریزی شاعری کا دور متاخرین بلکہ آخری دور کہنا چاہیے تین نامور شاعر گزرے ہیں در دسور، چٹینین اور بزازنگ۔ دران تینوں کا انداز بیان ایک دوسرے سے الگ ہے بزازنگ کے یہاں روحانیت کا عنصر غالب ہے مضامین نہایت بلند خیالات نہایت پاکیزہ۔ گو عبارت میں کمینہ و پیچیدگی ہوتی ہے جیسے فارسی میں مرزا بیدل کے کلام میں۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ انکی بیوی بھی نہایت شہور اور صاحب تصنیف شاعرہ تھی۔ تمام قوموں میں ستور ہے کہ ہر شعر ایک دوسرے کے کلام کے متعلق مذاق و طنز آمیز ہیں کرتے ہیں چنانچہ بزازنگ کی مشہور کتاب سارڈو جب نکلی تو اُس کے دوست چٹینین نے دیکھ کر کہا کہ میں اُسکے صرف دو شعر سمجھ سکا ہوں یعنی پہلا اور آخری اور وہ بھی صحیح نہیں ہیں اور کارلائل نے جب یہ کتاب اپنی بیوی کی زبان سے سنی تو کہا کہ کچھ میں نہیں آتا کہ سارڈو کسی آدمی کا نام ہے یا کسی شہر کا یا کتاب کا ۱۲

اسی وجہ سے انہیں شکوہ الفاظ اور علو مضامین کا زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔ وہی فارسی ترکیبیں اور متعارف تشبیہیں مبالغہ وغیرہ عام طریقہ سے برتے جاتے ہیں چونکہ قصیدہ خاصی خاص شخص کی تعریف میں کہا جاتا ہے لہذا مدوح کی صفات کو نہایت مبالغہ کے ساتھ ہر ممکن طریقہ سے بیان کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض قصائد بہ لحاظ مضمون و زبان اپنا جواب نہیں رکھتے مشکل بھریں۔ سخت قوافی قصیدہ گوئی قابلیت پر دال ہوتے ہیں۔ اکثر قصائد صنائع بدائع سے بھرے ہوئے ہیں۔

تثنوی شعر اُردو میں یہ صنف بہت مقبول رہی ہے اس میں بھی بحروں اور فارسی قواعد نظم وغیرہ کی پابندی کی جاتی ہے کہا جاتا ہے کہ انگریزی شاعری میں جو دو مشہور صنفیں معروف برائیک اور ڈراما ہیں اُردو میں صنف تثنوی اُن کا جواب ہے مگر ہماری راس میں تثنوی اور اصناف مذکورہ میں فرق ہے اُردو کے مشہور تثنوی نویس میر تقی میر، یونس خاں نسیم، قلق نواب مرزا شوق اور شوق قدوائی ہیں اور سب زیادہ مشہور تثنویاں سحر البیان اور گلزار نسیم سمجھی جاتی ہیں۔ وہی یورپین نقد و تثنوی کے بارہ میں یوں رقمطراز ہے "تثنوی یا بیانیہ نظموں میں بھی نفس قصہ دوسرے درجہ پر اور الفاظ کے ماتحت ہوتا ہے اکثر صورتوں میں قصہ کی روش ایک ہی ہوتی ہے اور پڑھنے والا اُس کے جزئیات تک سے واقف ہوتا ہے ہر چند کہ اشخاص قصہ کے نام بدل دیے جاتے ہیں مگر اصل قصہ پُرانا ہوتا ہے۔ جدت صرف میں ہوتی ہے جہاں ختم قصہ کے قریب افشاے راز ہوتا ہے۔ واقعات جو ایک محدود دائرہ میں بیان کیے جاتے ہیں بد مزگی کے ساتھ بار بار دہرائے جاتے ہیں۔"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اردو میں ڈراما کی کمی کو مثنوی پورا کرتی ہے مگر حق یہ ہے کہ جو لوگ ڈراما کے فن سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مثنوی اور ڈراما میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس وجہ سے کہ مثنوی میں تو کیکڑی نویسی ہے نہ پلاٹ قائم کیا جاتا ہے عمدہ مواقع جو ڈراما میں پیدا کیے جاتے ہیں اُن کا مثنوی میں کہیں پتہ نہیں اور نہ وہ دلچسپ مکالمے ہیں جو ڈراما کی جان ہیں۔ واقعات کی حرکت نہایت آہستہ اور عمل معدوم ہوتا ہے۔ اردو مثنویاں محض رسمی اور قواعد قدیمہ کی پابند ہیں۔ شاہنامہ فردوسی اور سکندر نامہ نظامی کی اُن کو ہوا بھی نہیں لگی۔ البتہ جیسا کہ بیان کیا گیا مثنوی میر حسن اور گلزار نسیم بہ اعتبار فصاحت و بلاغت روانی اور سلاست چستی بندش وغیرہ کے بے نظیر ہیں۔

مراثی [مراثی ادب اردو کی ایک نمایاں صنف ہے ان میں مناظر خوب خوب دکھائے جاتے ہیں۔ ہر چند کہ پیروی فطرت پوری طرح نہیں کی جاتی پھر بھی معرکہ کارزار، مبارزین کی جانبازی، صبح اور شام کا سماں، جنگوں اور میدانوں کے منظر دھوپ اور گرمی کی شدت وغیرہ کے مکمل نقشے الفاظ میں بے مثل طریقہ سے کھینچے گئے ہیں۔ پُر زور اور فصیح بیانیہ نظموں کی یہ بہترین صنف ہے اسکا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ ایک آئینہ باب میں بیان کیا جائے گا۔

قطعات در راعی [ان صنف سخن کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہے ان میں نصیحت آمیز خیالات اور عمدہ عمدہ مضامین نظم کیے جاتے ہیں۔ تمام بڑے بڑے شاعروں نے رباعیاں کہی ہیں جن میں انیس اور دبیر اور حالی کی رباعیاں بہت مشہور ہیں۔

اُستاد و شاگرد کا تعلق اُستاد اور شاگرد کا تعلق ادب اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتا ہے ابتدائی کلام اُستاد کو دکھالیا جاتا ہے اور شعرا سے اس فن میں ایک باقاعدہ قواعد لی جاتی ہے۔ چنانچہ شعرا اُردو ایک بڑے سلسلہ میں وابستہ ہیں شاگرد عموماً اپنے اُستاد کا تتبع کرتے ہیں اُستاد سے انحراف کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس اتباع کی وجہ سے قدرتی ذہانت اور طباعی کا خون ناحق ہوتا ہے اور شاعری وہی رکی رہ جاتی ہے کبھی کبھی البتہ کوئی خاص آدمی اس دائرۃ اتباع سے علیحدہ ہو کر شہرت حاصل کر لیتا ہے۔

مشاعرے مشاعرے میں سخن گو اور سخن سنج سب جمع ہوتے ہیں اور کسی طرح پر طبع آزمائی کی جاتی ہے اس میں شک نہیں کہ اس سے اُردو شاعری کو بہت ترقی ہوتی ہے اس قسم کی کوئی چیز یورپ میں نہیں ہے۔

تخلص شاعر اپنے کلام میں اپنے واسطے اپنے نام کے علاوہ ایک خاص نام اختیار کر لیتا ہے جس کو تخلص کہتے ہیں بعض اوقات اُستاد شاگرد کے واسطے تخلص کا انتخاب کرتا ہے کبھی کبھی اپنے مختصر نام سے تخلص کا کام لیا جاتا ہے۔

اُردو شاعری کے خصوصیات باوجود اُن نقائص کے جو اوپر بیان ہوئے اُردو شاعری جذباتی شاعری ہے اور ہمارے فطری جذبات میں کشش پیدا کرتی ہے۔ ماسوائے شیریں اور طیف اور اپنے طرز خاص میں بے مثل ہے وہ عشق میں شرابور ہے نفہم ہے غم عشق کی ناکامیاں حسرت و ارمان۔ ہجر کا قلق یہ اور اس قسم کے بیسیوں مضامین جو اُردو شاعری کی جان ہیں ہمارے قلب پر ایک خاص اثر کرتے ہیں۔ اس میں ایسے جواہر بے ہاشا مل ہیں جو اپنی آب و تاب سے انگریزی کیا بلکہ دنیا کے علم ادب سے

خلو خیال، نزاکت الفاظ، موسیقیت، حسن تخیل، محویت وغیرہ میں بے تکلف مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ بہت سا کلام ناقص اور بے مزہ ہے مگر یہی حال دنیا بھر کی شاعری کا ہے اردو کی نظم و شعر کو وجود میں آئے ہوئے ابھی بہت عرصہ نہیں گذرا مگر زمانہ حال کی تہذیب و تعلیم کا اثر اس پر اچھا پڑ رہا ہے اس وجہ سے کہ اب اس میں قومی ترانے اور جوشیلی اور نیچرل نظمیں اور انگریزی نظموں کے ترجمے بہ کثرت ہونے لگے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب طبائع پرانی لکیر کے فقیر رہنے کو پسند نہیں کرتیں اور جدید راہیں نکالتی ہیں۔ بہر حال اردو کا مستقبل بہت درخشاں نظر آتا ہے کیونکہ مشرق و مغرب دونوں کے قابل اور با اثر لوگ اُس کی فلاح و ترقی میں دل سے کوشاں ہیں۔

باب

قدیم شعرائے دکن

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا مسلمان فرمانروایان دکن کے دربار میں دکھنی زبان میں ہوئی۔ اس معاملہ کو زیادہ تفصیل سے لکھنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ یہ دریافت کیا جائے کہ دکھنی سے کیا مراد ہے اور اُس میں اور زبان اردو میں کیا فرق ہے۔

دکھنی زبان ہندوستانی کی ایک شاخ ہے جس کو مسلمانان دکن بولتے ہیں۔ اردو کے مانند وہ بھی فارسی نستعلیق خط میں لکھی جاتی ہے مگر

اُس میں فارسی الفاظ کی کثرت نہیں ہے اُس میں بعض خصوصیتیں ہیں۔ جب سلمان فوجیں اپنے ساتھ اپنی زبان کو ملک دکن میں لے گئیں اُس وقت اُس میں بہت سے ایسے محاورے داخل ہو گئے جو اب ادب اُردو سے متروک ہو گئے ہیں جب اس نئی زبان کا سیل اطراف و جوانب کی زبانوں یعنی مرہٹی، مائل، اور منگلی سے ہوا تو اُس کے محاورے اور ساخت میں کسی قدر فرق آگیا۔ مثلاً حالت فاعلیت میں اُم یا ضمیر کے بعد اور فعل ماضی کے قبل حرف (نے) استعمال نہیں کیا جاتا جیسے کہ مغربی ہندی کی شاخوں میں قاعدہ ہے۔ اسی طرح بجائے ”مجھ کو“ کے ”میرے کو“ بولتے ہیں یہ اور اسی قسم کی چند خصوصیتیں شمالی ہندوستان میں بھی پہونچیں جہاں صفائی زبان کی تدریجی رفتار میں اُن میں سے اکثر متروک ہو گئیں۔ نظر بریں دکنی کو ایک خراب قسم کی ادبی اُردو نمایاں کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ اُس کو اُردو کی ایک شاخ سمجھنا چاہیے جس نے بیجا پور اور گولکنڈہ کے درباروں میں نشوونما پائی اور ولی اور اُس زمانہ کے مشہور شعرا کی کوشش سے اُس کو ایک ادبی زبان کی حیثیت حاصل ہوئی۔

زبان دکنی کی ابتدا ملک دکن کی فتحِ ظلیموں کے زمانہ سے شروع ہوئی سب سے پہلا مسلمان بادشاہ جس نے ملک دکن پر حملہ کیا اور اُس کو فتح کر کے سلطنت دہلی کا ماتحت بنایا سلطان علاء الدین خلجی ہے۔ اس کے بعد سلطان محمد تغلق کا دو مرتبہ دکن جانا بھی اہمیت سے خالی نہیں۔ کیونکہ سلطانی حکم کے بموجب اکثر باشندگان دہلی کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ بڑے بڑے علمائے کبار اور صوفیائے عظام معمولی لوگوں کے ساتھ بادشاہ کے ہمراہ تھے۔ اس کے بعد بھی سلسلہ آمد و رفت

جاری رہا۔ مگر اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی تباہ ہو گئی چنانچہ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے
 ”چوں مردم اطراف کہ در دولت آباد تکلیف ساکن شدہ بودند پراگندہ گشتند۔
 پادشاہ مدت دو سال در انجا ماندہ ہمت بجزیر دولت آباد بگماشت و مادر خود مخدومہ
 جہاں را با سائر حرم ہائے امر و سپاہی روانہ دولت آباد گردانید۔ واحدے از
 مردم دہلی را کہ بآب دہواے آنجا غور گزشتہ بودند بحال خود گمراشتہ طرأ بدولت آباد
 فرستاد و دہلی نبوعی ویران گشت کہ آواز ہیچ متنفسے بجز شغال و روباہ و جانوران
 صحرائی بگوش نمی رسید“ مختصر یہ کہ دہلی کے باشندے اب دکن کے باشندے
 ہو گئے۔ اور دہلی کا نقصان دولت آباد کا فائدہ ہوا۔ امتداد زمانہ کے باعث
 آب و ہوا کے اثرات، زبانوں کے اختلاط، اور مقامی باشندوں کے ساتھ
 ربط و ضبط نے یہ نتیجہ پیدا کیا کہ جو زبان دہلی والے اپنے ساتھ لے گئے تھے
 اُس میں نمایاں تغیر ہو گیا۔ اور آخر ان دونوں زبانوں میں معتد بہ فرق معلوم
 ہونے لگا۔

دکن میں اردو شاعری کی ابتدا کے اس امر کی تحقیقات کہ دکن میں اردو شاعری کی ابتدا کے
 کیا اسباب ہوئے بہت دلچسپ ہے قرین قیاس یہ تھا کہ اُسکی نشوونما دہلی میں ہوتی جو اس کا اصلی گھر تھا۔ مگر بجائے اس کے ہم
 دیکھتے ہیں کہ قدیم شعراء اردو کا گوارہ دہلی سے اتنا دور دراز مقام یعنی دکن ہے۔
 اسکی کیا وجہ ہے۔ اس ضروری سوال کا جواب دینے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے
 اس کے صحیح جواب کے لئے ایک اہم واقعہ تاریخی کی طرف حوالہ دینا ضروری ہے
 یہ سب جانتے ہیں کہ مشہور خاندان بہمنی کا بانی ایک برہمن گنگو نامی کا ایک چیلہ تھا

جب کہ انقلابِ زمانہ سے وہ تختِ نشین ہوا تو اُس نے نہ صرف شگونِ نیک کی واسطہ اپنے گرد کا نامِ تعظیماً اپنے خاندان کے نام میں شامل کیا بلکہ اُس کو اپنا وزیرِ مال بھی مقرر کیا تاریخِ فرشتہ میں لکھا ہے کہ یہ عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ گنگوہیل بہمن ہے جس نے ایک مسلمان بادشاہ کی ملازمت اختیار کی اُس سے قبل بہمن لوگ معاملاتِ ملکی میں کوئی حصہ نہیں لیتے تھے بلکہ اُن کی زندگی امورِ مذہبی کی خدمت کے واسطے وقف تھی گنگوہ کے زمانہ سے یہ رسم نکل آیا کہ وزارتِ مال تمام فرمانرواؤں دکن کی مملکت میں برہمنوں کو تفویض ہوتی ہے۔ ہندوؤں کے صیغہِ مال میں تقریباً سے یہ نتیجہ ہوا کہ زبانِ ہندی نے جلد ترقی کرنا شروع کی اور نیزان دہری جماعتوں یعنی ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ارتباط بڑھ گیا۔ ابراہیم عادل شاہ نے بجائے دوسرے ممالک کے لوگوں کے دکھنیوں کو اپنی ملازمت میں کھنا شروع کیا اور اُس کے حکم سے ملکی حسابات جواب تک فارسی میں لکھے جاتے تھے وہ برہمنوں کے زیرِ نگرانی ہندوی یعنی ہندی میں لکھے جانے لگے۔ اُس سے دیسی زبان کو بڑی تقویت پہنچی۔ کیونکہ اب وہ سرکاری اور درباری زبان ہو گئی اور اُس نے بڑی ترقی کرنا شروع کی۔ ہندوؤں کی تعداد ملکِ دکن میں کم نہ تھی یہ جماعت اپنی کثرتِ تعداد ہی کی بدولت مسلمان بادشاہوں کی خانہ جنگیوں میں فاتح اور ہر سر اقتدار شخص کو بہت مدد دیتی تھی۔ کبھی ایک مسلمان حاکم اُن سے سیل کرنا چاہتا تھا اور کبھی اُس کا حریف۔ بعض اوقات چند

مسلمان حکمران کسی ہندو راجہ کے خلاف بھی آپس میں میل کر لیتے تھے مگر اس
ارتباط اور میل جول کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ باہمی معاملات سے زبان فائدہ اٹھاتی
رہی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تین سو برس کے عرصہ میں یعنی جب تک
بیجاپور اور گولکنڈہ خود مختار سلطنتیں رہیں ان دونوں قوموں یعنی ہندو اور
مسلمانوں میں اتنا میل جول تھا کہ ہندوستان میں کسی دوسری جگہ نہیں پایا جاتا
تھا۔ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان محض معمولی برتاؤ اور رواداری نہ تھی
بلکہ ہندو رعایا اپنے مسلمان بادشاہوں کے ساتھ دلی محبت اور خلوص سے پیش
آتی تھی اور یہ حالت برقرار رہی یہاں تک کہ زوال سلطنت بیجاپور کے بعد
مرہٹوں کے ساتھ ظلم و تعدی نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ باہمی ارتباط اور محبت و
یگانگت کی حد یہ تھی کہ مسلمان بادشاہ اور امرا ہندو عورتوں سے شادی کرتے
تھے اور اسی طرح ہندوؤں کو بھی مسلمان عورتوں سے شادی کرنے میں کوئی
باک نہ تھا۔ انتظام ملکی میں بہ کثرت ہندوؤں کا ذخیل ہونا رواداری کی پالیسی
کا بہت بڑا ثبوت تھا۔ گو کہ باہمی خانہ جنگیاں کبھی کبھی ہوتی تھیں مگر اس میں
کوئی شک نہیں کہ سلاطین گجرات اور ہمنی بادشاہوں کو امن و امان سے سلطنت
کرنے اور انتظام ملکی کو قائم رکھنے کے لئے سلاطین دہلی کی نسبت زیادہ موقعے
حاصل تھے جہاں کہ شمال سے برابر حملے ہوا کرتے تھے اور رعایا کی فلاح اور بہبود
مفقود تھی پس مختصر ہندو مسلمانوں کا باہمی ارتباط مسلمان فرمانروایان دکن کی
سلطنت میں ہندوؤں کا عروج، حساب کتاب کا زبان ملکی میں تبدیل کر دیا جانا،

یہ سب اسباب بل کر اس کا باعث ہوئے کہ دیسی زبان جو دکھنی کے نام سے مشہور تھی وہ ترقی کر کے ایک ادبی زبان بننے کے قابل ہو گئی۔ اس کے علاوہ ملک دکن میں اکثر بزرگان دین اور اولیاء اللہ بھی رہتے تھے جو ہندو اور مسلمانوں کی زبان اور مذہب میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ یہ لوگ عوام الناس کے ساتھ میل جول کے خیال سے دیسی ہی زبان کو پسند کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر قبائلی اور صوفی منش اشخاص تھے اور ان سب کے اشعار بہت صاف اور عام فہم زبان میں ہوتے تھے۔ اس مختصر بیان سے اُردو شاعری کی نشوونما کا کچھ حال تو معلوم ہو گیا مگر اُس زمانہ کے شعرا کے حالات کمال اور یکجا کسی معاصر تذکرہ میں نہیں دیکھے گئے۔ تذکرہ دل میں صرف بعض شعرا کے نام ملتے ہیں اور ان کے کلام کا بھی کچھ نہ کچھ نمونہ موجود ہے مگر یہ تذکرے بہت بعد کی تصنیف ہیں غنیمت ہے کہ اس زمانہ میں اس مسئلہ خاص میں کافی دلچسپی لی جا رہی ہے۔ اور ہم کو امید ہے کہ قابل لوگوں کی توجہ سے اس پر کافی روشنی پڑے گی۔

شاہانِ ہندی کا زمانہ
۱۵۵۰ تا ۱۶۰۰ء

آٹھویں صدی ہجری سے دکن میں علم و ادب کی ابتدا ہوتی ہے اُس زمانہ کی تصانیف کے جو نمونے اس وقت موجود ہیں وہ زیادہ تر مذہبی کتابوں کی صورت میں ہیں۔ اور ان کے مؤلف اُس وقت کے صوفی مشرب لوگ تھے جن میں سے بعض مشہور لوگوں کے نام حسب ذیل ہیں۔
گنج الاسلام شیخ عین الدین (متوفی ۱۵۹۵ء) خواجہ سید گیسو دراز۔ شاہ میراجی، مولانا وحشی۔ اور سید شاہ میر وغیرہ۔ یہ لوگ زیادہ تر تشار تھے۔ ان کا کچھ مختصر حال ہم اس کتاب کے حصہ نشر میں بیان کریں گے۔

قطب شاہیوں کا عہد

۹۱۵ھ تا ۹۵۸ھ

سلطنت ہمنی کے زوال کے بعد بیجا پور گوکنڈہ اور احمد نگر کی
چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوئیں اس زمانہ میں دکنی زبان کو

بہت ترقی ہوئی ہندوستانیوں کی وجہ سے جو شاہی محلوں میں تھیں دکنی زبان کو اور بھی
تقویت پہونچی۔ یوسف عادل شاہ کی بیوی جو بوبو جی کے نام سے مشہور تھیں -
کنہدراؤ مرہٹہ کی بہن تھیں۔ بھاگ متی سلطان محمد قلی شاہ کی محبوب بیوی تھیں
احمد نظام شاہ والی احمد نگر کی ماں بھی ہندو تھیں -

شاہان گوکنڈہ و بیجا پور نہایت قدردانِ فنِ مہذب اور قابلِ بادشاہ تھے
شعر کی قدردانی کے ساتھ خود بھی فارسی اور دکنی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے
اُردو کو دکن میں دکنی کہتے ہیں اُن کے دربار میں ایسے لوگوں کا مجمع تھا جو فارسی
اور عربی کے عالم تھے۔ اس نئی زبان کے اطراف و جوانب میں تلنگی مرہٹی اور کُٹری
زبانیں بولی جاتی تھیں گرجے میل ہونے کی وجہ سے اُن سے اُردو کو کوئی فائدہ
نہیں پہونچ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ نئی زبان کے ترویج و اشاعت کا انحصار
ایسے لوگوں پر تھا جو فارسی کے علاوہ دیگر زبانوں سے ناواقف تھے اسی وجہ
سے اس نئی زبان یعنی دکنی کی ترکیب زبان فارسی کے مطابق ہوئی دربار گوکنڈہ
اُس وقت کے شعرا اور اُدبا کا مجمع تھا جن میں مندرجہ ذیل شعرا کے نام تذکروں
میں ملتے ہیں مگر حالات دستیاب نہیں ہوتے۔ غواصی، ملا قطبی، ابن نشاطی،
جنیدی، طبعی، نوری، فائز، شاہی، مرزا شعور، بیچارہ، طالب، مومن،
سلطنت شاہہ ام میں قائم ہوئی اور ترقی کی معراج پر
پہونچ گئی سلطان قلی قطب شاہ اپنے والد ابراہیم قطب شاہ

سلطان محمد قلی قطب شاہ

۹۵۸ھ تا ۹۶۱ھ

اکی وفات پر چو اسیستہ ۶ میں واقع ہوئی بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا ۵۸۷ھ
 میں سلطان مذکور نے ابراہیم عادل شاہ فرما کر واسے بجا پور کے ساتھ صلح کی اور
 اپنی بہن کا نکاح اُن کے ساتھ کر دیا۔ وہ شہنشاہ اکبر اور شاہ عباس صفوی کا ہم عصر
 تھا۔ گو گندہ سے کچھ فاصلہ پر اپنی معشوقہ بھاگ متی کے نام سے ایک شہر بھاگل نگر
 آباد کیا۔ مگر تھوڑے عرصے کے بعد اس نسبت کو بدل کر اسی شہر کو حیدر آباد کے نام
 سے موسوم کیا جو موجودہ فرما کر واسے دکن کا مشہور دار السلطنت ہے۔ قطب شاہ
 کو علاوہ شعر و شاعری کے دیگر فنون لطیفہ کا بھی بہت شوق تھا چنانچہ فن تعمیر سے
 بھی اُن کو دلچسپی تھی دو مشہور عمارتیں مشہور بہ خداداد محل اور بارگاہ خسروی
 تعمیر کرائیں۔ اُن کے دربار میں بڑے بڑے صاحب کمال اور استادان فن عرب
 و ایران سے اُن کی داد و دہش اور قدردانی کا حال سن کر آتے تھے اور اُن کی فیاضی
 سے مستفیض ہوتے تھے۔ بادشاہ نے ایک خاص وقت مقرر کیا تھا جبکہ علماء و شعرا
 میں مناظرے اور مشاعرے ہوتے تھے۔ خوشنویسی کا بھی اُن کو بہت ذوق تھا
 چنانچہ مشہور خطاط ایران و عراق کے اُن کے دربار میں جمع ہو گئے تھے علاوہ
 دیگر اکمالوں کے دو مشہور عالم اُن کے دربار میں میر محمد موسیٰ استرآبادی اور میر حمید
 تھے۔ قطب شاہ کا مذہب شیعہ تھا اور وہ اکثر مناظرے اپنے مذہب کی حمایت
 میں اہل دربار میں منعقد کراتے تھے۔ اسی مذہبی شوق کی وجہ سے بہت سے مرثیے
 اس عہد میں کہے گئے۔ علاوہ قدردان فن ہونے کے خود بھی ایک اچھے شاعر
 تھے چنانچہ اُن کا کلام زبان دکھنی و تلمنگی و فارسی ایک ضخیم کلیات کی صورت میں
 جس کے اٹھارہ سو صفحے ہیں موجود اور محفوظ ہے۔ اشعار فارسی میں قطب شاہ

اور دکنی میں معافی تخلص کرتے تھے ان کی کلیات میں حسب ذیل اصناف سخن موجود ہیں ثنویاں قصیدے ترجیع بند مرثی بزبان فارسی و دکنی اور رباعیات۔ دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پچاس ہزار سے زیادہ شعر کہے تھے۔ سادگی اور شیرینی ان کے کلام کا جوہر ہے۔ تصوف اور عاشقانہ رنگ بھی ان کے اشعار میں پایا جاتا ہے۔ موقع نگاری اور مناظر قدرت کی بنیاد انھیں کی رکھی ہوئی ہے جو سودا اور نظیر اکبر آبادی کے زمانہ میں تکمیل کو پہنچی۔ اکثر ثنویاں خاص ہندوستانی پھلوں اور ایک ہندوستانی ترکاریوں اور ایک شکاری چڑیوں کے متعلق ہے بعض نظموں میں شادی بیاہ اور ولادت کے رسم و رواج ہندو اور مسلمانوں کے مذہبی تہوار مثلاً ہولی دوالی عید بقر عید بسنت وغیرہ بعض میں ہندوستان کے موسم برسات کا ذکر نہایت دلچسپی سے کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک دلچسپ مکالمہ صراحی و ساغر کا منظوم کیا ہے۔ ایک قصیدہ بارغ محمد شاہی کی تعریف میں اور اکثر قصائد حمد و نعت اور نقبت میں ہیں۔ معرکہ کربلا کے مؤثر مرثی بھی لکھے ہیں۔

قلی قطب شاہ پہلے شخص ہیں جن کا کلام اردو مجموعی صورت میں موجود ہے۔ ان کی زبان میں کافی سختگی اور ترقی پائی جاتی ہے۔ ممکن ہے ان سے بھی پیشتر کچھ لوگ گزرے ہوں جنھوں نے شعر کہا ہو مگر ان کے کلام کا اس وقت تک کہیں پتہ نہیں ملا۔ کچھ مذہبی ثنویاں قطب شاہ سے پیشتر کی موجود ہیں مگر وہ کسی معنی میں ادبی تصنیفات نہیں کہی جاسکتیں۔ قطب شاہ ہی کا کلام اب تک ایسا کلام کہا جاسکتا ہے کہ جس میں ایک ادبی شان موجود ہے۔ انھوں نے سب سے پیشتر فارسی کے متبع میں شعر کہے اور ایک دیوان بہ ترتیب حروف تہجی جمع کیا

اور یہ سہرا اب تک عدم تحقیق کی وجہ سے ولی کے سر تھا۔ علاوہ متعارف مضامین کے اُن کے کلام میں قابل تعریف بات یہ ہے کہ صلیت اور جدت ہے اور بعض مقامی دلچسپیوں کو بھی اُنھوں نے قلمبند کیا ہے۔ فارسی کے وہ پورے متبع نہیں ہیں کیونکہ ان کے کلام میں ہندی کا بھی بہت بڑا اثر پایا جاتا ہے۔ ہندی الفاظ اور ترکیبیں، ہندی ہتھارے اور تشبیہیں، ہندو فارسی الفاظ، خدا کی تعریف ٹھیسٹ بھاشا میں، ہندو سوراؤں اور بہادروں اور ہندوستان کی روایات کا ذکر، اظہار عشق عورت کی جانب سے مرد کے واسطے، جو ہندی شاعری کے لیے مخصوص ہے۔ یہ سب باتیں اُن کے کلام کی خصوصیات ہیں معشوق سے طریقہ خطاب جو بعد میں الٹ گیا اُن کے یہاں صحیح طریق پر پایا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ فارسی کا اتباع بھی نظر انداز نہیں کیا گیا، کیونکہ قواعد نظم الفاظ، محاورات، ترکیبیں، مضامین، تشبیہات کثر اُن کے کلام میں موجود ہیں۔ وہ اپنی قابلیت کا اظہار نہیں کرتے اور فارسی عربی الفاظ کو اُسی طرح استعمال کرتے ہیں جیسے روزمرہ میں مشہور ہیں، عام اس سے کہ وہ لغوی طریق پر صحیح ہوں یا غلط۔ فی الحال چونکہ وہ قدیم زبان متروک ہو گئی ہے اور لوگوں کو اُس میں کوئی لطف نہیں آتا اس لئے ان کا کلام دلچسپی سے نہیں پڑھا جاتا مگر جب نظر تحقیق وسیع ہوگی تو اُن کے کلام کی قدر کیا جائیگی مختصر یہ کہ قلی قطب شاہ اُن لوگوں میں ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اپنے کلام کی تدوین کی اور اردو کو ایسا وسیع کیا کہ آئندہ وہ ایک ادبی زبان بننے کے قابل ہو گئی۔ اُنھوں نے ایک ایسے ادب شعر کی بنیاد رکھی جس کے پیرو اور مختتم میر و سودا اُنیس و دہر ذوق و

غالب وغیرہ ہوئے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

دلِ ناہگ خدا کن کہ خدا کام دوے گا	تمنن کی مرادن کے بھرے جام دو گیا
کرتے ہیں دعویٰ شعر کا سب اپنی طبع سوں	بخشایح شعر معافی کے تئیں خدا

سلطان محمد قطب شاہ
۱۶۱۵ء لغایت ۱۶۲۵ء

سلطان محمد قطب شاہ سلطان قلی قطب شاہ کے بھتیجے اور جانشین تھے اُن کی ولادت گولکنڈہ میں ۱۵۹۷ء میں ہوئی اور اُن کی شادی اپنی چچا زاد بہن یعنی سلطان قلی قطب شاہ کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ نہایت تشرع اور پابند مذہب سخی اور فن تعمیر کے دلدادہ تھے۔ منجملہ دیگر تعمیرات کے اُسی محل۔ جامع مسجد معروف بہ مکہ مسجد محمدی محلِ دال محل مشہور ہیں۔ نظم و نشر فارسی و اردو دونوں خوب لکھتے تھے۔ اُن کے دو دیوان ہیں ایک فارسی اور ایک دکنی جن میں اکثر اصناف سخن موجود ہیں۔ فارسی میں **ظل الشہاد** اور اردو میں **قطب شاہ تخلص** کرتے ہیں۔ اسی توافق تخلص کی وجہ سے ان دونوں بادشاہوں کے کلام میں خلط ملط ہو گیا ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انکا تخلص اردو کلام کو واسطے اور سلطان قلی قطب شاہ کا فارسی کے واسطے مخصوص تھا۔ ان کے دونوں دیوان حیدر آباد میں نواب سرالاجنگ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ ان کے کلام میں بھی شیرینی، صفائی، لطافت پائی جاتی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

سکھی تو ہر گھڑی مجھ پر نہ کر غیظ	محبت پر نظر رکھ کر بسر غیظ
دولب ترے رنگیلے یا قوت کو دے رنگ	
لے بھیک رنگ عقیقاں رنگیں ہوئے عین میں	

سلطان عبداللہ قطب شاہ
 ۱۶۲۵ء لغات ۱۶۴۶ء
 عبداللہ قطب شاہ سلطان محمد قطب شاہ کے بیٹے اور
 سلاطین قطب شاہی میں چھٹے بادشاہ تھے ۱۶۱۴ء
 میں پیدا ہوئے اور اپنے باپ کی وفات کے بعد ۱۶۲۵ء میں تخت نشین ہوئے
 انھوں نے شاہ جہاں کے سامنے گردن اطاعت خم کی اور ایک سالانہ رستم
 بطور خراج کے دینا منظور کیا۔ ۱۶۵۶ء میں جب شاہ جہاں ان سے ناراض
 ہوئے تو شام ہزادہ اور نگ زیب نے جو اُس وقت ممالک محروسہ دکن کے
 صوبہ دار تھے حیدرآباد پر چڑھائی کر کے اُس شہر کو تہ و بالا کر دیا۔ عبداللہ نے
 اپنی شکست قبول کر کے تمام شرائط صلح منظور کر لئے اور اس وقت سے وہ سلطنت
 مغلیہ کے ایک باجگزار کی حیثیت سے ہو گئے۔ یہ بھی مثل اپنے باپ کے شعرو
 شاعری کے دلدادہ تھے اور انھیں کی طرح ان کو بھی فن تعمیر کا بڑا شوق تھا
 ان کا دربار بھی فارس اور عرب کے عالموں فاضلوں سے بھر رہتا تھا اور وہ
 سب ان کی فیاضی سے بہرہ یاب ہوتے تھے۔ اکثر کتابیں اس عہد میں ان کے
 نام سے لکھی گئیں مثلاً برہان قاطع اور ایک لغت موسوم بہ لغات فارسی یہ
 فارسی اور دکنی دونوں میں شعر کہتے تھے اور تخلص عبداللہ تھا۔ ان کے دیوان
 فارسی اُردو دونوں میں موجود ہیں۔ ان کے اشعار بہت صاف اور شیریں ہوتے
 ہیں۔ آصفی لکھاپوری نے اپنے تذکرہ شعراء دکن میں ان کے اکثر اُردو اشعار
 بطور نمونہ پیش کیے ہیں کلام کا نمونہ یہ ہے۔

آری پشیمانی پر ٹیکہ جھکمتا	تماشا ہے اُجالے میں اُجالا
آب حیات سے ہے زیادہ یہ لب ترا	کرتے ہیں مجھ سے خضر علیہ السلام بحث

جو کچھ راز پردہ میں ہیں غیب کے

سو مخفی نہیں اُس پہ ہیں آشکارا

ابن نشاطی | اس زمانہ کے شعر لے دکن میں ابن نشاطی بہت مشہور ہوئے ہیں۔ یہ گوکنڈہ کے رہنے والے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر تھے ان کے حالات زندگی کچھ معلوم نہیں۔ بجز اس کے کہ وہ ایک ثنوی موسوم بہ ”پھول بن“ کے مصنف ہیں جو زبان دکنی میں ہے اور عشق و عاشقی کا قصہ ہے اس کا نام اسکی ہیروئن کے نام پر رکھا گیا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ایک فارسی کتاب بسا تین کا ترجمہ ہے۔ ہمیں سکندر اور لقمان وغیرہ کی حکایات بھی ہیں اور ایک فرضی شہر مشہور بہ کچن پاٹن کا حال ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ تقریباً ۱۳۰ صفحہ کا ایسٹ انڈیا کمپنی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ معمولاً احمد ولعت و منقبت سے ابتدا ہوئی ہے۔ اس کے بعد سلطان عبداللہ قطب شاہ کی تعریف ہے پھر صل قصہ شروع ہوتا ہے۔ قصہ میں انسانوں کے قالب بدلنے اور جانوروں کے قالب میں آنے کا ذکر ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ سرور نے اسی کے مطالعہ کے بعد سائنہ عجائب لکھی ہو۔ اسکی تصنیف سنہ ۱۱۷۰ھ میں ہوئی۔

غواصی کا قصہ ”سیف الملوک“ غواصی نے بزبان دکنی ایک ثنوی لکھی ہے جس میں سیف الملوک شاہزادہ مصر اور بدیع البھال شاہزادی چین کے عشق کا حال ہے۔ اس کا سن تصنیف سنہ ۱۱۷۰ھ ہے۔ غواصی مذہب کا شیعہ تھا۔ اور عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا شاعر تھا۔ قصہ سیف الملوک غالباً الف لیلہ سے ماخوذ ہے شروع میں حمد و نعت اور منقبت کے بعد بادشاہ کی تعریف ہے

جس کا ذکر کتاب کے اٹھا رہویں شعر میں ہے۔ انھوں نے ایک اور مثنوی بھی لکھی ہے جس کا نام طوطی نامہ ہے اور یہ سنہ ۴۹۹ھ میں تمام ہوئی اور جس کو سرچارلس لائل غلطی سے ابن نشاطی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ دراصل قیصرہ ضیا بخشی کے فارسی طوطی نامہ سے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اردو میں ترجمہ ہوا تھا اس وجہ سے کہ دیا جا چکا ہے انھیں کی بہت زیادہ تعریف ہے۔ اس کا ماخذ اصلی سنسکرت کی کتاب ”سوگاشبتتی“ بتایا جاتا ہے۔ غواصی کے اس قصہ سے مولوی حیدر بخش نے جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مدرس تھے اپنا مشہور طوطی نامہ سنہ ۱۸۷۷ء میں تیار کیا۔ غواصی نے اپنا تخلص ایک ترجیع بند میں ظاہر کیا ہے۔ اور تصنیف دیا جا چکا ہے سنہ ۱۸۷۹ء (مطابق یکم جب سنہ ۱۲۹۹ھ) پایا جاتا ہے۔ ملا غواصی گوکنڈے کے باشندے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر ہیں۔ نصرتی نے گلشن عشق میں ان کا تذکرہ کیا ہے ۵

بڑی کچھ غواصی تنی کر خیال | کیا تازہ باغ بدیع ابھال

میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں ”غواصی تخلص در وقت جہانگیر سنہ ۱۵۸۵ھ سنہ ۱۵۸۶ھ بود۔ طوطی نامہ بخشی را نظم نموده است، بزبان قدیم نصف فارسی نصف ہندی بطور ایکٹ کہانی یہ سرسری دیدہ بودم شعر آں نظم یاد نیست“

سب سے مصنف مولانا وہی | ایک ضروری کتاب موسوم بہ سب سے کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے جس کو شر و کنی میں مولانا وہی نے تصنیف کیا تھا مولانا موصوف سلطان عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر اور غواصی کے معاصر تھے۔ یہ کتاب سلطان عبداللہ قطب شاہ کے حکم سے سنہ ۱۵۸۵ھ یا سنہ ۱۵۸۶ھ میں

تصنیف ہوئی۔ قدیم نثر دکنی کے نمونے سب سے پیشتر کے بھی موجود ہیں مگر وہ سب مذہبی رنگ یا تصوف میں ہیں۔ سب سے بڑی خوبی اس کتاب کی جیسا کہ مولوی عبدالحق صاحب سکر ٹری انجمن ترقی اردو نے بتلایا ہے کہ جنگلی کوششوں سے یہ کتاب پبلک کی نظروں میں آئی یہ ہے کہ ایک مسلسل قصہ ہے نیز یہ کہ اسکی عبارت ادبی شان رکھتی ہے اور شریف ہے جیسا کہ فارسی میں ظہور کیا کہ رنگ ہے۔ زبان بہت صاف اور سادہ ہے اور قصہ میں روانی پائی جاتی ہے۔ نفس قصہ مختصر ہے جس میں جا بجا اشعار حسب موقع عشق، عقل، شجاعت، حرص وغیرہ کے موضوع پر لائے گئے ہیں۔ اسکی زبان بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ قطب شاہیوں کے کلیات کی ہے۔

تخصیص الہین ممکن ہے کہ یہ نام ہو یا کوئی خطاب۔ غرض کہ ان بزرگ نے ایک مثنوی لکھی جسکا نام ”کامروپ کلا“ ہے۔ کلا شاہ لکھا کی بڑی قصہ کی ہیروئن ہے اور کامروپ، شاہ اودھ کا بیٹا ہیرو ہے۔ قصہ یہ ہے کہ یہ دونوں خواب میں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے جیسا کہ الف لیلا میں چین والی شہزادی کی نسبت لکھا ہے۔ کامروپ اپنی نادیدہ بلکہ خواب دیدہ معشوقہ کی تلاش میں ملکوں ملکوں پھرتا ہے جہاں اُسکو عجب عجب واقعات پیش آتے ہیں اور بالآخر اُسکی شادی کلا کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ مصنف مسلمان ہے اور اشخاص قصہ سب ہندو ہیں۔ اسی مثنوی کو گارسن ڈیٹاسی نے ۱۳۳۷ء میں قصہ ”کامروپ“ کے نام سے شائع کیا تھا۔ یہ بات بھی دیکھنی سے خالی نہیں کہ مشہور ہنر مند شاعر گیتے نے اس نظم کو ترجمہ کر کے سنا اور اُس سے بہت محفوظ ہوا۔

ملاقطبی انھوں نے سلسلہ ۱۷ھ میں تحفۃ النصائح کا ترجمہ زبان فارسی سے کھنسی میں کیا۔ یہ کتاب شیخ یوسف دہلوی نے ۹۵۷ھ میں اپنے بیٹے کی تعلیم کے واسطے تصنیف کی تھی۔ یہ ۷۸۶ء بند کا ایک قصیدہ ہے جسے ملاقطبی نے اُنکی اور اُسی ردیف و قافیہ میں ترجمہ کیا ہے۔

جنیدی ان کی نسبت کچھ اور معلوم نہیں سوائے اس کے کہ وہ ایک ثنوی لکھنے کے مولف ہیں جس کا سنہ تصنیف ۷۱۲ھ ہے۔

طبعی گوکنڈہ کے رہنے والے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر تھے۔ ان کی ایک ثنوی ”بہرام و گل اندام“ ہے جس کا مضمون ہفت پیکر نظامی سے ماخوذ ہے۔ یہ تصنیف ۱۷۱۲ھ ہے۔ دیباچہ شاہ راجو حسینی کے نام سے ہے جو گوکنڈہ کے ایک بہت بڑے بزرگ اور اولیا اللہ سے تھے اور خاتمہ پر ابو الحسن مہاشاہ کی تعریف ہے۔ یہ تقریباً تیرہ چودہ سو شعر کی ثنوی ہے۔

ابو حسن قطب شاہ ۱۷۱۲ھ ابو حسن قطب شاہ مشہور بہ مہاشاہ گوکنڈہ کا سب سے لغایت ۱۷۱۲ھ متوفی ۱۷۱۲ھ آخری تاجدار نہایت عیش پسند اور زارک باغ تھا یہ خود بھی نہایت قابل اور قابلوں کا قدردان تھا۔ ایک شعر مذکورہ گلشن بہد میں اسکی طرف منسوب ہے۔ یہ عبداللہ قطب شاہ کا داماد تھا اور اسکی وفات پر تخت نشین ہوا جب گوکنڈہ سات ماہ کے محاصرہ کے بعد ۱۷۱۲ھ میں فتح ہو گیا اور سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ قرار پایا تو ابو حسن قید کر لیا گیا اور اسکی باقی عمر قید میں گزری۔ مشہور ہے کہ اُس کو حقہ کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اُس نے حقہ پینے کی اجازت قید خانہ میں بھی طلب کی تھی۔

شعراے ذیل ابوحسن تانا شاہ کے زمانہ میں یا اُن کے دربار کے شاعر تھے۔
نوری سید شجاع الدین نوری گجرات کے معزز خاندان سادات سے تھے وہ سلطان
 ابوحسن تانا شاہ کے وزیر کے بیٹے کو پڑھاتے تھے۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں
 اُن کا ذکر کیا ہے۔ اِن کو اُن ملا نوری سے نہ ملانا چاہیے جو فیضی کے دوست تھے
 اور جن کا ایک شعر قائم نے اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے۔ گارسن ڈیٹا سی اور سر
 چارلس لائل نے نام کے التباس کی وجہ سے دھوکہ کھایا ہے اور دونوں کو
 ایک سمجھا ہے۔

خانز یہ گوکنڈہ کے رہنے والے تانا شاہ کے عہد کے شاعر تھے ۹۴۷ھ میں
 انھوں نے قصہ رضوان شاہ و روح افزا کا ترجمہ شرفارسی سے نظم دکنی میں کیا۔
 یہ مثنوی قصہ رضوان شاہ کے نام سے مشہور ہے مگر کتب خانہ آصفیہ میں مثنوی
 روح افزا کے نام سے ہے

شاہی شاہ قلی خاں نام اور بھاگ نگر (موجودہ حیدر آباد دکن) کے رہنے والے
 تھے شاہی ملازمت کرتے تھے رفتہ رفتہ تانا شاہ کے ندیم خاص ہو گئے۔
 شمالی ہند کی بھی سیر کی تھی تذکرہ میر حسن میں اِن کا ذکر ہے۔

مرزا ابوالقاسم متخلص مرزا حیدر آباد کے رہنے والے تانا شاہ کے مصاحب
 تھے۔ تانا شاہ کے انتزاع سلطنت کے بعد یہ فقیر ہو گئے اور حیدر آباد میں
 بقیہ عمر بسر کی اور وہیں انتقال کیا۔ تذکرہ میر حسن میں اِن کا ذکر ہے۔

عادل شاہیں کا زمانہ
 سلطنت عادل شاہی کی بنیاد پڑنے سے مدتوں پیشتر بجا پڑ
 میں اردو زبان عام ہو گئی تھی امیر غریب ادنیٰ اعلیٰ

سب اسی زبان میں بات چیت کرتے تھے سلاطین ہمنیہ نے یہاں کے شاہی دفتر کو بھی اسی زبان میں کر دیا تھا۔ لیکن یوسف عادل شاہ اور اس کے فرزند اسماعیل عادل شاہ نے اپنے زمانہ میں شاہی دفتر کو فارسی میں منتقل کر دیا۔ کم و بیش پچاس سال فارسی عروج پر رہی ابراہیم عادل شاہ اول نے جب تاج تخت حاصل کیا تو اس نے حسب سابق فارسی کے عوض شاہی دفاتر میں زبان اردو کو رواج دیا اور یہ زبان سلطنت کی زبان قرار پائی۔ مورخ خانی خاں نے بھی اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ علی عادل شاہ اول نے اپنے زمانے میں فارسی زبان کو مروج کیا لیکن جب ابراہیم عادل شاہ ثانی حکمراں ہوا تو شاہی دفاتر میں پھر اردو زبان جاری ہو گئی اور سلطنت عادل شاہیہ کی تباہی تک برابر جاری رہی۔

مثلاً بادشاہان گولکنڈہ کے سلاطین سب اپنی زبان ہی تعلیم یافتہ روشن خیال علم دوست بادشاہ تھے چنانچہ ابراہیم عادل شاہ کو بھی شعر و شاعری اور فن تعمیر سے بڑا شوق تھا۔ فارسی کا مستند شاعر ظہوری جو سنہ ۱۰۵۰ھ میں ہندوستان آیا اور سنہ ۱۱۰۰ھ میں وفات پائی اسی دربار کا بڑا مشہور شاعر تھا۔ ظہوری کی دو کتابیں ”خوان خلیل“ اور ”گلزار ابراہیم“ اسی ابراہیم عادل شاہ کے نام پر ہیں اور انکی تین مشہور فارسی نثریں جو سنہ ۱۱۰۰ھ میں ظہوری کے نام سے مشہور ہیں ابراہیم عادل شاہ کی تصنیف نورس کا دیباچہ ہیں جو ہندی نظم میں فن موسیقی کی ایک مشہور کتاب ہے۔ میر سبزواری اور ملک فیضی بھی اسی دربار کے بڑے شاعر تھے۔ سید شمس اللہ صاحب قادری لکھتے ہیں ”ابراہیم عادل شاہ کو

ابراہیم عادل شاہ ثانی
سنہ ۱۰۵۰ھ غایت مستند

موسیقی میں بے حد مہارت حاصل تھی۔ خاص کر سرود ہندی میں ایسا کمال پیدا کیا تھا کہ اُس عہد کے تمام گویئے اُسے جگت گرد کہا کرتے تھے۔ اُس نے علم موسیقی میں (دھریا) ایک کتاب لکھی تھی جس میں سرود ہندی کے قواعد و ضوابط ظہور کئے تھے اور اُس کا نام نورس نامہ رکھا تھا۔ یہ کتاب نظم دکھنی میں ہے۔ بلاظہوری نے اس پر دیباچہ لکھا تھا جو اس وقت سے شہر ظہوری کے نام سے مشہور ہے۔ مصنف گل رعنا رقمطراز ہیں ”کہ موسیقی کا شوق ایسا بڑھا کہ اطراف ہندوستان سے بلا کر تین چار ہزار گویئے بیجا پور میں جمع کئے اور مسئلہ ۷ میں بیجا پور کے قریب نور پور کے نام سے ایک بڑا شہر آباد کیا جس میں گرو اور چلیوں کے لئے بڑی بڑی محسلسر میں بن کر طیار ہو گئیں۔ شاہی محسلسر کا نام نورس محل۔ شاہی مہر پر نورسی۔ سکھ پر نورس علم و نشان کے نام نورسی بعض شاعروں نے اپنا تخلص بدل کر نورسی قرار دیا۔“

اس بادشاہ کے دربار میں بھی مشہور شاعر اور ادیب جمع تھے۔ ملک کا امن و سکون شیواجی مشہور سردار مرہٹہ کے

علی عادل شاہ ثانی
شہداء غایت شہداء

متواتر حملوں سے درہم و برہم ہو گیا تھا۔ شیواجی نے اکثر قلعے فتح کر لئے اور افضل خاں کو جو بیجا پور کا سردار تھا قتل کر دیا۔ اسی علی عادل شاہ کے زمانہ کا مشہور شاعر نصرتی جس کا نام محمد نصرت اور فرما نروا کے کرناٹک کا رشتہ دار تھا۔ کرناٹک سے بیجا پور آیا جہاں علی عادل شاہ نے اُس کو عہدہ منصب داری عطا کیا اور اپنا رفیق اور صاحب بنایا۔ علی عادل شاہ ثانی کو دکھنی سے نہایت دیکھی تھی اور وہ دکھنی شعر کی نہایت قدر کرتا تھا بقول خانی خاں

بادشاہ ہے بود باہوش سپاہ دوست و در سخاوت و شجاعت و وسعت خلق مشہور
 در حق شاعران ہندی زیادہ مراعات می فرمود۔ در عہد او ترجمہ یوسف زلیخا تالیف
 ملا جامی و ترجمہ روضۃ الشہداء و قصہ منوہر و مدالت کہ عاقل خان خوانی نظم
 در آوردہ ملا نصرتی و دیگر شاعران بجا پور بہ زبان دکنی تالیف نمودہ از نقد و حسن
 صلبہ و افروغ و سلاطین یافتند۔ اس عہد کے مشہور شعریہ ہیں۔ رسمی۔ نصرتی
 شاہ ملک۔ امین۔ سیوا۔ مومن۔ ہاشم۔ مرزا۔

رسمی کا نام کمال خاں ولد اسمعیل خاں۔ دربار بجا پور سے اس کا
 تعلق تھا۔ رسمی نے خدیجہ سلطانہ شہر بانو بیگم کی فرمائش سے ۹۵۰ھ میں
 خاوندنامہ کا فارسی سے نظم دکنی میں ترجمہ کیا۔ خاوندنامہ میں جناب امیر علیہ السلام
 کے محاربات مذکور ہیں اور فردوسی کے شاہنامہ کے طرز پر لکھا ہے شہر بانو بیگم کا
 عقد سلطان محمد بن ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ ہوا تھا۔

نصرتی اس کے حالات تحقیق سے معلوم نہیں ہیں بقول سید شمس اللہ قادری
 در نصرتی کا نام شیخ نصرت اور وطن بجا پور ہے۔ ان کے آبا و اجداد بجا پور میں
 توحی ملازم اور والد رکاب شاہی کے مسلح دار تھے چنانچہ خود نصرتی نے اس کا
 ذکر کیا ہے۔ نصرتی کے بھائی شیخ منصور ایک اہل دل اور خدا رسیدہ بزرگ تھے
 بجا پور کے مشاہیر فقرائیں ان کا شمار ہوتا ہے۔ گلشن عشق کے دیباچے سے
 ظاہر ہوتا ہے کہ نصرتی نے محمد عادل شاہ کے زمانہ میں دربار میں رسائی حاصل کی
 اور علی عادل شاہ کے دور میں عروج پایا اور ملک اشعر کا خطاب حاصل کیا۔

عبدالجبار خاں ملکا پوری نے اپنے تذکرہ شعرائے دکن میں نصرتی کا اس طرح ذکر کیا ہے ”نصرتی تخلص محمد نصرت نام دکنی المولد ہے۔ حاکم کرناٹک کے قرابت داروں سے تھا۔ آپ کی گزراوقات توکل و فضاغت پر تھی۔ مدت تک کرناٹک میں رہا۔ پھر سیر کرتا ہوا بیجا پور میں آیا سنہ ۱۱۵۷ھ دکنی زبان میں علی نامہ لکھا۔ اس پر ملک الشعرائی کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۱۵۸ھ میں فوت ہوا۔ نصرتی سنی المذہب تھا۔ بندہ نواز گیسو دراز کے خاندان کا مرید و معتقد تھا جیسا کہ شعر سے عیاں ہے؛ یہ نہیں معلوم کہ مؤلف تذکرہ شعرائے دکن نے یہ مواد کہاں سے فراہم کیا۔ نصرتی کی تصنیفات حسب ذیل ہیں :-

مثنویاں

(۱) علی نامہ سنہ ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۶۵ء میں نصرتی نے ایک طویل مثنوی لکھی جس کا نام علی نامہ ہے جس میں اپنے محسن علی عادل شاہ کے اکثر واقعات نظم کئے ہیں۔ اس میں علی عادل شاہ کے سوانح و فتوحات اور مجالس عیش و طرب کے واقعات کا بھی ذکر ہے۔ ان کے ضمن میں مختلف مواقع پر قصائد مدحیہ بھی رچے ہیں اس کتاب کو زبان دکنی میں سب سے پہلی کتاب سمجھنا چاہیے جو ایک بادشاہ کی تعریف میں بصورت قصیدہ لکھی گئی۔

(۲) گلشن عشق۔ دوسری مثنوی کا نام گلشن عشق ہے اور یہ سنہ ۱۱۶۵ھ ہجری مطابق ۱۷۶۵ء میں تحریر ہوئی تھی۔ اس میں ایک شخص مسلمی بہ کنور منوہر سپہ سوار بھلا اور مدد مالتی کے عشق کا ذکر ہے۔ اس قصہ کو مختلف لوگوں نے مختلف انداز سے لکھا ہے۔ عاقل خاں رازی نے اسی قصہ کو فارسی میں نظم کیا ہے اور

شمع و پروانہ اُس کا نام رکھا ہے۔ یہ شنوی اپنی رنگین تشبیہوں اور استعارات کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر ہے۔ گلشن عشق کے اشعار بعض تو نہایت صاف ہیں اور بعض نہایت ادق۔ کہیں عربی و فارسی کی آمیزش نظر آتی ہے تو کہیں بھاشا کی ہتات ہے۔ اس کے دیباچہ میں حسب معمول اپنے محسن علی عادل شاہ کی تعریف کی ہے۔

بقول سید شمس اللہ صاحب قادری یہ میری شنوی ہے
مگر بقول ڈیٹا سی یہ عاشقانہ غزلوں اور نظموں کا

(۳) گلشن عشق مسند
مشاعر لطیف و مستطیع

مجموعہ ہے۔ نصرتی کا ایک قصائد کا مجموعہ اور ایک غزلیات کا دیوان ہے۔ مؤلف گل رعنا نے نصرتی کا معراج نامہ بھی دیکھا ہے۔ یہ بڑا محمد عادل شاہ لکھا گیا تھا ایک سو اکتیس شعرا میں ہیں۔ بھاریسی ہے جو فارسی اور ہندی میں مشترک ہے۔ ابراہیم زبیری نے نصرتی کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے اور ان کی مضمون کو بڑی ضرورت طبع اور ادب و تخلیل کو خاقانی کے ہم پایہ قرار دیا ہے۔ سرچارلس لائل کا خیال ہے کہ یہ بہترین تھے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

ہاشمی سید میراں نام اور بیجا پوران کا وطن تھا۔ ہاشمی تخلص تھا۔ سید شاہ ہاشم علوی کے مرید تھے اور اسی مناسبت سے ہاشمی تخلص کرتے تھے۔ ہاشمی مادر زاد اندھے تھے مگر نہایت طباع اور ذہین آدمی تھے۔ ہندی اشعار مزے کے کہتے تھے۔ اپنے مرشد کی فرمائش سے یوسف زلیخا نام ایک شنوی دکنی میں لکھی اور یہ سنہ ۹۹۰ھ میں تمام ہوئی۔ اس میں چھ ہزار سے زیادہ ابیات ہیں اور دکنی لہجہ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ شمس اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ ”ہاشمی نے

اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا جس میں قصائد و غزلیات کے علاوہ مرثیے اور قطعات اور رباعیات بھی تھے۔ یہ مجموعہ اس وقت نایاب ہے لیکن جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں جب قدر غزلیات ہیں ان کا بیشتر حصہ ریختہ کے بجائے ریختی میں ہے۔ "قدیم بھاشا کا رنگ ان کے کلام میں بہت ہے اکثر جگہ صنعت ایہام سے کام لیتے ہیں اور ہندی شاعری کی متابعت میں عورت کا عشق مرد کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔ ہاشمی نے بقول قادری مسئلہ ھ میں انتقال کیا۔

دولت یہ بھی ایک دکنی شاعر ہیں۔ انھوں نے شہزادہ میں ایک قصیدہ موسوم بہ شاہ بہرام و بانوے حسن تصنیف کیا۔ جس میں بہرام گور اور ایک پری موسوم بہ بانوے حسن کے عشق کا ذکر ہے اور شہر دیو سپید میں بہرام گور کو عجیب واقعات پیش آئے تھے ان کا بھی ذکر ہے۔

شاہ ملک ان کا ذکر اردوے قدیم میں ہے۔ شاہ ملک بیجا پور کے باشندے اور علی عادل شاہ کے معاصر تھے انھوں نے ایک رسالہ احکام الصلوٰۃ کے نام سے نظم دکنی میں لکھا ہے اور اس میں نماز کے فرائض و احکام بیان کیے ہیں یہ رسالہ کسی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے اور شہزادہ میں تمام ہوا۔

شاہ امین شیخ امین الدین اعلیٰ کا تخلص ہے۔ آپ بیجا پور کے اولیائے کبار سے ہیں اور علی عادل شاہ کے زمانہ میں تھے۔ شہزادہ میں آپ کا انتقال ہوا آپ پر شب دروز محویت و مستغراق کی کیفیت طاری رہتی تھی اور اس حالت میں آپ نظم ارشاد فرماتے تھے۔ مریدوں نے ان کے عرفان حقائق کو جمع کیا اور

اجس مجموعہ کا نام جواہر الاسرار رکھا۔ دوسرے ان سے اور یادگار ہیں۔
رسالہ قریبہ۔ رسالہ وجودیہ -

دکن میں مرثیہ کی ابتدا مرثیہ نویسوں میں سب سے پہلے شیخ شجاع الدین نوری
بیجاپوری تھے۔ یہ اکبری دور کے شاعر تھے۔ اگرہ گئے اور ایک زمانہ تک ابو الفضل
وفیضی کا ساتھ رہا۔ ان کے بعد اور بھی مشہور مرثیہ گو گذرے جن کا ذکر ایک دوسرے
باب میں ہوگا۔ یہاں پر صرف ان کے نام لکھے جاتے ہیں۔ ہاشم علی برہان پوری -
قطب شاہی دور کے کاظم علی۔ رام راو و سیوا۔ سیوانے روضۃ الشہداء
و قانون اسلام لکھیں -

شعرے دکن بیجاپور و گولکنڈہ کو مغل بادشاہوں نے فتح کر لیا اور
مغلوں کے حکمرانوں میں ان سلطنتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن شعراے اُردو کی
قدرو مراعات میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ زبان اُردو کے عام ہونے کی وجہ سے
تمام ملک میں اُردو شعر و شاعری پھیل گئی۔ اس زمانہ کے مشہور اُردو شعرا ذیل
میں درج ہیں -

عاجز محمد علی تخلص عاجز۔ اورنگ زیب کی فتوحات دکن کے زمانہ میں موجود
تھے۔ ان کی تصنیفات سے قصہ فیروز شاہ ہے جو اُردو میں محبوب القلوب کا
ترجمہ ہے دوسری تصنیف قصہ لال و گوہر ہے اس میں لال زمر بادشاہ بنگال
کے فرزند اور گوہر چوہا ہر شاہ بنگال کی دختر کے عشق و محبت کا افسانہ مذکور ہے۔
قصہ ملکہ مصر بھی عاجز نے فارسی سے دکنی میں نظم کیا۔ عاجز کا ذکر شرح طوز
اُردو سے قدیم و تازہ پنج شعراے دکن میں درج ہے -

بحری قاضی محمود متخلص بہ بحری ولد بحر الدین دکن کے ایک صوفی مشرب بزرگ تھے ۹۵۰ھ کے قریب اپنے وطن سے بیجا پور چلے گئے اور وہاں سکندراعادل شاہ کے دربار میں دو سال رہے اور جب ۹۵۰ھ میں سلطنت تباہ ہو گئی تو حیدر آباد چلے آئے۔ فارسی اور دکنی زبانوں میں مثنویات غزلیات رباعیات اور قصائد لکھے جن کے اشعار کی تعداد پچاس ہزار کے قریب تھی مگر یہ سب ذخیرہ راستہ میں تلف ہو گیا۔ آپ کی تصنیف ”من لکن“ تصوف میں ایک مثنوی ہے اور یہ زبان دکنی اللہ بحری میں تمام ہوئی۔ زبان اسکی مشکل اور الفاظ سخت ہیں۔

امین شیخ محمد امین متخلص بہ امین عہد اورنگ زیب میں گزرے۔ انھوں نے یوسف زلیخا کے مسانہ کو دکنی میں ۹۵۰ھ میں منظوم کیا۔

دلی دکنی سید محمد فیاض نام۔ ملا محمد باقر آگاہ نے مرآۃ البھان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ دیوران کا وطن تھا۔ عالمگیر کے زمانہ میں گزرے ہیں۔ دکن میں سات گڑھ ایک تاریخی مقام ہے وہاں حراست خان نام ایک امیر رہتا تھا۔ ولی عرصہ تک اسکی رفاقت میں رہے پھر وہاں سے نکل کر کڑیہ میں چلے آئے۔ یہ واقعات ولی نے ”رتن پدم“ کے دیباچے میں بیان کیے ہیں اسکو ولی نے سدھوٹ میں لکھا تھا۔ یہ مثنوی ضخیم ہے۔ دوسری تصنیف ”روضۃ الشہداء“ ہے اس میں کر بلا کے واقعات منظوم کیے ہیں اور یہ ۹۵۰ھ میں لکھی گئی تھی۔ ان کے علاوہ ایک مناجات بھی لکھی ہے۔

دجدی بقول نصیر الدین ہاشمی مؤلف اردوے دکن ”اس متخلص کے

دکن میں دو شاعر ہوئے ہیں ایک وجہی سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں تھا جس نے تحفہ عاشقاں ۱۱۵۳ھ میں لکھی اور دوسرے وجہی تھنوں نے بارہویں صدی میں کئی ایک مثنویاں لکھیں اُس میں سے ایک بھی نام ہے جو شیخ فرید الدین عطار کے منطق الطیر کا ترجمہ ہے جس کو وجہی نے ۱۱۵۳ھ میں ترتیب دیا بقول مولف اُردو سے قدیم مثنوی تحفہ عاشقاں شیخ فرید الدین عطار کی مثنوی گل و ہرگز کا ترجمہ ہے جو خسرو نامہ یا خسرو گل بھی کہلاتی ہے یہ مثنوی ۱۱۵۳ھ میں ختم ہوئی اور خاتمہ میں اسکی تعریف اس طرح مذکور ہے -

دسے اسکی تاریخ مجھ کو عیاں	پچھانو اس سے تحفہ عاشقاں ۱۱۵۳
----------------------------	-------------------------------

غالباً مولف اُردو سے قدیم کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے ان سے ایک اور ضخیم مثنوی یادگار ہے۔ اُس کا نام مثنوی باغ جانفزا ہے ۱۲۵۵ھ میں تصنیف ہوئی اور "باغ جانفزا" سے اسکی تاریخ نکالی ہے یہ

آزاد فقیر اللہ متخلص بہ آزاد حیدر آباد کے باشندے اور ولی اورنگ آبادی کے معاصر تھے ان کا ذکر تذکرہ شعرا میر حسن و نکات الشعرا میں درج ہے -

شعراے اورنگ آباد اورنگ زیب جب دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا تو اُس نے کھر کی کو اپنا صدر مقام قرار دیا اور اُس کا نام اورنگ آباد رکھا۔ اس کے بعد اورنگ زیب کی عمر کا بیشتر حصہ اسی شہر میں بسر ہوا اور ایک عرصہ تک یہ شہر سلطنت مغلیہ کا مرکز رہا۔ اس تقریب سے ہندوستان اور دہلی کے بڑے بڑے امرا و علما و مشائخ جن کو شاہی دربار سے کسی قسم کا بھی واسطہ تھا اورنگ آباد

چلے آئے اور حیدر آباد و بیجا پور کی تباہی کے بعد یہاں کے باشندے بھی اورنگ آباد کی جانب متوجہ ہوئے۔ اس دور میں بہت سے شاعر گزرے جن کے حالات سید عبدالولی عزالت کی بیاض لکھی نرائن شفیق کے حینستان شعرا میر بہار الدین عروج کے بہار و خزاں اور محمد فضل کے تحفۃ الشعراء و تذکرہ موسوی خاں میں تحریر ہیں میر حسن نے بھی اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔

ولی کو اردو شاعری کے ساتھ وہی نسبت ہے جو چاکر کو انگریزی کے ساتھ اور رودکی کو فارسی شاعری کے ساتھ ہے۔ یہی وہ بزرگ ہستی ہیں جن سے موجودہ اردو شاعری کی بنیاد پڑی۔ آزاد مرحوم کے دعوے کے مطابق اب تک سب کا یہی خیال تھا کہ سب سے پہلے اردو میں دیوان جمع کرنے والے ولی ہیں۔ مگر جب سے کہ قطب شاہیوں کے دواوین دستیاب ہو گئے اُس وقت سے اس خیال کی تردید ہو گئی مگر اس واقعہ سے ولی کے کمال میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اردو شاعری کو ان کی وجہ سے جو تقویت پہنچی وہ کبھی زائل نہیں ہو سکتی۔ ان کو ان کے معاصرین اور اب بعد کے قریب الہد شعرا مثلاً شاہ حاتم وغیرہ سب نے استاد مانا ہے اور ان کے کلام کی بڑی قدر کی ہے۔

نام کے متعلق اختلاف ولی کے نام میں اختلاف ہے بعضوں کے نزدیک ان کا نام شمس الدین اور تخلص ولی ہے اور بعض محمد ولی نام شمس الدین نقب اور ولی تخلص بتاتے ہیں۔ میر حسن دہلوی مرزا علی لطف و شاخ و بلوچ ہارٹ کے نزدیک شاہ ولی السد نام ہے۔ اور نواب علی ابراہیم اور یوسف علی و آزاد شمس ولی اللہ

کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس اختلاف کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسی عہد میں شمس ولی اللہ نام ایک صوفی احمد آباد میں رہتے تھے۔ جن کے توافق نام کی وجہ سے یہ خلط ملط واقع ہو گیا۔

مقام پیدائش اور خاندان کے متعلق اختلاف + ۲

گارسن ڈیٹا سی۔ بلوم ہارٹ۔ اور میر حسن کا یہ خیال ہے کہ ولی احمد آباد میں پیدا ہوئے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اُن کی ولادت اورنگ آباد میں ۱۷۶۹ء مطابق ۱۱۸۰ھ میں ہوئی جسکی تصدیق میر تقی میر کے تذکرہ نکات اشعار سے بھی ہوتی ہے دلی کا تعلق خاندانی شاہ وجیہ الدین علوی کے ساتھ صحیح نہیں معلوم ہوتا بلکہ وہ اورنگ آباد کے شیوخ قادریہ میں سے تھے۔ البتہ وہ شاہ وجیہ الدین کے خاندان میں بعیت رکھتے تھے۔ کیونکہ جو قصائد اور ترجیع بند وغیرہ انھوں نے ان بزرگ کی شان میں لکھے ہیں اُن سے اُن کے حسن عقیدت کا اظہار ہوتا ہے مگر شجرہ اولاد شاہ وجیہ الدین علوی میں اُن کا نام کہیں نہیں پایا جاتا۔ اُن کے کلام سے پایا جاتا ہے کہ وہ گجراتی نہ تھے بلکہ دکنی تھے اور دکنی الفاظ بھی بہ کثرت استعمال کیے ہیں۔ جو لوگ اُن کے گجراتی ہونے کے مدعی ہیں وہ اپنے دعوے کی تائید میں اُن کا ایک قصیدہ پیش کرتے ہیں جس میں انھوں نے گجرات سے مفارقت پر اظہار ملال کیا ہے۔ مگر ہماری رائے میں یہ کافی ثبوت اس امر کا نہیں ہو سکتا کہ گجرات انکا مولد و سکُن تھا۔ اسی طرح اُس ثنوی سے بھی جو شہر سورت کی تعریف میں لکھی ہے اُن کا گجراتی الاصل ہونا پایا نہیں جاتا۔

حالات زندگی

اورنگ آباد میں پیدا ہوئے جہاں بیس برس تک تحصیل علوم

کرتے رہے بعد ازاں احمد آباد گئے جو اُس زمانہ میں علوم و فنون کا مرکز تھا۔ اور شاہ وجیہ الدین علوی کے مدرسہ میں جہاں لوگ مختلف مقامات دور و دراز سے تحصیل علوم کے لیے آتے تھے داخل ہوئے اور تھوڑے عرصہ کے بعد اس خانہ دان کے مُرید ہو گئے کچھ دنوں بعد اپنے وطن آکر شعر و شاعری شروع کی اور اُس میں انھیں پورا انہماک ہو گیا۔ ان کا کلام تقریباً سب اصنافِ سخن میں موجود ہے۔ یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی، مستزاد، رباعیات، ترجیع بند وغیرہ۔ پھر احمد آباد گئے جہاں انھوں نے اپنے احباب کو اپنا کلام سُنا یا اور انھوں نے اُس کو بہت پسند کیا۔

دلی کے دوسرے تذکروں میں ہے کہ ولی دومرتبہ دلی آئے ایک مرتبہ شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد یعنی سن ۱۰۷۰ء میں۔ اس مرتبہ شاہ سعد اللہ گلشن سے ملاقات ہوئی جنھوں نے فرمایا کہ ”یہ سب مضامین جو بیکار فارسی میں بھرے پڑے ہیں ان کو زبانِ ریختہ میں کام میں لاؤ تم سے کون محاسبہ کریگا“ اس واقعہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ولی میاں گلشن کے شاگرد ہوئے تھے۔ البتہ اُن سے عقیدت رکھتے تھے اور مذاقِ تصوف بھی انھیں کی صحبت میں حاصل کیا تھا۔ دوسری مرتبہ سید ابوالمعالی کے ساتھ سفر کیا جس میں دلی اور سرہند کے مزارات کی زیارت کی۔ سید ابوالمعالی سے ان کو کمالِ محبت تھی جو درجہ عشق کو پہنچ گئی تھی۔ ولی کا یہ دوسرا سفر محمد شاہ کے عہد سلطنت میں سن ۱۱۲۲ھ مطابق سن ۱۷۰۹ء میں ہوا اس سفر میں ولی اپنے ساتھ اپنا دیوانِ ریختہ لائے تھے جسکی نہایت قدر دانی کی گئی اور جو بہت مقبول اور ہر دلعزیز ہوا۔ اور یہاں تک شہرت ہوئی کہ

امرا کی محفلوں اور جلسوں اور کوچے و بازار میں اُسکے اشعار لوگوں کی زبان پر تھے اُن کے اشعار کو سن کر لوگوں کو شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا۔

۱۲۱ھ میں دہلی سے اورنگ آباد واپس آئے جہاں شہزادے کر بلا کی شان میں ایک شہنوی موسوم بہ دہ مجلس تصنیف کی جسکے ان دو آخری شعروں سے اُس کا سنہ تصنیف اور اُس کی زبان کا حال معلوم ہو جاتا ہے :-

ہو ہے ختم جب یو درد کا حال	تھا گیارہ سو پہ کتا لیوں سال
کہا ہاتھ لے کر تو تاریخ معقول	دلی کا ہے سخن حق پاس مقبول

اس شہنوی کو فضلی نے نشر کے قالب میں ڈھالا۔ جو اصل کتاب سے بھی زیادہ مقبول ہے صاحب گلشن ہند لکھتے ہیں کہ دلی کا ایک ہندی دیوان بھی ہے مولانا آزاد اور مصنف گل رعنا کا بیان ہے کہ دلی نے دیوان کے علاوہ تصوف میں بھی ایک رسالہ نور المعرفت لکھا ہے لیکن وہ ناپید ہو گیا ہے۔

وفات دلی کو گجرات سے ایسی دلچسپی ہو گئی تھی کہ اورنگ آباد میں کچھ دنوں رہ کر پھر احمد آباد چلے گئے جہاں بقول تذکرہ شعراے دکن ۵۵۷ھ مطابق ۱۱۶۳ء میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔

دلی کے بہت سے دوست تھے جن سے ان کو خاص محبت اور خلوص تھا مثلاً لالہ کھیم داس اورنگ آبادی۔ امرت لال۔ گوہر لال۔ اور محمد یار خاں دہلوی وغیرہ۔ ان سب کا ذکر مناسب مقام پر اُن کے اشعار میں موجود ہے۔ وہ گو کہ حنفی المذہب تھے جیسا کہ صحابہ کبار کی تعریف سے ظاہر ہے جو اُن کے اشعار میں موجود ہے مگر ساتھ ہی کسی مذہب دلت سے اُن کو کوئی تعصب تھا

کیونکہ وہ ایک صوفی منش فقیر مشرب شخص تھے۔ انھوں نے بہت سیر و سیاحت کی تھی اور اکثر مقامات دور و دراز کو دیکھا تھا۔ بنگال میں اُن کا جانا پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔ مگر گارسن ڈیٹاسی اُن کے کسی شعر سے جس میں حسن بنگالہ کی تعریف ہے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ بنگال بھی گئے تھے البتہ ستارا۔ دلی۔ اور سورت کا سفر یقینی ہے اس وجہ سے کہ ان تمام مقامات کی تعریف اُن کے اشعار میں موجود ہے مثلاً سورت کی تعریف میں ایک مثنوی میں کہتے ہیں :-

عجب شہروں میں ہے پر نور اک شہر	بلا شک ہے وہ جگ میں مقصد دہر
کہ ہے مشہور اس کا نام سورت	کہ جاوے جسکے دیکھے سب کہ ورت
بھری ہے سیرت و صورت سول سورت	ہر اک صورت ہے واں انمول صلت

دلی نے کسی امیر یا بادشاہ کی تعریف میں اشعار نہیں کہے مگر فارسی کے متبع میں اپنی شان میں اکثر فخریہ اشعار کہے ہیں جن میں جا بجا معاصرین پر چوٹیں ہیں۔

کلام پرارے اُن کی تصانیف بہ اعتبار قدامت اور نیز بہ اعتبار زبان بہت دلچسپ ہیں عبارت آسان اور سہل ہے۔ شعراے مابعد نے ان کا متبع کیا ہے اور انھیں کی شاعری سے شمالی ہند میں شعر کی بنیاد مضبوط ہوئی۔ یادگی سہل است اور ترنم ان کے کلام کے جوہر ہیں۔ اشعار میں روانی بے تکلفی اور آمد ہے اور صنائع بدائع کثرت نہیں ہیں۔ بعض شعر تو ایسے صاف ہیں کہ بالکل نمازہ حال کے معلوم ہوتے ہیں مثلاً :-

دل چھوڑ کے یار کیونکہ جاوے	زخمی ہے شکار کیونکہ جاوے
دشمن دیں کا دین دشمن ہے	راہزن کا چراغ راہزن ہے

<p>کرتی ہے نگہ جس قدر نازک پہ گرائی سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ جسے وہ زلف دستاویز ہو روز قیامت میں</p>	<p>آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اُسکو عجب کچھ لطف لکھتا ہے قحطیت میں دہرے گناہوں کی سینہ نامی سے کیا غم اُس پرشیاں کو</p>
<p>اک نگہ میں غلام کرتے ہیں دیکھ کر حسن بے حجاب سخن جس کو ہے نشہ شراب سخن تا قیامت کھلا ہے باب سخن جس نے دیکھا ہے آب تاب سخن جز سخن نہیں دو جا جواب سخن دل ہوا ہے مرا کباب سخن مجھ کو دیتے ہیں سب حساب سخن</p>	<p>خوبرو خوب کام کرتے ہیں دل ہوا ہے مرا خراب سخن بزم معنی میں سرخوشی ہے اُسے راہ مضمون تازہ بند نہیں گو ہر آنکی نظر میں جانہ کرے ہے سخن جگ منے عدیم المثل شعر فہموں کی دیکھ کر گرمی عرفی و انوری و خاقانی</p>
<p>اے قوی درد سر بھونہ رہے جب ملے صندل و گلاب سخن</p>	
<p>مزاداد و دنام داؤد تخلص وطن اوزنگ آباد ولی کے معاصر تھے اور ۶۷۱ھ میں انتقال کیا۔ ایک چھوٹا سا دیوان ان سے یادگار ہے۔</p>	<p>سراج سید سراج الدین نام آپ سادات حسینی خاندان مشائخ سے تھے۔ اوزنگ آباد کے رہنے والے تھے اور وہیں تربیت و تعلیم پائی۔ غالباً آپ ۷۲۰ھ میں پیدا ہوئے آپ نے اپنا حال منتخب دواوین کے دیباچے میں لکھا ہے۔</p>
<p>۱۷ ماخوذ از اردوے قدیم ۱۲</p>	

اس منتخب کا تاریخی نام "منتخب دیوانہا" ۶۹۱ھ ہجری ہے۔ سراج نے اس میں
 متقدمین و معاصرین شعرا کے فارسی کلام کا انتخاب کیا ہے۔ مجموعہ ضخیم ہے اور انہیں
 کسی ہزار اشعار ہیں۔ دو اوین فارسی کا اس طور پر انتخاب کیا ہے جس سے معلوم ہوتا
 ہے کہ آپ نقاد سخن تھے۔ سراج خود لکھتے ہیں "یہ فقیر بارہ برس کی عمر میں جوش جذبہ
 و غلبہ شوق سے سات برس تک برہنہ تن و برہنہ سر رہا۔ اکثر اوقات عالم بخودی
 میں حضرت شاہ برہان الدین غریب دولت آبادی کے روضہ کے اطراف میں
 گھومتا تھا۔ اسی حالت مستی میں اکثر اشعار فارسی زبان سے برآمد ہوتے۔ مگر
 تحریر کے دائرہ میں نہیں آئے اگر وہ تمام اشعار موجود ہوتے تو ایک ضخیم و بزرگ
 دیوان مرتب ہو جاتا۔ پھر مدت مذکورہ کے بعد حضرت خواجہ سید شاہ عبدالرحمن حشتی
 المتوفی ۷۱۱ھ کی خدمت میں پہونچا۔ حسن ارادت سے مرید ہوا۔ ان دنوں میں
 بیاس خاطر عزیز نبی عبدالرسول خاں جو فقیر کے برادر طریقت تھے اکثر اشعار
 رخیتمہ زبان میں لکھے گئے خاں صاحب نے جو اہر متفرق کو جو تخمیناً پانچ ہزار
 اشعار تھے حرف تہجی میں ترتیب دیا اور کامل دیوان شائقین کی خدمت میں
 بھیجا۔ پھر فقیری اختیار کی اور مرشد کے حکم سے شعر گوئی ترک کی۔ سراج ایک
 درویش منش پاکباز بزرگ تھے مسافر و دوست و غریب نواز۔ گوشہ نشین و
 پاکیزہ دل۔ ہفتہ میں ایک روز محفل سماع منعقد فرماتے تھے انہیں شہر کے اکثر عمائد
 و مشائخ جمع ہوتے تھے قوال دگوئے آپ کی غزلیں سناتے تھے۔ مجلس میں آچکا وہ
 رعب و داب تھا کہ اہل مجلس با ادب عالم سکوت میں ہوتے تھے۔ اُس وقت
 دکن میں آپ کے معاصرین میں سے میر غلام علی آزاد بلگرامی۔ عبدالوہاب افتخار

دولت آبادی - ظفر بیگ ظفر اورنگ آبادی - محمد نقیہ درد مند - مرزا محمد باقر شہید -
 وجان مرزا رسا - موسوی خاں جبرأت اورنگ آبادی و عبد القادر سامی اورنگ آبادی -
 عارف الدین خاں عاجز پوری خاں فطرت - خانی خاں - چچمی نرائن شفیق اورنگ آبادی -
 اور میر ولاد محمد ذکا بلگرامی غیر شعرا و علماء و شائخ تھے خوب مشاعرے ہوتے تھے اور سراج
 باوجود گوشہ نشینی مشاعروں میں شریک ہوتے اور کبھی کبھی اصرار سے شعر کہتے -
 میر نے نکات اشعار میں اور حسن نے اپنے تذکرہ میں تحریر کیا ہے کہ سراج کو
 سید حمزہ دکنی سے تلمذ حاصل تھا - مگر دکن میں کسی شاعر کا نام سید حمزہ یا سید حمزہ علی
 نہیں تھا - گمان غالب یہ ہے کہ سراج نے کسی کی شاگردی نہیں کی - سراج نے
 ایک دیوان فارسی کا اور ایک رنجیتہ کا جس میں پانچ ہزار اشعار ہیں اپنی یادگار چھوڑے
 منتخب دیوانہا کا ذکر اوپر ہو چکا ہے - ایک مثنوی بوستان خیال بھی لکھی جس میں
 ایک ہزار سات ابیات ہیں اور گل و بلبل کے انسانے میں جذبات معرفت کی
 ترجمانی کی ہے - یہ مثنوی سلسلہ ہجری میں تمام ہوئی -
 آپ کا کلام بھی ولی کی طرح ایہام و زوہد معانی الفاظ سے پاک و صاف
 ہے - سیدھا سادہ بیان ہے بکلف و بناوٹ کا نشان نہیں - اکثر غزلوں
 میں حُسن و عشق کے کرشمے بعض اشعار میں توحید و معرفت کا نقشہ مضامین میں
 شگفتگی خیالات میں بلندی اور پھر کلام میں صفائی اور سادگی موجود ہے -
 رنجیتہ گوئی میں ولی کے قائم مقام تھے - دکن میں استاد کی تربت کو پہونچنے والی نے
 اس زمین میں جو کچھ پودے جمائے تھے اور جو کچھ سبزے لگائے تھے سراج نے
 اُن کو اپنی توجہ کے پانی سے سیراب و شاداب کیا - آپ نے چوتھی شوال

یوم جمعہ ۱۱ھ میں انتقال فرمایا۔ یہ غزل سراج کی بہت مشہور ہے۔

خبر تحیر عشق حسن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
نشہ بچو دی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی
چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چین سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سوہری رہی
نظر تغافل یا رکہ گلہ کس زباں سیں بیاں کروں
کہ شراب صد قدح آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی
وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخہ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جیوں ہری تھی یونہی ہری رہی
ترے جوش حیرت حسن کا اثر اس قدر سیں عیاں ہوا
کہ نہ آئینہ میں جلا رہی نہ پری کی جلوہ گری رہی
کیا خاک آتش عشق نے دل مٹیوائے تیرا ج کون
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

اس دور میں بہت سے شاعر گذرے ہیں جن کا ذکر بوجہ طوالت
نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ان کے نام و حالات تذکرہ چھپی نرائن
و تذکرہ موسوی خاں و نکات الشعر امیر تذکرہ شعرائے اردو میر حسن۔ تذکرہ شعرائے
دکن مولفہ عبد الجبار خاں ملکا پوری۔ و دکن میں اردو مولفہ نصیر الدین ہاشمی سے

دیگر شعرا
اس دور کے

معلوم ہو سکتے ہیں۔ بعض مشہور شعرا اس زمانہ کے حسب ذیل ہیں:- عارف الدین عاجز -
 سید عبدالولی عزلت - یار - محرم - آیہ - داغ - رنگین - قہدی - عزیز -
 صدارم - قہر - پناہ - رضا - عراقی - مہتاب - شرافت - شہید - ضیا - کاظم
 بہتلا - نجم - بہم - درد - حشمت - حاجی - قادر - فخر - فوت - قدر -
 ان میں عزلت اور عاجز زیادہ مشہور و نام آور ہیں اور جو حالات کہ مصنف
 اگلے عنوانے ان شعرا کے درج کئے ہیں وہ زیادہ تر تذکرہ شعراے دکن سے
 ماخوذ ہیں۔

مولوی محمد باقر متخلص بہ آگاہ و یلور میں پیدا ہوئے اور انھوں نے
 اردو زبان میں سیر - عقاید فقہ کی متعدد کتابیں لکھیں ۱۱۵۵ھ
 سے انھوں نے تصنیف کا کام شروع کیا ۱۲۲۰ھ میں انتقال فرمایا۔ ان کے
 بزرگان سلف و طنائیجا پوری تھے مولف شمع انجمن لکھتے ہیں کہ در خیابان کرناٹک
 ہجوا و نہالے سر بالا نکرده و از گل زمین مدراس مثل او گل خوش رنگ نہ دمیدہ
 اردو تصنیفات کی فہرست حسب ذیل ہے۔ بہشت بہشت - تحفۃ الاحباب -
 تحفۃ النساء - فرائد در عقائد - ریاض الجنان - محبوب القلوب - روضۃ السلام
 گلزار عشق - قصہ رضواں شاہ - روح افزا - خمسہ متحرہ - مثنوی روپ سنگار -
 ارکاٹ کے دربار کے مدار المہام شرف الملک مولانا محمد غوث - اور ان کے خلف
 مولانا قاضی بدرالدولہ نے بھی کئی کتابیں اردو میں لکھیں۔ اُس وقت کے شعرا کے
 نام ذیل میں رقم ہیں۔ محمود - صبا ئی - احمد - اعظم -

باب

اساتذہ دہلی

حصہ اول طبقہ متقدمین

حاتم و آبرو کا زمانہ

دہلی میں اردو زبان کی ابتدا و ترقی۔
 اردو زبان دکن میں نویں صدی سے پہلے ادبی صورت حاصل کر چکی تھی اور اُس میں اُس زمانہ سے تصنیف و تالیف کا آغاز ہو گیا تھا۔ بابر خلافت اسکے جہان شک معلوم ہوا ہندوستان میں بارہویں صدی کے آغاز تک یہ زبان محض بات چیت اور لین دین تک محدود رہی۔ مولانا جمال جوشمند شاہ بابر کے معاصر تھے اور ۹۴۲ھ ہجری میں فوت ہوئے۔ ملا نور محمد جو عظیم پور کے باشندے تھے اور اکبر کے زمانہ میں گذرے ملا فیضی سے نہایت اتحاد رکھتے تھے اُن کا ذکر میر حسن نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے اور شیخ سعدی نے اگرچہ ایسے اشعار کہے ہیں جو آدھے فارسی اور آدھے اردو ہیں لیکن یہ باقاعدہ اور علمی شاعری نہ تھی۔ بابر اکبر و جہانگیر شاہ جہاں اور اورنگ زیب کی اور اُن کے عہد کی تحریرات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوؤں کی زبان پر عربی و فارسی کے الفاظ چڑھ رہے تھے اور اسی طرح

مسلمانوں کی زبانیں بھی ملکی زبانوں کے زیر اثر تھیں۔ اس کے نوے اُردو سے قدیم اور تذکرہ گل رعنائیں موجود ہیں۔ شاہ جہاں کا اُردو میں شفقہ لکھنا اور رنگِ سب کا اپنے رقعات میں اردو الفاظ استعمال کرنا اس بات کی بین دلیل ہے کہ اُردو زبان اس زمانہ میں ملک کی عام زبان ہو گئی تھی۔ بازار سے شاہی محلات تک خاص و عام اس کو پولتے اور سمجھتے تھے لیہ

عالمگیر کے زمانہ سے دلی میں اُردو شعر گوئی نے رواج پایا اور اس جانب سب سے پہلے فارسی شعر نے توجہ کی۔ موسوی خاں فطرت۔ مرزا عبد القادر بیدل۔ مرزا عبد الغنی قبول وغیرہ فارسی کے نامور شاعر تھے لیکن تفریح خاطر کے لئے اُردو میں بھی دو چار شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ محمد شاہ کے عہد سے پہلے لوگ خانہ جنگیوں میں مبتلا اور مرہٹوں کے حملوں سے پریشان تھے۔ محمد شاہ کے زمانہ میں سادات کی قوت ٹوٹ جانے پر کچھ عافیت نصیب ہوئی اُس وقت ادھر ادھر سے سمٹ کر دلی میں سب لوگ مجتمع ہو گئے۔ محمد شاہ کی نگلی طبعیت نے رنگ دکھایا۔ قزلباش خاں امید سلیمان قلی خاں قوداد۔ علی قلی خاں ندیم شیخ سعد اللہ گلشن۔ مرتضیٰ قلی خاں فراق۔ میر تمس الدین فقیر مرزا عبد القادر بیدل سراج الدین علی خاں آرزو ایسے بڑے بڑے صاحب فضل و کمال دلی میں جمع تھے۔ شمس دلی اللہ دکن سے آگئے۔ فراقی۔ فخری۔ آرزو وغیرہ بھی دکن سے آئے۔ دلی کچھ دنوں کورہ گئے اور اُن کا رنگ دلی میں خوب چمکا ہر طرف سے قدر دانی کی گئی جو شعر صرف فارسی میں اظہار کمال کرتے تھے اُنکو اُردو میں بھی

شعر کہنے کا شوق ہوا۔ اُمید تبدیل۔ فراق۔ آرزو نے اُردو میں طبع آزمائی کی اور یہ زبان دلی سے اُردو کے معنی کا خطاب پا کر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔

اُردو لغات کی ترتیب قریب قریب عالمگیر کے زمانہ میں اہل ہندوستان کو اُردو

لغات کی ترتیب و تدوین کا خیال پیدا ہوا۔ ملا عبد الواسع ہانسوی نے دہلی تو اُردو فارسی اور گلستاں بوستاں کی شرحیں نہایت مشہور ہیں) عالمگیر کے زمانہ میں اُردو ہندی الفاظ کا ایک لغت مدون کیا اور اُس کا نام ”غرائب اللغات“ رکھا اُردو الفاظ کے معنی فارسی میں لکھے۔ ایک عرصہ کے بعد سراج الدین علیخان آرزو نے اس کی نظر ثانی کی۔ بہت سے الفاظ اور معنی اضافہ کیے۔ غلطیاں درست کیں اور اُسے ”لوا اور لا لفاظ“ کے نام سے موسوم کیا۔

دلی کے پڑنے شاعر جو شاہراہ ولی نے دکھلائی تھی اُس کے پیرو دہلی میں بہت پیدا ہو گئے۔ آبرو۔ حاتم۔ ناجی مضمون۔ مرزا مظہر جان جاناں کو جو ولی کے ہم عصر تھے اور فارسی میں خوب کہتے تھے، رخیہ کا آباے قدیم سمجھنا چاہیے یہی وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن کی آغوش تربیت میں نو نوال اُردو کے پرورش پائی اس مبارک عہد میں زبان نے بہت کچھ بچگی حاصل کی شاعری کے واسطے کوئی خاص طرز اب تک مقرر نہیں ہوا تھا اور نہ اغراض شاعری کے واسطے کوئی خاص مناسبت زبان میں پیدا ہوئی تھی۔ بہت سے سخت اور بھدے دکنی لفظ و زبان کے ساتھ اُن کی خدمات محاورات جو دیوان ولی کی بدولت زبان میں داخل ہو گئے تھے چھانٹنا اور نکالنا پڑے۔ اسی وجہ سے ان حضرات کی خدمات

تصفیہ زبان کے متعلق بہت لائق تحسین ہیں۔ انھوں نے یہ مشکل کام بہت حسن و خوبی اور بڑی محنت و جانفشانی سے انجام دیا اسی لئے اُن کی قابلیت اور خوش مذاقی کی داد دینا چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ بھاشا الفاظ کی خوبصورتی اُن کی نظر میں نہ محض ورنہ اپنے ملک کے دیسی الفاظ کے بدلے غیر ملکی الفاظ کم لیے جاتے مگر اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں نے اس کاٹ چھانٹ اور متروکات کے خارج کرنے میں بڑی قابلیت اور دقت نظر سے کام لیا۔ اور بھدے، نا تراشیدہ محاورات اور تراکیب کی جگہ خوشنما محاورے اور دلکش ترکیبیں داخل کیں جو کہ عموماً فارسی سے لی گئیں کیونکہ اُسی کے وہ مشاق تھے۔ زبان میں چونکہ لوج اور قوت جذب پہلے ہی سے موجود تھی اس لیے یہ سب جدید تصرفات اُس نے آسانی سے قبول کر لئے۔

صنعت ایہام دل کے معاصرین صنعت ایہام کے بہت شائق تھے جس کا ذکر پیشتر کیا گیا یہ صنعت بھاشا کی شاعری میں بہت مقبول ہوئی اور وہ ہروں کی جان ہے قدامت کے کلام میں ایسے ذو معنی اشعار بہ کثرت ہوتے ہیں یہ محمد امجدی دور کی خصوصیت ہے شاہ مبارک آبرو، یک رنگ، شا کرناجی و شاہ حاتم وغیرہ نے اس رنگ کو خوب بڑا اور اُس کو اپنا مستقل فن بنا لیا تھا مگر شاہ عالم کے زمانہ میں اس میں ترمیم و اصلاح ہوئی اور مظہر سودا، میر تقی عالم نے اس کا رواج بہت کم کر دیا اور میر درد، فقیر دہلوی اور میر حسن کے عہد میں یہ رنگ قریب قریب خارج ہو گیا میر فرماتے ہیں ۵

کیا جانے دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

سودا فرماتے ہیں ۷

یک رنگ آن کی نہیں خوش مجھکو دورنگی

منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

قائم چاند پوری ۷

ہو دم دم مرا کیوں خوش کہ وہ بت چیں

یہ کہ گیا ہے کہ کونکا آج میں سرشام

بطور ہزل ہے قائم یہ گفتگو ورنہ

تلاش ہے یہ مجھے ہونہ شعر میں ایہام

تصوف | ایک دوسری خصوصیت اُس زمانے کی یہ تھی کہ شاعری پر

تصوف کا رنگ بہت غالب تھا۔ یہ رنگ اُس زمانے میں عالمگیر تھا۔ وجہ

یہ تھی کہ شعرا اکثر صوفی مشرب ہوتے۔ یا کم از کم آخر عمر میں ہو جایا کرتے تھے

پیری مریدی کا بازار گرم تھا۔ فارسی شاعری متاخرین کے کلام میں تصوف

میں ڈوبی ہوئی تھی اور اردو شاعری اُسی کی ناقل تھی۔ دکن میں شاعری کی

ابتداء مذہب سے ہوئی اور تصوف شاعری کا جزو عظم تھا۔ انھیں اسباب سے

اردو شاعری پر بھی تصوف کا رنگ اچھا خاصہ چڑھ گیا۔

سپاہی پیشہ شعرا | اس زمانہ کے شعرا اکثر سپاہی پیشہ ہوتے اس وجہ سے

کہ زمانہ بہت پر آشوب تھا۔ بیرونی حملوں کی کثرت۔ ملک میں بد امنی سلطنت

کی کمزوری۔ ان سب وجوہ سے کسی کا جان و مال محفوظ نہ تھا۔ اور پھر سپہگیری کا

پیشہ نہایت عزت اور منفعت کا پیشہ خیال کیا جاتا تھا۔

کلام میں یک رنگی کی کمی

ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس عہد کے اکثر شعرا کا کلام

یک رنگ نہیں مثلاً کسی غزل کو لیجئے تو اُس کے بعض شعر تو

بہت اچھے ہوں گے مگر بعض شعر نہایت معمولی اور اعلیٰ مذاق سے گرے ہوئے

اور سبک تبدیل الفاظ

اس زمانہ میں معمولی اور سوتیا نہ الفاظ لکھنے میں مطلق عار نہ تھا جسکی وجہ شاید یہ ہو کہ رخیۃ اُس وقت تک تفنن طبع اور تبدیل ذائقہ کے طور پر لکھی جاتی تھی نہ کہ نہیں فراولت اور مشق مد نظر تھی۔ اسی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو آبرو و حاتم ناجی منظر کے یہاں عمدہ کلام کے ساتھ ساتھ بہت سے اشعار ایسے بھی ملیں گے جو ذوق صحیح اور طبع سلیم پر ناگوار ہیں میر اور سودا نے بھی کبھی کبھی ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں خاص کر جہاں شیخ اور زاہد وغیرہ کا خاکہ اڑایا گیا ہے جو اب کسی مہذب صحبت میں شاید ہی استعمال کیے جائیں۔

اس عمدہ کے شعر کا طرز بیان اور ان کے کلام کی خامیاں نظم ابھی سختگی اور کمال کے درجہ پر نہیں پہنچی تھی۔ قواعد عروض کی پابندی بھی مشکل سے ہوتی تھی۔

قافیہ ایسی ضروری چیز اور ردیف تک کے قواعد پوری طرح برتے نہیں جاتے تھے۔ اشعار کی بندش ڈھیلی۔ زوائد کی کثرت جن سے آجکل ہمارے کانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ البتہ زبان میں سادگی اور شیرینی غضب کی ہر

اس دور میں سنسکرت و بھاشا و قدیم دکنی الفاظ کا اخراج ہوا۔ جو کہ میر و سودا کے زمانہ میں جاری رہا اور شیخ ناسخ کے عہد تک جسکی تکمیل ہوئی۔ مورخین ان کو مصلحین زبان کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ صحیح ہے کہ بہت سے بھونڈے الفاظ خارج کر دیے گئے مگر اُس کے ساتھ ہی بھاشا کے بہت سے شیریں۔ خوبصورت اور خوش آہنگ الفاظ بھی نکال دیے گئے عربی و فارسی کے مترادف قبول کیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ عربی و فارسی

اس عمدہ کے شعر کا طرز بیان اور ان کے کلام کی خامیاں

عربی و فارسی الفاظ و خیالات کا داخلہ و سنسکرت و بھاشا قدیم دکنی الفاظ کا اخراج

الفاظ میں صحت کا خیال ہونے لگا قدیم محاورات و الفاظ جو ولی کے زمانے میں مستعمل تھے اُن میں تغیرات پیدا ہونا شروع ہوئے اور جدید محاورے بنانے کی کوشش کی گئی تاریخ شعراء اُردو میں درج ہے کہ ”مگر استعمال الفاظ مکروہ کا اور نہ پروا کرنا باریک باتوں کا یعنی جائز رکھنا قافیہ سبب اور صداد کا اُس کے کلام سے دریافت ہوتا ہے، نہ صرف اُسی کے کلام میں بلکہ اُس کے ہم عہدوں کے کلام میں اُس سے زیادہ ہے۔ شاہ حاتم نے اس طرف توجہ کی اور بہت سے الفاظ کی اصلاح کی جیسا کہ اُن کے ”دیوانِ نژادہ“ کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے۔“

شاہ مبارک آبرو
متوفی ۱۰۷۷ھ

شاہ نجم الدین دہلوی عرف شاہ مبارک متخلص بآبرو محمد شاہ کے زمانہ میں تھے۔ پیدائش کی تاریخ معلوم نہیں شہر صوفی شیخ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں تھے۔ گوالیار میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں دہلی آئے جہاں شعر کہنا سیکھا۔ سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ دار تھے اور انھیں سے مشورہ سخن کرتے تھے صاحب دیوان ہیں مگر فنسوس کہ دیوان زمانہ غدر میں تلف ہو گیا اور اب نایاب ہے۔ ایک مثنوی موسوم بہ ”آرائش معشوق“ بھی لکھی ہے۔ تھوڑے عرصہ تک نارنول میں بھی رہے۔ نہایت خلیق اور متواضع آدمی تھے۔ ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی جسکی وجہ سے مرزا جان جاناں مظہر سے اکثر چشمک چلتی تھی۔ شاہ آبرو ایک شخص پیر کمرن خلف شاہ کمال الدین بخاری سے جو خود بھی شاعر تھے بہت محبت رکھتے تھے جس کا حوالہ اکثر اُن کے شعروں میں ہے۔ اکثر تذکرہ نویس مثلاً میر حسن مصحفی فتحلی۔

اور لطف وغیرہ اُن کے مزاج ہیں اور اُن کے کلام کی تعریفوں سے اُن کی آبرو بڑھاتے ہیں۔ شاہ آبرو متقدمین شعرائیں ہیں اور استعارات و ایہام کے بادشاہ ہیں۔ اسی وجہ سے کبھی کبھی کلام سبک اور مبتذل ہو جاتا ہے۔ گو وسعت معلومات محدود ہے مگر درسیات سے فارغ معلوم ہوتے ہیں اسلئے مطابق سہشتہء ۱۷ میں پچاس برس کی عمر سے متجاوز ہو کر وفات پائی۔

خان آرزو شہلا

۱۷۷۷ء

سراج الدین علی خان متخلص بہ آرزو معروف بہ خان آرزو۔ شیخ حسام الدین حسام کے صاحبزادے ہندوستان کے مشہور شعرا و ناقدان فن میں سے تھے میر تقی میر کا قول ہے کہ ”اِن کے زمانہ میں اُن سے بڑھ کر کوئی محقق اور شاعر شیریں زبان نہ تھا“ میر حسن اُن کو امیر خسرو دہلوی کے بعد سب سے بڑا شاعر ہندوستان کا خیال کرتے ہیں۔ لطف بھی اُن پر اپنی موج سرائی سے لطف کرتے ہیں اور فتح علی اُن کو اُن کے نام کی مناسبت سے ”چراغ محفل فصاحت“ کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں۔ مولانا آزاد اُنکی نسبت لکھتے ہیں کہ اُن کو زبان اُردو کے ساتھ وہی مناسبت ہے جو ارسطو کو فلسفہ کے ساتھ ہے۔ میر تقی میر اُن کا ذکر نہایت ادب سے کرتے ہیں اور اپنا اور اُس زمانہ کے شعرا کا جگت استاد مانتے ہیں۔ خان آرزو اُردو اور فارسی دونوں کے استاد تھے۔ گو اُردو کم کہتے تھے مگر اُن کے استاد الا سائذہ ہونے میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے اس وجہ سے کہ میر۔ سودا۔ منظر۔ درد۔ ایسے قادر الکلام اُن کو استاد مانتے تھے۔ اگرہ کے رہنے والے شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں سے تھے شعر کہنا ابتدا سے عمر میں شروع کیا۔ اور مختلف علوم و فنون میں بصیرت کا ملکہ

حاصل کی۔ جوانی میں بمقام گوالیار منصبدار مقرر ہوئے۔ مگر فرخ سیر کے عہد میں مسئلہ میں دہلی واپس آئے۔ مسئلہ مطابق ۱۲۳۷ء میں شیخ علی خیز ایران سے ہندوستان آئے جہاں اُن کے کمال کی بے انتہا شہرت ہوئی ہر شخص ایسے صاحب کمال سے ملنے کا مشتاق تھا۔ مگر آرزو کو کمال فن اور ہمتنا اسکی اجازت نہ دیتا تھا۔ اتفاقاً کسی موقع پر ان دونوں بالکالوں کا سامنا ہو گیا۔ شیخ کی متکبرانہ باتیں اُن کو بُری معلوم ہوئیں جس سے متاثر ہو کر انھوں نے شیخ کے کلام پر اعتراض وارد کرنا شروع کئے اور اُن کو ایک رسالہ سمی تبنیہ الفلین کی صورت میں شائع کیا۔ مگر شاہ کے حملہ دہلی اور تباہی شہر کے بعد نواب لاچنگ کے مشورہ سے وطن چھوڑ کر لکھنؤ آئے جہاں ۱۲۶۹ء مطابق ۱۲۷۷ء میں انتقال کیا۔ مگر لاش کو حسب وصیت نواب موصوف دہلی لے گئے اور وہیں پویندین کیا۔ خان آرزو بڑے صاحب کمال اور شاعر شیریں مقال تھے۔ انکی قابلیت طباعی، ذہانت، قوت اختراع، فصاحت و بلاغت سب کو مسلم ہے۔ تصانیف بہ کثرت ہیں مچملہ اُن کے کتب ذیل موجود ہیں ایک فارسی دیوان تقریباً تیس ہزار شعر کا۔ شروح سکندر نامہ و قصائد عرفی۔ و گلستان سعدی۔ لغت فارسی موسوم بہ ”سراج اللغات“ لغت اردو موسوم بہ ”غرائب اللغات“ جو اصطلاحات صوفیہ کی ایک لغت مستے بہ نوادرات الفاظ کی شرح ہے۔

رسائل ”موہبت عظمیٰ“ اور ”عطیہ کبریٰ“ فن بلاغت معانی و بیان میں تذکرہ ”مجمع انفاس“ جس کو تذکرہ آرزو بھی کہتے ہیں جس میں اُن ہندوستانی اور

۱۔ اسی نام کا ایک سالہ سودا کا بھی ہے جس میں فائز کین کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔

دکنی شعرا کا ذکر ہے جنہوں نے زبان فارسی شعر کے ہیں۔ آپس سے میر تقی میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں کچھ نقل کیا ہے۔ تقریباً پندرہ تصانیف خان اردو کی کسی جاتی ہیں مشہور استاد تھے۔ اور بعض شاگرد اپنے سے بھی زیادہ نامور چھوڑ گئے۔ زبان اردو ایسے محقق کامل اور ناقد فاضل کے احسانات سے کبھی عمدہ برا نہیں ہو سکتی۔

شاہ حاتم مشاہیر قدما میں ہیں۔ ان کو دہلی کے رنگ کا موجد خیال کرنا چاہیے۔ ریختہ بہ طرز ولی مضمون و ناجی و آبرو لکھتے تھے۔ ظہور الدین نام۔ حاتم تخلص۔ شیخ فتح الدین کے بیٹے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت اللہ تعالیٰ سے منکلتی ہے۔ جو ۱۶۹۹ء کے مطابق ہے سپاہی پیشہ تھے۔ تھوڑے عرصے تک نواب امیر خاں صوبہ آہا کی رفاقت میں رہے۔ ۱۷۲۲ء میں جب دیوان ولی دہلی میں آیا اور اُس کے اشعار کو لوگوں نے بہت پسند کیا تو حاتم نے بھی طبع آزمائی کی اور ریختہ میں شعر کہنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ کمال کو پہنچ گئے خواجہ میر درد میر تقی میر اور بعد کو مصحفی کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ اپنے زمانہ میں ریختہ کے استاد مانے گئے ہیں۔ دو دیوان ان کی طرف منسوب ہیں۔ ایک قدیم رنگ میں جس میں صنعت ایہام بہت ہے اور اکثر کلام محش ہے۔ دوسرا جدید رنگ میں۔ پہلے زمر تخلص کرتے تھے۔ عالمگیر ثانی کے زمانے میں ایک دیوان کلیات سے منتخب کر کے مرتب کیا۔ اُس کا نام دیوان زادہ رکھا۔ کلیات کی نسبت جو آبرو و ناجی کے طرز میں لکھا تھا تذکرہ قدرت میں

شاہ حاتم ۱۶۹۹ء
۱۶۹۱ء عیسوی

لکھا ہے کہ "فاما زعم شاعری بسیار دارد، دیوان قدیم او از نظرائں مولف گذشتہ
 بطرز آبرو و ناجی حرف می زند اکثر اشعارش از لطف خالی یافتہ، محمد شاہ بادشاہ
 کے حکم سے ایک مثنوی محققہ پر لکھی جو زیادہ دیکھپ نہیں۔ ان کے علاوہ ایک
 دیوان فارسی بھی ہے۔ نہایت متین و مہذب بزرگ تھے اپنے دیوان کے
 دیباچہ میں ۲۵ شاگردوں کے نام دیے ہیں جنہیں سب سے پہلے مرزا فیض سودا
 کا نام نامی ہے یہ ایسے شاگرد تھے جن پر استاد کو بھی فخر تھا۔ اور مشہور شاگردوں
 میں۔ رنگین، بشار، تاباں، فارغ بھی ہیں شاہ صاحب کے مزاج میں طرافت
 اور بذلتہ سخی بہت تھی تصفیہ زبان کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور بہت سے غیر مانوس
 اور غیر فصیح الفاظ ترک کر دیے۔ درستی زبان کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو
 کام ذوق اور آتش و ناسخ کے زمانہ میں ایک سو برس بعد پورا ہوا اُس کی
 داغ بیل شاہ حاتم نے ڈال دی تھی۔ انوس ہے اُن کے معاصرین نے
 اُنکی طرف زیادہ توجہ نہیں کی ورنہ اُسی زمانہ میں بہت کچھ تکمیل ہو جاتی۔
 شاہ صاحب اس کے متعلق خود فرماتے ہیں۔ "خوشہ چین خرمین سخنوران
 عالم بصورت محتاج و معنی حاتم کہ از سنہ ۱۲۹۰ تا سنہ ۱۲۹۶ھ کہ چل سال باشد
 عمر دریں فن صرف کردہ در شعر فارسی پیر و مرزا صائب و در ریختہ دلی را استاد
 می دانند۔ اول کسی کہ دریں فن دیوان ترتیب نموده او بود و معاصرین فقیر
 شاہ مبارک آبرو۔ و شرف الدین مضمون و مرزا جان جاناں مظہر۔ و شیخ
 احسن اللہ احسن۔ و مرزا شا کر ناجی۔ و غلام مصطفیٰ ایک رنگ ست۔ و لفظ
 در و برو از و الفاظ و افعال دیگر کہ در دیوان قدیم خود تقید دارد۔ دریں ولا

اڑدہ دو اڑدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ و الفاظ عربی و فارسی کہ قریب الفہم
 و کثیر الاستعمال باشند و روزمرہ دہلی کہ میرزا یان ہند و فیضان رند در محاورہ آزد
 منظور دار زبان ہندی بھاکارا موقوف کردہ محض روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند
 باشد اختیار نمود۔۔۔۔۔ مختصر کہ لفظ غیر فصیح انشا را اند نخواہد بود۔ اس کے
 پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ درستی اور صلاح زبان کا خیال سب سے
 پہلے شاہ حاتم کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ کلام صاف عاشقانہ اور کہیں کہیں
 عارفانہ ہے۔ شعر آپس کی باتیں۔ زبان صاف سلیس۔ البتہ زبان کی ابتدائی
 حالت ہونے کی وجہ سے اکثر زائد الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ دہلی میں ۹۱۷ھ
 یا ۹۲۷ھ میں انتقال کیا۔ مگر مصحفی کا قول ہے کہ ۸۳ برس کی عمر میں ۹۱۷ھ
 میں فوت ہوئے۔ میر تقی کو شاہ حاتم کے ساتھ حسن عقیدت نہیں ہے۔
 اپنے تذکرے میں ”مرد جاہل و متمکن“ اُن کی نسبت لکھا ہے۔ مگر میر حسن
 اُن کو صاحب کمال و پسندیدہ افعال۔ عالی فطرت و بلند سمیت کے معزز
 القاب سے یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اُن کی غزلوں کو نغمہ سرا یان ہند
 محفلوں میں گاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ شاہ حاتم کا مرتب ادب اُردو
 میں منفرد اور ممتاز ہے وہ سودا اور دوسرے بڑے بڑے شاعروں کے
 استاد تھے۔ اور صلاح شعر اور درستی زبان میں انھوں نے بہت نمایاں
 حصہ لیا۔

۱۰۔ مصنف غمناک جاوید کی تحقیق کے موافق ۹۶ برس کی عمر میں سنہ ۱۲ ہجری میں
 انتقال کیا ۱۲

سید ان مضمون بتوفی ۱۲۵۷ھ
شیخ شرف الدین متخلص بہ مضمون حضرت شیخ فرید الدین
شکر گنج کی اولاد میں تھے جیسا کہ خود کہتے ہیں ۷

اگریں کیوں نہ شکر لبوں کو مرید کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید
جارج موصوبہ اکبر آباد کے رہنے والے سپاہی پیشہ تھے پھر تلوار کو قلم سے بدل لیا
بچپن میں دلی گئے اور زنیۃ المساجد میں قیام کیا۔ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے
مگر بڑے ظریف با مذاق اور ذیلہ شیخ تھے۔ میران کو ”ہنگامہ گرم کن مجلسا“
لکھتے ہیں۔ اپنے زمانہ کے اُستاد فن اور اُسی زمانہ کی روش کے مطابق خوب
کہتے تھے۔ ایک دیوان دو سو ابیات کا چھوڑا۔ کلام پاکیزہ اور پر لطف ہے
مگر اکثر جگہ فحش اور استعارات و ایہام وغیرہ سے جو زمانہ کا رنگ ہے مملو ہے۔
گوکہ سن میں آرزو سے بڑے تھے۔ مگر شعر میں اُن سے مشورہ کر لیتے تھے میران کو
خوش فکر اور تلاش الفاظ تازہ کا بہت مشاق لکھتے ہیں۔ سودا اور میر حسن بھی اُنکے
بہت معروف ہیں۔ خان آرزو اُن کو شاعر بیدارہ کہتے تھے۔ اس وجہ سے
کہ نزلہ کے سبب سے سب دانت اُن کے گر گئے تھے ۱۲۵۷ھ مطابق ۱۲۵۷ھ
میں انتقال کیا۔

شمس الدین نام جانچا ناں عرف منظر متخلص۔ والد کا نام
مرزا جان تھا جو عالمگیر کے دربار میں صاحب منصب تھے۔
”نسب اُن کا باپ کی طرف سے محمد بن حنفیہ سے ملتا ہے۔ ماں بیجا پور کے شریف
گھرانے سے تھیں۔ دادا بھی دربار شاہی میں صاحب منصب تھے۔ پردادا سے
اکبر شاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھیں۔ ان رشتوں سے تیموری خاندان کے

مرزا منظر جانچا ناں

۱۲۵۷ھ تا ۱۲۵۷ھ

نو اسے تھے۔ صوفی با صفا اور شاعر کہتا تھے۔ کلام میں جب قدر متانت اور تاثیر ہے
 اُسی قدر توحید اور روحانیت بھی جلوہ گر ہے۔ سطر بیل اور فرانسسیسی محقق کا رسن
 ڈیٹاسی کی تحریر کے موافق بمقام اگرہ مسئلہ ۱۹۹ مطابق ۱۹۹۹ء میں۔ مگر مولانا
 آزاد کی تحقیق کے بموجب مسئلہ ۲۰۰ بمقام کالا باغ صوبہ مالوہ میں پیدا ہوئے
 آپ کے والد ماجد عہد عالمگیری میں منصب دار اور سبّا علوی تھے اور خاندان
 شاہی سے بھی دور کا پیوند تھا۔ جب آپ کی عمر سولہ برس کی ہوئی تو سایہ پیری
 سر سے اُٹھ گیا۔ مرزا صاحب کو صوفیائے کرام اور اہل دل کی صحبت کا بچپن سے
 شوق تھا شیخ محمد فضل سیالکوٹی سے باقاعدہ حدیث پڑھی اور مین برس تک مشائخ
 نقشبندیہ سے کمال حاصل کیا۔ خود بھی وہ درویش کامل اور صوفی صاحب دل تھے
 سیکڑوں ہندو اور مسلمان آپ سے بیعت اور حسن عقیدت رکھتے تھے۔ میر تقی میر
 اپنے تذکرہ میں آپ کا ذکر ادب و احترام کے ساتھ کرتے ہیں فرماتے ہیں "مدیریت
 مقدس، مطہر، درویش، عالم، صاحب کمال، شہرہ عالم، بنیظیر، معزز، مکرم،
 اکثر اوقات دیدار اسی صرف می کند خوش تقریر، لہزہ ایست کہ در تحریر یعنی گنجہ"
 حسن صوری و معنوی دونوں سے عشق کامل رکھتے تھے۔ میر عبدالحی تاباں سے
 جو اُس زمانہ کے شہرہ آفاق حسین و خوب رو شاعر تھے بہت محبت اور اختلاط
 تھا۔ عالم مستحرف فقیر کامل خفی المذہب اور نقشبندی طریقت تھے۔ عالم باعمل
 احکام قرآن کے پیرو۔ اکثر وقت اوراد و وظائف یا دھچپ علمی گفتگو اور شعر و شاعری
 میں صرف کرتے تھے۔ آپ کی تہذیب و متانت و قناعت اور پابندی وضع
 ضرب المثل تھی۔ سنا و بے تعلقی کی حکایات گل رعنا میں درج ہیں محمد شاہ نے

ایک دفعہ کھلا بھیجا کہ ملک میں سے جو حصہ چاہئے قبول فرمائیے۔ انکار کر دیا۔
 نواب فیروز جنگ نے گاؤں مشپکیش کیے قبول نہ ہوئے۔ آصف جاہ نے تین ہزار
 روپیہ نذر کیا منظور نہ ہوا۔ استغنا کی یہ شان تھی کہ کھانا تک بازار سے منگواتے
 تھے۔ نذر و نیاز شاید ہی لیتے ہوں۔ علم و فضل اور شعر و شاعری کے ساتھ آپ کا اخلاق
 شگفتہ دلی اور لطافت مزاج بھی مشہور تھی۔ حسن معنی کے ساتھ حسن صورت بھی اللہ تعالیٰ
 نے بدرجہ اتم عنایت فرمایا تھا۔ اکثر کرامات بھی آپ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔
 آپ کا کلام زبان اردو کی تاریخ ارتقا میں ایک خاص درجہ اور اہمیت
 رکھتا ہے۔ اس وجہ سے کہ آپ نے نہ صرف زبان کو صاف کیا بلکہ اُس میں
 فارسی کی نئی نئی ترکیبیں اور خیالات پیدا کیے اور قدیم طرز ایہام گوئی کو ترک کیا
 زبان میں یہ جدید رنگ آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ بہت کم
 لوگوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ مصحفی اور شوق اپنے اپنے تذکروں میں اس
 خدمت کا ضرور اعتراف کرتے ہیں۔ آپ کا کلام نظم و نثر دونوں میں نہایت سادہ

۱۔ مصحفی اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں: "دراخت شوق شعر کہ نور از میوزا کسے در عرصہ نیامد بود و دور ایہام گویاں بود
 اول کسیکہ شعر بخیتہ تبع فارسی گفتہ درست در تمام یوازش فصاحت بلاغت بان استا جودہ ظہور ہونی تحقیقت
 نقاش اول بان کفیتہ باعتقاد فقیر زہرست بعدہ تہنیش دیگران رسیدہ ۱۲ قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں: "سیکون اول کسیکہ
 طراز ایہام گوئی ترک نمودہ درختہ زاد زبان اردو کے معنی شاہجہاں باد کہ الحال پسند خاطر علوم و خواص وقت گردیدہ د
 مروج ساختہ زبندہ لہر افین قدوہ الاولیٰین اقصیٰ روز جناب اکبر کا شفت کنوز طریقہ پیغمبر مزاج خانماں مخلص بظہر
 مردیت فرشتہ صفت ۱۲ انشا را مدد خان دریائے لطافت میں لکھتے ہیں: "از بسکہ آوازہ فصاحت و بلاغت
 جناب فیضیاب مزاج خانماں مظهر علیہ الرحمہ گوش را تم را مقرر خود میداشت دل با دیدہ مستعد ستیہ شد کہ چرا از
 دیدار مزاج صاحب خود را پس ہمہ محروم می پسندی در مرا از لذت جاودانی و عیش و حالی کہ در کلام معجز نظام آن
 حضرت ست باز میداری ۱۲ می صاحب لکھتے ہیں: "دیوان مختصر شعر فارسی او بنظر فقیر مولف آمدہ است از
 سلیم و کلیم پاسے کمی ندارد ۱۲ میر حسن لکھتے ہیں: "در از فصاحت زماں و بلغاے دوران ۱۲"

سلیس اور فصیح ہوتا ہے اور جیسا ہم اوپر لکھ آئے ہیں جذبات اور تاثیر کے ساتھ
تصوف کے خیالات سے بھی بالا مال ہے۔ اکثر اشعار کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ
مضمون خیالی نہیں بلکہ واردات قلبیہ کا صحیح اور بین عن نظر ہے۔ ایک دیوان فارسی
ایک ہزار بیات کا جو سنہ ۱۱۷۵ھ میں مرتب کیا اور ایک قدیم دیوان کا انتخاب ہے
جس میں بیس ہزار شعر تھے۔ ایک ناتمام دیوان اردو اور ایک بیاض "خریطہ جواہر"
فارسی شعرا کے منتخب کلام کی آپ کی تصانیف سے یادگار ہیں۔ وفات نہایت
افسوسناک طریقہ سے ہوئی۔ اس طرح کہ عشرہ محرم تھا تفریے نکل رہے تھے
مرزا صاحب اپنے کوٹھے پر بیٹھے اُن کی سیر کر رہے تھے مشہور ہے کہ اُن کی زبان سے
نکلا کہ بارہ سو برس بعد اس قدر شور و غل اور ماتم کرنا اور کاغذ اور لباس کے
ڈھانچوں کا اس قدر ادب و احترام کرنا خلاف عقل ہے۔ یہ جملہ تعزیر لیجانے والوں
نے سُن لیا اور برس پر خاش ہو گئے۔ نویں تاریخ کی رات کو دو آدمی مرزا صاحب
کے مکان پر وارد ہوئے اور آواز دی۔ مرزا صاحب کو کچھ خیال نہوا باہر نکل آئے۔
ایک آدمی نے دیکھتے ہی فوراً قرابین ماری۔ مرزا صاحب زخمی ہوئے اور یہی ہلاکت
کا سبب ہوا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۱۹۵ھ مطابق سنہ ۱۷۸۱ء کا ہے۔ آپ کے شاگردوں میں
انعام اللہ خاں لقیں۔ میر محمد باقر خزین۔ خواجہ احسان اللہ خاں بیان۔ مصطفیٰ خاں
کیزنگ۔ بساؤن لال بیدار۔ اور محمد فقیہ درو مند مشہور شاعر صاحب دیوان
ہوئے ہیں۔

ناجی سید محمد شاہ کرام ناجی تخلص۔ مرد سپاہی پیشہ نواب امیر خاں کے
نعمتخانیہ کے داروغہ تھے۔ شاہ آبرو حاتم اور دلی کے معاصر عہد محمد شاہی کے

شعرا میں ہیں جب نادر شاہ نے دلی پر حملہ کیا ہے تو یہ موجود تھے۔ شہر کی تباہی و بربادی اپنی آنکھ سے دیکھی جس کے پُر درد حالات ایک محسوس میں بیان کیے ہیں۔ عنفوان شباب میں انتقال کیا۔ آرزو اُن کے کمال کے قائل اور اپنے برابر بلکہ اپنے سے بہتر سمجھتے ہیں۔ نہایت تیز شوخ طبع ظریف اور ہر شخص کے کلام میں عیب نکالا کرتے تھے۔ میر صاحب کا قول ہے کہ ”مزاج میں ہزل بہت تھا۔ اپنے مذاق آمیز کلام سے لوگوں کو ہنساتے اور خود منہ بنائے رہتے۔“

ان کا کلام بصورت دیوان موجود ہے اور سلاست زبان اور نزاکت خیالات کی وجہ سے اہل دہلی میں مقبول ہے۔ اشعار میں استعارات و ایہام کی کثرت ہو بعض اشعار فحش بھی ہیں جو اُس زمانہ کا رنگ ہے۔

تاہاں میر عبدالحی تاہاں تخلص۔ نہایت خوبصورت خوشرو جوان تھے۔ ان کے غیر معمولی حسن کا شہرہ لوگوں کے زباں زد تھا یوسف ثانی کہلاتے تھے ان کے حُسن کی تعریف میں شعر کہے جاتے تھے۔ اُسی حُسن کو دوبالا کرنے کے لئے وہ عموماً سیاہ کپڑے پہنتے تھے۔ اُن کے حُسن کا شہرہ یہاں تک پھیلا کہ ایک مرتبہ شاہ عالم اُن کے روئے صبح کی زیارت کے لئے خود گئے۔ عورتوں کی طرف ان کو زیادہ توجہ نہ تھی مگر ایک شخص پرچن کا نام شاہ سلیمان تھا عاشق تھے۔ مرزا مظہر جان جاناں کو ان کے ساتھ ایک خاص محبت اور ارتباط تھا۔ جیسا کہ اُن کے حال میں لکھا گیا ہے۔ اکثر تذکرہ نویسوں کا قول ہے کہ جوانی میں مرے اور موت کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مینوشی کثرت سے کرتے تھے۔ جسکی وجہ سے استسقا ہو گیا تھا۔ مگر صاحب تذکرہ گلشن ہند کا بیان ہے کہ

انھوں نے اُن کو سلسلہ میں لکھنویں دیکھا تھا اور جب بھی وہ نہایت حسین و جمیل تھے فیلن صاحب لکھتے ہیں کہ سلسلہ یعنی سلسلہ ۱۲۷۷ء تک وہ زندہ تھے۔ میر صاحب اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر غیر معمولی تعریفوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں "نوجوان بامزہ بود سید خجیب الطرین۔ مولد او شاہجہاں آباد است بسیار خوش فکر و خوب صورت خوش خلق و پاکیزہ سیرت۔ معشوق عاشق مزاج۔ تا حال در فرقہ شعراء چھول او شاعر خوش ظاہر از من بطون عدم بعرصہ ظہور جلوہ گر شدہ بود" آگے اُن کی بے نوشی کی نسبت لکھتے ہیں کہ "آخر آخر کہ او اہل جوانی او بود۔ ایں قدر مدامت شراب کردہ کہ ملاقات ہمہ یاراں موقوف شد اکثرے ازد و تناسل کہ بہ خانہ اوی رفتند اور مست طلح می یافتند" اسی شراب کی کثرت سے دستوں نے لینا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ انھوں نے بھی مجبور ہو کر آخر کار شراب سے کنارہ کشی کی مگر چنپہری دن کے بعد سفر آخرت اختیار کیا۔ ان کا کلام عاشقانہ شیریں و نمکین ہے۔ خیالات نہایت نازک۔ زبان بہت سلیس۔ شاگردی میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ حاتم اور بعض کے نزدیک محمد علی حشمت سے اصلاح لیتے تھے۔ لطف کا قول ہے کہ سودا کو اپنا کلام دکھاتے تھے مگر میر صاحب نے اپنے تذکرہ میں حشمت ہی کو اُن کا استاد مانا ہے اور یہی صحیح ہے۔

میرزا بگ مصطفیٰ خاں میرزا بگ خان جہاں لودی کے احفاد سے تھے۔ امرائے محمد شاہی میں تھے اور بڑی عزت و آبرو سے زندگی بسر کرتے تھے۔ باکمال سخنوران دہلی میں شمار کئے گئے ہیں۔ کلام بلند اور استعارات سے مملو۔ شاہ مبارک آبرو اور میان مضمون کے طرز کا ہے بعض لوگ اُن کو شاہ آبرو کا

اور بعض خان آرزو کا شاگرد بتاتے ہیں مگر خود اُن کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا مظہر کے شاگرد تھے۔ ایک دیوان یادگار ہے جو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور عاشقانہ اور عارفانہ دونوں رنگ میں ہے۔ اکثر اشعار کو دنیا دار عشق مجازی کا مگر عرفاً انکو عشق حقیقی کا پر تو سمجھتے ہیں۔ تاریخ پیدائش و وفات کا پتہ نہ چلا۔ ایک مثنوی بھی امام حسین علیہ السلام کی شان میں لکھا ہے جس کے کچھ اشعار میر صاحب نے اپنے تذکرہ میں نقل کیے ہیں۔

نفاں متونی سلسلہ اشرف علی خاں متخلص بہ نفاں خلف مرزا علی خاں نمکستہ۔

احمد شاہ بادشاہ دہلی کے کوکہ یعنی رضاعی بھائی تھے۔ نہایت ظریف الطبع اور بذلہ سنج تھے۔ اسی وجہ سے ظریف الملک کوکہ خان بہادر کا خطاب دربار دہلی سے عنایت ہوا تھا۔ باتوں میں مزاح اور ظرافت بہت تھی پھبتی کہنے کے مشاق تھے جب احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو تباہ کیا تو نفاں مرشد آباد چلے گئے جہاں اُن کے چچا ایرج خاں برسرِ اقتدار تھے۔ مرشد آباد سے نواب شجاع الدولہ بہادر کے پاس منیف آباد آئے۔ اور نواب نے اُن کی بڑی خاطر و مدارات کی۔ چونکہ نازک مزاج واقع ہوئے تھے کوئی بات ناگوار گزری یہاں سے پٹنہ چلے گئے (بقول مصحفی) نواب نے جوش احتلاط میں گرم پیسے سے ان کا ہاتھ داغ دیا تھا۔ جہاں مہاراج شتاب رائے نے اُن کی بڑی قدر و منزلت کی۔ یہاں کی صحبت سے بھی دل بھر گیا اور بالآخر گوشہ نشینی اختیار کی۔ ۱۱۸۰ھ مطابق ۱۷۶۷ء میں

۱۱۸۰ھ۔ یلرینے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ایک درباری امیر ناکرمل کو ”گھی کی منڈی کا ساٹھ“ اور ایک شخص مسکینی حکیم معصوم کو ”گاؤ گجراتی“ کہا کرتے تھے ۱۲

پٹنہ میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔ ایک عمدہ دیوان رنجیت یادگار چھوڑا جس میں تقریباً دو ہزار اشعار ہو گئے۔ میر تقی اور میر حسن کی تحقیق کے بموجب ایک دیوان فارسی کا بھی ہے۔ سودا اور میر دونوں باکمال ان کے معرفت ہیں۔ سودا نے ان کے بعض اشعار کی تضمین بھی کی ہے۔ میر صاحبان کو فزلباش خاں امید کا شمار دیتا ہے۔ مگر مصحفی علی قلی ندیم سے نسبت دیتے ہیں۔ نفاں فارسی اور ہندی کے محاورات خوبی کے ساتھ ایک ساتھ نظم کرتے ہیں۔ کلام نہایت پاکیزہ۔ خیالات نازک اور بلند۔ ایہام گوئی ترک کر دی تھی۔ مبتذل اور فحش الفاظ و خیالات سے احتراز تھا۔ کلام میں صفائی اور روانی بہت ہے۔ قطعات مسلسل خوب لکھتے ہیں۔ میر صاحب ان کو جوان قابل و ہنگامہ آرا کہتے ہیں۔ دیوان میں غزلیات۔ قصائد۔ قطعات۔ رباعیاں محسوس بھی کچھ ہیں۔

باقی ادھر

اس عہد میں شاعری کا رواج بہت پھیل گیا تھا۔ اس وجہ سے شعرا بھی کثرت سے پیدا ہوئے۔ قدیم تذکروں میں مثلاً میر تقی اور میر حسن کے تذکروں میں چھوٹے بڑے مشہور و غیر مشہور ہر قسم کے شاعروں کے نام اور ان کے کلام کے نمونے بہ کثرت دیے ہوئے ہیں۔ ہم اس مختصر کتاب میں ان سب کا ذکر بالاستیعاب کرنے سے قاصر ہیں۔ میر محمد حسین کلیم جودی کے رہنے والے تھے وہ قابل ذکر ہیں۔ میر حسن کا بیان ہے کہ فصوص کا انھوں نے عربی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا اور ایک رسالہ عروض و قافیہ میں بھی لکھا تھا۔ میر صاحب کے رشتہ دار تھے اور صاحب کمال تھے۔

باب

اساتذہ دہلی

حصہ دوم طبقہ متوسطین

میر اور سودا کا زمانہ

اُردو شاعری کا زیرِ عہد یہ دور اُردو شاعری کی سب سے بڑی ترقی کا دور ہے۔

اسی میں شاعری کو معراجِ ترقی حاصل ہوئی۔ اسی میں میر حسن، درد، سودا اور میر ایسے صاحبِ کمال پیدا ہوئے جن کے نام اس وقت تک روشن ہیں۔ بلکہ جب تک زبانِ اُردو دنیا میں رہی وہ کبھی نہیں مٹ سکتے۔ تمام صنائعِ سخن اس عہد میں انتہائے کمال پر پہنچے۔ مثنوی میں میر حسن کی مثنوی ”سحر البیان“ قصیدہ میں سودا کے قصائدِ غزل میں میر اور درد کی غزلیں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ یہ کامل استاد اپنے اپنے فن میں بنیظیر اور بے مثال گزرے ہیں اور اپنا کلام آئندہ نسلوں کے واسطے ایک بے مثل کسوٹی چھوڑ گئے ہیں۔ یہی وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن کا ادب و احترام مرورا یا م سے کم نہیں ہو سکتا۔ تمام اساتذہ مابعد مثلاً ذوق، غالب، نسیم، آتش، سب ان کا لوہا مانتے تھے۔ اور انکی امتدادی اور قادر الکلامی کے دل سے قائل تھے۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب	ذوق یاروں نے بہشتِ غزل میں مارا
------------------------------------	---------------------------------

قالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
 آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں
 رنجیتہ کے تھیں استاد نہیں ہو غالب
 کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا
 کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب
 ان متبع کرتے ہیں قلمِ ہم اُس مغفور کا

زبان میں فارسی کا غلبہ اس عہد میں فارسی کا بہت غلبہ تھا۔ میر سودا اور دیگر
 استادان فن اپنے پیش روؤں کی نقل کرتے رہے۔ شاہ حاتم کے ساتھ خواجہ میر درد و
 میر خیاں کین نے اپنے کلام سے ہندی کے لفظ کال ڈالے۔ ان تغیرات کی فہرست
 صفیر بلگرامی نے تذکرہ جلوہ خضر کی جلد اول میں درج کی ہے جسکو شعر المند میں نقل
 کیا ہے۔ مولوی عبدالسلام صاحب لکھتے ہیں کہ "ان اصلاحات کے بعد اردو شاعری
 بالکل فارسی کے قالب میں ڈھل گئی اور ہمارے شعرا نے بالکل ایرانی شعر کے طرز میں
 کہنا شروع کیا چنانچہ میر صاحب فرماتے ہیں -

تبعیت سے جو فارسی کے میں نے ہندی شعر کے
 سارے ترک بچے ظالم اب پڑھتے ہیں ایران کے بیچ

سودا و میر نے سعدی و حافظ سے استفادہ کیا اور انکے اشعار کا ترجمہ بھی کیا۔ اس زمانہ
 میں کچھ لوگوں نے متاخرین شعراے فارسی ناصر علی - جلال - اسیر - کلیم اور بیدل کے
 رنگ میں کہنا شروع کیا۔ لیکن خوش ذاق شعرا نے طالب علمی اور شغفائی وغیرہ کی
 روش اختیار کی۔ ان تصریحات کے علاوہ خود ان شعرا کے کلام کی اندرونی شہادت

سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے متاخرین شعرا فارسی کے کلام کو پیش نظر رکھ کر شاعری شروع کی ہے۔ چنانچہ سودا و میر و درد وغیرہ نے اس دور کے متعدد شعرا فارسی مثل صائب۔ بیدل۔ نظیری۔ عرفی کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور ان کے عمدہ اشعار کا ترجمہ کیا۔ اور اس دور کے شعرا کے کلام میں فارسی ترکیبوں اور فارسی محاوروں کی ترجمہ کی جو بہتات ہے وہ اسی تقلید و تتبع کا اثر ہے۔ سودا نے علی الخصوص ایسی نئی نئی ترکیبیں اور محاورے زبان میں داخل کئے جو مستقل طور پر اُسی کے ہو گئے۔ میر نے بھی خزانہ فارسی سے زبان کو بہت کچھ مالا مال کیا۔ البتہ میر حسن نے متاع موجودہ پر قناعت کی۔

الفاظ میں تذکر و تانیث الفاظ میں تذکر و تانیث کی پابندی نہ تھی مُصنّف

کی خواہش اور خوشی کے موافق الفاظ مذکر اور مؤنث لکھے جاتے تھے۔ نئی بحریں جو اس سے پیشتر نہیں کہی گئی تھیں اب داخل شعر ہوئیں۔ نئے اصناف سخن بھی اسی زمانہ میں داخل ہوئے مثلاً میر صاحب نے واسوخت مثلث، مُرتج، کی ایجاد کی۔ فارسی میں البتہ واسوخت کی ابتداء فغانی اور وحشی نے کی تھی۔ قصائد اور اہاجی کی تکمیل سودا کے ہاتھوں ہوئی اور قصائد تو یقیناً اُسی وقت درجہ کمال کو پہنچ گئے تھے۔ مُشکل مُشکل بحر میں اور قافیے۔ اور دوہرے قافیوں کا رواج ہوا تاکہ زبان پر قدرت ثابت ہو۔ زوائد اور بھرتی کے الفاظ جن کا رواج عہد سابق میں بہت تھا اب کم ہو گئے۔

افغانوں کے پیہم حملوں اور مرہٹوں کی لوٹ مار کے خوف سے اکثر نامور شعرا دہلی نے ترک وطن اختیار کیا۔

شعار دہلی چھوڑ کر
لکھنؤ آتے ہیں

چنانچہ میر، سودا، میر حسن، سوز و غیرہ اس پر آشوب زمانہ میں اپنے وطن کو
 خیر باد کہہ کے لکھنؤ چلے آئے جو اُس وقت شعرا و کلا کا لمبا واد تھا اور ہر فن کے
 استاد وہاں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ صرف میر درد ہی ایک ایسے قانع اور
 وطن پرست بزرگ تھے جنہوں نے خاک وطن کی محبت نہ چھوڑی اور وہیں جمے رہے۔
 کلام کی خصوصیت اس عہد کے شعرا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے کلام
 میں پست خیالات کے ساتھ بلند خیال اور خفیف الفاظ کے ساتھ شان دار اور
 فصیح الفاظ ملے جلتے ہیں غزلوں میں شتر گری و ناہمواری میر تقی میر کی نسبت
 ایک قدیم تذکرہ نویس کا قول ہے کہ اُن کے معمولی اشعار نہایت معمولی اور اعلیٰ
 اشعار نہایت اعلیٰ ہوتے ہیں۔ انگریزی میں یہی حالت وڈ ٹور تھ شاعر کی ہے۔
 نواب مصطفیٰ خاں شفیقہ اپنے تذکرہ گلشنِ نیجا میں یہی اعتراض مرزا سودا پر بھی وارد
 کرتے ہیں جھقیقت میں یہ ناہمواری کلام ایک معقول سزا ہے جو ان لوگوں کو ملتی
 ہے جن کا کلام موقع بموقع اور کثرت ہوتا ہے۔ سودا اور میر سے زیادہ ہر گو کون ہوگا
 پس اُن کے تمام اشعار کیساں کیسے ہو سکتے ہیں۔ خواجہ میر درد چونکہ کم کہتے تھے
 یعنی اُسی وقت کہتے تھے جب طبیعت ملہم ہوتی تھی اسی وجہ سے اُن کا بیشتر کلام
 اس عیب سے پاک ہے۔

تذکرے متعدد تذکرے یعنی شعرا کے مختصر حالات اور اُن کے کلام کا انتخاب بھی
 اسی عہد میں قلمبند کیا گیا۔ یہ کام بہت مفید ہوا۔ کیونکہ اس سے اُس زمانہ کے
 حالات پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے۔ میر تقی میر کا تذکرہ "نکات الشعراء" اور

میر حسن کا تذکرہ ”شعراے اردو“ اب چھپ گئے ہیں اور ہر جگہ ملتے ہیں۔ انہیں گو کہ حالات بہت مختصر لکھے ہیں مگر پھر بھی شعراے اردو کے مورخ کے لئے بہت مفید چیز ہیں اور نہایت دلچسپ باتیں ان میں ملتی ہیں۔

خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ
تاسلسۃ جبری ÷

سید خواجہ میر نام۔ درد تخلص۔ خواجہ محمد ناصر علیہ کے
خلف الصدق تھے۔ ان کے پدر بزرگوار کا بھی ایک ضخیم

دیوان ”نالہ علیہ“ کے نام سے مشہور ہے سلسلہ نسب خواجہ بہار الدین
نقشبند سے ملتا ہے اور ماں کی طرف سے حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ تک
پہنچتا ہے ان کے نانا میر سید محمد حسنی نواب میر احمد علی خاں کے صاحبزادہ تھے جنگی
تعلیم میں سودا نے تصیدہ لکھا ہے۔ اور جو جنگ پانی پت میں شہید ہوئے تھے۔
خواجہ صاحب کے جد امجد بخارا سے ہندوستان آئے مگر ان کے والد خواجہ ناصر
کی ولادت ہندوستان ہی میں ہوئی۔ خواجہ ناصر جب جوان ہوئے تو شاہی منصبدار
مقرر ہوئے۔ مگر تھوڑے دنوں میں تعلقات دنیاوی ترک کر کے گوشہ نشین اور
حضرت شاہ خواجہ محمد زبیر کے مرید ہو گئے۔ اسی عرصہ میں مشہور صوفی شاہ گلشن
کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ خواجہ صاحب نے اپنے پدر بزرگوار کے علم و
فضل اور کمالات ظاہری و باطنی کے حالات نہایت پراثر طریقہ سے بیان کیے
ہیں۔ خواجہ صاحب کا سنہ ولادت ۱۱۳۳ھ ہے۔ انھوں نے اپنے والد ہی کی
آغوش تربیت میں تحصیل علوم سے فراغت حاصل کی۔ قرآن۔ حدیث۔ تفسیر۔
فقہ اور تصوف میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ جوانی میں دنیاوی معاملات میں
حصہ لیتے اور اپنی جاگیر کے کاموں کو بھی دیکھتے تھے۔ مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں

کہ سپاہی پیشہ تھے۔ مگر والد کے حکم سے فوکر چھوڑ کر فقر اختیار کیا۔ اٹھائیس
 برس کی عمر میں دنیا چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گئے۔ اور جب باپ نے سفر آخرت
 اختیار کیا۔ تو اسی برس کے سن میں اُن کے سجادہ نشین اور قائم مقام ہوئے۔
 خواجہ صاحب کا خاندانی اثر اور نواب ظفر خاں رئیس عہد ہانگیری سے اُن کا
 انتساب اور سلسلہ نقشبندیہ میں اُن کا شیخ وقت ہونا۔ یہ سب باتیں اُن کو مرج
 خاص و عام بنائے ہوئے تھیں۔ پھر اُن کے ذاتی تقدس اور مراتب عرفان
 و تصوف سے کما حقہ واقف ہونے کی وجہ سے لوگ اُن کے دل سے گرویدہ تھے۔
 غریب سے لیکر امیر اور بادشاہ سے لیکر فقیر تک اُن کی بے انتہا عظمت کرتے
 اور اُن کے ساتھ دلی عقیدت رکھتے تھے معاصر تذکرہ نویس اُن کے اس خاص امتیاز
 اور اُن کی بزرگی اور خداسی کی شہادت نہایت زوردار الفاظ میں دیتے ہیں
 اور کہتے ہیں کہ وہ مجسم تہذیب و متانت اور پیکر آداب و
 اخلاق تھے جو اولیاء اللہ کا نشان امتیاز ہے قناعت و توکل اور رضا
 و تسلیم اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے جب دہلی پر احمد شاہ ابدالی کا
 حملہ ہوا اور اُس کے بعد مرہٹوں کی لوٹ مار شروع ہوئی تو ہر شخص جو اپنی ناموس
 و آبرو کا تحفظ چاہتا تھا شہر چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔ بڑے بڑے نامی شاعر دلی سے
 نکل کر لکھنؤ پہنچے مگر اس مرد راہ خدا کو جنبش بھی نہ ہوئی۔ وہ اللہ پر توکل کے
 اپنے بزرگوں کے سجادہ پر بیٹھا رہا۔ اور اُنکی قناعت و استقلال اور توکل علی اللہ
 میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ طبیعت میں آزادی۔ خودداری اور استغنا اس درجہ تھا
 کہ کسی کی طرح و شناسے اپنے قلم کو آلودہ نہیں کیا۔ ایسی خوددار طبیعت بھلا خوشامد

اور بھٹی کیونکر گوارا کر سکتی تھی۔ دنیا داروں کے سامنے زانوئے ادب نہ کرنا اُن کو بیحد شاق تھا۔ استغنا کا یہ حال تھا کہ بادشاہ وقت تک سے ملنے میں عار تھا۔ ایک مرتبہ شاہ عالم اُن کی بزمِ سماع میں چلے آئے جسکی شرکت کو وہ اپنا فخر جانتے تھے اتفاق سے پاؤں پھیلا دیے خواجہ صاحب کو نہایت ناگوار ہوا۔ بادشاہ اُن کے چشم و ابرو سے سمجھ گئے۔ فوراً عذر کیا کہ مجبور ہوں۔ پاؤں میں درد ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر تکلیف تھی تو تکلیف کیوں کی۔ حضرت کو موسیقی سے بھی بڑا ذوق تھا۔ خود اس فن میں صاحب کمال تھے۔ بڑے بڑے کلاؤنت اور گوئیے حاضر خدمت ہوتے اور متاع کمال پیش کرتے۔ آپ کے دولت خانہ پر ہر مہینہ کی دوسری اور چوبیسویں کو محفلِ سماع منعقد ہوتی۔ جس میں بڑے بڑے قوال اور ماہران فن جمع ہوتے۔ اور اپنا کمال دکھلاتے۔ میاں فیروز جو اُس زمانہ کا مشہور قوال تھا اکثر حاضر خدمت ہوتا اور اپنے کمال سے حضرت کو مظلوظ کرتا۔ محرم میں مجالس منعقد ہوتیں جس میں سوز خوانی اور مرثیہ خوانی کے جوہر دکھائے جاتے۔ اسی طرح ارباب تصوف اور صاحب سلوک کے بھی جلسے دولت کدہ پر اکثر منعقد ہوتے جنکی شرکت کو بڑے بڑے رئیس و امیر اپنی سعادت و فخر سمجھتے۔

تصانیف خواجہ صاحب کو تصنیف و تالیف کا شوق بچپن ہی سے تھا

کتاب ذیل جو چھپ چکی ہیں اُن کی تصنیفات سے ہیں۔

(۱) رسالہ اسرارِ صلوة جو پندرہ برس کے سن میں بہ حالت اعجاز لکھا۔

(۲) وارداتِ دردِ اُنٹیس برس کی عمر میں لکھی اور اُس کی شرح میں

(۳۳) علم الکتاب۔ ایک بڑا نسخہ تحریر کیا جس میں ایک سو گیارہ رسالے ہیں۔
 (۳۴) نالہ درد (۵) آہ سرود (۶) درد دل (۷) شمع محفل (۸)
 واقعات درد وغیرہ (۹) حرمت غنا (۱۰) دیوان فارسی (۱۱) دیوان اردو۔
 رسالہ اسرار الصلوٰۃ اہم ہاسمی ہے اس میں نماز کی فضیلتوں اور پوشیدہ اسرار کا
 بیان ہے۔ رسالہ واردات اکتیس برس کی عمر میں ۱۲ھ میں تصنیف فرمایا۔
 اس میں مسائل تصوف نظم و نثر میں بیان کیے گئے ہیں علم الکتاب اسی رسالہ واردات
 کی شرح ہے جسکو اپنے عزیز بھائی اور شاگرد خواجہ میراث کی فرمائش سے تصنیف
 کیا۔ اس میں مسائل تصوف کو زبردست دلائل کے ساتھ آیات قرآنی۔ احادیث
 نبوی اور اقوال سلف سے ثابت کیا ہے۔ اپنی زندگی کے بھی اکثر واقعات کا
 اس میں بیان ہے۔ نالہ درد ۱۹ھ میں اور آہ سرود ۲۳ھ میں تصنیف ہوئی
 یہ رسالے بھی روحانیات اور مسائل تصوف پر ہیں شمع محفل اور صحیفہ واردات،
 یہ دونوں کبرسنی کی تصنیفات ہیں جبکہ آپ کی عمر باسٹھ برس کی تھی۔ حرمت غنا اور
 واقعات درد میں بھی دقیق مسائل تصوف کا ذکر ہے۔ اول الذکر میں غنا کی حلت و
 حرمت سے بحث کی ہے۔ دیوان فارسی فارسی کلام کا ایک مختصر دیوان ہے
 جس میں غزلوں کے علاوہ رباعیات اور نظمیں وغیرہ بھی ہیں۔ آخری چیز
 دیوان اردو ہے جسکو اردو شاعری کے تاج کا سب سے بڑا ہیل سمجھنا چاہیے
 دیوان اردو کے علاوہ جملہ تصانیف مذکورہ بالا فارسی میں ہیں۔ دیوان کا ایک
 نہایت صحیح اور عمدہ نسخہ مطبع نظامی نے چھاپا ہے جس پر محترم نواب حبیب الرحمن صاحب
 شروانی نے نہایت قابلیت سے ایک دیباچہ لکھا ہے۔ خواجہ صاحب کی زبان

اور طرزِ ادا ہی ہے جو میر کی ہے۔ عبارتِ صاف سلیس فصیح ہر شخص کی سمجھ میں آسانی سے آتی ہے۔ درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ تصوف کو ان سے بہتر کسی نے نہیں کہا۔ عرفان اور تصوف کے پیچیدہ اور مشکل مضامین اس خوبصورتی اور صفائی سے بیان کیے ہیں کہ دل وجد کرتا ہے۔ غزلیں زبان کی سادگی اور صفائی میں میر کے کلام کا مزادیتی ہیں اور تصوف کی چاشنی اور درد و اثر کے اعتبار سے اُن سے بڑھی ہوئی ہیں۔ مثل میر صاحب کے خواجہ صاحب کی بھی وہ غزلیں جو چھوٹی بحروں میں ہیں اپنا جواب نہیں دیتیں۔ بقول مصنف ”آبِ حیات“ - تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھردی ہے۔ یا بقول امیر مینائی مرحوم سپی ہوئی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں۔ بیہودہ مذاق اور رنجوسے کبھی زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ کہیں کہیں پرانے الفاظ اور محاورے بھی استعمال کر جاتے ہیں مگر اس خوبصورتی سے کہ اُن سے شعر کی خوبی بڑھ جاتی ہے۔ عاشقانہ رنگ نہایت اعلیٰ اور بلند ہے۔ اس زمانہ کا عشق مجازی جس کو وہ بواہوسی سے تعبیر کرتے تھے اُن کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ مثل خواجہ حافظ اور اساتذہ سلف کے اُن کا معشوق بھی کوئی بازاری اور ہرجائی نہیں بلکہ اُس سے معشوق حقیقی یا مرشد مراد ہے۔ ایسے بزرگوں کی نظر میں شاعری کا پایہ نہایت بلند اور اُس کا مقصد نہایت اعلیٰ ہوتا ہے۔ وہ لوگ کسبِ مال و جاہ کی غرض سے شعر کہنا گناہ سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے اُن کا کلام سوز و گداز اور تاثیر سے مملو ہوتا ہے۔ زبان اور ادب اُردو کے لحاظ سے خواجہ صاحب ایک نہایت نمایاں اور ممتاز درجہ رکھتے ہیں بقول مصنف ”آبِ حیات“ ”چار کنول سے ایک رکن یہ ہیں“ باقی رکن - میر - سودا - اور مظہر ہیں۔ حقیقت میں انھیں عناصرِ رابعہ کی

ترکیب سے زبان کا قوام درست ہوا۔ قدیم ایہام گوئی اور ہندی دوہروں کی تقلید
گئی۔ زبان صاف ہوئی اور سنجی۔ اور بالآخر ترقی کی معراج تک پہنچ گئی خواجہ صاحب
کے کلام نے یہ اور اضافہ کیا کہ تصوف اور روحانیت کی چاشنی سے اُس میں چارچاند
لگا دیے۔ خواجہ صاحب کا یہ اثر اُن کے معاصرین اور بعد کے آنے والوں پر بھی
بہت تھا۔ اُن کے معاصر شعرا اُن کا بہت ادب و احترام کرتے تھے۔ خداے سخن
میر تقی میر اپنے تذکرہ میں کس نگینی اور جوش کے ساتھ اُن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے
ہیں ”جوش ہمار گلستانِ سخن۔ عن لیب خوشخوان چین ابن فن زبان گفتگویش کو کشا
زلف شام دعا مصرعہ نوشتہ اش بر صفحہ کاغذ از کا کل صبح خوشما ... خلیق متواضع
آفناے درست شعر فارسی ہم میگوید اما بیشتر رباعی۔ گرمی بازار وسعت مشربا دست
غرض ارشادِ انسانی مطلب است متوطن شاہماں آباد بزرگ بزرگ زادہ جوان صلح از درویشی
بہرہ دانی دار و فقیر انجست او بندگی خاص است اگر چہ حسن سلوک عام حسن سلوک بپای خود
گرفتہ اعتزاز از گوشہ دل نہادہ خلف الصدق حضرت خواجہ ناصر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ
است کہ مقتداے عالم است۔ ایامی کہ فقیر انجست آن بزرگوار شرف اندوز می شد۔
از زبان مبارکش میفرمود کہ میر محمد تقی تو میر مجلس خواہی شد۔۔۔ مجلس ریختہ کہ بخانہ
بندہ تبارتخ پانزدہم ہمراہ مقررست والحدیثات ہمیں بزرگ است۔ زیر کہ پیش ازیں
مجلس بخانہ اش مقرر بود۔ از گردش روزگار بہدار بہتم خورد از بسکہ بایں احقر اخلاص
ولی داشت گفت کہ ایں مجمع را شما اگر بخانہ خود معین کنید بہترست۔ نظر بر اخلاص آں
مشفق عمل کردہ آمد۔ خداش ابدآباد سلامت دارد۔ میر صاحب خواجہ صاحب کا
ذکر ایسے الفاظ میں کرتے ہیں کہ لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے کہ اُن کے شاگرد تھے

چنانچہ فتوح مستشرق اور زبان اردو کے دلدادہ گارسن ڈیٹاسی کو بھی یہی دھوکا ہوا کہ وہ میر کو درد کا شاگرد جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب اُن کے تقدس اور کمال عرفان اور نیز اُن کی ذاتی قابلیت کے دل سے قائل تھے اور یہی حال میر حسن کا بھی ہے۔ وہ بھی اُن کی بزرگی کے قائل اور اُن کے کلام کے معرفت اور دلدادہ تھے۔ کلام کی نسبت لکھتے ہیں کہ ”اگرچہ مختصر مگر مثل کلام حافظ شیرازی انتخاب ہے“ ہماری راسے میں میر انیس کے کلام میں جو سادگی اور اثر پایا جاتا ہے وہ بواسطہ میر حسن خواجہ صاحب کے کلام کا ایک نمایاں اثر ہے۔

شاگرد خواجہ صاحب کے بہت سے شاگرد تھے جن میں قائم - ہدایت - فراق اور اثر مشہور ہیں علی الخصوص قائم اور اثر اعلیٰ درجہ کے شاعر اور صاحب دیوان ہیں۔ خواجہ صاحب کے صاحبزادہ کا نام صاحب میر اور ام تخلص تھا۔ سنہ وفات اور عمر کے متعلق اختلاف ہے۔ بیل صاحب لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۱۹۹ھ مطابق سنہ ۱۷۸۵ء میں وفات پائی۔ مرزا علی لطیف سنہ ۱۲۰۷ھ اور مصحفی سنہ ۱۲۰۹ھ لکھتے ہیں جو سنہ ۱۲۰۳ء کے مطابق ہے۔ یہی وہ سن ہے جس میں مصحفی نے اپنا تذکرہ لکھا تھا۔ گارسن ڈیٹاسی اور لائل صاحب مصحفی کی پیروی کرتے ہیں مصنف آبجیات لکھتے ہیں سنہ ۱۱۹۹ھ میں بمقام دہلی چھاسٹھ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ علامہ شروانی نے اپنے مقدمہ میں ایک معاصر شاعر بیدار کی تاریخ لکھی ہے ع حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب جس سے سن وفات سنہ ۱۱۹۹ھ اور عمر اسٹھ کی نکلتی ہے خود خواجہ صاحب شمع محفل میں فرماتے ہیں کہ کشف کے طور پر مجھ کو معلوم ہوا کہ میری عمر چھاسٹھ کی ہوگی سب کا خلاصہ یہ ہے اور صحیح بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عمر چھاسٹھ سال اور سنہ وفات سنہ ۱۱۹۹ھ ہے۔

درو کی شخصیت اردو شاعری میں ایک خاص شخصیت ہے اپنے معاصرین کے
اور نیز بعد کی نسلوں پر اُن کی شاعری کا ایک گہرا اثر پڑا قصوف کے رنگ میں وہ
بے نظیر اور بمثال ہیں۔

سیرت

۱۲۳۱ تا ۱۲۳۲ھ

سید محمد میزنام میر ضیاء الدین کے صاحبزادہ شاہ قطب عالم گجراتی
کی اولاد میں تھے آبا و اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ مگر خود
میر سوز کی ولادت دہلی میں ہوئی تیر اندازی اور شہسواری میں مشاق شہنرو اور ورزش
کے بڑے شائق تھے فنون سپہ گری کے علاوہ خوشنویسی میں بھی یدِ طولی رکھتے تھے۔
نسخ نستعلیق شفیعا وغیرہ تمام خطوط مروجہ خوب لکھتے تھے۔ جوانی میں رنگین طبع
اور عاشق مزاج تھے شاہ عالم کے زمانہ میں جب دلی پر تباہی آئی اور لوگ ہجرا
تھے تو یہ دولت فقر سے الامال صوفی با کمال تھے۔ وطن کی تباہی و بربادی
سے افسردہ خاطر ہو کر نکل کھڑے ہوئے پہلے فرخ آباد گئے جہاں نواب مہربان خان
دیوان نواب احمد خاں غالب جنگ کی چند دن ملازمت و رفاقت کی۔ اُس کے
بعد لکھنؤ آئے۔ یہ نواب آصف الدولہ کا زمانہ تھا۔ نواب بڑی مہربانی سے پیش
آئے۔ مگر ان کا جی نہ لگا۔ چند دن ٹھہر کر مرشد آباد کا رخ کیا۔ جہاں نوابان بنگالہ
کا دور دورہ تھا وہاں سے بھی جی گھلایا تو آخر کار اسی سال پھر لکھنؤ واپس آئے
اور اب کی مرتبہ آصف الدولہ اُن کے شاگرد ہوئے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے
بعد استاد نے انتقال کیا۔ بیل صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۲۳۵ھ میں بعمر ۸۰ سال
رحلت کی۔ مگر لطف نہ وفات ۱۲۳۵ھ بتاتے ہیں اور مصحفی بوقت وفات شریک
کامین لکھتے ہیں۔ نساخ اپنے تذکرہ سخن شعرا میں عمر اسی سال اور مقام وفات

تلمہ بتاتے ہیں۔ فیروز تذکرۃ الشعراء میں سلسلہ وفات اور عمر ۷۰ سال لکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں عمر ۸۰ سال اور سلسلہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ میر سوز نہایت خوش طبع ظریف۔ شیریں زباں خلیق۔ فلساں اور بڑے پابند وضع تھے۔

طرز کلام کلام میں ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے جس میں غزلوں کے علاوہ مثنوی رباعیاں اور مخمس بھی ہیں۔ انداز کلام نہایت صاف ساوہ اور بے تکلف۔ زبان میٹھی غزل کے واسطے نہایت موزوں ہے۔ لطف زبان صفائی محاورہ اور میا خستہ پن میں ان کا کلام اپنا آپ نظیر ہے۔ تکلف و آورد فضل مبالغہ تشبیہات اور استعاروں سے پاک و صاف۔ لفظی صنائع بدائع بھی بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ان کا شاہ کلام حسن طبعی سے آراستہ کسی مصنوعی زیب و زینت کا محتاج نہیں۔

سادگی اور صفائی میں میر تقی میر البتہ ان کے مقابل ہیں مگر سودا بہت پیچھے ہیں۔ مگر میر صاحب کے یہاں لطف زبان کے ساتھ جو لطف مضامین اور جذبات کا ہے وہ سوز کے یہاں بہت کم ہے۔ ان کے کلام میں میر اور سودا کی طرح فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کی بھی کثرت نہیں سیدھے سادھے ہندی لفظ بسیا خٹکی سے باندھتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ باتیں کر رہے ہیں شعر کو اتنا ہلکا چھلکا کر دیتے ہیں کہ اکثر اُس پر رو لینے کا بھی بوجھ نہیں ڈالتے اسی سادگی کی وجہ سے ایک دور پہلے کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ زبان کی اصلاح یا توسیع کی کوئی خدمت ان سے انجام نہ ہو سکی بلکہ سچ پوچھو تو غزل کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ ان کے اشعار کی سادگی اور بے تکلفی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو طرزِ نعتی کے نام سے بعد کو سعادت یا رخان نگین نے ایجاد کیا۔ اُسکی ابتداء سوز ہی کے زمانہ میں ہو گئی تھی۔ شعر پڑھنے کا طریقہ بھی ان کا

سب سے علیحدہ تھا۔ ترم اور خاص درد و اثر کے ساتھ شعر پڑھتے اور اظہار مطلب میں آنکھ ناک ہاتھ گردن غرض ہر عضو سے کام لیتے اور خود مضمون کی صورت بن جاتے
۲ اہمیات میں لکھا ہے کہ جب یہ قطعہ پڑھا ہے

کئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے	سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفل پر پیڑو	ارے رے رے رے رے رے رے رے

تو چوتھا مصرعہ پڑھتے پڑھتے زمین پر گر پڑے۔ گویا پر یزادوں کو دیکھ کر دل بے قابو ہو گیا۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں ”در عمد خود از جملہ ادبندال مت از طرا وائری ملک اوست۔ و خواندن اشعارش از زبان و نیکو از خواندنش چنان خوب نمایا کہ در گفتن نمی آید“ مرزا علی نطف لکھتے ہیں کہ عاشقانہ رنگ کے بادشاہ میروز کا کلام میروز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے۔ نام کی مناسبت سے پہلے میز تخلص کرتے تھے پھر سوز اختیار کیا۔ چنانچہ اس شعر میں دونوں تخلصوں کی طرف اشارہ ہے

کہتے تھے پہلے میز میر تب نہ موس ہزار حیف
اب جو کہیں ہیں سوز سوز یعنی سدا جلا کرو

میر تقی میر اسی اثر کو نکال کر کلام کی وجہ سے اُن سے کچھ ناراض ہیں فرماتے ہیں ”ہر چند طرز علیحدہ دارد لیکن از خوش کردن تخلص من نصف دلم از خوش است“

سوز کا مرتبہ شاعری میں سوز کا مرتبہ اردو شاعری میں بہت بلند ہے گو وہ میر و سودا کے مقابل نہیں سمجھے جاسکتے مگر پھر بھی غزل گوئی کے استاد اور صفائی کلام، محاورہ بندی، اور سوز و گداز کے بادشاہ تھے، کلام نہایت صاف، سلیس، ہر اثر، تکلف اور بناوٹ سے بالکل خالی ہوتا ہے۔

مرزا محمد رفیع متخلص بہ سودا اقلیم غنوری کے شہنشاہ اُردو
 کے خاقانی و انوری۔ پھر شاعری کے درخشندہ تارے۔
 بلکہ آفتاب۔ اور بقول اپنے حریفین اور معاصر خدائے سخن۔
 میر کے رنجیتہ گویوں کے انتخاب تھے۔

سودا
 ۱۲۵ھ تا ۱۱۹۵ھ
 ۱۳۰۰ھ تا ۱۲۴۰ھ

ان کے آبا و اجداد معزز خاندان کے لوگ کابل کے باشندے تھے۔
 مرزا صاحب کے والد مرزا محمد شفیع ایک تجارت پیشہ بزرگ تھے جو کابل سے
 ہندوستان آئے اور دہلی میں قیام کیا۔ خاک دہلی ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ
 سر آمد شعراے ہندوستان مرزا رفیع السودا وہاں پیدا ہوئے۔ آزاد تذکرہ آبجیات
 میں تاریخ ولادت ۱۲۵۰ھ لکھتے ہیں مگر یقین کے ساتھ اس کی صحت کا اعتبار
 نہیں کیا جاسکتا۔ اس وجہ سے کہ نہ تو معاصرین نے لکھا ہے اور نہ مابعد کے
 تذکروں میں مرزا صاحب کی عمر یا سنہ ولادت کی تصریح ہے تخلص کے انتخاب
 کی وجہ بھی آبجیات میں دلچسپ لکھی ہے۔ فرماتے ہیں کہ تخلص سودا اس واسطے
 رکھا گیا کہ سودا یا جنون تمغائے عشق ہے جس پر ایشیائی شاعری کا دار و مدار
 ہے۔ اور یا پھر باپ کی سوداگری کی رعایت سے رکھا گیا۔ کہ اُس کے جزو اول
 میں لفظ سودا داخل ہے۔ اور آخر میں یہ خوب فرمایا کہ سوداگری کی بدولت ایہام کی
 صنعت گھاتے میں آئی۔

مرزا صاحب کی پرورش اور تعلیم دہلی میں ہوئی۔ پہلے سلیمان قلی خاں قزاق
 کے پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ شاہ صاحب نے جو فہرست اپنے شاگردوں کی
 اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھی ہے اُس سے مرزا کی اُستادی پر فخر و مباہلات

شہادت ہوتا ہے۔ لائق شاگرد کا نام نہایت محبت اور عزت کے ساتھ لیتے ہیں۔
 مرزا کو خان آرزو کے ساتھ شرفِ تلمذ نہ تھا مگر اُن کی صحبت سے بہت
 فیضیاب ہوئے اور شعر گوئی میں بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ انھیں کی ہدایت کے
 موافق فارسی کو ترک کیا اور رخیۃ کہنا شروع کیا۔ مگر فارسی کا شوق اُن میں اس قدر
 سرایت کئے ہوئے تھا کہ اُس سے بالکل علیحدگی محال تھی۔ کچھ نہ کچھ ضرور کہتے تھے۔
 چنانچہ اُن کا مکمل دیوان فارسی دیوانِ رخیۃ کے شروع میں موجود ہے۔ مرزا کا کلام
 اس قدر مقبول اور ہر دلعزیز ہوا کہ گھر گھر اور کوچہ و بازار تک میں پھیل گیا۔ مرزا کو
 اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اُن کا کلام اُن کی زندگی ہی میں مشہور ہو گیا تھا۔
 اور وہ مسلم الثبوت شاعر اُسی وقت مانے جاتے تھے اُن کی اُستادی کا چرچا اس قدر
 پھیل گیا کہ بادشاہِ وقت شاہِ عالم کو بھی اُن کی شاگردی کا شوق ہوا۔ وہ اُردو اور
 فارسی خوب کہتے تھے اور آفتابِ تخلص کرتے تھے۔ آخر کار مرزا کے شاگرد ہوئے
 اور اپنا کلام اصلاح کے لئے دکھانے لگے۔ کچھ عرصہ کے بعد مرزا کو اُن سے کسی
 خاص بات پر بحث ہو گئی اور دربار آنا جانا چھوڑ دیا۔ مگر دہلی میں بہت سے ایسے
 قدردانِ رئیس و امیر موجود تھے جنہوں نے استادِ زمانہ کی دلجوئی اور خدمت کو اپنا
 فخر سمجھا اور اُن کے ساتھ بڑی مہربانی اور عالیِ حوصلگی سے پیش آتے تھے۔ ایسے
 قدر شناسوں کی درِ یاد دلی اور قدر دانی نے مرزا کو ایسا مستغنی اور فارغ البال کر دیا تھا
 کہ جب نواب شجاع الدولہ نے مرزا کے کمال کا شہرہ سُن کر اُن کو نہایت شفقت و
 محبت سے بلاوے کا خط لکھا اور زادراہ بھی بھیجا تو مرزا نے طامال دیا اور کمالِ استغنا
 سے یہ رباعی جواب میں لکھ بھیجی۔



سودا

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک	آوارہ ازیں کوچہ باں کو کب تک
حاصل ہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے	بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

تھوڑے دنوں کے بعد زمانہ نے پٹا کھایا۔ دلی کی حالت بدل گئی۔ وہ پُرانا وقت نہ رہا۔ پُرانے قدردان کے بعد دیگرے مرتے گئے۔ پُرانے شرفاء کے گھرانے آئے دن کے بیرونی حملوں اور مرہٹوں کی قتل و غارت سے برخاستہ خاطر اور پریشاں ہو گئے۔ اسی کے ساتھ لوگوں کی جان و مال اور عزت و اکبر بھی خطرہ میں تھی اور وہ قدراں اور فن کے جوہری بھی باقی نہیں رہے تھے اس وجہ سے شعراء بالکمال نے دلی کو خیر باد کہا مرزا بھی اُسی نازک وقت میں اُس تباہ قافلے کے ساتھ دہلی سے نکلے۔ اُس وقت اُن کی عمر تقریباً ساٹھ برس کی تھی۔ فرخ آباد پہنچے۔ نواب احمد خاں نگیش غالب جنگ برسر حکومت تھے۔ مہربان خاں زنداں کے دیوان تھے جو اہل علم و کمال کے قدردان خود بھی شاعر تھے اور بقول میر حسن میر سوز و میرزا سودا سے تلمذ تھا۔ چند سال تک مرزا فرخ آباد رہے۔ اُنھوں نے مہربان خاں کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں۔ ۱۰۷۰ھ میں نواب احمد خاں مرگئے تو سودا بھی فیض آباد چلے گئے اور نواب شجاع الدولہ کے زمرہ ملازمین میں داخل ہو گئے۔ جب سلطنت کا مرکز کھنڈ قرار پایا تو سودا بھی لکھنؤ آ گئے۔

تھوڑے دنوں کے بعد نواب شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا اور نواب آصف الدولہ سرکار اسے سلطنت ہوئے تو اس زمانہ میں مرزا سے اور ایک فارسی شاعر فخر المکین سے شعر و شاعری کے معاملہ میں کچھ نزاع ہو گئی جس نے طول پکڑ کر ایک سخت جھگڑے اور باہمی جنگ کی صورت اختیار کی اُس کا تصفیہ نواب سعادت علی خان نے

جو اُس وقت ولیم سلطنت تھے نواب کے دوہرہ مزار کی موافقت میں کر دیا۔ سابق کی
شکر رنجی جاتی رہی۔ خطاب ملک الشعرائی اور چھ ہزار سالانہ کا وظیفہ عطا ہوا پھر تو نواب
آصف الدولہ مزار پر نہایت شفقت اور عنایت کی نظر فرمانے لگے اور اتنا ارتباط بڑھ گیا
کہ اکثر اوقات مزار کی پرٹھت صحبت اور اُن کی بذلہ بنجیوں کو جلیہ کاموں پر یہاں تک کہ
بسا اوقات محل کے عیش و آرام پر ترجیح دیتے تھے مزار کا انتقال لکھنؤ میں ۹۵۹ھ
مطابق ۱۵۷۷ء میں ہوا۔ بہت سے معاصرین اور نیز ابجد کے شاعروں نے وفات
کی تاریخیں کہی ہیں۔ مصحفی، منت، ناسخ، نسخ کی تاریخیں مشہور ہیں۔

تصانیف مزار کی تصانیف جمیع اقسام سخن میں کثرت حسب ذیل ہیں۔

(۱) ایک مختصر دیوان فارسی جس میں ردیف و ارغلیں ہیں۔

(۲) چند فارسی قصائد۔

(۳) دیوان اردو مکمل جس میں علاوہ غزلوں کے رباعیات، قطعے، تاریخیں،

مغنس، ترجیع بند، واسوخت، مستزاد، تضمین، غرض ہر قسم کا کلام ہے۔

(۴) چوبیس ثنویاں یعنی مختلف منظوم حکایتیں اور لطائف جن میں انکی دلچسپ اور

مشہور ہجوئیں اور پہیلیاں ہیں۔

(۵) تضمین برکلام میر۔ اور دو خط بنام میر ایک نظم اور ایک شعر میں (اُن کے

کلیات میں نہیں ہیں)

(۶) قصائد امرائے دہلی و لکھنؤ وغیرہ اور نواب آصف الدولہ کی تعریف میں۔

(۷) سلام اور مرثیہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شان میں۔

۱۵ ایک تاریخ یہ ہے ۹۵۹ھ کو جب حضرت سودا گئے : مگر میں تاریخ کی ماہ ہوا : بولے نصف
دوڑ کر پاسے عناد : شاعران ہند کا سرور گیا :

- (۸) قصائد ائمہ معصومین علیہم السلام کی منقبت میں -
 (۹) ایک رسالہ نشر میں موسوم بعبقۃ الفافلین مرزا فاخر مکین کے اعتراضوں کا جواب ہے جو انھوں نے فارسی کے شعراے سلف پر کیے تھے -
 (۱۰) میر تقی میر کی مشہور مثنوی شعلہ عشق کا ترجمہ نشر میں (اُن کے کلیات میں نہیں ہے) -

(۱۱) ایک تذکرہ شعراے اردو کا جواب نہیں ملتا -

سودا کا مرتبہ شاعری میں سودا اپنے زمانہ کے بہت بڑے استاد مانے گئے ہیں - اس میں شک نہیں کہ میر اور سودا دونوں زبان اردو کے سب سے بڑے شاعر گزرے ہیں - اپنے زمانہ میں بھی بے نظیر اور بے عدیل تھے اور اُن کے بعد بھی اُن کا ایسا کوئی نہیں ہوا - اُن کی خدمات زبان اور شاعری اور فن نظم کے ساتھ بہت قابل قدر ہیں اُن کی اصلاح زبان کا اثر بہت گہرا اور دیر پا ہے -

اُن کی خدمات زبان کے ساتھ مرزا نے اکثر ہندی الفاظ کی درستی کو دور کر کے فارسی کی آمیزش سے زبان میں شیرینی اور حلاوت پیدا کی - میر اور سودا ہی نے زبان کو ادبی زبان بنایا اُس کو رنجیتہ کا مرتبہ بخشنا چنانچہ خود فرماتے ہیں ۵

کہے تھے رنجیتہ کہنے کو عیب ناداں بھی	سو یوں کہا میں کہ دانا ہنر لگا کہنے
بسان مہر بہ روشن ہے سارے عالم پر	جہاں میں جیسے کہ میں شعر تر لگا کہنے

ولہ

سحن کو رنجیتہ کے پوچھے تھے کوئی سودا	پسند خاطر دلہا ہوا یہ فن مجھ سے
کلب کو گوش کرے تھا جہاں میں اہل کمال	یہ سنگریزہ ہوا ہے دُرعدن مجھ سے

شاعری کی صنایعوں سے اُس میں طرح طرح کی لطافتیں اور زراکتیں پیدا
کیں۔ فارسی سے بکثرت الفاظ و محاورات، استعارے اور تشبیہیں، طرزِ تخیل،
اور تلمیحات زبانِ اُردو میں داخل کیے اور اس استادِی سے داخل کیے کہ اُس کے
جزو ہو گئے اور ہنکی وسعت اور نوچداری اتنی بڑھ گئی اور وہ اس قابل ہو گئی کہ
ہر ادبی کام اُس سے لیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ نئی نئی ترکیبیں اور محاورے
فارسی کی روش پر ایجاد کئے جس میں سے بعض تو مقبول ہوئے اور بعض کو آئندہ
نسلوں نے ناپسند اور ستروک کیا۔ کیا اچھا ہوتا اور ہماری زبان کی کتنی خوش نصیبی
ہوتی اگر ان خدایانِ سخن کو وہی توجہ جو فارسی کے ساتھ تھی بھاشا کے ساتھ بھی
رہی ہوتی جس کا نتیجہ لازمی یہ ہوتا کہ دیسی زبان کے لفظ بجائے اجنبی الفاظ کے
کثرت سے داخل ہوئے ہوتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا کی قوتِ ایجاد و
انتخاب اور قابلیت اس اعلیٰ درجہ کی تھی کہ جو چیزیں داخل کیں اُن پر طغرائے قبول
فوراً ثبت ہو گیا اور اب وہ ہماری زبان کا جزو لا ینفک بن گئیں۔

یہ بات بھی قابلِ داد ہے کہ فارسی روایات اور تلمیحات کے ساتھ ہندوستان
کی قدیم روایات و الفاظ بھی بھلائے نہیں گئے، مثلاً الفاظ بھجبل، پریت، رائی
وغیرہ اور ہندی علمِ اہنام میں ارجن کی بہادری، کنھیا کا عشق وغیرہ جو اُن کے
عالم میں بڑا لطف دیتے ہیں۔ یہ سب اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ کم سے کم

بجبل کے کردن بھجبل کی میں تعریف کیا یاد	ستم پریت ہو تو کھو اٹھا لیتا ہے جو رائی
نہیں ہے گھر کوئی ایسا جہاں سکونہ دیکھا ہو	کنھیا سے نہیں کچھ کم صنم میرا ہے ہر جانی
ترکش النیر سینہ عالم کا جھان مارا	مڑگاں نے تیرے پیارے ارجن کا بان مارا

اُس زمانہ میں ماور وطن کے ساتھ تعلقات کو سچتہ کرنے کا خیال ہمارے شعراء اُردو کے دل میں بہت کچھ تھا۔ جو افسوس ہے کہ متاخرین نے حقارت کے ساتھ دل سے فراموش کر دیا۔ مرزا کو اکثر مناسب ہندی الفاظ بھی مہندی خیالات کے اظہار کے لئے اختراع کرنا پڑے۔ اور اس کوشش میں اُن کو اپنے معاصرین سے سخت مخالفتیں اور وقتیں اٹھانا پڑیں۔ مرزا کے عہد میں قدیم ایہام گوئی اور دوہروں کا رواج جو متقدمین کی یادگار میں سے کچھ باقی رہ گیا تھا وہ بالکل متروک ہو گیا تھا چنانچہ سودا خود فرماتے ہیں ۷

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دورنگی
مُسکِ سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

اور اُن کے ہم عصر میر کہتے ہیں -

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

مگر فارسی اور ہندی الفاظ کو ملانے کی وقت رفع نہیں ہوئی تھی۔ اور آخری منادِ ترقی اُردو شاعری کے واسطے ہنوز باقی تھے۔ مرزا کے کلام کو اس نقطہ نظر سے جانچنا بہت ضروری بات ہے۔ جو خدمات زبان کے ساتھ اُنھوں نے انجام دیں اور جو قوت زبان پر اُنھیں حاصل تھی اُس کا اعتراف اُن کے معاصرین مثلاً میر، میر حسن، مصحفی وغیرہ نے بخوبی کیا ہے اور ان کی قابلیت کمال کی دل سے داد دی ہے۔

اُن کی خدمت شاعر کے ساتھ جو بنیادیں دیں اور شاہ حاتم نے قائم کی تھیں اُنھیں پر سودا

اشارہ اوشانہ لایا ایشا عری تیار کیا۔ علاوہ کمال فن کے وہ دو چیزوں کے موجب بھی تھے۔ یعنی قصیدہ اور ہجو۔ ہر چند کہ یہ دونوں صنعتیں فارسی میں نہایت مکمل اور باقاعدہ صورت میں اور اردو میں بھی ایک ابتدائی اور نامکمل حالت میں موجود تھیں مگر انھوں نے یہ کمال کیا کہ ان کو اردو میں درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ اور ایسا کر دیا کہ ان کی برابری اور ہمسری کا خیال تک بعد کے شاعروں کے لیے محال ہو گیا۔ ہر چند کہ اکثر شعرائے ان کی پیروی کی اور ان کے قدم بقدم چلنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکے اور مرزا دونوں اصناف سخن میں متفرد ہی رہے۔

قصیدہ و مرثیہ ان کے اردو قصائد بڑے بڑے فارسی استادوں کے قصائد کے ٹکڑے ہیں اور بعض تو عرفی و خاقانی کے معرکہ الآرا قصیدوں کو بھلا دیتے ہیں۔ نزاکت خیال اور طرفگی مضامین میں وہ اکثر اہل عجم سے گوئے سبقت لیکے ہیں۔ یہی حالت ان کے مرثیوں کی بھی سمجھنی چاہیے۔ مرزا سے پہلے گو مرثیہ گو اردو میں بہت گزرے ہیں مگر ان کے کلام میں سوائے مذہبیت کے کوئی شاعرانہ رنگ، کوئی جدت اسلوب، کوئی نئی بات نہ تھی جو زمانہ موجودہ کے ترقی یافتہ مذاق کو کھلی معلوم ہو۔ مرزا ہی وہ صاحب ایجاد ہیں جنھوں نے اس فن خاص میں بھی اپنے زمانہ کے اعتبار سے کمال حاصل کر لیا بلکہ سچ پوچھو تو اپنے بعد آنے والوں کے واسطے ترقی کی راہیں کھول گئے۔

ہجو مرزا صاحب نے ہجوؤں کے دفتر کے دفتر لکھ کر کھدیے ہیں۔ ان لوگوں کو تو ضرور افسوس ہوتا ہے جن کے دلوں پر یہ آئے چلے ہوئے مگر ہمارے واسطے وہ ایک زعفران زار چھوڑ گئے ہیں جو اب لا باؤ تک شاداب و سرسبز رہیگا۔ ان کے

اباجی میں وہ گرمی کلام اور تیزی ہے جس سے وہ ظرافت و مذاق کا ایک عالمی ذخیرہ بن گئی ہیں معلوم ہوتا ہے اس صنف سے اُن کو خلقی مناسبت بلکہ قدرتی خصوصیت تھی جیسا کہ اُن کے خود ایک شاگرد نے اس طرف اشارہ کیا ہے ۵

ہر اُس سے طرف اُس کے نہ عائد ہوئی تقصیر	کی ہجو ہر اک شخص کی ہر چند کہ اُس نے
اور جتنے بزرگ اُس کے تھے مغلوں کے تھے وہ پیر	ہے ایک سبب یہ کہ وہ خود آپ مُغل تھا

بڑھاپے میں بھی اُن کی زندہ دلی اور مزاج کی شکفتگی ایسی تھی کہ جو بات دل میں آجاتی تھی اُس کے اظہار سے کبھی نہ چوکتے تھے۔ کسی انعام کا لالچ یا انتقام کا خوف اُن کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے سے روک نہ سکتا تھا۔ جہاں کسی سے اُن بن ہوئی فوراً اُن کا غلام ”غنیچہ“ قلمدان و کاغذ کا سامان گل تراشی لیے ہر وقت موجود تھا اور پھر وہ وہ گل بُٹے تراشے جلتے تھے کہ جن کو دیکھ کر لوگ اپنی آنکھیں اور سن کر اپنے کان بند کر لیتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی تحریروں سے اس بتذل صنف کو بھی ایک باقاعدہ اور مکمل فن بنا دیا۔ وہ زمانہ کی خرابی اور گرمایوں کی پڑھ دہی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ ایک انگریز نقاد کا قول ہے کہ ”جس طرح رومۃ الکبریٰ کے زوال کی تصویروں کے واسطے ہم جو سیناں ایسے مرقع نگاروں کی صفحہ گردانی کرتے ہیں اُسی طرح ہم کو اگر زوال دولتِ مغلیہ کی سچی تصویریں دیکھنا ہیں تو ہم کو چاہیے کہ سودا کی اُن پُر آشوب نظموں کا مطالعہ کریں جس میں اُنھوں نے مرہطہ سواروں کی عین قلعہ دہلی کی دیواروں کے نیچے قتل و غارتگری کا سچا فوٹو اُتارا ہے یا جس میں زمانہ کی پُر آشوب حالت اور اُمرائے دہلی کی

تباہی و بربادی اور کس مہر سی کا بیان نہایت پُر زور اور دردناک طریقہ سے کیا ہے۔ یا مثلاً وہ نظم جو ہجو شیدی فولاد خاں کو تو ال شاہ جہاں آباد کے نام سے مشہور ہے جس میں چوری کی کثرت شہر کی بدمنی اور کو تو ال شہر کی کم زوری کس پُر مذاق اور مؤثر طریقہ سے بیان کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ مرزا سے پہلے بھی بعضوں نے ہجوئیں کہی ہیں مگر بہت کم اور بے قاعدہ۔ میرزا کے یہاں وہ ایک صنف کلام اور مقابلہ کا ایک زبردست ہتھیار بن گئی۔ میر حسن کے پدر بزرگوار میر ضاحک، فدوی پنجابی، مرزا فاخر مکین، بقا اور ان کے علاوہ اور لوگ بھی باری باری سب مرزا کی زد میں آئے اور ان بیچاروں نے حرکت مذہبی میں کچھ ہاتھ پاؤں ہلائے اور اپنی بساط کے موافق کہا مگر ان کا کہا کسی نے نہ سنا۔ مرزا کا کہا بچے بچے کی زبان پر ہے۔ کثرتِ اہاجی سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا کو اس چیز سے خاص اُنس تھا اور اس میں اُن کو بڑا مزہ آتا تھا۔ ان کی ہجوئیں کچھ معمولی نظمیں نہیں ہیں بلکہ اُن سے اُن کی قوت بیان، قدرتِ زبان، اور معاملات دُنیاوی میں اُن کی وسیع معلومات کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ وہ جب کسی کی ہجو لکھتے ہیں تو اُس چیز کی جزئیات کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ اور حیرت ہوتی ہے کہ دو متضاد چیزیں درد و آفر اور مسخر و مذاق کو یکجا کر دیتے ہیں اور سننے والے پر غضب کا اثر پڑتا ہے۔ جس چیز کا خاکہ اُڑاتے ہیں اُس میں فارسی وغیرہ کی تقلید نہیں ہوتی۔ مضمون اچھوتے اور پھر دکا دینے والے ہوتے ہیں۔

مرزا میں جو ویناں والٹیر اور سوفیٹ تینوں کا مزاح ہے۔ ایڈیٹنگ کی متانت اُن میں مطلق نہیں۔ اُن کی جج میں پھکڑپن کے ساتھ طعن و تشنیع بھی بہت ہے۔ اُن کے الفاظ میں دل لگی اور مذاق کی تہ میں ایسی کاٹ اور برش ہے جو دل کے اندر

۱۔ "جولین جونیال" روم کا مشہور چوکنا شاعر تھا۔ سنہ پیدائش تقریباً ۷۰ عیسوی اور سنہ وفات ۱۲۸ عیسوی۔ ایک امیر آدمی کا لڑکا فن شعر اور انشاد میں کمال رکھتا تھا۔ اسکی سولرکتا میں مختلف مضامین پر موجود ہیں جن میں ہجو کا مذہب سے بڑھا ہوا ہے۔ زمانہ کی سوسائٹی کی بد اخلاقی اور خرابی پر شہر آشوب کی صورت پر جو مضمون لکھے ہیں وہ نہایت سخت اور زوردار زبان میں ہیں جسکے بعض جملے ضرب المثل ہو گئے ہیں۔

۲۔ پورا نام "فرانسوا ماری والٹیر" فرانس کا مشہور شاعر ڈراما نویس اور ناقد گزرا ہے۔ سنہ ولادت اور سنہ وفات۔ فن شعر اور تنقید میں کتنا زمانہ تھا۔ مرزا غالب کی طرح اُس کے بھی خطوط نہایت دلچسپ اور انشاپردازی کے بہترین نمونے ہیں اُسکے کلام میں ذہانت و طباعی اور انتہا درجہ کی طعن کی مینوشوخی اور ظرافت پائی جاتی ہے نہایت آزاد خیال واقع ہوا تھا۔ مذہب کے ساتھ اسکی بے پروائی، شوخی اور طعن آمیز جملے مشہور ہیں۔ اُسکا ڈراما موسوم بہ "محمد" ایک مشہور کتاب ہے۔

۳۔ "جان تھن سوفیٹ" والٹیر کا معاصر ہے۔ مشہور آئرش افسانہ نویس اور ہجو نگار تھا۔ بر خلاف والٹیر کے یہ مذہب کا پابند بلکہ پادری تھا۔ "بٹیل آف دی کبس" کتابوں کی جنگ اور "د گلیوور کے سفر" اُس کی مشہور تصانیف ہیں۔ ملکی سیاسیات میں بھی بہت حصہ لیتا تھا۔ اسکی تصانیف میں بے انتہا شوخی، مذاق اور طنز ہے مثلاً جب آئر لینڈ کے قصا بوں کا جھگڑا پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو اُس نے ایک رسالہ لکھا جس کا نام مقول تجویز لکھا، جس میں تجویز تھا کہ آئر لینڈ کی مصیبت دور کرنے کی سب سے بہتر ترکیب یہ ہے کہ اس ملک کے بچے حلال کر کے اُن کا گوشت بازار میں بیچا جائے یہ مضمون نہایت پر مذاق اور طنز آمیز ہے عبارت نہایت صاف سادہ بلا کسی تصنع کے لکھا تھا جسکی وجہ سے اُس کی تمام تصانیف مقبول عام ہیں ۱۲

۴۔ جوزف ایڈیسن انگلستان کا سب سے بڑا مشہور مضمون نگار اور شار گزرا ہے اسکی مشہور کتاب "سپیکٹس" بہترین ذخیرہ اخلاقی سیاسی اور معاشرتی مضامین کا ہے جسکی سلاست و شیرینی زبان انگریزی میں مشہور ہے۔ وہ بھی اپنے کلام میں ایک خاص قسم کی ظرافت اور مذاق سے کام لیتا ہے مگر اُس سے کسی کا دل نہیں دکھتا۔ اُس کے کلام میں نہایت متانت اور سنجیدگی ہے برخلاف سوفیٹ کے جسکے یہاں طعن و تشنیع بہت ہے ۱۱

اُتر جاتی ہے آزادانہ سچ کہا ہے کہ جس کے پیچھے پڑتے تھے اُس کو بھیچا چھڑانا مشکل ہوتا تھا۔

کلام پرانے مرزا کو زبان پر پوری قدرت اور شعر پر پوری حکومت حاصل تھی۔ مشکل سے مشکل زمینیں اُن کے سامنے پانی اور ادق مضامین اُن کے سامنے ہاتھ بندھے کھڑے رہتے تھے۔ اشعار سب کیل کانٹے سے درست بندشِ حُجیت، روانہ و بھرتی کا نام نہیں۔ کلام سانچے میں ڈھلا معلوم ہوتا ہے الفاظ کو اپنے مقام پر ایسا رکھتے تھے جیسے انگوٹھی میں نگینے جڑے جاتے ہیں اگر کوئی لفظ بھولتا تو دوسرا لفظ اسکی جگہ پر نہیں رکھ سکتے۔ اگر لفظ ادھر سے ادھر رکھ دے تو شعر کا لطف اور مرزا جاتا رہے گا۔ کلام ٹھوس اور زور مضاحت سے بھرا ہوا ہے۔ نئی نئی بحرین اور نگفتہ زمینیں نئے نئے ردیف اور قافیے ایسے کہہ گئے ہیں کہ اب تک دل مزے لیتا ہے سنگلاخ زمینوں میں بھی ایسے ایسے شعر نکالے ہیں جس طرح پتھر سے چشمہ نکلتا ہے۔

سودا کا اثر بعد کے شعرا پر مرزا کا اثر اپنے زمانے کے اور نیز بعد کے شعرا پر بہت کچھ پڑا۔ اُن کے اشعار پڑھ کر بہت سی منجلی طبیعتوں میں شعر گوئی کا شوق اور مادہ پیدا ہو گیا۔ اس خاص صفت کے اعتبار سے اُن کو اُردو شاعری میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو اسپنسر کو انگریزی میں ہے جو شاعر دل کا شاعر کہلاتا ہے معاصرین سے قطع نظر غالب اور ذوق وغیرہ بھی سب اُن کو مانتے تھے اور اُن کے کلام سے مستفیض ہوتے تھے۔

لے آؤ صد سیر سلوچوں صدی عیسوی کا نامور انگریزی صاحب تصنیف شاعر ہے اہل کتاب فری کوئن (پری ملکہ) ایک شہو نظر ہے۔ اس قدیم یعنی اورینٹالی بحری نظم انگریزی میں رواج دیکر انگریزی شاعری کا بایہ بلند کیا۔

ناسخ کا قول اور نقل ہو چکا ہے۔ غالب ایسا جادو نگار سودا کا قائل ہے اور استاد ذوق کا تو پورا کلام مرزا کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے علی الخصوص اُن کے قصائد میں معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے قصائد سامنے رکھ کر کہے گئے تھے۔ مرزا کے کلام میں سبب تنوع کے اس قدر مقبولیت اور دلچسپی ہے کہ ہر شخص خواہ وہ شاعر ہو یا غیر شاعر اُس کو پڑھتا ہے اور اُس پر وجد کرتا ہے۔ بعض اشعار میں تو حقیقی شاعری کے ایسے سچے جذبات دکھائے ہیں جو دیگر شعراء اُردو کے کلام میں کمیاب ہیں۔ البتہ انگریزی میں شیلی اور کیٹس کے یہاں بہت کچھ ہیں۔ غرض کہ میر و مرزا دونوں ایسے صاحب کمال تھے جن کا کلام بعض اُس زمانہ کے الفاظ و محاورات کو چھوڑ کر زبان کی صفائی اور شیرینی اور خیالات کی بلندی اور پاکیزگی دونوں اعتبار سے اُردو شاعری کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے اور اس زمانہ میں بھی کسی شعر کی سب سے بڑی تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ ان قادر الکلاموں کے کسی شعر کے قریب پہنچ جائے سودا کی استادی اور ملک سخنوری کی بادشاہت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے وہ قدرتی شاعر تھے اور جذبات شاعری اُن کے خمیر میں پڑے تھے میر ایسا نازک دماغ اور دنیا کو بے حقیقت سمجھنے والا شخص اُن کو پورا شاعر مانتا ہے

۱۷ تبو برس اُدھر کا ایک مشہور رنگین طبیعت اور عاشق مزاج انگریزی شاعر تھا۔ تیس برس کے سن میں جوان مرگ مرا نہایت آخفتہ مزاج اور آزاد خیال آدمی تھا جو اسکی بدنامی کا بھی باعث ہوا۔ اسکی تصانیف میں کوئن میب (ملکہ میب) الاسٹر (کنج تنہائی) اور یوولٹ آن سلام مشہور ہیں اُس کے خیالات نہایت شاعرانہ اور بلند ہوتے تھے ۱۲

۱۸ شیلی کا معاصر تھا اور مثل اُسی کے نوجوان مرزا اسکی کتاب 'انڈائنس' نہایت دلچسپ ہے۔ نازک خیال اور رنگین طبیعت شاعر تھا۔ خود نہایت حسین اور حسن کا عاشق تھا ۱۲

اور اُن کو ملک الشعرائی کا ستھی قرار دیتا ہے۔ مرزا کے کلام سے ظاہر و باہر ہے کہ اُن کا دل جذبات سے کس درجہ متاثر ہوتا ہے۔ اُن کے اشعار میں ترشے ہوئے نگینوں کی سی آبداری اور انعکاس اور اُن کا دماغ اعلیٰ التخیل سے روشن ہے۔ مرزا میں چند خاص باتیں ہیں جو اُن کے کلام کو مجملہ شعرے ماضی و حال سے ممتاز کر دیتی ہیں۔

(۱) زبان پر کامل قدرت۔ جس سے کلام کا زور مضمون کی لطافت اور نزاکت سے مل کر عجب لطف و اثر پیدا کر دیتا ہے۔

(۲) بندش کی چستی اور الفاظ کی نشست و ترکیب جس سے شعر میں ڈھیل پان اور سستی مطلق باقی نہیں رہتی بلکہ انہیں تلوار صفا مانی کی سی آبداری پیدا ہو جاتی ہے۔ نشست الفاظ کی یہ صفت ہے کہ اگر کوئی لفظ ادھر ادھر ہو جائے تو شعر بجز ہلکے مہل ہو جائے گا۔ صنعت کی خوبی سے صناعت کی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔

(۳) خیالات کی بلندی اور نزاکت ہے۔ البتہ کچھ استعاروں اور تشبیہوں سے کام لیتے ہیں مگر صرف اسی قدر کہ شعر کا حسن بڑھ جائے اور سامع کو مطلب ٹھونک نہ پڑے۔ اُن کا سامان زینت شعر کے حقیقی حسن کو کبھی نہیں چھپاتا۔ ان کی طبیعت ایک رنگ کی پابند نہ تھی۔ جوابات اور لوگوں کو سخت کاوش اور محنت سے میسر ہوتی تھی وہ اُن کو ایک جنبش قلم سے حاصل ہو جاتی تھی۔ تخیل اور قدرت زبان کا اثر تھا۔

(۴) چوتھی چیز اُن میں تصفیہ زبان ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ جن

لوگوں نے زبان کو پاک صاف اور نیر و سیر کیا اُن سب میں مرزا کا نمبر اول ہے۔ بقول مصنف آب حیات جس طرح کیمیادان دو مادوں سے تیسرا مادہ تیار کرتے ہیں انھوں نے فارسی اور ہندی کے امتزاج سے ایک تیسری زبان پیدا کی جسے

مقبولیت عام حاصل ہوئی۔

اب بے موقع نہوگا کہ مرزا صاحب کے متعلق اُن کی اور نیز اُن کے بعد کے شعرا اور تذکرہ نویسوں کی بھی قیمتی اور قابل قدر رائیں بلکہ

مرزا کے کلام پر

شعرا کی رائیں۔

اُن کا اقتباس یہاں تحریر کیا جائے۔ میر تقی میر اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں اُن کی نسبت فرماتے ہیں۔ خود انھیں کی زبان سے سنیے ”مرزا رفیع متخلص بہ سودا جو انے است خوش خلق و خوشخو، گرم جوش، یار باش، شگفتہ رو۔۔۔۔۔

غزل و قصیدہ و شنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید۔ سرآمد شعرائے ہندی اوست۔ بسیار خوش گوشت۔ ہر شعرش طرف لطف رستہ رستہ در چین بندی

الفاظش گل معنی دستہ دستہ۔ ہر مصرعہ برجستہ اش را سرو آزاد بندہ۔ پیش طبع عالیشان فکر عالی شرمندہ۔ شاعر رنجیتہ چنانچہ ملک الشعرائی رنجیتہ اور شاید قصیدہ در ہجو سب گفتمہ موسوم بہ تضحیک و زکا و دراز حد مقدور در و صنعتا بکار بردہ۔

اکثر اتفاق طرح غزل باہم می افتد۔ غرض از مختصات روزگار است حق تعالیٰ سلامش دارد۔“

اسی طرح مرزا قتیل چار شربت میں مرزا کے قصائد کی نسبت لکھتے ہیں کہ ”سودا کا مرتبہ قصائد میں ظہوری کے برابر ہے۔ سوائے اس کے کہ دونوں کا طرز الگ الگ ہے۔ اور کوئی فرق نہیں ہے۔“ اس تنقید پر مصنف اُجیات کی رائے ہے کہ ”مرزا قتیل جو چاہیں کہیں مجھ بے کمال نے ظہوری کی غزلیں اور قصائد تھوڑے بہت پڑھے ہیں دونوں ستاروں اور شہیہوں کے پھندوں سے الجھا ہوا رشیم معلوم ہوتے ہیں۔ مرزا کی مشابہت ہے تو انوری سے ہے جو قصائد اور ہجو

اور نیز مجاورے اور زبان دونوں کا بادشاہ ہے۔ اسی طرح صاحب طبقات الشعرا مرزا کے قصائد کو عربی اور خاقانی کے قصائد سے اور ان کی غزلوں کو سلیم و کلیم کی غزلوں سے بڑھ کر سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ پر گو بھی تھے اور خوش گو بھی تھے میر حسن اپنے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ”مرزا سودا کے مقابلہ میں اب تک کوئی شخص ہندوستان سے نہیں اٹھا اور وہ موسیقی کے بھی ماہر تھے اور فقیر ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا ہے اور وہ میرے اوپر کرم فرماتے ہیں۔ حکیم قدرت اللہ خاں بقا اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں ”مرزا محمد رفیع سرآمد شعراے فصاحت ہیں بعض کے نزدیک غزل گوئی میں میر تقی میر کو نہیں پہنچتے۔ سچ یہ ہے کہ ہر گلے رازنگ و بوئے دیگر است۔ مرزا ایک بے کنار سمندراور میر ایک عظیم الشان دریا ہیں۔ قواعد کی معلومات میں میر صاحب کو مرزا صاحب پر برتری ہے اور قوت شاعری میں مرزا صاحب کو میر صاحب پر فوقیت ہے۔ تذکرہ گلشن بنجار میں ہے کہ ”فقیر کی دانست میں ان کی غزلیں ان کے قصیدوں سے اور ان کے قصیدے ان کی غزلوں سے بہتر ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ غزلوں میں بھرتی کے اشعار ہیں اور قصائد ان سے خالی ہیں تو میں کہوں گا کہ ان کے دیوان کو سمجھ کر پڑھنے والوں پر اس رائے کی قباحت ظاہر ہو جائے گی۔“ پروفیسر شہباز شمس العلما لواب امداد امام صاحب اثر کا قول نقل کرتے ہیں کہ سودا اردو کے شکسپیر تھے۔ اسی طرح سر الفرڈ لائل سودا کو زبان اردو کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔

کلام میں کمی مرزا میں دو تین کمیاں بھی ہیں (۱) ان کا کلام کم و بیش تصوف کی چاشنی سے خالی ہے جس کا ان کے اکثر ہم عصروں میں بہت زور تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ اور ذوق معاملات دنیاوی تک محدود ہے (۲) دوسرے لطف غزل اُن میں کم ہے یعنی اُن کی غزلوں میں وہ سوز و گداز اور سبکی اور سادگی نہیں جو غزل کی جان ہے۔ اس کا مفصل ذکر انشاء اللہ میر تقی میر کے حالات میں آئے گا جہاں ان دونوں کی شاعری کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

میر حسن متوفی ۱۰۸۵ھ مطابق ۱۶۷۴ء میر غلام حسن متخلص بہ حسن معروف بہ میر حسن میر غلام حسین ضاحک کے وہ بلند اقبال صاحبزادے تھے جن کے بیٹے خلیق اور پوتے میر انیس ہوسے جو فلک شاعری پر آفتاب بن کے چمکے۔ ان کے اجداد شہر ہرات کے مشہور خانوادہ سادات سے تھے۔ جد اعلیٰ میر لامی نام ہندوستان آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کی۔

میر حسن اپنے زمانہ کے نامی گرامی شاعر جید فاضل اور مشہور خوشنویس تھے۔ اور ان کمالات کی وجہ سے اپنے ہمچشموں اور ہم عصروں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اُن کے والد میر ضاحک نہایت زندہ دل ظریف اور باغ و بہار آدمی تھے جیسا کہ اُن کے تخلص سے ظاہر ہے۔ میر حسن کی ولادت پُرانی دلی کے محلہ سیدارہ میں ۱۰۸۵ھ میں ہوئی اور بچپن میں درسی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی اور کلام بھی انھیں کو دکھایا اُس کے بعد خواجہ میر درد کے شاگرد ہوئے۔ دہلی کی تباہی کے بعد اپنے والد کے ہمراہ فیض آباد آئے۔ راستہ میں تھوڑے عرصہ تک ڈیگ میں قیام کیا۔ ایک مرتبہ شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ سفر کیا جس کا مفصل حال اپنی مثنوی گلزار ارام میں قلمبند کیا ہے۔

۱۰ گلزار ارام میں لکھنؤ کی جہانگیر آباد کی بہت تعریف ہے اس مثنوی کی ایک نہایت صحیح و خوبصورت نسخہ کتب خانہ مدرّسہ میں موجود ہے۔ دہرہ گندھار گل عینا

فیض آباد میں پہنچ کر نواب سالار جنگ بہادر برادر ہو، یکم صاحبہ کی ملازمت اختیار کی اور ان کے بیٹے مرزا نوازش علی خاں کی مصاحبت میں بھی چند دن رہے۔ جب نواب آصف الدولہ شہنشاہِ عالم میں تخت سلطنت پر بیٹھے اور فیض آباد بدل کر لکھنؤ دار السلطنت ہو گیا تو میر حسن بھی لکھنؤ چلے آئے اور تھوڑے دن قیام کر کے ہمیں ماہِ محرم سنہ ۱۲۸۷ھ میں انتقال کیا بروقت وفات عمر پچاس سال سے متجاوز تھی۔ مصحفی نے تاریخ کہی "شاعر شیریں بیاں" جس سے تاریخ سنہ ۱۲۸۷ھ نکلتی ہے۔ مرزا علی لطف شہنشاہ لکھتے ہیں جو زیادہ قابل اعتبار نہیں ہے۔

تعلیم اور شاگردی میر حسن عربی کم جانتے تھے۔ مگر فارسی میں کمال حاصل تھا۔ اور اس زبان میں کمال بے تکلفی اور سادگی سے لکھتے تھے چنانچہ ان کا تذکرہ شعراے اردو "جو نہایت اعلیٰ درجہ کی فارسی میں ہے اس کا شاہد ہے۔ شاگردی کی نسبت تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے مصنف آبجیات لکھتے ہیں کہ سودا کے شاگرد تھے۔ میر تقی لکھتے ہیں "جوان ابلہ ست نوکر پیشہ اکثر در بندہ خاں در تقریب مجلس تشریف می آرد و منع مرد آدمیانی دارد مشق شعر از مرزا رفیع کہند میر حسن خود اپنی نسبت لکھتے ہیں "اصلح سخن از میر ضیا سلمہ اللہ گرفتہ ام لیکن طرز و اشال از من کما حقہ سرنجام نیافت۔ بر قدم دیگر بزرگان مثل خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا و میر تقی پیر دی نمودہ ام" اس سے ظاہر ہے کہ وہ رسمی طور پر میر ضیا الدین ضیا کے شاگرد تھے اور منیوں صاحب مذکورہ بالا کی پیر دی کرتے تھے۔

۱۔ عقب از نوای سحر خاں محدثی گنج لکھنؤ میں مدفون ہیں (تذکرہ ضحیٰ جلد ۲)

اور ممکن ہے مشورہ سخن بھی کرتے ہوں۔ فطرتاً نہایت خوش مزاج ہشاش
بشاش ظریف اور بذلہ سنج تھے۔ ہزل اور فحش سے کبھی زبان کو آلودہ نہیں
کیا۔ نہایت شیریں زبان، خلیق اور قابل تھے۔ کسی شخص کو کبھی شکایت کا
موقع نہیں دیا۔ اور نہ کسی تذکرہ نویس نے ایک حرف اُن کے خلاف
لکھا ہے۔

طرز کلام کلام نہایت سلیس اور صاف ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے منہ سے
پھول جھڑتے ہیں۔ غزل، رباعی، مثنوی، مرثیہ سب خوب کہتے تھے۔ البتہ
قصیدہ زور دار نہ تھا۔ مثنوی میں کمال حاصل تھا۔ چنانچہ ان کی مشہور
مثنوی ”سحر البیان“ معروف بہ ”مثنوی میر حسن“ اردو میں اپنا جواب نہیں
رکھتی۔ اُن کی غزلیں میر سوز اور میر تقی میر کی غزلوں کا ٹٹف دیتی ہیں۔
وہی عاشقانہ رنگ، وہی سادگی، وہی دلفریبی۔

میر حسن کے صاحبزادے میر حسن کے چار بیٹے تھے جن میں سے تین شاعر
تھے۔ میر تحسن خلیق جو صحفی کے شاگرد تھے۔ میر حسن محسن۔ یہ دونوں نواب
آصف الدولہ کی والدہ نواب بہو بیگم صاحبہ کے داماد مرزا محمد تقی کی سکرٹری
سے تعلق رکھتے تھے۔ تیسرے بیٹے میر احسن خلیق نواب ناظر داراب علی خاں
کی خدمت میں رہتے تھے۔ یہ سب اچھے شاعر تھے اور اپنے پدر بزرگوار کے
رنگ میں کہتے تھے خلیق اور خلق کے دیوان بھی ہیں۔

تصانیف حسب ذیل ہیں

(۱) ایک دیوان غزلوں کا مشتمل بر جملہ اقسام سخن ترکیب بند۔

محسن واسوخت مثلث وغیرہ جس میں فارسی شعر پر مصرع خواہ فارسی میں یا اردو میں لگایا ہے -

(۲) گیارہ مثنویاں جس میں سے حسب ذیل نہایت مشہور ہیں -

(۱) مثنوی سحرالبیان یا قصہ منظر و بد منیر لا جواب اور بے عدیل و منظر مثنوی ہے ۱۹۹۹ء مطابق ۱۹۸۸ء میں تحریر ہوئی۔ جیسا کہ قتیل اور مصحفی کی تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے۔ اور نواب آصف الدولہ بہادر کے نامی پر معنون ہوئی۔ اس میں شاہزادہ منظر اور شاہزادی بد منیر کے عشق کا فسانہ ہے جس میں ضمناً نہایت دلچسپ جزئیات مثلاً قدیم زمانہ کا لباس زیور شادی بیاہ کے رسوم، ہرات کا سامان وغیرہ وغیرہ نہایت خوبی سے بیان کیے ہیں۔ عبارت اس قدر صاف اور با محاورہ ہے کہ صد ہا شعر محاورہ کی صورت میں زبانوں پر چڑھ گئے ہیں۔ اس کا ہر مصرع لا جواب اور ہر شعر انتخاب ہے۔ صفائی بیان، لطف محاورہ، شوخی مضمون، قابل دید ہے سوال جواب کی نوک جھونک، پر لطف مذاق کی باتیں ایسی ہیں جنکو پڑھ کے دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اور ان سب پڑھ یہ کہ کتاب کو لکھے ڈیڑھ سو برس ہو گئے۔ زبان وہی ہے جو ہم آپ بولتے ہیں۔ مولانا آزاد حیرت سے پوچھتے ہیں ”کیا اسے سو برس آگے دالوں کی باتیں سنائی دیتی تھیں کہ جو کچھ کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے جواب ہم تم بول رہے ہیں قصہ پڑانے رنگ کا ہے۔ اس کا ترجمہ نثر میں ایک شخص سنی میر بہادر علی نے ۱۹۱۱ء میں کیا تھا جس کا نام نثر منظر رکھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر

ہم اصل شنوی سے ایسے اشعار منتخب کر کے لکھیں جس سے قصہ کی تمام کڑیاں
مل جائیں اور پورا قصہ باسانی سمجھ میں آجائے

اختصار شنوی میر حسن مسلسل بصورت افسانہ

<p>کے تھا وہ شہنشاہ گیتی پناہ مگر ایک اولاد کا تھا اَلَم جو کچھ دل کا احوال تھا سو کہا فقیری کا ہے میرے دل کو خیال نہ ہو ذرہ تجھ کو کبھی اضطراب فقیری میں ضائع کرو اُس کو مت سو اس کا تردد بھی کرتے ہیں ہم نصیبوں کو اپنے ذرا دیکھ لو جو نہی رو برو سب وہ شہ کے گئے چند ماں سا بالک ترے ہو گیا خطر ہے اسے بارہویں سال میں بلندی سے خطرہ ہے اس کو تمام رہے برج میں یہ مہ چار وہ ہوا گھر میں شہ کے تولد پسر رکھا نام اُس کا شہر بنیظیر</p>	<p>کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ کسی طرح کا وہ نہ رکھتا تھا غم وزیروں کو ایک روز اُس نے بلا کہ میں کیا کروں گا یہ مال و منال وزیروں نے کی عرض کاے آفتاب یہ دُنیا جو ہے مزرعِ آخرت مگر ہاں جو اولاد کا ہے یہ عزم بلا تے ہیں ہم اہل تنجیم کو بلا کر اُنھیں شہ کنے لے گئے کہا رام جی کی ہے تجھ پر دیا یہ لڑکا تو ہو گا ولے کیا کہیں نہ آئے یہ خورشید بالاے بام نہ نکلے یہ بارہ برس رشک مہ گئے نو مہینے جب اُس پر گذر ہوا وہ جو اس شکل سے دلپذیر</p>
--	--

پڑی جب گرہ بارہویں سال کی
 کہا شہ نے بلوا نقیبوں کو شام
 رعیت کے خوش ہوں صغیر و کبیر
 کہا شاہ نے اپنے فرزند کو
 نہاد دھوکے نکلا وہ گل اس طرح
 غرض ہو کے اس طرح آراستہ
 گھڑی چار تک خوب سی سیر کر
 اسی کثرت فوج سے ہو سوار
 قضا را وہ شب تھی شب چارہ
 کچھ آئی جو اُس مہ کے جی میں ترنگ
 خواصوں نے جا شاہ سے عرض کی
 ارادہ ہے کوٹھے پہ آرام کا
 کہا شہ نے اب تو گئے دن نکل
 قضا را وہ دن تھا اُسی سال کا
 زبس نیند میں تھا جو وہ ہو رہا
 قضا را ہوا ایک پری کا گذر
 ہوئی لاکھ جی سے وہ اُس پرشار
 محبت کی آئی جو دل میں ہوا
 قضا را کھلی آنکھ اُس گل کی جو

کھلی گل پھری غم کے جنجال کی
 کہ ہوں صبح حاضر بھی خاص عام
 کہ نکلے گا گل شہر میں بے نظیر
 کہ بابا نہاد دھوکے تیار ہو
 کہ بدلی سے نکلے ہے مہ جس طرح
 خراماں ہوا سرو نو خاستہ
 رعیت کو دکھلا کے اپنا پسر
 پھرا شہر کی طرف وہ شہریار
 پڑا جلوہ لیتا تھا ہر طرف مہ
 کہا آج کوٹھے پہ بچھے پلنگ
 کہ شہزادے کی آج یوں ہے خوشی
 کہ بھایا ہے عالم لب بام کا
 اگر یوں ہے مرضی تو کیا ہے خلل
 غلط وہم ماضی میں تھا حال کا
 بچھونے پہ آتے ہی وہ سو رہا
 پڑی شاہزادے پر اُسکی نظر
 وہ تخت اپنالائی ہو اسے اتار
 وہاں سے اُسے لے اُڑی دلربا
 نہ پائی وہاں شہر کی اپنے بو

نہ وہ لوگ دیکھے نہ وہ اپنی جا
 اچنبھے کا یہ خواب دیکھا جو واں
 سر جانے جو دیکھی مہ چار دہ
 کہا کون ہے تو یہ کس کا ہے گھر
 پھر اُنٹھ کو لے اور اُدھر سے نقاب
 خدا جانے تو کون میں ہوں کہاں
 یہ گھر گو کہ میرا ہے تیسرا نہیں
 چُھڑا کر ترا تجھ سے شہر و دیار
 پری ہوں میں اور یہ پرستان ہے
 غرض دل کو جوں توں لگایا وہاں
 ولیکن نہ عقل و نہ ہوش و حواس
 وہ تھی نازنیں بھی بہت عقل مند
 غرض ماہِ رُخ اُس پری کا تھا نام
 کہا ایک دن اُس نے اے بنیظیر
 تو رُک رُک کے کرا اپنے جی کو نہ بند
 یہ گھوڑا تو کل دو گئی کل کا تجھے
 کہ گر شہر کی طرف جائے کہیں
 تو پھر حال ہو جو گنہگار کا
 کہا کیونکہ میں تم کو جاؤں گا بھول

تعجب سے اک اک کو تکتا رہا
 لگا کہنے یارب میں آیا کہاں
 کہ ہے اجنبی سی وہ اک رشک مہ
 لے آیا مجھے کون گھر سے اُدھر
 دیا اُس پری نے یہ ہنس کر جواب
 مجھے بھی تعجب ہے میں ہوں جہاں
 یارب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں
 یہ بندی ہی لائی ہے تقصیر وار
 یہاں سب یہ قوم بنی جان ہے
 کہا اُس نے جو کچھ کہا اُس کو ہاں
 رہے وحشیوں کی طرح وہ اُداس
 نہ کھلنے سے کچھ اُسکے ہوتی تھی بند
 پدر سے کیا تھا یہ پوشیدہ کام
 مرے دام میں تو ہوا ہے اسیر
 نہ پہنچے کہیں تیرے جی کو گزند
 ولیکن یہ دے تو مچلکا مجھے
 ویا دل کسی سے لگائے کہیں
 وہی حال ہو تجھ سے دلدار کا
 مجھے جو کہا تم نے سب ہے قبول

فلک سیر تھا نام اُس رخس کا
 اُسی رخس پر ہو کے جلوہ کناں
 وہی اک پہر سیر کرتا تھا وہ
 کہ پھر تہ تھا ماہ رخ کا عتاب
 اٹھا سیر کو بے نظیر ایک رات
 سہانا سا اک باغ آیا نظر
 کہ تھی نور میں چاندنی سے دو چند
 اُتر اپنے گھوڑے سے اور سُجھکا
 کہ دیکھوں یہاں کوئی ہے یا نہیں
 کہ سب کچھ گیا اُس کے جی سے اُتر
 ذرا چل کے اس سیر کو دیکھ لو
 نظر سے بچائے ہوئے چھانوں وہ
 چلا سائے سائے درختوں کی آڑ
 کہ لپٹے ہوں جس طرح مشتاق سخت
 درختوں سے جوں ماہ ہو جلوہ گر
 عجب چاندنی ہے عجب ہے سماں
 لگا نکلنے سیرت سے ہر ایک سو
 چلا دیکھتے ہی دل اُس کا نکل
 اور آئی نظر اُس میں اک شک ماہ

یہ گھوڑا جو اُس گل کے تھا بخش کا
 سرشام وہ بے نظیر جہاں
 ہر اک طرف سے ہو گزرتا تھا وہ
 پہر جبکہ بچتا تو پھر تاشتاب
 سنو ایک دن کی یہ تم واردات
 ہونا گہاں اُس کا اک جا گذر
 سفید ایک دیکھی عمارت بلند
 یہ عالم جو بھایا تو کوٹھے پہ آ
 لگا جھانکنے اُس مکان کے تنیس
 جو دیکھا تو ایسا کچھ آیا نظر
 کہا جی سے اب تو جو کچھ ہو سو ہو
 یہ کہہ نیچے اُتر ادبے پاؤں وہ
 الگ کھول ہاتھوں سے واں کے کوڑ
 تھے اک طرف گنجان باہم درخت
 لگا واں سے چھپ چھپ کے کرنے نظر
 جو دیکھی تو صحبت عجب ہے وہاں
 رہی جنس کی اپنے جو اُس کو بو
 عجب صورتیں اور طرفہ محل
 گئی اُس کے عالم پہ جسد نگاہ

برس پندرہ ایک کا سن و سال
 دیے کہنی تکیے پہ اک ناز سے
 خواہیں کھڑی ایدھر او دھر تمام
 قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام
 یہ قدرت کا دیکھا جو اُس نے کمال
 درختوں سے وہ دیکھتا تھا نہاں
 جو دیکھے تو ہے اک جوانِ حسیں
 کسی نے کہا ہے پری یا کہ جن
 یہ آپس میں باتیں جو ہونے لگیں
 گئے بات پر شاہزادی کے گوش
 کہا میں تو دیکھوں یہ کہہ کر اٹھی
 خواہوں کے کا ندھے پہ رکھ اپنا ہاتھ
 جو دیکھیں تو ہے اک جوانِ حسیں
 برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
 ولے عشق کی تیغ کھائے ہوئے
 گئی اُس جگہ جب کہ بدر منیر
 گئے دیکھتے ہی سب آپس میں مل
 عنبر صن بنظیر اور بدر منیر
 تھی ہمراہ اک اُس کی دختِ وزیر

نہایت حسیں اور صاحبِ جمال
 سر نہر بیٹھی تھی انداز سے
 ستاروں کا جوں ماہ پر اثر دہم
 قیامت کرے جس کو جھجک کر سلام
 کہا شاہزادے نے یا ذا الجلال
 کسی کی نظر جا پڑی ناگہاں
 درختوں کی ہے اوٹ میں مہ حسیں
 کسی نے کہا ہے قیامت کا دن
 اشاروں سے گھاتیں جو ہونے لگیں
 یہ سنتے ہی جاتا رہا اُس کا ہوش
 گیا سننا جی تو رہ کر اٹھی
 عجب اک ادا سے چلی ساتھ ساتھ
 کھڑا ہے وہ آئینہ ساں مہ حسیں
 جوانی کی راتیں مرادوں کے دن
 کڑا دل کسی پر لگائے ہوئے
 اور اُس نے جو دیکھا شہِ بنظیر
 نظر سے نظر جی سے جی دل سے دل
 گرے دونوں آپس میں ہو کر اسیر
 نہایت حسیں اور قیامت شریہ

تبتائی تنوں میں ذرا اُن کے تاب
گلِ شبنم آلودہ گریبان سی ۛ
وہیں نیم بکمل اُسے چھوڑ کر
نہاں آہ آہ اور عیاں واہ واہ
میں اب چھوڑ گھراپنا جاؤں کہاں
چھپی اپنے جا کر وہ دالان میں
لگی ہنس کے کہنے کہ بدرِ منیر
مثل ہے کہ من بھائے مُنڈیا ہلائے
یہ ہے وارداتِ غریب و عجیب
تو اس گل سے گھر رشک گلزار کر
کیا میزباں میہاں کے تئیں

شتابی سے لا اُس نے چھڑکا گلاب
دہ اٹھنے تو اٹھی یہ حیران سی
چلی اُس کے آگے سے مُنہ موڑ کر
غضبِ منہ پہ ظاہر نہاں دل میں چاہ
یہ ہے کون کم بخت آیا یہاں
یہ کہتی ہوئی اُن کی آن میں
کہ اتنے میں آئی وہ دختِ وزیر
مری طرف ٹھک دیکھ تو ہائے ہائے
ترے گھر میں آیا ہے ہماں غریب
شتابی سے مجلس کو تیار کر
بلا لائی جا اُس جواں کے تئیں

محل کا سماں سب دکھایا اُسے
جواں نے حقیقت کہی موہو
چھپے راز سے اُس کو ماہر کیا
زیادہ نہیں اس سے فرصت مجھے
بہر بھر گئی اتنے عرصے میں رات
کہا اب میں جاتا ہوں بدرِ منیر
تو پھر آج کے وقت کل آؤں گا

بلا اک نکاں میں بٹھایا اُسے
اکھلا بسند جس دم درِ گفتگو
پر می کا بھی احوال ظاہر کیا
کہا ایک پہر کی ہے رخصت مجھے
رہی دل ہی دل میں غرض دل کی بات
خبر رات کی سُن اٹھا بنیظیر
اگر قید سے چھوٹنے پاؤں گا

بندھا پھر تو معمول اُس کا دھام
 پہر رات تک ہنسنا اور بولنا
 کبھی ہجر سے اُن کو ہونا ملول
 کسی دیو نے دی پری کو خبر
 یہ سن کر وہ شعلہ بھبھوکا ہوئی
 قسم مجھ کو حضرت سلیمانؑ کی
 کہا دیو سے تو مجھے دے پتا
 کوئی ناز نہیں سی تھی اک اُسکے ساتھ
 قضارا اُڑا میں جو ہو کر ادھر
 یہ اُڑتی سی سن کر خبر وہ پری
 غضب ناک بیٹھی تھی یہ تو ادھر
 بلا سی وہ دیکھ اُس کے پیچھے پری
 تجھے سیر کو میں نے گھوڑا دیا
 مزا چاہ کا دیکھ اپنی ذرا
 یہ کہہ اور بلا اک پریزا کو
 اسے کھینچتا یاں سے لیجا شباب
 کنواں اُس میں جو ہے مصیبت بھرا
 اسے جا کے اُس چاہ میں بند کر
 سر شام کھانا کھلانا اُسے

کہ ہر روز آتا اُدھر وقت شام
 درِ عشق اور حُسن کو کھولنا
 کبھی وصل میں بیٹھنا پھول پھول
 کہ معشوق عاشق ہوا اور پر
 لگی کہنے ایں یہ بلا کیا ہوئی
 ہوئی دشمن اب اُسکی میں جان کی
 کہا وہ کسی باغ میں تھا کھڑا
 کھڑی تھی دیے ہاتھ میں اُسکے ہاتھ
 یہ دونوں مجھے واں پڑے تھے نظر
 کہا دیکھنے پاؤں اُس کو ذری
 کہ رتنے میں آیا وہ رشکِ قمر
 کہا سن تو اے موزی و مدعی
 کہ اُس مال زادی کو جوڑا دیا
 جھنکاتی ہوں کیسے کنویں رہ بھلا
 کہا سننا اس کی نہ فریاد کو
 وہ صحرا جو ہے درد و محنت کا باب
 کئی من کا پتھر ہے واں پر دھرا
 وہی سنگ پھر اُسکے مُنہ پر تو دھر
 اور اک جامِ پانی پلانا اُسے

نہ دیکھو سوا اس کے گر کچھ کے
 کیا بند پھر جا کے اُس چاہ میں
 پھنسا اس طرح سے جو وہ بنظر
 کسی دن نہ آیا جو وہ رشکِ ماہ
 لگی کہنے نغم النساء سے بوا
 کہا اُس نے بی تم کو سودا ہے کچھ
 خدا جانے کس شغل میں لگ گیا
 لگی کہنے تب اُس کو بدرِ منیر
 مجھے رات دن اس کا رہتا ہے ڈر
 نہ باندھا ہو اُس کو کسی شید میں
 کسی منڈکری مار آخر کو لیٹ
 ذرا آنکھ لگ گئی جو اس حال میں
 قضا نے دکھا یا عجب اُس کو خواب
 جو دیکھے تو صحرا ہے اک ق و دق
 نہ انسان ہے دان نہ حیوان ہے
 مگر بیچ میں اُسکے ہے اک کنواں
 کنویں کا ہے منہ بند اُس سے اڑی
 صداواں سے آتی ہے بدرِ منیر
 میں بھولا نہیں تجھ کو لے میری جاں

یہی اُس کا معمول دائم رہے
 کنواں وہ جو تھا قاف کی راہ میں
 پڑی بے قراری میں بدرِ منیر
 نظر میں ہوا اُس کے عالم سیاہ
 خدا جانے اُس شخص کو کیا ہوا
 وہ مشوق ہے اُس کو پرواہ ہے کچھ
 مری چڑ ہے اتنا بھی ہونا خدا
 کہ سُنتی ہے اے میری دختِ ذریعہ
 پری نے سُنی ہو نہ یاں کی خبر
 کیا ہو نہ اُس کے تیس قید میں
 چھپر کھٹ کے کونے میں منہ کو لیٹ
 تو دیکھا بہت اُس کو جہاں میں
 کہ دشمن نہ دیکھے یہ حال خراب
 کہ رستم جسے دیکھ ہو جائے فق
 فقط اک کفِ دست میدان ہے
 کہ اٹھتا ہے آہوں کا وانسے دھواں
 کسی لاکھ من کی سل اُس پر پڑی
 ترے چاہ غم میں ہوا ہوں اسیر
 کروں کیا کہ ہے مجھ پہ قیدِ گراں

یکا یک گئی آنکھ رتنے میں کھل
 سنا جب کہ خیم النساءے یہ حال
 لگی کہنے وہ یوں نہ آنسو بہا
 بس اب سر بصر اٹکتی ہوں میں
 کہا شاہزادی نے سن اے رفیق
 بھلی جنگی اپنی نہ کھو جان تو
 کہا اُس نے کیا کیجئے اب بھلا
 تجھے دیکھنا یوں گوارا نہیں
 یہ کہہ اُس نے رُو رُو اتارا سنگار
 پھر آئے جو کچھ اُس کے ہوش کو اس
 چلی بن کے جوگن وہ باہر کے تئیں
 جُدا ہو کے القصر و توں کو چھوڑ
 نہ سدھ بُدھ کی لی اور نہ منگل کی لی
 لئے بین پھرتی تھی صحرا نور و
 قضا را سہانا سا اک دشت تھا
 وہ تھی اتفاقاً شب چارہ
 بچھا مرگ چھالے کو اور لیکے بین
 کدرا بجانے لگی شوق میں
 بندھا اُس جگہ اس طرح کا سماں

پڑے اشک خسار پر اُس کے ڈھل
 ہوئی بیکراری تب اُس کو کمال
 ترے واسطے میں نے یہ دیکھ سہا
 اُسے ڈھونڈ لائے کو حلیتی ہوں میں
 ہوئی میں تو اس چاہ غم میں غریق
 کہ وہ ہے پری اور انسان تو
 پڑی اب تو ہے اپنے سر پر کلا
 اس اندوہ کا مجھ کو یا را نہیں
 کیا اپنی لہواز کو تار تار
 سجاتن یہ جوگن کا اُسے لباس
 دکھاتی ہوئی چال ہر ہر کے تئیں
 چلی اپنے گھر بار سے مُنہ کو موڑ
 نکل شہر سے راہ جنگل کی لی
 تن چاک چاک اور رُخ زرد زرد
 کہ اک شب ہوا اُسکا داں بستر
 آداسے وہ بیٹھی تھی داں شکم
 دوزانو سنبھل کر وہ زہرہ جبین
 لگی دست دپا مارنے ذوق میں
 صبا بھی لگی رقص کرنے وہاں

یہاں تو یہ عالم تھا اور طور یہ
 کہ تھا اک پری زاد فرخ سیر
 ہوا بہر اڑائے ہوئے اپنا تخت
 وہ جاتا تھا کرتا ہوا سیر ماہ
 یکا یک سنی بین کی جو صدا
 جو دیکھے تو جو گن ہے اک رشک حور
 نظر کر کے حسن اُس کا غش کر گیا
 یہ سمجھا بناوے کا کچھ بھیس ہے
 پڑا تم پہ ایسا کہو کیا بجوگ
 وہ سمجھی کہ دل اُس کا آیا دھر
 کہا ہنس کے جو گن نے ہر بول ہر
 گیا بیٹھ آ سامنے ریت میں
 بجاتی رہی بین وہ صبح تک
 دھری اپنے کا ندھے پہ جب اُس نے بین
 پر بزا دے تب پکڑ اُس کا ہاتھ
 زمیں سے اڑا آسمان کے تکیں
 نہ مانا اور اُس نے اٹھایا اُسے
 یہ مژدہ گیا باپ پاس اپنے لیے
 یہ جو گن جو ہے ایک صاحب کمال

تس اوپر مزا تم سنا اور یہ
 جنوں کے وہ تھا بادشہ کا سپر
 کسی طرف جاتا تھا فیروز تخت
 اُسے لوگ کہتے تھے فیروز شاہ
 وہاں تخت لا اپنا اُس نے رکھا
 کہ چشم فلک نے نہ دیکھا یہ نور
 تعشق کے عالم میں بس مر گیا
 لگا کہنے جوگی جی آ دیس ہے
 لیا واسطے جس کے تم نے یہ جوگ
 کہ دل بھی تو رکھتا ہے دل کی خبر
 جہاں سے تو آیا چلا جا ادھر
 ہوا کھیت یہ تو اُسی کھیت میں
 یہ رویا کیا سامنے بے دھڑک
 اُٹھی لے کے انگریزائی زہرہ جبین
 شتابی بٹھا تخت پر اپنے ساتھ
 وہ کتنی کہا کی نہیں رے نہیں
 پرستان میں لا بٹھایا اُسے
 کہا عرض رکھتا ہوں میں آپ سے
 ذرا بین سنیے اور اُس کے خیال

بہت آپ اُس سے اُٹھا دینگے حظ
 کہا اُس نے بابا بہت خوب ہے
 کہا او جو گی جی بیٹھو ادھر
 بہت اُس کی تعظیم و تکریم کی
 غرض اس طرح اُس کا معمول تھا
 بجا بن سب کو رچھاتی تھی وہ
 دے کیا کہوں حال فیروز شاہ
 نہ دُنیا کی اُس کو نہ دیں کی خبر
 غرض ایک دن بات یہ جان کر
 نہ تھا اُس گھڑی کوئی ایدھر ادھر
 اکیلے اُسے دیکھ ہو بے قرار
 گرا اس طرح سے قدم پر جو وہ
 کہ ہے آج کیا یہ خلاف قیاس
 لگا کہنے رُو رُو کے فیروز شاہ
 تمھاری سمجھ نے تو مارا ہمیں
 کہا اُس نے کہہ تو شتاب پنا حال
 کہا تب پر یزاد نے میری جاں
 بھلا ہجر میں کب تلک ہوں ملول
 لگی مہنس کے کہنے کہ اک طور سے

بہت بین میں اُسکی پاؤں گئے حظ
 ہمیشہ سے راگ اپنے مرغوب ہے
 کروڑ روشن اپنے قدم سے یہ گھر
 جگہ ایک پاکیزہ رہنے کو دی
 کہ اُس شاہ پریوں کی خدمت میں جا
 پہر کے بچے گھر کو آتی تھی وہ
 کہ تھی دن بدن اُسکی حالت تباہ
 اُسی کے تصور میں آٹھوں پہر
 لگا گھات پر اپنی وہ آن کر
 اکیلی پڑی جو گن اُس کو نظر
 گرا پاؤں پر اُسکے بے اختیار
 تو کہنے لگی مُسکرا اُس کو وہ
 گرا اتنا کیوں ہو کے تو بے حواس
 کہ بس بس ہی تو کہو گی نہ واہ
 یہ باتیں نہیں ہیں گوارا ہمیں
 کہ تو کیوں گرا سر کو پاؤں پہ ڈال
 کہاں تک کروں راز اپنا نہاں
 غلامی میں اپنی مجھے کرم قبول
 جو میری کہانی سُننے غور سے

مطالب اگر میرے برلائے تو
 کہا اُس نے پھر جلد سہرا لے
 کہا اُس نے یہ ہے مری داستان
 ملک اک وہاں کا ہے مسعود شاہ
 جہاں میں ہے بدر منیر اُس کا نام
 بنایا ہے اُس نے الگ ایک باغ
 جُدا باپ سے تھی وہ اُس جا مقیم
 میں نجم النساء اُس کی دُختِ وزیر
 ہوئی ایک دن یہ عجب واردات
 کہاں تک کہوں اُس کا قصہ ہے دُور
 گیا اُس پر اس شاہزادی کا دل
 دے اُس پر عاشق ہوئی تھی پری
 کہیں اُس کے آنے کی سُن کر خبر
 دیا قید میں اُس کو ڈالا کہیں
 سو میں کھوج میں اُس کے جو گن ہوئی
 پریزا د آپس میں تم ایک ہو
 تو شاید مدد سے تمھاری ملے
 دل آباد ہو جی کو آرام ہو
 کہا تب پریزا د نے ہاتھ لا

تو شاید مراد اپنی بھی پائے تو
 جو کچھ آپ سے ہو بجالائیے
 کہ شہر سراندیپ ہے اک مکاں
 کہ بیٹی ہے اک اُس کی مانند ماہ
 میں رہتی تھی خدمت میں اُسکی مدام
 کہ فردوس کا ہے وہ چشم و چراغ
 سدا سیر کرتی تھی بے خوف و بیم
 ہمیشہ سے ہمارا تھی اور شیریں
 کہ اک شخص وارد ہوا ایک رات
 نہ تھا آدمی نور کا تھا ظہور
 گئے کچھ دنوں میں وہ آپس میں مل
 محبت میں تھی اُس کے وہ بھی بھری
 خدا جانے پھینکا ہے اُس کو کہ ہر
 کہ مدت سے اُس کی خبر کچھ نہیں
 یہاں تک تو پہونچی بروگن ہوئی
 اگر تم ذرا کھوج اِس کا کرو
 تو پھر آرزو بھی ہماری ملے
 تمھارا اسی کام میں کام ہو
 انگوٹھا دکھایا کہ اترانہ جا

یہ سن قوم کو اُس نے اپنی بلا
 کہ جاؤ تو ڈھونڈو کرو مست کمی
 جو تم میں سے لادے گا اُس کی خبر
 ہوا ناگہاں ایک کاواں گزر
 وہ روتا جو تھا نالہ و آہ سے
 وہ چوکی پر جو دیوتھے جا بجا
 کہا ماہِ مَرخ کا ہے قیدی یہاں
 وہ تحقیق کر اور لے اُس کا بھید
 کیا جا کے فیروز شاہ کو سلام
 یہ بھیجا پھر اُس ماہِ مَرخ کو پیام
 بنی آدموں کو تو چوری سے لا
 بھلا چاہتی ہے تو اُس کو نکال
 گیا ماہِ مَرخ کو یہ پیغام جب
 کہا مجھ سے تفصیر اب تو ہوئی
 پراتنا یہ احسان مجھ پر کرو
 یہ سن کر جواب اُس کا فیروز شاہ
 الگ یوں لے آیا کنویں سے نکال
 وہ جیتا تو نکلا دے اس طرح
 یہ دیکھا جو احوال اُس کا تباہ

تقید سے سب کو سنا کر کہا
 کہ ہے اک پرستان میں آدمی
 جواہر کے دوں گا لگا اُس کو پر
 جہاں قید میں تھا وہ خستہ جگر
 تو کچھ اُس کو آئی صدا چاہ سے
 لگا پوچھنے کس کی ہے یہ صدا
 کنویں میں تڑپتا ہے اک نوجوان
 اڑا شہر کو اپنے دیو سفید
 سن آیا جو کچھ تھا سنا یا تمام
 کہ کیوں زینت کرتی ہے اپنی حرام
 بٹھاتی ہے گھر میں تعشق جتنا
 کنویں میں جسے تو نے رکھا ہڑال
 ہوئی غون سے وہ پریشان تب
 کہو اُس کو لیجائے یاں سے کوئی
 کہ اُس کا پرستان میں چرچا نہو
 چلا اپنے گھر سے جہاں تھا وہ چاہ
 کہ فوارہ جوں آب کو دے اُچھال
 کہ بیمار ہو نزع میں جس طرح
 تو روتا ہوا جلد فیروز شاہ

لے آیا وہ بیٹھی تھی جو گن جہاں
 کہا پھر یہ جا کر کہ خبسم النساء
 یہ سُنتے ہی گھبرا کے بولی کہاں
 ذرا اُس کی صورت دکھا تو مجھے
 کہ شادنی بڑی ہے کہیں غم نہ ہو
 لے آیا وہ جو گن کو داں ساتھ ساتھ
 دکھایا اُسے اور کہا کر تو غور
 کہا ہاں رے ہاں یہ وہی ہے وہی
 بلا اُس کی لے لے کے گرنے لگی
 تو خبسم النساء ہے یہ دخت وزیر
 کہاں یہ لباس اور کہاں تم یہ لوگ
 کہ عالم سے اپنے بگنا کیا
 کہ اس طرح پہنچے ہو تم ہم تلک
 چلے دوسرے دن وہ نزدیک شام
 چلے تخت پر بیٹھ اوپر کی راہ
 وہاں اُس کو لائی وہ دخت وزیر
 لگی گرد پھرنے بزنک صبا
 کہا میں لے آئی تیرا بے نظیر
 وہ سب کہدیا حال تھا جس طرح

بٹھا تخت پر اپنے اُس کو وہاں
 رکھا تخت اک جا پہ اُس کا چھپا
 چل اب تو کہ میں اُس کو لایا یہاں
 کہا چل کہاں ہے بتا تو مجھے
 کہا رے کے چلیو ذرا خبسم رہو
 یہ کہہ اور لے ہاتھ میں اُس کا ہاتھ
 گیا آپ اُس تخت پر بیٹھ اور
 جسے ڈھونڈتی تھی سو یہ ہے وہی
 یہ اُس تخت کے گرد پھرنے لگی
 وہ دیکھے جو تلک آنکھ اٹھا بے نظیر
 کہا تو کہاں اور کس کا یہ جوگ
 کہا تیرے غم نے دانا کیا
 کسی سرگزشت اُس نے اسدم تلک
 کیا ایک دن تو انھوں نے مقام
 وہ جو گن وہ فیروز شہ اور وہ ماہ
 مریج نشیں تھی جو بدر منیر
 بلائیں لگی لینے خبسم النساء
 گئی جب کہ خلوت میں بدر منیر
 کہا کیونکہ لائی کہا اس طرح

ترا قیدی جا کر چھڑا لائی ہوں
 کہا پھر وہ دونوں کہاں ہیں کہا
 سواب ایک کو جا کے لاتی ہوں میں
 یہ سن شاہزادی ہنسی کھیل کھلا
 یہ سن کر شتابی گئی وہ ہنگام
 پھپھپھٹے ہوئے لاٹھیاں وہاں
 غرض دیر تک بل کے روتے رہے
 کہا شاہزادے نے احوال سب
 اگرچہ ہر اک وصل سے شاد تھا
 یہ ٹھہر کے نکلے وہ دو ماہرو
 وہ بنجم النساء اور وہ بدر منیر
 رہیں گھر میں پھر جا کے ماں باپ کے
 اکل بنظیر اور وہ فیروز شاہ
 کہ اسباب سب سلطنت کا درست
 وہاں کا جو تھا شاہ انجم سپاہ
 کیا نامہ یوں ایک اُس کو رقم
 فریدوں مثال و سکندر نژاد
 میں وارد ہوں یاں ایک مہاں غریب
 بوازش سے اپنی کرم کیجئے

اور اک اور بندھوا اڑا لائی ہوں
 درختوں میں اُن کو رکھا ہے چھپا
 ہوا دوسرے کو بتاتی ہوں میں
 کہا کیوں اڑاتی ہے بنجم النساء
 لیا جا کے آہستہ اُن کو پکار
 وہ خلوت کا جو تھا قدیمی مکاں
 جدائی کے داغوں کو دھوتے رہے
 کنویں میں جو گزرا تھا اسپر تعب
 ولے ہجر کا غم اُنھیں یاد تھا
 کہ اس بات کو کیجئے ایک سو
 کچھ اک کر بہانا وہ دونوں شریہ
 کہ دیکھیں گے اب ہم قدم آپ کے
 کسی شہر میں رکھ کے فوج و سپاہ
 پھر آئے اُسی جا پہ چالاک و چست
 جسے لوگ کہتے تھے مسعود شاہ
 کہ اسے شاہ شاہاں واسے فخر جم
 مراد جہان و جہان مراد
 لے آئے ہیں مجھ کو مرے یاں نصیب
 غلامی میں اپنی مجھے لیجئے

اگیا یہ جو مسعود شہ کو پیام
 لکھا نامہ اُسکے یہ ایک در جواب
 کہ نامہ تمہارا جو سر بستہ تھا
 اگر ہم کہیں اپنے دعوے پہ آئیں
 ولے ہم کو ہے پاس شرع رسول
 سنی یہ جو نامہ کی گفت و شنید
 بلا سنتوں کو بتا سال و سن
 بڑی خواہشوں سے جب آیا وہ روز
 ہوا جب نکاح اور بٹے ہا رہا
 اٹھا پھر تو نوشاہ بعد از نکاح
 ہوا لیکن اُس وقت دونا مزا
 غرض اس طرح جبہ دولہن کو بیاہ
 وہ نجم النساء تھی جو دختِ وزیر
 کہا باپ کو اُس کے اسے خیر خواہ
 سو میں تجھ سے رکھتا ہوں ایک التجا
 غرض ہر طرح کہ رضا مند اُسے
 پر زیاد تھا وہ جو فیروز شاہ
 پھر سے دن تو اپنے وطن کو پھرے
 خوشی سے لئے حرمت دجان دال

سنا اور پڑھا خط کا مضمون تمام
 کہ عاقل کو نکتہ لگے ہے کتاب
 وہ راز نہاں اپنے ہاتھوں کھلا
 تمہارے فلک کو نہ خاطر میں لائیں
 سو اس واسطے کرتے ہیں ہم قبول
 ہوئی شانزادہ کو گویا کہ عید
 مقرر کیا نیک ساعت کا دن
 چڑھا بیاہنے وہ مہ دلفروز
 پلاسب کو شربت دیے خاصدان
 محل میں بلانے کی ٹھہری صلاح
 کہ دولہا دولہن جیب ہوے ایک جا
 لے آیا جہاں شکی تھی عیش گاہ
 گیا اُس کے والد کے منظر
 مرا بھائی ہے ایک فیروز شاہ
 کہ تو اسکو فرزند ی میں اپنی لا
 کیا حال پر اپنے پابند اُسے
 دیا اُس کو نجم النساء سے بیاہ
 وہ آشفۃ بلبل تمین کو پھرے
 چلے شہر کو اپنے وہ حال حال

<p>زبس باپ ماں کو تھی سہرے کی چاہ لکھوں گر میں اس بیاہ کی دھوم دھام ہوا شہر پر فصل پروردگار مرے ایک مشفق ہیں مرزا قتیل انھوں نے شتابی اٹھا کر قلم بگو شتم زہاقت رسیدایں ندا میاں مصحفی کو جو بھایا یہ طور کسی اُس کی تاریخ یوں بر محل</p>	<p>دوبارہ انھوں نے کیا اُن کا بیاہ تو پھر یہ کہانی نہ ہو دسے تمام وہی شاہزادہ وہی شہریار کہ ہیں شاہراہ سخن کے دلیل یہ تاریخ کی فارسی میں رستم بریں مستثنوی باد ہر دل فدا انھوں نے بھی کی فکر از راہ غور یہ تنخانہ چین ہے بے بدل</p>
--	--

(۲) دوسری مثنوی گلزارِ ارم ہے جس کو گارسن ڈیٹاسی اور بلوہار ڈنے غلطی سے مثنوی سحر البیان کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے یہ بالکل دوسری چیز ہے اور ۹۲۰ھ مطابق ۱۵۱۷ء میں تصنیف ہوئی اس میں جیسا کہ اوپر لکھا گیا شاہ مدار کے میلہ کی چھڑیوں کا مفصل حال لکھا ہے اور مثل مثنوی سحر البیان کے اس میں بھی اُس زمانہ کے مختلف رسم و رواج زنانہ لباس شادی بیاہ ناچ رنگ وغیرہ کے دلچسپ حالات موجود ہیں اس میں لکھنؤ کی ہجو اور فیض آباد کی بہت تعریف کی ہے نمونہ آخر میں موجود ہے۔

(۳) رموز العارفین اس کا ذکر کسی تذکرہ نویس نے نہیں کیا مگر خود میر حسن نے اپنے تذکرۃ اشعار میں کیا ہے۔
ان کے علاوہ اور بھی بعض مثنویاں بتائی جاتی ہیں جو اب ناپید ہیں

انہوں نے کئی ہجوئیں بھی لکھیں مثلاً ہجو عظیم کشمیری - ہجو قصاب - نقل کلا و نٹ
ہجو مکان وغیرہ یہ سب ہجوئیں نہایت پر لطف اور مہذب زبان میں لکھی گئی ہیں
میر حسن نے مختلف اشخاص کی تعریف میں قصائد بھی لکھے جنہیں سے
سات قصیدے موجود ہیں میر صاحب موصوف قصیدہ کے مرو میدان
نہ تھے مگر پھر بھی کچھ قصائد ملتے ہیں -

مراثی چند مرثیے اور سلام بھی انہوں نے تحریر فرمائے جیسا کہ اُن کے تذکرہ
سے پایا جاتا ہے - اس صنف کی تکمیل و ترقی اُن کے پوتے کے زمانہ
میں بخوبی ہوئی -

تذکرہ اشعار یہ تذکرہ فارسی میں ہے اور اس میں تقریباً تین سو شاعروں کا
ذکر ہے اس کا سال تصنیف کہیں مذکور نہیں مگر اُن تاریخوں سے جو خود
تذکرہ میں موجود ہیں ۱۱۹۷ھ بہت قریں قیاس معلوم ہوتا ہے اور یہ
وہ سن تھا جبکہ مزار فیع سودا کی عمر ۷۷ برس کی تھی مصنف نے اس کو
تین دوروں پر تقسیم کیا ہے - پہلا دور اُن شعرا کا جو فرخ سیر سے پیشتر
گزرے - دوسرا اُن کا جو فرخ سیر کے بعد محمد شاہ کے زمانہ تک ہوئے اور
تیسرا خود اپنے معاصروں کا - بڑی خوبی اس تذکرہ کی یہی ہے کہ اکثر ہمعصر شعرا
کا اس میں حال ملتا ہے جو گو کہ بہت مفصل نہیں مگر پھر بھی نہایت دلچسپ اور
کار آمد ہے - مختصر یہ کہ میر حسن ایک شاعر شیریں بیان تھے اُن کا کلام نہایت
سادہ فصیح اور عاشقانہ ہوتا تھا اور اُن کی شنوئی سحرالبیان تو ایک معرکہ الادب

اللہ مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی تذکرہ شعرا سے اردو کے فاضلانہ تقدیریں لکھتے ہیں کہ واضح رہے کہ
یہ تذکرہ ۱۱۹۷ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا -

اور بنظیر تصنیف ہے جس سے اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا -
 آخر میں کچھ اشعارِ مثنوی گلزارِ ارم سے اور کچھ متفرق اشعارِ قصائد و ہجو وغیرہ
 کے بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں -

مثنوی گلزارِ ارم سے

لکھنؤ کی نزمت

جب آیا میں دیا رکھنؤ میں کیا تھا غم نے از بس دل پہ ڈیرا بہت ہیں گرچہ اہل اللہ اس جا ز بس یہ ملک ہے بیڑ پہ بستا کسی کا آسماں پر گھر ہوا میں نہیں ہے لکھنؤ یہ ہے زمانا عجب ہے یاں کی رسمِ در راہ گندی ز بس گنجان ہے یہ شہر باہم ہر اک کو چہ یہاں کا تنگ تر ہے	نہ دیکھا کچھ بہارِ لکھنؤ میں لگا اس جا پہ ہر گز دل نہ میرا وے جاگہ جو بد ہو تو کریں کیا کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا کسی کا جھوٹا تحتِ شہرے میں زمانے پر عبث رکھنا بہانا گئے پستی ہے اور گا ہے بلندی سما سکتا نہیں یاں غیر کا دم ہوا کا بھی بہ مشکل یاں گزر ہے
---	--

فیض آباد کی تعریف

یہ دیکھی میں نے جب کیفیتِ شہر کہ کیجئے سیرِ فیض آباد جا کر جو نہی داخل ہوا میں اُس نگر میں	مرے اک روز جی میں آئی یوں لہر چلا میں یاں سے اپنا دل اٹھا کر کھلا جنت کا دروازہ نظر میں
--	---

مثال گُل ہر اک دل شاد پایا	عجب معمورہ آباد پایا
فیض آباد سے مراجعت پر نہایت انسوس ظاہر کرتے ہیں -	
قضا پھر لکھنؤ میں مجھ کو لائی مجھے جنت سے جوں آدم نکالا کہ پھر دیکھوں وہی روئے دل افروز وہی صحبت ہو اور وہ ساتھ کے یار غزل خوانی کروں جا اس مکان میں رجب بیگ دحبیب اللہ فضل	نہ تھی معلوم مجھ کو یہ جدائی بُرادن سر سے قسمت نے نہ مالا دعا میری یہی ہے اب شب و روز وہی ہو شہر اور وہ باغ و گلزار پھروں میں چھپے کرتا جہاں میں رہیں میری غزل خوانی میں شامل
رباعی کا نمونہ	
معنی بھی تو ہے اور بیاں بھی تو ہے یاں بھی تو ہے اور واں بھی تو ہے	ظاہر بھی تو ہے اور نہاں بھی تو ہے دونوں عالم میں تجھ سوا کوئی نہیں
ولہ	
جو ہیں سو حسن بڑوتے ہیں وہ اس غم میں جلتے ہیں یہ دل حسین کے ماتم میں	کیا وحش و طیور دانس و جاں عالم میں روشن نہ سمجھ ضرورت پر قسندلیں
ہجو کا نمونہ	
اپنے گھر کی حالت	
دور و پیہ کے تئیں کراٹے پر	ہم نے جب سے لیا ہے یاں اک گھر

جان سے ہیں تنگ اُس میں لوگ
 پہلے اُس گھر کی خوبی یہ پائی
 کلمہ آماس کر گیا سارا
 وہ مثل ٹھیک ہے یہاں فی الحال
 صحن اُس کا بتاؤں کس مقدار
 پانچ بتی کا کُنہ سا چھپر
 نوکا یا دس کڑی کا ایک دالان
 سیڑھی اک بانس کی پُرانی سی
 نہ تو مٹی نہ وال مکان ضرور
 ایک چوکی دھری ہے صحن کے بیچ
 آسپہ دو ٹٹیاں برائے ادھ
 ڈیوڑھی کا بند کیجئے جب در
 آنے والا جو کوئی آ جاوے
 یعنی در جو کھلا نہیں پایا
 گھر میں ہیں دھوپ سے کباب بھی
 ٹوٹا پھوٹا جلا بھنا سارا
 چیز آبی و بادی اُس میں کم
 یاں کنواں بھی نہیں مزا ہے یہ
 خوب یاں کا کھلا جو ہم پر بھید

صحن کا اعداد

گھر نہیں ہے وہ ایک جان کا روگ
 آتے ہی گھر میں مجھ کو تپ آئی
 پہلے ہی مجھ پہ گھر نے مُنہ مارا
 پہلے مُنہ چومتے ہی کاٹا گال
 ایک دو تین چار پائی وار
 ساتھ سایہ کے دھوپ آٹھ پہر
 تیسپرک ٹوٹے جھوپڑے کی شان
 آنے جانے کے واسطے ہر دھری
 دونوں باتوں کا وال نہیں دستور
 صحن میں ساری جاضرور کی کچ
 وہ کہ جاویں ہو اسے خاک میں لوٹ
 بیٹھے جاضرور تب جا کر
 دیکھ دروازہ بند پا جاوے
 کوئی ہے جاضرور کو آیا
 گھر سے نکلے نہ آفتاب کبھی
 دھوپ سے گرم جیسے انگارا
 زور خاکی و ناری کا پیہم
 کس کا یہ گھر ہے کیا بلا ہے یہ
 چاہ کی جا ہے چشمہ خورشید

<p>دن کو آنکھوں میں بھرتے ہیں پانی اگر د میں صورتیں اٹی ہیں سب کپڑے ہم جھاڑتے ہیں لیل و نہار تکیے رہتے ہیں اس طرح میلے طاق پر تھے جہاں جہاں جزدان خاک بھر بھر کے یوں ہوئی ہر دوات تھے دھڑے وہ جو خاص و عام قلم جھاڑتے جھاڑتے بیاض و کتاب صاف آٹا نہ کوئی سانے گا کیا کہیں کس طرح سے جیتے ہیں</p>	<p>رات پلکوں سے قطرہ افشانی ماٹی کی مورتیں بنی ہیں سب دھو بی دھوتے ہیں جیسے دے دے ما جوں نیم کی خاک کے تھیلے ہو گئے کل وہ کوہ رگستان جیسے آندھی میں ہواندھیری رات ریگ ماہی ہوئے تمام مسلم حروف مٹا مٹ کے ہو گئے ہیں خراب خوب جب تک نہ خاک چھانے گا خاک کھاتے ہیں کیچ پیتے ہیں</p>
---	--

قصیدہ کا رنگ یہ ہے -

<p>کون بہست گل اندام چمن میں ہے مقیم خوش ادا کون یہ ستانہ پھرے ہو جسکے عرق شبنم گل کس پہ چھڑکتا ہو گلاب کون انگڑائیاں لیتا ہے چمن میں مخمور شاید اس باغ میں ہو آصف دوران گذر آصف الدولہ بہادر ہے وزیر اعظم</p>	<p>جسکی بودوش پر اپنے لئے پھرتی ہو نسیم نقس پاسے گل زر کس کو کرے دائم نسیم عند لیونکا ہوا رشک سے دل کسکے دو نیم غنچہ بھر بھر کے گلابی کرے ہو کیوں تقسیم کہ ہو وہ ابن کریم ابن کریم ابن کریم نائب ظل الہ صاحب تاج و دیہیم</p>
---	---



میر تقی میر [میر محمد تقی نام میر بخش۔ ریختہ گویان ہند کے استاد اعظم
شاعران اردو کے رہبر مسلم۔ ادب و زبان دانی کے ماہر فن۔ خوش گو خوش بیان
شیریں سخن۔ تذکروں میں والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے مگر ذکر میر میں میر صاحب
نے کوئی نام نہیں لکھا۔ البتہ یہ تحریر کیا ہے ”کہ میرے والد نے جو میرے دادا
کے چھوٹے بیٹے تھے درویشی اختیار کی اور ترک دنیا کر کے بیٹھ رہے شاہ کلیم اللہ
اکبر آبادی سے علم ظاہری و معنوی کا استفادہ کیا جو ان صالح و عاشق پیشہ تھے
اس لیے علی تقی کے عرف سے مشہور ہوئے“ چونکہ اُن کا نام تحریر نہیں ہے
لہذا ممکن ہے کہ نام میر عبداللہ ہی ہو۔ اپنے بزرگوں کی نسبت میر صاحب
تحریر فرماتے ہیں ”میرے بزرگ زمانے کی نامساعدت سے اپنی قوم و قبیلہ
کے ساتھ حجاز سے روانہ ہو کر سرحد کن میں پہنچے وہاں سے وہ احمد آباد
گجرات میں وارد ہوئے بعض تو اُن میں سے وہیں رہ گئے اور بعض تلوکاش
معاش کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ چنانچہ میرے جد کلاں نے اکبر آباد میں
توطن اختیار کیا مگر ناسازگاری آب و ہوا سے راہی عدم ہوئے۔ ایک فرزند چھوٹا
جو میرے دادا تھے وہ اکبر آباد کی فوجداری پر سرفراز ہوئے۔ پچاس سال کی عمر میں
علیل ہوئے اور ابھی پوری صحت نہ ہوئی تھی کہ گوالیار گئے اور چند ہی روز کے
بعد اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ اُن کے دو بیٹے تھے۔ بڑے
بیٹے کو کچھ خلل دماغ تھا اور وہ جوان مر گیا۔ چھوٹے بیٹے میرے والد تھے جو علی تقی
کے نام سے مشہور تھے“ میر صاحب نے ان کے چند قصے بیان فرمائے ہیں۔
درویش صفت تھے ایک دفعہ لاہور چلے گئے اور وہاں ایک فقیر حبیبہ مکر و فریب کا

جال پھیلا رکھا تھا اُس سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ پھر وہ دلی آئے وہاں اُنکی بڑی قدر ہوئی۔ وہاں سے بیانہ پہنچے۔ ایک نوجوان سید پران کی نظر پڑی جو خلوص کے ساتھ اُن کا معتقد ہو گیا وہاں سے آگرے آئے اور خانہ نشین ہو گئے۔ وہ نوجوان سید بھی اُن کی تلاش میں آگرہ پہونچا اور وہیں رہ پڑا۔ اُن کا نام سید ابوالشہ تھا اور میر تقی اُن کی عزت کرتے تھے میر صاحب کی تربیت میں اُن کو بڑا دخل تھا میر صاحب اُن کو اچھے کہتے تھے اور ذکر میر میں ہمیشہ عم بزرگوار لکھنا یاد کرتے ہیں دن رات اُنھیں کے پاس رہتے اور اُن کی تمام تربیت سید صاحب کے زیر نظر ہوئی۔ سید امان اللہ کا جب انتقال ہوا تو میر صاحب دس برس کے تھے۔ میر صاحب اور اُن کے والد کو اُن کے مرنے کا سخت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اُن کے والد بھی بیمار ہو کر مر گئے۔ بڑے بھائی حافظ محمد حسن نے میر صاحب سے بڑی بے مروتی کی اور باپ کے کُل ترکہ پر قبضہ کر لیا۔ اس صغیر سن میں میر صاحب اپنے چھوٹے بھائی محمد رضی کو اپنی جگہ چھوڑ کر خود تلاش معاش میں مصروف ہوئے۔ لیکن کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ ناچار وطن کو خیرباد لکھ کر شاہجہاں آباد دہلی پہونچے۔ خواجہ محمد باسط جو صمصام الدولہ امیر لاهور کے بھتیجے تھے اُن کو نواب کے پاس لیگئے اور میر صاحب وہاں ملازم ہو گئے۔ نواب صاحب نادر شاہ کی جنگ میں مارے گئے اور میر صاحب کی ملازمت جاتی رہی میر صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد آگرہ واپس آگئے مگر جب گذرا وقت کی کوئی معقول صورت نظر نہ آئی تو پھر دلی کا رخ کیا اور اپنے بڑے بھائی کے خاں سردار الدین علی خاں آرزو کے یہاں جا کر ٹھہرے اور کچھ دنوں اُن کے

پاس رہے۔ مگر بڑے بھائی کی تحریک پر خان آرزو نے میر صاحب کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کی۔ اس سے میر صاحب کو استقدر صدمہ ہوا کہ مکان کے دروازے بند کیے پڑے رہتے اسی وجہ سے اُن کی حالت جنون کی سی ہو گئی۔ حکیم فخر الدین خاں نے علاج کیا اور رفتہ رفتہ وہ حالت جاتی رہی۔ بعدہ ایک بزرگ میر جعفر نامے سے کچھ تعلیم حاصل کی اور سید سعادت علی خاں نے اُن کو رنجیتہ میں شعر موزوں کرنیکی ترغیب دی۔ دھڑھان آرزو درپے آزار تھے۔ ایک روز مجبوراً میر صاحب اُن کے مکان سے نکل گئے، مگر غوبی قسمت سے ایک رئیس رعایت خاں نامے نے اُن کو اپنا مصاحب بنالیا اور اس طرح تنگدستی سے گو نہ نجات ملی جب احمد شاہ درانی کو سرحد میں شکست ہوئی تو میر صاحب بھی رعایت خاں کے ساتھ شریک تھے اور جو خدمت اُن کے لائق ہوئی اُس کو انجام دیا۔ رعایت خاں کے ساتھ میر صاحب نے قصبہ سانہر کی سیر کی جو اجیر کے قریب واقع ہے اور جب رعایت خاں اور راجہ رنجیت سنگھ میں شکر رنجی ہو گئی تو میر صاحب نے صفائی کی کوشش کی۔ ذرا سی بات پر رعایت خاں کی ملازمت ترک کر دی مگر اُس نے اُن کی دوستی کا حق خوب نباہا اور محمد ضی میر صاحب کے چھوٹے بھائی کو اپنے یہاں نوکر رکھ لیا۔ چند دنوں کے بعد میر صاحب نواب بہادر کے یہاں ملازم ہو گئے اور رُہیلوں کی جنگ میں اُس اطراف کی سیر کی۔ جب صفدر جنگ نے نواب بہادر کو دغا سے قتل کر ڈالا تو میر صاحب بیکار ہو گئے لیکن چند ہی روز بعد مہارائن دیوان کی سرکار سے متوسل ہو گئے۔ اسی زمانے میں میر صاحب نے خان آرزو اپنے خالو کی ہمسایگی چھوڑ دی اور امیر خاں کی حویلی میں رہنے لگے۔ سکندر آباد کی

لڑائی میں میر صاحب احمد شاہ کے ساتھ تھے۔ راجہ جگل کشور کے توسل سے مہاراجہ
 ناگرمل سے ملے اور پھر کچھ دنوں بعد اُن کے بیٹے نے ان کی کچھ تنخواہ مقرر کر دی
 میر صاحب اُن کے خانہ باغ میں دو پہر رات تک موجود رہتے مشاہرہ معقول
 ہونے سے کسی قدر فراغ البالی سے بسر ہوتی تھی۔ خانہ جنگیوں سے دلی کی حالت
 ابتر ہو رہی تھی اسی میں میر صاحب کا مکان بھی خاک میں مل گیا اور سب مال و سہا
 لٹ گیا۔ اس لوٹ مار کے بعد میر صاحب معہ لواحقین کے دہلی سے نکل کھڑے
 ہوئے اور کچھ دنوں برسات نہ ضائع تھا میں قیام کر کے کہیں پہنچے جو سورج مل کے قلعہ
 اور بہادر سنگھ یہاں اُن سے بڑی مدارات سے پیش آئے اور سورج مل کے طویلے
 میں جو خانہ خرابان دلی کا ماں بنگیا تھا اعظم خاں سے ملاقات ہوئی میر صاحب
 کے بیٹے میر فیض علی بھی یہاں اُن کے ہمراہ تھے۔ راجہ سورج مل کے چھوٹے بیٹے
 نے میر صاحب کے واسطے کچھ ساز و سامان مہیا کر دیا اور خود سورج مل نے روزینہ
 مقرر کر دیا۔ چند دنوں بعد میر صاحب پھر دلی واپس آئے مگر گھروں کو خراب اور
 شہر کو ویران پایا۔ سورج مل کے ساتھ تیس سال کے بعد میر صاحب اکبر آباد
 پہنچے اور اپنے والد اور عم بزرگوار کی قبروں کی زیارت کی۔ اُن کے شعروشعر کا شہرہ
 اب عالم گیر ہو چکا تھا چارمینے دطن میں رہ کر سورج مل کے قلعہ میں آگئے۔ کچھ
 دنوں بعد پھر اکبر آباد آئے اور پندرہ روز رہ کر واپس چلے گئے۔ جاٹوں کی لوٹ مار
 سے راجہ ناگرمل معہ اپنے ہمراہیوں کے کاماں چلے گئے جو راجہ پر تھی سنگھ پیر دھونگھ
 کا سرحدی مقام تھا۔ میر صاحب بھی اُن کی معیت میں تھے اور بوجہ ملازمت اسی
 شہر میں چند دن اقامت گزریں ہوئے مگر تھوڑے عرصے کے بعد ملازمت سے

کنارہ کش ہو گئے۔ راجہ نے میر صاحب کو حسام الدین کے پاس بھیجا اور میر صاحب نے اُن کی طرف سے سب عہد و پیمان کئے مگر راجہ بادشاہ کے لشکر میں جو فرخ آباد میں تھا نہیں گیا۔ اور شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ناچار میر صاحب بھی اُسکے ہمراہ ہو گئے اور دہلی پہنچے اہل دعیال کو عرب سراسے میں چھوڑا اور راجہ سے جدا ہو گئے۔ سرداروں کے اغوا سے بادشاہ نے مجبور ہو کر ضابطہ خاں پر حملہ کیا میر صاحب بھی اس حملہ میں بادشاہ کے ہمراہ تھے۔ ضابطہ خاں بے لڑے بھاگ گیا۔ میر صاحب چونکہ بے روزگار تھے تلاش معاش میں نکلے۔ وجہ الدین خاں برادر خورو حسام الدولہ سے ملے اور اُس نے کچھ مقرر کر دیا۔ میر صاحب ان دنوں خانہ نشین تھے۔ بادشاہ عالمگیر ثانی اُن کو اکثر طلب فرماتے۔ مگر وہ کبھی نہ گئے۔ ابوالقاسم خاں اور عبدالاحد خاں کا چچا زاد بھائی میر صاحب کے ساتھ اس زمانہ میں سلوک کرتے رہے۔ کبھی کبھی وہ اُن سے ملاقات کو جاتے اور بادشاہ بھی کبھی کبھی بھیج دیتے تھے اور حسن رضا خاں بھی میر صاحب کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔

روانگی لکھنؤ۔ لکھنؤ کی روانگی کے حالات میر صاحب یوں تحریر فرماتے ہیں
 ”فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جائے۔ لیکن بے سامانی سے مجبور تھا۔ میری عزت و آبرو کی حفاظت کے خیال سے نواب وزیر المملک آصف الدولہ بہادر آصف المملک نے چاہا کہ میر میرے پاس آجائے تو اچھا ہو۔ چنانچہ میری طلبی کے لئے نواب سالار جنگ پسر اسحاق خاں مولتن الدولہ نے جو وزیر اعظم کے خالو ہوتے تھے، اُن قدیم تعلقات کی وجہ سے جو میرے

خالو سے تھے کہا کہ اگر نواب صاحب ازراہ عنایت کچھ زادراہ عنایت فرمائیں
 تو البتہ میر صاحب یہاں آسکتے ہیں۔ نواب صاحب نے حکم دیا اور انھوں نے
 سرکار سے زادراہ لیکر مجھے خط لکھا کہ نواب والا جناب آپ کو یاد کرتے ہیں۔
 جس طرح ہو سکے آپ یہاں آجائیے۔ میں پہلے ہی دل برداشتہ بیٹھا تھا خط
 کے آتے ہی لکھنؤ روانہ ہو گیا۔ چونکہ خدا کی یہی مرضی تھی میں بے یار و مددگار
 بغیر قافلہ و رہبر کے فرخ آباد کے رستے سے گذرا وہاں کے رئیس مظفر جنگ تھے
 انھوں نے ہر چیز چاہا کہ کچھ روز وہاں ٹھہر جاؤں مگر میرے دل نے قبول نہیں
 کیا۔ دو ایک روز بعد روانہ ہو کر منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ اول سالار جنگ کے
 یہاں گیا انھوں نے میری بڑی عزت کی اور جو کچھ مناسب تھا بندگان عالی
 کی جناب میں کہلا بھیجا۔ چارپانچ روز بعد اتفاقاً نواب مرغوں کی لڑائی دیکھنے کے
 لئے تشریف لائے میں بھی وہاں حاضر تھا ملازمت حاصل کی محض فراست سے
 دریافت فرمایا کہ کیا تم میر تقی ہو؟ اور نہایت لطف و عنایت سے بغل گیر ہوے
 اور اپنے ساتھ نشست کے مقام پر لیگئے اپنے شعر مجھے مخاطب کر کے سنائے۔
 سبحان اللہ کلام الملوک ملک الکلام۔ اس کے بعد فرط مہربانی سے مجھ سے کچھ
 بڑھنے کی فرمائش کی۔ اُس روز میں نے اپنی غزل کے صرف چند شعر عرض کیے
 رخصت کے وقت نواب سالار جنگ نے کہا کہ اب میر صاحب حسب اطلب حاضر
 ہو گئے ہیں۔ بندگان عالی مختار ہیں انھیں کوئی جگہ عنایت فرمادی جائے
 جب مرضی مبارک ہو یاد فرمائیں۔ فرمایا کہ میں کچھ مقرر کر کے آپ کو اطلاع دوں گا
 دو تین روز بعد یاد فرمایا۔ حاضر ہوا اور جو قصیدہ مدح میں کہا تھا پڑھا۔

سماعت فرمایا اور کمال لطف کے ساتھ اپنے ملازموں کے سلسلے میں داخل فرمایا اور ہمیشہ میرے حال پر عنایت و مہربانی فرماتے رہے۔

میر صاحب نے لکھنؤ میں زندگی آرام کے ساتھ بسر کی۔ نواب آصف الدولہ جب شکار کے لئے بہار چلے گئے تو میر صاحب بھی ہم کاب تھے اُنکی یادگار میں شکار نامہ موزوں کیا دوسری دفعہ نواب کوہ شمالی کے دامن تک گئے۔ اُنھوں نے دوسرا شکار نامہ مکر حضور میں پیش کیا۔ اس شکار نامہ کی دو غزلوں کی نواب نے بطور تحسین فرمائی۔

آخر میں تحریر فرماتے ہیں کہ اُس زمانہ میں میر فراج ناساز رہتا ہے۔ یاؤں کی ملاقات ترک کر دی ہے بڑھاپا آپہنچا اور عمر غزنیہ ساٹھ سال کی ہو گئی۔ اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں کچھ دنوں آنکھ کے درد کی تکلیف اٹھانی ضعف بصر کی وجہ سے عینک لگائی۔ دانتوں کے درد کا کیا ذکر کروں۔ آخر دل کڑا کر کے ایک ایک کو جڑ سے اکھڑا دیا۔ غرض کہ ضعف قوی۔ بے دماغی۔ ناتوانی۔ دل شکستگی اور زردہ خاطر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ زندہ نہ رہوں گا اور زمانہ بھی رہنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ بس آرزو اتنی ہے کہ خاتمہ بخیر ہو۔ ۱۷

میر صاحب کی عمر میر صاحب کی عمر میں صاحب کی عمر میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ سو برس کی عمر پائی۔ اُن کی وفات کا سال تحقیق سے معلوم ہے ناسخ کے مشہور مصرعہ تاریخ ”واویلا مرد شہ شاعران“ سے سنہ وفات بارہ سو پچیس ہجری نکلتا ہے۔ تذکرہ جہاں میں میر صاحب کی عمر

۱۷ ملخص از ذکر میر تہ مولوی عبد الحق صاحب (رسالہ اردو ادب و ادب گاہ) دکن اپریل ۱۳۳۷ء

۸۰۔ سال تحریر ہے۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ۱۲۹۰ھ میں جبکہ وہ اپنا تذکرہ قلمبند کر رہے تھے میر صاحب کا سن اسی سے متجاوز ہو چکا تھا مگر یہ قیاس پر زیادہ ترمیمی ہے۔ کتاب ذکر میر کی تاریخ جو ایک قطعہ سے نکالی ہے ۱۲۹۰ھ موتی ہے۔ کتاب کے اختتام پر میر صاحب نے اپنی عمر ۶۷ سال بتائی ہے۔ ان کی پیدائش کی تاریخ تقریباً ۱۲۲۳ھ ہجری ہوئی۔ نادر شاہ کا حملہ ۱۲۹۰ھ میں ہوا تھا اس وقت ان کی عمر صرف ۱۳ یا ۱۵ سال کی ہوگی۔ اگر پیدائش کا سن ۱۲۲۳ھ ہو تو میر صاحب کی عمر ۸۰ یا ۸۹ سال کی ہوتی ہے۔

میر صاحب کی زندگی کے متعلق ابھی تک صحیح حالات بہت کم معلوم ہوئے۔ ڈاکٹر اسپر نگر لکھتے ہیں کہ جب میں ۱۲۴۸ھ لغایت ۱۲۵۸ھ میں شاہان اودھ کے کتب خانوں کی فہرست مرتب کر رہا تھا تو میں نے موتی محل میں ایک قلمی نسخہ میر صاحب کی خود نوشتہ سوانح عمری موسوم بہ ذکر میر کا دیکھا جو زبان فارسی میں ہے اور ضخامت ۵۲ صفحات کی ہے۔ یہ کتاب ابھی تک نایاب تھی مگر اب دستیاب ہو گئی ہے اور انجمن ترقی اردو حیدرآباد کی طرف سے چھپ گئی ہے۔ لکھنؤ میں بھی ایک قلمی نسخہ سید سعید حسن رضوی کے پاس موجود ہے۔ اسکی وجہ سے بہت سی نئی باتیں میر صاحب کے حالات زندگی کے متعلق دریافت ہو گئیں اور اکثر بے بنیاد فرضی افسانوں کا جو میر صاحب کے متعلق بعد کے تذکرہ نویسوں نے لکھے ہیں خاتمہ ہو گیا۔ اکثر غلطی اور بے بنیاد باتیں جو عوام الناس میں مشہور تھیں معاصر تذکرہ نویسوں نے بغیر تحقیق کے قلمبند کر دیں اور ان کو بعد کے

ذکر میر

۱۲۹۰ھ ہجری

لوگوں نے مستند تسلیم کر کے اور زیادہ چمکایا افسوس ہے کہ ذکر میر میر کی ادبی زندگی پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتی اور نکات الشعرا میں میر نے اپنے متعلق سوک اس کے اور کچھ نہیں لکھا۔ مولف اس نسخہ متوطن اکبر آباد سے سبب گردش لیل و نہال از چندے در شاہجہاں آباد سے۔ یہ تذکرہ تقریباً ۱۷۵۶ء میں مرتب ہوا ذکر میر میں میر صاحب نے اپنی زندگی کے حالات قلمبند فرمائے ہیں۔ اپنے زمانے کے واقعات بھی لکھے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے بھی کتاب خاص وقعت رکھتی ہے۔ نادر شاہ کی جنگ سے لیکر ضابطہ خاں کے قتل تک کے واقعات موجود ہیں یعنی ۱۷۵۷ء ہجری سے لیکر ۱۷۶۹ء تک کی تاریخ ہے اور اس زمانے کے واقعات پر روشنی ڈالتی ہے۔ ابھی تک مؤرخین کو اس کتاب کا پتہ نہ تھا اور یہ کتاب تاریخی لحاظ سے قابل قدر ہے۔ دہلی کی خانہ جنگیاں۔ مرہٹوں۔ جاٹوں۔ روہیلوں و افغانوں کی لڑائیاں۔ نوابان اودھ کے معرکے انگریزوں کے مورچے۔ عمائدین شہر کی سازشیں۔ اہل ہنود و مسلمانوں کے خوشگوار تعلقات سب کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔ چونکہ اس زمانے کی بہت سی تاریخیں ہیں لہذا واقعات کی تصدیق یا تردید ہو سکتی ہے۔ میر صاحب خود بہت سی مہموں میں شریک تھے۔ افسوس ہے کہ میر صاحب نے اس زمانے کے لطیف و پہلو پر بہت کم روشنی ڈالی ہے۔ شعر کا ذکر بالکل نہیں ہے۔ ادبی زندگی کے حالات مفقود ہیں۔

سیادت میں اختلاف تذکرہ شورش میں ہے (جس کا سنہ تالیف گیارہ سو ترائوی ہے جبکہ میر صاحب حیات تھے اور دہلی میں مقیم تھے) کہ میر صاحب فی حقیقت

سید نہ تھے بلکہ میر تخلص ہونے کی وجہ سے سید خیال کیے جانے لگے تذکرہ
آب حیات میں ہے کہ کہن سال بزرگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ جب انھوں نے
میر تخلص کیا تو اُن کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کر دایک دن خواہ خواہ سید
ہو جاؤ گے اُس وقت انھوں نے خیال نہ کیا رفتہ رفتہ ہو ہی گئے پھر سودا کے
ایک قطعہ کا حوالہ دیتے ہیں جس کا آخری شعر یہ ہے

میری کے اب تو سارے مسالے ہیں مستعد

بیٹا تو گندنا بنے اور آپ کو تھمیر ۛ

مگر یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ قطعہ سودا کے کلیات میں نہیں ہے اور پھر آگے
خود کہتے ہیں کہ میر صاحب کی سیادت میں شبہ نہ کرنا چاہیے اگر وہ سید
نہ ہوتے تو خود کیوں کہتے

۱۔ مصنف آب حیات نے میر صاحب کی سیادت کے متعلق ایسے الفاظ میں لکھا ہے جن سے اُن کے سید ہونے
میں شبہ بھی پایا جاتا ہے اور آگے چل کر اپنے اس شبہ کی خود ہی تردید بھی کر دی ہے انوس ہے انھوں نے ایک
غیر معتبر روایت ”کہن سال بزرگوں کی“ زبانی نقل کر دی کہ جب میر صاحب نے میر تخلص کیا تو اُن کے والد نے منع کیا
کہ ایسا نہ کر دایک دن خواہ خواہ سید ہو جاؤ گے اس زبانی اور غیر موثق روایت کے علاوہ سودا کا وہ
قطعہ بھی پیش کرتے ہیں جس کے ایک شعر میں میر صاحب کی سیادت کے متعلق مذاق اڑایا گیا ہے
مگر خود ہی اس پیش کردہ شہادت میں شبہ پیدا کرتے ہیں کہ یہ قطعہ سودا کے کلیات میں نہیں ہے
اور آگے چل کر اپنی نگین عبارت میں میر صاحب کی سکینی و غربت اور صبر و فصاحت وغیرہ کا محضر
تیار کر کے ادا کے شہادت کرتے ہیں کہ اُن کی سیادت میں شبہ نہ کرنا چاہیے۔ منطوق سمجھ میں نہیں
آئی اس وجہ سے کہ پہلے خود ہی شبہ کیا پھر اُس شبہ کی آپ ہی تردید کی۔ اس کے علاوہ
شروع مضمون میں جہاں میر صاحب کے خاندان کا ذکر کیا ہے اُن کو ”خلف میر عبداللہ“ لکھتے
ہیں یعنی اُن کے والد کی بھی سیادت کے قائل ہیں۔ اسی طرح مضمون کے آخر میں میر صاحب کے
بیٹے کا نام ”میر عسکری عرت میر کلہو“ بتاتے ہیں ۱۲

پھرتے ہیں میر غوار کوئی پوچھتا نہیں اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی
 حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب کی سیادت کے متعلق کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا اس
 وجہ سے کہ اپنی سیادت کا اشارہ انھوں نے اپنے اکثر اشعار میں کیا ہے۔ ذکر
 میر نے اس امر کا قطعی طور پر فیصلہ کر دیا ہے۔ میر صاحب اپنے والد کا ذکر ہر جگہ
 میر علی متقی کے نام سے کرتے ہیں۔ اپنا نام اپنے والد و نبرگوں کی زبان
 میر محمد تقی لکھا ہے اپنے بیٹے کا نام میر فیض علی لکھا ہے۔ یہ روایت غلط ہے
 کہ جب انھوں نے مختصر اختیار کیا تو ان کے والد نے منع کیا کیونکہ والد کی
 وفات کے وقت میر صاحب کی عمر دس گیارہ برس سے زیادہ کی نہ تھی اور
 اس وقت شعر نہیں کہتے تھے۔ ”میر صاحب کا مذہب شیعہ تھا مگر ایسا تنگ نہیں
 جو دوسروں کے لئے ناگواری کا باعث ہو“ آزاد نے اپنی نہایت
 قابل قدر مگر واقعات کے اعتبار سے کسی قدر غیر معتبر تصنیف (آب حیات) میں
 بعض غلط بیانیوں بھی کی ہیں مثلاً بعض ایسے قصے اور اقوال میر صاحب کی طرف
 منسوب کیے ہیں جن سے ان کی بددماغی اور نازک مزاجی کا اظہار ہوتا ہے
 مثلاً وہ واقعہ جس میں میر صاحب کے سفر دہلی کا ذکر کیا ہے۔ اور میر قمر الدین
 منت اور سعادت یا رخاں نگین کی شاگردی کے متعلق۔ افسوس ہے کہ ان
 واقعات کی تصدیق نہیں کر لی گئی اپنی کتاب کو دیکھ پ بنانے کی غرض سے
 بہت سے بے بنیاد قصے اور سُنائے واقعات بلا تحقیق (مکن ہے بعض
 غلط ذکرہ نویسوں کی تقلید کے خیال سے) داخل کر دیے۔ احمد شہر کہ نکات شعر
 کے شائع ہو جانے اور دیگر معاصرین میر کے تذکروں کے دستیاب ہونے سے

اکثر مشکوک واقعات اب صاف ہو گئے۔ نکات الشعر اُس کے متعلق آبجیات
 نکات الشعر میں ہے ”کہ نکات الشعر شائق شعر کے لئے بہت مفید ہے۔
 اُس میں شعر اے اردو کی بہت سی باتیں اس زمانہ کے لوگوں کے دیکھنے کے
 لائق ہیں مگر وہاں بھی اپنا انداز قائم ہے دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ یہ اردو
 کا پہلا تذکرہ ہے اس میں ایک ہزار شاعر کا حال لکھو گا۔ ان ہزار میں ایک
 بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا۔ ولی کہ بنی شعر کا آدم ہے
 اُس کے حق میں فرماتے ہیں۔ ”وے شاعریت از شیطان مشہور تر“ مگر واقعات
 ان سب باتوں کی تردید کرتے ہیں۔ نکات الشعر اب شائع ہو گئی ہے اُس کے
 دیباچہ میں یہ سب باتیں کہیں نہیں ہیں اور نہ اُس میں ایک ہزار شاعروں کا
 ذکر ہے بلکہ فی الحقیقت تقریباً سو شعر کا حال ہے نہ اُن کے کلام کی تنقید میں سختی
 اور بد دماغی سے کام لیا گیا ہے۔ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی عبارت
 نہایت سلیس اور مبالغے اور استعارے وغیرہ سے پاک و صاف ہے تنقید
 بھی نہایت مختصر اور زور دار الفاظ میں اور نہایت منصفانہ ہے۔ جہاں کہیں
 کسی شاعر کا حال زیادہ معلوم نہیں ہے تو صاف لکھ دیتے ہیں کہ فقیر کو اس کے
 حال سے آگاہی نہیں۔ یا اسی قسم کا کوئی اور جملہ۔ درشت اور طنز یہ جملے کہیں کہیں
 ہیں مگر بہت کم۔ اور صرف اُسی صورت میں جبکہ کوئی شخص اُس کا مستحق فی الواقع
 ہے۔ ولی کی نسبت شیطان سے زیادہ مشہور والا فقرہ ہم کو کہیں نہیں ملتا۔
 بلکہ برعکس اُس کے اُنکی نسبت تو یہ لکھتے ہیں ”کہ از کمال شہرت احتیاج
 تعریف ندارد“ پھر میر صاحب کے مذہب کے متعلق آبجیات میں ہے

کہ ”میر صاحب کے ماموں خفی مذہب تھے اور میر صاحب شیعہ اسپناڑک مزاجی
غضب غرض کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہو گئے“ یہ صحیح ہے کہ خان آرزو کے
متعلق میر صاحب کی نازک مزاجی یا بددماغی کا تذکرہ نکات اشعار میں کہیں
پتا نہیں چلتا بلکہ وہ تو اُن کو اپنا استاد و پیر و مرشد اور رہنما ہے فن وغیرہ
ایسے معزز الفاظ سے یاد کرتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ میر صاحب
کو دیگر مذاہب کے ساتھ تعصب اور ناز و اداری کا ہرگز خیال نہ تھا بلکہ وہ
دیگر مذاہب کا بڑا ادب و احترام کرتے تھے وہ علیحدگی جس کا ذکر مولانا آزاد
نے کیا ہے میر صاحب نے اُس کے متعلق ذکر میں تحریر کیا ہے۔ لیکن
اُن کے کلام سے کہیں نہیں پایا جاتا کہ اُنھوں نے خان آرزو کے خلاف
کوئی بد وضعی کی۔ ذکر میں سراج الدین علی خان آرزو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے
ہیں کہ نادر شاہ کے حملے کے بعد پھر دہلی گیا اور اپنے بڑے بھائی کے خالو
سراج الدین علی خان آرزو کا منت پذیر ہوا اور وہیں کچھ دن رہا اور شہر کے
بعض صاحبوں سے چند کتابیں پڑھیں جب میں کسی قابل ہوا تو بھائی صاحب
(حافظ محمد حسن) کا خط پہنچا کہ میر محمد تقی فتنہ روزگار ہے ہرگز اسکی تربیت میں
سعی نہ کی جائے وہ عزیز آرزو) واقعی دنیا دار شخص تھا اپنے بھانجے کے
لکھنے پر میرے درپے ہو گیا جب کبھی ملاقات ہوتی تو بلا وجہ برا بھلا کہنا
شروع کر دیتے اور طرح طرح سے مجھے تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے
میرے ساتھ اُن کا سلوک ایسا تھا جیسا کسی دشمن سے ہوتا ہے اس رنج و غم
میں میر صاحب کی حالت جنون کی سی ہو گئی ایک روز اُن نے میر صاحب کو

کھانا کھانے کے لئے بلایا اور ناگوار و تلخ باتیں کرنا شروع کیں میر صاحب بغیر
کھانا کھائے اٹھ آئے شام کو اُن کے گھر سے چلے گئے اور پھر کچھ عرصے بعد
اُن کی ہمسائیگی بھی ترک کر دی آرزو کے شجاع الدولہ کے پاس جانے کے بہتہ
لکھتے ہیں کہ میرے خالو بادیہ پیمائے طمع ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب
دوسری بیوی سے تھے اور پہلی بیوی سے حافظ محمد حسن جن کے آرزو خالو تھے
اور میر صاحب کے سوتیلے خالو ہوئے۔ اُنھوں نے میر صاحب کی کچھ پرورش
ضرور کی اور تعلیم میں بھی کچھ حصہ لیا۔ نکات شعرا میں خان آرزو کے کمالات کا اعتراف
ہے اور ذکر میر میں خانگی تعلقات کا بیان۔ پھر آزاد کے بیان سے ایک جگہ
مترشح ہوتا ہے کہ میر صاحب نے اپنا تخلص میر سوز سے لیا جو پہلے تخلص
کرتے تھے۔ یہ بھی ایک بے بنیاد دعویٰ ہے کیونکہ میر صاحب خود فرماتے ہیں
کہ میں عرصہ سے یہ تخلص کرتا ہوں بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ جب سوز نے
یہ دیکھا ہوگا کہ اُن کے اچھے اشعار اُن کے ہم تخلص کی طرف منسوب کیے جائینگے
تو اُنھوں نے پہلا تخلص ترک کر کے سوز اختیار کیا ہوگا۔ خواجہ میر درد کی نسبت بھی
میر صاحب نہایت عمدہ الفاظ استعمال کرتے ہیں اور بہت ادب و عزت سے
اُن کا نام لیتے ہیں۔ مولانا آزاد یہ بھی لکھتے ہیں کہ میر صاحب اُن لوگوں کا ذکر
جو دلی کے رہنے والے نہ تھے اور زبان اُردو سے اسی وجہ سے ناواقف تھے
بہت حقارت کے ساتھ کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی واقعہ کے خلاف ہے اسوجہ سے
کہ میر صاحب لے اکثر ایسے شعرا کی بہت کچھ تعریف کی ہے جو دلی کے رہنے والے
نہ تھے مثلاً میاں شرف الدین مضمون کی نسبت یہ دلچسپ الفاظ لکھتے ہیں۔

شہنشاہ چھپا چھپو کہ قصہ بہایت متصل اکبر آباد حریف ظریف، ہشاش بشاش، ہنگام
گرم کن مجلس، ہر چند کم گو بود لیکن بسیار خوش فکر و تلاش لفظ تازہ زیادہ،
میر صاحب کا کیر کٹر اس میں کوئی شک نہیں کہ قسام ازل نے میر صاحب کو
انتہا درجہ کی محنت، خود داری، اور ایک حساس طبیعت دی تھی۔ وہ اکثر
رؤسا اور امرا کے ارتباط و میل جول تک کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے
کہ مبادا اس سے اُن کی خود داری پر کوئی حرف نہ آئے۔ وہ سید ضابط، کم گو،
اور آزاد طبیعت واقع ہوئے تھے۔ افلاس اور کم مانگی نے اُن کی عالی ظرفی کو
اعلیٰ تر کر دیا تھا۔

نازک ماغی میر صاحب کی بددماغی اور نازک مزاجی کو آزاد نے بڑے مبالغہ
سے بیان کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ نازک مزاج ضرور تھے۔
راجہ ناگرمل جو اُن کا بڑا قدر داں تھا اسکی رفاقت محض اسوجہ سے چھوڑ دی کہ
جو معاہدہ وہ اُس کے ایما سے بادشاہی اُمر سے کر کے آئے تھے اُس پر اُس نے
عمل نہیں کیا۔ ایک امیر راجہ جگل کشور جو محمد شاہ کے عہد میں دیوان بنگالہ
تھے اور بڑی ثروت سے بسر کرتے تھے میر صاحب کو گھر سے اُٹھائے گئے۔
اپنے کلام کی صلاح کی خواہش کی میر صاحب نے صلاح کی قابلیت دیکھی
اور اُن کی اکثر تصنیفات پر خط کھینچ دیا۔ مگر راجہ جگل کشور نے کچھ خیال نہ کیا
اور راجہ ناگرمل سے ملاقات کر دی اور میر صاحب کی اُنھوں نے بہت کچھ
قد کی علایت خاں کی رفاقت میں چند روز رہے۔ ایک ذرا اُنھوں نے میر صاحب سے
فرمایش کی کہ گویئے کو بیختے کے اپنے دو تین شعر یاد کر دیجئے گا تو وہ گانے کے

قاعدے سے درست کر کے گالیکا۔ میر صاحب نے عذر کیا خاں صاحب نے
 اصرار کیا مگر میر صاحب خانہ نشین ہو گئے اور اُن کی ملازمت چھوڑ دی عالمگیر
 ثانی بادشاہ نے بار بار بلایا مگر میر صاحب نہیں گئے۔ اس کا ایک سبب تو طبعی
 تھا اور دوسرے یہ کہ اُنھیں اپنی وضع کا بڑا پاس تھا اور جب فقر و فاقہ درپے
 ہو تو وضع داری نبھانے میں نازک مزاجی آہی جاتی ہے۔ اُن کی نازک دماغی
 دوسروں کی ہمدردی کی بھی تحمل نہیں ہو سکتی تھی سیریع اغیظہ اور جلد برہم ہو جانے
 والے تھے اور اپنی اس کمزوری سے خود بھی واقف تھے چنانچہ اپنے بعض
 اشعار میں اسکی طرف اشارہ کیا ہے اور میر حسن لطف وغیرہ نے بھی اسکا ذکر کیا ہے
 حالت تو یہ ہے مجھ کو غموں سے نہیں فراغ

دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
 سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ ۛ
 ہے نام مجلسوں میں میرا میرے دماغ
 از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے شہتار

ولہ

ہر چند تیر بستی کے لوگوں سے ہے نفور
 پر ہائے آدمی ہے وہ خانہ خراب کیا

ولہ

پیدا کہاں ہیں ایسے براگندہ طبع لوگ ۛ
 انوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

ولہ

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

ولہ

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میر جی!
جوں شیشہ میرے منہ نہ لگو میں نشہ میں ہوں

ہر چند کہ اپنی نسبت بعض اشعار میں اور تذکرہ میں حقیر و منکسرانہ الفاظ استعمال کیے ہیں اور اپنے شاگردوں کو اپنا دوست بتایا ہے مگر یہ سب بھی اُسی خلقی تمکنت کی ایک شان اور ایک ادا ہے۔ اُن کی مشہور شنوی اجگر نامہ جس میں کہ اپنے آپ کو ایک اژدہ قرار دیا ہے اور باقی شاعروں کو چھوٹے چھوٹے جانوروں سے تشبیہ دی ہے کوئی فرضی اور خیالی چیز نہ سمجھنا چاہیے بلکہ وہ اُن کے فطری غرور اور بدماغی کی ایک بین مثال سمجھی جاسکتی ہے۔ اپنے معاصر شاہ حاتم کو ان الفاظ میں یاد کرتے ہیں ”مردیست جاہل و متکبر و مقطع وضع..... دریافتہ نمی شود کہ ایں رگ کس بسبب شاعری است یا وضع او ہمین است خوبست مارا بالینا چہ کار..... با من ہم آشنائے بیگانہ است“ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ہر شخص کو اسی ناروا داری اور کم بینی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اپنے دوسرے معاصر اور حریف مزار فیر بٹو کی نسبت اس طرح رطب اللساں ہیں ”غزل و قصیدہ و شنوی و قطعہ و جنس و رباعی ہمہ را خوب می گوید۔ سر آمد شعر ہے ہندی اوست بسیار خوش گوشت...“

چنانچہ ملک الشعرائی رنجیتہ اور شاید "اسی طرح بعض خود اپنے شاگردوں کی بھی بہت کچھ تعریف کرتے ہیں۔ مگر مولانا آزاد نے اس قدرتی کمزوری پر اور گل بوٹے لگائے ہیں فرماتے ہیں "اگر یہ غرور و بددماغی فقط امر کے ساتھ ہوتی تو معیوب نہ تھی افسوس یہ ہے کہ اور دں کے کمال بھی انھیں دکھائی نہ دیتے تھے اور یہ ہر ایسے شخص کے دامن پر نہایت بدنام دھبہ ہے جو کمال کے ساتھ صلاحیت اور نکو کاری کا خلعت پہنے ہو۔ بزرگوں کی تحریری روایتیں اور تقریری حکایتیں ثابت کرتی ہیں کہ خواجہ حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو وہ سر بلا ناگناہ سمجھتے تھے کسی اور کی کیا حقیقت ہے؟ اس سخت اور غیر منصفانہ تنقید سے صاف ظاہر ہے کہ "نکات الشعراء" مولانا آزاد کی نظر سے نہیں گزری بلکہ انھوں نے میر صاحب کے غرور اور بد مزاجی کی اکثر بے بنیاد روایتیں ضعیف اور غیر قابل اعتماد تذکروں سے علی الخصوص تذکرہ قائم سے بغیر جانچے ہوئے لیلیں۔

میر کے کلام میں ایسی درد میرزل ہی سے درد مند دل لیکر آئے تھے اور ان کو دنیا میں سوائے رنج دالم کے کچھ اور نہیں دکھلائی دیتا تھا چنانچہ میر صاحب خود لکھتے ہیں ۵

نہ درد مندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ قدم قدم پہ تھی یاں جاے نالہ و فریاد
پھر والد کی درویشانہ زندگی اور یقین کہ "اے پسر عشق بورز۔ عشق است
کہ دریں کارخانہ متصرف ست۔ اگر عشق غنی بود نظم کل صورت غنی بست۔
بے عشق زندگی و بال ست۔ دل باختر عشق بودن کمال ست عشق بسا در

عشق بسوزو۔ در عالم ہر چہ بہت ظہور عشق است بے عشق نباید بود
 بے عشق نباید زیست۔ چنانچہ جابجا میر صاحب فرماتے ہیں ۷
 عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

۷

یارب کوئی تو واسطہ گشتگی کا ہے اک عشق بھر رہا ہے زمیں آسمان میں
 میر صاحب کی تربیت بھی سید امان اللہ کے زیر نظر ہوئی جو ایک صوفی منش
 بزرگ تھے۔ زمانہ طفولیت ہی سے شان درویشی اور صبر و قناعت پیدا
 ہو گئی تھی۔ سید صاحب کی بدولت میر صاحب کو بہت سے درویشوں اور
 اہل دل سے ملنے کا اتفاق ہوا اور ان کی سوز و گداز بھری باتیں سننے کا موقع
 ملا جو ان کے دل میں اتر گئیں اور جن کا رس ان کی طبیعت اور کلام میں ہمیشہ
 باقی رہا۔ میر صاحب کی زندگی بھی درد سے معمور ہے۔ بچپن سے ہی مصیبت
 کا سامنا تھا۔ دس سال کی عمر میں باپ کا انتقال ہوا۔ تلاش معاش کے
 لیے باہر نکلے۔ بڑے بھائی نے بیرخی اختیار کی۔ دلی گئے وہاں بہت تکلیف
 سے کٹی۔ خان آذر بھی درپے آزار ہو گئے۔ میر صاحب بہت ہی دل شکستہ و
 دل گرفتہ رہتے تھے۔ اس پر بے لوائی و بے بسی۔ اس غم و غصہ میں ایک
 جنون کی سی حالت ہو گئی اور انھیں چاند میں ایک عجیب صورت نظر آنے لگی
 جس سے ان کی وحشت و دیوانگی اور بڑھ گئی۔ اس حالت کا ذکر ذکر میر میں
 موجود ہے اور ان کی مثنوی خواب و خیال میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔
 قلبی داروات کی تصویر نظر آتی ہے اس کے جستہ جستہ اشعار ذیل میں

درج ہیں۔

زمانے نے رکھا مجھے متصل
چلا اکبر آباد سے جس گھڑی
پس از قطع رہ لائے دلی میں بخت
جگر جو گردوں سے خواں ہو گیا
ہوا خط سے مجھ کو ربط تمام
بکھوکھ بلب مست رہنے لگا
نظر آئی اک شکل مہتاب میں
دلی میں جب تک رہے روزی کا مستقل ٹھکانا نہ تھا۔ آج گھر میں اناج تو
کل نان شبینہ کے محتاج۔ کبھی کبھی فاقہ کی نوبت پہنچی۔ اس فقر و سکینتی
میں زندگی بسر کی۔ چنانچہ کلام میں بھی اس حالت کی جھلک موجود ہے۔
نامرادانہ زیست کرتا تھا
بہت سعی کیجئے تو مَر رہتے میر
نہ مل تیراب کے امیروں سے تو
پھر دلی کی بربادی۔ عزیزوں اور خاندانوں کی تباہی۔ آئے دن کے
انقلاب۔ مرہٹوں۔ جاٹوں۔ درانیوں کی دستبرد و غارتگری اپنی آنکھ سے
دیکھیں اور قلم سے لکھیں۔
دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں
دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا
تھاکل تاکے داغ جنھیں تاج و تخت کا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلا در

مولوی عبدالسلام ندوی نے بہارِ بخیراں کی روایت پر لکھا ہے کہ ”میر صاحب تیغِ عشق کے زخمِ غورہ تھے اور اُن کے دل پر ابتدا ہی سے یہ چرکہ لگ چکا تھا۔ عمر بھر اُن کے دل میں یہ نشتر کھٹکتا رہا۔ اگرچہ یہ ایک راز ہے کہ عام طور پر تذکرہ نویسوں کو اسکی خبر نہیں ہے لیکن بعض تذکروں نے اس کو فاش کر دیا ہے۔ چنانچہ بہارِ بخیراں میں ہے کہ ”بہ شہرِ خوش باہری تماشے کہ از غزیرِ نش بود در پردہ عشق طبعِ دہل خاطر داشت آخر عشق او خاصہ مشک پیدا کر دہ می خواست کہ بخیہ بجا رسوے رسوائی سے کند حسن بے پردہ بجلوہ گرمی درآید از رنگ افشائے رازِ وطنِ اقربا باد لے بغل پر در دہ حسرت و حرم و با خاطر ناشادوست و گریبان قطع رشتہ حب وطن ساختہ از اکبر آباد بعد از خانہ بر انداز یہاں بشہر لکھنؤ رسید وہیں جا بعد حسرت جا نکاہ جلا وطنی و حرمِ انضیبی از دیدار یار و دیار جاں بجاں آفریں داد تا بقید رشتہ حیات بود طوق محبت بگردن و سلسلہ دیوانگی بیاد داشت از کلام عاشقانہ و درد انگیزش پیدا است کہ صد آرزو بجاک برودہ“۔ میر صاحب کے بعض اشعار سے بھی در پردہ اسکی تصدیق ہوتی ہے ۷

مرے سلیقہ سے میری بھی محبت میں ؛ تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا
 کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا
 لیکن جامے نزدیک یہ بات پایہ تحقیق کو نہیں پہنچی۔ اشعار سے اس بات کو ثابت کرنا ایک قیاسی دلیل ہے۔

تصانیف کی تصانیف کثرت سے ہیں۔ چونکہ بہت بڑی

عمر پائی تھی۔ لہذا تصنیف و تالیف کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ اُن کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) چھ ضخیم دیوان غزلوں کے

(۲) ایک دیوان فارسی (جو ہنوز شائع نہیں ہوا ہے)

(۳) متعدد مثنویاں

(۴) ایک رسالہ بزبان فارسی موسوم بہ فیض میر جس کے آخر میں

چند لطیفے و حکایات ہیں۔ اُن میں بعض بہت فحش ہیں اُس سے اُس زمانے کا مذاق معلوم ہوتا ہے

(۵) ایک تذکرہ بزبان فارسی شعراے اُردو کا موسوم بہ نکات اشعار

دیوانوں میں نہ صرف غزلیں ہیں بلکہ رباعیاں۔ مستزاد۔ واسوخت۔ مخمس۔

مسدس۔ ترجیع بند۔ ترکیب بند۔ مطلع۔ تضمینیں۔ فردیات۔ غرض کہ جملہ

اقسام سخن موجود ہیں۔ دیوانوں کے صد ہا صفحے ہیں۔ اور غزلیں ہزاروں کی

تعداد میں ہیں۔

میر صاحب نے چند قصیدے بھی لکھے۔ مگر اول تو اُنکی تعداد کم ہے۔

دوسرے بمقابلہ سودا کے قصائد کے وہ زیادہ زوردار نہیں اُن کو دیکھنے

سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کی طبیعت غزل گوئی کے واسطے مخصوص

تھی قصیدہ کی طرف مائل نہ تھی۔ اس وجہ سے کہ وہ امیروں اور رئیسوں کی

خوشامد اور بھٹی سے کوسوں بھاگتے تھے اور نیز یہ کہ ہتغراق خود داری اور

قدرتی کم سخن اُن کو بیجا الفاظی کیطرن کسی طرح مائل نہ ہونے دیتی تھی۔

منحسات بعض مناقب میں ہیں اور بعض شر آشوب کی صورت میں ہیں جنہیں شاہ عالم بادشاہ دہلی کے زمانہ کی شکایات ہیں -

غزلوں کے بعد ان کی مثنویوں کا نمبر ہے جنکی تعداد بھی کثرت سے ہو مثنویاں اکثر عاشقانہ اور بہت مقبول ہیں بعض متفرق مضامین پر ہیں تعداد حسب ذیل ہے -

(۱) مثنوی اجگر نامہ یا اژدر نامہ جس میں میر صاحب کے طبعی غرور اور دیگر معاصرین شعر کی حقارت کا ایک منظر ہے۔ اُس میں اُنھوں نے اپنے آپ کو ایک اژدہ تصور کیا ہے جو چھوٹے چھوٹے کیڑوں سانپ سمجھو وغیرہ کو کھا جاتا ہے اور ان حشرات الارض سے اُس زمانہ کے کم مایہ شعرا مراد ہیں -

(۲) شعلہ عشق (۳) جوش عشق (۴) دریائے عشق (۵) اعجاز عشق (۶) خواب خیال (۷) معاملات عشق (۸) تنبیہ الجہال جس میں کہ فن نظم اور اُس کے مرتبہ کا بیان ہے ان کے علاوہ تین مثنویاں شکار نامہ کی ہیں جن میں نواب آصف الدولہ کے سیر و شکار کا حال ہے۔ کچھ اور چھوٹی چھوٹی نظمیں ایسی چیزوں کے متعلق بھی ہیں جن سے میر صاحب کو بہت اُنس تھا۔ مثلاً کتا۔ بلی۔ بکری وغیرہ - ایک مثنوی مرغبازاں ایک میں موسم ہر سات اور اُس کی تکلیفوں کا خاص کر اپنے گھر کا حال بیان کیا ہے جو بارش کی شدت سے گر گیا تھا۔ اسی طرح ایک میں سفر ہر سات کا ذکر ہے ایک چھوٹی سی مثنوی چھوٹ کیطرت

خطاب کر کے لکھی ہے کچھ مرثیے بھی لکھے ہیں مگر وہ چنداں قابل ذکر نہیں۔
تاریخ گوئی کا اُن کو مطلق شوق نہ تھا۔ ایک ساتی نامہ بھی ہے۔

میر صاحب کی ایجادیں . میر صاحب اُردو و اسوخت کے موجد تسلیم کئے گئے ہیں
اسی طرح اُردو میں مثلث و مرتج (یعنی تین اور چار مصرعوں کی نظمیں) بھی انھیں
کی ایجاد ہیں۔ بعض فارسی کے شعروں کو تضمین کر کے کبھی مثلث کیا ہے اور کبھی
مرتج مثلاً اہلی شیرازی کا شعر ہے۔

امروز یقین شد کہ نہ داری سراہلی بیچارہ ز لطف تو غلط داشت گمانہا
اس پر میر صاحب نے ایک مصرعہ لگا کے اس طرح مطلب پورا کیا۔
کل تک تو فریبندہ ملاقات حق پہلی امروز یقین شد کہ نہ داری سراہلی
بیچارہ ز لطف تو غلط داشت گمانہا

میر صاحب کی شہرت خاص کر اُن کی غزلوں اور ثنویوں پر مبنی ہے غزلوں
میں تو فی الحقیقت اُن کا جواب ہمیں مگر ثنویاں میر حسن کی ثنوی سحر البیان
کو نہیں پہنچتیں پھر بھی اُن کی بیباختگی اور فصیح البیان و سادگی قابل داد ہے۔
دیوان فارسی بقول مصحفی ایک سال میں تیار ہوا تھا جب کہ رنجیتہ کہنا مو تو دن
کر دیا تھا۔

تذکرہ نکات اشعار . یہ تذکرہ تقریباً ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۲ء عیسوی میں لکھا گیا
یہ حسب دعویٰ مصنف شعرائے اُردو کا سب سے پہلا تذکرہ ہے اور واقعی نہایت
دکھپ اور مفید ہے افسوس ہے اس میں حالات زیادہ تفصیل سے نہیں دیے گئے
مگر پھر بھی جو باتیں معاصر شعرا کے متعلق آئیں ملتی ہیں وہ بہت کچھ قابل قدر ہیں

جن شعرا کا ذکر ہے اُن کا کلام بھی بطور نمونہ کے دیا گیا ہے۔

میر صاحب کی خدمات
زبان اور شاعری کے ساتھ

میر صاحب نے اکثر فارسی ترکیبیں یا اُن کے ترجمہ کو
اُردو میں داخل کر کے اُس کو رنجیتہ بنایا۔ آزاد نے
آب حیات میں انکی بہت سی مثالیں دی ہیں مثلاً

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا	پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا
دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہر بیش	ایک عالم کے سسر بلا لا یا
اے تو کہیاں سے عاقبت کار جا ئیگا	یہ قافلہ رہے گا نہ زہار جا ئیگا

ترجمہ کی مثال -

گل کو محبوب ہم قیاس کیا	فرق نکلا بہت جو باس کیا
-------------------------	-------------------------

باس کرنا یا بو کرنا فارسی 'بو کردن' کا ترجمہ ہے بمعنی سونگھنا۔
ان میں سے اکثر چیزیں پسند عام ہو کر منظور ہوئیں بہت سی ناپسند ٹھہریں
جو رفتہ رفتہ متروک ہو گئیں۔ میر صاحب کے خیالات رنجیتہ کے متعلق جو
نکات شعرا کے آخر میں دیئے ہوئے ہیں، خود انہی کی زبان سے سننے کے
لائق ہیں فرماتے ہیں :-

بدانکہ رنجیتہ بر چندیں قسم است - از انجملہ انچہ معلوم فقیر ست نوشتہ می آید
اول آنکہ یک مصرعش فارسی و یک ہندی چنانچہ قطعہ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ
کہ نوشتہ شد۔ دوم آنکہ نصف مصرعش ہندی و نصف فارسی چنانچہ شعر

لے	زر گر پسے چو ماہ بارہ	کچھ گھڑے سنوارے پیکارا
	نقد دل من گرفت و شکست	پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

مرزا معز کہ نوشتہ آمد۔ سوم آنکہ حرف و فعل فارسی بجا رمی برند و ایں قبیح است
 اچام آنکہ ترکیبات فارسی سے آزد اکثر ترکیب کہ مناسب زبان ریختہ می افتد
 آن جائز است۔ و ایں را غیر شاعر نمی داند و ترکیبے کہ نامانوس ریختہ می باشد
 ایں معیوب است و دانستن ایں نیز موقوف سلیقہ شاعری است و مختار فقیر ہم
 ہمین است اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوئے ریختہ بود مصداقہ ندارد بدینچہ اہام است
 کہ در شاعران سلف دریں فن رواج داشت اکنون طبعها مصروف ایں صنعت کم
 است مگر بسیار شبستگی بستہ بشود۔ معنی اہام ایں است کہ لفظے کہ براو بنائے بیت بود
 اں دو معنی داشته باشد یکی قریب و یکی بعید و بعید منظور شاعر باشد و قریب
 متروک او ششم انداز است کہ اختیار کردہ ایم و اں محیط ہمہ صنعتها است
 تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفائی گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادبندی، خیال
 وغیرہ۔ ایں ہمہ در ضمن ہمین است و فقیر ہم از ہمیں و تیرہ مخطوطہ ظم ہر کہ را دریں
 فن طرز خاصی است ایں معنی رامی فہم۔ باعوام کار ندارم۔“

بہرچہ شاعر کے عام طور پر اردو شاعری اردو تغزل کی مراد ہے اور
 میر صاحب غزل گوئی میں مسلم الثبوت استاد مانے گئے ہیں۔ لہذا یہ نتیجہ نکلتا ہے
 کہ میر صاحب زبان اردو کے سب سے بڑے شاعر اور مسلم الثبوت استاد تھے۔
 میر صاحب کا پایہ شنوی نویسی میں بھی بہت بلند ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ
 غزل گوئی میں اُن کا جواب نہیں اور اُس ملکیت میں وہ متفرد اور تنہا حکمران
 ہیں۔ ان کے اشعار صاف۔ سادہ۔ فصیح اور تیر و نشتہ کا کام دینے والے دو اثر

۱۔ از لعل سیا و تو بل۔ دوم پری ہے۔ بد درخائے آئینہ۔۔۔ گستاخوم پری ہے ۱۲

سے مملو ہوتے ہیں۔ اُن میں دلکشی اور زور کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اظہار جذبات
چستی بندش اور نرمی میں وہ اپنی آپ نظیر ہیں۔ ان کے اکثر اشعار میں وہ ایک
خاص کیفیت ہے جو سحر یا طلسم سے تعبیر کی جاسکتی ہے اور جو تمام زبانوں کی حقیقی
اور سچی شاعری کا طغراے امتیاز ہے۔ میر صاحب کے بہتر نثر مشہور ہیں۔ مگر بیچ
پوچھیے تو اُن کے صد ہا ایسے شعر نکلیں گے جنہیں حقیقی شاعری کے اوصاف بدرجہ
احسن موجود ہیں جب کوئی پھر لکھتا ہوا شعر سُنا جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ
انہیں بہتر نثر میں سے ہے۔ زبان شستہ کلام صاف بیان ایسا پاکیزہ
اور دل آویز جیسے باتیں کرتے ہیں۔ وہ اردو کے شیخ سعدی ہیں ان کا کلام کسیر
شاعری ہے۔ علی الخصوص چھوٹی بھروں کے تو وہ بادشاہ ہیں اور ہمارے
نزدیک تو بڑی بھروں میں بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اُن کے کلام میں
جو حزن و ملال حسرت و مایوسی سے مملو ہے وہی اُن کی شاعری کی جان ہے
یہی نا اُمیدی اور یاس اُن کی غزلوں کو زور دار اور مؤثر بناتی ہے میر صاحب
شاعری اور زبانِ ندانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ عام طور پر لوگ اُن کو خدے سخن
کہتے ہیں۔ غالب و ناسخ اور نیز تمام مشاہیر جو اُن کے بعد ہوئے اُن کی عظمت
اور اُستادی کے معترف تھے اور یہ بات خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ وہ اپنے
ہی زمانے میں بہت بڑے شاعر مانے جاتے تھے۔ اُن کے معاصر اور نیز بعد کے
تمام تذکرہ نویسوں نے اُن کی سچید تعریف کی ہے۔ اور نہایت رنگین عبارت
اور سبائغہ آمیز کلمات اُن کی نسبت استعمال کیے ہیں۔ شاعر اور نثر دان دونوں
اُن کی تعریف کے معاملہ میں باہم مسابقت کرتے معلوم ہوتے ہیں اور آرٹ

اور نیمچہ دونوں میں اُن کے کمال کی مع سرائی کے الفاظ و اصطلاحات ڈھونڈتے ہیں مثلاً میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ سرآمد شعرائے ہند اور اپنے وقت کے فصیح الفصحا اور بے نظیر و بے عدیل شاعر تھے۔ اسی طرح مرزا علی لطف تذکرہ گلشن ہند میں یوں رقمطراز ہیں کہ ”جو شخص کہ نظارہ گاہ سخن میں حتم خوردہ ہیں رکھتا ہے اور چاشنی خرد سے امتیاز ذائقہ تلخ و شیرین رکھتا ہے تو وہ اس بات کو جانتا ہے اور اس رمز کو پہچانتا ہے کہ میر شیریں مقال میں اور رنجیتہ گویاں سابق و حال میں نسبت خوردہ و ماہ ہے اور فرق سپید و سیاہ ہے“ صاحب طبقات اشعار لکھتے ہیں ”مجموعہ قابلیت ہنر صاحب طبع خوش فکر سرآمد مشہوران عصر محاورہ داں و متین متلاشی مضامین و نگین تحسب الفاظ چرب و شیریں۔ در میدان غزل پرداز می گوے فصاحت از معاصران سے برد و ہر چند سادہ گوشت اما در سادہ گوئی پرکا رہیا دارد“ حقیقت یہ ہے کہ میر و مرزا دونوں اپنے مابعد کے شعرا کے واسطے ایک صحیح نمونہ اور سرشتیہ فیض تھے۔ اُن کے کلام کی حلاوت دل آویزی اُن کے اشعار کا درد و اثر اور رنگینی آج تک مشہور ہیں بلکہ جب تک زبان اردو قائم ہے مشہور رہیں گی۔

میر صاحب کی شہرت اُن کی غزلوں اور مثنویوں پر
 سیر اور سودا کا مقابلہ
 بنی ہے اور سودا قصیدہ اور ہجو کے استاد مانے جاتے ہیں۔ خود سودا کے زمانے میں ہی خیال اکثر ارباب فن کا تھا۔ چنانچہ حکیم قدرت اللہ خاں قائم اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں ”زعم بعضے آنکہ سرآمد شعرائے فصاحت مرزا محمد رفیع تھو

در غزل گوئی ہوے (میر تقی) نرسیدہ اما حق آنست کہ ہر گلے راز نگ و ہوے
دیگر ست مزار دریا کیست بیکراں و میر نہرست عظیم الشان۔ در معلومات قواعد
میرا بر میرزا برترست و در قوت شاعری مزارا بر میر سروری“ اسی طرح
ایک مشہور صاحب دل خواجہ باسط نے جو علاوہ کمالات عرفان و تصوف
کے فن نقد میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے اس مشکل اور نازک مسئلہ یعنی میر
و مرزا کی شاعری کے فرق کو نہایت مختصر الفاظ میں منسلک کر دیا اور فرمایا کہ
دونوں صاحب کمال ہیں۔ مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام آہ ہے
اور مرزا کا کلام واہ ہے۔ اسی فرق کو ایک نہایت لطیف پیرایہ میں امیرنیاں
نے بھی اپنے ایک شعر میں ظاہر کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ دونوں بڑے
شاعر اور اپنے اپنے طرز کے استاد تھے۔ ہماری ناچیز رائے میں ان دونوں
بزرگواروں کے طرز کلام کا فرق ان کے مزاج اور طبیعت کے فرق پر
بہت کچھ مبنی ہے۔ میر صاحب قدرتا حزیں اور غمگین واقع ہوئے تھے ان کی
زندگی حزن و یاس اور مصائب و ادبار کا نمونہ تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ خود داری
اور عزت کا ان کو بید احساس تھا جس سے وہ مجبور ہو گئے تھے کہ عزت
اور تلخکامی کی زندگی بسر کریں۔ اسی وجہ سے عمر بھر تلخ بے حیات پیتے رہے
بزم طرب اور محفل سرور کے وہ فطرتاً ہی نہ تھے۔ خوشی اور ہشاشمبہاشی
کا حصہ قسام ازل نے ان کو دیا ہی نہ تھا۔ برعکس اس کے سودا نہایت
شگفتہ مزاج اور رنگیں طبع واقع ہوئے تھے وارستگی اور آزادی ان کی طبیعت
کا اصلی جوہر تھا۔ خوشی و خرمی زندہ دلی اور ظرافت سے اُبلے پڑتے تھے

خوشی کے مجموعوں اور مہنسی مذاق کے جلسوں کے روح رواں تھے، جہاں اُن کی قابلیت خداداد کے جوہر کھلتے تھے۔ زندگی نہایت فارغ البالی اور دکائی سے بسر کرتے تھے۔ نظر بریں ان دونوں کی شاعری اُن کے خیالات اور اُن کے مزاج اور دنیا کے ساتھ اُن کے برتاؤ کا بہترین آئینہ کہی جاسکتی ہے۔ اسی طرح اُن دونوں کے اپنی اپنی شاعری کے واسطے منتخب کئے ہوئے الفاظ بھی اُن کے حسب مزاج اور موافق حال ہیں۔ ظاہر ہے کہ درد و اثر کے لیے الفاظ نہایت نرم اور صاف و سادہ اور بندش نہایت سلیس اور بے تکلف ہونی چاہیے اور یہی طرزِ غزل کے واسطے زیادہ موزوں ہے۔ علی الخصوص چھوٹی چھوٹی بحروں کے لئے جس میں کہ میر صاحب کی شاعری اپنے عروجِ کمال پر دکھائی دیتی ہے۔ برعکس اس کے قصیدہ کے لئے شاندار الفاظ، علومِ صناین، نادر تشبیہوں اور استعاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ قصیدہ کہنا ایک پُر مردہ اور دل گرفتہ آدمی کا کام نہیں۔ عاشقانہ خیالات مثلاً مصائب، ہجر و فراق وغیرہ کے دردناک حالات جن بے تکلف اور سیدھے سادے الفاظ سے ظاہر ہو سکتے ہیں وہ قصیدہ کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہیں۔ میر درد و اثر اور سادگی کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ ان کے وہ اشعار جو بہتر نثر کے فرضی نام سے مشہور ہیں سب خود انھیں کے سچے اور دلی جذبات کا پرتو ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تخیل سے انہیں رنگ آمیزی مطلق نہیں کی ہے۔

میر کی زندگی ایک دردِ دواہم کی زندگی ہے اور انگریزی شاعر شیلی کی

یہ سطور اُن کے حسب حال ہیں ”حراما نصیب لوگ غلطی سے گموارہ شعر میں
ڈال دیے جاتے ہیں جو مصیبت تو خود جھیلے ہیں مگر وہی مصیبت نظم میں
دوسروں کو سناتے ہیں۔“

اسی وجہ سے میر کے بہترین اور سب سے زیادہ مؤثر شعر وہی ہیں جنہیں
درد و الم کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ سودا کے کلام میں میر کا سادہ
نہیں۔ میر کے اشعار غمگین اور چوٹیلے دلوں پر خاص اثر کرتے ہیں۔ اُن کا
قصہ غم کا قصہ ہے۔ وہ زندگی کا وہ رخ جو یاس اور غم سے بھرا ہوا ہے
نہایت آب و تاب اور سچائی سے پیش کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے سودا
اُس کا دوسرا رخ دکھلاتے ہیں جو امید اور خوشی سے ملبوس ہے۔ سودا کے
اشعار پڑھنے والے کے لئے سامان طرب و نشاط مہیا کرتے ہیں۔ اُن کی
طبیعت کسی محدود دائرے میں مقید رہنا پسند نہیں کرتی۔ وہ جذبات کے
سنگ عالم سے نکل جانا چاہتے ہیں اور ایک وسیع جولا نگاہ اپنے اظہار
خیال کے لئے تلاش کر لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے اُنھوں نے نئی نئی راہیں
نکالیں اور اُن کے اشعار ایک ایسے گلدستہ کا مزادیتے ہیں جو انواع و اقسام
کے مختلف رنگ و بو کے پھولوں سے بسا ہوتا ہے۔ اُنھوں نے انقباضی
جذبات کو چھوڑ کر انبساطی جذبات کو بہت کچھ وسعت دی ہے۔ میر کی
دنیا تاریکی اور غم سے بھری ہوئی ہے جس میں کہ امید کی جھلک تک نظر نہیں
آتی۔ اُن کے تمام اشعار اس مقولہ کے تحت میں ہیں ”جو کوئی اس عکمدہ
میں قدم رکھے اُمید کو پیچھے چھوڑ آئے۔“ میر کی مہنسی اور مذاق بناوٹی اور انکی

طعن و تشنیع مصنوعی ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ میر نے ہجو اور قصیدہ نہیں لکھا
 فی الحقیقت ان دونوں صنفوں میں انھوں نے طبع آزمائی کی مگر چونکہ طبیعت
 ان اصناف کے واسطے موزوں نہیں پائی تھی لہذا ناما کام رہے۔ یہ بھی کہنا
 صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اپنے مزاج کی خودداری اور دولت و اقتدار کی
 بے پروائی کیوجہ سے ان اصناف سخن میں سرسبز نہ ہوئے۔ انھوں نے اگر نامہ
 ضرور لکھا مگر وہ سودا کی ہجوؤں کا عشر عشر بھی نہیں۔ اسی طرح اُن کے قصائد
 جو اب آصف الدولہ کی تعریف میں ہیں سودا کے قصائد کے سامنے ہیج ہیں۔
 دونوں بزرگوار میر اور سودا حقیقت اور اصلیت بیان کرنے کے بادشاہ
 ہیں۔ دونوں کا بلِ مضمون ہیں جو خیالی تصاویر نظم میں ایسی خوبصورتی اور جزئیات
 کی تفصیل کے ساتھ کھینچتے ہیں کہ اُن کے لفظی مرتعے ہمارے دل کی آنکھوں کے
 سامنے جیتی جاگتی تصویریں معلوم ہوتے ہیں۔ یہ مرقع نگاری داخلی یا خارجی،
 یعنی جذبات انسانی یا مناظر قدرت، دونوں کی ہو سکتی ہے۔ پس جہاں تک
 کہ جذبات انسانی اور علی الخصوص درد و غم کے جذبات کا تعلق ہے اُن کے
 اعلام و اظہار میں میر صاحب متفرد ہیں۔ مگر ان کے سوا دیگر جذبات پر سودا کو
 کمال حاصل ہے۔ سودا کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ جن مضامین کی وہ اپنے
 اشعار میں تصویر کھینچنا چاہتے ہیں اُن کے مالہ اور مال علیہ کا اُن کو بدرجہ کمال
 علم ہوتا ہے۔ میر صاحب اپنی افتاد و طبیعت اپنی نازک عادات اور اپنے استغراق
 خودی کیوجہ سے مجبوراً فطرت انسانی کا مطالعہ اس وسیع النظری سے ہمیں کر سکتے
 اُن کی محدود نظر اسی استغراق اور خود بینی کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنے رنگ میں

ڈوبے ہوئے تھے۔ اُن کو اپنے کام میں اس قدر انہماک اور توغل تھا کہ سات برس تک اپنے کمرہ کے پائیس باغ کو نظر اٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہ ملی۔ اس انہماک سے اتنا ضرور ہوا کہ وہ اپنے خاص کام میں لیتائے زمانہ ہو گئے۔ وہ متوجع جو سودا کے کلام کی جان ہے میر صاحب کے یہاں مفقود ہے سودا کی تصاویر نہایت رنگین اور خوشنما ہوتی ہیں۔ بخلاف میر صاحب کے جنکی دنیا مایوسیوں سے تیرہ و تار۔ جسکے پھول پیر مردہ و افسردہ جیسی زمین تکلیفوں اور مصیبتوں کی قیام گاہ اور جس کا آسمان اکام و مصائب کی جائے پناہ۔ ایسے عالم میں مفر کا بس یہی طریقہ ہوتا ہے کہ یا سکوت و محویت اختیار کی جائے یا نالہ و زاری سے دل کی بھڑاس نکالی جائے یا عالم خواب کی سیر کی جائے۔ مگر وہ خواب بھی قوت متخیلہ ہی کے پیدا کئے ہوئے خواب پریشاں ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے سودا کی دنیا جیتی جاگتی دنیا ہے جس میں بجائے تاریکی کے امید کی روشنی جلوہ گر۔ جس کے باغ سرسبز و شاداب۔ جس میں باد صبا خوبصورت پھولوں اور نازک نازک پتیوں کے ساتھ ہر وقت لکھیلیاں کرتی پھرتی ہے۔

تشبیہیں اور استعارے ہر شاعری کے جزو اعظم مگر خصوصیت سے مشرقی شاعری کی تو وہ جان ہیں۔ اگر اُستادی کے ساتھ برتے جائیں تو شعر کے حسن میں وہ چار چاند لگا دیتے ہیں۔ سودا وہ اُستاد ہے جو اُن کے صحیح استعمال پر قادر ہے۔ انکی یہاں دھچپ تشبیہیں اور نادر استعارے میر کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں۔ وہ اُن مختلف علوم و فنون سے بھی

جن کو وہ شعر میں استعمال کرتا ہے بہ نسبت میر کے زیادہ واقف ہے۔
یہ بالکل صحیح ہے کہ سودا کی اکثر غزلوں میں قصیدہ کی شان پیدا ہو جاتی
ہے۔ اسکی کم و بیش یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ شاعر کا زبردست تخیل بعض وقت
اُس کو ایسے مضامین اور الفاظ بچھاتا ہے جو غزلیت سے میل نہیں کھاتے
وہ اپنی بلند پروازی اور تخیل کی تیزی کو روک نہیں سکتا۔ میر صاحب کے
یہاں ایسے عیوب نہیں ہیں۔ سودا کے اس قسم کے اشعار اُن قواعد کے ضرور
خلاف ہیں جو ترتیب غزل کے واسطے مقرر ہو گئے ہیں مگر اس میں بھی کوئی
شک نہیں کہ اگر اسی قسم کے شعر علیحدہ علیحدہ دیکھے اور جانچے جائیں تو
اُن کی عمدگی اور کمال میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے۔ یہ بات بھی ضرور
یاد رکھنا چاہیے کہ ترتیب غزل کے قواعد سے استغنا اور بے پروائی متاخرین
شعراے فارسی کی متبع میں ہے جن کے قدم بہ قدم اُردو شعرا چلنا چاہتے ہیں
نظم فارسی کی آخری منزل ارتقا میں غزل کا محدود دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا
اور اُس میں بہت سی چیزیں مثلاً فلسفہ، مذہب، اخلاق، تصوف اور دیگر علوم
و فنون وغیرہ سب شامل کر لئے گئے تھے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ عاشقانہ رنگ
یا عشق مرتب اور نظم ہو کر سائنس کے درجہ پر پہنچ گیا تھا۔ اُردو شاعری
جو فارسی کی متبع تھی اس انقلاب سے اُس نے بھی بہت کچھ فائدہ اُٹھایا۔
البتہ یہ ضرور ہوا کہ آخر الذکر مضامین سے بہرہ اندوزی بہ نسبت دل کے
دماغ زیادہ کرتا ہے یعنی جس قدر ان مضامین کی کثرت ہوتی ہے اتنی ہی
درد و اثر کی کمی ہو جاتی ہے۔ قصیدہ کی شان اور غزل کے رنگ میں زمین

و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور یہ فرق ہمارے زمانہ کے نو آموز شعرا کے کلام میں جو سودا اور غالب وغیرہ ایسے استادوں کی تقلید کرنا چاہتے ہیں بخوبی نمایاں ہے۔

سودا اور تیسرے دونوں موسیقیت الفاظ کے استاد ہیں ان کے شعر سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ بندش نہایت چست۔ اور زوائد سے پاک ہوتے ہیں نشست الفاظ پر سودا کو زیادہ توجہ تھی۔ وہ ہر شعر کو اپنی جگہ پر مکمل بنانا چاہتے ہیں جو خود ایک بہت بڑا فن ہے۔ شاذ و نادر معنی میں گنجلک بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ دونوں استاد دور از کار تعلیمات اور تشبیہات سے بچتے ہیں۔ اگرچہ سودا کے یہاں کبھی کبھی اس قسم کی غلطی ہو جاتی ہے۔ دونوں استاد ان فن کے کلام کا مقابلہ ایک کار آمد اور قیمتی چیز ہے اس وجہ سے کہ دونوں ہم عصر تھے اور متحدہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہم طرح غزلیں کہی جاتی تھیں جن کا مقابلہ اس لئے بہت دلچسپ ہے کہ اُس سے دونوں کے مختلف مزاج اور طبیعت اور نیز انداز بیان کے فرق کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ دونوں کے کلام میں اُس عہد کے بعض نقائص بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ دونوں کے یہاں کبھی کبھی متبدل اور فحش الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ بعض اوقات مضمون شعر میں فحش ہوتا ہے کہیں اختلاف تذکرہ و تانیث اور شتر گریہ ہے اکثر اشعار معمولی بلکہ پھیکے اور بے مزہ بھی ہیں۔ میر صاحب کہیں کہیں ایہام بھی برتتے ہیں۔ امر و پرستی جو اُس زمانہ کی شاعری کا ایک قبیح موضوع ہے۔ دونوں کے کلام میں

جا بجا پائی جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ وسعت نظر، تنوع خیالات، جزئیات کے بیان کی قدرت، دنیاوی معاملات کی واقفیت اور سب سے بڑھ کے یہ کہ مذاق اور ظرافت میں سودا کو میر پر برتری ہے۔ سادگی الفاظ، سلاست زبان، عاشقانہ رنگ، درد و اثر، فصاحت و بلاغت، اور تصوف میں میر صاحب کو سودا پر فضیلت ہے۔ کسی کا قول ہے اور سچ کہا ہے کہ دونوں کا کلام بیش بہا جواہر ہیں۔ میر صاحب کے یہاں صرف ہیرے ہیں۔ سودا کے یہاں ہیروں کے علاوہ موتی، زرد، اور یا قوت بھی بکثرت پائے جاتے ہیں سچی کسوٹی پر کھنے والے کا مزاج اور مذاق ہے۔ ۱۷

اس عہد کے دیگر شعرا اس عہد میں ان دو بزرگواروں کے علاوہ اور بھی بہتے شاعر گزرے ہیں مگر چونکہ وہ کثرت سے ہیں اور ان کے کلام میں کوئی خصوصیت نہیں لہذا یہاں ان کا ذکر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ناظرین کو اگر ان کے کلام یا حال کے دریافت کرنے کا اشتیاق ہو تو اس عہد کے یا بعد کے تذکرے ملاحظہ کریں۔

۱۷ میر و مزرا کے کلام کے مقابلہ کے لئے دیکھو بقا کے اشعار صفحہ ۲۵۴

۱۸ اس عہد کے بعض شعراء کا حال مختصراً باب ۷ کے آخر میں بیان کیا گیا ہے دیکھو

باب

اساتذہ دہلی

طبقہ متاخرین

انشا اور مصحفی کا زمانہ

طبقات کی ترتیب
اس کی ترقیاں

شعر کے طبقات کی ترتیب کوئی فرضی چیز نہیں جیسا کہ بادی النظر میں وہ معلوم ہوتی ہے۔ گو یہ سچ ہے کہ اکثر شعرا ایک دور کے ماقبل کے دور کے بعض شعرا کے معاصر ہیں مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو یہ کہ مابعد کے دور کے شاعر دور ماقبل میں نوجوان اور نواآموز تھے اور اُس وقت انھوں نے کوئی شہرت نہیں حاصل کی تھی اور دور ماقبل کے شاعر کہن سال، مشاق، اور شہور ہو چکے تھے، اسکے علاوہ زبان کا فرق بھی بہت کچھ قابل لحاظ ہے۔ اس دور میں بمقابلہ دور ماقبل کے زبان اور نیز بندش کے اعتبار سے شعر میں بہت کچھ ترقی ہوئی۔ بہت سے پرانے الفاظ اور ترکیبیں متروک ہو گئیں اور ان کی جگہ نئے الفاظ اور جدید ترکیبوں نے لی۔ اس معاملہ میں زبان اردو انشا کی بہت احسان مند ہے جنھوں نے اسکی ترقی اور توسیع کے لیے بہت سے نئے نئے تجارب اختیار کیے۔ مصحفی البتہ قدما کے پیرو تھے جنھوں نے نظم کی قیام روایات کو جاری رکھا۔ جرأت بھی غزل میں میر کے پیرو تھے۔

شاعری بابت وابستہ ہو گئی | اس دور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے نظم اُردو کو دوبار کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ دورِ ماقبل کے شعرا کو اپنے سرپرستوں سے انعام و اکرام اور وظیفے اور تنخواہیں پاتے تھے مگر اپنی آزادی اور خودداری کو ہمیشہ قائم رکھتے رہے وہ اپنی حیثیت ایک ملازم کی کبھی نہیں سمجھتے تھے۔ اس دور میں یہ خرابی ہوئی کہ گو شعرا کی قدردانی اور سرپرستی بڑھ گئی مگر ان کی خودداری اور عزت اُردو کم ہو گئی۔ شاعری کا اب صرف یہ کام رہ گیا کہ اُس سے امیر و رئیس خوش کیے جائیں شاعر لوگ اپنے سرپرستوں کے چشمِ دابر و ہر وقت دیکھتے تھے اور چونکہ ان کا دل خوش کرنا مقصود تھا لہذا اشعار بھی انھیں کے مزاج اور مذاق کے موافق کہے جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ اس دور کے شعرا انتقال اور سحرے پہلے تھے اور شاعر بعد کو۔ اب شاعری حصولِ زر کا ایک کامیاب ذریعہ ہو گئی تھی اور شاعر اُمرا اور رؤسا کے درباروں میں پہنچنا بلکہ اپنے مالکوں کے مزاج میں درخورِ حاصل کرنا بس یہی اپنا فخر سمجھتے تھے اس کا ایک بُرا نتیجہ یہ ہوا کہ خود آپس ہی میں سخت رقابت اور بد مزگی شعرا میں پیدا ہو گئی۔ اس کے قبل بھی اس قسم کی بد مزگیاں ظہور میں آئی تھیں مگر وہ فن سے متعلق اور حدودِ شائستگی کے اندر ہوتی تھیں۔ اب چونکہ شاعری امیر رسی کا ایک ذریعہ ہو گئی تھی لہذا شاعر ایک دوسرے سے سخت رقابت اور عداوت برتتے تھے۔ اور ان کے آپس کے شاعرانہ مقابلے اب تہذیب و شائستگی کی حد سے گزر کے گالی گلوچ اور لپٹا ڈگی کے درجہ تک پہنچ جاتے تھے۔ چنانچہ انشا اور صحفی کے ہنگامے اس زمانہ کی تاریخ شاعری پر ایک نہایت بدنام دھبہ ہیں۔

اُس بستی کے خراب تاج شاعری کی اس درباری وابستگی کا ایک خراب نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی متانت اور پاکیزگی اور علو خیال میں بہت فرق آگیا۔ درباری اثر سے اُسکی آئندہ ترقی کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ خیالات میں نفاست اور پاکیزگی کم ہو گئی، شعر کی روحیت اور بلند پروازی مفقود ہو گئی۔ معشوق سے اب تک عموماً معشوق حقیقی مراد ہوتا تھا اب بجائے اسکے کوئی لونڈا یا زلیخا، جنکی ایسے عیش پرست درباروں میں لگی نہ تھی سمجھا جانے لگا۔ شہوانی جذبات بے تکلفی کے ساتھ بکثرت نظم ہونے لگے کیونکہ عیاش امرا اور اُن کے مصاحبین اسی قسم کے اشعار سے خوش ہوتے تھے اور اسی قسم کے فواحش پر انعام و اکرام دیتے تھے۔ دلی کی یہ حالت نہ تھی یہاں کے شعرا میں، گو کہ وظائف اور تنخواہیں وہ بھی پاتے تھے، متانت اور سنجیدگی اور آزادی مزاج اب تک باقی تھی۔ بلکہ سیح پوچھیے تو یہاں عموماً شاعری تصوف و عرفان کی گود میں پلی شعر گوئی ایک مقدس اور مغز مشغلہ سمجھی جاتی تھی۔ اہل اللہ کے دائروں اور خانقاہوں میں اُسکی نشوونما ہوئی۔ شاہ گلشن، خواجہ میر درد، مرزا مظہر جانجانا، یہ سب مشہور اہل دل بزرگ گزرے ہیں جنہوں نے شاعری کو بہت کچھ تحریک و ترقی دی۔ لکھنؤ میں برعکس اسکے شاعری کے سر پر سے روحانیت اور تصوف کا سایہ اُٹھ گیا اور اب وہ دربار سے متعلق ہو گئی۔ اب شاعر ولی ہونے کی نہیں بلکہ دربار سے ہونے کی تمنا کرتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ کچھ ایسے لوگ جو دلی چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے تھے کچھ دنوں یہاں کی ہوا اور خراب صحبت سے بچتے رہے مگر رفتہ رفتہ طمع اور شہرت پسندی اور سب سے زیادہ اُس زمانہ کے بڑے ہوئے مذاق نے اُن کو اپنی راہ پر آخر لگا ہی لیا۔

ریختی ایک جدید صنف شاعری، یعنی ریختی، جسکو اس انحطاط مذاق کا بدترین نمونہ سمجھنا چاہیے اسی دور میں وجود میں آئی۔ اس کے موجد سعادت یا رضاں ازبکین تھے۔ جنہوں نے اپنے زمانہ کے مدرسہ تعیش میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے تمام ملائج عیاشی و آوارگی کو یکے بعد دیگرے بہ تمام و کمال طے کیا تھا۔ اُن کا کلام عورتوں کی زبان میں ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ عیاش مزاج لوگوں کو بہت دلچسپ معلوم ہوتا تھا مگر حقیقت میں سوائے فحش اور ابتذال کے اُس میں اور کچھ نہ تھا۔ انشائے بھی بہت کچھ اُس میں حصہ لیا۔

اس عہد میں فن شعر گوئی کو بہت قوت حاصل ہوئی اور کثرت مزا و ملت سے شعرانے من حیث الفن بڑی ترقی کی۔ اگرچہ شیریں کلامی اور بلبل خیالی شعر میں کم ہو گئی مگر تکمیل فن نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ اظہار قابلیت کی غرض سے لوگ مشکل مشکل بحروں اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرتے تھے اور پھر دلیک نہیں بلکہ صدہا اسی قسم کی غزلیں کہہ ڈالتے تھے جو اُن کے کمال کا نمونہ تو ضرور ہیں مگر وہ قدما کا درد و اثر اور صحیح جذبات کا اُن میں نام نہیں۔

اس عہد کے شعرانے شعر کی ظاہری درستی کی طرف جو خاص توجہ کی تھی وہی آئندہ چل کر ناسخ و غیرہ کے زمانہ میں ایک طرز خاص بن گئی۔

فنی مباحث کو چھوڑ کر شعرانے شاعری کو حصول زراور کسب معاش کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا اور وہ مباحث اب درباری نزاعوں تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ میاں مصحفی جو صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ کے استاد تھے انشائے اُن کو اس حلیل القدر درجہ سے ہٹانا چاہا اور یہ امر ایک عظیم الشان جنگ کا

باعث ہوا جس کا تذکروں میں تفصیل ذکر ہے۔ اُنکی ابتدا تو معمولی طریقہ سے ہوئی تھی مگر آخر کو وہ پھکڑ مچا کہ خدا کی پناہ! اُن کے مرنے پر اس تھکا فطیحتی کا دور سے تماشہ دیکھتے تھے اور اُن کے مہملیات کی داد دیکر جانبین کی آتش حسد و نفاق کو اور بھڑکاتے تھے۔ بالآخر شاعروں نے قلم ہاتھ سے رکھ کر لاٹھی پونگے اٹھالیے اور بے تکلف ایک دوسرے سے دست و گریباں بلکہ ایک دوسرے کی جان اور عزت و آبرو کے درپے ہو گئے۔ سچ پوچھیے تو اس قسم کی لغو اور بیودہ نظموں سے شاعری کی تہذیب و متانت میں فرق آگیا اور مصحفی اور انشا کی اس قسم کی نظمیں اب اُس زمانہ کے پر شور مذاق اور چھکڑ کا ایک نمونہ لگتی ہیں جن کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے مگر رنج بھی ضرور ہوتا ہے۔

ہزل گویان اردو اس موقع پر چند ہزل گویان اردو کا بھی کچھ ذکر کر دینا ضروری ہے۔ حسب ذیل نام قابل ذکر ہیں۔ میراٹل نارولی۔ میر جعفر زطل۔ زانی۔ چرکین۔ فنس۔ میر غلام حسین برہان پوری شاگرد زانی۔ یہ منشی کچھی نرائن شفیق اور نگ آبادی کے ہم عصر تھے اور شفیق نے فنس کا ذکر اپنے تذکرہ چمنستان شعرا میں کیا ہے۔

سید انشاء اللہ خان متخلص بہ انشا خلف حکیم میر انشا اللہ خان ان کے بزرگ نجف سے آئے تھے اور دہلی میں بس گئے تھے۔ رفتہ رفتہ امرے شاہی میں داخل ہوئے۔ انشا کے والد شاہی طبیب تھے اور کچھ شعر بھی کہتے تھے اور مصداق تخلص کرتے تھے۔ زوال سلطنت کے زمانہ میں وہ مرشد آباد گئے جو نوابان بنگالہ کا دار الحکومت تھا اور یہیں سید انشا کی

انشاء متوفی ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۸۲۰ء عیسوی

ولادت ہوئی۔ ابتدا سے عمر میں علوم رسمیا اپنے والد ہی سے حاصل کیے شعر کہنے کا شوق ان کو بچپن سے تھا۔ کبھی کبھی والد سے اصلاح لیتے تھے۔ مگر زیادہ تر اپنی طبیعت خدا داد اور فطری ذہانت سے کام لیتے تھے۔ آثار مرشد آباد چھوڑ کر شاہ عالم کے زمانہ میں دلی آئے شاہ عالم اب محض برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے خود بھی شعر کہتے تھے اور شاعروں کے بڑے قدردان تھے انھوں نے انشا کی بڑی قدر کی۔ دربار اُسوقت ہاکل لٹا پٹا تھا۔ مگر پھر بھی اُس قدردان بادشاہ نے اس جوان ہمت اور جوان طبیعت شاعر کو نظر شفقت و عنایت سے دیکھا اور اس کو انعام و اکرام سے مالا مال کیا۔ سید انشا اہل دربار میں داخل ہوئے اور انھوں نے بھی وہ وہ لطیفے اور ٹھٹکے بادشاہ اور اہل دربار کو سُنا نا شروع کئے کہ پھر تو یہ عالم ہوا کہ ان کی تھوڑی دیر کی بھی مُجدائی بادشاہ کو بہت ناگوار ہوتی تھی۔ آخر کار ولی کی تباہی سے بد دل ہو کر اور نیز اس خیال سے کہ ان کی قابلیت کے موافق یہاں اُنکی قدر نہیں ہوتی تھی اور خاص کر مرزا اعظم بیگ کے مناقشہ کی وجہ سے انشانے کھنوکا بُخ کیا جو اس زمانہ میں دہلی سے نکلے ہوئے شعرا اور دیگر باکمالوں کا ملجا وادنا ہوا تھا یہاں پہونچ کر انھوں نے شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ متخلص بہ سلیمان کی ملازمت اختیار کر لی جو خود بھی صاحب دیوان اور شاعروں کے قدردان تھے۔ انشانے اپنی ظرافت اور بذلہ سنجیوں سے اُن کے مزاج میں بڑا رسوخ حاصل کیا اور تھوڑے عرصے بعد اُن کے قدیمی اُستاد مصحفی کی جگہ لے لی مگر اُن کی سنجلی طبیعت جو ایک حال پر قائم رہنے والی نہ تھی ہمیشہ ترقی کے

نئے راستے ڈھونڈھتی تھی۔

انشا کی تقریباً سبادت علی خاں
کے دربار میں

تفضل حسین خان علامہ جو اپنی قابلیت اور تہذیب
سے سرکار انگریزی کے معتمد اور نواب عابد علی خاں

کے مشیر کار تھے سید انشا اُن کی صحبت میں آیا جایا کرتے تھے خان علامہ اُن کی
بڑی عزت کرتے تھے اور اس خیال میں تھے کہ کوئی مناسب حال صورت اُن کے
لئے نکالیں۔ اتفاق سے ایک دن سید انشا جوش تقریر میں ایک ایسا لفظ
بول گئے جو دو معنی میں تھا۔ اور اردو میں اُس کے معنی قابل اظہار نہیں کہنے کو
تو کہہ گئے۔ مگر خان علامہ کی نظر تاڑ کر بولے کہ زبان ماڑی وادی میں ہو قیوت
کو کہتے ہیں۔ اُنھوں نے کچھ سوچ کر کہا ”خیر خاں صاحب انداز معلوم ہو گیا
جلد کچھ صورت ہو جائیگی۔“ دوسرے دن نواب سعادت علی خاں سے اُنکے
خاندان کی بزرگی اور اُن کے ذاتی کمالات کا ذکر کر کے کہا کہ آپ کی صحبت میں
اُن کا ہونا شغل صغریٰ و کبریٰ سے بہتر ہوگا۔ وہ سن کر مشتاق ہوئے۔ دوسرے
دن خاں صاحب سید انشا کو لے گئے انشا نے اپنے لطیفوں اور چٹکوں اور
مذاق و ظرافت سے نواب کو ایسا پرچایا کہ اُن کو ان کی ایک دم کی جدائی بھی

۱۔ وزیر علی خاں کی مستثنیٰ اور بعد کو اُن کے اخراج اور سعادت علی خاں کی مستثنیٰ نہیں
حسن تدبیر کا نتیجہ تھی۔ خان علامہ علاوہ ایک مستند عالم فاضل اور باکمال ہونے کے اپنے زمانہ
کے مشہور سیاست داں تھے۔ ان کو کئی زبانوں سے واقفیت تھی جن میں انگریزی اور لاطینی
بھی شامل ہیں۔ سرگزٹ ٹیوٹن کے ڈفرنشل کلکولس کا ترجمہ اُنھوں نے فارسی میں کیا ہے۔

۲۔ ماغوازا بحیات ۱۲

ناگوار تھی۔ اُن کی حاضر جوابیاں، اُن کے پر مذاق لطیفے، اُن کی ظرافتیں نواب کو
 ایسی اچھی معلوم ہوتی تھیں کہ وہ اُن کو ایک دم بھی اپنے سے جدا رکھنا پسند نہ کرتے
 تھے مگر افسوس ہے کہ آخر میں رنگ میں بھنگ اور ہنسی ہنسی میں مخالفت پیدا
 ہو گئی۔ انشا اپنے مذاق اور دلگی کی باتوں میں بعض وقت حد سے گزر جاتے تھے
 اور جو ٹھہر میں آتا تھا کہہ جاتے تھے، ایسی باتیں اکثر موقعوں پر نواب کو موجب
 تفریح ہوتی تھیں مگر بعض دفعہ مکر ہو جاتے تھے اور ناک بھوں چڑھاتے تھے
 نواب کے مزاج کا پارہ حرارت نہ اپنے کے واسطے سید انشا بسا اوقات اچھے
 بیامی نہیں ثابت ہوتے تھے مزاج میں بھی اختلاف تھا انشا کی آزا و طبیعت
 یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ موقع دبے موقع اور جا و بیجا نواب ہی کا کہنا مانا جائے
 اور اُن کی ہاں میں ہاں ملائی جائے۔ چنانچہ ایک روز یہ واقعہ ہوا کہ دربار میں
 شرفائے خاندانی کی شرافت و نجابت کا ذکر ہو رہا تھا نواب نے کہا ”کیوں بھی
 ہم بھی نجیب الطرفین ہیں؟“ انشا محض مذاق سے اور بغیر سمجھے بوجھے بول اُٹھے
 ”بلکہ انجب“ (انجب عربی میں لوٹدی بچہ کو کہتے ہیں) سعادت علی خاں
 فی الحقیقت حرم سے تھے۔ اس بے ہنگام لفظ پر سارے دربار میں سٹالما
 چھا گیا مگر کمان سے نکلا ہوا تیر کیوں نہ واپس کیا جاسکتا ہے۔ نواب کے دل
 کی کھٹک کبھی نہیں نکلی اور اب اس فکر میں رہنے لگے کہ کوئی موقع پائیں تو
 انشا کو زک دیں۔ انشا کی بات بات کی گرفت ہونے لگی اور سخت سزائیں اور
 تکلیفیں اُن کے واسطے تجویز کی جانے لگیں۔ حکم ہو گیا کہ سوا سے ہمارے
 کسی امیر کے یہاں ہرگز نہ جاؤ۔ یہ نظر بندی اُن کے واسطے قید بے زنجیر تھی۔

اس پر طرہ یہ ہوا کہ جو ان لڑکا تعالیٰ اللہ خاں مرگیا جس سے اُن کی کمزور ہو گئی۔
 آخر میں ایک جنوبی کیفیت بھی پیدا ہو گئی تھی جسکی ایک عبرتناک کیفیت میاں
 رنگین کی زبانی آبجیات میں بیان کی گئی ہے۔ اسی اثنا میں تنخواہ بھی بند ہو گئی
 تھی جس سے فاقہ کی نوبت پہنچ گئی تھی۔ وہ شخص جو کبھی چمکتا ہوا بلسل بادشاہ
 کی ناک کا بال اور اپنے دوستوں کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھا بالآخر
 اسی خراب صحت اور فقر و فاقہ کی حالت میں اس دار فانی سے چل بسا۔
 یہ واقعہ ۱۳۳۲ھ کا ہے جیسا کہ بسنت سنگھ نشاط کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے

خبر انتفال میر انشا دل غمدیدہ تا نشاط شنفٹ
 سال تاریخ اور جان اجل ”عرفی وقت پود انشا“ گفت

اُن کے کلام کی خصوصیات انشا کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ اُنھوں نے
 توسیع زبان کا کام جو مرزا رفیع سودا نے شروع کیا تھا جاری رکھا۔ انشا پہلے
 ہندوستانی شخص ہیں جنھوں نے زبان اُردو کی صرف و نحو و وزن کی ادب و تحقیق
 و تلاش اور محنت سے اپنی مشہور کتاب دریائے لطافت مرتب کی اُس سے اُن کا

لہ آزاد نے انشا کے متعلق خصوصاً اُن کے مجنون ہو جانے اور اڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی بہت سی
 روایتیں بیان کی ہیں جو باری تحقیق کو نہیں پہنچتیں اور بہت سی روایتیں مستند طور پر غلط قرار پاتی ہیں۔
 حیات دبیر کے مصنف نے مرزا اوج کی زبانی لکھا ہے جو میر انشا را اللہ خاں کے لوا سے تھے
 کہ سید انشا نہ مجنون ہوئے اور نہ انکی تنخواہ بند ہوئی۔ صرف اتنا صحیح ہے کہ نواب سعادت علی خاں نے
 حکم دیدیا تھا کہ وہ سوا دربار کے اور کمیں نہ آئیں جائیں اور دربار میں بھی بغیر بلائے حاضر نہوں معلوم
 ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں انشا و مصحفی میں جھگڑا ہوا اور جو تک نوبت پہنچی تو نواب زیر نے انشا کو
 گھنٹوں سے چلے جائیکا حکم دیدیا تھا۔ وہ حیدر آباد گئے چند دنوں کے بعد نواب زیر نے پھر بلایا ذکرہ خاں

پایہ استاد ہی بلند ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کے کلام میں ہجواری اور
 انتقامت نہیں ہے مگر اُن کا اچھا کلام یقیناً بہت قابل قدر بلکہ قابل استناد
 ہے۔ اُن کے مختلف اصناف سخن سے پایا جاتا ہے کہ وہ زبان کو وسعت دینے
 کی غرض سے بہت سے تجربے کرنا چاہتے تھے۔ اگر وہ اپنی طبیعت اور زبان پر
 قابو رکھتے تو یقیناً وہ زبان اردو کے بڑے پایہ کے استاد سمجھے جاتے۔ انشاء کی
 خاص خصوصیات یہ ہیں (۱) ظرافت۔ مذاق اور ظرافت میں انکا ہم پلہ شعرے
 اردو میں سوائے سودا کے اور کوئی نہیں ہوا۔ انکی روزمرہ کی گفتگو اور کلام نظم و
 نثر دونوں مذاق اور ظرافت سے بھرے ہوئے ہیں (۲) جامعیت ان کی طبیعت
 ایسی تھی جیسے ایک ترشا ہو آگینہ جسکے مختلف پہل ہوتے ہیں۔ ان میں خاص
 صفت یہ تھی کہ ہر قسم کے مضامین کو اپنے رنگ میں ڈھال لیتے تھے۔
 (۳) علم و فضل معلوم ہوتا ہے کہ مشکل مشکل مضامین علمیہ اپنے دماغ کے چھپے
 ہوئے گوشوں سے ایک لمحہ میں حاضر کر سکتے تھے اور اپنے دعوے کے ثبوت
 میں کوئی ایسا پر لطف قصہ یا دلیل یا شعر یا کوئی دوسری سند اس خوبی سے
 پیش کرتے کہ حریف اُس کو فوراً تسلیم کر لیتا (۴) نہایت ذہین اور طباع تھے۔
 اور ان کی قوت تخیل بجلی سے تیز تھی (۵) فارسی اور عربی کے فاضل زبردست
 تھے۔ اور ان دونوں زبانوں میں اُن کے اشعار کا بہترین نمونہ موجود ہے۔
 ان کے علاوہ ترکی۔ پشتو۔ پوربی۔ پنجابی۔ ماڑواڑی۔ مرہٹی۔ کشمیری۔ اور
 ہندی بھی خوب جانتے تھے اور ان سب میں شعر کہہ سکتے تھے۔ غرض کہ ایک
 بہت زبردست اور قابل زبان دان تھے۔ تضمین بھی خوب کرتے تھے۔ نہایت

تیز و طراطبعیت پائی تھی۔ اور مشکل اور نئی نئی چیزوں میں اُن کو بڑا لطف آتا تھا۔ ایک مختصر دیوان صنعت غیر منقوطہ میں لکھا ہے بعض نظموں میں دوسری صنعتیں بھی دکھائی ہیں مثلاً واسع الشفتین یا ذولسائین وغیرہ۔ ان کو اُردو کا امیر خسرو کہنا بجائے ان کو مشکل بحریں اور مشکل زمینیں بہت پسند تھیں اور اس میں اپنی زبان وانی کی قوت دکھائی ہے۔ ان کے بعض قوافی بھی بہت غیر معمولی اور دشوار ہوتے ہیں اور گوکہ بہت ہوشیاری سے نظم کیے ہیں مگر پھر بھی کانوں کو بُرے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ غزل کے واسطے وہ موزوں نہیں ہیں ظرافت اور مذاق جو ان کا خاصہ ہے بعض اوقات اُسکی اتنی کثرت ہو جاتی ہے کہ مہذب طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے اور شعر میں ندرت اور خوبصورتی پیدا کرنے کے بجائے اُس کو مہمل اور بھونڈا کر دیتا ہے۔ ظرافت کی کثرت شاید اس وجہ سے کی گئی ہو کہ اُس زمانہ کے لوگوں کو جن کا مذاق بہت گر گیا تھا یہ رنگ بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے اُن کا مذاق لطافت اور تہذیب سے خالی ہر اور اسی تعلق سے اس عہد میں رنجی کی بنا پڑی جس کا موجد اور مخترع انشا اور رنگین کو سمجھنا چاہیے۔ انشا کی بے ہنگام ظرافت نے تصوف ایسی مقدس اور پاک چیز کو نہ چھوڑا۔ چنانچہ اگر کسی کو تصوف اور مذاق کا بے جڑ میل دیکھنا منظور ہو تو وہ اُن کی مثنوی شیر برنج دیکھ لے۔

انشا کی خاص صفتیں یہ ہیں۔ زبان پر قدرت۔ ہمہ گیر طبیعت۔ ہر صنف شاعری میں مہارت۔ اعلیٰ قابلیت۔ قوت ایجاد و اختراع۔ وطن کی روایات قدیمہ سے محبت اور مذاق و ظرافت۔ انشا نے سودا کی طرح مگر اُن سے کسی قدر

محدود درجہ پر ہندوستان کی تخیل اور تخیل سے اپنی غزلوں میں بہت کام لیا ہے ان کا بڑا عیب یہ ہے کہ انھیں تناسب کا صحیح اندازہ نہیں ہے اور اسی وجہ سے وہ صائب رس قائم کرنے میں غلطی کھاتے ہیں۔ اُن کے کلام میں ہمواری نہیں ہے غزلوں میں خیالات کی قلت اور الفاظ کی کثرت پائی جاتی ہے۔ جسکی وجہ شاید انکی مشکل زمینیں اور توانی ہوں قصیدہ اور غزلگوئی میں وہ معمولی قواعد شعر سے بے پروا ہوتے ہیں۔ اظہارِ ظرفیت پر بھی قابو نہیں رکھتے۔ نواب اور اُن کے عیش پرست درباریوں کے خوش کرنے کے لیے کبھی کبھی فحش سے بھی اپنی زبان خراب کرتے ہیں یہ عیب ان کا خاص نہیں بلکہ اُس زمانہ کا عیب ہے۔ یہی حال عہدِ سیٹورین کے انگریزی شعرا کا تھا۔ جن کا کلام اُس زمانہ کی خراب موسیقی کا آئینہ ہے انشانے شعر کو اپنے نواب کے خوشی کے ماتحت کر دیا تھا وہ شعر کے بلند درجہ پر کبھی فائز نہیں ہوئے۔ شاعری اُن کے واسطے حصولِ غرض کا ایک ذریعہ تھی۔ اُن کا کوئی اعلیٰ سطحِ نظر نہ تھا اور نہ کوئی پیغام اُن کو پہنچانا تھا۔ درباری شاعر بن کر اُن کو مقبول سنا ملی۔ جب کہ ان کے مسخرے پن کی باتوں اور ہزل و ہجو پر انعام و اکرام ملنے لگے اور اُن کی قدر ہوتی تھی تو پھر اعلیٰ شاعری کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ وہ ایسے زبردست طبیعت کے پاک باطن بھی نہ تھے کہ اپنے زمانہ کے رنگ اور گرد و پیش کے حالات سے متاثر نہ ہوتے۔ بہر طور جو کچھ لکھا ہے وہ سب بیکار اور خراب بھی نہیں ہے۔ اُن کے کلام میں جا بجا نہایت بیش بہا جواہر بھی ملیں گے جو مترسریں کسی سے کم نہیں۔ ان کا قصیدہ جو جارج سوم کی تعریف میں ہے وہ نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ سید انشا اور انکی شاعری کے متعلق میاں بختیاب کا چھتا ہوا جملہ

یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ ہے کہ انشاء کے علم و فضل کو انکی شاعری نے اٹھوایا اور انکی شاعری کو نواب سعادت علی خاں کی دربارداری نے ڈھویا۔ اگر کسی کو انشاء کے مفصل حالات و بحسب لطیفوں اور چٹکوں کے ساتھ دیکھنا منظور ہوں تو وہ آب حیات میں اُن کا حال پڑھے۔

ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں :-

تصانیف

کلیات جس میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں :-

(۱) ایک دیوان اُردو و غزلوں کا جس سے زبان پر اُن کی پوری قدرت معلوم ہوتی ہے مگر ہمواری نہیں ہے۔ فصیح الفاظ، عمدہ محاوروں، چُست ترکیبوں کے ساتھ یہ عیب بھی ہے کہ کہیں کہیں قواعد شعر کی خلاف ورزی ہو گئی ہے۔ بعض اشعار فی الواقع بہت اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ اور نظم اُردو کے بہترین نمونے کہے جاسکتے ہیں۔

(۲) دیوانِ ریختی جس کے آخر میں کچھ مستزاد اور پہیلیاں اور طلسمات

بھی ہیں۔

(۳) قصائد اُردو و فارسی جو حمد و نعت اور منقبت المہر معصومین

اور مختلف اشخاص کی تعریفوں میں ہیں۔ ان میں زبان پر قدرت اور الفاظ کی شان و شکوہ بہت پائی جاتی ہے مگر قواعد کا خیال کم کیا گیا ہے۔ بعض جگہ مذاق اور ظرافت کے ساتھ نازِ خیالی بھی خوب ہے اور عربی فارسی ترکی اور دیگر زبانوں کے شعر بھی شامل کئے گئے ہیں کہیں کہیں اُن کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے جو قصیدہ کی شان کے خلاف ہے۔

(۴) دیوان فارسی کا بھی یہی حال ہے گو زبان کا زور اور لطافت بہت کچھ ہے مگر اکثر جگہ صرف مسخر اپن ہے اور کچھ نہیں۔ اگر اپنے رفیق طبعی یعنی متسخ کو چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لئے ضبط سے کام لیتے تو ان کا پایہ شاعری بہت بلند ہوتا۔

(۵) ایک فارسی شنوی موسوم بہ شیر و برنج جو مولانا روم کی مشہور شنوی کی بھریں اور اسی طرز پر لکھی گئی ہے اور جس میں مسائل روحانیت و تصوف کو مذاق کے پیرایہ میں بیان کیا ہے مولانا آزاد نے خوب لکھا ہے۔ کہ کھیر (شیر و برنج) میں نمک ڈال کر تصوف کو متسخ کر دیا ہے۔

(۶) ایک شنوی بے نقط جسکی سرخیاں بھی بے نقط ہیں مثلاً ”حمد“ کے موقع پر لکھتے ہیں کہ ”لوہ در حمد مالک الملک“ ”نعت“ کے واسطے ”لوہ در مدح سرور کل“ ”منقبت“ کے واسطے ”لوہ در مدح سوار دل“ ”د بادشاہ کی تعریف کے لئے“ ”لوہ در مدح حاکم عصر“ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب سرخیاں بھی موزوں ہیں۔ اس سے ہم دو بے نقط شعر نقل کرتے ہیں جس سے نمونہ کلام کے علاوہ تاریخ تصنیف بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

لوہ سال کلامِ مسطور

گردِ کرمِ آہِ گردِ دم	دُر درِ سلکِ کلامِ کرم
طورِ الاسرارِ دِ سطرِ گوہر	کردم سالِ درِ محرّر

(۷) - مثنوی شکار نامہ جو نواب سعادت علی خاں کے حکم سے اُن کے شکار دھڑہ کے بیان میں بقید تاریخ بطور روزنامہ کے لکھی گئی تھی اسکی نظم بہت دلچسپ اور ترکیبیں بہت حست ہیں تاریخ کے یہ دو اشعار بطور نمونہ دیے جاتے ہیں -

قطعہ در تاریخ

فوج ظفر موج بایں عز و جاہ گرد رسانید چو براوج ماہ
شوکتش آتشا بجو زر نوشت فقرہ تاریخ مظفر نوشت
(۸) ہجویں گرمی - بھڑوں - کھٹلوں - کھٹیوں - پھڑوں وغیرہ کی شکایت میں اور متفرق اشخاص کی ہجویں منجملہ جن کے میاں مصحفی کی ہجو جو بحر طویل میں ہے بہت دلچسپ ہے -

(۹) مثنوی موسوم بہ شکایت زمانہ
(۱۰) چند مثنویاں جو عاشقانہ رنگ میں ہیں - اور ایک میں ایک ہاتھی اور چنچل پیاری مٹھنی کی شادی کا دلچسپ افسانہ ہے
(۱۱) ایک مثنوی بزبان ماڑواڑی جس میں گیارہ چند سا ہوکار کی ہجو ہے
ایک دوسری مثنوی موسوم بہ مرغ نامہ جس میں مرغ بازی کے قواعد مذاق اور مسخرہ کے ساتھ بیان کیے ہیں -

(۱۲) مائتہ عامل عربی بزبان فارسی

(۱۳) متفرق اشعار معنی، رباعیاں، قطعے، تاریخیں، پہیلیاں، چیتا نین وغیرہ

(۱۴) دیوان بے نقط

کہانی ٹھٹھ ہندی میں اس مضمون کے نام سے ایک کتاب شُرُود میں لکھی ہے جس میں ایک لفظ بھی عربی و فارسی کا نہیں آنے دیا اور نہ کوئی لفظ سنسکرت یا ٹھٹھ ہندی بھاشا کا ہے اور باوجود اس کے زبان نہایت سلیس اور بامحاورہ اُردو ہے مقدار میں تقریباً ۵۰ صفحے ہونگے۔ اس کے اکثر حصے اُن کتابوں میں نکل چکے ہیں جو فورٹ لیم کا لچ کلکتہ کی طرف سے شائع ہوئی تھیں۔ ایٹیاٹمک سوسائٹی آف بنگال نے عرصہ ہوا اسکو کئی جلدوں میں شائع کیا تھا۔ قصہ کا خلاصہ یہ ہے۔

ایک راجہ تھا جس کا نام سورج بھان تھا اور اسکی رانی کا نام پچھی باس تھا۔ اُن کے ایک لڑکا تھا جو اودے بھان کے نام سے مشہور تھا اور وہ ہی اس قصہ کا ہیرو ہے۔ ایک دن وہ بغرض سیر و شکار جنگل کی طرف نکل گیا۔ ایک ہرنی کے پیچھے گھوڑا ڈالا رات ہو گئی اور راستہ بھول گیا۔ ایک باغ میں اُس نے چند خوبصورت لڑکیوں کو جھولا جھولتے دیکھا جن میں راجہ جگ پرکاش درانی کام لٹا کی خوبصورت لڑکی رانی کینکی بھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے۔ دن بان رانی کینکی کی سہیلی اور ہمراز تھی۔ اُس کے کہنے سے ان دونوں نے اپنی اپنی انگوٹھی ایک دوسرے سے بدل لی۔ کنوراودے بھان واپس آیا تو اسکی حالت کینکی کے عشق میں خراب ہو گئی۔ آخر شش یہ راز اودے بھان کے باپ پر ظاہر ہوا تو اُس نے

۱۵۔ ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ دو کتابیں فلمی ابھی دستیاب ہوئی ہیں۔ جن کو سید انشانے نواب سعادت علی خاں کے حکم سے اُن کی دیکھپی کے واسطے لکھا تھا۔ ایک کا نام لطائف السعادت اور دوسری کا نام بحر السعادت ہے آخر الذکر کا دریاے لطافت سے بھی کچھ تعلق معلوم ہوتا ہے ممکن ہے کہ اُس کا نقش اول ہو۔

شادی کا پیام راجہ جگ پرکاش کو بھیجا جسے اُس نے بڑی حقارت سے دکر دیا۔
 نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں راجاؤں میں جنگ چھڑ گئی۔ لڑائی کے دوران میں
 کنورا دوسے بھان نے ایک ماہن پھول کلی کے ہاتھ ایک رقمہ رانی کیتی کے
 پاس بھیجا اور غصہ بھاگ چلنے کے لیے اصرار کیا۔ رانی کیتی کی غیرت نے اسکو
 قبول نہ کیا۔ جگ پرکاش نے دیکھا کہ فتح نصیب نہیں ہوتی تو اُس نے اپنے
 گرو مہندر گرو کو جو کیلاس پر بت (کوہ ہمالیہ) پر رہتا تھا اپنی کمک پر بلا یا۔
 اُس نے اپنے علم کے زور سے سورج بھان کو شکست دی اور کنورا دوسے بھان
 اور سورج بھان اور مہارانی کچھی باس ہرن دہرنی بن گئے اور کئی برس
 تک یوں ہی رہے۔ چلتے وقت گرو نے راجہ جگ پرکاش اور اُسکی رانی کو
 ایک شیر کی کھال اور بھوت دی اور یہ ہدایت کی کہ اگر میری ضرورت ہو تو
 کھال میں سے ایک بال نکال کر جلا دینا میں فوراً پہنچ جاؤں گا اور بھوت
 اس لیے ہے کہ جو کوئی چاہے اُسکا انجن لگائے وہ سب کو دیکھے اور اُسے
 کوئی نہ دیکھے۔ رانی کیتی کو اپنے عاشق کی جدائی شاق تھی اور وہ نہایت
 پریشان و مضطرب تھی ایک روز چالاکی سے آنکھ میچولی کھیلنے کے بہانے
 اُسے بھوت مانگا اور اُسکو لگا کر اُسکو نکل گئی۔ اُسکی سہیلی دین بان کو جب
 یہ معلوم ہوا تو وہ بھی کیتی کی تلاش میں بھوت لگا کر نکلی۔ ایک عرصہ بعد دونوں کی
 ملاقات ہوئی۔ دین بان واپس آگئی اور رانی کیتی اور کنورا دوسے یہاں کی
 محبت کا راز راجہ جگ پرکاش درانی کام لتا پر ظاہر ہو گیا جب یہ معلوم
 ہوا تو اُس نے کھال کے بال سے مہندر گرو کو بلا یا اور کل حالات بیان کیے

رائی کیتی اور اُس کے ماں باپ اپنے ملک کو چلے گئے اور ہندو گردنے تلاش کر کے کنور اودے بھان اور اُس کے ماں اور باپ کو انکی اصلی صورت میں کر دیا راجہ اندرنے بھی اس کام میں اُسکی مدد کی تھی اور آخرش رائی کیتی کی شادی بڑی شان و شوکت و تزک و جشنام سے کنور اودے بھان کے ساتھ ہو گئی۔
 نمونہ کلام یہ ہے۔ اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو بتاتا ہے۔
 اور جیسا کچھ اُسے لوگ پکارتے ہیں کہہ سنا سنا ہے اپنا ہاتھ منہ پر پھیر کر
 مچھوں پر تاؤ دیتا ہوں اور آپ کو بتاتا ہوں جو میرے داتا نے چاہا
 تو وہ تاؤ بھاؤ اور چاؤ اور کود پھاندا اور لپیٹ جھپٹ دکھاؤں کہ آپ کے
 دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت چنچل اچلا ہٹ میں ہے دیکھتے ہی
 ہرن کے روپ اپنی جو کڑی بھول جائے ۱۰ چوتھا

گھوٹے پر اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں کرب جو میں سب کھاتا ہوں میں
 اُس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں

دریائے لطافت پہلی کتاب قواعد اردو کی ہے جو ہمارے اہل زبان

نے اردو کے متعلق لکھی ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۶۲ھ مطابق سنہ ۱۸۴۶ء ہے۔ اسکی تصنیف میں مرزا قتیل بھی شریک تھے۔ انشانے اس کا پہلا حصہ لکھا جس میں زبان اردو کی صرف و نحو کا حال ہے اس میں اول اردو بولنے والوں کی مختلف زبانوں کے نمونے دکھائے ہیں اور پھر قواعد بیان کیے ہیں۔ طرز تحریر میں وہی ظرافت اور سخر ہے جو ان کے دم کے ساتھ ہے۔ دوسرا حصہ مرزا قتیل کی تصنیف ہے۔ اس میں عروض و قافیہ

منطق، معانی، بیان وغیرہ کا ذکر ہے۔ مرزا قاتل نے بھی اپنے دوست کی پیروی میں مذاق اور ظرافت کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ مگر پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہے لطف سے خالی نہیں مثلاً تقطیع میں بجائے مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن کے پری خام۔ پری خام۔ پری خام۔ پری خام لکھا ہے اور مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن کی جگہ بیجان پری خام۔ بیجان پری خام۔ درج ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دو سطر حصہ اتنا دلچسپ نہیں جتنا پہلا ہے۔ سید انشاء پہلے شخص ہیں جنہوں نے زبان اردو کی اہمیت اور اس کے قواعد مرتب کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا تھا۔ انہوں نے صحیح محاورات لفظوں کی اصل، اور تلفظ کی تحقیق و تلاش میں اپنا بہت سا وقت عزیز صرف کیا اور بیگمائی اور محلات کی جو زبان لکھی ہے وہ بھی ہمارے واسطے دلچسپی سے خالی نہیں۔ انہوں نے بڑی محنت اور قابلیت سے اس اثر کا بھی ذکر کیا ہے جو مختلف قومیں اور جماعتیں شتر کہ زبان اردو کی ترقی پر ڈالتی ہیں۔ قواعد کو نہایت صفائی کے ساتھ اور مکمل طریقہ پر بیان کیا ہے۔ اردو کے حروف تہجی اور انکی آوازوں کو نظر تعمق سے دیکھا ہے ان کی رائے میں مجموعی آوازوں کی تعداد ۵۸ ہے۔ زبان کے مختلف شعبوں مثلاً پوربی، اڑواڑی وغیرہ کے نمونے دیے ہیں اور دکھایا ہے کہ ان کا اثر اردو پر کس طرح پڑتا ہے۔ یہ کتاب اسوجہ سے بھی دلچسپ ہے کہ اُس میں بہت سے متروکات دیکر ان کی جگہ مروجہ الفاظ کو بیان کیا ہے۔ پوری کتاب کا طرز تحریر مذاق و ظرافت سے بھرا ہوا ہے مگر باوصف اس کے وہ قدیم اردو گرامر کی حیثیت سے نہایت قیمتی چیز ہے۔

غرض کل تصنیفات کی حالت مجموعی دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انشاء میں حیث
الادب اور نیز میں حیث الشاعری بہت بلند پایہ رکھتے تھے۔ اُن کی تصانیف میں
انتانوع ہے کہ کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں۔ تصرف اور ایجا دوں کے
حاکم علی الاطلاق اور ظرافت و لطافت میں طاق و مشاق تھے۔ چنانچہ اُن کا ایک قطعہ
نمخانہ جاوید جلد اول سے نقل کر کے بطور نمونہ ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ فائق
تخلص ایک شاعر تھا جس نے اُن کی ہجو کہی اور خود لاکر سنائی تھی۔ اُنھوں نے
بہت تعریف کی اور پانچ روپے دیے اور یہ قطعہ بھی کہ کر روپیوں کے ساتھ ساتھ
اُس کے حوالہ کیا۔

فائق بے حیا جو ہجوم گفت دل میں سوخت سوخت سوخت بہ
صلہ اش پنج روپیہ داوم دہن مگ بہ لقمہ دوخت بہ

اس شاعر نے لفظ ید کو مشدود باندھا تھا انشاء نے اُس کے جواب میں بطور تعریض
کے جو قطعہ لکھا ہے درج ذیل ہے۔

چہ خوش گفت فائق شاعر غرہا کہ چوں دہن او دہن رَسا نباشد
یکے شعر نادر کہ در چہن دوزن شود خواندہ و شکب بمعنا نباشد
دراں لفظ ید را بدل مُشدود نوشت است و این غلط صلا نباشد
شنید این سخن را چو گرد سخن ز انشا کہ ہمسر ش اصل نباشد
بگفتا کہ من شاعر خوش منکرم چو من ہیج معتل گویا نباشد
تو گستاخ را ندانی در ست ترا ہیج شعور و ذکا نباشد
سند یاد از اُستاد است مارا بکلام ما ہیج خطا نباشد

جو تشدید در شعر ضرورت افتد تشدید صحیح چہرہ نباشد
 جرأت دستوی ۱۲۱ھ جرأت تخلص مشہور نام شیخ قلندر بخش۔ صلی نام کبی امان
 تھا۔ ان کے والد کا نام حافظ امان ہے اور سلسلہ خاندان اسے امان سے ملتا ہے
 جو محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانہ میں دربار شاہی میں خدمت درباری پر مامور
 تھے۔ دہلی میں کوچہ راسے مان انھیں کی طرف منسوب ہے اور یہ نادر شاہی حملہ
 دہلی ۱۲۱۰ھ میں مارے گئے۔ جرأت کا زمانہ بچپن فیض آباد میں گذرا جیسا کہ حسین
 کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے۔ وطن سے بہت کسنی میں بکھلے تھے۔ شروع میں
 نواب محبت خاں پسر حافظ رحمت خاں کی رفاقت کی چنانچہ خود کہتے ہیں
 بسکہ گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بستار کے

ہوئے نوکر بھی تو نواب محبت خاں کے

اس کے بعد ۱۲۱۰ھ میں صاحب عالم و عالمیان مرزا سلیمان شکوہ کے
 حاشیہ نشینوں میں داخل ہوئے اور آخر تک لکھنؤ ہی میں رہے اور وہیں وفات
 پائی۔ ناسخ اور نساخ دونوں نے وفات کی تاریخیں کہی ہیں۔ ناسخ کی
 تاریخ ہے ۱۲

جب میاں جرأت کا باغ دہرے گلشن فردوس کو جانا ہوا
 مصرع تاریخ ناسخ نے کہا ہاے ہندستان کا شاعر موما
 جرأت مرزا جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ علاوہ فن شاعری کے

۱۱ گل کے سرے پر جو بورڈ لگا ہے اُس پر ”کوچہ جمن“ لکھا ہے ۱۲

۱۳ ہندستان بغیر داو کے پڑھنا چاہیے ۱۴

نجوم میں ماہر اور فن موسیقی کا بھی شوق رکھتے تھے اور ستار خوب بجاتے تھے۔
 افسوس ہے جوانی ہی میں آنکھوں کی مینائی جاتی رہی۔ بعض کہتے ہیں یہ
 حادثہ چیچک سے ہوا، بعض کچھ دوسری وجہ بتاتے ہیں۔ مولانا آزاد نے
 اب حیات میں اسکو بہت طول دیکر لکھا ہے مختصر یہ ہے کہ ہمارا نوجوان عاشق مرزا
 شاعر حسن نازک کی پر لطف صحبتوں کا بہت دلدادہ تھا۔ مگر پردے کے سبب
 سے شرفا اور امرا کے گھروں میں گھسنے نہیں پاتا تھا۔ ایک مرتبہ آشوب چشم کے
 بعد مشہور کر دیا کہ میری آنکھوں کی مینائی جاتی رہی اور مجھ کو اب کچھ نہیں سوجھتا
 اس بہانے سے رئیسوں اور امیروں کے گھروں میں اندھا بن کے جانے لگا
 اور خوبصورت عورتوں کو چپکے چپکے تاکنے لگا۔ آخر کار اپنی اس کار کی پاداش
 میں سچ مچ اندھا ہو گیا۔

جرات زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے زبان عربی اور معمولی علوم و فنون
 سے ناواقف تھے مگر طبیعت بلا کی پائی تھی۔ شعر کا شوق اُن کو خلقی تھا، کبھی
 فکر شعر سے غافل نہیں رہتے تھے۔ میر حسن اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں ”دیوانہ
 فن شعر است کہ گاہے بفکر نمی ماند۔“ بسیار درد مند و گداز بہت“

تصانیف ایک دیوان اور دو مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں، دیوان میں
 غزلیں، فردیات، رباعیاں، مخمس، مسدس، ہفت بند، ترجیع بند و اسوخت

۱۔ مرزا علی لطف اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں ”علم موسیقی میں مشغلہ بھلا چکا رکھتا ہے اور
 ستار کے بجانے میں نہایت دست رس رکھتا ہے۔ نجوم میں بھی اس شخص کو ذیل تام ہے
 ایسا کہ ایک عالم گھنوا کا اس کا منتظر احکام ہے“ ۱۲

تاریخیں، ہجو، سلام، مرثیے، سب کچھ ہیں۔ ایک فالنامہ بھی ہے۔ دو مثنویوں کے آخر میں جو تاریخیں دی ہوئی ہیں اُن سے ۹۱ھ اور ۹۲ھ نکلتے ہیں۔ مثنویوں میں ایک ۶۲ صفحات اور دوسری ۳۲ صفحات کی ہے۔ ایک میں برسات کی ہجو اور سن تصنیف ۹۵ھ ہے۔ دوسری مثنوی کا سن تالیف ایک تاریخ سے ۹۲ھ معلوم ہوتا ہے۔ اُس کا نام ”حسن و عشق“ اور اُس میں ایک بزرگ خواجہ حسن نام اور لکھنؤ کی ایک حسین زیدی بخشی کے عشق کا ذکر ہے۔ اُس کی زبان نہایت فصیح و پر لطف اور کلام نہایت نکلیں و بامزہ ہے۔

جرات کی خصوصیات اور اُن کا مقابلہ میر کے ساتھ

جرات نے قصیدہ یا کسی دوسری شکل اور متین صنف نظم کو اختیار نہیں کیا فارسی میں بھی کچھ نہیں کہا جیسا کہ اُس زمانہ کے ذی استعداد شعرا کا دستور تھا۔ وہ علی الخصوص ایسی محفل کے شاعر تھے جہاں شراب ناب کے دور چلتے ہوں اور حسن و عشق کے چرچے ہوتے ہوں۔ عاشقانہ رنگ، بلکہ اس میں بھی معاملہ بندی، ان کا خاص رنگ ہے اور اُس میں ان کو درجہ کمال حاصل ہے۔ یہی معاملہ بندی بعض وقت زیادہ تفصیل کے بعد فحش کی سرحد سے بل جاتی ہے اور ان کے اشعار کو مہذب صحبتوں کے لائق نہیں رکھتی۔ باعتبار رنگ کے ان کا اور میر کا کلام ملتا جلتا ہے۔ کیونکہ دونوں غزال تھے اور دونوں کا رنگ عاشقانہ ہے مگر میر کے جذبات اور درد و اثر جرات کے یہاں مفقود ہیں۔ میر عمیق اور جرات سطحی شاعر ہیں۔ ان کے یہاں معاشیق علی الخصوص معاشیق بازاری کے ناز و کرشمے، عشاق کی حرام نصیبی، ہجر کی مصیبتیں، درباریوں کی ایک دوسرے کے ساتھ رقابت

اور بے پروائی وغیرہ وغیرہ، غرض کہ جو کچھ ایک عیش پرست دربار اور عشرت طلب سائے کا تقاضا تھا۔ بہت خوبی اور بڑی کامیابی سے بیان ہوا ہے۔ غزل کے لئے انکی طبیعت بہت مناسب واقع ہوئی تھی۔ میر کے رنگ کو انھوں نے اختیار کیا اور اُن کی شیرینی اور فصاحت و بلاغت میں ایک ایسی چاشنی اور شوخی اضافہ کی جس سے ان کا طرزِ علمیہ ہو کر مقبول عام ہو گیا۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ میر میں اور ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میر کا تغزل بلند اور اُن کا عاشقانہ رنگ بہت اعلیٰ اور ارفع قسم کا ہے، جرات کا عشق مادی اور ادنیٰ درجہ کا ہے۔ میر کے قدردان اہل دل سخن شناس اور جرات کے دلدادہ عوام الناس ہیں۔ سچ پوچھیے تو اصلی فرق دونوں کی طبیعتوں کا ہے۔ میر میں متانت، خودداری، استغراق اور گوشہ نشینی تھی اور وہ شاعری کو ایک نہایت معزز اور مقدس کام خیال کرتے تھے۔ برخلاف اس کے جرات ایک حریفِ لطیف، ہشاش بشاش خوش طبع آدمی تھے، ہمیشہ صحبت کے تلاشی اور شاعری کو ذریعہٴ معاش اور جلبِ کار کا ایک زبردست آلہ سمجھتے تھے اور شعر کے ذریعہ سے اپنے تئیں اپنے مرہوں اور سرپرستوں کا ایک دھچپ کھلونا بنائے ہوئے تھے اور اُن کے دل کو خوش کر کے اُن سے کچھ اینٹھنا جانتے تھے۔ اُن میں میر اور انشا کا ایسا علم و فضل اور تواضع شعر سے ویسی واقفیت نہ تھی مگر پھر بھی اُن کا ایک طرزِ خاص ہے اور اُن کے کلام میں ایسی سادگی اور مزہ ہے جو عام دلوں کو بہت مرغوب ہے۔ میر نے جو رائے اُن کی غزلوں کی نسبت ظاہر کی تھی وہ سننے کے قابل ہے اور بہت صحیح ہے۔ مرزا محمد تقی خاں ترقی کے مکان پر ایک مشاعرہ تھا جس میں شہر کے سب نامی

امیس اور شاعر جمع تھے میر اور جرأت بھی تھے۔ جرأت نے جو غزل پڑھی اسپر بہت واہ واہ ہوئی اور بہت تعریفیں ہوئیں وہ ازراہ تنجریا شوخی سے، جو کچھ سمجھے، میر صاحب کے پاس آ بیٹھے اور اپنے کلام کی داد چاہی، میر صاحب نے دو ایک مرتبہ تو ٹالا مگر جب انھوں نے زیادہ اصرار کیا تو تیوری سی چڑھا کر فرمایا، تم شعر کہنا کیا جانو اپنے چو ما چائی کر لیا کرو، مختصر یہ کہ جرأت کا پایہ شاعری بہت بلند نہیں، دربار کے تو تسل نے ان کو بھی مٹایا جیسا کہ انشا کو مٹایا تھا پھر بھی انشا کو ان کے علم و فضل نے بچا لیا۔ ان کا تو یہ بھی سہارا نہ تھا۔ جرأت نے زبان یا نظم اردو کی ترقی میں بھی کوئی حصہ نہیں لیا۔ جو شاہراہ متقدمین قائم کر گئے تھے اُسی پر انھیں بند کئے چلے گئے، کہا جاتا ہے وہ عاشقانہ رنگ کے موجد ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ دعویٰ صرف اس حد تک صحیح ہو سکتا ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے بگڑے ہوئے عام مذاق کی پیروی کی اور ایک ایسا رنگ اختیار کیا جسکی تکمیل متاخرین میں جرأت اور داغ نواب مرزا خاں داغ کے ہاتھوں ہوئی۔ ان دونوں شاعروں میں باعتبار لفظ اور معنی دونوں کے فی الواقع بہت مماثلت اور مشابہت ہے۔

مصطفیٰ حسن علیؒ تاسکندہؒ شیخ غلام ہمدانی نام۔ مصطفیٰ تخلص۔ شیخ ولی محمد کے بیٹے امروہہ کے رہنے والے تھے۔ آغاز جوانی میں وطن چھوڑ کر سنہ ۱۲۹۷ھ میں آئے۔ جہاں تکمیل علوم کی اور شعرو سخن کی طرف مائل ہوئے۔ ان کو پڑھنے کا اس قدر شوق اور کتب بینی سے اس قدر ذوق تھا کہ کتابیں عاریت لے لے کر پڑھتے تھے اور بطور خلاصہ اپنی یادداشت کے طریقہ پر لکھتے جاتے تھے۔

انھوں نے ۹۵۰ھ ہی میں شعر گوئی میں شہرت حاصل کر لی تھی کیونکہ مذکورہ
میر حسن میں ان کا ذکر عزت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ خود مشاعرہ بھی کرتے تھے جنہیں
معزز شعر مثل انشاء اور میر حسن اور جرأت وغیرہ کے جمع ہوتے تھے۔ بارہ برس
دلی میں رہ کر مثل اور شعر کے لکھنؤ آئے جب کہ نواب آصف الدولہ سریر آرائے
حکومت تھے لکھنؤ میں انھوں نے مستقل قیام کیا اور شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ
کے ملازم ہو گئے۔ لکھنؤ آنے سے پہلے کچھ دنوں ٹانڈہ میں نواب محمد یار خاں کے
پاس رہے تھے۔ لکھنؤ تھوڑے دنوں رکھ کر پھر دلی چلے گئے مگر کچھ دنوں کے بعد آدھ
کی کشش ان کو پھر لکھنؤ کھینچ لائی۔ آزاد کی تحقیق کے موافق ۱۲۰۰ھ میں تقریباً
اسی برس کی عمر میں انتقال کیا جب کہ آٹھواں دیوان ترتیب دے رہے تھے۔
شیفہ بھی اپنے گلشن بیجا میں جو ۱۲۰۰ھ کی تصنیف ہے لکھتے ہیں کہ ان کو
مرے دس برس ہوئے حسرت موہانی اپنے تذکرہ میں ان کا سن ولادت ۱۱۶۲ھ
لکھتے ہیں۔ لہذا مرنے کے وقت ان کی عمر ۳۷ برس کی ہوگی۔

تصانیف مصحفی اردو اور فارسی دونوں کے پرگو شاعر تھے ۹۳۵ھء کے
پہلے انھوں نے دو دیوان فارسی مرتب کیے تھے ایک نظیری میثا پوری کے جواب
میں۔ اور دوسرا اپنی طبع زاد غزلوں کا مجموعہ۔ ان کے علاوہ دو اور فارسی دیوان بھی
لکھے ایک ناصر علی کے رنگ میں اور دوسرا جلال اسیر کے انداز میں یہ دونوں دیوان
چوری گئے۔ اب ان کا صرف ایک دیوان فارسی مرقع ہے جس کا ذکر سب کرہ نویسوں
نے کیا ہے۔ ایک تذکرہ فارسی شعر کا اور ایک اردو شعر کا فارسی زبان میں لکھا۔
شاہنامہ کا ایک حصہ بھی لکھا ہے جس میں شاہ عالم کے خاندان تک کے حالات درج ہیں۔

تذکرہ شعراء اردو
مصنفہ ۱۹۳۷ء

مصحفی کی شہرت زیادہ تر ان کے ضخیم اردو دیوانوں اور تذکرہ پر مبنی ہے۔ آٹھ اردو دیوان انکی یادگار ہیں جن میں ہزار ہا غزلیں قطعے قصائد وغیرہ سب کچھ موجود ہیں۔ تذکرہ شعراء اردو جو زبان فارسی میں ہے سنہ ۱۹۳۷ء میں ترتیب پایا۔ اور اب ملتا ہے۔ یہ نہایت مفید کتاب ہے اور اس میں تقریباً ساڑھے تین سو شعرا کا ذکر ہے جو محمد شاہ کے زمانہ سے لیکر مصنف کے زمانہ تک تھے انھوں نے اپنے معاصرین کا خصوصیت کے ساتھ مفصل ذکر کیا ہے اور کلام کے نمونے بھی دیے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تذکرہ ان کے شاگرد میر تحسن خلیق خلف میر حسن کی خاص فرمائش سے لکھا گیا تھا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ مصحفی کے آٹھوں دیوان اور دونوں تذکرے بھوپال میں کسی صاحب کے پاس موجود ہیں۔

خصوصیات کلام سب سے بڑی صفت مصحفی میں یہ تھی کہ وہ نہایت زود گو تھے۔ جب وہ شعر کہتے تھے اور قلمبند کرتے جاتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی کتاب سے نقل کر رہے ہیں۔ مشاعروں کے لیے بکثرت غزلیں کہہ رکھتے تھے۔ معمولی غزلیں خریداروں کے ہاتھ بیچ ڈالتے اور منتخب شعرا اپنے لئے رکھ لیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی زود گوئی یا پُر گوئی سے ان کے کلام میں ناہمواری پیدا ہو گئی کیونکہ پُر گوئی نے زیادہ جانکا ہی اور غور و فکر کا موقع نہیں دیا۔ دوسری خصوصیت انکی یہ ہے کہ وہ مسلم الثبوت جگت استاد تھے۔ اور بڑے بڑے استاد ان کے دہن بلند سے وابستہ تھے مثلاً میر تحسن خلیق ضمیر آتش۔ شہیدی عیشی وغیرہ۔ بلکہ اگر بیچ پوچھئے تو ان کے زمانہ کے بعد کے اکثر شعرا بالواسطہ یا بلا واسطہ انھیں کے

شاگرد تھے۔ نسخ کی نسبت مشہور ہے کہ اُن کو کسی سے فخر تلذ حاصل نہ تھا۔ مگر وہ بھی محمد علیؑ تہا کے ذریعہ سے جو مصحفی کے شاگرد رشید تھے، اسی مائدہ سخن کے ریزہ چین ثابت ہوتے ہیں جیسا کہ خود مصحفی نے اپنے چھٹے دیوان کے دیباچہ میں ان کی نسبت لکھا ہے اس سے بڑھ کر ثبوت مصحفی کے کمال فن کا کیا ہو سکتا ہے۔ کہ جتنے استاد اُن کے شاگردوں میں نیکلے اتنے اور کسی کو نصیب نہیں ہوئے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ قواعد نظم کے یہ نہایت سخت پابند رہے اور شکر گریہ کے عیب سے جو میر و سودا ایسے استادوں کے یہاں بھی پایا جاتا ہے، ان کا کلام پاک ہے۔ نسخ نے اور بھی اس اصلاح کے آئین کو درجہ تکمیل پر پہنچایا۔ مگر ان کے کلام میں رطب و یابس شامل ہونے کی وجہ سے جمواری نہیں ہے۔ کہیں میر تقی میر کا درد و گداز ہے۔ کہیں سودا کی بلند پروازی۔ کہیں نفاں کی رنگینی۔ کہیں میر سوز کی سادگی۔ کسی میں جرأت کی شوخی اور کہیں کہیں انشا کا بھی رنگ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا کلام اعلیٰ درجہ کا قدما کے رنگ کا بھی بہت ہے۔ مگر زیادہ تر غزلیں معمولی ہیں اور کسی خاص رنگ کی نہیں ہیں بعض غزلوں کی زمینیں سودا کے متبع میں نہایت سخت اور رویت و قافیہ مشکل رکھے گئے ہیں اور گو کہ ان میں شاعری کا کمال دکھایا ہے مگر پھر بھی سودا کا ساز اور استاد ی نہیں پائی جاتی۔ اگرچہ میر تقی اور میر سوز کے متبع میں بہت سے اشعار سادہ اور فصیح اور دردناک لہجہ میں کہے ہیں مگر پھر بھی مذکورہ بالا استادوں کی وہ بات کہاں مختصر یہ کہ غزل میں اُن کا کوئی خاص رنگ نہیں اور بعض اشعار کی عمدگی کو من اولہ الی آخرہ نباہ نہیں سکتے یہی حال اُن کے قصیدہ کا بھی ہے جن میں قواعد کی پابندی اور الفاظ و معانی کی بلندی تو

ضرور ہے مگر متقدمین کا زور اور شان و شکوہ پیدا نہیں ہو سکا۔ چند مثنویاں بھی لکھی ہیں جن میں ایک ”بحر المحبت“ میر کی مثنوی ”دریا سے عشق“ کے رنگ میں بلکہ اُنکی نقل پر قصہ کا مضمون اور طرز عبارت وغیرہ سب اُسی سے ملتے جلتے ہیں۔

مختصر یہ کہ مصحفی کے کلام میں کوئی خاص بات نہیں، وہ متقدمین کے پیرو تھے اور نہایت زود گو اور پُر گو تھے۔ مختلف اصناف سخن پر اُنھیں کمال حاصل تھا، ملکی خصوصیات اُن کے یہاں جرأت سے زیادہ اور انشا سے کم ہیں۔ نہ تخیل میں بلندی ہے نہ جذبات میں دلکشی ہے۔ الفاظ بھی بعض جگہ ایسے لکھ گئے ہیں جو اب متروک ہو گئے۔ زبان میں اکثر جگہ میرو سودا کی پیروی ہو گی کہ زمانہ انشا اور جرأت کا پایا تھا۔

مصحفی اور سید انشا کے معرکے مصحفی اور سید انشا کے معرکے نہایت مشہور ہیں جنہیں مختلف جموں اور مذاق و تسخر سے جو بسا اوقات فحش کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔ ہمت کا کم لیا گیا ہے۔ یہ واقعات نہایت تفصیل کے ساتھ آبجیات میں درج ہیں اگر کسی کو دیکھنا ہوں تو اس کتاب میں دیکھنا چاہیے یہاں بھی مختصر البصر اہل مشتے نمونہ از خروارے لکھے جاتے ہیں۔ ابتداً اس واقعہ کی یوں ہوئی کہ میرا مصحفی پہلے شہزادہ سلیمان شکوہ کے کلام پر اصلاح دیتے تھے جب سید انشا پہنچے تو اُن کے سامنے اُن کا رنگ کب جم سکتا تھا۔ چنانچہ اب غریب اُن کے پاس آنے لگیں جس سے مصحفی کو بڑا قلق ہوا اسی اثناء میں اُنکی ستخواہ بھی کم کردی گئی جس کے متعلق اُنھوں نے ایک قطعہ لکھ کر شہزادہ موصوف کو گزرا نا جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

چالیس برس کا ہی ہے چالیس کے لائق تھا مرد عمر کہیں دس بیس کے لائق
 لے لے کہ بچپن سے اب پانچ ہیں اپنے ہم بھی تھے کسی روز نہیں بچپن کے لائق
 استاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر ہوتا ہے جو در ماہ کہ سائیس کے لائق
 مشاعروں میں بھی ہم طرح غزلوں میں نوک جھوک ہوتی اور ایک دوسرے
 کا مذاق اڑایا جاتا مثلاً ایک جلسہ میں میاں مصحفی نے غزل پڑھی جس کا مقطع تھا :-
 تھا مصحفی یہ مائل گریہ کہ پس از مرگ تھی مکی دھرمی چشم پتہ نابوت میں انگلی
 اس شعر کو انشانے یا ان کے یار دوستوں نے اُلٹ دیا اور کہا
 تھا مصحفی کا نا جو چھپانے کو پس از مرگ رکھے ہوئے تھا آنکھ پتہ نابوت میں انگلی
 اسی زمانہ میں مصحفی نے ایک غزل کہی تھی جس کا یہ مطلع ہے -
 سرشک کا ہے تیرا تو کا فور کی گردن نے موسے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن
 اس غزل پر سید انشانے بہت سے اعتراض وارد کیے اور ایک قطعہ بھی نظم کیا -
 غزل کا مطلع ہے
 آوڑوں کا خیم بادۂ انکور کی گردن رکھ دو نگاہاں کاٹ کے اک حور کی گردن
 اور قطعہ اس طرح شروع کیا -
 سن لیجے گوش دل سے مری شفق ایہ عرض مانند بید غصہ سے مت تھر تھر ایسے
 بٹور گود درست ہو لیکن ضرور کیا خواہی خواہی اسکو غزل میں کھپائیے
 دستور و طور و نور یہ ہیں قافیہ بہت اسمیں جو چاہیے تو قصیدہ سنائیے
 کیا لطف ہے کہ گردن کا فور باندھ کر مرنے کی باس زندوں کو لا کر نگھائیے
 اسی قسم کے اور بہت سے اشعار ہیں جن میں مصحفی کے زبا بنداں ہونے پر اعتراض

کیا ہے مصحفی نے جواب الجواب اپنی غزل کی طرح میں دیا۔ اور انشا کی غزل میں
 جوان کے نزدیک قابل اعتراض باتیں تھیں ان پر اعتراض جمائے مثلاً
 لے آنکہ معارض ہو مری تیغ زباں سے تو نے سپرِ عذر میں مستور کی گردن
 ہے آدم خاکی کا بنا خاک کا پتلا گر نور کا سر ہو دے تو ہو نور کی گردن
 انگور کو شاعر تو نہ باندھیکا غزل میں کسو اسطے باندھے کوئی انگور کی گردن
 گردن تو صراحی کے لیے وضع ہونا داں بجائے خم بادہ انگور کی گردن
 اس مباحثہ اور مناظرہ کے بعد پھر تو وہ پھکڑ شروع ہوا جو دونوں
 آدمیوں کی تہذیب و متانت سے بہت دور تھا۔ فریقین کے شاگردوں نے
 اپنے اپنے استادوں کی تیج میں وہ طوفان اٹھائے کہ خدا کی پناہ۔ ایک دن
 میاں مصحفی کے سب شاگرد اکٹھا ہوئے شہدوں کا سوانگ بھرا اور ہجو کہہ کر
 اُس کے اشعار پڑھتے ہوئے سید انشا کے مکان کی طرف روانہ ہوئے۔ اور
 آمادہ تھے کہ مار پیٹ بلکہ کشت و خون سے بھی دریغ نہ کریں۔ سید انشا کو اسکی
 پہلے سے خبر ہو گئی تھی وہ نہایت متحمل اور سمجھدار آدمی تھے۔ بجائے ان لوگوں پر
 غصہ کرنے یا ان کا مقابلہ کرنے کے انھوں نے ان کی بہت خاطر مدارات کی
 ان کو مٹھائیاں کھلائیں۔ گلوریاں اور ہار پھول ان کے سامنے پیش کیے۔
 اور اپنی ہجو میں اپنے سامنے پڑھوا کر خود بھی بہت خوش ہوئے اور ان کو نہایت عزت
 و احترام سے رخصت کیا۔ مگر دوسرے دن جو جواب سید انشانے تیار کیا وہ
 غضب کا تھا۔ ایک پُر تکلف بارات کی نقل بنائی جس میں ایک مجمع کثیر شامل تھا
 اور لوگ ڈنڈوں پر کچھ اشعار پڑھتے ہوئے اور ایک گڈا اور ایک گڑیا ہاتھ میں

ہلاتے ہوئے جاتے تھے جس کا ایک شعر یہ ہے -

سواہگ نیا لایا ہے دیکھنا جہنم لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن
ان معرکوں میں نہ صرف معمولی لوگ بلکہ اُس زمانہ کے معزز شعراء لکھنؤ
سب شامل تھے اور اس پُر فتنہ مذاق سے لطف اٹھاتے تھے۔ اکثر امرانے
اور خاص کر مرزا سلیمان شکوہ نے سید انشا کا ساتھ دیا تھا جس سے مصحفی کو
بہت رنج ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اسی افسردہ دلی میں ایک غزل کہی جس کا
مطلع و مقطع یہ ہے -

جاتا ہوں تیرے در سے کہ توقیر نہیں یاں کچھ اسکے سوا اب مری تدبیر نہیں یاں
اے مصحفی بے لطف ہو اس شہر میں رہنا سچ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں
ادھر مرزا سلیمان شکوہ کو یہ شبہ پیدا ہوا تھا کہ اس شکوہ و شکایت
میں ہم پر بھی چوٹیں کی ہیں اور وہ ناراض ہو گئے تھے۔ مصحفی نے اس کی
معذرت میں ان کے حضور میں ایک قصیدہ پیش کیا جس کا مطلع ہے -

قسم بذات خدا نیک ہے سیمع و بصیر کہ مجھ سے حضرت شہر میں نہیں ہوئی تقصیر
اس میں مدوح کی عزت و شان اور اپنی بے حقیقتی کا مقابلہ کر کے کہتے ہیں
کہ یہ ناممکن ہے کہ یہ نمکخوار قدیم حضور کی نسبت کوئی بُرا لفظ کہے۔ یہ فقر اسب
انشاء کا بنایا ہوا ہے جس نے حضور کے مزاج کو مجھ سے منحرف کر دیا ہے -
اس قصیدہ میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی بریت اور سید انشا کی خطا ناہت
کی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ معرکہ بھی ہمیشہ شعرو شاعری ایک یادگار معرکہ ہے ہر چند
اس میں خلافت تہذیب لظہیں کہی گئیں مگر پھر بھی یہ بہت دلچسپ درس زمانہ کی

ایک خاص یادگار ہے۔

رنگین ۱۶۹ سالہ ۱۷۹۹ء
 سعادت یار خاں رنگین طہاسپ بیگ خاں تورانی کے
 فرزند ارجمند تھے۔ سرہند میں پیدا ہوئے ان کے والد توران سے اگرچہ دنوں
 لاہور میں حسین الملک میرمنو خاں کی سرکاری ملازم رہے۔ اس کے بعد لی گئے
 جہاں پیشگاہ سلطانی سے منصب ہفت ہزاری اور خطاب محکم الدولہ عطاء جنگ
 بہادر عنایت ہوا۔ رنگین نے شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت اختیار کر لی تھی
 وہ بہت اچھے شہسوار اور فنون سپہگری سے خوب واقف تھے۔ دکن میں نظام
 حیدر آباد کی فوج میں افسر توپ خانہ رہے۔ لیکن بعد کو نوکری چھوڑ کر گھوڑوں کی
 تجارت کرنے لگے۔ انشا کے وہ بڑے دوست تھے اور اکثر ان سے لکھنؤ میں
 ملا کرتے تھے اہل عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ اور سب سے پہلے شاہ حاتم کے
 شاگرد ہوئے۔ مشہور ہے کہ میر صاحب سے صلاح لینا چاہتے تھے مگر انھوں نے
 یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ تم امیر آدمی کے لڑکے ہو تم کو شاعری نہیں آسکتی تمہارے لئے
 شہسواری و ورزش وغیرہ مناسب ہے تم کو اس سے کیا واسطہ حاتم کے بعد وہ
 محمد ان نثار کو اپنا کلام دکھاتے تھے اور جرمن مستشرق بلوم ہارٹ کی تحقیق ہے
 کہ مصحفی سے بھی صلاح لیتے تھے۔ رنگین کو سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا اور نہایت
 عاشق مزاج واقع ہوئے تھے چونکہ امیر آدمی تھے حسین بھی تھے لہذا زندگی نہایت
 عیش و عشرت سے پریشوں کے جھگڑے میں گزارتے تھے۔ بے انتہا خلق متواضع
 اور مذہب آدمی تھے۔ ڈاکٹر سیرنگر اور کریم الدین کی تحقیقات کے بموجب اتنی برس
 کی عمر میں ۱۷۹۹ء میں فوت ہوئے۔ مگر شیفہ اور گارسن ڈیٹاسی اُن کی عمر کا سی

اور سن وفات بارہ سو پچاس بتاتے ہیں۔

تصانیف (۱) ”ثنوی دلپذیر“ جس میں تقریباً دو ہزار شعر ہوں گے اس میں شانہ زار

ماہ جبیں اور رانی سری نگر کا قصہ ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۱۳۳ھ ہے جیسا کہ جرات

اور انشا وغیرہ کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے۔

(۲) ”ایجاد رنگین“ یہ بھی ایک ثنوی ہے اس میں فحش قصے اور

دھپ چھپ حکایات ہیں۔

(۳) چار دیوان جن کے علیحدہ علیحدہ نام ”دیوان ریختہ“، ”دیوان

دیوان آئینہ“، ”دیوان آئینہ“ ہیں اور مجموعاً ان چار دیوانوں کا نام ”چار عنصر

رنگین“ ہے۔

(۴) ”ثنوی منظر العجائب یا غرائب المشہور“ اس میں بھی حکایتیں ہیں۔

(۵) ”مجالس رنگین“ یہ ان کی بہت مشہور تصنیف ہے اور اس میں اپنے

زمانے کے شعر کا حال لکھا ہے اور ان کے کلام کی تنقید بھی کی ہے۔

(۶) ”فرنامہ مصنفہ“ ۱۲۷۷ھ میں لکھوڑوں کی شناخت نیک و بد

اور ان کے علاج وغیرہ کا ذکر ہے۔ پہلا دیوان ۱۲۷۷ھ میں تیار ہوا تھا جیسا کہ

ایک تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ۲۷ صفحہ غزلیات ۲۲ صفحہ رباعیات

اور دو منظوم خط اور ایک قصیدہ ۶۰۰ شعروں کا ہے۔ دوسرا دیوان ۱۲۸۴ھ کا

غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہے تیسرے دیوان میں ان کے ہزلیات

شامل ہیں۔ اور اسی میں ایک قصیدہ شیطان کی تعریف میں ہے۔ چوتھا

دیوان نخی کا ہے۔ اس کے دیباچہ میں مصنف نے مستورات کے خاص خاص

محاورات اور عورتوں کی اصطلاحیں بیان کی ہیں اور نیز جہلن عورتوں کی جن کو وہ عروس شیطان لکھتا ہے بول چال درج ہے۔

ریختی سے کیا مطلب ہے
اور انکی ایجاد کے اسباب

ریختی کے طرز میں ایک قسم کی دھچپی ضرور ہے۔ مگر غربانی یہ ہے کہ انھیں اکثر غیر مہذب اور فحش آمیز اشارے ہوتے ہیں۔ نساخ کی رائے ہے کہ اس طرز خاص کے موجد میاں رنگین تھے۔

اور رنگین نے خود بھی یہ دعویٰ اپنی نسبت اپنے دیوان کے دیباچہ میں کیا ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ طرز قدیم شعرا علی الخصوص شعراے دکن میں بھی موجود تھا مثلاً مولانا ہاشمی بیجا پوری جو دکن کے ایک مشہور شاعر تھے اور مولانا قادری جو ولی کے ہم عصر تھے اور جن کا تخلص خاک تھا اور جن کا دیوان سلسلہ ہدیس مرتب ہوا ہے۔

ان لوگوں کے یہاں بھی ریختی کا پتہ چلتا ہے۔ مگر اتنا فرق ضرور ہے کہ ان قدیم شاعروں کی ریختی ایک خاص قسم کی تھی جسکی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ان کے کلام میں بھاشا کا زیادہ اثر ہے لہذا اسی کے تنبیغ میں اظہار عشق عورت کی جانب سے اور اسی کے الفاظ میں کرتے ہیں بخلاف معمولی اردو کے جس میں اظہار عشق عموماً مرد کی جانب سے ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس قسم کی ریختی میں فحش اور ابتذال مطلق

نہیں ہوتا۔ برخلاف انشا اور رنگین کے طرز کے جن کا دار و مدار عیاشی و شر ہو پستی پر ہے۔ ان کی غرض عموماً یہ ہوتی ہے کہ ایسا کلام پڑھ کر لوگوں کو ہنسی آئے یا ان کے نفسانی جذبات میں ہيجان پیدا ہو۔ اسی وجہ سے اس قسم کی نظموں میں خلوص اور بلند خیالی یہاں تک کہ بے ضرر ساوہ مذاق بھی نہیں ہوتا۔

یہ بات ضرور قابل غور ہے کہ ہمارے ملک میں عورتوں اور مردوں کی علیحدہ علیحدہ

زبان ہونے کے اسباب کیا ہیں۔ ان دونوں کی زبانوں میں صرف الفاظ و محاورات کا فرق ہوتا ہے بعض الفاظ و محاورے مستورات کے لیے مخصوص ہیں جن کو عام طور پر مرد نہیں استعمال کرتے۔ ہمارے نزدیک اس خصوصیت اور فرق کی بڑی وجہ پردہ ہے جس سے اس ملک کی شریف گھرانے کی عورتیں غیر مردوں کے سامنے نہیں آسکتیں اور ان کے ساتھ بے تکلفی سے نہیں مل سکتیں اکثر پڑنے خیال کے لوگوں میں تو پردہ کے بارہ میں یہاں تک سختی ہے کہ عورتیں اپنے غیر محرم رشتہ داروں تک سے پردہ کرتی ہیں پس ایسی قید کی صورت میں لازم ہوا کہ عورتیں اپنے واسطے کچھ خاص اصطلاحیں اور محاورے مخصوص کر لیں۔ مثلاً مرد و چو نہ کہ آزاد تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ لہذا وہ دوسری زبان کے الفاظ بے تکلف بولنے لگتے ہیں۔ عورتیں برعکس اسکے اپنے پردہ اور عدم تعلیم کی وجہ سے اپنی خالص زبان کی پابند رہتی ہیں۔ اور اسکی صحت اور بے میل رہنے کی حفاظت کرتی رہتی ہیں۔ پھر چونکہ عورتوں کے مزاج میں فطرتاً قدامت پسندی اور تنفیہ نا آشنائی ہوتی ہے اس وجہ سے دوسری زبان کے ثقیل اور کدھب الفاظ ان کو پسند نہیں آسکتے۔ مزید برآں ان میں چونکہ قدرتا شرم و حیا اور ضعیف الاعتقادی ہوتی ہے ایسے الفاظ ان کو ایک رمز و کنایہ سے اور خاص طریقہ سے وضع کرنا پڑتے ہیں جن کے نام لینے میں ان کو شرم و حیا مانع ہو یا وہم و غور دامگیر ہو۔ یہ تخصیص اصطلاحات و محاورات ظاہر ہے کہ ان گھرانوں میں بہت زیادہ ہے جہاں پردہ کی زیادہ سختی سے پابندی ہوتی ہے۔ اس فرق مذکورہ بالا سے آلتا اور رنگین نے اپنی خاص اغراض کے لیے

فائدہ اٹھایا اور اپنی نوابیجا دطرز کا وار و مدار سی مخصوص عورتوں کی زبان اور نیز عیاشی اور بد اخلاقی پر رکھا۔

ریختی اس زمانہ کی بگڑی ہوئی سوسائٹی کا بہترین آئینہ ہے جبکہ لکھنؤ کے عیش پسند فرمائرواؤں اور امرا کی محفلوں میں عیش و عشرت و حسن پرستی کا بازار گرم تھا اور بازاری عورتوں کا عشق داخل فیشن ہو گیا تھا۔ شہر کے نوجوان امرا اس قسم کی بے اعتدالیوں سے متنبہ ہونے کے بجائے ان کو کھلم کھلا اور بلا خوف و لوم لائم عمل میں لاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ کی نظم بھی ان کے جذبات اور ان کے مذاق کا آئینہ ہونا چاہیے۔ مگر حقیقت میں اس قسم کی ناشائستہ اور غیر مذہب انظمیں نہایت ہی مخرب اخلاق اور نوجوانوں کے حق میں سم قاتل ہیں چنانچہ خود انشا نے بھی اس قسم کے فواحش کے بُرے اثر کا ذکر ایک جگہ اپنے دریائے لطافت میں کیا ہے۔ بہر طور یہ طرز اس زمانہ میں بہت مقبول تھا اور ٹکی ترقی کی معراج میر یار علی المتخلص بہ جان صاحب کے زمانہ میں ہوئی۔ جان صاحب میلتن کے بیٹے اور نواب عاشور علی خاں کے شاگرد تھے۔ وطن اصلی لکھنؤ تھا مگر آخر عمر میں بسبب ملازمت زیادہ تر رامپور میں رہے۔ جان صاحب نے اپنی تمام عمر اسی خاص صنف میں بسر کر دی اور اپنی خاص روش میں خوب کہتے تھے۔ مشاعروں میں زمانہ لباس سے شریک ہوتے اور بالکل عورتوں کے طریقہ سے پڑھتے جس سے سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے۔ شکستہ ام میں وہ دلی گئے تھے اور وہاں سے تہلاش روزگار بھوپال آئے مگر ناکام رہے آخر کار رامپور میں نواب کلب علی خاں کے دامن دولت سے وابستہ ہو گئے اور یہیں رامپور

میں کچھ اوپر سرسبز کے سن میں عیشہ میں انتقال کیا۔

غرض کہ یہ صنف شاعری اب مقبول نہیں ہے اور مہذب جلسوں میں اس کو کوئی پسند نہیں کرتا البتہ مذاق و ظرافت کے وہ اشعار جو دائرہ تہذیب سے خارج نہوں عام طریقہ سے پسند کیے جاتے ہیں۔

آخر زمانہ کے شاہانِ دہلی شعرا کے مرہبی بھی تھے اور خود بھی اچھے خاصے شاعر تھے مثلاً شاہ عالم ثانی جو آفتاب تخلص کرتے تھے ایک مثنوی موسوم بہ "مضمون اقدس" کے مصنف ہیں۔

شاعر شاہانِ دہلی
شاہ عالم ثانی
سلطنتِ اسلامیہ

جس میں ایک فرضی افسانہ مظفر شاہ بادشاہ چین کا ہی مثنوی کا تاریخی نام ہے جس سے ۲۰۱۱ نکلتے ہیں۔ اس مثنوی کے علاوہ ان کا ایک دیوان غزلوں کا ۲۴۴ صفحات کا ہے وہ فارسی بھی کہتے تھے چنانچہ ان کا فارسی دیوان بھی موجود ہے اور وہ قصیدہ جس میں مکرم غلام قادر کے ظلم و ستم کا اور اپنی آنکھیں نکالے جانیکا ذکر کیا ہے بہت ہی دردناک ہے۔ بڑے بڑے شاعر مثلاً سودا، میر، نصیر، اعظم، انشا، زار، ممنون، احسان، اور فراق وغیرہ یہ سب انکی سرکار کے دعاگو تھے۔

شاہ عالم ثانی کے تیسرے بیٹے تھے۔ غلام قادر کی لغات کے بعد دہلی کی سکونت چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے اور مثل اپنے برادر بزرگ مرزا جواں بخت بہادر ولی عہد کے وہیں رہنے لگے۔ نواب آصف اللہ بہادر نے آخر اجماع کے لیے چھ ہزار ماہوار مقرر کر دیے تھے۔ نواب سعادت علی خاں اور

مرزا سلیمان سکوہ
متخلص سلیمان

غازی الدین حیدر نے ان کے جھک کر ملتے تھے اور زندیں دیتے تھے جب
غازی الدین حیدر نے تاج شاہی پہنا تو ملاقات بدھ مساوات چاہی شاہزادہ نے
باقضائے مصلحت وقت مرزا ضیاء الدین حیدر ولی عہد سلطنت کے ساتھ اپنی
بیٹی کی شادی کر دی جنہوں نے سلطان ہو کا خطاب پایا مگر شوہر و بیوی میں
ناموافقیت رہی۔ ۳۸ سال لکھنؤ میں رہ کر کاسکینچ اپنے پرانے دوست کرنل گڈنر
کے پاس چلے گئے بعد کو اکبر آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانے
میں کئی بار دہلی آئے ۸۳ء میں انتقال کیا اور سکندرہ میں مدفون ہوئے
شعر کے بہت بڑے سرپرست تھے۔ خود بھی اچھے خاصے شاعر صاحب دیوان ہیں۔
ابتداء میں شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے اسکے بعد مصحفی اور انشا کو کلام دکھایا۔ دہلی سے
جواکمال لکھنؤ جاتا پہلے ان کے یہاں حاضر ہوتا اور صاحب عالم بھی الطاف
امیرانہ سے پیش آتے لکھنؤ میں مشاعرے کرتے مصحفی قاتل انشا میر حسن سب
اسی سرکار کے دعا گو تھے۔ ان کا قلمی دیوان لالہ سری رام صاحب مصنف نخب خانہ جوا
کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

اکبر شاہ ثانی
۶۱۸۳ھ تا ۶۱۸۶ھ
ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی حضرت شاہ عالم
ثانی کے دوسرے بیٹے تھے ۹۵ء میں پیدا ہوئے۔
۹۷ء میں تخت سلطنت پر بیٹھے اور ۱۰۳ء میں انتقال کیا ظفر نے
ساری سچ کہی

پے سال وفات گفت ظفر عرش آرام گاہ عالی متر
موزوں طبع تھے۔ اپنے باپ کے تخلص "آفتاب" کی رعایت سے شعاع تخلص کرتے تھے

فکر سخن کی طرف توجہ کم تھی لیکن شعر کی بڑی قدر کرتے تھے میر نظام الدین ممنون غالب علی خاں سید شاہ نصیر وغیرہ ان کے دربار کے شاعر تھے۔

خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار مرزا ابوالنظر سراج الدین محمد بہادر شاہ اکبر شاہ ثانی کے بیٹے تھے۔ ولادت ۱۰۳۵ھ میں ہوئی اور باپ کے

بہادر شاہ ثانی

مختصر بنظر

مرنے کے بعد ۱۰۳۵ھ میں تخت پر بیٹھے اور غدر کے بعد ۱۰۳۵ھ میں معزول ہو کر ملک برہما میں جلاوطن کئے گئے جہاں ۱۰۳۵ھ میں انتقال کیا۔ بہادر شاہ شاعری کے بڑے دلدادہ تھے اور اکثر اپنا وقت اُس میں صرف کرتے تھے۔ چونکہ سلطنت کا کام کاج کچھ نہیں تھا زیادہ تر وقت شعر گوئی میں گزرتا تھا۔ اُستاد ذوق اور مرزا غالب کو کلام دکھاتے تھے۔ مگر قبل اس کے شاہ نصیر سے بھی استفادہ سخن کیا تھا۔ شاعری کے علاوہ فن موسیقی میں بھی ان کو اچھا دخل تھا انکی اکثر ٹھمراں شمالی ہند میں بہت مقبول ہوئیں۔ خوشنویس بھی بہت اچھے تھے۔ اور اکثر اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن شریف دلی کی بڑی مسجدوں میں بطور ہدیہ کے بھیجتے تھے۔ انھوں نے ایک شرح گلستاں بھی لکھی جو ایک اچھی کتاب سمجھی جاتی ہے مگر انکی شہرت کی اصلی بنا ان کے ضخیم کلیات پر ہے جو بہت مشہور ہے چار دیوان ان کے شائع ہو چکے ہیں ان کو لوگ بہت شوق سے پڑھتے ہیں انکی غزلیں اس قدر مقبول ہیں کہ اکثر ناز رنگ کے جلسوں میں گائی جاتی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کے اُستاد ذوق اور غالب ان کو غزلیں کہہ کر دے دیتے تھے۔ اور آہیں شک نہیں کہ ظفر کی بعض غزلوں میں ان دونوں اُستادوں کا رنگ پایا جاتا ہے مگر پھر بھی ظفر کے خود شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں کیونکہ انکی بہت سی غزلیں

اُن کے خاص رنگ کی ہیں جو ذوق وغالب سے بالکل علیحدہ ہے معلوم نہیں کہ ظفر نے سجات قید بھی مشغلہ شعرو شاعری جاری کھا تھا یا نہیں اغلب ہو کہ یہ پچسپ مشغلہ اُن سے نہ چھوٹا ہوا اور کچھ اُن کا اُس زمانہ کا بھی کلام موجود ہو کیا تعجب ہے کہ سعی و تلاش اس معاملہ میں آئندہ کامیاب ہو۔

ان کا طرز کلام بہت صاف اور سادہ ہے۔ کلام بہت مزیدار سلیس اور فصیح ہوتا ہے اور ایک خاص درد و اثر رکھتا ہے جو اُن کے مصائب کی اصلی تصویر ہے۔ ظفر اکثر جگہ مشکل مشکل بحر میں اور سخت ردیف و قافیہ میں بھی غزلیں کہتے تھے۔ جو بہت کچھ قابل تعریف ہیں۔ ان کے خیالات بلند اور تشبیہیں نگین اور جذبات دلنشین ہوتے ہیں۔

اس دور میں مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ اور بھی شعرا گزرے ہیں جو اگرچہ اس پایہ کے نہ تھے مگر پھر بھی مشاہیر میں اُن کا شمار کیا جاتا ہے۔ مثلاً قائم۔ قاسم۔ حسرت۔ منت۔ ممنون وغیرہ۔ ان کے علاوہ بعض شعراے دور سابق کا بھی کچھ حال جو گذشتہ باب میں رہ گیا تھا مختصر یہاں درج کیا جاتا ہے۔

قائم چاند پوری شیخ قیام الدین نام تھا بڑے اعلیٰ درجہ کے شاعر خاص کر قطعات اور رباعیات میں ید طولی رکھتے تھے۔ چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ مگر ملازمت کے تعلق سے زیادہ حصہ دہلی میں بسر ہوا جہاں وہ داروغہ توپخانہ تھے۔ شروع میں اپنا کلام خواجہ میر درد کو دکھاتے تھے۔ بعد کو سودا کے شاگرد ہو گئے۔ انھوں نے ایک تذکرہ بھی لکھا ہے جو کیا اب ہے۔ دلی کی تباہی کے بعد وہ ٹانڈہ (قریب آنولہ) میں نواب محمد یار خاں کی رفاقت میں رہتے تھے۔

اسکے بعد رامپور گئے جہاں سالہ ۱۲ھ میں انتقال کیا۔ انکی نسبت مصحفی لکھتے ہیں
 ”درختگی کلام حسی مصراع غزل و ردیہ قصیدہ و ثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ
 دوش بدوش استاد راہ می رفت در بعضی مقام رحجان می جست“ اور مرزا علی لطف
 اپنے تذکرہ گلشن ہند میں یوں رقمطراز ہیں ”مضمون تراشی اور معنی بندی میں معروف
 سیج تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی رخیہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے۔
 راقم آٹم کو تو طور گویائی اس سخن آفریں کا نہایت مرغوب ہے۔“

منت میر قمر الدین منت دلی کے رہنے والے ننھیالی رشتے سے سید جلال
 بخاری کی اولاد سے تھے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سایہ عاطفت
 میں دلی میں پرورش پائی۔ روحانی تعلیم مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل
 کی اور مشورہ شعرو سخن میر نور الدین نوید اور میر شمس الدین فقیر سے کرتے تھے بہت
 پُر گو شاعر تھے۔ ایک کلیات تھمینا ڈیڑھ لاکھ اشعار کا اپنی یادگار چھوڑا۔ متعدد
 مثنویاں تصنیف کیں جن میں سے ایک شکرستان ہے جو شیخ سعدی کی گلستان کے
 جواب میں لکھی ہے چنانچہ فرماتے ہیں ۵

درین عمرہ ثنوی گفتہ ام	بہ آئین طرز نوی گفتہ ام
چو اشعار من در عدد میرسد	شمار قصائد بصد میرسد
بود شعر من در غزل ہی ہزار	ز اقصاء رباعی گرفتہ شمار

دلی چھوڑ کر ۱۹۱۱ھ میں لکھنؤ آئے۔ یہاں مسٹر جانشن سے ملاقات ہوئی
 جو ان کو کلمتہ لے گئے اور مارکوس آف ہٹنگز کے روبرو ان کو پیش کیا۔
 لارڈ موصوف نے خطاب ملک الشعرائی ان کو عنایت کیا۔ ان کی طرح میں انکے

اکثر قصائد ہیں مسئلہ ۱۲ھ میں گورنر جنرل نے ایک خاص سفارت پر انکو حیدر آباد بھیجا وہاں پہنچ کر حضور نظام کی مع میں انھوں نے قصیدہ پیش کیا جس کے صلیب میں بہت انعام و اکرام پایا۔ بعد واپسی حیدر آباد عظیم آباد میں مہاراجہ ٹیکٹ رائے کی مصاحبت میں چند دنوں رہ کر پھر کلکتہ کا رخ کیا جہاں پہنچتے ہی مسئلہ ۱۲ھ میں سفر آخرت اختیار کیا۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

اس آنے کا کچھ ہے لطف پیارے ہر دم جو کہو کہ جائیں گے ہم

دلہ

آہ اب کثرت داغ غم غواں سے دم صفحہ سینہ پر از جلوہ طاؤسی ہے

دلہ

گر اس لب جان بخش کی کچھ بات سناؤں عیسیٰ بھی جو کچھ پوچھے تو صلوٰۃ سناؤں

ممنون میر نظام الدین ممنون خلف میر قمر الدین منت۔ ان کے آبا و اجداد سوئی پت کے رہنے والے تھے مگر ان کی ولادت دلی میں ہوئی۔ اور وہیں نشوونما پایا۔ اکبر شاہ ثانی نے ان کو فخر الشعرا کا خطاب عطا کیا اور اکثر لوگ ان کے سلسلہ تلمذ میں داخل ہو گئے۔

کچھ دنوں یہ اجمیر میں کجیثیت صدر الصدور کے رہے تھے مگر پھر دلی آ گئے جہاں مسئلہ ۱۲ھ میں انتقال کیا خود بھی اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اور شاگرد بھی نامی و گرامی چھوڑے مثلاً مفتی صدر الدین خاں آزرہ وغیرہ ان کا دیوان کیا اب ہے اُس کے دیکھنے سے اُنکی قادر الکلامی کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

صرت دہلوی مرزا جعفر علی نام حسرت تخلص ابوالخیر عطار کے بیٹے تھے۔

دل میں پیدا ہوئے اور ابتداء عطاری کا پیشہ کرتے تھے شعر سے اُن کو فطری
 ذوق تھا اور اس فن میں اُنھوں نے کمال حاصل کیا جب شاہ عالم ثانی
 سر پر آئے سلطنت ہوئے تو حسرت بھی اور شعر کے ساتھ دامن دولت سے
 وابستہ ہو گئے۔ جب نمک حرام غلام قادر نے بد نصیب بادشاہ کی آنکھیں نکالیں اور
 اسی قسم کی دوسری زیادتیاں کر کے لوٹ مار و بیگیاں شاہی کی بھیمتی وغیرہ کا
 ہنگامہ برپا کیا۔ تو اس عبرتناک منظر کو اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا
 چنانچہ اسی قیامت خیز واقعہ کی نسبت اُن کی ایک درد انگیز نظم ہے۔ حسرت
 دلی چھوڑ کر فیض آباد آئے جو اُس وقت اودھ کا دار السلطنت تھا۔ اپنے سفر کے
 مصائب اور حالات کے بیان میں اُنھوں نے ایک دلچسپ نظم لکھی جو ہمیں
 سفر کی تکلیفیں، دھوپ کی شدت، پانی کی قلت، سست و گاڑی کی مصیبت
 وغیرہ وغیرہ نہایت تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ فیض آباد پہنچ کر اُنھوں نے
 نواب کے سامنے اپنا قصیدہ پڑھا اور اس کے صلے میں کچھ وظیفہ مقرر ہو گیا
 جب شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ نواب ہوئے تو حسرت نے انکی تہنیت
 میں ایک دوسرا قصیدہ کہہ کر اُن کے سامنے پڑھا۔ ۱۱۹۵ھ میں جب لکھنؤ دار السلطنت
 ہوا تو حسرت بھی اپنے دوستوں کے اصرار سے لکھنؤ آ گئے اور یہاں گھنٹا بیگ
 کی گڑھیا پر قیام تھا۔ شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کے قیام لکھنؤ کے زمانہ میں
 حسرت کے شاگرد رشید میاں حبرأت بھی اپنے استاد کے پاس رہنے لگے۔
 اور یہ دونوں شاگرد و استاد لکھنؤ کے مشاعروں میں شریک ہو کر اپنی پرکھت
 غزلوں پر سامعین سے خراج تحسین وصول کرتے تھے حسرت سب سے پہلے

مرزا حسن علی خاں بہادر کی رفاقت میں تھے اُس کے بعد پرنس جہاندار شاہ کے ملازم ہو گئے مشہور ہے کہ یہ بالگی میں سوار ہوتے تھے جو امر کے لیے مخصوص تھی۔ اس سے ان کے ہم پیشہ ساتھیوں کو بہت رشک ہوا اور انھوں نے ان کے چڑھانے کے لیے بہت سی جہیزیں کمیں اور مسخر کے اشعار لکھے۔ سودا نے بھی اسیں حصہ لیا خود حسرت نے ایک لکھنؤ کے حکیم کی جو لکھی ہے جس میں اُس کے پیشہ اور قابلیت پر حملہ کیا ہے اُن کو شاہزادہ سیماں شکوہ بھی کچھ درابہ دیتے تھے۔ وہ رے سرب منگھ دیوانہ کے شاگرد تھے اور خود ان کے بھی شاگرد کثرت تھے چنانچہ میر حسن تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ”کثرت شاگردانش چنان ست کہ در صورت شناسی خود ہم حیران ست۔“ ان سب میں حرأت اور نواب محبت خاں محبت بہت نامور شاعر ہوئے ہیں۔ مشہور ہے کہ وفات ۱۲۱۷ھ میں ہوئی اور لکھنؤ میں مدفون ہوئے تصنیفات میں ایک کلیات ہے جس میں ساتی نامہ، ثنوی، واسوخت، ترجیع بند، ترکیب بند، مسدس، مخمس، قصیدے، رباعیاں، اور دو دیوان غزلوں کے ہیں۔ غرض کہ صناعت سخن میں ہر قسم کے نمونے اُس میں پائے جاتے ہیں۔ خاص انداز یہ بھی ہے کہ وہ غزل کو اکثر قطعہ پر ختم کرتے ہیں اور اکثر مسلسل غزل ایک ہی مضمون پر لکھتے ہیں۔

قدرت شاہ قدرت اللہ قدرت میثم الدین فقیر کے برادر عمنز او تھے اور کوئی عجب نہیں کہ اُن کے شاگرد بھی ہوں۔ نسخا اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ مرزا مظہر جانجانا اور جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ ۱۲۷۰ھ میں مرشد آباد میں انتقال کیا۔ تیسرا اُن کی نسبت کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے اور اُن کو ”عاجز سخن“ لکھا ہے مگر میر حسن نے اُن کے کلام کی بہت تعریف کی ہے لکھتے ہیں ”سمند نظمیں در میدان فارسی و ہندی

ہیالاک و حسرت و تصویرِ منظرِ معاش در استخوان بندی الفاظِ درست بندہ ویرا
ایک بار در مشاعرہ لکھنؤ دیدہ ام، اسی طرح مرزا علی لطف بھی اُن کے بہت مداح
ہیں چند اشعار بطور نمونہ ہدیہ ناظرین ہیں ۵

ہنگامہ پر ہیز و رعب اب بسر آیا لے بادہ کشوثرہ کہ پھر ابر تر آیا
کچھ دیر ہوئی اشک نہیں آنکھوں سے گرتے شاید تیرے مڑگاں کوئی نخت جگر آیا

ولہ

مجھ کو غفلت نے خبر ایامِ فرصت کی نہ دی آہ جب جاتے ہے دن تب میں کھپتے لگا

ولہ

سینہ اُس کا ہر دل اُس کا ہی جگر اُس کا ہی تیرے بیدار جدھر رخ کرے گھر اُس کا ہی

ولہ

ایک ہی پردے کے گر تھوڑے سب ہیں الپ گرو صدے چنگ ہی یا نعمتِ نا قوس ہے
صبرِ طاقت تو کبھی کے کوچیاں سے کر گئے اب دواعِ ننگ ہو اور خصیتِ موس ہے
کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے کیا ہی ملکِ موم ہو کیا سرزمینِ دس ہے
گر تیرے ہو تو کس عشرت سے کیجئے زندگی اس طرف آوازِ طبل اور دھڑکاؤں سے
صبح سے تا شام چلتا ہوں گلگوں کا دور شب ہوئی تو ماہر ویوں سے کنارہ بوس ہے
مسنے ہی عبرت یہ بولی اک تاشہ میں تجھے چل دکھاؤں کیا تو اپنی آرزو کا محبوس ہے
لیگئی کبارگی گور غریباں کی طرف جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے
مرفقیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیا کوس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و کمندِ دنیا سے آج کچھ بھی ان کے ہاتھ غیر از حسرتِ مایوس ہے

کل تو قدرت پائے خم رکھتے تھے تسبیح ریا
آج رہن جام سے یہ فرقہ سالوس ہے

بیدار میر محمد علی عرف میر محمد می تخلص بہ بیدار خواجہ میر درد کے دوست اور
شاگرد بھی تھے۔ فارسی میں مرضی قلی خاں فراق سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ کہا جاتا
ہے کہ شاہ حاتم کو بھی کلام دکھایا تھا۔ مولانا فخر الدین علیہ الرحمۃ کے مریدوں میں
تھے۔ آخر عمر میں دلی سے آگرہ چلے گئے جہاں ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء میں
انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ میر و مرزا کے ہم عصر تھے۔ دودویان اپنی یادگار
چھوڑے۔ ان کے کلام میں صفائی کے ساتھ تصوف کا رنگ بھی اچھا خاصہ
ہے۔ دو چار شعر نمونہ کے دیے جاتے ہیں۔

ہم خاک بھی ہو گئے ولیکن جی سے نہ ترے غبار نکلا

ولہ

تیرے رخسار و قد و حیم کے ہیں عاشق زار گل جُدا، سرو جُدا، نرگس بیمار جُدا

ولہ

بیدار راہ عشق کسی سے نہ طے ہوئی صحرائیں قیس کوہ میں فرما درہ گیا

ولہ

بچھوڑ کر کوئے بتاں جاتا ہے تو کعبہ کو جلد پھر پوچھے بیدار خدا کو سونپا

ولہ

رابطہ جو چاہیے بیدار سوا اُس سے معلوم مگر اتنا کہ ملاقات چلی جاتی ہے

ہدایت ہدایت اللہ خاں دہلوی خواجہ میر درد کے مریدوں اور شاگردوں میں تھے ۱۲۷ھ میں انتقال کیا صاحب دیوان ہیں۔ اور بقول مرزا علی لطف ایک شنوی بنارس کی تعریف میں بھی خوب لکھی ہے میر تقی میر اور میر حسن دونوں ان کے کمالات شاعری کے معرفت ہیں۔

فراق حکیم نثار اللہ خاں متخلص بہ فراق ہدایت اللہ خاں ہدایت مذکور بالا کے بھتیجے تھے کسب سخن اور کسب باطن خواجہ میر درد سے کرتے تھے میثا میر عصر میں سے تھے اور دلی کے بہت نامور حکیم سمجھے جاتے تھے مصحفی اور میر حسن نے ان کا ذکر خیر بہت اچھے لفظوں میں کیا ہے۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ میرے سامنے انھوں نے تحصیل طب کی اور جب میں شاہجہاں آباد میں تھا تو مجھ سے اور ان سے مراسم دوستی و محبت بہت تھے۔

ضیا میر ضیا الدین ضیاء دہلوی سودا کے معاصر تھے۔ دلی سے فیض آباد اور لکھنؤ آئے اور یہاں سے عظیم آباد گئے جہاں مہاراجہ شتاب رائے کے بیٹے راجہ بہادر متخلص بہ راجہ ان کے شاگرد ہو گئے پٹنہ ہی میں انتقال کیا میر حسن اور مرزا علی لطف ان کے کلام کے معرفت ہیں اور آخر الذکر اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "اکثر شعر درین سنگلاخ گفتن والفاظ نامعقول را مقبول دہما ساختن کار اوست" میر حسن بتدبیر انھیں کے شاگرد تھے ان کو قصیدے اور شنوی وغیرہ سے شوق نہ تھا صرف غزل کو پسند کرتے تھے جیسا کہ میر حسن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے سنگلاخ زمینوں میں کہنے کا شوق تھا نمونہ کلام یہ ہے۔

رسوایوں کی اپنے مجھے کچھ ہوس نہیں
ناصح پہ کیا کروں کہ مراد دل پہیں نہیں

کسی دشمن کی بھی یارٹ گزرتے ٹرچیا کی کی
کہ جیسے اُس سے میرے وصل کا اکرن گزرتا ہے
دلہ بات منہ پر آ رہی ہو اور لب ہلانا منع ہے

دلہ

اے آہ بچ نکل نہ کہیں دل تھکت پڑے
یہ جام بھر رہا ہے مبادا چھلک پڑے
کون سے زخم کا کھلا ٹامکا
دلہ آج پھر دل میں درد ہوتا ہے
صاف تھا جب تک تو ہم کو بھی جواب صاف تھا

اب جو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگا

کل کی رسوائی تجھے کچھ کم نہ تھی اے ننگ خلق

اُس کے کوچہ میں ضیا تو آج پھر جانے لگا

بقا شیخ بقا، اللہ اکبر آبادی حافظ لطف اللہ خوشنویس کے بیٹے تھے دلی میں
پیدا ہوئے مگر لکھنؤ میں توطن اختیار کیا۔ فارسی میں مرزا فاخر مکین اور اردو میں
شاہ حاتم اور خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ فارسی میں خزین اور اردو میں بقا
تخلص کرتے تھے۔ جو اپنے استاد شاہ حاتم کے کہنے سے رکھا تھا۔ میر و سودا
دونوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور ان دونوں سے اور ان سے اکثر جوڑیں چلتی
تھیں چنانچہ جب ان کے دو آہ کا مضمون میر صاحب نے بھی! اندھا تو انھوں نے
جل کر کہا

میر نے گر تر مضمون دو آہ کا لیا
اے بقا تو بھی دُعا دے جو دعا دینی ہو
یا خدا میر کی آنکھوں کو دو آہ کر دے
اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تر بینی ہو
اک اور موقع پر میر صاحب کی اس طرح خبر لیتے ہیں

بگڑی اپنی سنبھالے گا میر اورستی نہیں یہ دیتی ہے
ایک جگہ میرومرزا کی شاعری کا فرق اپنے مذاق اور ٹھٹھول میں اس طرح
دکھایا ہے

میر و مرزا کی شعر خوانی نے بسکہ عالم میں ہوم ڈالی تھی
کھول دیوان دونوں صاحب کے لے بقا ہم نے جب یارت کی
کچھ نہ پایا سولے اس کے سخن ایک تو تو کہے ہے اک ہی ہی
یعنی ایک کے کلام میں روکھی بھیک کی اخلاق آموزی ہے اور دوسرے کے یہاں محض
ظرافت و تسخر۔ مفلسی سے تنگ آکر تسخیر کو اکب کے اعمال کا شوق کیا تھا اُسے
اُن کا دماغ خراب ہو گیا آخر کار ہر طرف سے مجبور ہو کر سلسلہ اہ میں عتبات عالیات
کی زیارت کو چلے مگر راستے ہی میں انتقال کیا۔ اپنے زمانہ کے مشہور شاعروں میں
تھے صاحب دیوان ہیں۔

حزین میر محمد باقر حزیں مرزا مظہر جانجاناں کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔
بزرگ استاد سے بہت حسن عقیدت اور محبت رکھتے تھے چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں
جس طرح جی چاہتا ہی ہوں نہیں سکتی حزیں حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا
مصائب روزگار سے تنگ آکر دیتی سے پٹنہ عظیم آباد پہنچے۔ وہاں فاضل جنگ
نے ان کی بڑی قدردانی کی۔ ایک دیوان یادگار ہے جس میں قصائد اور غزلیں دیفاتار
موجود ہیں دو تین شعر بطور نمونہ کے یہاں دیے جاتے ہیں۔

کچھ کہا شاید اُس نے قاصد سے دل میں میرے ہر خطر نہیں
حال لے قاصد مرا جو کچھ کہہ تو جاتا ہو کچھ اس طرح سے اُس سے مت کہو کہ وہ محبوب

ہر نصیحت میں ہی نو نگاہ و ناصح پر ایک دہروں کے دیکھنے میں جی مڑنا چاہیے
 [بیان] خواجہ حسن اللہ کشمیری النسل تھے اور دہلی میں پیدا ہوئے مرزا مظہر جانجانا
 کے شاگرد اور مولانا فخر الدین کے مرید تھے آخر عمر میں حیدر آباد گئے اور نو ایک صنفِ
 ثانی کی ملازمت میں زندگی عزت سے بسر کی سالہا میں وفات پائی اور حیدر آباد ہی
 میں مدفون ہوئے ان کی وفات کی تاریخ ہے ”اُستاد از جہاں رفت“ میر حسن اپنے
 تذکرہ میں ان کے بڑے معروف ہیں لکھتے ہیں ”شاعر عذب البیان از خوش گویان
 زمان خواجہ حسن اللہ متخلص بہ بیان از تلامذہ مرزا مظہر جانجانا زرتیج نامہ
 از مشہور ست بسیار خوب گفتہ رباعیات دلپذیر دارد“ نمونہ کلام یہ ہے -
 کوئی کسی کا بیان آشنا نہیں دیکھا سولے اسکے ان آنکھوں نے کیا نہیں دیکھا
 مصلحت ترک عشق ہے ناصح لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا
 کہتا نہیں میں عرش پاؤں مالہ جا پہنچ کانوں تلک تو اسکے تو اسرار سا پہنچ
 عرش تک جاتی تھی اب لب تک بھی آسکتی نہیں
 رحم آتا ہے تبیان اب مجھ کو اپنی آہ پر
 صاف مُنہ پر میں نہیں کہتا کہ ہوگا اس کے پاس
 ورنہ کیا واقف نہیں میں دل ہے میر جس کے پاس
 کافر ہوں گرز یادہ کچھ اس سے آرزو ہو اُن بخیل مکاں ہو بس میں ہوں اور تو ہو
 وصل کی شب کا ماجرا کیا کہوں تم سے ہشیر فام سے لیکے صبح تک ہی نہیں نہیں ہی
 بیان کون ہے اب تلک پوچھتے ہو تغافل کے قربان تجاہل کے صدقے
 جاد و جھٹی کہ سحر جھٹی بلا جھٹی ظالم یہ تری نگاہ کیا جھٹی

[راسخ] شیخ غلام علی راسخ شاگرد میر سلیمان علیہ السلام میں بیٹے عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔
 شروع میں مرزا قدوی اور مرزا اختر کو کلام دکھاتے تھے مگر آخر میں باقاعدہ طور پر
 میر تقی میر کے شاگرد ہو گئے تھے اور میر صاحب ان کا بڑا خیال کرتے تھے۔
 ۱۲۲۱ھ تک کلکتہ، غازی پور، دہلی، لکھنؤ کی سیاحت میں مصروف رہے۔
 اس کے بعد اپنے وطن مالون کو واپس آئے اور شعر و شاعری کا مشغلہ وہاں
 بہت زور و شور سے شروع کر دیا۔ چتر برس کی عمر پر ۱۲۳۵ھ یا ۱۲۳۶ھ میں
 وفات پائی۔ زبان پاکیزہ اور طرز بیان صاف و سادہ ہے۔ سادہ اشعار کے ساتھ
 رنگین شعر بھی بہت ملتے ہیں جب لکھنؤ میں تھے تو نواب آصف اللہ اور غازی الدین
 کی تعریف میں تصدیق بھی کہے تھے۔



باب

اساتذہ لکھنؤ

ناسخ و آتش کا زمانہ

مرکز شاعری لکھنؤ میں منتقل ہوتا ہے

شاعری کا مرکز ترقی دلی سے ہٹ کر اب لکھنؤ میں آگیا۔ اس کے اسباب مختصر ایہ تھے کہ سلطنت مغلیہ کے آخری فرمانروا بہت کمزور اور محض نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ سب سے پہلا حملہ جس نے قصر سلطنت کو متزلزل کر دیا نادر شاہ کا تھا جس سے شیرازہ حکومت بکھر گیا اور درخت اقبال کی جڑیں کمزور ہو گئیں۔ نادر شاہ کے حملے کی تباہی اور بربادی سے ابھی سلطنت نہیں سنبھلی تھی کہ احمد شاہ درانی اور مرہٹوں کی قتل و غارت نے لوگوں کی جان و مال کو اور زیادہ غیر محفوظ کر دیا۔ شاہ عالم ثانی بدخت اور تک حرام علام قادر کے مظالم کا نشانہ بنے جس نے ایسے نیک دل اور فرشتہ سیر بادشاہ کی آنکھیں مکال ڈالیں اور ان کو قید کر لیا۔ ستم رسیدہ بادشاہ نے اپنی اس مصیبت و پریشانی کی حالت میں سینہ دھیا اور انگریزوں سے مدد چاہی جیہاںچہ ان کے اس و وہاں قصیدے کے جو اس مصیبت کی وقت میں لکھا تھا چند اشعار یہ ہیں۔

شاہ تیمور کہ دارد در نسبت با من زود باشد کہ بیاید ہمدرد گاری

مادھوجی سیندھیا فرزند جگر بند من است ہست مصروف تلافی ستمکاری ما
 راجہ وراؤ زمیندار و امیر و چہ فقیر حیف باشد کہ نسا زند بہ غمخواری ما
 آصف الدولہ و انگریز کہ دستور من اند چہ عجب گر بنمایند مددگاری ما
 اس کے ساتھ ہی ساتھ ملک کے امراء دولت بھی اپنے باہمی رشک و حسد
 اور فساد و عناد سے باز نہیں آتے تھے۔ اس عام بد امنی کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگ اپنا
 وطن چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے وہ شاعر جو سلطنت کے دامن دولت سے وابستہ
 تھے مثلاً میر سودا، میر حسن، انشا وغیرہ انھوں نے بھی دلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رخ کیا
 جو اُس وقت ان کا قدر شناس اور ان کے واسطے دولت خیز خطہ تھا اور علم کی
 قدردانی میں دربار دہلی کے قدم بقدم چلنا چاہتا تھا۔ اس طور پر دلی کا نقصان
 لکھنؤ کا نفع ثابت ہوا۔ شعراء دلی کو اہل لکھنؤ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے ساتھ
 نہایت اخلاق و محبت سے پیش آئے۔ سلطنت کی طرف سے ان کے واسطے جاگیریں
 و وظائف انعام و اکرام مرحمت ہوئے۔ اور ان کی نازک مزاجیاں اور بد ماغیاں تک
 بہت کشادہ پیشانی سے برداشت کی جاتی تھیں۔ بلکہ اکثر انھیں صفات کی
 تعریف کی جاتی تھی۔ سلسلہ روابط کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لیے نوابان عہد
 اور امراء وقت نے اکثر شعراء کو اپنے دامن دولت سے وابستہ کر لیا اور ان کو
 اپنا رفیق و مصاحب بنا لیا۔ مگر سچ پوچھیے تو یہی ربط و ضبط اور دربار کا تعلق
 بالآخر شاعری کے حق میں سم قاتل ثابت ہوا۔ شروع میں جب کہ سرمایہ داران شعر
 آزاد مزاج اور خوددار ہوتے تھے تو اس میل جول سے کوئی نقصان نہیں ہوا بلکہ
 اس نے شاعری اور زبان کی ترقی میں بہت مدد دی۔ مگر اب بعد کے زمانہ میں جبکہ

شعر اپنی عزت و اکبر کا بھی کچھ خیال نہیں کرتے تھے اور اپنے کلام کو اپنے عیش پرست مالکوں کے رنگ میں رنگنا چاہتے تھے اس سے بہت بُرے نتائج سرزد ہوئے مرتبہ شاعری پست ہو گیا۔ شعرائے اپنے ہاتھوں خود کو ذلیل کر لیا۔ مثال کے لئے میر و سودا۔ اور انشا و مصحفی کی حالت پر نظر کرو اول الذکر دونوں صاحب گو کہ سلطنت کے وظیفہ خوار تھے مگر نہایت بلند و آزاد طبیعت رکھتے تھے۔ وہ کبھی اپنے اشعار میں کسی کی دست اندازی یا کسی خاص رنگ کی پسروی جو ان کی طبیعت کے خلاف ہوتی گوارا نہیں کرتے تھے برعکس اس کے مؤخر الذکر دونوں بزرگ دربارداری کے اثر سے متاثر ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری بجائے الہامی ہونے کے محض رسمی اور تکلفات کی رہ گئی۔

لکھنؤ کا طرز شاعری اس میں کوئی شک نہیں کہ لکھنؤ میں چرخ شاعری ملی والوں نے روشن کیا۔ اور شاعری کا مذاق یہاں انھوں نے پھیلا یا ان لوگوں کے آنے سے پہلے مشہور مقامی شاعر یہاں کوئی نہیں تھے۔ لکھنؤ کے مستقر اختلاف ہو جانے اور شعرے دہلی کے یہاں بکثرت آ جانے سے یہاں مذاق شاعری بہت پھیل گیا اور شاعری کو بہت ترقی ہوئی۔ بادشاہ بڑے ذوق و شوق سے شاعروں کو اپنی مصاحبت میں جگہ دیتے تھے سودا کے بلائے جانے کا واقعہ مشہور ہے کہ نواب شجاع الدولہ نے اُن کو طلب کیا اور ایک خوبصورت حیلہ سے انھوں نے اُس کو ٹال دیا شعر کا اتنا چرچا پھیلا کہ جابجا مشاعرے ہونے لگے۔ امرا اور رؤسا اور نیز عوام الناس بھی شاعری کے دیوانے تھے عمدہ اشعار پڑھ کر اور لے دیکھ صفحہ ۱۲۰ و ۱۲۹۔

مُن کر ٹوٹ جاتے تھے میثاء و مکی محفلیں ماہوار اور مفتہ وار سے ترقی کر کے اکثر جگہ روزانہ ہوتی تھیں جس میں شعر اپنی اپنی عمدہ غزلیں پڑھتے تھے اور سامعین کی تعریف سے اُن کے دل بڑھتے تھے۔ اس مقابلہ سے یہ فائدہ ضرور تھا کہ علاوہ کلام کی کثرت کے لوگ ایک دوسرے پر فوقیت لیجانے کی کوشش کرتے تھے اور یہی فوقیت اور سرسبزی کا خیال لوگوں کے لئے مایہ ناز تھا۔ اسی کثرت شوق نے ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی جو بالکل مقامی تھا۔ دونوں اسکولوں کی نوعیت میں کوئی اہم اور اصولی فرق نہیں ہے مگر مضامین منتخب میں پسند طبع کے نمونے جدا جدا ہیں اور سہلو بیان میں بھی فرق ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو جدت پسند طبائع نے قدامت پرستی سے گھبر کر اپنے نام و نمود اور زُندرت کے خیال سے نئی نئی راہیں نکالیں۔ اور شعرِ اے دہلی کی قدیم شاہراہ کو چھوڑ دیا۔ نسخ اس طرز جدید کے پیشواے اعظم ہیں اور اُن کے بعض مشور شاگرد بھی اُن کے قدم بقدم چل کر کامیاب ہوئے یہاں تک کہ زمانہ موجودہ میں وہ طرز خاص نامقبول ٹھہری اور اب شاعری نے ایک جدید روش اختیار کی۔

طرزِ دہلی اور طرزِ گھنٹو کا فرق اور اُن کا تقابل

طرزِ دہلی کی خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں جذبات کی تصویرِ سادہ اور پر اثر الفاظ میں کہنچی جاتی ہے۔ تخیل اور جذبات پر رعایت لفظی کو مقدم سمجھتے ہیں۔ نسخ اور اُن کے متبعین نے برخلاف اس کے اپنی تمام تر توجہ شعر کے حسنِ ظاہری اور رعایت لفظی اور صنایعِ بدیع پر صرف کردی یعنی الفاظ کی مصوری ایک بُرے سہلوب سے کی۔ شکوہ الفاظ پر بلند خیالی اور مصوری جذبات کو قربان کر دیا۔ الفاظ میں صرف وہی لفظ

منتخب کئے جو کسی پہلو سے مراعات النظر میں شامل ہو سکتے تھے مثلاً اگر کسی باغ کا منظر دکھانا ہوتا تو بلغ ہی کی رعایت کے الفاظ استعمال کیے جاتے۔ دوسرے الفاظ گو کہ کتنے ہی مناسب اور موزوں ہوتے مگر ان کو جبکہ نہ ملتی اور سختی کے ساتھ ان کو برطرف کر دیا جاتا۔ اس رعایت لفظی کی بے انتہا پاسداری کا یہ اثر ہوا کہ شعر سے سادگی اور بے تکلفی جاتی رہی اور تکلف اور تصنع کی بھرمار ہو گئی ایسے الفاظ ڈھونڈھے جانے لگے جو مضمون سے کسی نہ کسی جہت سے ظاہری تعلق رکھتے ہوں گو دیگر وجہ سے وہ کیسے ہی نامناسب اور بے موقع ہوں۔ گویا محض رعایت لفظی شعر کی خوبی اور عمدگی کا دار مدار رہ گئی۔ اور الفاظ کے قربانگاہ پر درد و اثر، جذبات، سادگی، سلاست، فصاحت، بلاغت وغیرہ سب بھینٹ پڑھادی گئیں۔ اور اس کمی کو اغراق، غلو، اور دور از کار تشبیہوں نے پورا کیا۔ اس طرز میں کیفیات اور صحیح جذبات کی نازک تحلیل نہیں ہوتی۔ اور وہ روح کے ہتزاز کی پوری پوری قربانی نہیں کرتی۔ اس میں شعر الفاظ لکھنے کا محض ایک خوشنما گھنڈا ہوتا ہے جو نظروں کو اچھا معلوم ہوتا ہے مگر کبھی دلکش نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے پیش نظر صائب اور بیدل کا کلام تھا جس کا مطالعہ انھوں نے غور سے کیا تھا۔ صائب کی طرح مثال دوسرے مصرع میں پیش ہوتی تھی اور دعوے پہلے میں کیا جاتا تھا۔ یہ مثالیں کہیں کہیں تو عمدہ اور دلچسپ ہوتی ہیں مگر بسا اوقات بالکل معمولی اور بے مزہ۔ بیدل کی تتبع میں نازک اور باریک تشبیہوں اور نازک خفایوں سے کام لیا گیا مگر اردو میں اکروہ محض نقل ہو گئیں اور گورکھ دھند بن گئیں۔ اس قسم کی بے قابو تخیل پُرانے شعر کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ لکھنو کا طرز شاعری مانگ کو تو

متوجہ کرتا ہے مگر دل پر کوئی اثر نہیں کرتا۔ ایسے کلام کی صورت ظاہری بہت اچھی ہوتی ہے اور اُس کا وہی حال ہے جیسا کہ نگریری میں پوٹ اور اُس کے تابعین کی شاعری کا ہے جس میں سراسر تکلف اور تصنع ہے اور اہلیت اور درد و اثر مطلق نہیں جس سے گو دماغ لطف اندوز ہوتا ہے مگر دل کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا۔ شعر گوئی کی زحمت کے مقابلہ میں ایسے اشعار کا نتیجہ بالکل بے حقیقت ہوتا ہے پہلے پہلے تو تبدیل ذائقہ کے طور پر اس قسم کے اشعار اچھے معلوم ہوئے مگر جلد ہی طبیعتیں اُن سے گھبرا گئیں کیونکہ معمولی کاریگروں کے ہاتھ میں شاعری تسخیر نہیں ہو گئی۔ بجز اشعار کی کثرت سے لوگوں کا دل پھر گیا اور اب وہ انیس و دو سیر کی جادو نگاری اور غالب و مومن کی مضمون آفرینی سے لطف اندوز ہونے لگے۔ ہر دور کی شاعری اُس وقت کا آئینہ ہوتی ہے یہی حال لکھنؤ کی بھی شاعری کا ہے۔ تاسخ اور اُن کے شاگردوں کا کلام اُس زمانہ کی نسوانیت کا پتہ دیتا ہے اُن کی غزلوں سے اُس زمانہ کے زمانہ لباس اور زیور اور آرایش کی ایک مکمل فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ کبھی کبھی اُن کے کلام سے زمانہ گفتگو ترشح ہوتی ہے جو آئی لو کے یہاں نہیں ہے۔ دلی والے فارسی کے انداز میں چھوٹی چھوٹی غزلیں کہتے اور پامال اور فرسودہ خیالات سے بہت بچتے تھے۔ بخلاف اس کے شعراے لکھنؤ ایک ایک زمین میں چو غزلے اور پنج غزلے کہتے تھے اور یہ خراب رسم مصحفی اور جرات کی نکالی ہوئی تھی۔ اسی کثرت کی وجہ سے اکثر اوقات شعر میں بد مزگی اور بے لطفی اور کبھی کبھی ابتذال پیدا ہو جاتا ہے۔

تحقیق الفاظ و رعایت لفظی کا زمانہ اس زمانہ میں اور نیز اس کے بعد کے زمانہ میں تحقیق الفاظ

درعایت لفظی کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ جسکی ابتداء شیخ ناسخ نے کی۔ اور ان کے شاگردوں کی کوششوں سے یہ رنگ لکھنؤ اور رام پور میں پھیل گیا۔ یہی لوگ اصطلاح میں زبانوں کہلاتے ہیں۔ رشک، جگر، سحر، منیر، جلال، برق، واجد علی شاہ اختر آسیر وغیرہ یہ سب لوگ مناسب الفاظ کے انتخاب میں نہایت جانفشانی کرتے تھے اور ہمیشہ خیال رکھتے تھے کہ صحیح الفاظ و محاورے اشعار میں استعمال کیے جائیں۔ ہندی الفاظ اور محاورات کے صحیح استعمال میں بھی یہی لوگ مدد سمجھے جاتے تھے۔ اس چھان بین اور دقت نظر کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سے الفاظ خارج کر دیے گئے اور لغات شعریہ بہت کم رہ گئے۔ اسی وجہ سے زبان میں ایک کڑختگی پیدا ہو گئی۔ کیونکہ جو الفاظ و محاورات منتخب شدہ تھے وہ صرف مقرر کردہ طریقہ پر استعمال کیے جاسکتے تھے اور مقرر کردہ قواعد کی خلاف ورزی معیوب سمجھی جاتی تھی۔

اس جدید طرز لکھنؤ نے زبان میں بھی بعض اختلافات پیدا کر دیے۔ لکھنؤ کے شعرا اور عوام الناس نے بعض الفاظ و محاورات کو خاص خاص محل پر استعمال کرنا شروع کیا اور ان کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ استعمال دہلی کے طریقہ استعمال سے بہتر اور موزوں تر ہے۔ نیز یہ کہ ان کے پسند کردہ الفاظ و محاورات زیادہ تر لطیف و فصیح ہوتے ہیں۔ یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے زبان کی صرف و نحو تک پہنچ گیا اور تذکرہ و تائید میں فرق کیا جانے لگا۔ یعنی بعض الفاظ جو اہل لکھنؤ کے نزدیک مذکور ہیں وہ دہلی میں مومنٹ بولے جاتے ہیں۔ اور بعض جو وہاں مومنٹ ہیں وہ یہاں مذکور بولے جاتے ہیں۔ یہ اختلاف جو بہت زیادہ اہم نہیں ہے اور صرف چند الفاظ تک محدود ہے اسکی ابتداء میر علی اوسط رشک شاگرد ناسخ نے کی تھی۔ ان کے بعد سے

یہ قضیہ تب تک چلا آتا ہے اور ان دونوں مقاموں کے شاعر اب بھی اس فرق کا بہت خیال رکھتے ہیں۔

شیخ امام بخش ناسخ زبان اردو کے بہت بڑے شاعر اور طرز لکھنؤ کے موجد تھے۔ ان کے خاندانی حالات صحیح طور پر نہیں معلوم ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شخص ستمی خدا بخش خیمہ دوز نے جولاہور کا ایک دولتمند سوداگر تھا اور کوئی اولاد نہیں رکھتا تھا ان کو متبنی کر لیا تھا اُس نے ان کو بہت اچھی تعلیم دی اور مثل اپنی اولاد کے ان سے محبت کرتا تھا۔ اُس کے مرنے کے بعد اُس کے بھائیوں نے وراثت کا جھگڑا کیا اور ناسخ کی بنیت کو غلط فہم کر ان کو اپنے بھائی کا غلام بتایا رفتہ رفتہ کچھ مصاحبت کی صورت پیدا ہوئی اور اسی اثنا میں ناسخ کو زہر دینے کی تدبیر کی گئی مگر وہ کارگر نہ ہوئی۔ یہ معاملہ بالآخر عدالت میں پہنچا جہاں سے ناسخ کے حق میں فیصلہ ہوا۔ ان کے دیوان کی چند رباعیوں میں ان واقعات کی طرف حوالہ ہے مثلاً

(۱)

مشہور ہے گر چہ افسرے اعمام پر کرتے نہیں غور خواص اور عوام
وارث ہونا دلیل فرزند ہی ہے میراث نہ پاسکا کہیں کوئی غلام

(۲)

کہتے رہے اعمام عداوت سے غلام میراث پدر بانی مگر میں نے تمام
اس دعوے ہل سے ستمگاؤں کو حاصل یہ ہوا اگر گئے مجھ کو بدنام
فارسی اور عربی کی درسیات انھوں نے حافظ وارث علی اور علمائے فرنگی محل سے پڑھیں

جو لکھنؤ میں ایک بہت بڑا تعلیمی مرکز ہے۔ وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ شاعری میں انکو کس سے تلمذ تھا۔ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ وہ میر کے پاس بغرض شاگردی گئے تھے مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ یہ بات کسی قدر اعتبار سے صحافی کی سند سے کہی جاسکتی ہے کہ ناسخ تنہا سے اصلاح سخن لیتے تھے جو صحافی کے شاگرد تھے مگر تعلق زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہا وہ اپنی ہی طبیعت پر زور دیتے تھے اور مشاعرہ کی غزلوں سے جو جو مزاح و بڑھتی جاتی تھی اوس قدر ان کو کلام پر قدرت حاصل ہوتی جاتی تھی۔ بالآخر استاد مانے جانے لگے اور خود بیسیوں شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح دینے لگے جنہیں سے اکثر مرتبہ کلام میں اُن سے کم نہیں ہیں۔ ناسخ کو ورزش کا بہت شوق تھا۔ بڑے تن و توش کے اور قوی ہیکل آدمی تھے اور کھاتے بہت تھے شادی نہیں کی تھی۔ دن میں صرف ایک مرتبہ کھاتے تھے مگر اُس وقت تقریباً پانچ سیر غذا نوش جان کر لیتے تھے۔ رنگ سیاہ تھا اسی وجہ سے اُن کے حریف اور با مذاق لوگ اُن کو کٹھنہ کی بھتی کہتے تھے۔ روزانہ معمول یہ تھا کہ صبح سویرے اُٹھتے ورزش سے فراغت کر کے نہاتے پھر اپنے شاگردوں اور دوستوں سے ملنے۔ اُس کے بعد قریب بارہ بجے کے کھانا کھاتے اور تھوڑی دیر آرام کرتے۔ سہ پہر کو پھر وہی شاگرد اور احباب جمع ہوتے اور شعر و شاعری کا چرچا ہوتا۔ رات کو فکر سخن کرتے جس میں اپنی غزلیں بھی کہتے اور شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح بھی دیتے۔ بہت بڑے صاحب وضع تھے اور اسی پاسداری وضع کو دوسروں سے بھی چاہتے تھے جو ان سے ملنے آتے تھے۔ ان کی صحبت اور باتوں میں بڑی کشش تھی اس واسطے کہ باوجود شاعرانہ بددماغی اور آزاد مزاجی کے لوگ کثرت سے ملنے آتے تھے جن میں اکثر لکھنؤ کے بڑے بڑے امرا اور رئیس ہوتے تھے۔ خود کبھی

کسی کی ملازمت نہیں کی اور اپنے قدردانوں کی قدر شناسی اور فیاضی کی بدولت نہایت آرام سے زندگی بسر کرتے تھے مشہور ہے کہ اسلئے میں نواب آغا میر نے سولہ لاکھ روپیہ لیں کو دیا تھا۔ وہ انھوں نے کہیں رکھوا دیا تھا لوگوں نے جانا انہی کے یہاں جو رنے رات کو نقب لگائی مگر کچھ نہ پایا انھوں نے تاریخ کہی

دزد در خانہ ناسخ چور دہ نقب مشب نہ زرو سم نہ بدس نخل آمد بیڑوں
بہر تاریخ مسیحی چو بریدم سرزد دزد از خانہ مفلس نخل آمد بیڑوں
اس سے ۲۷ کے تحریج کے بعد ۱۸۳۱ء نکلتے ہیں -

ناسخ ایک مرتبہ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ سے چلے گئے تھے۔ وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ بادشاہ موصوف اُن کو اپنے دربار سے متعلق کرنا اور خطاب ملک الشعرائی دینا چاہتے تھے ناسخ کو یہ مرتبہ ناگوار ہوا اور یہ کہ ناسخ کو پس کر دیا کہ غازی الدین حیدر کو نہ تو شاہانِ دہلی کا مرتبہ حاصل ہے اور نہ سرکارِ انگریز کا ایسا اقتدار۔ پھر میں ایسے بادشاہ کا خطاب لیکے کیا کروں۔ اس حقارت آمیز جواب سے بادشاہ کو غصہ آیا اور ناسخ کو وطن چھوڑنا پڑا۔ لکھنؤ سے وہ الہ آباد گئے جہاں چندو قیام کیا۔ یہاں راجہ چندو لال دیوانِ سلطنت آصفیہ حیدر آباد دکن نے اُن کو بارہ ہزار روپیہ بھیجے اور ایک خط لکھا کہ اگر آپ دکن آئیے تو وہاں حسبِ مراتب آپ کے قد و منزلت کی جائیگی۔ وطن کی محبت سے انھوں نے اس قدر دور و دراز جانے سے انکار کیا -

مشہور ہے ایک مرتبہ اور انھوں نے اسی قسم کا پیغام بھیجا تھا جسکے ساتھ ہندو ہزار روپیہ بھی ارسال کیے تھے۔ غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد وہ لکھنؤ واپس آئے مگر حکیم مہدی کی دشمنی کی وجہ سے جو اُن کے سرپرست اور قدردان آغا میر کے دشمن تھے

ان کو پھر لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ اب کی مرتبہ فیض آباد الہ آباد بنارس کانپور اور مپنہ میں تھوڑے
تھوڑے دن قیام کیا مگر وطن کی محبت کبھی نہ بھولے آخر کار حکیم مہدی کے انتقال
کے بعد ۱۲۸۷ھ میں پھر لکھنؤ واپس آئے۔ جہاں چند سال رہ کر ۱۲۸۷ھ ہجری میں
انتقال کیا میر علی اوسط رشک نے تاریخ کمی

دلا شعر گوئی اوٹھی لکھنؤ سے

تصانیف ان کے تین دیوان ہیں جن میں سے دو زیادہ مشہور ہیں۔ ایک دیوان

الہ آباد کے قیام میں مرتب کیا تھا جس کا سنہ تصنیف ۱۲۳۲ھ ہے۔ اسکا نام
دفتر پریشان رکھا۔ اس میں غزلوں رباعیوں اور تارخیوں کے سوا اور قسم کی نظم نہیں۔
دوسرے اور تیسرے دیوان کا سنہ تالیف علی الترتیب ۱۲۴۷ھ اور ۱۲۵۲ھ ہے۔

ان کے دیوانوں میں جو تارخیں ہیں وہ اس لئے بہت قابل قدر ہیں کہ ان سے
اکثر نامی گرامی شعرا اور دیگر مشاہیر کا سنہ وفات معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے
کہ نسخے کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ ان کے کلام میں قصائد کی جگہ اکثر قطعات ملی ہے
ہجو اور مذاق کا بھی پتہ ان کے یہاں نہیں۔ ان کی ایک شنوی بھی ہے جس کا نام

۱۔ فقیر مولف کے پاس جو نسخہ ملتا ہے اس کے آخر میں یہ عبارت ہے ”المحمدیہ کہ بفرانش شاہزادہ والا جاہ مزافر خندہ
ہمدان اقبالہ کلیات کس شعرے نان سرتر بقام وانی علم و عمل اسخ شیخ الامام شمتخلص ناسخ دیوان اول ستمی
”دیوان ناسخ“ در تین دیوان و ستمی بہ دفتر پریشان بر حاشیہ دیوان سوم ستمی بہ دفتر شعر دہر دلیف متحی دفتر پریشان
بتاریخ چہام جادی الاول ۱۲۸۷ھ در طبع مولائی واقع بازار راٹھ کیٹ راس منطبع گردید“

۲۔ اب حیات میں ہوٹھ کے ایک تاریخ نگار کی نکالی ہے جس سے ان کی تفریح طبع اور مذاق کا حال معلوم
ہوتا ہے۔ یہ گھسیٹا نام ایک شخص مرگئے تو شیخ صاحب نے فرمایا

جب میگھسیٹا مر گئے ہاے ہر ایک نے اپنے منہ کو پیٹا
تاریخ نے کبھی بے سن کے تاریخ انوس کہ موت نے گھسیٹا

”نظم سرچ“ ہے، اجتہاد یعنی نام ہے۔ اس سے ۱۲۵۴ھ تکلتے ہیں یعنی اس سال اُن کے شاگرد رشک نے انکی وفات کے بعد اُس کو شائع کیا تھا۔ ایک مولود شریف بھی شخصیت کی تصنیف ہے مگر یہ دونوں کتابیں مصنف کے پایہ سے بہت گری ہوئی ہیں۔

ناسخ کا اثر فارسی اور زبان پر شیخ ناسخ تین چیزوں کے واسطے مشہور ہیں۔ ایک

انکی قادر الکلامی جو انکی غزلوں سے معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے وہ طرز جدید جو انھوں نے ایجاد کیا تھا۔ تیسرے ایک بڑی جماعت مشہور شاگردوں کی جنکو اپنے بعد وہ چھوڑ گئے۔ ہمیں کوئی شک نہیں کہ ناسخ ایک مسلم الثبوت استاد تھے جن کو زبان اُردو و فارسی پر قدرت حاصل تھی شعر کی آرائش ظاہری کما حقہ کرتے تھے لکھنؤ کے حلقہ شعرا میں اُن کا بہت بڑا اثر تھا اور اب تک کسی تنازع فیہ ادبی مسئلہ میں مثلاً کسی محاورے یا لفظ کی صحت کے متعلق ان کا کلام سند میں پیش کیا جاتا ہے۔

الفاظ اپنی جگہ پر خوب صرف کرتے تھے اور ایسے الفاظ جو سودا و میر کے زمانہ کی یادگار رہ گئے تھے اُن سے اجتناب کرتے تھے برخلاف ان کے مصحفی زمانہ قدیم کے بہت بڑے متبع تھے۔ ناسخ کے کلام میں یہ نقص ضرور ہے کہ انھوں نے الفاظ کی تلاش جو تجو پر ضرورت سے زیادہ توجہ کی اور بڑھیبی سے کمیں کہیں ایسے متعلق اور اوق الفاظ فارسی عربی دخل کرنا چاہے جو غزل کے شایان نہیں ہیں اسی وجہ سے ان کا کلام حسن ظاہری سے تو آراستہ ہو مگر دیکھپی اور تاثیر سے خالی ہے۔ یہی حال انگریزی میں پوپ شاعر کا ہے جس میں کوئی ظاہری سقم تو نہیں مگر درد و اثر مطلق نہیں ہے۔

ناسخ کی غزلیں اُن کی غزلیں شاندار الفاظ اور طرح طرح کی تشبیہات کا مجموعہ

ہوتی ہیں مگر جذبات و اثرات سے خالی ہیں تصنع ان کے کلام کا اصلی جوہر ہے
 تشبیہیں اکثر نئی تو ہیں مگر عجیب ہوتی ہیں حسن ظاہری بجائے غرض ثنائی کے ان کے
 یہاں غرض اصلی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ الفاظ کی مناسبت کی بہتات میں
 شعر کا مضمون خبط ہو جاتا ہے۔ انکی غزلیں صائب و مرزا بیدل کے رنگ میں ہوتی
 ہیں یعنی اول الذکر کی تشبیہات اور آخر الذکر کی نازک خیالیاں کہیں کہیں ان میں
 پائی جاتی ہیں۔ ناسخ کے چند ایسے اشعار جن میں عربی و فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال
 کیے ہیں بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں۔

غیر کوثر کسی دریا کا میں سبلاح نہیں	بیشہ شیر خدا بن کہیں سبلاح نہیں
ظلم طول شبِ فرقت کے تناول نے کیا	داورس کوئی بجز فاق الاصلح نہیں
بے خطریوں ہاتھ دوڑاتا ہوں لف یا پر	دوڑتا تھا جس طرح ثعبان موسیٰ مار پر
دیکھیو ناسخ سریشخِ معم کی طرف	کیا کلس مسواک کا ہے گنبد ستار پر
کیونکر رائے ناسخ خوارِ عمل دشمن ہونہ خوار	کیسے موسیٰ کا علی شیر خدا ہاروں ہوا
معمولی کلام کا انداز یہ ہے۔	

روے جاناں کا قصور میں جو نظار ہوا	دل میں تھا جو دانِ حسرتِ عشق کا تار ہوا
وہ مہ خانہ نشیں گلیوں میں آوارا ہوا	اے مخم دیکھنا ثابت بھی سیارا ہوا
محفلِ نئے میں جو آیا تو برائے میکشی	تھا جو شیشہ جو شِ موسیٰ ایک نوار ہوا
چشم بد دور آج کیا آتے نظر ہیں گل صاف	سبزہ خط کیا غزالِ چشم کا چارہ ہوا
شرعاً سے ہل گئی جو اسکی زلفِ عنبریں	دم میں موم شمع سارا عنبر سارا ہوا
پیٹھ پیچھے میرے بد کہنے سے زاہد یہ بلا	پیٹھ پر بارِ گنہگار کا جمع پشتار ہوا

دوبھیکا سا قیالیتے ہی تیرے حجر میں ہاتھ میں جامے گل رنگ انگارا ہوا
جب ہمارے کو ہوا عریاں وہ پتلا نور کا حوض میں روشن بزرگ شمع فوارا ہوا

دوستو جلدی خبر لینا کہیں ناسخ نہو

قتل آج اسکی گلی میں ایک بیچارا ہوا

تاریخ گوئی میں اُن کو خاص ملکہ تھا۔ بات بات پر تاریخ کہتے تھے بعض
تاریخیں بہت عمدہ اور دھپپ ہیں مثلاً کسی نے اُن کے خطوط چرائے تو کہا

سیاہ ہیچو قلم باد روے حاسد من

پھر چار خط جاتے رہے تو کہا

صد حیف تلف چما ز نامہ

پیارے شاگرد خواجہ وزیر کا بیاہ ہوا تو فرمایا

شدہ نوشہ وزیر من امروز

جب اُن کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو صبح کا وقت تھا فرمایا

صبح طالع شد برآمد آفتاب

جب حکیم مہدی معزول ہو کر فرخ آباد گئے تو انھوں نے تاریخ کہی

افتاد حکیم از وزارت تاریخ بطرز نور مستم کن

از حاکم حکیم ہشت برگیر سہ مرتبہ نصف نصف کم کن

تعبید نہیں کہا تعجب ہے کہ اس صنف خاص میں انھوں نے کوئی توجہ نہیں کی

در حالیکہ اسکی ترتیب میں درد و اثر کی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ بلکہ اُن کا شوق

شکوہ الفاظ کا اس کا مدد و معاون ہوتا۔ لیکن ہے اسکی وجہ یہ ہو کہ ان کی

نظری طبیعت کی آزادی نے خوشامد اور چالپوسی کی اجازت نہ دی ہو۔ وہ تصوف سے بھی بریگا نہ ہیں۔ اُن کے بعض اشعار جو صوفیانہ کہے جاسکتے ہیں اُن میں بھی خود انھیں کارنگ غالب ہے اور حقیقی تصوف کہیں چھو نہیں گیا ہے۔ مزاح و ظرافت کا بھی کہیں اُن کے کلام میں ذکر نہیں۔ اُنکی ہنسی بناوٹی ہوتی ہے اور مذاق پھس پھسا کہیں کہیں مذہبی حملے اور طعن و تشنیع سے بھی کام لیتے ہیں مگر اُس میں کسی قسم کی لطافت اور خوبی نہیں ہوتی بلکہ اُن کے مرتبہ سے گری معلوم ہوتی ہے۔

نقائص کلام کلام میں وہی نقائص ہیں جو عام طور پر اُن کے ایجاد کردہ طرز میں پائے جاتے ہیں یعنی کسی عمدہ خیال کا اُن میں پتہ نہیں۔ اُن کے کسی شعر پر پڑھنے والے کا دل نہیں پھڑکتا۔ نہ اُس میں کسی قسم کا انوکھا س اور باریک نظری ہے۔ اشعار ٹھس اور بے لوج ہوتے ہیں۔ عام طور پر نقائص کلام یہ ہیں۔ تصنیع اور تکلف۔ فارسی تشبیہات جو اردو کا جامہ پہن کر بدنام ہو گئی ہیں۔ بڑے بڑے فارسی عربی مطلق الفاظ جنکی اردو غزل متحمل نہیں ہو سکتی۔ شعر کی ظاہری آرایش کو مقدم سمجھنا۔ معمولی اور پست خیالات کا ہی موقع اظہار شاندار الفاظ میں۔ سرکہ کا بھی الزام اُن پر لگایا جاتا ہے مگر سچ پوچھیے تو یہ دستور قدیم سے چلا آتا ہے۔

ناسخ کے کا زانہ ناسخ اپنے تخلص کے اعتبار سے طرز قدیم کے مٹانے والے تھے۔ مگر غور سے دیکھئے تو اس تغیر کا شوق اور خیال لوگوں کے دلوں میں پہلے سے چلا آتا تھا۔ مگر انھوں نے اسکی ابتدا کی اور اپنے کلام میں اُسکو برتا۔ مرزا حاجی صاحب اُس زمانہ کے ایک متمول اور بار سونخ رئیس تھے جو خود بھی ذی استعداد تھے اور اُنکی سحر میں

مرزا قتیل اور قاضی محمد صادق خاں اختر وغیرہ ایسے باکمال لوگ جمع رہتے تھے۔ ناسخ کو خوش نصیبی سے مرزا کے دربار میں رسائی ہو گئی جہاں ایسے کامل لوگوں کی صحبت میں ان کو بھی زبان کی تراش و خراش اور تحقیق و تدقیق کا شوق پیدا ہوا اور ان کے دل بڑھانے سے کلام نے روز بروز رنگ پکڑنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ طبیعت میں امنگ اور دل میں جوش بڑھ گیا۔ غرض کہ مرزا حاجی کی مہربانی سے انکی شاعری خوب چمکی اور اس کو لکھنؤ میں خوب فروغ حاصل ہوا۔ ناسخ نے جو تغیرات غزل میں کئے ان میں سے بعض یہ ہیں۔ لفظ اُردو بجائے رخیۃ کے استعمال کیا جو لکھنؤ میں جاری ہو گیا۔ مگر دلی میں عرصہ تک وہی پُرانا لفظ قائم رہا۔ ایسی غزلیں کہیں جنکی زلفیں اکہری مثلاً کا۔ کو۔ ہے۔ نہیں۔ سے۔ نے۔ پر۔ تک وغیرہ ہیں افعال میں بھی تغیر کیا مثلاً آئے ہے جائے ہے کی بجائے آتا ہے۔ جاتا ہے۔ اور آیاں۔ دکھایاں وغیرہ ترک کر دیا۔ یہ آخری فرق لکھنؤ اور دلی کی زبان کا بہت متمایز فرق تھا جو بھی تک کسی قدر باقی ہے۔ مابعد اور فحش الفاظ جو بعض قدما کے کلام میں پائے جاتے تھے انھوں نے خارج کر دیے۔ عربی اور فارسی الفاظ اور ترکیبوں کی طرف زیادہ توجہ کی۔ اور ہندی لفظوں کو بسا اوقات بے ضرورت خارج کیا۔ الفاظ کی تذکیر و تانیث کے سخت قواعد مقرر کئے۔ غزل کا دائرہ وسیع کیا الفاظ کا صحیح استعمال مقرر کیا۔ ایک طولانی فہرست اس قسم کے تغیرات کی جو ان کے زمانہ میں عمل میں آئے۔ مذکورہ جلوہ خضر اور شعر الہند میں دی ہوئی ہے۔ ناسخ کی تعریف یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مقرر کردہ قواعد پر خود بھی سختی سے عمل کیا اور اپنے شاگردوں کو بھی عمل درآمد پر مجبور کیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے شاگرد میر علی اور سطرشک نے ان سب

تغییرات کو ایک کتاب کی صورت میں منضبط کیا۔

شاگرد [] ناسخ کے بہت سے شاگرد تھے جن میں سے چند مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں :-

وزیر برق رشک بھر منیر مہر نادر آباد طاہر

برق [] فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برق، مرزا کاظم علی خاں کے بیٹے

اور واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کے مصاحب خاص اور استاد بھی تھے۔

بادشاہ کے ساتھ ان کو بہت محبت تھی چنانچہ جب بعد از نزاع سلطنت بادشاہ

کلکتہ گئے تو وہ بھی ان کے ہمراہ تھے جہاں شہنشاہ میں انتقال کیا۔ یہ شعر ان کا

ان کے حسب حال ہے۔

برق جو کہتے تھے آخر وہی کر کر اُٹھے

جان دی آپ کے دروازہ پہ مکر اُٹھے

برق شاعری کے علاوہ بانگپن میں بھی مشہور تھے۔ بانگ بنوٹ وغیرہ

اچھی جانتے اور تلوار خوب لگاتے تھے۔ لکھنؤ میں باعتبار ان کے عالی خاندان

اور ذی مرتبہ ہونے کے اور نیز ان کے اخلاق و سیرت کی وجہ سے ان کی بڑی

شہرت تھی۔ پُرگو شاعر تھے اور اپنے استاد ناسخ کے تابع تھے ان کے کلام میں

بھی مثل ان کے استاد کے تکلف اور تصنع بہت ہے مگر زبان پر قدرت اور عزم

مزہ ہے ایک ضخیم دیوان چھوڑا جس میں مختلف اصناف سخن موجود ہیں ایک شعر شوب

لکھنؤ کی تباہی کا بہت درد انگیز لکھا ہے یہ بھی گو کہ اپنے پرانے رنگ میں ہے مگر

اکثر اشعار بہت مؤثر و درد انگیز ہیں۔ جلال اور سحر ان کے دو مشہور شاگرد تھے۔

نمونہ کلام یہ ہے -

اذن ہی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکارا کیا

دلہ

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو دیکھ لینا مجھے تم موسم گل آنے دو

دلہ

بکلا غبار ول سے صفائی تو ہو گئی اچھا ہوا جو خاک میں تم نے ملا دیا

دلہ

آتا نہیں ستر دل بہت لرز کو غم میں بھنسا ہوں دام محبت سے چھوٹ کر

بسم شیخ امداد علی بھر شیخ امام بخش اپنے استاد ناسخ کے ہم نام کے بیٹے تھے

عمر بھر پریشانی اور عسرت میں گزری۔ آخر عمر میں نواب کلب علی خاں والی رامپور

انکی سرپرستی فرماتے تھے۔ رامپور ہی میں کچھ پتر برس کی عمر میں سنہ ۱۱۸۲ھ مطابق

سنہ ۱۸۸۲ء میں اس دار فانی سے حلت کی۔ ان کے دیوان کی ترتیب ان کے

دوست نواب سید محمد خاں زند شاگرد آتش نے کی۔ ان کے کلام میں بھی سچیدہ

تمثیلیں اور دقیق استعارات پائے جاتے ہیں مگر پھر بھی اس قدر تصنع اور الفاظ کی

بھرا رہی ہے جیسا کہ دیگر شاگردان ناسخ کے یہاں ہے۔ اکثر اشعار بہت صاف

وسلیس اور پُر اثر بھی ہوتے ہیں۔ صحت الفاظ اور تحقیق لغت کے استاد تھے۔

ناسخ اور رشک کے بعد لکھنؤ کے دور متوسط کے شعراء میں بہت بڑا درجہ رکھتے

تھے اور تحقیق الفاظ کے معاملہ میں خاص کر بہت مستند سمجھے جاتے تھے۔ کچھ صاف

و سادہ اشعار بطور نمونے کے پیش کئے جاتے ہیں ۵

میل دل کس نے لیا نام تباؤں کس کا میں ہوں یا آپ ہیں گھر میں کوئی آیا نہ گیا

ولہ

ظالم ہماری آج کی یہ بات یاد رکھ اتنا بھی دل جلوں کا ستا نا بھلا نہیں

ولہ

مدت سے التفات مرے حال پر نہیں کچھ تو کجی ہو دل میں کہ سیدھی نظر نہیں

ولہ

افسوس عمر کٹ گئی بیخ و ملال میں دیکھا نہ خواب میں بھی جو کچھ تھا خیال میں

ولہ

کیا کیا نہ مجھ سے سنگدلی دلوں نے کی پتھر ٹپیں سمجھ پہ نہ سمجھا کسی طرح

آباد مرزا مہدی حسن خان متخلص بہ آباد مرزا غلام جعفر کے بیٹے تھے سلسلہ ۱۲۰ھ میں

لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ نوابان فرخ آباد سے سلسلہ قرابت رکھتے تھے اور لکھنؤ

کے روسا میں شمار کیے جاتے تھے شعر گوئی سے بڑا شوق تھا مقررہ اوقات پر

اپنے مکان پر مشاعرہ کرتے تھے اور دوسرے مشاعروں میں بھی بالالتزام جاتے تھے

پر گو شاعر تھے دو دیوان ایک مثنوی اور تین واسوخت یادگار چھوڑے ہیں جن میں سے

ایک دیوان موسوم بہ ”مگارستان عشق“ لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ ان کا ایک مجموعہ

”بہارستان سخن“ جس میں ناسخ و آتش کی ہر طرح غزلیں جمع کی ہیں بہت مشہور

ہے جس سے ان دونوں استادوں کے کلام کے موازنہ کا بہت اچھا موقع

ملتا ہے۔ آباد کے کلام میں کوئی خاص خصوصیت نہیں البتہ کہیں کہیں کوئی

پتھر کتا ہوا شعر نکل آتا ہے۔

خواجہ وزیر خواجہ محمد وزیر المتخلص بہ وزیر خواجہ محمد فقیر کے بیٹے تھے۔ سلسلہ خاندان ان کا باپ کی جانب سے حضرت خواجہ بہار الدین نقشبند سے ملتا ہے۔ لکھنؤ میں علی خاندان ہونے اور نیز اپنے ذاتی تقدس کی وجہ سے بڑی عزت سے بسر کی۔ آخر عمر میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور شعرو سخن سے نفرت ہو گئی تھی فتوح اور تخیل اعمال کا بہت شوق تھا۔ ہر وقت نقوش بھرا کرتے تھے سوڑیہ ہمارے خرچ کم نہ تھا مگر آمدنی کمیں سے کچھ نہ تھی۔ آزادی مزاج کا یہ حال تھا کہ واجد علی شاہ بادشاہ نے دو مرتبہ یاد فرمایا مگر وہ کچھ نہ کچھ عذر کر کے اپنی جگہ سے ہلے نہیں۔ بالآخر سلسلہ میں وفات پائی منشی اشرف علی شاگر نسیم دہلوی نے مادہ تاریخ خوب نکالا ہے

مرزہ شعر کا ہاے حاتارہ

ان کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں اور دوستوں نے ان کا کچھ کلام بصورت غزلیات جمع کر کے شائع کیا اور اُس کا تاریخی نام ”دفتر فصاحت“ رکھا جس سے سلسلہ ۱۲۶۳ ضلی مطابق ۱۲۷۷ھ کی تاریخ اشاعت نکلتی ہے۔ ان کے بہت سے شاگرد تھے جن میں سب سے مشہور فقیر محمد خاں گویا ہیں۔ خواجہ وزیر کا رنگ وہی ہے جو ان کے استاد کا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اپنے استاد کے سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ محبوب شاگرد ہی تھے۔ مشکل مشکل طرحوں میں طبع آزمائیاں کی ہیں اور اپنے طرز کے موافق خوب خوب شعر نکالے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اپنے عہد کے شعرا میں خواجہ وزیر بہت بڑے پائے کے شاعر تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

جلا ہے اول راحت طلب کیا شاو مان ہو کر زمین کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر

اسی باعث تو قتل عاشق سے منع کرتے تھے اکیلے پھر ہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر
ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلیگیر کو کیسے تیرا ناز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

ولہ

ہے چشم نیم باز عجب خواب ناز ہے فتنہ تو سورہا ہے در فتنہ باز ہے

ولہ

نہ کر نظر مرے جرم و گناہ بیک پر اتنی تج کو غفور الرحیم کہتے ہیں
کہیں عدو نہ کہیں مجھ کو دیکھ کر محتاج یا ان کے بندے ہیں جن کو کریم کہتے ہیں

رشک

میر علی اوسط رشک میر سلیمان کے بیٹے تھے بزرگون کا وطن فیض آباد تھا
مکران کی نشوونما لکھنؤ میں ہوئی اور ہمیں ان کی شاعری بھی پروان چڑھی۔ ناسخ کے
مشہور شاگرد تھے زیادہ تر ان کی شہرت ان کی مبسوط اور جامع لغت موسوم بہ "نفس اللغۃ"

پر مبنی ہر جو زبان فارسی میں ہے اور اردو اور ہندی الفاظ و محاورات کی صحت کی
تحقیق اُس میں کی گئی ہے یہ تاریخی نام ہے جس سے سن تا لیف ۱۲۶۵ھ نکلتا ہے۔

وہ ان کی زندگی ہی میں مشہور و مقبول ہو چکی تھی اب اُس کا ایک حصہ نشر کاوردی
نے چھپو کر دفتر نور اللغات سے شائع کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دو دیوان بھی

ہیں جن کے علی الترتیب تاریخی نام "نظم مبارک" (۱۲۵۵ھ) اور "نظم گرامی" (۱۲۶۱ھ)

ہیں۔ رشک کا بھی دنگ وہی ہے جو ان کے استاد ناسخ کا ہے۔ ان کا کلام بھی

بالکل بے مزہ اور سیٹھا پھیکا ہے اور اُس زمانے کے عیوب اس میں بھی سب موجود

ہیں۔ رشک تاریخ گوئی میں بڑا ملکہ رکھتے تھے بات بات پر تاریخ کہتے تھے۔ اپنے بعد

انھوں نے بہت سے شاگرد چھوڑے جن میں منیر مشہور ہیں منیر پہلے ناسخ کے شاگرد تھے

مگر ان کے بعد رشک سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ رشک کچھ دن کانپور اور الہ آباد میں بھی رہے ہیں آخر عمر میں کربلائے معلیٰ چلے گئے تھے اور وہیں ۱۲۸۷ھ میں بسترِ برس کی عمر میں وفات پائی، ان کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ صحتِ الفاظ کا بہت خیال رکھتے تھے اور خود اپنے استاد کے زمانے میں بھی اسی بات کے لئے مشہور تھے۔ ان کے کلام میں بلند خیالی اور مضمون آفرینی کا پتہ نہیں معمولی باتیں کہتے ہیں اور بالکل معمولی طریقے سے کہتے ہیں۔ ان کو اس بات کا بڑا خیال تھا کہ جو لفظ جس طرح معمولی بول چال میں بولا جائے اُسی طرح وہ نظم بھی کیا جائے مثلاً ہم آپ میں آئیں گے تو وہ آئیں گے آپ ہی (آپ ہی)

دل ہی میں سُراغِ دردِ دلدار ملے گا

بہت پُرگو تھے مگر کلامِ رعایتِ لفظی اور ضلعِ جگت کی سچیدگیوں میں ایسا پھنسا ہوا ہے کہ دو چار شعر بھی اچھے مشکل سے ملتے ہیں۔ ان کی ایک طویل غزل ہے جس کا قافیہ ”لگاؤ تاؤ“ وغیرہ ہے چونکہ قافیہ مشکل تھا انھوں نے محنتِ جانفشانی سے بہت سے ہم قافیہ لفظ جمع کیے تھے۔ نمونے کے طور پر چند شعر لکھے جاتے ہیں۔

یار کو ہم سے کچھ لگاؤ نہیں	وہ محبت نہیں وہ چاہو نہیں
پرزوں میں دستخط کروں کیا حال	ایک دو تین چار تاؤ نہیں
گنگ کو بجر غم سے کیا نسبت	یہ وہ دریا ہے جسمیں ناؤ نہیں
ابکی جاڑے ہیں اور نالہ و آہ	اس طرح کا کوئی الاؤ نہیں
چاول الماس گوشتِ سخت جگر	فرقتِ یار میں پلاؤ نہیں
میر گھانے سے کیوں فلک ہو کباب	پاؤ روٹی ہے نانیاؤ نہیں

ہجریں کیوں طرح طرح نہ دبائے بارِ غم پر مراد باؤ نہیں
 یہ زمین غزل وہ ہے اتور شک
 جس میں ذرہ کہیں بھراؤ نہیں
 اتفاق سے ”بلاؤ“ کا قافیہ رہ گیا تھا اسکی کئی کسی ظریف نے پوری کردی اور خود
 انھیں کی طرف منسوب کر دیا۔

دور سے چھیچھڑے دکھاؤ نہیں

رشتک بیٹھا ہے بن بلاؤ نہیں

مہر مرزا حاتم علی بیگ مختلص بہ مہر سلسلہ ۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک مشہور
 خاندان صفہانی کے نوہال تھے۔ اُن کے والد مرزا فیض علی بیگ قزلباش ایٹاٹا
 کہنی کے عہد میں علی گڑھ کے تحصیلدار تھے۔ اُن کے دادا مرزا مراد علی خان بھڑا
 شجاع الدولہ لکھنؤ آئے اور خطاب رکن الدولہ سے سرفراز ہوئے۔ وہ کسی زمانہ میں
 رائے بریلی کے ناظم تھے۔ والد کا انتقال ان کی صغر ہی میں ہوا تھا۔ مشہور ہے کہ
 اُن کو شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا اور چودہ برس کے سن میں شعر کہنے لگے تھے
 جب ان کے بھائی مرزا عنایت علی بیگ مختلص بہ ماہ آتش کے شاگرد ہوئے تو
 خود انھوں نے زانوے شاگردیِ ناسخ کے سامنے تہ کیا اور کہتے کہتے پختہ کار ہو گئے
 سلسلہ ۱۳ھ میں سرکاری امتحان پاس کر کے چنار گڑھ ضلع مرزا پور کے منصف ہوئے
 چنانچہ اُن کا یہ شعر اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

از بسکہ سوز ہجرت سے خوگر ہوئے ہیں ہم

منصف چنار گڑھ کے مقرر ہوئے ہیں ہم

وہ عدالتِ عالیہ ہائیکورٹ کے وکیل بھی تھے ۱۸۵۷ء کے غدر میں انھوں نے چند انگریزوں کو بپاہ دی تھی جسکے صلے میں خلعتِ فاخرہ اور دو گاؤں جاگیر میں سرکار سے عنایت ہوئے۔ اس کے بعد وہ آگرے آگئے جہاں وکالت کرتے تھے اور کچھ دنوں آنریری مجسٹریٹ بھی کی ہے ۱۸۶۷ء میں بمقام ایٹہ انتقال کیا۔ وہاں انکے بیٹے مرزا سخاوت علی کچھ دن تحصیلدار رہے ہیں۔

مہرزنبہ بامیہ رکھتے تھے مگر متعصب بالکل نہ تھے اکثر مشہور لوگوں سے دوستی تھی مثلاً غالب آئیں دبیر غلام امام شہید صبا منیر وغیرہ چنانچہ غالب کے اکثر خطوط ان کے نام اردوئے معلیٰ میں موجود ہیں۔ ہمارا راجہ بلونت سنگھ راجہ بنارس جو ان دنوں آگرے میں ٹھہرے تھے ان کے شاگرد ہوئے اور پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔

تصانیف مہر کی اکثر تصانیف زمانہ غدر میں تلف ہو گئیں مگر کتب ذیل مطبوعہ غیر مطبوعہ یادگار باقی ہیں۔

- (۱) دیوانِ اردو موسوم بہ "الماس درخشاں" تاریخی نام "خیالات مہر" (۱۸۶۷ء)۔ اس کو ان کے پوتے مرزا قاسم حسین قزلباش نے شائع کر دیا ہے۔
- (۲) "پیرایہ عروض" ایک مختصر رسالہ فن عروض میں۔
- (۳) "ایاغِ فرنگستان" ابتدائی عملداری انگریزی کی مختصر تاریخ ۱۸۶۳ء میں شائع ہوئی۔

(۴) "مثنویِ ایغ نگار" جو ایک دن میں لکھی تھی۔

(۵) "داغِ دل مہر" واسوخت۔

(۶) ”شعاع مہر“ مشہور شاعر میں شائع ہوئی جسکی تعریف مرزا غالب نے اپنے خطوط میں بہت کی ہے۔

ان کے علاوہ ”شبہ عشرت“ ”ضبط انتقام“ ”ہمد آخرت“ ”بیان بخشایش“ ”عید قیصریہ“ ”بنجہ مہر“ ”توقیر شرف“ اور اور کچھ نظمیں بھی ان کی طرف منسوب ہیں۔ بہت پرگو تھے مختلف مضامین پر لکھتے تھے اور تاریخ خوب کہتے تھے۔ دوسرے درجہ کے شعرا میں مہر کا مرتبہ بلند ہے۔ ان کے کلام میں سلاست و روانی، تناسب اور زبان پر قدرت ہے بعض اشعار ان کے نہایت صاف و سلیس اور بہت پر لطف ہوتے ہیں۔

سید اسماعیل حسین متخلص بہ منیر خلف سید احمد حسین شاہ شکوہ آباد ضلع میں پوری کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں عرصے تک رہے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اپنے اردو دیوان ”منتخبات عالم“ کے شروع میں جو فارسی دیباچہ لکھا ہے اس میں انھوں نے اکثر اپنے واقعات زندگی بیان کیے ہیں۔ پہلے ناسخ سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح سخن لیتے تھے پھر کانپور میں جب وہ نواب نظام الدولہ کی ملازمت میں تھے اور ناسخ وہاں پہونچے تو یہ ان سے ملنے گئے اور شاگرد ہو گئے اور انہی کی ہدایت کے بموجب وہ رشک سے بھی مشورہ کرنے لگے چنانچہ اپنے کلام میں ان دونوں بزرگواروں کا ذکر بہت ادب و احترام سے کرتے ہیں اور انکی قابلیت کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ کلکتہ، مرشد آباد، اور الہ آباد میں بھی رہے تھے مگر لکھنؤ کے عاشقوں میں تھے یہاں کی دھچپیاں ان کو مجبور کرتی تھیں کہ اپنی مستقل سکونت وہاں اختیار کریں اور شعرو شاعری کے جلسوں میں برابر شریک ہوں۔ اس شوق کا

ذکر ان کے کلام میں اکثر پایا جاتا ہے۔ لکھنؤ وہ کم سے کم سال میں ایک مرتبہ ضرور آتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ یہاں ظفر الدولہ نواب علی صفر خاں کے ملازم بھی ہو گئے مگر تھوڑے دنوں کے بعد پھر کانپور واپس جانا پڑا جہاں تھوڑے دن رہنے پائے تھے کہ لکھنؤ کی کشش نے پھر زور کیا اور اب کی مرتبہ نواب سید محمد ذکی متخلص بہ ذکی کے سلسلہ رفقا میں داخل ہوئے اور ان کے کلام کو اصلاح بھی دینے لگے لکھنؤ میں دو سال قیام کر کے نواب تجل حسین خان کی فرمائش سے فرج آباد گئے جہاں نواب موصوف کی حیات قیام کیا۔ اسی عرصے میں ہمارا جگان دھولپوڑا اور انور نے بھی ان کو اپنے دربار میں طلب کیا تھا مگر انھوں نے باندے میں ملازمت کر لی جہاں نواب علی بہادر والی ریاست کے استاد مقرر ہو گئے۔ بعد ازاں ایک بڑی مسماۃ نواب جان کے قتل کی سازش میں ان پر مقدمہ قائم ہوا اور کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی مگر شہداء میں قید سے رہائی پائی۔ بالآخر عہد نواب کلب علی خاں رامپور میں قیام کیا اور یہیں کی خاک میں شہداء میں آرام کیا۔

تصانیف تین دیوان یادگار چھوڑے ہیں (۱) منتخبات عالم (۲) تنویر الالہار (۳) نظم منیر۔ تنویر معراج لمضامین جس میں ائمہ معصومین کے کشف و کرامات بیان کیے ہیں انھیں کی تصنیف ہے۔ بہت پرگو شاعر تھے اور مرثیہ بھی کہتے تھے مرثیے میں مرزا دیر کے شاگرد تھے قصیدے بڑے زوردار کہتے تھے اور قطعہ رباعی انجمن وغیرہ میں بھی بہت زور و طبیعت دکھاتے تھے۔ ان کا رنگ ان کے استاد ناسخ اور رشک کا سمجھنا چاہیے اکثر اشعار میں بلند پروازی اور عمدہ تخیل ہے، قطعات بہت صاف سادہ اور سلیس ہیں غزلوں میں پورا لکھنؤ کا رنگ ہے مختصر

کہ منیر کا مرتبہ اُس زمانے کے شعرا میں بہت بلند ہے۔

آتش متوفی ۱۱۳۸ ہجری

خواجہ حیدر علی آتش خلف خواجہ علی بخش دلی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد نواب شجاع الدولہ کے عہد میں دلی چھوڑ کر فیض آباد آئے اور محلہ مغلیہ روہ میں سکونت اختیار کی۔ آتش کی ولادت فیض آباد میں ہوئی۔ یہ بہت صغیر سن تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اسی وجہ سے تعلیم سے بھی محروم رہے اور بڑی صحبت میں بٹھیکر مزاج میں شوریدہ سری اور بانک پن آگیا۔ نواب مرزا محمد تقی خاں ترقی کی ملازمت اختیار کر لی اور انھیں کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ یہاں اُس زمانے میں مصحفی اور انشا کے زور دار مقابلے ہو رہے تھے۔ اسی کو دیکھ کر ان کو بھی شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا۔ مصحفی کے شاگرد ہو گئے اور چند روز کی محنت میں ایسی مشق ہم پہونچائی کہ خود صاحب طرز ہو گئے۔ نسخ اور انشا کی طرح ان کی استعداد علمی درجہ تکمیل کو نہیں پہونچی تھی۔ البتہ درسی کتابیں دیکھی تھیں۔ اور ایک رسالہ فن عروض کا عربی میں پڑھا تھا۔

نسخ اور آتش کی طرز زندگی میں بھی مثل اُن کے کلام کے بین فرق تھا۔ آتش نہایت سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے جسمیں تکلف اور تصنع کو مطلق دخل نہ تھا۔ وہ حُسن کے عاشق تھے اور آزاد مزاج واقع ہوئے تھے۔ سپاہیانہ وضع اور لباس رکھتے تھے۔ مگر اسمیں بھی بانکیں کو دخل تھا۔ تلوار باندھتے تھے اور مشاعروں تک میں اپنے ساتھ لیجاتے تھے۔ قناعت اور توکل کے ساتھ زندگی بسر کی کبھی کسی امیر کی جسکی دولت کی وجہ سے خوشام نہیں کی ثنا گد کبھی کبھی خود سلوک کرتے تھے مگر ان کا دست سوال کسی کے سامنے دراز نہیں ہوا۔

اسی روپیہ مہینہ بادشاہ کے یہاں سے ملتا تھا جس سے بالکل گزارہ ہوتا تھا۔ اور کبھی کبھی کوئی شاگرد بھی اعانت کرتا تو کوئی انکار نہ تھا۔ محلہ معالیخاں کی سرائے میں ایک ٹوٹا پھوٹا مکان تھا جس میں غریباً موز زندگی بسر کرتے تھے۔ مزاج میں انتہا درجہ کی وضع داری اور خود داری تھی۔ اُمرائے بہت لوگ کی لیتے تھے۔ مگر معمولاً بہت منکر المزاج اور خلیق واقع ہوئے تھے۔ آخر میں ان سے اور ان کے استاد مصحفی سے کچھ بگاڑ ہو گیا تھا اصلاح لینا بند کر دی تھی اور آپ اپنی غزلوں پر ایک گہری نظر اصلاحی ڈالتے تھے۔ ناسخ کے معاصر تھے۔ لکھنؤ اس عہد میں دو فرقوں پر منقسم تھا۔ ایک جانب دارانِ ناسخ دوسرے طرف دارانِ آتش۔ اس آپس کے مقابلہ سے یہ فائدہ ضرور تھا کہ دونوں استادانِ سخن مقابلہ کے خیال سے طبیعت پر بہت زور دیکر کہتے تھے۔ البتہ ایک لطیف پیرایہ میں ایک دوسرے سے نوک جھونک ہوتی رہتی تھی مگر انشا اور مصحفی کی طرح دائرۂ تہذیب سے باہر نہ ہوتے تھے۔ اس قسم کے دو چار شعرا منوٹا لکھے جاتے ہیں :-

ناسخ

ایک جاہل کہہ باہر میسے دیواں کا جواب بوسلم نے کہا تھا جیسے قرآن کا جواب
اس پر آتش نے یہ کہا۔ آتش

کیونکہ ہر مومن اس لمحہ کے دیوان کا جواب جسے دیوان اپنا ٹھہرایا ہو قرآن کا جواب
آتش نے ایک مرتبہ کہا

یہ بزمِ وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں ہمارے گنجفہ میں بازی غلام نہیں
ناسخ کی طرف سے جواب دیا گیا

جو خاص بندے ہیں وہ بندہ علوم نہیں ہزار بار جو یوسف کے غلام نہیں
مگر باوجود اس سب کے آتش اپنے حریف ناسخ کا بہت احترام کرتے تھے۔ چنانچہ
مشہور ہے کہ ناسخ کی وفات کے بعد انھوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا۔ آتش نے
۶۳ھ میں انتقال کیا۔ رشک نے تاریخ کسی

خواجہ حمید علی اے وامرند

طرز کلام کلام میں ان کے تخلص کے اعتبار سے گرمی بہت ہے۔
تصنع اور تکلف مطلق نہیں۔ نہ معمولی اور مبتذل خیالات ہیں جن کا عیب شکوہ الفاظ
سے چھپایا گیا ہو۔ نہ بیجا اور فضول تمثیلوں سے شعر بے مزہ کئے گئے ہیں۔ ترشے
ہوئے الفاظ آبدار موتیوں کی طرح لڑی میں پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔
اکثر اشعار میں روانی موسیقیت کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ محاورات ایسے بر محل
استعمال کیے ہیں کہ شاعری مرصع سازی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بیج ہے کہ انکی شاعری
میں تیز انکاس اور میر کی طرح درد و اثر کی ٹرپ نہیں ہے پھر بھی ان کے بعض
اشعار پوری اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ میر وغالب کے بعد اگر کسی
مرتبہ ہے تو وہ آتش ہیں۔ بڑی خوبی ان کے کلام کی یہ ہے کہ جذبات کو نہایت
موثر اور دلکش الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ فوق البھوک الفاظ ان کے یہاں بہت کم
ہیں۔ زبان بہت مزیدار اور روزمرہ کی بول چال ہے۔ جس میں ابتذال نہیں ہے
شعر آسانی سمجھ میں آتے ہیں اور بہت لطف دیتے ہیں۔ محاورات بہت منتخب
اور بر محل ہوتے ہیں تلاش الفاظ بہت قابل تعریف ہے۔ خیالات میں بلندی
ہے اگرچہ غالب کی ایسی نہیں اور عموماً فواہش سے پاک و صاف ہیں۔

تصانیف پہلا دیوان خود انھیں کی زندگی میں شائع ہو گیا تھا اور نہایت مقبول ہوا تھا۔ دوسرا دیوان جسے پہلے دیوان کاہنیمہ سمجھنا چاہیے ان کے عزیز شاگرد میر دوست علی خلیل نے ان کے مرنے کے بعد مرتب کر کے پہلے دیوان میں شامل کر دیا۔ انھوں نے سولے غزل کے اور کسی صنف شعر میں طبع آزمائی نہیں کی۔

نفاص کلام بعض کوتاہ نظر لوگ ان کے کلام میں یہ قسم نکالتے ہیں کہ انکے یہاں فقط باتیں ہی باتیں ہیں۔ کلام میں سختگی اور اشعار میں مضامین عالی نہیں اور اس کے نتیجہ انکی بے استعدادی کا نکالتے ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حقیقی شاعری علم و فضل پر مبنی نہیں ہے گو اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ کم علمی کی وجہ سے وہ اکثر الفاظ غلط استعمال کرتے تھے مثلاً المضاف بجائے المضاف حلوہ بید بجائے حلوے بید و کفار بجائے کفارہ تبشید فاء مطالع بجائے مطالعہ وغیرہ۔ اسکے جواب میں انکی طرف سے یہ عذر پیش ہو سکتا ہے کہ انھوں نے تلفظ مروجہ کے موافق ان الفاظ کو استعمال کیا۔ اور لغوی صحت کی طرف توجہ نہیں کی اور بہت اچھا ہوا کہ انھوں نے زیادہ تحقیق سے کام نہیں لیا کیونکہ سچی جان بین نے زبان کو سخت اور بے لوج کر دیا اور اجنبی غیر ملکی الفاظ کی بھر مار کر دی۔

ناسخ اور آتش کا مقابلہ دونوں زبان اردو کے کامل استاد اور صاحب طرز تھے، اب اس زمانے میں ناسخ کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور لوگ اُس کو پسند نہیں کرتے البتہ جب وہ اپنے عروج پر تھا تو اُس کی بڑی قدر تھی اور وہ بہت مقبول تھا۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اپنے تذکرہ گلشن بنجار میں ناسخ کو آتش پر تر ترجیح

دیتے ہیں اور شیخ صاحب ہی کے کلام کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مگر غالب اپنے ایک خط میں آتش کو فوقیت دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ان کا کلام بہت مؤثر ہے حق یہ ہے کہ بندش کی جُستی، الفاظ کی حلاوت اور مضمون کی بلندی میں

۱۔ نواب مصطفیٰ خاں شفیق نے اپنے تذکرہ گلشنِ بنجار میں آتش کے حال میں جو ان کا اور ناسخ کا مقابلہ کیا ہے وہ عجب گول گول الفاظ میں ہے جس سے کسی کی کمتری یا کسی کی برتری صاف طور پر نہیں ثابت ہوتی، فرماتے ہیں ”مردم آن دیا آتش و ناسخ را کلا اساتذہ مسلم آنجا بہت قریب ہم انکار نہ و ہر دورا ہوزن شمار نہ و قباحات این تحقیق لایحقی علی من لہ خطا من القہم“ اگر ناسخ کو وہ فوقیت دیتے تو یقیناً اُن کے کلام کو بھی وہ ضرور پسند کرتے اور اس کے دیکھنے کا اشتیاق اُن کو ضرور ہوتا مگر تعجب ہے کہ اسی تذکرہ میں ناسخ کے حال میں لکھتے ہیں ”دیوانے دیگر از افکار و قادش فراہم آمدہ وہم در شہر سید ما خاطر آسودگی از انتخاباں بابیتاد“ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سر دیوان دیکھنے کو نواب صاحب کا جی نہیں چاہا پھر کوئی بالیقین کہا جاسکتا ہے کہ وہ ناسخ کو آتش پر فوقیت دیتے تھے۔

۲۔ مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں جو پٹھری عبدالغفور کے نام پر یہ قطع نقل کیا ہے

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار نیک جام اندر زہم سخن مست

وے بآبادہ بعضے حریفان خمارِ چشم ساتی نہیں پویت

مشو منکر کہ در اشعار این قوم درائے شاعری چیزے دگر بہت

اس کے بعد اس چیزے دگر کی مثال میں میر تقی میر، سودا، مومن، اور قائم کا ایک ایک شعر پیش کر کے لکھا ہے کہ ”ناسخ کے یہاں کمتر اور آتش کے یہاں بیشتر یہ تیز نشتر ہیں۔“

آتش کو ناسخ پر یقیناً فوقیت حاصل ہے۔ آتش کے یہاں الفاظ نہایت شیریں اور مزیدار ہوتے ہیں۔ بخلاف ناسخ کے کہ اُن کو موٹے موٹے الفاظ کا شوق ہے آتش کے اشعار سچرل ہوتے ہیں۔ اُن میں بے تکلفی اور تڑپ ناسخ کی نسبت زیادہ ہوتی ہے آتش کے خیالات بہت رفیع ہیں اور اُن کا کیر کپڑا آزادانہ اور فقیرانہ ہے جسکی ناسخ کے یہاں کمی ہے۔ صوفیانہ مضامین نسبت ناسخ کے آتش کے یہاں بہت زیادہ ہیں مختصر یہ کہ ناسخ کے کلام میں صرف شکوہ الفاظ اور استعارات اور تشبیہیں ہیں اور جو مزہ اور صلاوت کہ آتش کے یہاں ہے اُس میں مطلق نہیں ہے۔ زبان کی صحت اور صفائی دونوں کے یہاں ہے مگر اس میں شک نہیں کہ بحیثیت ایک حقیقی شاعر کے آتش کو ناسخ پر ترجیح ہے۔

شاگرد آتش کے مشہور شاگرد حسبِ ذیل تھے۔ زند، صبا، خلیل، نسیم، فواب مرزا شوق اور آغا جھو شرف۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

اے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوے	میں جا ہی ہونڈتا تری محفل میں رہ گیا
اللہ سے شوق اپنی جبین کو خبر نہیں	اُس بُت کے آستانہ کا پتھر رگڑ گیا
بڑا شور سُنتے تھے پہلو میں دل کا	جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا
قاصدوں کے پاؤں توڑے بگمائی نے ہر	خطا دیا لیکن نہ بتلا یا نشان کو می دوست
اُس بلا جاں سے آتش دیکھیے کیونکر نبھے	دل سوا شیشہ سے نازک دل سے نازک غمی دست
مشتاق درو عشق جاگ بھی ہو دل بھی ہو	کھاؤں کہ صحر کی چوٹ بچاؤں کہ صحر کی چوٹ
کوچہ یار میں سایہ کی طرح رہتا ہوں	در کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس
خسار زر پر مرے بہتے ہیں اشک خوں	یکجا دکھا رہے ہیں خزان بہار رنگ

کیفیت اُسے ملتی ہے جو جسکے مقدر میں نئے اُلفت غم میں ہے نہ شیشہ میں ساغر میں
 پر کرتا ہو مے صیاد تو کاٹ سطرچ حسرت پرواز بھی اُڑ جائے بال پر کے ساتھ
 باغ میں آئے ہو ساتھ انکے بھی پھر دود گام کبک طاؤس کا جھگڑا ہی چکاتے نہ چلو
 ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر ہکو غریب وطن سے بہتر ہے
 پیا مبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا زبان غیر سے کیا شرح آڑو کرتے
 سولے نام کے باقی اثر نشان سے نہ تھے زمیں سے دب گئے دبے جو آسمان سے نہ تھے
 شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ قناعت بھی بہا زبیراں ہے
 سفر ہر شرط مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجر سایہ ارارہ میں ہے
 نقش پائے رنگاں سے یہ صد ہے آہی دو قدم میں راہ طریقی شوق منزل چاہیے
 افسوس ہے فرہاد کو پہلے ہی نہ سوچھی سر پھوڑ کے مرجائے اس کو کہنی سے
 رند نواب سید محمد خاں متخلص بہ رند سراج الدولہ نواب غیاث محمد خاں کے
 بیٹے تھے ۱۲۱۲ھ میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ چونکہ نواب وزیر کے خاندان
 سے قریبی تعلق تھا اداں کے والد نواب برہان الملک سعادت خاں کے حقیقی بھانجے
 تھے) اس واسطے ہو سیکم صاحبہ کے دامن تربیت میں ناز و نعمت سے پرورش پائی
 جب تک فیض آباد میں رہے اپنا کلام مستحسن خلعت کو دکھلاتے اور فائز تخلص کرتے
 تھے ۱۲۲۲ھ میں لکھنؤ چلے آئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ لکھنؤ آکر خواجہ حمید علی
 آتش کے شاگرد ہوئے۔ اور اب رند تخلص رکھا۔ پہلا دیوان ”جو گلہ رتہ عشق“ کے
 نام سے مشہور ہے ۱۲۵۵ھ میں مرتب ہوا۔ دوسرا دیوان انکی وفات کے بعد
 شائع ہوا تخلص کی مناسبت سے زندانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اور دربار اودھ کی

مشہور عیش و عشرت اور مزہ داریوں کا پورا لطف اٹھاتے تھے۔ اپنے اُستادِ آتش کے مرنے کے بعد شراب چھوڑ دی تھی اور منہیات سے تائب ہو گئے تھے۔ اسی عرصہ میں بارادہ حج روانہ ہوئے۔ مگر راستہ میں بمقامِ ممبئی عینِ غدر شروع ہونے سے کچھ دنوں پہلے سفر آخرت اختیار کیا۔ کلامِ ان کا نہایت صاف اور سادہ ہر جسمیں محاورات کی برجستگی اور تاثیر کا رنگ جھلکتا ہے۔ بلند پروازی اور خیالِ آفرینی ان کے یہاں کم ہے۔ مگر مذاقِ شعر بہت سلیم ہے اور ان کے اشعارِ مہذب کانوں پر ناگوار نہیں ہوتے۔ کچھ ایسے بھی اشعار پائے جاتے ہیں جن میں روحانیت اور تصوف کی جھلک ہے۔ غرض کہ آتش کے شاگردوں میں ان کا بہت بڑا درجہ ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

دیدلیں کے لیے دیدہ بجنوں ہے ضرور میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

ولہ

پھینک دینگے اسے ہم چیر کے پہلو اپنا تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

ولہ

آئندہ لب لباب کے کریں آہ و زاریاں تو ہائے گل بچار میں چلاؤں ہائے دل

مقابلہ کرو۔

بنال لب لباب اگر بامنت سراپا رسیست کہ ماد و عاشق زاریم و کارا زار رسیست (حافظ)

ای لب لباب اگر زانی من باتو ہم آواز م تو عشق گداوی من عشق گل اندامے (سعدی)

او دل ہر تیرنگہ پھر کیا تو نے اگلے ہی مرے زخم جگر تھے ابھی آئے

ولہ

دو چاکہ گامیاں سے ہو دو تیرے دست ٹوٹیں یہ پاؤں دیکھو تو آکر کہاں تھکے

قطعہ

بس اب آپ تشریف لیجائیے گزرنی ہے جو کچھ گزر جائیگی
طبیعت کو ہوگا قلق چند روز ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائیگی

خلیل میر دوست علی متخلص بخیل سید جمال علی کے صاحبزادہ تھے اور بڑی ملک اودھ کے رہنے والے تھے۔ یہ بھی آتش کے مشہور شاگردوں میں ہیں۔ ۱۲۹۹ء میں نواب نادر مرزا کی رفاقت میں کلکتہ گئے۔ ان کے کلام میں ناہمواری ہے بعض اشعار نہایت عمدہ اور بلند اور بعض بالکل معمولی ہیں۔ ان کو بھی غیر مانوس الفاظ اور رعایت لفظی کا بہت شوق ہے شعر عاشقانہ ہوتے ہیں مگر وہی عشق مجازی اور بعض میں ابتذال پایا جاتا ہے۔

نسیم پنڈت دیاندر کول متخلص بہ نسیم خلف پنڈت گنگا پرشاد کول آتش کے شاگرد اور رشنوی گلزار نسیم کے مشہور مصنف ہیں۔ پنڈت جی عموماً اپنے تخلص ہی سے مشہور ہیں۔ ایک محضر کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۱۲۲۷ء میں پیدا ہوئے اور عین جوانی کی حالت میں ۱۲۷۷ء میں بعمر ۵۰ سال انتقال کیا۔ فارسی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے اور بہرامجد علی شاہ بادشاہ اودھ فوج میں بخشی گری کے عہدہ پر مامور تھے۔ بچپن ہی سے اُن کو شعر و سخن سے شوق تھا۔ چنانچہ اکثر اساتذہ اُردو و فارسی کا کلام بخوبی پڑھا تھا بعمر ۲۰ سال آتش کے شاگرد ہوئے۔ ان کی زندہ جاوید تصنیف رشنوی گلزار نسیم میحسن کے جواب میں ہے۔ مشہور ہے کہ پہلے یہ بہت ضخیم تھی مگر استاد کے کہنے سے اُنھوں نے اس کو مختصر کر دیا۔ اور اب یہ اختصار کی ایک لاجواب مثال ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۵۲ء

اور سنہ اشاعت ۱۲۱۵ھ ہی اس وقت مصنف زندہ تھے اور اسکی اشاعت سے نفقاً ان کی شہرت ہو گئی۔ اس کا ایجاز۔ روانی۔ مناسبت الفاظ۔ جہنگلی محاورات۔ نادر تشبیہات و استعارات۔ یہ سب قابل تعریف ہیں۔ البتہ تصنیع ضرور ہے۔ اور اسی وجہ سے اسکی حقیقی دلاویزی اور تاثیر میں کمی ہے۔ فن کے لحاظ اور تخیل کے اعتبار سے یہ ایک معرکہ الار تصنیف ہے۔ ثنوی سحرالبیان سے اس کا مقابلہ ایک فضول سی بات ہے کیونکہ دونوں کا طرز جدا ہے۔ یہ ثنوی اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے بہت سے اشعار بطور ضرب المثل زبان پر چڑھ گئے ہیں۔ اس سے پندرت دیا شکر کا نام ہمیشہ کے لیے روشن ہے اور وہ اردو کے ایک مایہ ناز شاعر کہلائے جانے کے قراواقعی مستحق ہیں۔

صبا۔ میر ذریع علی نام۔ میر بندہ علی کے بیٹے تھے لکھنؤ وطن تھا یہیں پیدا ہوئے اور یہیں ان کا نشوونما ہوا۔ اُن کے چچا میر اشرف علی نے اُن کو بیٹا بنایا تھا اور انھوں ہی نے اُن کو بقدر ضرورت عربی اور فارسی کی تعلیم دی تھی صبا بہت خلیق اور منسا اور بڑے یار باش آدمی تھے۔ اُن کے دوست احباب ہر وقت اُن کے پاس رہتے تھے اور انکی خاطر تواضع یہ دل کھول کر کرتے تھے۔ دو سو روپیہ اجداد کی سرکار سے اور تیس روپیہ ماہوار نواب محسن الدولہ کے یہاں سے ملتے تھے خود آتش کے مشہور شاگرد تھے اور اپنے بھی بعض مشہور شاگرد چھوڑے۔ ۱۲۱۵ھ میں گھوڑے سے گر کر جان دی۔ ان کا ایک ضخیم دیوان عاشقانہ رنگ میں شائع ہو گیا ہے جسکا نام غنچہ آرزو ہے۔ ایک ثنوی شکار نامہ واجد علی شاہ بھی انکی یادگار ہے۔ ان کے کلام میں تصنیع اور آورد اور غیر مانوس الفاظ کی کثرت ہے کبھی کبھی کوئی

تھوڑا ہوا شعر اپنے استاد آتش کے رنگ کا بھی کہہ جاتے ہیں۔

آغا جوشرف میر سادات حسین خاں نام عرف آغا ججو واجد علی شاہ بادشاہ
 اودھ کے سمجھی یعنی مرزا حامد علی کوکب ولیمہ کے خسر تھے۔ صدر کے بعد اودھ
 کے مصیبت زدہ قافلہ کے ساتھ یہ بھی کلکتہ چلے گئے اور مٹیابرج میں ولیمہ
 کے ہمراہ تھے اتفاق سے ولیمہ کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا جس سے ان کو
 سخت صدمہ ہوا جو کلام سے ظاہر ہو رہا ہے۔ ان کا طرز کلام وہی ہے جو کھنؤ
 اسکول کے شعر کا ہے یعنی زبان نہایت صاف و سلیس۔ بندشیں اور ترکیبیں
 دیکھیں۔ البتہ مضمون آفرینی کی کمی ہے۔ فارسی اور عربی الفاظ ان کے کلام میں
 بہت کم ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

جہاں میں حسن پرستوں کی جان لینے کو	نکھر نکھر کے نکلتے ہیں خوب رو کیا کیا
ٹپک ٹپک کے کہیں گل بنا کہیں لالہ	چمن میں رنگ نہ لایا مرا ہو کیا کیا
زباں جو ان کی شرف نشہ میں بہکتی ہے	مزے مزے کی وہ کرتے ہیں گفتگو کیا کیا
پھر طک کے جان نہ دیتا تو آہ کیا کرتا	قفس سے اور نکلتے کی راہ کیا کرتا
شاخ گل جھوم کے گلزار میں سیدھی جو ہوئی	پھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑانی کا
را کے دھونی جو بیٹھا ہوں ناگ پر اٹکی	اسی لکیر کا مجھ کو فقیر ہونا تھا

اس دور میں زبان میں
 کیا تغیرات ہوئے

تذکرہ جلوہ خضر و شعر الہند میں ایک مختصر فہرست ان تغیرات کی دی ہے جو
 نسخ اور آتش اور نیز ان کے شاگردوں کے عہد میں نظم و مدح میں وقوع پزیر
 وہ تغیرات یہ ہیں بغیر افسوس و موٹے موٹے فارسی و عربی الفاظ اور ترکیبوں کی اکثر ہندی الفاظ جو ترک
 کر دیے گئے تھے انکا پھر دخل شعر کیا جانا ضرر ان محاورات کا استعمال جو سن کو بڑھائیں اور محفل میں معشوق کا
 خط و خان گل و بلبل و شرم و غریب وغیرہ کے رواج اور زور کا ترشہاٹ استعارات اور فضول مبالغوں کی کمی۔

باب

دربار لکھنؤ اور اُس کے شعرا

واجد علی شاہ اختر کا عہد

جس طرح دلی اردو شاعری کا گہوارہ تھا۔ اسی طرح اُس کے زوال کے بعد لکھنؤ اُس کا مسکن و امن بن گیا۔ اس وجہ سے کہ دلی کے سب پرانے استاد مثل آرزو اور میر و سودا و سوز و غیرہ کے اپنا وطن چھوڑ کر اور فرمانروایاں اودھ کی داد و دہش اور جو دو سخا کے افسانے سن کر لکھنؤ چلے آئے۔ شاہان اودھ نے بادشاہان دہلی کے تنبع میں نہ صرف بڑے بڑے شاعر اپنے دربار میں جمع کئے تھے بلکہ خود بھی شعرو سخن کی طرف متوجہ ہو گئے تھے جیسا کہ فرمانروایان ذیل جن کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے سب شاعر تھے۔

آصف الدولہ آصف نواب آصف الدولہ متخلص بہ آصف شعرو سخن کے بڑے قدردان

و مُرتبی تھے جنکی سخاوت اب تک ضرب المثل ہے۔ نواب یحییٰ خاں نام مرزا امامی عرف آصف تخلص تھا۔ نواب شجاع الدولہ بہادر کے فرزند دلبند اور جانشین تھے۔ ۲۷ برس کی عمر میں بمقام فیض آباد ۱۱۸۷ھ میں مسند نشین ہوئے۔

تاریخ جلوس یہ ہے

گشت از پائے آصف الدولہ رونقِ مسند وزارتِ ہند

دہائیوں کے تعمیر سے جو لفظ آصف الدولہ کی آخری ہ کے عہد میں مشہور ہوئے ہیں
 جب لکھنؤ دار السلطنت ہوا تو انھوں نے مشہور محل اور عمارتیں یہاں تعمیر کرائیں جو اب تک
 انکی یادگار موجود ہیں انکو فن تعمیر کا بہت شوق تھا۔ ان کے عہد میں انگریزوں کی
 آمد اور دہ میں زیادہ ہوئی اور ان کا رسوخ بڑھتا گیا۔ کئی انگریز اجارہ داری نوکری
 و تجارت کے سلسلہ سے اور دہ میں آئے۔ ریزیدنسی کے خرچ کی تعداد لاکھوں تک
 پہنچ گئی تھی۔ اس دربار میں ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدے ملے تھے۔ راجہ
 نول رائے صفدر جنگ کے دیوان تھے راجہ مہنی بہادر شجاع الدولہ کے مشیر تھے
 اور آصف الدولہ کے زمانے میں راجہ ٹکلیٹ رائے بہار راجہ جھانوالال۔ اور
 خوشحال رائے پسر راجہ نول رائے حلیل القدر عہدوں پر ممتاز ہوئے۔ شعر و شاعری
 اور جملہ علوم و فنون کے بڑے قدردان تھے خود بھی شعر کہتے تھے اور اپنا کلام سیر
 کو برائے اصلاح دکھاتے تھے۔ نواب موصوف کے کلام میں اپنے استاد کی سی سادگی
 اور صفائی ہے۔ اور تصنیع اور تکلف جو ناسخ کے زمانہ میں وبال جان ہو گیا ان کے
 یہاں نہیں ہے۔ ایک اردو دیوان ان سے یادگار ہے جس میں تقریباً بیہ صفحات
 میں غزلیں ۷۰، ۱۰ صفحات میں رباعیاں اور خمس اور ۱۰۰ صفحات میں ایک
 مثنوی ہے۔ انھیں کے مبارک عہد میں ملک الشعر امیر ارفع سودا اور خدائے سخن
 میر اور میر سوز وغیرہ دلی سے لکھنؤ آئے اور انھیں کی سرکار و ولہدار کے مداح
 اور وظیفہ خواہ رہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

جہاں تیغ اُس کی علم دیکھتے ہیں وہاں اپنا سر ہم قلم دیکھتے ہیں
 جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں

گزرتے ہیں سو سو خیال اپنے دل میں کسی کا جو نقش قدم دیکھتے ہیں
بتوں کی گلی میں شب و روز آصف تماشہ خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

آصف الدولہ کے بعد ۱۷۹۷ء میں انکے بیٹے وزیر علی مسند وزارت پر
بیٹھے مگر چار ہی مہینے کے بعد ان کو انگریزوں نے مغرول کر دیا

نواب وزیر علی خاں
اتخلص بہ وزیر دوزیری

کہا یہ گیا کہ وہ نواب آصف الدولہ کے صاحبزادے نہیں ہیں ممکن ہے یہ وجہ ہو
کہ وزیر علی کے مزاج میں سرکشی تھی معزولی کے بعد وہ بنارس بھیجے گئے جہاں
غصہ میں انھوں نے مسٹر چیری رزیڈنٹ کو مار ڈالا اور سرکشی و بغاوت شروع کر دی
آخر کار جے پور میں جہاں کہ انھوں نے پناہ لی تھی گرفتار ہو کر انگریزوں کے حوالے
کئے گئے پھر وہ سرکاری حکم سے قلعہ فورٹ ولیم میں قید کئے گئے۔ وزیر علی شعر
کہتے تھے اور وزیر تخلص کرتے تھے۔ ایک غزل کے چند اشعار جو مصیبت کی حالت
میں لکھے تھے درج کیے جاتے ہیں -

جوں سبزہ زندے لگتے ہی پڑیں کے تلے ہم اس گردشِ فلک سے پھولے نہ پھلے ہم
راں بہت رکھتے تھے ہم دل کے چمن میں بیٹھے نہ خوشی سے کبھی سائے کے تلے ہم
ہم وہ نہ قلم تھے کسی مالی کے لگائے نرگس نہابوں میں تھے آصف کے پلے ہم
زندہ ان مصیبت میں بھلا کس کو بلائیں رہتے ہیں وزیر ہی سے دُرات پلے ہم

نواب سادات علی خاں نواب آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی نواب سعادت علی خاں

مسند وزارت پر متمکن ہوئے۔ ان کے عہد میں انگریزی گورنمنٹ سے ایک عہد نامہ
کیا گیا جس سے انگریزوں کا سوخ بڑھ گیا۔ ان کا دو تہائی ملک ان کے قبضہ
انکل کر انگریزی علاقہ میں شامل ہو گیا۔ چونکہ ملک میں ہر طرف امن و امان تھا

بادشاہ کو عیش و عشرت کے سواے اور کوئی کام نہ تھا۔ یہ بھی مثل اپنے بٹے بھائی
 آصف الدولہ کے علوم و فنون کے بڑے قدردان تھے اور خود بھی کبھی کبھی شعر کہتے
 تھے گو کہ ان کا کوئی کلام نہیں ملتا۔ مصحفی اور انشا کے مشہور معر کے انھیں کے زمانہ
 کی یادگار ہیں۔ سید انشا سعادت علی خاں کے دربار کے شاعر تھے اور جان بلی
 انگریزوں کی طرف سے ریزیڈنٹ۔

غازی الدین حیدر نواب سعادت علی خاں کے بعد اُن کے بیٹے غازی الدین حیدر
 مسند وزارت پر ۱۲۸۷ھ میں جلوہ افروز ہوئے۔ اوپانچ برس بعد بعد نواب گورنر جنرل بہادر
 لارڈ ہیسٹنگز نواب وزیر سے بادشاہ کہلائے جانے لگے چنانچہ جب ۱۲۹۷ھ
 میں انکی تخت نشینی ہوئی تو اس قدر ساز و سامان اور تکلف اس تقریب میں کیا گیا کہ
 زرو جواہر بکثرت لٹائے گئے۔ ناسخ نے تاریخ کہی ۷
 بگو ناسخ کہ ظل اللہ گردید

غازی الدین حیدر اردو شعر کہہ لیتے تھے۔ مگر اُن کا کلام جو زیادہ تر منقبت
 اور مرثیہ کی صورت میں ہے اس قدر روکھا پھیکا اور ہمزہ ہے کہ ڈاکٹر سپرنگر
 کا قول اُن کے متعلق سچ معلوم ہوتا ہے کہ ”اُن کے اشعار اس درجہ خراب ہیں
 کہ واقعی بادشاہ کا کلام معلوم ہوتے ہیں۔“

نصیر الدین حیدر غازی الدین حیدر کے بعد اُن کے بیٹے نصیر الدین حیدر تخت سلطنت
 پر بیٹھے ان کا زمانہ سلطنت ۱۲۸۷ھ سے ۱۲۸۷ھ تک ہے۔ مسند نشینی کی تاریخ ہی
 جاودان سلطنت ہند مبارک باشد

جس سے بارہ سے تینتالیس نکلتے ہیں۔ یہ بھی مثل اپنے پدر بزرگوار کے ائمہ معصومین

کی شان میں اکثر کہا کرتے تھے۔ اور بادشاہ تخلص کرتے تھے۔ چنانچہ اُن کی یہ غزل مشہور ہے۔

یکس مست کے آنے کی آرزو ہو کہ ساقی لیے ساغر مشک بو ہو
سمایا ہو جبے تو نظر نہیں میری جدھر دکھیتا ہوں دھر تو ہی تو ہو
جتاؤں میں کیا اپنا حال پشایا عیاں لفظ لہار سے موبو ہو
چلو قبر فرہاد پر فاختہ کو مگر آب شیریں سے لازم وضو ہو
شفق بن کے ہوتا ہو گرو وں ظاہر یکس کشتہ بے گنہ کا لہو ہو
گلستاں میں جا کر ہر گل کو لکھا نہ تیری سی نگہ نہ تیری سی بو ہو

رہے سایہ نہجتن بادشاہ پر

خداوند عالم نگہبان تو ہے

نصیر الدین حیدر کے بعد ان کے حقیقی چچا محمد علی شاہ (۸۲۲ھ لغایت ۸۲۳ھ) اور پھر ان کے بیٹے امجد علی شاہ (۸۲۳ھ لغایت ۸۲۴ھ) تخت نشین ہوئے۔ یہ بھی علوم و فنون کے مرنی اور شعرو سخن کے قدردان تھے۔ اور اُن کے زمانہ میں بھی شعرا و انعام و اکرام اور وظائف اور مناصب سے سرفراز ہوتے تھے۔ ان کے بعد امجد علی شاہ کا زمانہ آیا جو کسی قدر تفصیل طلب ہے لہذا علیحدہ لکھا جاتا ہے۔

یہ تخلص سلطان عالم حضرت واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کا ہے۔
بعد وفات امجد علی شاہ اُن کے بیٹے سلطان عالم واجد علی شاہ بھرم ۲ سال (۸۲۴ھ) میں سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ مبارک مبارک ہو شاہانہ تاج
تاریخ جلوس ہوئی۔ سلطان عالم کو فن تعمیر سے بے حد شوق تھا تخت نشین ہوتے ہی

تعمیر قصر باغ کا خیال پیدا ہوا۔ اُس کو عمارات و ایوان دلکشا۔ بارہ دری۔
 نہر۔ پہل سنگ مرمر و تصاویر سنگی سے مزین کیا۔ مشہور ہے کہ دو کروڑ سپر
 اس عمارت میں صرف ہوا۔ یہاں ہر برسات میں ایک خاص میلہ ہوتا تھا جسکے
 محکفات اور شان و شوکت بڑھے لوگوں کی زبانی اب تک سنے جاتے ہیں سلطان عالم
 کو شروع میں چند روز انتظام مملکت کا شوق اور عدالت و رعایا پروری کا ذوق
 رہا مگر بالآخر مصاحبوں اور بدخواہ ہم نشینوں نے رفتہ رفتہ مزاج کو بدل دیا اور عیش
 و عشرت کی طرف مائل کر دیا۔ اب بجز محفل رقص و سرود اور کوئی مشغلہ باقی نہ رہا
 شہنوی غزالہ و ماہ پیکر کی تصنیف سے جلسہ ریس کی بنیاد پڑی۔ صدر باغ بصورت
 اور خوش گلو طوائفیں ملازم ہو گئیں جو محفل شاہی کو اپنے پرائر نفموں سے محفوظ
 کیا کرتی تھیں۔ غرض کہ اسی عیش و عشرت و زناچ رنگ کی بدولت میں انتہادرجہ کی برہمی
 پھیل گئی جسکی وجہ سے سلطنت انگریزی کو بار بار فہمائش کرنا پڑی۔ مگر اس کا کوئی
 نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر کار ۱۸۵۷ء کو انتزاع سلطنت کا حکم سنایا گیا۔
 اور ایک ہفتہ کے اندر عظیم الشان ملک جسکی آمدنی دو کروڑ سالانہ سے کم نہ تھی
 بادشاہ کے قبضہ سے نکل کر حکومت انگریزی میں شامل ہو گیا۔ سلطان عالم مغزولی
 کے بعد کلکتہ بھیج دیے گئے اور یہ شعر کہتے ہوئے کلکتہ چلے گئے۔
 درود دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں رخصت لے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں
 جہاں تقریباً ڈیڑھ دو سال قلعہ فورٹ ولیم میں نظر بند کیے جانے کے بعد حملہ ٹیپو
 میں قیام اختیار کیا۔ چونکہ سلطان عالم کو ہمیشہ سے فن تعمیر سے دلچسپی تھی یہاں بھی
 انھوں نے عالیشان کوٹھیاں اور پرفضا باغات بنوانا شروع کیے اور تھوڑے ہی

عرصہ میں ٹیا بُرج لکھنؤ کا ایک مختصر نمونہ بن گیا سلطان عالم نے جو سفر لکھنؤ سے کلکتہ تک کیا تھا اُس کا مختصر حال اپنی ایک شنوی میں جس کا نام ”حُزنِ اختر“ ہے۔ قلمبند کیا ہے۔

سلطان عالم کو مختلف چیزوں سے شوق تھا۔ مگر ہرات میں نفاست اور جدت طرازی ملحوظ رہتی تھی۔ جانوروں اور مختلف اقسام کی چڑیوں سے اتنا شوق تھا کہ اُن کا کلکتہ کا چڑیا خانہ دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ فنِ موسیقی اور علیٰ مخصوص ناچنے اور تبانے کے لطیف فن میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اسی طرح شعر و سخن کے بھی بجد دلدادہ تھے۔ اور بڑے بڑے کامل استاد اس فن کے اپنے دربار میں جمع کر لیے تھے۔ اگر سچ پوچھیے تو انھیں شوقوں کی زیادتی نے یہ روز بد دکھایا۔ علاوہ اُردو کے ٹھیٹھ ہندی میں بھی اُن کا کلام موجود ہے اور اُن کی بنائی ہوئی ٹھمریاں، داورے وغیرہ جسمیں وہ ”جانِ عالم پیا“ تخلص کرتے تھے اب تک لکھنؤ میں زباں زد خاص و عام ہیں۔ کلکتہ ہی میں سٹیشن ۷ میں اس دار فانی سے رحلت کی۔

تصانیف ان کی متعدد تصانیف اس وقت موجود ہیں۔ اور مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی جسمیں قصائد، غزلیات، مثنویاں، مرثیہ، وغیرہ سب شامل ہیں۔ تصانیف حسب ذیل ہیں۔

- (۱) - چھ دیوان تفصیل ذیل شیوع فیض۔ مضمون۔ سخنِ اشرف۔ گلہ سٹہ عاشقاں۔ ماہِ ملک۔ نظم نامور
- (۲) مثنویاں۔ حُزنِ اختر (جس کا ذکر اوپر ہوا)۔ خطاباتِ محلات۔

اس میں اُن محلات کا ذکر ہے جن کے ساتھ عقد ہوا یا جن کے ساتھ متعہ ہوا۔
اور کن کن سے اولاد ہوئی اور کن کن کو طلاق دیا گیا۔ یہ شنوی اُس وقت کی
تصنیف ہے جب بادشاہ ایام غدر میں فورٹ ولیم میں قید تھے۔ بنی۔ ناچو۔
دھن۔ شنوی درفن موسیقی۔ ڈریاے عشق۔

(۳) مراٹی۔ جنگی تین جلدیں ہیں۔ ایک موسوم بہ جلد مراٹی جس میں ۲۵ مرثیے
یاد و نہر ایک سو گیارہ بند ہیں۔ دفتر غم و بھراں۔ اس میں ۱۰۰ مرثیے ہیں۔
اس میں ۳۳ مرثیے ہیں۔

(۴) قصائد اُردو و فارسی موسوم بہ قصائد المبارک

(۵) مباحثہ بین نفس و عقل۔

(۶) صحیفہ سلطانی۔ اس میں کچھ ادعیہ اور آیات قرآنی ہیں۔

(۷) نصائح ختری۔

(۸) عشق نامہ

(۹) رسالہ ایمان در بیان مصائب اہل بیت

(۱۰) دفتر پریشاں۔

(۱۱) مقتل معتبر

(۱۲) دستور واجدی در سیاست مدن

(۱۳) صوت المبارک

(۱۴) ہیبت حمیدی

(۱۵) جوہر عروض (۱۶) ارشاد خاقانی۔ یہ آخری دو کتابیں علم عروض میں ہیں

مختصر یہ کہ ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً ۲۰ جلد ہوگی۔ اصلاح سخن میں مظفر علی آسیہ اور نواب فتح الدولہ برق سے لیتے تھے۔ برق کو مزاج شاہی میں خاص خصوصیت حاصل تھی اور بادشاہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے ساتھ ہی ساتھ کلکتہ گئے اور وہیں چند ماہ بعد ۱۷۵۸ء میں انتقال کیا۔ یہ شعران کا ان کے حسب حال ہوا۔

برق جو کہتے تھے آخر وہی کر کر اٹھے جان دی آپ کے دروازے پر کر اٹھے
آسیہ برخلاف اس کے شرف رفاقت سے محروم رہے اور لکھنؤ ہی میں رہے۔
یہ بات سلطان عالم کو ناگوار گزری تھی علاوہ آسیہ اور برق کے اس عہد کے مشہور
شاعر۔ آمانت قلیق بجز۔ سحر۔ ذکی۔ درخشاں۔ قبول شفق۔ بیخود۔ ہنر عطار۔
ہلال۔ سرور تھے جن میں سے اکثر دامن دولت سے وابستہ بھی تھے صاحبزادوں
میں نواب ولیعہد بہادر کوکتب اور نواب برجیس قدر بہادر جو پس تخلص کرتے تھے۔
طرز کلام [طرز کلام وہی ہے جو اُس زمانہ میں لکھنؤ کے شعرا کا عام رنگ تھا۔
رعایت لفظی کا اکثر خیال رہتا ہے سوز و گداز کی کمی ہے۔ البتہ اُن کی شہنوی
حُزن اختری جس میں مصائب سفر کا بیان ہے نہایت دلکش اور پُر تاثیر نظم ہے
اسکی سلاست اور فصاحت اور خوبی زبان کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ دیوانوں اور
شہنویوں کے علاوہ ان کے خطوط بھی بہت دلچسپ ہیں جو انھوں نے قیام کلکتہ
کے زمانہ میں اپنی محبوب بیوی نواب زینت محل کے نام لکھے تھے جن کو نواب اکیل محل
یا ممتاز جہاں کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ یہ خطوط بادشاہ کی اجازت سے مقفے
اور مسجع دیباچہ کے ساتھ اکبر علیاں تو قیر نے جو بادشاہی منشی تھے جمع کئے۔ یہ خطوط

بترتیب سنہ جمع کئے گئے ہیں اور ۱۲۷ھ میں شائع کئے گئے۔ ان میں اکثر شاعرانہ انداز کے ساتھ نہایت محبت اور اخلاص سے اپنا اشتیاق اور لکھنؤ کی یاد کا درد نگیز صورت میں بیان کیا ہے۔ یہ خط اس لیے جمع کیے گئے تھے کہ بادشاہ کو قید کے مصائب اور اپنی پیاری بیوی کی مفارقت سے کسی قدر تسکین ہو۔

نمونہ کلام یہ ہے :-

اس عشق نے سو کیا میں کیا بتاؤں کیا کیا
آہ دل ناشادے اور آسماں پیدا کیا
کمر دھوکا۔ دہن عقد غزال لکھیں پری چہرہ
شکم ہلیر بدن خوشبو حبیس دریا۔ زباں علی
برائے سیر مجھ سازد میخانہ میں گم آئے
گرے ساغر لندے شیشا ہنسے باقی بے دریا

یہی تشویش شب و روز ہے بنگالے میں لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا

یہ تمنا نہ رہے زیست میں اے بار خد
پھر مجھے لکھنؤ دنیا میں دکھائے غربت
ہاں طن دیکھوں تو شاداں ہو دل زار مرا
یہ بھی ممکن ہے کہ دوتے کو ہنسائے غربت
و معیتِ خلد سے بڑھ کر ہے کہیں خوب وطن
تنگی گور سے بدتر ہے فضا کے غربت
یوں تو شاہان جہاں پر ہی پڑا وقت مگر
ختم ہے آستر بیکس پہ جھائے غربت

اسیر سید مظفر علیخان متخلص بہ اسیر خلع سید ابراہیم علی امیٹھی کے رہنے والے تھے کتب درسیہ علمائے فرنگی محل سے پڑھیں مصحفی سے اصلاح سخن لیتے تھے نصیر الدین حسین کے زمانہ میں شاہی ملازمت شروع کی اور امجد علی شاہ کے عہد میں اقتدار پایا۔ اسکے بعد آٹھ نو سال تک داجہ علی شاہ کے مصاحب ص رہے اور تہذیب الدولہ و مہذب الملک کے

معزز خطاب سے سرفراز ہوئے۔ بادشاہ کبھی کبھی اپنے کلام میں بھی ان سے مشورہ کرتے تھے جب بادشاہ کلکتہ جانے لگے تو انھوں نے رفاقت منظوری کی جس سے بادشاہ آزرده خاطر ہوئے جس کا ذکر جا بجا اپنی تصانیف میں کیا ہے۔ بعد غدر نواب یوسف علی خاں والی رامپور اور پھر ان کے صاحبزادے نواب کلب علی خاں نے انکی اور ان کے کلام کی بڑی قدر دانی کی۔ پھر مدت العمر اسی ریاست کے دعا گو رہے اور چھ ماہ رامپور اور چھ ماہ لکھنؤ رہا کرتے تھے ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں بمبئی ۸۱ برس لکھنؤ میں انتقال کیا اور یہیں مدفون ہوئے۔ بہت مشاق اور پر گو شاعر تھے انکی تصانیف میں چھ دیوان اردو ہیں جس میں سے چار چھپ چکے ہیں ایک دیوان فارسی اور ایک ثنوی "درۃ التاج" اور رسالہ عروض بھی شائع ہو گئے ہیں۔ ان کے علاوہ مرثیے اور قصائد بھی بہت سے لکھے ہیں۔ علم عروض اور فن نظم کے استاد کامل تھے۔ زبان پر انکی حیرت انگیز قدرت سب کو تسلیم ہے مگر کلام کا رنگ وہی ہے جو اُس زمانہ کے اہل لکھنؤ کا تھا۔ البتہ کبھی کبھی اس رنگ خاص سے علیحدہ ہو کر اچھے اچھے شعر نکالتے ہیں۔ شاگرد بھی بہت زبردست اور زامی گرامی پائے مثلاً امیر مینائی ان کے علاوہ انکے دونوں بیٹے متخلص بحکیم و فضل اور نیز شوق اور واسطی بھی مشہور شاگرد اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

کہنے کو یوں جہان میں ہزاروں ہیں یادوست	مشکل کے وقت ایک ہی پروردگار دوست
کس سے کہوں تلون انہاے روزگار	دشمن یہ لاکھ بار ہوئے لاکھ بار دوست
خدا سے جتنا ہو یہاں کافر و نیک و نیک	زاہد اتنا تو نہیں بجہ و زنا میں فرق
زنجیر تعلق مے پاؤں سے تو بیکلے	ہو فاصلہ دو گام کا ہستی سے عدم تک

آیا ہے ہکڑا تھ یہ مضمون چراغ سے روشن اُسی کا نام ہے جو جلائے دل
امانت سید آغا حسن خلف میر آغا رضوی لکھنوی روضہ مشہد مقدس کے
 کلید بردار سید علی رضوی کی اولاد سے تھے شروع میں مرثیہ گوئی کا شوق ہوا۔
 میاں دلگیر کو جو اُس زمانہ کے مرثیہ گوئیوں میں نامور تھے اپنا کلام دکھاتے تھے
 چند روز بعد غزل گوئی کی طرف توجہ کی۔ چونکہ میاں دلگیر نے اصلاح دینے سے
 انکار کیا انھوں نے بھی اصلاح لینا ترک کر دی۔ ۱۲۰ھ میں بیس برس کی عمر میں
 کسی عارضہ کی وجہ سے قوت گویائی جاتی رہی اور گونگے ہو گئے مجبوراً بدریہ
 تحریر بات کرتے تھے۔ یہی حالت مسئلہ ۱۲۰ھ تک رہی آخر کار خدا کی قدرت سے
 یہ مرض جاتا رہا۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ کربلا جا کر زبان خود بخود کھل گئی
 اور قوت گویائی عود کر آئی۔ امانت کو معما اور حقیقتاں کہنے کا بہت شوق تھا۔ انکی
 تصانیف سے دیوان خزائن الفصاحت۔ گلدستہ امانت۔ اندر سجا اور اکثر مرثیے
 شائع ہو چکے ہیں۔ ایک واسوخت بھی لکھا ہے جو نہایت اعلیٰ درجہ رکھتا ہے۔
 ان کی تصانیف میں واسوخت اور اندر سجا کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔
 اندر سجا کو انوکھی اور دلچسپ کتاب ہونے کی وجہ سے اور نیز اسوجہ سے
 کہ اردو ڈراما کی حیثیت سے یہ سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اپنے جانشین و وارث کے
 چھوٹے لطافت اور فصاحت جو اپنے اپنے رنگ میں شعر لے لکھتے ہیں بہت نامور
 ہوئے۔ ان کا انداز کلام خاص ہے یعنی رعایت لفظی اور صنائع بدائع کا اس قدر
 شوق تھا کہ بعض شعر محض لفظی گو رکھ دھند معلوم ہوتے ہیں۔ لکھنؤ اسکول کے
 رنگ کے سب سے بڑے برتنے والے یہی ہیں جن کے لفظ لفظ سے تصنع اور

بنوٹ ظاہر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر لکھے جاتے ہیں۔
 بزم عالم میں یہ ہر شب ہرمانت کی دعا شمع روئے یار سے روشن مرا کا شانہ ہو
 فی سبیل اللہ پانی ان کو دوا سے آبلو کانٹے اب دیکھے نہیں جاتے زبان خار کے
 برعکس اسکے کہیں کہیں نہایت صاف اور مزیدار شعر بھی نکل آتے ہیں۔

آنسو رواں ہیں لطف سیہ کے خیال میں موتی پرور ہا ہوں جسے بال بال میں
 عشق کا خنجر لگا ہے دل پہ کاری لہڑیوں زخم کیصوت ہر خون نگھول جاری لہڑیوں
 فصل گل میں ات بس ہم ہوں اور میٹھا ہو ساقی موش ہو مگر ہوشیشہ ہو۔ بیانا ہو
 کوچہ قاتل تلک لے دل پرانی کیجئے کار نہ سرا تھا میں لے کر گدا ئی کیجئے

آفتاب لدولہ تعلق خواجہ ارشد علی خاں عرف خواجہ اسد اللہ ملقب بہ آفتاب لدولہ
 خواجہ وزیر کے بھانجے اور شاگرد بھی تھے۔ وہ اپنے آپ کو واجد علی شاہ کا بھی شاگرد
 بتاتے تھے۔ جو خوشامد اور زمانہ سازی پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور واقعیت سے دور
 ہے۔ ان کے کلام میں محض لفظی تصنیفات اور شنوی میں تو اکثر جگہ ابتذال اور رکاکت
 بھی پائی جاتی ہے۔ انہیں کوئی شک نہیں کہ بلحاظ زبان کے ان کا کلام بہت مستند
 اور قابل قدر ہے مگر شعر کی حقیقی خوبیوں سے محروم ہے۔ ان کی مشہور شنوی طلسمِ آفت
 نہایت دلچسپ اور قابل قدر کتاب ہے۔ ان کے دیوان موسوم بہ مظهر عشق کے
 شروع میں چند قصیدے واجد علی شاہ کی تعریف میں ہیں۔ ایک محسوس بھی ان کی
 تصنیف سے ہے جس میں بادشاہ کی نظر بندی کا حال نہایت دردناک طریقہ سے
 لکھا ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ رنج و افسوس محض اپنے عیش و عشرت کے مفقود ہونے کی
 وجہ سے ہے نہ کہ حب وطن اور بادشاہ کی محبت کے خیال سے۔

ذکی مدنی علیخان تخلص بہ ذکی شیخ کرامت علی کے بیٹے تھے۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے مگر آخر عمر میں مراد آباد جا رہے تھے۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ آئے اور شیخ ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ ایک قصیدہ بادشاہ کی تعریف میں پڑھا جسکے صلہ میں انعام و اکرام پایا۔ یہاں سے وہ دہلی اور پھر دکن گئے جہاں انکی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ دکن سے لوٹ کر واجد علی شاہ کے زمانہ میں پھر لکھنؤ آئے جنھوں نے ان کو ملک الشعرائی کا خطاب عنایت کیا۔ بعد ان نزاع سلطنت مراد آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی مگر نواب یوسف علیخان والی رام پور کی سرکار سے چند روز وابستہ رہے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد انبالہ گئے اور وہیں اسی سالہ میں انتقال کیا۔ علم عروض سے خوب واقف تھے اور اس فن میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے جو ۱۲۶۵ھ میں شائع ہوا تھا۔ مشاق اور خوشگو شاعر تھے۔ اور دوسرے درجہ کے شعراء لکھنؤ میں بلند پایہ رکھتے تھے۔

درخشاں سید علیخان مخاطب بہ مہتاب الدولہ کو کب الملک ستارہ جنگ کا تخلص ہے۔ اسیر لکھنؤی کے شاگرد تھے اور انھیں کی کوشش سے دربار رس ہو گئے تھے۔ بادشاہ کے ساتھ کلکتہ گئے اور وہیں انتقال کیا۔ فن نجوم سے بھی کچھ واقفیت رکھتے تھے۔ شاید اسی مناسبت سے یہ خطاب دیا گیا ہو۔ معمولی قابلیت کے آدمی تھے۔

خستہ قاضی محمد صادق خاں اختر قاضی محمد لعل کے صاحبزادے مہکلی بنگالہ کے قاضی زادوں میں تھے وطن چھوڑ کر لکھنؤ آ رہے تھے۔ یہ غازی الدین حیدر کا زمانہ تھا جنھوں نے ان کو ملک الشعراء کا خطاب دیا آخر مرزا قتیل کے شاگرد ہو گئے

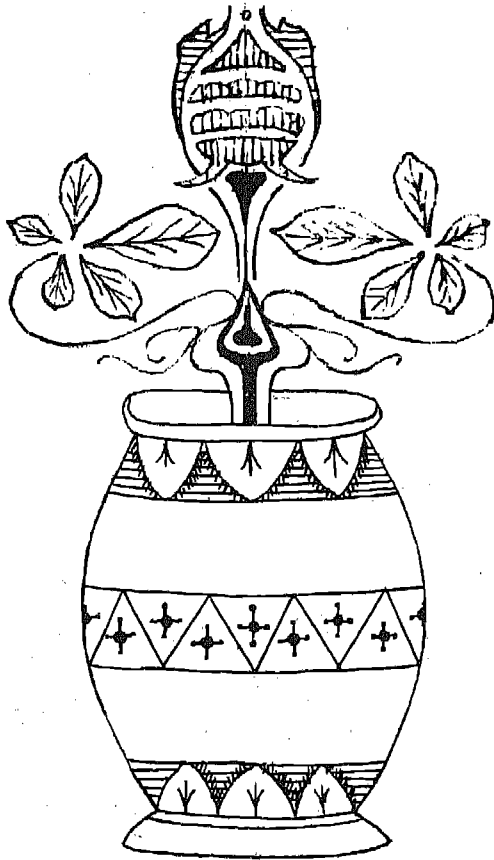
اور مصحفی جرأت اور انشا وغیرہ کے مشاعروں میں شرکت کی۔ چند دن فرخ آباد میں بھی قیام کیا تھا۔ مشہور ہے کہ واجد علی شاہ نے ان کا تخلص ان سے مانگ لیا تھا اور اسکے صلے میں بہت کچھ انعام و اکرام دیا تھا۔ تھوڑے عرصہ میں واجد علی شاہ کچھ ناراض ہو گئے جسکی وجہ سے ان کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا اور اٹاواہ کے تحصیلدار ہو گئے جہاں مشاعرے میں انتقال کیا۔ اختر بڑے جامع کمالات اور لکھنؤ کے نامی شاعروں میں سے تھے۔ فارسی بہت کہتے تھے چنانچہ ان کی فارسی تصنیفات حسب ذیل ہیں۔ ”مخامد حیدریہ“ غازی الدین حیدر کی تعریف میں۔ ”گلہ سترہ محبت“ جس میں گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز اور غازی الدین حیدر کی ملاقات کا حال ہے۔ ”شہنوی سرپا سوز“، ”صبح صادق“، ”جوانی سوانح عمری آپ ہی لکھی ہے۔“ ”شہزادہ آفتاب عالم تاب“، ”جسمیں پانچزار فارسی شعر کا حال اور کلام فراہم کیا تھا۔“ ”دیوان فارسی“، ”بہار بنجران“، ”بہار اقبال“، ”ہفت اختر“، ”ایک دیوان ریختہ“ یہ ان کی مشہور غزل قطعہ بند بطور نمونہ کلام پیش کی جاتی ہے :-

جب پردہ رخ سے دور کرے وہ نقاب کا	جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہو آفتاب کا
کل بن کے شیخ مجتہد عصر ساقیا	دکھلا کے باغ سبز ثواب و عذاب کا
کہنے لگا راہ تبختر مجھے طبع سنز	معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا
میں نے کہا کہ یہ تو میں ہم خوب جانتے	پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
گستاخی ہو معان تو اک عرض میں کروں	کیجیے جو آپ مجکو نہ مورد عتاب کا
تقوے ہلکے آگے ہو جب آپ کا درست	اور ہو یقین آپ کے اس اجتناب کا

۱۷ تذکرہ گل رعنا اور شمعانہ جاوید وغیرہ میں ان کے حال میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں فاطمہ پائی۔

مے ہووے کنج باغ ہو ساقی ہو باہوش اور واں محل نہ ہو کوئی باعث حجاب کا
 گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شمع بی حجاب دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا
 کھینچے منسی سے اپنا ملا کر وہ منہ سے منہ یہ ریش جس پہ جلوہ ہو رنگِ خضاب کا
 منت سے یوں کہے کہ ہمارا ہو پیے گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا
 اُس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو گر کچھ بھی خوف کیجئے روزِ حساب کا

اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
 قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا



باب

مرثیہ اور مرثیہ گو

مرثیہ کی تعریف مرثیہ وہ صنف نظم ہے جس میں کسی مردہ شخص کی تعریف کی جائے
 اہل اسلام اس کے بہت شائق رہے ہیں۔ یہ قصیدہ کے عکس ہے کیونکہ قصیدہ
 میں کسی زندہ شخص کی تعریف کی جاتی ہے۔ ^{مطلع}مطلع میں مرثیہ انھیں نظموں کو کہتے ہیں
 جس میں حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین اور دیگر شہداء کے کر بلا کی شہادت کا
 ذکر کیا جائے اور جو علی العموم محرم کے زمانہ میں کسی مجلس عزائیں یا کسی تعزیر کے
 ساتھ بہت سوز و گداز اور خوش الحانی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ ابتدا میں اس
 قسم کی نظمیں صرف بین کے اشعار تک محدود ہوتی تھیں یعنی ان میں ممدوح کی
 صفات حسنہ کا بیان ہوتا تھا اور اس کی موت پر اظہار افسوس کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے
 مرثیے بہت مختصر ہوتے اور ان کی غرض اصلی صرف گریہ و بکا ہوتی تھی۔ امتداد زمانہ
 سے مرثیہ کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور اس میں مختلف قسم کے نئے نئے مضامین داخل
 ہونے لگے مثلاً چہرہ، ممدوح کے مناقب، دشمنوں کے معائب، مناظر جنگ،
 مناظر قدرت، رجز خوانی، گھوڑے اور تلوار کی تعریف، سامان حرب ضرب وغیرہ
 اس قسم کے مضامین کے اضافہ سے مرثیہ کا مرتبہ بڑھ گیا اور آخر کار وہ اردو نظم کی
 ایک مستقل صنف بن گیا۔

مرثیہ کی قدامت عرب کی شاعری کی ابتدا مرثیہ ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ مگر جب شاعری شاعر کے ذاتی مفاد پر مبنی ہو گئی تو مرثیہ کو زوال ہونا شروع ہوا اس لیے کہ اس سے کسی قسم کے نفع کی امید نہ تھی۔ کیونکہ مرنے والا کسی کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب قدر قصیدہ گوئی کو جو ذاتی مفاد پر مبنی تھی ترقی ہوئی اتنا ہی مرثیہ گوئی میں تنزل ہوا۔ فارسی شاعری کی بنیاد چونکہ مکلف آورد، اور مداحی پر قائم ہوئی تھی اس لیے اسکی ابتدا قصیدہ گوئی سے ہوئی۔ اور وہ انواع سخن جنکو جذبات سے لازمی تعلق تھا جس میں مرثیہ بھی داخل ہے دفعتاً پستی کی حالت میں آگئے۔ ہر چند کہ قدامت کے یہاں ایسے بعض شعر ملتے ہیں جن میں فطرتی اثر اور جوش پایا جاتا ہے مثلاً شاہنامہ میں بادشاہ کا اظہار رنج و الم اپنے پیارے بیٹے شہرب کی موت پر یا فرخی کا مرثیہ محمود غزنوی کی وفات پر جو دس بارہ بیتوں سے زیادہ نہیں۔ مگر یہ یا اس قسم کے اور اشعار جو بینہ ہوں آجکل کے خیال کے مطابق بہ مشکل مرثیہ کہے جاسکتے ہیں۔ اسکے بعد سعدی اور خسرو کا زمانہ آیا۔ انھوں نے بھی مرثیے لکھے مگر وہ مقبول نہیں ہوئے۔ اور نہ لوگوں کو ان کے تتبع کا زیادہ خیال پیدا ہوا۔ ملا محمد شمس کا شی گو کہ ہمیشہ مرثیہ نگار تھے۔ مگر انھوں نے بھی طرز قدیم میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ اسی طرح طالب علی غزالی۔ سیلی کلیم وغیرہ نے گوکہ اور اصناف سخن میں خوب کہا ہے مگر انکے مرثیے مشہور نہیں ہیں۔ اسی طرح ظہوری کے مرثیے جو علی عادل شاہ کے واسطے لکھے گئے تھے بجز تعریفوں کے اور کچھ نہیں۔ البتہ ملا مقبل نے اس صنف میں ایک خاص زور اور جوش پیدا کیا جس سے ایران میں ایک تعمیر عظیم پیدا ہو گیا۔ اور ایرانی شاعر اس کو بہت پسند کرنے لگے۔

اُردو مرثیہ کی ابتدا جیسا ہم بیان کر چکے ہیں اُردو شاعری کی ابتدا کن میں ہوئی تھی اور اسکی ابتدائی کوششوں میں صنف مرثیہ بھی داخل تھی۔ شاہان گو لکندہ و بیجا پور نہ صرف شاعروں کے قدردان تھے بلکہ خود بھی مذہبی آدمی ہونے کی وجہ سے مرثیہ وغیرہ خوب کہتے تھے مگر مرثیہ اُس زمانہ میں بالکل ابتدائی حالت میں تھا ولی نے کوئی مرثیہ نہیں کہا۔ البتہ چند بند شاہ وجیہ الدین کی تعریف میں ہیں اُن کو مرثیہ سمجھیے یا کچھ اور۔ اسکے بعد جب شعراء دہلی کی ترقی کا زمانہ آیا تو یہ لوگ مرثیہ کے بہت شائق تھے اور اس کو ایک مذہبی فرض سمجھ کر لکھتے تھے۔ مرثیہ کی نظم میں چونکہ مذہبیت کا رنگ غالب ہوتا تھا اس لئے عیوب شاعری پر نکتہ چینی کی نظر نہ ڈالی جاتی تھی۔ میر تقی نے اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں اور میر حسن نے اپنے تذکرہ میں اکثر ایسے شعرا کا حال لکھا ہے جو مرثیہ گو تھے مثلاً میر انانی۔ میر عاصمی۔ تیر آل علی۔ درخشاں۔ سکندر۔ قصبر۔ قادر۔ گمان۔ بیکم وغیرہ اس طرح میر و سودا نے بھی مرثیے لکھے ہیں مگر ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ اُن میں حقیقی جذبات و اثر کی کمی ہے۔ میر ضاحک اور میر حسن کے مرثیے کوئی خصوصیت نہیں رکھتے البتہ اس لیے قابل قدر ضرور ہیں کہ یہ بزرگوار میر انیس کے اجداد میں تھے سودا کے وقت تک عموماً مرثیے جو مصرعے ہو کرتے تھے غالباً سب سے پہلے سودا نے مسدس لکھا جواب تک مروج ہے۔ اسی طرح ضمیر نے مرثیہ کے مضمون میں اضافہ کیا اور اس میں جدید تشبیہات و استعارات معرکہ کارزار کے مفصل حالات۔ شاعرانہ استدلال اور دلچسپ مبالغے داخل کیے جو انیس

۱۔ تذکرہ گل رعنائیں لکھا ہے کہ ولی نے کر بلا کے حالات میں ایک ثنوی لکھی ہے ۱۲۔

دوبیر کے زمانہ میں معراج کمال تک پہنچ گئے۔ ضمیر نے کلام میں زور بندش میں
چستی اور صفائی پیدا کی اور سوز کی جگہ تحت اللفظ پڑھنے کی بنیاد ڈالی۔

بزرگانِ انیس در انگی خدا
مرثیے کے ساتھ

ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں کہ میرا بی۔ اور میرا صاحب اور میرا
مرثیے کے تھے مگر اب وہ ملتے نہیں میرا حسن کے چار بیٹے تھے

جسمیں سے تین یعنی خلیق اور خلق اور حسن شاعر تھے۔ خلق اپنے والد ہی کے شاگرد
تھے صاحب دیوان ہیں اور مرثیہ بھی کہتے تھے اور سو برس کی عمر میں انھوں نے
انتقال کیا۔ خلیق بھی سبائے خود ایک نہایت مشہور شاعر تھے جن کے حالات علیحدہ
ذیل میں قلمبند کیے جاتے ہیں۔

خلیق
میر حسن خلیق میر حسن کے صاحبزادے عمر میں خلق سے چھوٹے تھے
فیض آباد اور لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی۔ سولہ برس کی عمر سے مشقِ سخن شروع کی
اور چونکہ خود ان کو شعر گوئی کا بہت شوق تھا اور باپ کو بوجہ تصنیفِ مثنوی
سحرالبیان فرصت نہ تھی لہذا ان کو مصحفی کا شاگرد کر دیا۔ تھوڑے دنوں میں
یہ مشاق ہو گئے اور کلام اسقدر بامزہ ہونے لگا کہ ایک مرتبہ مرزا محمد تقی ترقی کے
یہاں فیض آباد میں مشاعرہ تھا جس میں خواجہ حمید علی آتش بھی بلائے گئے تھے
اور خیال تھا کہ وہ وہیں روک لئے جائینگے۔ جب شروعِ جلسہ میں خلیق نے غزل
پڑھی۔ جس کا مطلع تھا۔

ریشک کینہ ہے اُس ریشک قمر کا پہلو صابِ ادھر سے نظر آتا ہے ادھر کا پہلو
تو آتش نے اپنی غزل بھار ڈالی اور کہا کہ جب ایسا شخص یہاں موجود ہے تو پھر
میری کیا ضرورت ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد جب میر حسن کا انتقال ہو گیا تو

عیال کا بوجھ سر پر پڑا۔ چونکہ آمدنی کچھ نہ تھی لہذا غزلوں کی فروخت سے اپنا کام چلاتے تھے۔ میخلیق ایک پر گوشاعر تھے ایک دیوان مرتب کر لیا تھا مگر وہ شائع نہ ہو سکا۔ آخری عمر مرثیہ گوئی میں صرف کی اور ضمیر اور فصیح اور دلگیر کے معاصر تھے۔ میاں دلگیر صاحب کے شاگرد تھے مگر چونکہ زبان میں کثرت تھی اس لیے اپنا کلام خود نہ پڑھتے تھے۔ البتہ مرثیہ کو قدیم رنگ سے علیحدہ کر کے انہیں کچھ جدتیں پیدا کی تھیں۔ مرزا فصیح دشاگرد ناسخ و دلگیر راج کو گئے اور وہیں رہ گئے اب صرف ضمیر اور خلیق کے واسطے میدان مرثیہ گوئی رہ گیا تھا۔ لہذا یہ دونوں باکمال ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کیلئے کاوشیں کرتے تھے جس کا نتیجہ مرثیہ کی تکمیل و ترقی کی واسطے بہت اچھا نکلا۔ مرثیہ کی صورت میں یہ تغیر ہوا کہ بجائے چومصر کے اب مسدس کا رواج ہوا۔ اسکی ابتدا سو دسے ہوئی تھی اور خلیق نے اسکو پھیلا یا۔ سلام بھی بطر زغل کہے جانے لگے مرثیہ پڑھنے کا طریقہ بجائے سوز کے تحت اللفظ مقرر ہوا۔ جو زغل مستزاد کے اسلوب پر کسی جاتی وہ نوحہ کہلاتی اور اسکو سوز ہی کے اسلوب میں پڑھتے تھے۔ پہلے مرثیہ چالیس سچا پس بندوں تک محدود تھا میر ضمیر پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس کو طول دیا۔ اس طرح کہ پہلے تہید پھر سراپا۔ پھر میدان جنگ کا نقشہ دکھایا اور خاتمہ شہادت پر کیا۔ اس جدت کی بڑی قدر ہوئی اور اس نے مرثیہ گوئی کے عالم میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا اس وجہ سے کہ قدیم زمانہ میں مرثیہ محض حصول ثواب کی غرض سے رونے رلانے کی واسطے ایک مقررہ طریقہ پر کہے جاتے تھے اب انہیں دوسری چیزیں شامل کی جانے لگیں جنکی جانچ پڑتال بھی سٹیج کی جاتی تھی جس طرح اساتذہ شعرا کے کلام کی ہوتی ہے۔ ان جدید مطالب کے

اضافہ سے مرثیہ گوئی کے قالب میں ایک نئی روح چھونکی گئی اور اسکی بوسیدہ ٹہیوں پر اس اضافہ سے نیا گوشت پوست چڑھایا گیا۔ اور اب وہ شاعری کی ایک موثر صنف قرار پایا جس سے کہ اب اکثر فرقہ ہائے اسلام یہاں تک کہ اہل ہنود بھی محسوس لیتے ہیں اور بہت ذوق و شوق سے سنتے ہیں۔ میرخلیق کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے صفائی زبان اور صحت محاورہ پر بہت توجہ کی اور دروازہ کو خالی تشبیہوں اور لفظی مناسبت کے مقابلے میں زیادہ ملحوظ رکھا۔ اور یہی فرق انکے اور میرضمیر کے یہاں ماہہ الامتیاز ہے۔ انیس نے بھی اس معاملہ میں اپنے پدر بزرگوار کی پوری پیروی کی۔ سیطرح پڑھنے کے طریقے میں بھی میرانیس نے اپنے والد ہی کا تتبع کیا۔ یہ زیادہ تر اعضا کی حرکت سے کام نہ لیتے تھے بلکہ صرف آنکھ کی گردش یا خفیف سی گردن کی جنبش سے سب کام نکالتے تھے۔ میرخلیق کا خاندان زبان اردو کی صحت اور محاوروں کی صفائی کے لیے مشہور ہے۔ چنانچہ ناسخ اپنے شاگردوں سے برابر کہتے تھے کہ اگر زبان سیکھنا ہو تو خلیق کے گھرانے سے سیکھو۔

میرانیس میر بہ علی انیس ^{۱۶} سالہ یا ^{۱۷} سالہ میں بمقام فیض آباد محلہ گلاب باڑی میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد رہتے تھے۔ اپنے والد کے سائے عاطفت میں تعلیم و تربیت پائی۔ لکھنؤ میں اس وقت آئے جب ان کے بڑے صاحبزادے میرفیس پیدا ہو چکے تھے۔ چھوٹے بھائی انس ہمراہ تھے۔ ابتدا میں فیض آباد کے تعلقات بالکل منقطع نہیں ہوئے اس وجہ سے کہ باپ اور بھائی وہیں رہتے تھے مگر جب بعد کو پورا خاندان لکھنؤ چلا آیا تو یہیں تسکین سکونت اختیار کر لی۔ ابتدائی کتابیں مولوی حمید علی صاحب سے اور صدر مفتی میرعباس صاحب سے

پڑھی تھی۔ ورزش کے بہت شائق تھے اور فنون سپہ گری میر کاظم علی اور اُن کے بیٹے
 میر میر علی سے حاصل کیے جو اس فن میں اُس زمانہ کے اُستاد مانے جاتے تھے۔
 فن شہسوارِی سے بھی واقف تھے۔ فن سپہ گری کی معلومات جنگ کے مناظر وغیرہ
 دکھانے میں بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ جتن سب کے ایسے عاشق تھے کہ خواہ وہ انسان
 میں ہو یا کسی دوسری شے میں اُسکی دل سے قدر کرتے تھے۔ اُن کو اپنی عزت
 خاندانی پر بڑا فخر تھا اور خود داری اور عزت خاندانی کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔
 وضع دار بھی بہت بڑے تھے ملنے جلنے میں رکھ رکھاؤ کا بہت خیال رکھتے تھے۔
 ایک وقت معینہ پر لوگوں سے ملاقات کرتے تھے کوئی شخص حتیٰ کہ اُن کے گھر والے
 بھی بغیر اطلاع اُن کے پاس نہیں آسکتے تھے۔ امر اُسے بہت کھنچ کر ملتے تھے۔ یہاں تک
 کہ بادشاہ وقت کے یہاں بھی اُس وقت تک نہیں گئے جب تک کہ ایک معتمد شاہی
 اُن کو لینے نہ آیا۔ وہ اپنی عزت خاندانی اور عزت پیشہ کو سب باتوں پر مقدم سمجھتے
 تھے۔ آئین وضع داری کے بہت سختی سے پابند تھے جسکو انھوں نے اپنے اور اپنے
 احباب اور ملنے والوں کے واسطے مقرر کر لیا تھا۔ وضع اور لباس بھی خاص تھا
 جسکو انھوں نے عمر بھر نباہا۔ لوگ جس طرح اُن کے کلام کی عزت کرتے تھے اسی طرح
 اُنکی پابندی وضع کے بھی قدردان اور مداح تھے۔ ایک مرتبہ نواب تہور جنگ ایک
 رئیس حیدر آباد نے میر صاحب کی جو تیاں اُٹھا کر اُنکی پالکی میں رکھ دیں اور اس پر
 اُن کو بڑا فخر و ناز تھا۔ یہ اُن کے مزاج کی خود داری و تناعت اور استغنا کا نتیجہ تھا
 کہ کبھی کسی کی تعریف میں یا رویہ کے لالچ میں ایک حرف زبان سے نہیں کہا
 البتہ امر اسے لکھنؤ جو ہدایا و تحائف مداح آل رسول سمجھ کر پیش کرتے تھے اُس کو





میر مونس لکنوی

قبل بھی کر لیتے تھے۔

میر انیس لکھنؤ سے تانترع سلطنت کبھی باہر نہیں نکلے جب کبھی باہر نیک
 ذکر ہوتا تو فرماتے کہ اس کلام کو اسی شہر کے لوگ خوب سمجھ سکتے ہیں اور کوئی اسکی
 قدر کیا کر گیا اور ہماری زبان کا لطف کیا اٹھائے گا۔ لیکن تباہی لکھنؤ کے بعد
 پہلی مرتبہ ۱۷۵۷ء میں اور پھر ۱۷۵۸ء میں نواب قاسم علی خاں کی طلب اور اصرار
 سے پٹنہ عظیم آباد شریف لیگئے اور واپسی میں بنارس میں بھی ایک مرتبہ ٹھہرے
 تھے۔ اس کے بعد ۱۷۵۸ء میں مولوی سید شریف حسین خاں کی تحریک و نواب
 تہور جنگ بہادر کے سخت اصرار سے دکن حیدر آباد گئے اور لوٹتے ہوئے آہ آباد
 میں قیام کیا۔ اور ان سب مقامات پر اپنے معرکہ آرا مرثیوں سے لوگوں کو مستفیض
 اور داخل حسنات کیا۔ جس مجلس میں پڑھتے لوگ اس کثرت سے جمع ہو جاتے
 تھے کہ باوجود سخت انتظام اور پیروں کے بھی چپہ بھڑ میں سننے والوں سے خالی
 نہ رہتی تھی۔ جب دوسرے شہروں کا یہ حال تھا تو پھر خاص لکھنؤ کا کیا پوچھنا
 ہے جو قدر دانی اور کمال کا سر شیمہ تھا۔ میر صاحب کا انتقال بعارضہ بخار ۱۷۵۹ء
 مطابق ۱۷۵۸ء میں ہوا۔ اور اپنے باغ ہی میں دفن ہوئے۔

میر انیس بحیثیت شاعر [میر صاحب خلقی شاعر تھے اور شاعری ورثہ میں پائی تھی۔
 کوئی خاندان اتنا زبردست سلسلہ مشہور اور قابل شعراء کا نہیں پیش کر سکتا۔

۱۔ کسی نے کیا خوب مادہ تاریخ نکالا ہے جس میں مصرعہ کے ایک جزو سے میر انیس اور دوسرے

جزو سے مرزا دبیر کی دفات کا سن نکلتا ہے۔ مصرعہ یہ ہے ع

غم انیس میں ہے ہے۔ دیا دبیر کا غم

لہذا جو فخر میر صاحب کو اپنے خاندان پر تھا وہ بجھا تھا۔ میر صاحب نے بچپن ہی میں جبکہ فیض آباد میں قیام تھا شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے حزنِ تخلص کرتے تھے شاید اس مناسبت سے کہ اُن کے پردادا میر ضاحک اور مشہور شاعر شیخ علی خاں میں بہت ربط و ضبط تھا۔ جب لکھنؤ آئے تو اُن کے والد اُن کو ناسخ کے پاس لگائے ناسخ نے کہا کہ تخلص کو بدل دو چنانچہ ایسا ہی کیا انیس تخلص اختیار کیا۔ انیس نے کم سنی سے مرثیہ کہنا شروع کر دیا تھا اور تھوڑے ہی دنوں کی مشق میں درجہ کمال کو پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ انکی شہرت ان کے والد کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ جب خلعت اور ضمیمہ بیان مرثیہ گوئی سے مہٹ گئے تو دبیر و انیس کا زمانہ آیا جنھوں نے اس فن کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔

تصانیف میر صاحب نے ہزار ہا مرثیے، سلام، قطعات، رباعیاں لکھی ہیں۔ انیس ہے کہ اُن کا پورا کلام اب تک شائع نہیں ہوا مگر جتنی چھپ چکا ہے پانچ جلدوں میں ہے۔ باقی اُن کے اعزہ کے پاس محفوظ ہے۔ مشہور ہے کہ انھوں نے ڈھائی لاکھ شعر کہے تھے جن میں کچھ غزلیں بھی تھیں۔ جس طرح اُن کا کلام لا جواب ہے اسی طرح اُن کے پڑھنے کا طریقہ بھی لا جواب تھا اُن کی آواز قد و قامت صورت۔ غرض ہر شے اس کام کے لئے موزون واقع ہوئی تھی۔ پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ بڑا آئینہ سامنے رکھ کر تنہائی میں بیٹھتے اور پڑھنے کی

لے نسبت ترین عقل نہیں معلوم ہوتی اسوجہ سے کہ میر ضاحک میر اور سودا کے معاصر تھے اور شیخ علی خاں خاندان کے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے اور اُن سے سن میں بڑے تھے لہذا زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ضاحک نے اپنی بہت صغر سنی میں شیخ کو کہیں دیکھا ہو ارتباط وغیرہ تفادوت سن کی وجہ سے ممکن ہو ۱۲

مشق کرتے تھے۔ میر انیس کا کلام ہموار ہے اور دوسرے شاعروں کی طرح
 رطب و یابس کا مجموعہ نہیں ہے۔ ادب اردو میں میر انیس ایک خاص مرتبہ رکھتے
 ہیں بحیثیت شاعر کے اُن کی جگہ صفا اولین میں ہے اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں
 جو ان کو زبان اردو کے تمام شعرا سے بہترین اور کامل ترین سمجھتے ہیں اور ان کو ہندوستان
 کا ٹیکسپیڈ اور خدا سے سخن اور نظم اردو کا ہومر اور ورجل اور بالیک خیال کرتے ہیں۔
 انیس کی خدمت زبان کے ساتھ
 انیس نے زبان اردو کی بڑی خدمت کی اس کو خوب
 صاف کیا اور اس کا اور اُن کا کلام اپنی فصاحت اور تازگی
 کے لئے مشہور عالم ہے۔ وہ صحت محاورہ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اور اسی پر اُن کو
 بڑا فخر و ناز تھا۔ لغات کی معلومات انکی بہت وسیع تھی۔ اور الفاظ کی سجاوٹ میں
 ان کو کمال حاصل تھا۔ بہت سے نئے نئے محاورے انکی وجہ سے دخل زبان ہوئے
 اور قدیم محاورات کا صحیح استعمال بھی انھوں نے بتایا۔ ابتدائی کلام میں کچھ قدیم
 محاورات پائے جاتے ہیں مگر جوں جوں مشق بڑھتی گئی اور تجربہ وسیع ہوتا گیا
 اُسی قدر کلام صاف ہوتا گیا۔ میر صاحب کی زبان دلی اور لکھنؤ دونوں جگہ مستند
 مانی جاتی ہے اُن کا خاندان صحت محاورہ کا محافظ سمجھا جاتا ہے چنانچہ خود
 فرماتے تھے کہ میں فلاں لفظ یا فلاں ترکیب کو اس طرح استعمال کرتا ہوں جیسا میر
 گھرانے میں مروج ہے نہ کہ اس طرح کہ جیسے آپ اہل لکھنؤ بولتے ہیں۔ میر حسن اور
 میر خلیق کے تعلقات بہو بیگم صاحبہ کے خاندان کے ساتھ وابستہ تھے۔ مشہور ہے
 کہ فیض آباد میں ان کے یہاں ایک باقاعدہ دفتر تھا جس میں ایسے محاورے اور
 شلیں جو بہو بیگم صاحبہ کے گھر میں بولی جاتی تھیں باقاعدہ درج ہوتی رہتی تھیں

اور اس دفتر کے افسر اعلیٰ میر حسن اور میر خلیق تھے۔ ظاہر ہے کہ زبان کی صحت و صفائی کے واسطے ان سے زیادہ کون مستند ہو سکتا تھا۔ میر صاحب کا مرتبہ زبان اردو میں بہت خاص ہے اسوجہ سے جو احسان انھوں نے زبان کے ساتھ کیا وہ بھی خصوصیت رکھتا ہے۔ اردو باوجود اصنافِ نظم کی تنوع اور کثرت کے زرمیہ نظم سے اب تک تہید ست تھی، اُس میں ہومر کی الیاڈ ورجل کی اینیاڈ و ویاس کی مہابھارت و المیک کی رائائن یا فردوسی کے شاہنامہ کی طرح کوئی تصنیف موجود نہیں جسکی وجہ یہ ہے کہ زبان اردو ایک نوخیز چیز ہے اور اس قسم کی تصانیف زرمیہ کے لیے ایک مدتِ مدید کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ کمی کسی طرح پوری ہو سکتی تھی تو وہ آنیس کے مشہور مرثیے سے ہوئی۔ ان کے مرثیوں کی تہدیں اور مناظر جنگ وغیرہ ایسی استادی اور کمال سے لکھے گئے ہیں کہ نظامی کے سکند نامہ اور فردوسی کے شاہنامہ کا آسانی سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح مناظر قدرت اور جذبات انسانی جس زور کے ساتھ انھوں نے دکھائے ہیں اُس کا بھی جواب زبان اردو میں کہیں نہیں ملتا۔

مرقع نگاری [آنیس کو مناظر قدرت کی ہو ہو تصویر کھینچنے میں کمال حاصل تھا اس قسم کے بیانات مرثیہ سے غیر متعلق نہیں ہوتے بلکہ اصل مضمون کے تحت میں ہوتے ہیں مگر پھر بھی بالذات ایک مکمل چیز ہیں جو مرثیہ سے بے تکلف علیحدہ کیے جاسکتے ہیں۔ پورا مرثیہ ایک ایسا مرقع معلوم ہوتا ہے جس میں صد باخوضات و خوبصورت مکمل تصویریں چسپاں ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے تعلق نہیں رکھتیں مگر پھر بھی مجموعی حیثیت سے اُسی کل کے تحت میں سب آتی ہیں مثلاً

صبح کا سماں طلوع آفتاب نیم سحر کے خوشگوار جھونکے۔ شام کا سُہانا وقت، چاندنی کا لُطف یا تاریکی کا بھیاںک منظر۔ باغ میں پھولوں کا کھلنا اور مہکنا۔ سبزہ کی بہار وغیرہ وغیرہ الگ الگ چیزیں ہیں مگر سب مرثیہ کے جزو ضروری ہیں۔

اظہار جذبات مثل عالم ظاہر کے عالم باطن یعنی جذبات کے اظہار پر بھی میر حسن کو بہت بڑی قدرت حاصل ہے۔ جذبات۔ خوشی و غم۔ غصہ۔ محبت۔ رشک و حسد۔ بیم ورجا وغیرہ ایسی استادی سے بیان کرتے ہیں کہ دل و جد کرتا ہے ایک اور کمال یہ ہے کہ کہنے والے کی عمر۔ جنس۔ حالت وغیرہ کا پوری طرح خیال رکھا جاتا ہے مثلاً اگر کسی بچہ کی زبان سے کچھ الفاظ کہے گئے ہیں تو خیالات اور زبان دونوں بچوں ہی کے ادا کیے جاتے ہیں۔ وہ کبھی اس نازک فرق کو نظر انداز نہیں کرتے جس سے انکی اصول ڈراما نویس کی کما حقہ واقفیت کا اندازہ اچھی طرح کیا جاسکتا ہے۔ سیطرہ عورتوں کے مختلف رشتوں کے نازک فرق کو بھی بدرجہ اتم ملحوظ رکھتے ہیں۔ معرکہ جنگ میں مہارزوں کی رجز خوانی۔ حریت کا جواب۔ حملہ آوروں کے حملے پہلوانوں کی لڑائیاں۔ سامان حرب و ضرب علی قدر مراتب اس خوبی سے دکھاتے ہیں کہ میدان کارزار کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ تلوار اور گھوڑے کی تعریف صدا بلکہ ہزار ہا جگہ کی گئی ہے مگر ہر دفعہ تشبیہ و تخیل نئی ہوتی ہے اور نیا لطف دیتی ہے۔

مرثیوں میں تسلسل بیان ایک حیرت انگیز چیز ہے۔ میزانیس ایک مستند مؤرخ کی حیثیت نہیں رکھتے کیونکہ جن واقعات کو انھوں نے نظم میں باندھا ہے وہ

من وعن ہرگز وقوع پذیر نہیں ہوے۔ اُن کا وجود اگر ہے تو شاعر کے تخیل میں ہے مگر یہی تخیلی وجود مابعد کے شعرا اپنے ماقبل کے شعرا کے کلام سے اخذ کرتے چلے آتے ہیں۔ میر انیس کا کلام اغلاط سے بھی بالکل پاک نہیں۔ مولوی عبدالغفور صاحب نسخ نے ایک رسالہ لکھا تھا جس میں اُنھوں نے انیس اور دبیر کی عروضی اور دوسری قسم کی غلطیاں دکھائی ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے طرفداروں نے بھی اسکے جواب میں رسالے لکھے اور اپنے اپنے استادوں کی جانبداری کا حق ادا کیا۔ مگر سچ پوچھیے تو واقعیت بین بین میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے اصلی حالت میں اور صحیح طور پر نہیں چھپے۔ اُن میں کچھ کتابت کی غلطیاں ہیں اور کچھ اُن لوگوں کی حسب موقع تحریفیں ہیں جنھوں نے مرثیے پڑھے کہیں کہیں پُرانے محاورات بھی ہیں جو اب متروک ہو گئے۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ تمام مرثیوں میں ہمواری نہیں ہے اور بعض اشعار تو انیس اور دبیر ایسے پختہ کار شاعروں کے درجہ سے گرے ہوئے ضرور ہیں۔ مگر تعجب کی کیا بات ہے اسوجہ سے کہ اُنھوں نے لاکھوں شعر کہے اگر کہیں کہیں غلطیاں بھی ہو گئیں تو اُس سے اُن کی اُستادی پر کیا حرف آتا ہے۔

میر انیس کا طرز میر انیس تمثیلوں۔ ہتکاروں اور صنائع بدائع میں کمال رکھتے ہیں وہ فضول مبالغے اور بیجا اغراق کو ہرگز نہیں پسند کرتے جنگی اُس زمانہ میں کثرت تھی صنائع بدائع کا استعمال اس خوبی سے کرتے ہیں کہ جس سے شعر پر کوئی بار نہیں پڑتا اور حسن بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح اُنکی تمثیلیں بھی نہایت حسین اور بہت ارفع اور نہایت آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہیں وہ اُن سے ایک عجب دلکش اثر

پیدا کرتے ہیں۔ بڑی چیز کی مثال ہمیشہ بڑی چیز سے دیتے ہیں اُن کی تشبیہات کبھی معمولی اور ادنیٰ قسم کی نہیں ہوتیں۔ کلام حسب موقع کہیں صاف و سلیس اور کہیں رنگین ہوتا ہے۔ مگر فصاحت اور زور کہیں ہاتھ سے نہیں جاتا۔ بیان میں روانی غضب کی ہوتی ہے۔ فصاحت نشست الفاظ۔ اور زور یہ سب انکی کلام میں ملے ہوئے ہیں۔ اشعار بہت صاف اور سلیس اور جلد سمجھ میں آنے والے ہیں اور یہ آخری صفت بعض وقت دھوکا دیتی ہے اور عمق معنی کو اُس گہرے غار کے پانی کی طرح پوشیدہ کر دیتی ہے جسکو صفائی اور موجوں کی روانی نے چھپا دیا ہو۔ ان کے قادر الکلام ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ ایک ہی بات اور ایک ہی مضمون کو اُسی سادگی اور دل آویزی کے ساتھ صد بار کہتے ہیں اور پھر ہر مرتبہ وہ نئی معلوم ہوتی ہے۔

انیس کا مرتبہ اردو شعر کی صف اول میں نہایت اعلیٰ درجہ ہے۔ انکی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس زمانہ میں جب تصنع اور تکلف اور مبالغے اور اغراق کا بازار گرم تھا انکی شاعری جذبات حقیقی کا آئینہ تھی اور جس نیچرل شاعری کا آغاز حالی اور آزاد کے زمانہ سے ہوا اسکی داغ بیل انیس نے ڈالی تھی۔ انیس نے مرثیہ کو ایک کامل حربہ کی صورت میں چھوڑا جسکا استعمال حالی نے نہایت کامیابی سے کیا۔ اُن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انگریزی داں طبقہ میں بہت مقبول ہیں جسکا دماغ معمولی شعرو شاعری کی عطر بنی سے بعض وقت پریشان ہو کر حقیقی شاعری کی نکمت کے لیے بیتاب ہوتا ہے۔ انکی شہرت برابر ترقی کر رہی ہے اور ہماری رے میں اُس وقت تک ترقی کرتی جائیگی جب تک زبان اردو ترقی کرے گی۔

بلکہ اُسی وقت انیس کی واقعی قدر کیجائیگی۔

دبیر مرزا سلامت علی دبیر دہلی میں سنہ ۱۲۱۷ھ مطابق سنہ ۱۸۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مرزا غلام حسین تھا۔ ارباب تذکرہ میں خاندان کی نسبت اختلاف ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ان کو عالی خاندان اور ان کے بزرگوں کو نہایت معززناہت کیا جائے۔ مگر ہمیں شک نہیں کہ مرزا دبیر ایک شریف اور معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے بزرگ قدیم زمانے میں کچھ اثر ضرور رکھتے تھے۔ ان کے والد تباہی دہلی کے بعد لکھنؤ آئے اور یہیں شادی کر کے رہ پڑے۔ اُس کے بعد جب دہلی میں تسلط ہو گیا تو پھر دہلی واپس گئے۔ مگر دبیر اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ اُس وقت آئے جب ان کی عمر تقریباً سات برس کی تھی۔ مرزا استعدادِ علمی معقول رکھتے تھے اور درس و تدریس اور بحث و مباحثہ کے بڑے شائق تھے جس سے ان کی ذہانت اور طباعی کو جولانی کا خوب موقع ملتا تھا۔ شعر و سخن سے قدرتی مناسبت رکھتے اور علی الخصوص مرثیہ گوئی کے بچپن ہی سے دلدادہ تھے۔ میضمریہ کے شاگرد ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی ذہانت اور طبعی جودت سے اپنے ہم مشقوں پر گویا سبقت لے گئے۔ اب ان کا شمار اچھے مرثیہ گوئیوں میں ہونے لگا۔ چنانچہ مرزا جب علی بیگ سرور نے فسانہ عجائب میں اُس وقت کے مشہور مرثیہ گوئی لکھنؤ میں دبیر کا بھی ذکر کیا ہے۔ مرزا دبیر کی شہرت برابر ترقی کرتی گئی یہاں تک کہ ان کو بادشاہ وقت کے سامنے پڑھنے کا بھی افتخار حاصل ہوا۔ لکھا ہے کہ اکثر دوسرے لکھنؤ اور محلات شاہی بھی ان کی شاگرد ہو گئی تھیں اور اب یہ زبان اردو کے مسلم الثبوت استاد مانے جاتے تھے۔ ان کی شہرت سے اور نیز استاد کی غرض محبت کے

بڑاؤ سے بعض لوگ کتش رشک و حسد سے جلنے لگے اور استاد و شاگرد میں ایک خاص موقع پر جبکہ مرزا دبیر نے نواب فتح ارالدولہ کی مجلس میں اپنا مرثیہ پڑھا تھا، رنجش اور بددلی پیدا کرادی مگر غنیمت ہے کہ اس معاملے نے طول نہیں کھینچا اور صحفی منش کی طرح تھکا فضیحت کی نوبت نہیں آئی۔ آخر کار معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ مرزا صاحب ہمیشہ اپنے استاد کا نام ادب و احترام سے لیتے تھے اور لوگوں کو بھی کوئی موقع اُنکو برا بھلا کہنے کا اپنے سامنے نہیں دیتے تھے۔ مرزا صاحب کا دامن شہرت وسیع ہو چکا تھا کہ میر انیس فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے۔ اب میر ضمیر بوڑھے ہو گئے تھے مقابلہ آئندہ مرزا دبیر اور میر انیس میں شروع ہوا۔ یہ دونوں بزرگوار بھی نہایت تہذیب و متانت سے ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے اور جب کبھی کسی مجلس میں یکجائی کا موقع ہوتا تو ایک دوسرے کا بہت ادب و آداب کرتے تھے۔ ۱۲۹۱ھ ہجری میں مرزا صاحب کو ضعف بصارت کی شکایت ہوئی۔ چنانچہ حکم واجد علی شاہ جو وقت مٹیا برج میں قیام گزیں تھے کلکتہ تشریف لے گئے جہاں ایک ہوشیار ڈاکٹر نے کامیابی سے اُن کا علاج کیا۔ مثل میر انیس کے یہ بھی غدر ۱۲۵۵ھ تک گھر سے نہیں نکلے تھے۔ مگر ۱۲۵۵ھ میں مرشد آباد اور ۱۲۵۶ھ میں ٹپنہ عظیم آباد گئے اور ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۲۵۶ھ میں لکھنؤ میں اس دارنا پاؤں دار سے حلت کی اور اپنے ہی مکان میں مدفون ہوئے۔

دبیر پیشیت مرثیہ گو مرزا دبیر مرثیہ گوئی کے استاد کامل تھے۔ انھوں نے اپنی پوری عمر اسی مشغلہ میں صرف کی۔ ان میں میر انیس کی اکثر خصوصیات موجود ہیں اور

۱۲۹۲ھ میں کھاتے کہ مجلس نواب شرف الدولہ کے یہاں ہوئی تھی ۱۲

شکوہ الفاظ اُس پر طرہ ہے۔ مرزا صاحب سامعہ نواز الفاظ کے ساتھ اعلیٰ تخیل، نئی تشبیہات اور تازگی مضامین کے بھی بہت دلدادہ ہیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ بسا اوقات اُن کا مقصد پورا نہیں ہوتا اور کوہِ کندن و کاہِ برآوردن کی مثل صادق آتی ہے۔ اُن کے کلام میں ایک عالمِ فضل کی جھلک برآتی ہے۔ وہ آیاتِ قرآنی اور احادیث کو باندھنے کے بہت شائق ہیں اور بعض وقت اُردو کے ساتھ عربی کا جوڑ خوب بٹھاتے ہیں۔ دوسری صفت یہ تھی کہ بہت پُرگو اور زود گو تھے۔ اُن کی کثرتِ خیالات حیرت انگیز ہے۔ مختصر یہ کہ اپنی حسین اور نادر تشبیہات سے، اپنی شاندار ابیات سے، اپنے اعلیٰ مضامین سے، اپنے پر شکوہ الفاظ سے، اپنی طباعی و ذہانت سے، اپنی زود گوئی اور پُرگوئی سے، اور اپنی ایجا د پسند طبیعت سے وہ ضرور اس قابل ہیں کہ میرانیس کے پاس شعر کی صفِ اولین میں اُن کو جگہ دی جائے۔

انیس اور دسیر کا مقابلہ ان دونوں کے مقابلے سے اہل لکھنؤ دو بڑی جماعتوں پر منقسم ہو گئے ایک طرف دارانِ انیس دوسرے جانب دارانِ دسیر جو باطل لکھنؤ انیسویں اور دسیر کے کلمات تھے ان دونوں فریقوں کی جنبہ داری بعض اوقات اعتدال سے بڑھ کے سخیف اور مضحکہ انگیز درجہ تک پہنچ جاتی تھی مگر ایک مورخ کا یہ فرض نہیں ہے کہ ان جزئی مباحث میں پڑے پھر بھی ان نامور استادوں کے کلام کا مقابلہ دسیر سے خالی نہیں۔ دونوں بزرگ ایک ہی زمانہ میں تھے یہاں تک کہ ایک سال کی کمی بیشی میں پیدا ہوئے اور ایک ہی سال کی کمی بیشی میں انتقال کیا دونوں ایک ہی صنفِ نظم (مرثیہ) میں مشغول و منہمک تھے۔ دونوں کی سوسائٹی

اور ماحول ایک ہی تھا۔ دونوں نے اپنی تصنیفات از قسم مراثنی و رباعیات و سلام وغیرہ
بکثرت چھوڑے اور دونوں زبان اردو کے مستند اور مسلم البشوت استاد تھے۔ اب
فرق دیکھنا چاہیے کہ کیا ہے۔ انیس موروثی شاعر تھے شاعری اُن کو ورثے میں
ملی تھی چنانچہ خود کہتے ہیں ۷

عمر گزری ہے ہسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شپیر کی مداحی میں

مگر مرزا دبیر کو یہ شرف حاصل نہ تھا۔ دونوں کا طرز بھی جدا جدا ہے۔ انیس کی
خاص توجہ زبان کی صفائی اور حلاوت، بندش کی چستی اور محاورے کی
درستی پر ہے۔ برخلاف اسکے مرزا دبیر کے یہاں جدت خیالات، بلند خیال،
نئی نئی تمثیلیں اور پر شکوہ الفاظ زیور کلام ہیں۔ مختصر طور پر فصاحت اور سادگی
میر انیس کے کلام کا جوہر ہے اور صنعت اور رنگینی مرزا دبیر کا مایہ ناز ہے۔ ہمیں
کوئی شک نہیں کہ میر صاحب کا کلام ایسی بھدی ترکیبوں اور درواز کا تشبیہوں
پاک و صاف ہے جو مرزا صاحب کے یہاں بکثرت ہیں۔ اسکی وجہ شاید یہ ہو
جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب کو عربی و ریاضیات بہت مستحق تھیں اور میر صاحب
کو اسقدر نہ تھیں اور یہی کتابی علم کی کمی میر صاحب کی شگفتگی کلام کا باعث ہے
حقیقت یہ ہو کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ایک فضول سی بات ہے۔

اس معاملہ میں آخری فیصلہ کن چیز ادبی ذوق ہے اور ہر شخص کا ذوق الگ الگ
ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں یہ بات داخل فیشن ہو گئی ہے کہ دبیر کے کلام کو کم کر کے
دکھایا جائے اور اُن کا مرتبہ انیس سے بہت کم رکھا جائے مگر حق یہ ہو کہ دبیر بھی

مثلاً انیس کے مسلم الثبوت استاد تھے جیسا کہ خود ان کے معاصرین امیر مینائی اور
اسیر لکھنوی نے اعتراف کیا ہے۔ اُن کی شہرت خود اُن کے زمانہ میں بھی بہت
تھی جیسا کہ لفظ ”استاد“ سے ثابت ہے جو اُن کے واسطے برابر استعمال
کیا جاتا ہے۔

مرثیہ کی مقبولیت کے باب

لکھنؤ ہمیشہ سے شیعیت کا مرکز رہا ہے اور اہل تشیع شہداءِ کربلا
کا دل سے ادب و احترام کرتے ہیں۔ اس شہر میں عشرہ محرم بڑے دھوم دھام
اور خاص اہتمام کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہاں کے تعمیر پسند بادشاہوں نے بڑے بڑے
امام باڑے بنوائے جہاں ایام عزاء میں مومنین جمع ہوتے ہیں اور شہداءِ کربلا کی
مجالس نہایت سیرجشی اور تکلف سے کرتے ہیں، امیر سے غریب تک اس مہینہ کو
متبرک سمجھ کر جملہ مراسم عزاداری انہیں انجام دیتے ہیں۔ اظہارِ غم کا سب سے زیادہ
مؤثر طریقہ مرثیہ خوانی ہے۔ کوئی شخص یہاں تک کہ بڑے سے بڑا مشکاک بھی
علی الاعلان کسی کے مذہبی رسوم کی مخالفت کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مرثیہ لکھنا اور مرثیہ
پڑھنا ہمیشہ سے ایک مذہبی کام سمجھا جاتا ہے۔ ہر شیعہ شخص اپنی طبری خوش نصیبی
سمجھتا ہے اگر ایک بند بھی امام مظلوم کی شان میں یا ایک شعر جناب امیر کی تعریف
میں حصولِ ثواب کی نیت سے وہ کہدے۔ یہاں کے بادشاہ ایسے لوگوں کی قدر دانی
اس غرض سے کرتے تھے کہ لوگ اُن کو باندھب خیال کریں۔ درحالیکہ وہ سال بھر
دنیاوی عیش و عشرت میں نہمک رہتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ ایک مہینہ کی عزاداری
سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ہو جائیگی۔ مگر عملاً اور شعراً مرثیہ کی قدر ایک دوسرے
نقطہ نظر سے کرتے تھے۔ وہ اُس کو ایک ادبی چیز سمجھتے تھے۔ بہر طور جو کچھ وجہ بھی ہو

وہ زمانہ مرثیہ کے عروج کا زمانہ تھا۔

مرثیہ سے کیا کیا

فائدے پہنچے

میر ضحیر پہلے شخص ہیں جنہوں نے مرثیہ میں نئی نئی ایجادیں کیں۔
 مرثیہ۔ سراپا، گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی طولانی تعریفیں نئی نئی تشبیہات
 اور عمدہ تخیل کے ساتھ، مناظر جنگ، معرکہ تفصیل جزئیات، غیر فصیح الفاظ اور ترکیبوں کا
 ترک جن کو قدیم مرثیہ نویس مدت دراز سے برتتے چلے آتے تھے، غرض کہ یہ اور اسی قسم
 کی بہت سی جہتوں کا سہرا میر ضحیر کے سر ہے مگر انہیں وہ میر نے انہیں چیزوں کو ترقی
 کی معراج تک پہنچایا اور ان میں چار چاند لگائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں نے
 اس صنف شاعری کو ترقی کے آسمان تک پہنچا دیا اور اسی زمانے سے مسدس جن میں
 عموماً مرثیے لکھے جاتے ہیں پُر جوش نیچرل نظموں کے لئے بھی مناسب خیال کیا جانے لگا۔
 ”مدو جزا سلام“ حالی کا مشہور مسدس اسی عنوان پر ہے۔ ”سُرور جہاں آبادی“ نے
 بھی اسی صنف کو اپنی قومی اور نیچرل نظموں کا آلہ کار بنایا۔ اگر غور سے دیکھئے تو
 آزاد حالی، اور ”سُرور“ وغیرہ کی دلچسپ اور زوردار نظمیں سب مرثیہ ہی کی خوشہ چین
 اور بہن منت ہیں کیونکہ زمانہ حال کے طرز میں وہ سب خصوصیات موجود ہیں جو
 مرثیہ میں پائی جاتی ہیں، مثلاً تمہید، تسلسل بیان، اعلیٰ جذبات کا اظہار، سلاست
 زبان، تشبیہات، تخیل وغیرہ جو ہماری جدید شاعری کے بڑے عنصر ہیں سب
 قریب قریب وہی ہیں جن کو مرثیہ کے استاد اب سے بہت پیشتر نہایت کامیابی
 سے برت چکے ہیں۔

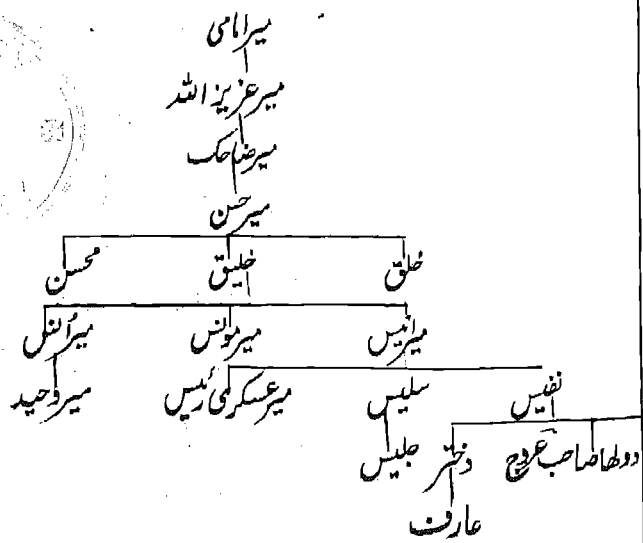
قدیم طرز لکھنؤ کی مصنوعی اور مخرب اخلاق فضائے شاعری میں مرثیہ کی
 نمود اور انکی سلاست و فصاحت اور ادب آموزی نے وہی کام کیا جو رنگینان میں

ایک خوشنما سبزہ زار کرتا ہے۔ مرثیہ میں اُس حقیقی شاعری کا پرتو ہے جو علیٰ جذبات کو برائے تختہ کرتی ہے۔ اُس کی ادب آموزی ایسے وقت میں، جب دنیاے شاعری عیش پسند باروں کی خوشامد اور تتبع میں نہایت ادٹے اور رکیک جذبات کی دُکُل میں پھنسی ہوئی تھی، قابلِ صد ہزار آفریں ہے۔ ہر چند کوئی مرثیہ بلحاظ فن اگر ہوا ہو مگر پھر بھی وہ ایک اخلاقی نظم ضرور ہے اور اس معنی میں اُس کے مفید ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ اُس کا مضمون ضرور عالی اور مقدس ہوگا۔ لہذا شاعر گو غزل میں وہ کیسا ہی سہت اور لالہ بالی خیال ظاہر کرے مگر مرثیہ میں مناسبت مضمون کے خیال سے وہ ضرور سنجیدہ اور اخلاق آموز شعر کہنے پر مجبور ہوگا اشجاعت عالی تہمتی، عفت، انصاف وغیرہ کی تعریفیں جو ہم اس افسانہ مصائبِ غم میں برابر سنتے رہتے ہیں۔ ہماری درستی اخلاق کے لئے اور ہم میں شریف اور اعلیٰ جذبات پیدا کرنے کے لئے اُس مفید اور ضروری ہیں۔ لڑائیوں کے ہو ہوؤ نقشے، اسلامی نبرد آزماؤں کے تنہا مقابلوں کی جیتی جاگتی تصویریں، مبارزوں کی پُر جوش رجز خوانیاں، مخالفین کے جوابات، کُفار کا قتل و قمع، کمزوروں کی اعانت و مدد، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو مرثیہ کی بدولت ہماری نظم اُردو میں صنف ”ایک“ (رزمیہ) کا بیش بہا اضافہ کرتی ہیں جسکی اُس میں اب تک کمی تھی۔ ہمارے اُردو میراثی اکثر ایسے مکمل مرقعے پیش کرتے ہیں جو بلا تکلف دنیا کی بہترین رزمیات سے مقابلے کے لیے تیار ہیں۔ زبان کے ساتھ بھی مرثیہ کی خدمات نہایت بیش بہا اور عظیم الشان ہیں۔ چار پانچ لاکھ بیت جو انیس اور دہیر کہے چھوڑ گئے اُن سے ہماری زبان میں کیا کچھ کم قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ پھر اُس

زمانہ سے اس وقت تک کے استعمال نے اُن کو اور صاف کیا اور مانجا
الحق مرثیہ نے محدود میدان اُردو کو وسیع کیا اور زبان اُردو کے سلاح خانے میں
ایک نہایت قیمتی اور ضروری حربہ اضافہ کیا۔

دیگر مرثیہ نویس [اس زمانہ کے دیگر مرثیہ نویس میان دگیر اور فصیح تھے جن کا ذکر اوپر
ہو چکا ہے۔ ان سے پیشتر میان مسکین (جن کے مفصل حالات نہیں معلوم
ہو سکے سوا اس کے کہ اُن کا نام میر عبداللہ تھا) آفسردہ سکندر، گدا وغیرہ
ہیں۔ جن کے مرثیے اب بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آ جاتے ہیں۔

خاندان آئیں [یہ عجیب بات ہے کہ علم و فضل اور شاعری اس مشہور خاندان میں
پشتہ پشت سے چلی آتی ہے اور اب تک ماشاء اللہ وہ سلسلہ جاری ہے مشعل شاعری
باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی چلی آئی ہے اور اب تک وہ روشن ہے۔ میرا مامی (جو
میرا مامی موسوی ہروی کہلاتے ہیں) اس خاندان کے مورث اعلیٰ تھے۔ ان کے
بعد سلسلہ خاندان بصورت شجرہ حسب ذیل ہے :-



اس خاندان میں اصحاب ذیل کے کچھ مختصر حالات ہدیہ ناظرین کیے جاتے ہیں۔

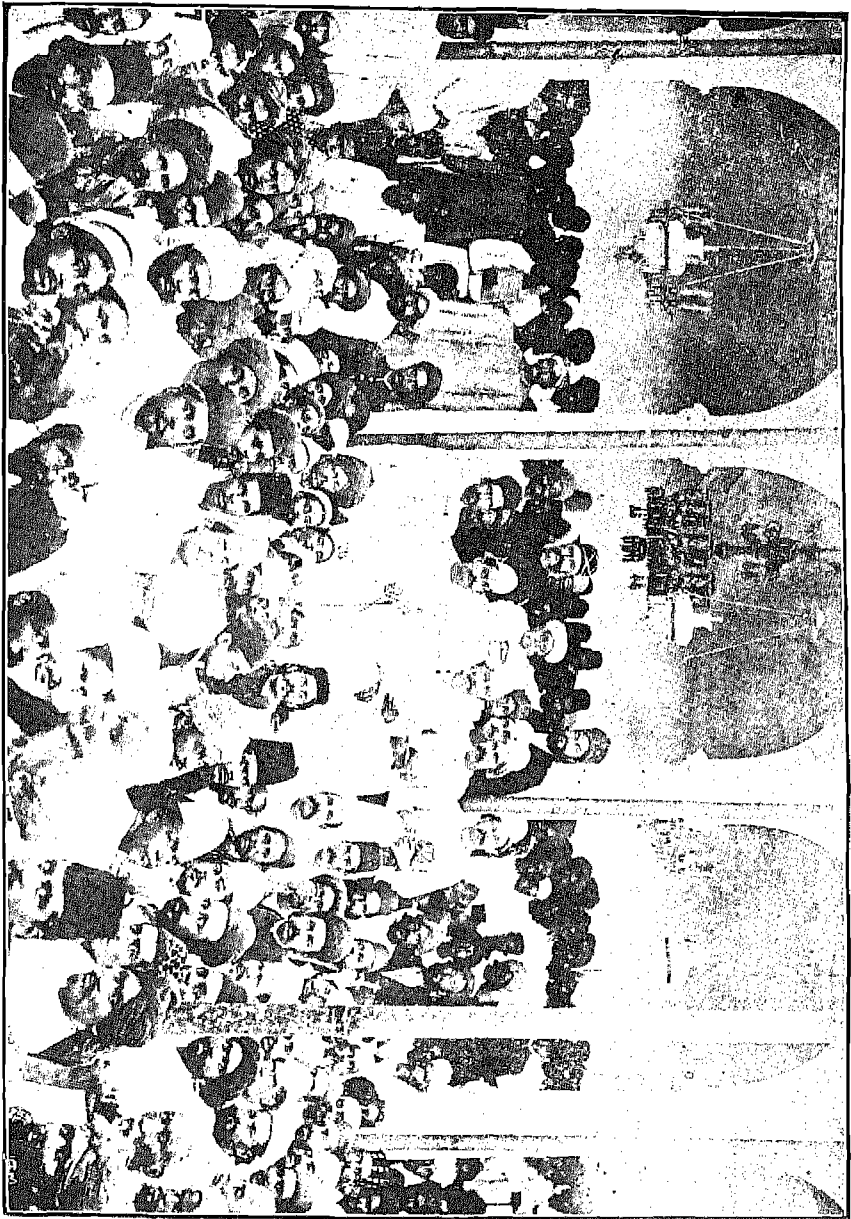
میر مونس میر محمد نواب مونس میر انیس کے چھوٹے بھائی تھے اور بہت اچھا مرثیہ کہتے تھے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر میر انیس کی طرح مشہور نہ تھے۔ مرثیہ نہایت مؤثر اور دل کش طرح سے پڑھتے تھے۔ راجہ امیر حسن صاحب مرحوم والی ریاست محمود آباد مرثیے میں ان کے شاگرد تھے اور ایک معقول مشاہیر دیتے تھے۔ میر مونس کا انتقال ۱۲۹۵ھ میں ہوا اور کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

میر نفیس میر خورشید علی نفیس میر انیس کے بڑے صاحبزادے اپنے بھائیوں میر سلیم اور میر رئیس سے زیادہ ممتاز اور زیادہ مشہور تھے۔ لائق باکے لائق فرزند تھے اور انھیں سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ ان سے میر انیس بلکہ پورے خاندان کا نام روشن ہوا۔ بہت خوش گوار قابل تھے اور اپنے بعد ایک بڑا ذخیرہ مراثی و سلام و رباعیات وغیرہ کا چھوڑ گئے۔ ۱۳۵۱ھ مطابق سن ۱۹۳۷ء میں بمبئی چالیس سال انتقال کیا۔

عارف سید علی محمد عارف سید محمد حیدر کے صاحبزادے میر نفیس کے نواسے تھے ۱۲۹۵ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے نانا کی زیر نگرانی تعلیم و تربیت پائی اور انھیں سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں والی ریاست محمود آباد ان کے شاگرد ہیں اور مبلغ ایک سو پچیس روپیہ ماہوار سے ان کی خدمت کرتے تھے۔ عارف صاحب بہت بڑے زبانداں تھے اور لکھنؤ کے مرثیہ گوئیوں میں ایک خاص درجہ امتیاز ان کو حاصل تھا۔ ان کے مرثیے نہایت فصیح و بلیغ اور زوردار ہوتے ہیں۔ ان کے مرثیوں میں مثل پیارے صاحب رشید کے



میر علی محمد عارف



حیدرآباد میں ستر نفیس لکھنوی کی ایک مجلس
ستر نفیس وسط سنن ہٹن اور عازن اڑکے داعفی جانب ہٹن

بہار و ساقی نامہ وغیرہ نہیں ہوتا وہ مرثیت کا زیادہ خیال رکھتے تھے جسکے ۳۲۷ھ میں
بعمر ۵ سال انتقال کیا۔

جلس سید ابو محمد عرف ابو صاحب جلس میسلیس کے صاحبزادے پایا صاحب
رشید کے شاگرد تھے۔ ہونہار شخص تھے مگر انیسویں ہے کہ جوانی میں ۱۲۵۷ھ میں
انتقال کیا مرثیہ اور غزل کہتے تھے۔ بالفعل اس خاندان میں دولہا صاحب عروج
(میسلیس کے صاحبزادے) اور قائل (عارف کے صاحبزادے) اور قدیم
(سلیس کے صاحبزادے) موجود ہیں اور اپنے کلام سے اہل لکھنؤ اور دیگر شائقین
کلام کو مستفیض اور مخلوط کرتے ہیں۔

سید میرزا انس کا خاندان یہ خاندان بھی لکھنؤ کے مرثیہ گوئیوں کا ایک مشہور خاندان ہے
اس کے بھی مختصر حالات ہدیہ ناظرین کیے جاتے ہیں۔

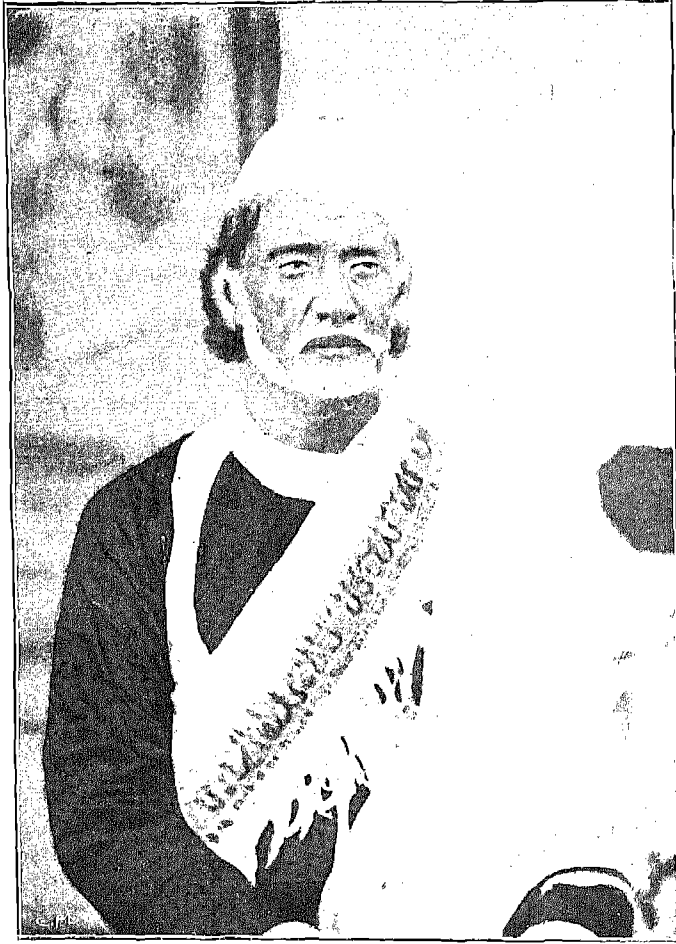
سید میرزا انس سید محمد میرزا انس سید علی میرزا کے صاحبزادے اور سید ذوالفقار علی
میرزا کے پوتے تھے۔ صاحب دیوان ہیں مگر اب تک ان کا کلام چھپا نہیں اور
ان کے خاندان میں محفوظ ہے۔ ہر اتوار کو اس زمانے کے بڑے بڑے شاعر مثل
قلق، بحر، اسیر، میر گل و عرش وغیرہ کے بلاناغہ ان کے مکان پر جمع ہوتے تھے
اور شعر و شاعری کے تذکرے رہتے تھے۔ نوابی میں تنویر و پیہ ماہوار ان کو خزانہ
شاہی سے ملتا تھا۔ فدر ۱۲۵۷ھ کے بعد انس نے نواب منور الدولہ کی سفارش سے
نواب ملکہ جہاں کی سرکار میں بحیثیت داروغہ ملازمت کر لی تھی اور بہت عزت
سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ۱۲۵۷ھ میں نواب کلب علی خاں والی رامپور نے
انس کو طلب کیا اور اپنے استاد منشی امیر احمد صاحب مینائی کو ان کے لینے کی واسطے

لکھنؤ بھیجا۔ اُنس رامپور گئے مگر تھوڑے عرصہ کے قیام کے بعد پھر لکھنؤ واپس آئے جہاں سلسلہ ۱۷ میں عمر ۹۰ سال قضا کی۔ چونکہ اُن کا کلام چھپا نہیں لہذا اس کے متعلق کوئی راس نہیں ظاہر کی جاسکتی۔ صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ناسخ کے شاگرد اور کمنہ مشق شاعر تھے۔ ان کے پانچ بیٹے تھے عشق، تعشق، صبر، صابر اور عاشق۔

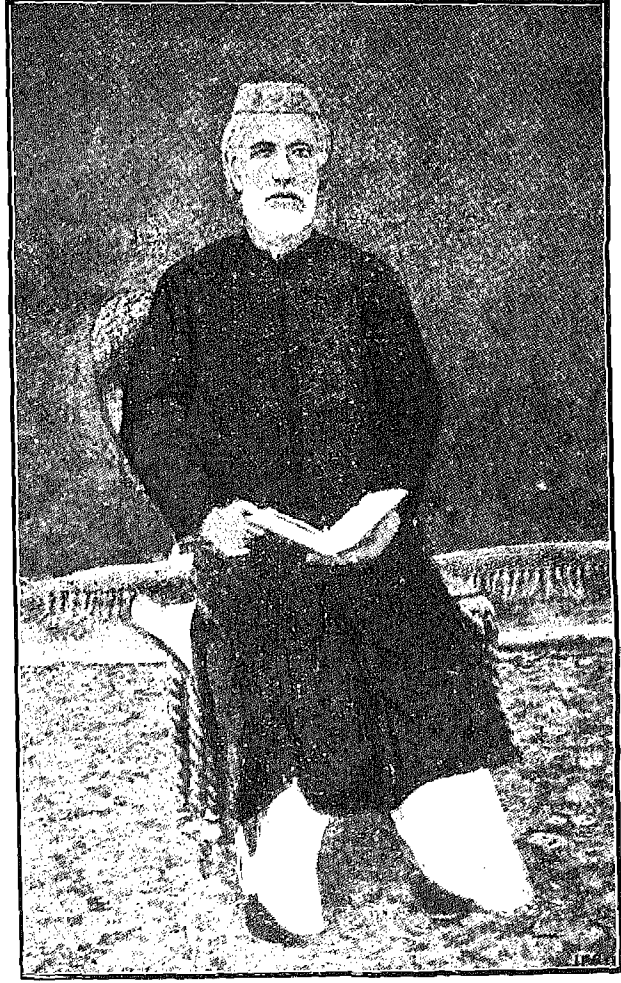
عشق حسین مرزا عشق، معروف بہ میر عشق، اپنے زمانے کے نامی مرثیہ گو اور انیس و دہرے کے ہم عصر تھے۔ یہ بھی مثل انھیں استادوں کے مرثیہ کے استاد مانے جاتے ہیں اور ان کا کلام بہت اعلیٰ درجہ کا اور بے عیب ہے۔ سچ پوچھیے تو کلام کی عمدگی کے اعتبار سے ان کی شہرت کم ہے۔ ان کے پوتے عسکری زار مؤدب جو اپنے چچا رشید کے شاگرد ہیں اب بھی موجود ہیں اور مرثیہ اچھا کہتے ہیں۔

تعشق سید میرزا تعشق مرثیہ اور غزل دونوں کے استاد تھے لکھنؤ میں سید صاحب

کے لقب سے مشہور ہیں۔ ایک عرصہ دراز تک کربلا میں قیام کیا اور بعد اپنے بڑے بھائی میر عشق کے انتقال کے وہاں سے واپس آئے مرثیہ اور غزل دونوں خوب کہتے تھے۔ ناسخ کے شاگرد تھے اور ان کا کلام جذبات، حسن بندش، نزاکت خیال اور تاثیر کے لیے مشہور ہے۔ بعض لوگ تو ان کی نسبت بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں مگر تناظر و رہے کہ یہ ایک فطری شاعر تھے اور ان کے کلام میں بہت سوز و گداز اور تاثیر ہے اور ان کا مرتبہ اپنے زمانے کے شعرا میں بہت بلند ہی ملے نہیں ان کے ساتھ بہت محبت کرتے تھے اور انھیں کی صحبت سے یہ برابر فضا بہ رہے۔ سلسلہ ۱۷ میں عمر، سال انتقال کیا۔



سید • رزا تہشقی لکھنوی



پہارے صاحب رشید

اسمیرزا قصاب ۱ یہ اپنے مشہور بیٹے پیارے صاحب شید کی وجہ سے قابل ذکر ہیں۔ انکی شادی میرانمیس مرحوم کی دختر سے ہوئی تھی جس سے دو مشہور خاندانوں کا اتحاد ہو گیا۔ یہ واجد علی شاہ کے وظیفہ خوار اور نواب ملکہ جہاں کے یہاں داروغہ تھے۔ واجد علی شاہ اُن کو بہت مانتے تھے اور اُن کو محل شاہی نواب زہرہ محل کی ڈیوڑھی کا داروغہ کر دیا تھا۔ جو منظوم خطوط بادشاہ اپنی محبوب بیوی کے نام بھیجتے تھے اُن کے جوابات اُسی طریقہ کی نظم میں اُنکی طرف سے یہ قلم بند کرتے تھے ۷۲ سال کی عمر میں ۱۱۳۰ھ میں انتقال کیا۔

پیارے صاحب رشید ۲ سید مصطفیٰ اسمیرزا معروف بہ پیارے صاحب المخلص بہ رشید ۱۱۶۳ھ میں پیدا ہوئے اور ضروریات زمانہ کے مطابق تعلیم باپ اُن کی شادی میر عسکری رئیس خلف میرانمیس کی صاحبزادی کے ساتھ ہوئی تھی۔ اپنا کلام اپنے چچا میر عشق کو دکھاتے اور کبھی کبھی میرانمیس سے بھی اصلاح لیتے تھے عشق کے بعد اپنے دوسرے چچا عشق سے مشورہ سخن کیا اور سچ پوچھے تو اُنھیں کازنگ اُن کی غزلوں اور مثنویوں پر زیادہ غالب ہے۔ رشید کی توجہ زیادہ تر زبان پر تھی اور اس میں وہ اپنے استاد انیس کے قدم بقدم چلتے تھے۔ مرثیے، غزلیں، سلام، رباعیاں، بکثرت لکھیں۔ کبھی کبھی قصیدے بھی کہے۔ اُن کی غزلوں میں سلاست زبان، حلاوت اور پابندی محاورہ کا بہت خیال ہے مگر جدت خیال اور تاثیر کم ہے۔ اُن کو فارسی ترکیبیں زیادہ پسند نہ تھیں۔ سلاموں میں غزلیت کا رنگ زیادہ ہے، مگر رباعیاں کثرت سے ہیں اور واقعی بہت عمدہ ہیں علی الخصوص وہ رباعیاں جو بڑھاپے پر لکھی ہیں بہت مؤثر اور دلچسپ ہیں۔ رشید بحیثیت

مرثیہ گو کے زیادہ مشہور ہیں۔ مرثیہ میں انھوں نے دونی چیزیں یعنی حساتی نامہ اور بہارا ضافہ لکیں جس سے مرثیہ کی ادبی شان اور بڑھ گئی اور نفس مرثیہ میں کوئی خلل بھی نہیں آیا۔ کیونکہ ایسے اشعار حسب موقع وہ رکھتے ہیں۔ ان سے پیشتر بھی اکثر استادان فن اس قسم کے اشعار مرثیوں میں کہہ گئے ہیں مگر رشید نے ان کو ایک ممتاز جگہ دی اور طول دیکر لکھا۔ ۱۸۹۲ء میں نواب رامپور نے رشید کو سنا تھا۔ رشید ٹپنہ عظیم آباد بھی گئے تھے جہاں انکی بڑی قدر اور خاطر و مدارات ہوئی۔ نواب بہارم الدولہ کے اصرار سے حیدر آباد دکن کا سفر کیا جہاں حضور نظام نے ان کا مرثیہ سنا اور بہت پسند کیا۔ اسی طرح کلکتہ اور دیگر مقامات میں بھی سفر کا اتفاق ہوا تھا رشید کا انتقال ۱۲۷۴ھ سال ۱۸۵۸ء ہجری میں ہوا۔ اپنے بعد بہت سے شاگرد چھوڑے جن میں سے مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں۔ سید باقر صاحب حمید (ریاں کے بھائی تھے اور ۱۳۳۹ھ میں انتقال کیا) مودب پروفیسر ناصری، جلیس مرحوم اشہر (مؤلف حیات رشید) شدید، ناظم فرہاد وغیرہ۔

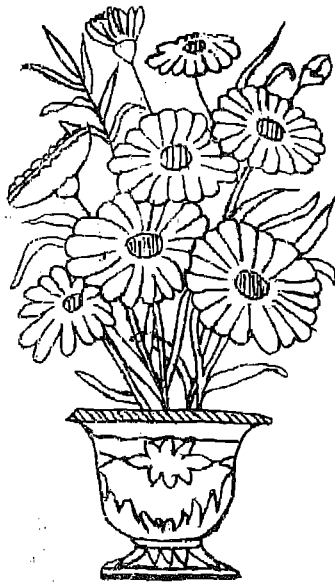
پیارے صاحب رشید لکھنؤ کی ادبی دنیا میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے تھے اور زبان کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ غزل اور مرثیہ دونوں خوب کہتے تھے۔

مرزا دبیر کے صاحبزادے مرزا محمد جعفر آج اپنے والد کے متبع اور انھیں کے رنگ میں کہتے تھے۔ ان کی بھی ٹپنہ، حیدر آباد اور رامپور وغیرہ میں بڑی شہرت تھی اور ان سب مقامات سے ان کی حسب لیاقت ان کی خدمت کی جاتی تھی۔ مرزا آج بھی مثل اپنے

غالبان دبیر
مرزا آج

پدر بزرگوار کے بہت بڑے زباں داں اور عروض کے استاد سمجھے جاتے تھے۔
چنانچہ ایک رسالہ بھی انھوں نے اس فن میں لکھا ہے۔ خسرو دکن نے ان کو
بھی سنا ہے۔

نعت [نعت اُس نظم کو کہتے ہیں جس میں پیغمبر اسلام کی مدح میں اشعار
کے جائیں۔ بہت سے شاعر گورے ہیں جنھوں نے اس صنف نظم میں بہت کچھ
کہا ہے مگر ان سب میں امیر مینائی اور محسن کا کردی بہت مشہور ہیں۔



باب

نظیر اکبر آبادی اور شاہ نصیر دہلوی

نظیر اکبر آبادی ان کا تعلق کسی خاص دور سے نہیں ہے اور ان کا کلام بھی ایک خاص رنگ رکھتا ہے لہذا ان کا ذکر علیحدہ کیا جاتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی بہمد محمد شاہ ثانی تقریباً اُس زمانے میں پیدا ہوئے جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تھا۔ اس وجہ سے وہ میر و سودا اور دیگر قدیم شعراء دہلی کے معاصر کہے جاسکتے ہیں مگر چونکہ عمر زیادہ پائی تھی اسوجہ سے انشا جرات اور ناسخ تک کا زمانہ دیکھا۔ یہ ان کی خصوصیت ہے کہ بسبب اپنی طویل عمر کے مختلف عہد کے شعرا ان کی نظر سے گذرے۔ ان کا طرز کلام بھی ایک عجیب رنگ رکھتا ہے۔ قدما میں ان کا شمار اس وجہ سے نہیں ہو سکتا کہ ان کا اکثر کلام زمانہ حال کا معلوم ہوتا ہے۔ متوسطین شعراء دہلی میں بھی یہ نہیں لیے جاسکتے۔ اس وجہ سے کہ ان کے کلام میں بہت آزادہ روی ہے اور ان کے اور ان کے مضامین اور انداز میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لکھنؤ کا قدیم طرز تو ان میں چھو نہیں گیا ہے کیونکہ ان میں نبوٹ اور رنگینی جو طرز لکھنؤ کی خاص پہچان ہے مطلق نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح دور جدید کے شعراء دہلی مثلاً غالب، ذوق، اور مومن وغیرہ سے بھی یہ بالکل علیحدہ ہیں اسوجہ سے کہ ان کے یہاں سادگی ہے

اور فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کا ان کو مثل اُنکے مطلق شوق نہیں ہے۔
 نظیر کا نام ولی محمد اور اُن کے باپ کا نام محمد فاروق تھا۔ نظیر کی ولادت
 شہر دہلی میں ہوئی۔ چونکہ اپنے باپ کی بارہ اولادوں میں صرف یہی بچے تھے
 لہذا باپ اُن سے بہت محبت کرتے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت
 نظیر اپنی ماں اور نانی کو لیکر اگرچہ چلے گئے جہاں محلہ تاج گنج میں جو تاج محل کے
 قریب واقع ہے سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کی شادی ایک عورت سماء تھوڑی سی
 دختر محمد رحمن سے ہوئی تھی جن سے ایک لڑکا خلیفہ گلزار علی اور ایک لڑکی امی بیگم
 تھیں۔ نظیر فارسی کی معمولی قابلیت کے علاوہ تھوڑی بہت عربی بھی جانتے تھے
 اور فن خوشنویسی سے بھی واقف تھے جس کا اُس زمانے میں بہت چرچا تھا۔ نظیر
 کی طبیعت میں آسودگی اور فضاغت اس درجہ تھی کہ اُنھوں نے حسب الطلب نواب
 سعادت علی خاں لکھنؤ آنے سے اور اسی طرح بھرت پور کے جانے سے بھی انکار
 کر دیا۔ اوائل عمر میں متھرا گئے تھے جہاں کسی جگہ معلمی کی نوکری کرنی تھی مگر تھوڑے ہی
 دنوں کے بعد اگرچہ واپس آ گئے اور یہاں لالہ بلاس رام کے لڑکے کو بمشاہرہ
 شرہ روپیہ ماہوار پڑھایا کرتے تھے۔

آخر عمر میں مرض فالج میں مبتلا ہو گئے تھے اور اسی مرض میں بہت کیر سنی
 کی حالت میں ۱۶۔ اگست سن ۱۸۵۷ء کو انتقال لیا جیسا کہ اُن کے ایک شاگرد کی
 تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ لائل صاحب سن ۱۸۵۷ء کا سنہ وفات بتاتے ہیں

۱۷۰۰ وہ مصر تاریخ مسیح ۱۸۵۷ء بیت بے دل۔ فرد بے سر شد +

خ + م + پ + ت + د + د
 ۶۰۰ ۴۰ ۲۰۰ ۳۰۰ ۲۰۰ ۲۰۰

۱۲۳۶ھ

مگر کوئی سند نہیں دیتے ہیں -

تفصیل بہت صحبت پسند آدمی تھے اور مختلف قسم کے لوگوں کی سوسائٹی میں ملتے جلتے تھے اسی وجہ سے اُن کا تجربہ بہت وسیع تھا جس سے اُنھوں نے اپنے اشعار میں بہت بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ اُن کو گانے سے کسرت سے اور سیر تماشا سے بہت شوق تھا۔ نہایت حلیم الطبع منکسر المزاج، اور اسی کے ساتھ نہایت ظریف اور با مذاق واقع ہوئے تھے۔ کسی طرح کا تعصب اور خود بینی اُن کے مزاج میں نہ تھی ہندو مسلمان سب اُن کو مانتے اور سب اُن سے محبت رکھتے تھے۔

جوانی میں البتہ بہت نگین مزاج تھے اور عشق و عاشقی کا بھی ذوق رکھتے تھے کہا جاسکتا ہو کہ جب قدر کلام میں اُن کے فواحش ہیں وہ اسی دور کی یادگار ہے۔ مشہور ہے کہ ایک رڈی نے جس کا نام موتی تھا، اُن سے تعلق تھا اور آزادانہ زندگی شاید اسی زمانے میں بسر کرتے ہو گئے۔ اس زندگی کی جو جیتی جاگتی تصویریں اُن کے کلام میں موجود ہیں وہ یقیناً اسی عہد کی یادگار ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو فواحش کو مستثنیٰ کر کے اُن میں بمثل مرتضیٰ سوسائٹی کے ہیں جس میں وہ اُس وقت ملتے جلتے تھے مگر بڑھاپے میں یہ باتیں سب بدل گئی تھیں۔ گزشتہ گناہوں سے توبہ کر کے وہ ایک صوفی صافی ہو گئے تھے۔ اس زمانے کا اُن کا کلام نہایت قابل قدر اور پُر اثر ہے۔ بہت پُر گوشااعر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ دولاکھ سے زیادہ شعر کہے تھے مگر وہ سب کلام تلف ہو گیا بالفعل جب قدر موجود ہے اسکی تعداد تقریباً چھ ہزار شعر سے زیادہ نہوگی اور یہ لالہ بلاس رام کی کاپیوں سے نقل کر کے لیا گیا ہے کیونکہ خود اُن کو اپنے کلام کے محفوظ رکھنے کی مطلق پروا نہ تھی۔



نادر اکبر آبادی



نورمن دهلوی

نظیر حیثیت و عطر و ناصح اگر نظیر کے کلام میں سے اُن کے معمولی اشعار نکال ڈالے جائیں تو اُن کا شمار بڑے بڑے فلسفیوں اور ناصح شعرا میں ہو سکتا ہے۔ اُن کے اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ولی کامل دنیا و مافیہا کی بے ثباتی اور بے حقیقتی پر پُر زور لکچرے رہا ہے اور ایک دوسری زندگی کی تعلیم ہم کو دیتا ہے جو رذائل و معائب سے بالکل پاک ہے۔ اُن کی دس گیارہ ایسی دلچسپ اور موثر نظمیں ہیں جن کے اکثر اشعار فقیر اور سادہ لوگ خوش الحانی سے پڑھ پڑھ کے ہمارے دلوں کو بتیاب کرتے ہیں۔ اس قسم کی نظموں میں وہ ”دنیا ہیچ است و کار دنیا ہمہ ہیچ“ کے پوری طرح سے قائل ہیں۔ وہ خیر و خیرات کے بہت معترف ہیں اور دنیا کو مزرع آخرت سمجھتے ہیں۔ اُن کی تمثیلیں بہت اعلیٰ اور دلکش ہوتی ہیں۔ اُن کی نظم ”موت پر“ اور ”بنجاو نہ“ مغرور اور سرکش لوگوں کے لئے ایک تازیانہ عبرت ہے اور اُن کو آگاہ کرتا ہے کہ دنیا دار فانی ہے اس کو چھوڑو اور عاقبت کی فکر کرو نظیر کا مقابلہ اس معنی میں شیخ سعدی سے خوب ہو سکتا ہے کیونکہ دونوں کا کلام صاف اور سلیس اور دونوں میں تصوّف کا رنگ ہے، دونوں عاشقانہ رنگ کے استاد اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اور اپنے اپنے رنگ میں نصیحت گو بھی ہیں۔ نظیر چونکہ صوفی مشرب آدمی تھے لہذا اُن کو تمام مذہبی جھگڑوں اور مناقشوں اور نیز مذہبی پابندیوں سے بالکل بے تعلقی تھی، اُن کی صوفیانہ نظمیں بہت ہی اعلیٰ درجہ کی ہیں اور اس حیثیت سے اُن کا مقابلہ کسی دوسری زبان کے بہتر سے بہتر اخلاقی شاعر سے ہو سکتا ہے۔ وہ ”الوحدة فی الکثرة“ کے

۱۱ مثلاً ”زر کی جو محبت تجھے تڑپائے گی بابا“ یا ”بٹ مارا جل کا آہو بچا ملک اُس کو دیکھ ڈر دیا“ وغیرہ ۱۲

دل سے قائل اور ع "بائسلمان اللہ اللہ بابرہمن رام رام" کے پورے عامل تھے اسی وجہ سے ہندو اور مسلمان دونوں اُن سے دلی محبت رکھتے اور اُن کو اپنا مرشد اور گرو سمجھتے تھے چنانچہ جب اُن کا انتقال ہوا تو اُن کے جنازہ کے ساتھ ہزار ہا ہندو شریک تھے اور اپنی رسم و رواج کے مطابق نہایت ادب اور احترام سے اُس کو لے گئے۔ نظیر مثل گرو مانک کے ایسے تارک الدنیا فقیروں اور سادھوؤں کے خاص شاعر تھے جو لوگوں کو ترک ماسوا اللہ کا سبق دیتے ہیں۔ انگریزی شعرا میں یہی حال وردس ورتھ کا ہے جسکی سائٹ (غزل) "دُنیا ہمارے ساتھ بہت ہے" بہت مشہور ہے۔ نظیر کی وسیع انظری، آزاد خیالی، ہمہ گیری اور بے تعصبی، ایسی خصوصیات ہیں جو اُن کے کلام کو تمام دوسرے شعرا کے کلام سے متمیز اور ممتاز کرتی ہیں۔

نظیر کی ہمدردی و محبت بنی نوع انسان کے ساتھ محدود نہیں ہے بلکہ وہ حیوانات اور بے جان اشیاء سے بھی ایک خاص اُنس و محبت رکھتے ہیں۔ اُن کی نظمیں جانوروں کے متعلق مثلاً بچہ کا بچہ، گلہری کا بچہ، جنگ جانوراں، ہرن کا بچہ، ملبلوں کی لڑائی وغیرہ اس قدر دلچسپ ہیں اور اس قدر جزئیات سے مملو ہیں کہ پڑھنے والے کو اُن کی عام واقفیت اور ہمہ دانی پر تعجب ہوتا ہے۔ اسی طرح چھوٹے بچے اُن کی نظمیں مثلاً کبوتر بازی، پتنگ بازی، تر بوڑ، ع "کیا وقت تھا وہ جب تھے ہم دودھ کے چوڑے" ع "کیا دن تھے وہ بھی یارو جب ہم تھے بھولے بھالے" ہولی، دیوالی، بسنت، عید وغیرہ کو پڑھکر باغ باغ ہوتے ہیں۔ نظیر زندگی کے تمام لطفوں اور خطوں سے خوب بہرہ اندوز

نظیر کی محبت حقیقی
ہندوستانی شاعر کے

ہوتے تھے۔ وہ ہندو مسلمانوں کے تہواروں میں شریک ہوتے اور اُن کے میلے
ٹھیلوں کی خوب سیریں کرتے تھے۔ انھیں سیر تماشوں میں اُن کا پائے تہذیب
کبھی پھسل جاتا ہے اور وہ بے مکان اڑانے لگتے ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ انھیں چیزوں
وہ مفید مطلب اور اخلاقی نتائج بھی نکالتے ہیں اور بقول شکسپیئر ”تجسس و عظمت
ہیں اور ہر چیز میں اچھائی دیکھتے ہیں“ یہ اُن کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے دنیا
کے مختلف اشغال اور کھیل تماشوں کا حال اس مزے سے اور ایسے جوش مسرت
کے ساتھ لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے بچوں کی طرح وہ خود اُن سب میں شریک
ہیں پھر معمولی معمولی چیزوں کو ایسی دلچسپ تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ بغیر
تعریف کیے رہا نہیں جاتا۔ اُن کی معلومات غیر محدود، اُن کا خزانہ لغات
غیر مختتم، اور اُن کی صفائی بیان دلکش ہے۔ ان کے مزاج میں چونکہ مذہبی تعصب
اور نارواداری نہ تھی بلکہ کثرین کو وہ نہایت نفرت اور حقارت کی نگاہ سے
دیکھتے تھے اسی وجہ سے وہ ہندوؤں سے بہت غلط ملط رکھتے تھے اور اُن کے
رسم و رواج، اُن کی زبان، اُن کے خیالات، اُن کے تہوار اور معتقدات تک
کو ایسے دلچسپ طریقہ سے اور اس قدر صحت کے ساتھ بیان کر گئے ہیں کہ ہم کو
اُن کی ہمہ دانی پر تعجب معلوم ہوتا ہے۔ وہ دوسرے مذہب کی چیزوں کے
ساتھ کبھی تسخر نہیں کرتے اور نہ اُن کو حقارت کے ساتھ دیکھتے ہیں اسی سے اُن کے
کلام میں ایک مقامی رنگ ہے جو اکثر ہمارے شعراء اردو میں کمیاب بلکہ نایاب
ہے البتہ کہیں کہیں سودا، اور انشا کے کلام میں اس کا پتہ چلتا ہے۔ نظیر ایک
خالص ہندوستانی شاعر تھے، کیونکہ اُن کے خیالات، اُن کی زبان اُن کے مضامین

سب مقامی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے -

اُن کی خدمت زبان کے ساتھ بہت قابلِ قدر ہے۔ اُنھوں نے
ایسے الفاظ سے بہت فائدہ اٹھایا جن کو شعر ادنیٰ اور بازاری

اُن کی خدمت
زبان کے ساتھ

سمجھ کے چھوڑ دیتے ہیں چونکہ ایسے الفاظ مروجہ مضامین شعر سے میل نہیں کھاتے
اس وجہ سے عام شعرا ان کو معمولی اور سو قیاناہ سمجھ کے ترک کرتے ہیں اور شعر میں
اُن کو داخل کرنا خلاف شان سمجھتے ہیں۔ نظیر لے کمال کیا کہ ایسے ہی الفاظ کو
اپنے اشعار میں جگہ دی اور دنیا کو دکھلا دیا کہ ان میں وہ خوبیاں چھپی ہوئی ہیں جن کو
ظاہر میں نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں۔ البتہ اس میں بھی شک نہیں کہ اس قسم کے سب
الفاظ اُس عزت کے مستحق نہیں تھے جو اُن کو حاصل ہوئی مگر بہت سی چیزیں
باوجود مخالفت اور احتیاط کے بھی ادبی دنیا میں داخل ہو گئیں نظیر کی مستعملہ لغات
تین قسموں پر تقسیم کی جاسکتی ہیں :-

(۱) ایسے الفاظ جو ان کے ابتدائی رنگ کے کلام میں بکثرت پائے جاتے
ہیں اور اب بالکل خلاف تہذیب سمجھے جاتے ہیں -

(۲) ایسے الفاظ جو معمولاً اردو شاعری کے مایہ بساط ہیں -

(۳) وہ جو اہر ریزے جن سے حسن شعر بڑھ جاتا ہے اور خزانہ زبان بالامال

ہو جاتا ہے -

نظیر پر شبیشت شاعر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے بلکہ
ایک معمولی غلط گو شاعر تھے اور اپنے اشعار سے بازاری لوگوں کا دل خوش کیا کرتے
تھے۔ اُن کا کلام غیر مہذب بلکہ فحش درجہ تک پہنچ جاتا ہے اور اُنھوں نے

اپنے عامیانہ اور سوقیانہ الفاظ کی آمیزش سے ہماری زبان کو غارت کر دیا۔ ان الزامات کے متعلق ہم آگے لکھیں گے مگر بالفعل مختصر طور پر اتنا کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جو چیز نظیر کی خامی اور کمزوری سمجھی جاتی ہے وہی ہماری رائے میں فی الحقیقت اُنکی بڑی خصوصیت اور صفت ہے مثلاً وہ ایسی معمولی چیزیں اور مناظر میلے ٹھیلے وغیرہ جن کو عام لوگ بہت پسند کرتے ہیں دیکھنے کے بہت شائق تھے اور ان کے بیان کے لئے ان کو عام فہم اور سیدھے سادے الفاظ کی ضرورت تھی لہذا ان کا بڑا کمال یہی ہے کہ وہ عوام الناس کے خیالات اور جذبات اور ان کی بول چال کو خود انھیں کی زبان سے ظاہر کرتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ وہ ایسی چیزوں کو فلسفیانہ نظر سے یا دور سے کھڑے ہو کر بطور تماشہ کے دیکھنا نہیں چاہتے نہ ان میں کوئی نقص یا عارض نکالنا چاہتے ہیں بلکہ وہ ان کا سچا فوٹو من و عن کھینچ دیتے ہیں ایسے منظروں و محسوس کو حکیمانہ یا جارحانہ نظر سے نہیں دیکھتے اسی وجہ سے ان کا بیان ان چیزوں کا نہایت دلچسپ اور سچل ہوتا ہے تصنع اور بناوٹ ان کے کلام میں مطلق نہیں ہوتی جالی نے شاید اسی کثرت الفاظ کے خیال سے نظیر کو میر انیس پر ترجیح دی ہے۔ نظیر ایسے موقعوں پر کوئی نکتہ چینی نہیں کرنا چاہتے بلکہ خود ان میں شریک ہو کر ان سے لطف اٹھانا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ جس طرح کسی کی ہجو نہیں کسی اُس طرح کسی کی تعریف میں کوئی قصیدہ بھی نہیں لکھا۔ یہ دونوں باتیں ہمارے نزدیک ان کے کلام کا بہت بڑا جوہر ہیں اور ان لغزشوں کی تلافی کر دیتی ہیں جو ابتداءً عمر میں اُسے سرزد ہوئی ہوں گی۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ زمانہ موجودہ کی فطری اور قوی

نظیر جدید رنگ کے پیشرو تھے

شاعری جسکی ابتدا مولانا آزاد اور حالی وغیرہ سے کمی جاتی ہے۔ اُس کے پیشرو بلکہ موجد نظیر اکبر آبادی کہے جاسکتے ہیں جس طرح انیس اور دبیر نے فاضلانہ قابلیت کے ساتھ مناظر جنگ اور مناظر قدرت کے بمثل مرقعے اپنے اشعار میں دکھائے ہیں اُسی طرح نظیر نے بھی معمولی معمولی چیزوں کی ہو ہو تصویریں، جنگی گنجائش شعریں مطلق نہ تھی، سیدھے سادے مؤثر الفاظ میں کھینچ دی ہیں جس سے ان کا کلام عوام الناس میں بہت مقبول ہے۔ اس مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فارسی کے دقیق لفظ اور ترکیبیں اور سچیدہ تشبیہیں اور استعارے اُن کے کلام میں کہیں نہیں۔ اُن کی تحریر سادہ اور بے تکلف اور اُن کا بیان صاف اور صلیت کے مطابق ہوتا ہے۔ مگر مجردیچر کی پرستش سے وہ ناواقف ہیں، جنگوں اور پہاڑی چوٹیوں کا حال اُن کے یہاں نہیں ہے۔ قدرتی مناظر کا نوٹ وہ صرف اُسی حالت میں کھینچتے ہیں جب اُن مناظر کا تعلق انسان سے ہوتا ہے، مثلاً باغوں میں روضہ تاج گنج کو اُنھوں نے منتخب کیا۔ اُن کی نظمیں برخلاف معمولی اُردو نظموں کے مسلسل ہوتی ہیں۔ البتہ اُن کے کلام میں وہ وسیع انظری اور گہرائی نہیں ہے جو متأخرین شعراء دہلی کے کلام میں ہے، غرض کہ اپنے سادہ بیان سے، اپنے بے تکلف مگر پُر زور الفاظ سے، اپنے عام دلچسپی کے مضامین سے، اپنے دلکش اشعار سے جن میں تصنع اور مکرنگی کا نام نہیں، نظیر اکبر آبادی ایک ایسے طرز کی بنا ڈال گئے جو آگے چل کر ہماری زبان اور ادب کی ترقی بلکہ ہمارے قومی احساس کے از سر نو زندگی کا بہت بڑا باعث ہوا۔

نظیر کا ظریفانہ رنگ خاص ہے اور عجیب قلم کا ہے، اس

نظیر کا ظریفانہ رنگ، اُن کا مقابلات کے ساتھ

رنگ کی ترقی کا باعث اُن کا عام لوگوں کے ساتھ میل جول اور ربط ضبط ہے۔ چونکہ وہ عام لوگوں سے بے تکلفانہ اور مساویانہ ملتے تھے اور اُن کے شادی و غم میں برابر شریک رہتے تھے لہذا اُن کو فطرت انسانی کے مطالعہ کا خوب موقع ملتا تھا اور معلومات کے ساتھ انکی خوش طبعی اور ظرافت میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ وہ افلاس اور مصیبت کی تکلیفوں کو نہایت تحمل اور خندہ پیشانی سے برداشت کرتے اور ہر ہلکا حوالہ کو اپنے مذاق میں اُڑا دیتے تھے۔ اُن کی ظرافت نہ تکلیف دہ ہے نہ اُس میں شہدین ہوتا ہے۔ نظیر اور انشاء دونوں اپنے اپنے رنگ میں ظرافت کے اُستاد تھے۔ مگر ان دونوں کی ظرافتوں میں فرق ہے۔ انشا کی ظرافت ایک ایسے درباری کی ظرافت ہے جو پُر مذاق باتوں سے اپنے مالک کو خوش کرنا چاہتا ہے اور اس کو کشش میں وہ بھانڈوں کی طرح اپنی اور دوسروں کی معیشت کی بھی مطلق پروا نہیں کرتا ہر چیز کو اپنے آقا کی خوشنودی مناج پر وہ قربان کر دیتا ہے۔ نظیر ایک آزاد ظریف ہے جو اپنی با مذاق باتوں سے کسی کو رنج دینا نہیں چاہتا نہ کسی کی عزت پر حملہ کرتا ہے اور سب کو خوش رکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ انشا کی ظرافت میں خوشامد اور بھٹی کی بواقی ہے اور نظیر ان عیوب سے پاک ہے۔ باوجود اس کے انشا اور نظیر میں کئی باتوں میں مماثلت بھی ہے دونوں شاعروں نے مشکل مشکل ردیف اور قافیوں میں طبع آزمائی کی ہے اور بعض غزلیں سمجھ بھی کہی ہیں دونوں عربی مصرعے اشعار میں کامیابی کے ساتھ موزوں کرتے ہیں۔ دونوں کے کلام میں مقامی رنگ یعنی ہندی الفاظ اور ہندی رسم و رواج وغیرہ کثرت سے ہیں دونوں نے مختلف زبانوں میں شعر کہے دونوں کے کلام میں تصوف کا سنہرا رنگ جلوہ گر ہے۔ زبان کے بارہ میں دونوں آزاد ہیں۔

مگر فارسی اور عربی الفاظ صحت کے ساتھ استعمال کرنے میں انشامشاق ہیں۔ اور
بمقابلہ نظیر کے اُن کے یہاں متروکات کم ہیں۔ اور اُن کی ظرافت کا رنگ بہت
زیادہ گہرا ہے۔

نظیرِ حشیتِ مصوّر کے چونکہ نظیر کو فنِ موسیقی سے بہت شوق تھا اس لئے اُن کو
انتخابِ الفاظ میں اس فن سے بہت مدد ملی۔ وہ ایک آرٹسٹ اور بہت بڑے
مترقع نگار ہیں اُن کو اپنے اشعار کے واسطے انتخابِ الفاظ میں وہی انہماک تھا جو
انگریزی شاعر ٹینیس کو تھا وہ صنعتِ تجنیس کے بہت شایق ہیں اور اکثر ایسے الفاظ
استعمال کرتے ہیں جنکی آواز سے اظہارِ مطلب ہو جاتا ہے۔ مثلاً لڑائی بھڑائی کے موقع
پر وہ ثقیل حروف لاتے ہیں شادی و مسرت کی محفلوں اور تہواروں کے بیان میں
انھیں کے مناسب سرے اور دلکش الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ دُور از کارِ تشبیہات
اُن کے کلام میں کم ہیں اور دیگر صنائعِ بدائع بھی نہایت اعتدال سے ہیں۔
اور آورد وغیرہ سے اُن کا کلام پاک ہے۔

یہ سوال بہت دلچسپ ہے کہ اُردو کا ٹیکسپیئر ہمارا کون شاعر ہو
اصل یہ ہے کہ ڈراما کا وجود اہلِ عجم میں تھا ہی نہیں اور نہ
ہمارے اُردو شعراء نے اسکو سنسکرت سے اخذ کیا۔ سودا اپنی اعلیٰ درجہ کی طباعی،
اپنی زبردست شخصیت، اپنی عام واقفیت اور قدرتِ زبان کی وجہ سے ضررِ قابلِ
الحاظ ہیں۔ انھوں نے بے مثل جویں لکھی ہیں اور اسی وجہ سے وہ ایک بردست
کمپڈی نگار ہو سکتے تھے مگر اُن میں ٹریجڈی لکھنے کا مادہ، یعنی فطرتِ انسانی کے
ساتھ ہمدردی اور اس کا وسیع علم بہت محدود ہے۔ میر کی حالت یہ ہے کہ سوز و گداز

اُن کے یہاں بدرجہ اتم ہے مگر کیرکٹر نویسی سے وہ ناواقف ہیں۔ سوائے نزل اور شہنوی کے دیگر اصناف سخن اور نیز دیگر شعبہ ہائے زندگی میں اُنکی واقفیت بہت محدود ہے۔ انشا کے یہاں تسخر و ظرافت کی بہتات ہے۔ اور وہ اپنی قوت نقالی اور قدرت زبان کیوجہ سے خود اکیٹر بننے کے لیے زیادہ موزوں تھے۔ مگر اُن کے درباری تعلق نے اُن کو ایک دوسری راہ پر لگا دیا اور تعمق خیال بھی اُن میں بہت کم ہے۔ انیس و دہیر گو فطری شاعر تھے زبان پر پوری طرح قدرت حاصل تھی کیرکٹر نویسی کے بھی مشاق تھے۔ مگر اُن کا دائرہ عمل محدود ہے یعنی وہ محض مرثیہ نگار تھے۔ اور یہ تخصیص اُنکے اوسط قوت اور کمزوری دونوں کا باعث تھی۔ ایرانی پیش پلے (یعنی تعزیر داری وغیرہ) جس کا مقابلہ مرکل (معجزات) کے ڈراما اور سٹری (مذہبی اسرار) کے ڈراما سے کیا جاسکتا ہے۔ باقاعدہ ڈراما سے قریب تر ہیں اور یہی انیس و دہیر کے موضوع ہیں۔ لیکن اُس مذہبی جوش سے جو اُن کی نظموں میں سرایت کیے ہوئے ہر معمولی معمولی کیفیات و جذبات انسانی نظر انداز ہوتے رہے نظیر کو بھی مثل سودا انشا اور انیس کے زبان پر پوری طرح قدرت حاصل تھی اُس کی خصائل انسانی کی معلومات اکثر مشاہیر شعرا سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ ہندو اور مسلمان بچے اور بوڑھے، امیر و غریب، خواص و عوام، دنیا دار اور تارک الدنیا سب سے ملتا جلتا تھا اور سب کا دوست اور ہی خواہ تھا، عورتوں کا علم بھی اُس کو کافی تھا۔ گو اُسکے یہاں ایسے مرقعے جیسے شکسپیر کے یہاں ایوجن ٹوسٹیمونا، پورٹیا، اور ایللیا، کے ہیں موجود نہیں ہیں جسکی وجہ شاید یہ ہو کہ ہماری ہندوستانی سوسائٹی میں پردہ کا رواج ہے اور عورتیں آزادی کے ساتھ مردوں سے نہیں مل سکتیں اور اسی وجہ سے نظیر کو معزز عورتوں سے ملنے اور اُن کے

خیالات اور جذبات دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اُس کو صرف شاہانِ بازاری کا تجربہ ہوا لہذا اُس کے اشعار میں اسی مخصوص جماعت کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں۔ اُس کو کیرکٹر نگاری کا بڑا لکھ تھا اور قوتِ بیانِ بھی بڑے غضب کی پائی تھی مگر ٹیکسپیر کی طرح اُس کے خیالات میں عمق نہیں ہے۔ اور نہ ٹیکسپیر کی ایسی اعلیٰ درجہ کی ذہانت اُس میں ہے۔ اُسکی دو نظمیں ایسی ہیں جن میں ڈراما کی کچھ خصوصیات پائی جاتی ہیں گو وہ پوری طرح ڈراما نہیں کہی جاسکتیں۔ ایک ”لیلیٰ مجنوں“ جو ترکیبی ہے اور دوسری ”مہادیو کا بیاہ“ جو اپنے انبساطی رنگ کی وجہ سے کمیڑی کہے جانے کی مستحق ہے۔ اسی طرح اُسکی نظمیں ”ریچھ کا بچہ“ اور ”بلبلوں کی لڑائی“ نہایت مزے کی اور اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ نظیر میں سودا کا زور، میر کی بلند پروازی، انشا کی ظرافت، آہیں و دبیر کا جوش و خروش نہیں ہے مگر یہ سب صفات اُس میں ایک حد تک ضرور پائی جاتی ہیں۔

نظیر کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ معمولی معمولی چیزوں کے بیان میں ایسی دلچسپی پیدا کر دیتا ہے جو دوسروں کے یہاں اعلیٰ مضامین میں بھی نہیں پائی جاتی جب غزل کی کیرنگی اور قصیدہ کی لفاظی سے جی اکتا جاتا ہے تو نظیر کے اس قسم کے مضامین بہت پسند آتے ہیں۔ اُس نے شعر میں نئے نئے مضامین اختیار کئے اور ادبِ اردو کو بہت وسعت دی۔ یہ سچ ہے کہ وہ کوئی فاضل شاعر نہیں اور نہ وہ کیفیتِ اشیا کو فلسفیانہ طریقہ سے یا بہت گہرائی کے ساتھ بیان کرتا ہے بعض اوقات وہ فحش بھی کہہ جاتا ہے اور ایسے موقعوں پر اُسکی صاف بیانی سے تہذیب کے دل کو چوٹ لگتی ہے۔ وہ بڑے پایہ کا شاعر بھی نہ سہی۔ اور اُس کے کلام میں بعض جگہ متروکات

و اغلاط بھی ضرور ہیں۔ زبان اور خیالات بھی بہت شستہ و رفتہ نہیں۔ مگر با اینہم وہ ایک خالص ہندوستانی شاعر ہے اور ہندوستانی مضامین پر لکھتا ہے ہندوستانی جذبات اُس کے دل میں جوش زن ہیں اور وہ مذہبی تعصب اور فرقہ دارانہ جھگڑوں سے بالکل پاک و صاف ہے، اپنے تنوع مضامین، اپنی ناصحانہ روش، اپنی وسیع النظری، اپنی ہر طبقہ کے ساتھ دلچسپی، اپنی خالص ہندوستانیّت، اور علی الخصوص ایک جدید رنگ کی ایجاد کے سبب سے نظیر پوری طرح اس کا مستحق ہے کہ اُس کو شعرائے اردو کی محفل میں ایک ممتاز جگہ دی جائے۔

شاہ نصیر کا شمار مثل نظیر اکبر آبادی کے زبان اور زمانہ دونوں اعتبار سے طبقہ متقدمین میں کیا جاسکتا ہے۔ مگر ان کو شہرت شعرائے متوسطین کے زمانہ میں حاصل ہوئی۔ اس لیے ان کو دور متقدمین و متوسطین کے بیچ کی کر دی سمجھنا چاہیے نصیر الدین نام نصیر تخلص اپنے سیاہ رنگ کی وجہ سے میاں کے عرف سے مشہور تھے۔ شاہ غریب کے بیٹے دلی کے رہنے والے تھے، باپ ایک گوشہ نشین فقیر تھے اور جو آمدنی چند مواضعات جاگیر سے ہوتی تھی اُس پر بسر وقات تھی۔ ہر چند کہ غریب باپ نے تعلیم و تربیت میں پوری کوشش کی مگر نصیر کو سوائے شاعری کے اور کچھ نہ آیا شاعری کی طرف اُن کا رجحان بچپن سے تھا شاہ محمد علی اہل کے شاگرد ہو گئے جو شیخ قیام الدین قائم سے اصلاح لیتے تھے اور اس نسبت سے شاہ نصیر کو تودا اور خواجہ میر درد سے بھی ایک تعلق شاگردی پیدا ہو گیا تھا۔ خاندانی وجاہت اور نیز شاعری کی وجہ سے شاہ عالم کے دربار میں نصیر کی رسائی ہو گئی۔ جہاں اُن کی قدردانی خوب ہوتی تھی اور انعام و اکرام سے بھی سرفراز ہوتے تھے شاہ نصیر نے

شاہ نصیر دہلوی
متوفی ۱۲۸۵ھ

سفر بہت کیے اور اکثر شہروں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ علی الخصوص لکھنؤ اور حیدرآباد متعدد مرتبہ گئے تھے۔ اپنے وطن دہلی میں اپنے مکان پر اکثر مشاعرے کرتے تھے جن میں اُس زمانہ کے مشہور شعرا جمع ہوتے تھے۔ ایسے ہی مجموعوں میں اُن کے شاگرد ذوق کو اپنی ابتدائی بلند پروازیوں کے جوہر دکھانے کا خوب موقع ملتا تھا۔

جب دلی میں تباہی آئی اور شعرادھردھر منتشر ہونے لگے۔ تو شاہ نصیر بھی ہول ڈھونڈھنے باہر نکلے، دو مرتبہ لکھنؤ آئے اور چار مرتبہ حیدرآباد گئے۔ لکھنؤ میں جب یہ پہلی مرتبہ پہنچے تو مصحفی، انشاء اور جرأت کا زمانہ تھا جن سے خوب خوب مقابلے ہوئے دوسری مرتبہ ناسخ اور آتش کا آوازہ سخن بلند ہو رہا تھا۔ ناسخ سے بھی ایسے مقابلے ہوئے اور یہ کامیاب ہوئے۔ حیدرآباد جانے کی یہ تقریب ہوئی کہ دیوان چنڈوالا جو شادان تخلص کرتے تھے اور اہل کمال خصوصاً شعر لکھنے دہلی کے بڑے قدردان تھے انکی داد و دہش کا شہرہ سن کر یہ وہاں پہنچے۔ مشہور ہے کہ دیوان موصوف نے ذوق اور ناسخ کو بھی حیدرآباد بلا بھیجا تھا مگر انھوں نے انکار کیا۔ شاہ نصیر نے اپنے حیدرآباد کے قیام میں بہت سے شاگرد جمع کر لیے اور اُن کے سبب سے وہاں بازار شاعری بہت گرم ہو گیا تھا۔ بالآخر چوتھی مرتبہ جب وہ حیدرآباد گئے تو چند روز قیام کر کے ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں وہیں انتقال کیا۔

تصانیف شاہ نصیر ایک پرگو شاعر تھے ساٹھ برس تک مشغلہ شعر میں منہمک رہے۔

۱۔ دیکھو "بدن سرخ ترا" "چمن سرخ ترا" والی غزل مصحفی کے حالات میں اور اسی طرح میں شاہ نصیر کی غزل اُن کے حالات میں آجیات میں ۱۱۔ تذکرہ گل رعنا میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جیسی انکی قدر ہونا چاہیے تھی نہیں ہوئی ۱۲۔ قاضی مخدوم موسیٰ کی خانقاہ میں دفن ہوئے۔ ایک شاگرد نے "چراغ گل" کے الفاظ سے "تاریخ نکالی" (آجیات ذکر شاہ نصیر) ۱۳

اس طویل مدت میں ایسے ذہین و ذکی شخص نے جو اس قدر شاعری کا دلدادہ ہو کیا کچھ نہ کہا ہوگا۔ مگر انیسویں صدی کے ان کا اکثر کلام تلف ہو گیا۔ اس لیے کہ ان کو کلام کے جمع کرنے اور حفاظت سے رکھنے کی عادت نہ تھی۔ ان کے ایک شاگرد مہاراج سنگھ نے ان کا کچھ کلام بصورت دیوان کے جمع کیا جس میں تقریباً ایک لاکھ شعر کہے جاتے ہیں۔ مگر بعض صحابہ تذکرہ لکھتے ہیں کہ ان کے دیوان کی ترتیب میر عبد الرحمن خاں میر حسین نسکین شاگرد مومن نے کی تھی جس کا ایک قلمی نسخہ نواب صاحب رامپور نے اپنے کتب خانہ کے لئے خرید کیا تھا۔

شاہ نصیر نہایت متین و مہذب مگر اس کے ساتھ ہی بڑے بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج تھے۔ سیکڑوں شاگرد دہلی لکھنؤ اور حیدرآباد میں چھوڑے۔ حنفی المذہب تھے مگر تعصب مطلق نہیں رکھتے تھے۔ آخر آخر میں اپنے مایہ ناز شاگرد ذوق سے چشمک ہو گئی تھی۔ کیونکہ کثرت مشق نے ذوق کے دل میں ایک قسم کی انایت پیدا کر دی تھی اور وہ سودا و میر ایسے بالکالوں کی برابری کا دعوے کرنے لگے تھے۔

ان کا مرتبہ شاعری میں شاہ نصیر کی خصوصیت یہ ہے کہ سنگلاخ زمینوں اور مشکل مشکل ردیف و قافیہ میں غزلیں کہتے تھے جن میں اچھے شعر نکالنا ہر کسی کا کام نہیں مثلاً۔

شب کو کینو کمر تجھ کو ہے پھبتا سر پر طرہ ہار گلے میں

جوں پردیں وہالہ مہ تھا سر پر طرہ ہار گلے میں



بادہ کشی کے سکھاتے ہیں کیا ہی قرینے سادون بھادوں

کیفیت کے ہم نے جو دیکھا دو ہیں مہینے سادون بھادوں

وقت نماز ہو ان کا قلم گاہِ خدنگ گاہِ کماں بنجاتے ہیں اہلِ عبادت گاہِ خدنگ گاہِ کماں
 حالِ پشت لب شیریں ہے غسل کی کٹھی دلہ روح فرما دلپٹ بن کے جبل کی کٹھی
 شکوہ الفاظ کے بھی عاشق تھے۔ ان کے بعض استعارات اور تشبیہیں بہت نادر اور
 عجیب ہوتے ہیں۔ مثل صائب کے مثالیہ اور اخلاقی مضامین بھی خوب باندھتے ہیں۔
 فی البدیہ کہنے میں بھی مشاق تھے۔ علی استعداد کم رکھتے تھے اور کہیں کہیں متروک الفاظ
 بھی نظم کر گئے ہیں۔ گو کہ کلام میں زور و اثر ہے مگر بلند پروازی اور اعلیٰ خیالات کم ہیں۔
 دوسرے درجہ کے شعرا میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ کلام میں کوئی خاص بات نہیں
 البتہ اپنے زمانہ کے استاد تھے اور صدہا لائقِ شاکر دچھوڑ گئے۔

لے مثلاً۔ دیہات جاگیر کے تعلق سے ایک دفعہ تحصیلدار سونی پت کے پاس ملاقات کو گئے
 اور کچھ زنگترے دلی سے بطور سوغات ساتھ لے گئے۔ تحصیلدار نے کہا کہ جناب شاہ صاحب !
 زنگتروں کی تکلیف کیا ضرورت تھی۔ آپ کی طرف سے بڑا تحفہ آپ کا کلام ہے ان زنگتروں کی تحسینِ شبیہ میں
 کوئی شعرا شاہ فرمائیے۔ اس وقت رباعی کہی اور سنائی ۵

لے نیز برج آسمان اقبال ان زنگتروں پر غور سے کیجیے گا خیال

یہ مندر حقیر ہو قبولِ خاطر پردہ میں شفق کے ہیں گرہ بند ہلال

(آبجیات ذکر شاہ نصیر)

باب ۱۲

طبقہ متوسطین شعرا دہلی

ذوق و غالب کا زمانہ

دہلی کی شاعری کا دوبارہ عروج دہلی کا از سر نو پھر عروج ہوا۔ صفحات گزشتہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اُردو شاعری کا مرکز ترقی دہلی سے لکھنؤ منتقل ہو کر آگیا تھا۔ لیکن قدما کی تخم ریزی بیکار نہیں گئی اُن کی کوششیں سرسبز ہوئیں اور وہ درخت جسکو دہلی کے قدیم شاعروں نے بڑی کدو کاوش سے سینچا تھا اب وہ نئے سرے سے پھیکا بنا شروع ہوا۔ دنیا میں مدوجزر، ترقی و تنزل، اور تنزل و ترقی کا قاعدہ ہمیشہ سے چلا آتا ہے یہی دہلی کا بھی حال ہوا۔ تھوڑے عرصہ کی خاموشی کے بعد شاعری دہلی کی بلبل ہزار داستان نے پھر نغمہ سرائی شروع کی۔ اور تمام اُردو و اہل بیک کے اپنی خوشنوائیوں کا گرویدہ بنا لیا۔ غالب، ظفر، ذوق، مومن وغیرہ اس دور کے نامی گرامی شعرا ہیں۔ غالب کی خدا داد ذہانت اور طباعی کا مقابلہ تو دنیا کے بہترین شعرا سے کیا جاسکتا ہے۔ ذوق و مومن گوکہ غالب کے مقابلہ میں نہیں چمک سکتے تھے مگر پھر بھی اپنے معاصرین میں بہت نمایاں درجہ رکھتے تھے۔ ظفر بھی کوئی معمولی درجہ کے شاعر نہ تھے اور چونکہ مشاغل حکمرانی کی زیادہ فکر نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے شعر کے مشغلہ سے دل بہلاتے رہتے تھے، وہ ذوق و غالب کے شاگرد تھے۔ اس زمانہ کے

شعرے دہلی جدید طرز کھنڈ کے بالکل متبع نہ تھے جہاں تصنع مکلف اور رعایت لفظی وغیرہ شاعری کی جان سمجھی جاتی تھی۔ ان کا کلام حقیقی شاعری اور صحیح جذبات سے ملبو ہے۔ غالب و دمومن کے یہاں فارسی الفاظ و محاورات کثرت سے ہیں اسوجہ سے کہ وہ فارسی کے بڑے زباں داں اور شاعر تھے۔ ان حضرات کے ابتدائی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قدما کی سیدھی سادی ہندی ترکیبیں نکال کر ان کی جگہ فارسی الفاظ رکھ دیے ہیں۔ اس زمانہ کا ان کا کلام محض فارسی الفاظ کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے ہندی لفظ اور محاورے یہ اُس وقت استعمال کرتے تھے کہ جب وہ کسی فارسی لفظ یا ترکیب کے ساتھ میل کھاتے تھے اور کلام کا سُسن بڑھاتے تھے۔ مومن اور غالب کے بعد غلبہ فارسی میں ایک معتد بہ کمی واقع ہوئی جملوں کی ترکیبیں سہل ہو گئیں شعروں میں صفائی اور روانی پیدا ہوئی۔ اسی وجہ سے غالب و مومن کے شاگردوں کا کلام بہت صاف ہو مثال کے لیے حالی ساک فطہ، انور اور مجروح کے کلام کو دیکھنا چاہیے۔

مومن ^{۱۲۶۵ھ} لغایت ^{۱۲۶۷ھ} ۱۲۶۵ھ مطابق ^{۱۲۶۷ھ} لغایت ^{۱۲۶۹ھ} ۱۲۶۷ھ

حکیم مومن خاں حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے۔ ان کے دادا حکیم نامدار خاں جنگی اصل پنجاب کے کشمیر سے تھے سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں آکر بادشاہی طبیبوں میں داخل ہوئے اور شاہ عالم کے زمانہ میں چند مواضعات جاگیر میں پائے۔ جب سرکار انگریزی کی حکومت ہوئی تو ان کی نشن مقرر ہو گئی جس کا کچھ حصہ مومن خاں کو بھی ملتا تھا۔ مومن خاں کی ولادت ^{۱۲۶۵ھ} ۱۲۶۵ھ میں ہوئی۔ بچپن ہی سے ذہانت اور طباعی اور شعر کہنے کی استعداد ان میں موجود تھی۔ حافظہ بہت زبردست پایا تھا جو بات سنتے تھے فوراً یاد ہو جاتی تھی۔ عربی و فارسی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ فن طب جو ان کا موروثی پیشہ تھا اپنے باپ پر چچا سے حاصل کیا۔

شاعری کے علاوہ نجوم میں بھی انھوں نے کمال حاصل کیا تھا اور ایسا ملکہ ہمہ پہنچایا تھا کہ ان کے احکام پیشین گوئیاں سن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے اکثر احکام کے صحیح ہونے کے سبب سے لوگ ان کے بہت معتقد تھے اور اکثر آئینہ کی باتیں ان سے دریافت کیا کرتے تھے شیخ سے بھی ان کو کمال مناسبت تھی۔ اور دلی کے مشہور شاعر کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے مگر ان تمام مشاغل اور فنون کو انھوں نے ذریعہ معاش نہیں بنایا تھا۔ آدمی بہت خوبصورت خوش وضع اور عاشق مزاج تھے عشق بازی کے لیے دلی ایسا وسیع شہر پایا تھا جہاں ان کے عشق و محبت کے افسانے لوگوں کے زباں زد تھے۔ جب جوانی کی ہوسنا کی ختم ہو گئی تو انھوں نے تمام بُری باتوں سے توبہ کر لی تھی اور نماز و روزہ کے سختی سے پابند ہو گئے تھے۔ جو کلام ان کی جوانی اور آزادہ روی کے زمانہ کا ہے وہ عاشقانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ مگر آخر عمر میں کلام میں بہت سختگی اور متانت آ گئی تھی۔ ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھاتے تھے مگر چند روز کے بعد ان سے اصلاح لینی چھوڑ دی۔ اور اپنی ہی ذہانت اور طباعی پر بھروسہ رکھتے تھے۔ دلی سے پانچ مرتبہ باہر نکلے اور رام پور، سسواں، جہانگیر آباد، اور سہارن پور کی سیر کی۔ چنانچہ کہتے ہیں ۷

دلی سے رامپور میں لایا جنوں کا شوق دیر نہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم
چھوڑ دلی کو سسواں آیا ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

مگر وطن کی محبت نے پھر اپنی طرف جلد بلا لیا۔ جب مرزا غالب نے سلسلہ اعم میں دلی کالج کی پشین پروفیسری قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ تو ٹامسن صاحب نے یہی جگہ بمشاورہ آئی ویسہ ہمارا اس شرط پر کہ باہر جائیں مومن خاں کو دینا چاہی مگر انھوں نے

باہر جانے سے انکار کیا۔ اسی طرح کپور تھلہ بھی بمشاہرہ تین سو پچاس نہ گئے۔ کیونکہ مومن لیا تھا کہ وہاں ایک گویے کی یہی تنخواہ ہے۔ نواب ذبیر الدولہ ہمارے والی ٹونک نے ایک مرتبہ ان کو بلا بھیجا اور اپنے پاس رکھنا چاہا مگر انھوں نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ ٹونک میں دلی کی پُرکھٹ جعبتیں کہاں تیسر ہوگی۔ مومن خاں نہایت آزاد مزاج قانع اور وطن دوست تھے۔ امیروں اور رئیسوں کی دربارداری اور خوشامد سے ان کو سخت لغت اور عار تھا۔ یہی ان کے کیرکٹر کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ ان کا دیوان امرا کے مدحیہ قصائد سے خالی ہے۔ سوائے اس قصیدہ کے جس کا مطلع ہے۔
صبح ہوئی تو کیا ہو اور وہی تیرہ انخوری کثرت دود سے سیاہ شعلہ شمع خاوری
یہ قصیدہ بطور اظہار شکر یہ کے راجہ اجیت سنگھ رئیس پٹیا لہ کی شان میں لکھا تھا جنھوں نے ان کو ایک تھنی بطور تحفہ کے دی تھی۔

اپنی قابلیت اور جوہر ذاتی کا حکیم مومن خاں صاحب کو اس درجہ خیال تھا کہ اسکے مقابلہ میں لوگوں کی فصاحت و بلاغت کو سچ سمجھتے تھے۔ مشہور ہے کہ گلستان سعدی کو بھی ایک معمولی کتاب کہتے تھے۔ جب سعدی کی نسبت ان کا ایسا خیال تھا تو اپنے معاصرین ذوق و غالب کو کیا خطرہ میں لاتے۔ ان کے کلام کو نگاہ حقارت سے دیکھتے اور ان کا مضحکہ اڑاتے تھے۔ تاریخ گوئی میں ان کو کمال حاصل تھا۔ تاریخ میں تخریب اور تعمیہ بڑا سمجھا جاتا ہے۔ مگر ان کی طبع رسائی اس کو محسنات میں داخل کر دیا تھا۔ تاریخیں نئے نئے طریقہ سے لکھتے تھے مثلاً اپنی صنفیر سن بٹی کی تاریخ وفات کسی سے خاک برفرق دولت دنیا بہ من فشا دم خزانہ بر سر خاک۔ اسمیں ”خزانہ“ کے اعداد سرخاک یعنی (رخ) کے اعداد کے ساتھ ملانے سے ۱۲۳۳ نکلتے ہیں۔ ایک بٹی کی

ولادت کی تاریخ اس طرح کہی ۵

نال کٹنے کے ساتھ ہاتھ نے کسی تاریخ دخترمومن

”دخترمومن“ کے اعداد سے ”نال“ کے اعداد خارج کرنے سے تاریخ نکل آتی ہے
اسی طرح شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی وفات کی تاریخ عجیب طریقہ سے
نکالی ہے ۵

دوست بیدار اجل سے بے سرو پا ہو گئے فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل
اس میں دوسرے مصرعہ کے الفاظ کے صرف بیچ کے حروف سے مادہ تاریخ
۱۲۳۹ھ نکالا ہے۔

تصانیف تصانیف میں ایک دیوان جس میں چھثنویاں شامل ہیں یادگار چھوڑا
دیوان میں جمیع اصناف سخن جو شعراے اردو کو مطبوع ہیں بکثرت موجود ہیں۔ دیوان
کی ترتیب ان کے مشہور شاگرد نواب مصطفیٰ خاں شفیق نے کی تھی اور ۱۲۷۶ھ میں
مولوی کریم الدین صاحب مولف تذکرہ شعرائے ہند نے اس کو شائع کیا

زنگ کلام مومن خاں کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لیے شہرہ آفاق ہے
ان کی تشبیہیں اور استعارے بالکل غیر معمولی ہوتے ہیں اور کلام میں ایک خصوصیت
پیدا کر دیتے ہیں انہیں بلند پروازی کے ساتھ صحیح جذبات نگاری کا جوہر بھی ہے
اور یہی چیز ان کو طرز لکھنؤ سے علیحدہ کر دیتی ہے۔ عاشقانہ زنگ کے وہ استاد کامل
ہیں۔ انکی علمی لیاقت اور طباعی ان کو معمولی پامال مضامین سے بچاتی ہے۔ مثل
غالب کے وہ بھی کلام میں فارسیت کے بہت دلدادہ ہیں کیونکہ فارسی میں ان کو بھی
وہی تجربہ حاصل تھا بعض وقت یہ فارسیت کی کثرت اچھی نہیں معلوم ہوتی اور کلام کو

سخت اور گنجلک کر دیتی ہے۔ انکی ثنویاں سرتیز نشتر ہیں جن میں حراں نصیب عاشق کے سوز محبت کا اظہار ہے۔ وہ جذبات سے بھری ہوئی ہیں اور مضطرب دلوں کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔ البتہ یہ اُن میں کمی ہے کہ عشق بازاری ہو اور طرزِ ادا بلند نہیں ہے اس معنی میں وہ طلسمِ آفت اور زہِ عشق وغیرہ کے رنگ کی کمی جاسکتی ہیں۔ مومن کے یہاں الفاظ کا طلسم ہے اور اسی لفظی ہم پھیر سے تخیل کے نئے راستے کھل جاتے ہیں مثلاً چند شعر درج ہیں۔

روز جزا جو قاتلِ دجُو خطاب تھا میرا سوال ہی مے خوں کا جواب تھا

پشکستنِ خم زجرِ محتسب معقول گناہگار نے سمجھا گناہگار مجھے

فقد جال تھا نہ سزلے دیتِ عاشق حریف خونِ فرہاد سرگردنِ مسرہادر رہا

کیون غش ہوے دیکھ آئینہ کو کہتے تھے کہ تاب لائیں گے ہم

آئینہ رنگِ غم نے توڑا کیونکر اُسے منہ دکھائیں گے ہم

مومن کا مرتبہ بحیثیت شاعر مومن شعراءِ اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں نہ صرف

اپنی ذہانت اور طباعی اور دلفریب شاعری کی وجہ سے۔ یا اس لیے کہ اُن کے معاصرین

انکی بڑی قدر کرتے تھے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ ایک صاحب طرز ہیں جن کے پیرو

نسیم دہلوی، منشی امیر اللہ تسلیم، حسرت موہانی وغیرہ ایسے نام برآوردہ لوگ ہیں۔

مومن کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں لو اب مصطفیٰ خاں شفیقہ صاحب دیوان

و تذکرہ گلشنِ بخار، حمیرا تسکین، میر غلام علی وحشت، صفر علی خان نسیم وغیرہ۔ مومن کا

انتقال ۱۳۶۷ھ مطابق ۱۹۴۸ء میں کوٹھے سے گر کر ہوا۔ انھوں نے حکم لگایا تھا

کہ پانچ دن یا پانچ مہینے۔ یا پانچ برس میں مہجاول گاجہاں پانچ مہینے کے بعد مر گئے

گرنے کی تاریخ خود کسی تھی۔ دست و بازو شکست۔ چونکہ اسی سال انتقال ہو گیا تھا
لہذا یہی تاریخ اُن کے مرنے کی سمجھنا چاہیے۔

شہادت ۱۳۱۰ھ

نفاذ ۱۳۱۰ھ

نواب مصطفیٰ خان شفیقہ خلف الصدق نواب مرتضیٰ خان جنھوں نے
لاہور لیک کے ساتھ رہ کر بڑے بڑے کام کیے تھے اور اُس کے
صلے میں ہوڈل پول کا علاقہ جاگیر میں پایا تھا۔ علاقہ جہانگیر آباد واقع ضلع بلند شہر
نواب مصطفیٰ خان صاحب نے خرید کیا جواب تک اُن کی اولاد کے قبضہ میں ہے۔
نواب صاحب موصوف کی ولادت ۱۲۲۰ھ مطابق ۱۸۰۸ء میں دہلی میں ہوئی اور غدر
۱۸۵۷ء تک وہیں قیام رہا۔ اس کے بعد اپنے علاقے جہانگیر آباد میں قیام گزیر ہوئے
نواب صاحب کو شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی۔ پرگو شاعر تھے۔ فارسی میں حسرتی
اور اردو میں شفیقہ تخلص کرتے تھے مشہور ہے کہ فارسی میں غالب سے اور اردو میں
مومن سے مشورہ سخن کرتے تھے شاید واقعہ یہ ہو کہ پہلے اپنا کلام مومن کو دکھاتے
ہوں اور ان کے بعد غالب سے جو اُن کے بہت بڑے دوست تھے رجوع کی ہو۔
شفیقہ کی قابلیت کا نشوونما علم و فن اور شعر و سخن کے ایسے جگہ میں ہوا جس میں مولوی
آغا بخش صہبائی۔ عبداللہ خان علوی۔ مفتی صدر الدین خان آذرہ۔ غالب۔ ذوق
شاہ نصیر جہان تبسکین حکیم آغا جان علیش وغیرہ شریک تھے مفتی صدر الدین خان
اور خود نواب صاحب کے یہاں ہفتہ ہفتہ باری باری سے مشاعرہ ہوتا تھا۔ اہل کمال
اُس میں جمع ہو کر لطف سخن اُٹھاتے تھے۔ نواب صاحب کی سخن فنی کی اتنی شہرت تھی
کہ غالب ایسا صاحب کمال اپنے اشعار کی اچھائی اور بُرائی کی کسوٹی نواب صاحب کی پسند کی
کو قرار دیتا ہے اور کہتا ہے۔

غالب بے گفتگو نادر ہیں ارزش کما و نوشت در دیوان غزل مصطفیٰ خاں شکر

ایک دوسری جگہ انکی طباعی اور ذہانت کی داد دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

غالب زحمتی چہ سرایم کہ در غزل چوں او تلاش معنی و مضمون نکرده کس

نواب صاحب کو سفر حج کے بعد سے شعر گوئی سے ایک بے توجہی سی ہو گئی تھی

کبھی احباب کے اصرار سے کچھ کہہ لیتے تو کہہ لیتے۔ زیادہ وقت اپنا طاعت و عبادت

اور اردو وظائف میں صرف کرتے تھے اور تمام منہیات سے تائب ہو گئے تھے۔

تصانیف میں ایک فارسی دیوان، ایک اردو دیوان، ایک مجموعہ انشائے فارسی،

جو فارسی انشا پر دازی کا بہترین نمونہ ہے، ایک سفر نامہ موسوم بہ ترغیب السالک،

الیٰ احسن المسالک جس کا فارسی نام رہ آور دہے۔ اور ایک مبسوط تذکرہ شعرائے

اردو کا زبان فارسی میں مشہور گلشن بیجاران کی یادگار ہیں۔

شیفۃ بہ نسبت شاعر کے ناقد کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ اپنے زمانہ

میں بھی ان کو یہی شہرت حاصل تھی اور اردو اور فارسی شاعری کے اعلیٰ درجہ کے

نقاد اور سخن سنج سمجھے جاتے تھے۔ ان کا تذکرہ گلشن بیجار ایک مبسوط اور مشہور تصنیف

ہے اور ہمارے نزدیک وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں انصاف اور آزادی کے ساتھ اشعار

کی تنقید کی گئی ہے۔ اردو میں شیفۃ اپنے استاد مومن کے پیرو ہیں۔ ان کا کلام اخلاق

و تصوف کے مضامین سے لبریز ہے۔ ان کے کلام میں دانستگی مطلق نہیں ہے۔

ان کے اردو اشعار گو بہت اعلیٰ درجہ کے نہ سہی مگر بلن مضامین صاف اور با محاورہ

زبان اور پاکیزہ خیالات رکھتے ہیں۔ دوسرے درجہ کے شعرا میں ان کا درجہ ممتاز ہے۔

ان کے صاحبزادہ نواب محمد اسحاق خاں نے ان کا اردو و فارسی کلام مع ایک مفید

دیباچہ اور حالات کے سلسلہ ۱۹۱۷ء میں نظامی پریس دلیوں سے چھپوا کر شائع کیا۔
 تسکین سلسلہ ۱۲۶۷ء میں حسین تسکین میر حسن عرف میرن صاحب کے بیٹے تھے۔
 دلی میں پیدا ہوئے اور مولوی امام بخش صہبائی سے درسی کتابیں پڑھیں۔ شعر و سخن
 میں شاہ نصیر سے صلاح لیتے تھے۔ مگر اُن کے انتقال کے بعد مومن کے شاگرد ہوئے
 اور شہرت حاصل کی۔ تلاش معاش میں لکھنؤ اور میرٹھ گئے مگر جب وہاں کچھ مقصد برآری
 نہ ہوئی تو رام پور آ رہے۔ جہاں نواب یوسف علی خاں نے اُن کی بڑی قدر دانی کی چند روز
 رام پور میں آرام سے بسر کر کے پچاس برس کے سن میں سلسلہ ۱۲۷۷ء میں رامپور ہی میں
 انتقال کیا اور وہیں پوینہ خاک ہوئے۔

کلام کا رنگ گواہی دیتا ہے کہ مومن کے شاگردوں میں یہ خاص مرتبہ رکھتے
 تھے۔ اپنے اُستاد کے قدم بقدم چلتے ہیں بلکہ کلام میں اس قدر ہم رنگی پیدا ہو گئی ہے
 کہ اگر دونوں کا کلام مخلوط کر دیا جائے تو تین کرنا دشوار ہو جائے گا۔ تسکین کے بیٹے
 میر عبد الرحمن اُسی رامپور میں نواب کلب علی خاں کے زمانہ تک تھے۔ یہ بھی ایک
 نام برآوردہ شاعر تھے۔

نسیم دہلوی
 سلسلہ ۱۲۷۷ء لغایت ۱۲۸۷ء
 مرزا اصغر علی خاں متخلص بہ نسیم نواب آقا علی خاں کے بیٹے تھے
 دلی میں سلسلہ ۱۲۸۷ء مطابق ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے اور وہیں
 نشوونما پایا۔ ضروریات زمانہ کے موافق تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ باپ کے مرنے
 کے بعد بھائیوں سے ناموافقت ہو گئی اور وہ اپنے بڑے بھائی مرزا اکبر علی خاں کے ساتھ
 لکھنؤ چلے آئے اور یہیں رہ پڑے۔ بعد کو بھائیوں نے عفو و تقصیر کر کے ملت چاہا
 مگر لکھنؤ نے ایک نہ مانا۔ اور پھر دلی نہیں گئے۔ تمام عمر لکھنؤ میں فقر و فاقہ کی حالت میں

رہے مگر کبھی کسی کے سامنے دست سوال نہیں پھیلایا۔ بڑے پابند مذہب اور احکام
قرآنی کے سختی سے عامل تھے۔ غدر کے بعد منشی نو کشور کے مطبع میں الف لیلہ کے منظوم
ترجمہ کی خدمت پر مقرر ہوئے۔ ایک جلد ختم کی تھی کہ مطبع کی طرف سے تکمیل کتاب کی
جلدی ہوئی جو ان کو ناگوار خاطر ہوئی اور وہ علیحدہ ہو گئے۔ ان کے بعد منشی طوطا را
نیاں نے بقیہ کتاب کو پورا کیا۔ تعجب ہے کہ جبوقت لکھنؤ کا طرز زوروں پر تھا اُس وقت
نسیم دہلوی کو خود اپنے طرز میں لکھنؤ میں بڑی شہرت اور کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ بڑے
زود گو تھے مگر اسی کے ساتھ مزاج میں دارنگی اس قدر تھی کہ جو کچھ لکھتے اُس کی نقل
اپنے پاس نہیں رکھتے تھے جسکی وجہ سے بہت کچھ کلام تلف ہو گیا۔ اُن کا دیوان
اُن کے شاگرد حافظ عبدالواحد خاں مالک مطبع مصطفائی نے چھپوا دیا تھا۔ مگر اُس کو
وہ اپنے لئے ننگ سمجھتے تھے۔ ان کی غزلوں کو مرزا غالب بھی پسند کرتے تھے۔ باوجود
دہلوی ہونے اور اپنے شہر کی زبان پر فخر کرنے اور اسکی سختی کے ساتھ پابندی کے اکثر
اہل لکھنؤ نسیم کے شاگرد ہوئے جن میں عبداللہ خاں مہر، منشی اشرف علی اشرف۔
منشی امیر اللہ تسلیم مشہور ہیں۔

طرز کلام نسیم میں مومن کا رنگ بہت پایا جاتا ہے۔ اُن کا نہایت ہی لطیف طرز
بیان نادر کجیالی کے ساتھ ملا ہوا ہے جو مومن کا فیض تھا۔ نسیم کو تازگی کلام اور صحت
محاورات کا بہت خیال تھا۔ لکھنؤ کی تصنیفات اور لفاظی کو وہ پسند نہیں کرتے تھے
ان کے کلام میں خیال کی دلفریبی کے ساتھ زبان کی صفائی اور پاکیزگی بہت نمایاں
ہے اپنے استاد کی طرح وہ بھی فارسی ترکیبیں بہت استعمال کرتے ہیں۔ اور زراکت خیال
اور طرز بندش اور روانی کلام میں بھی انھیں کے پیرو ہیں نسیم کا مرتبہ شعلے درجہ میں

بہت برتر ہے -

ذوق ۱۲۰۳ لغایت ۱۲۰۷

مطابق ۱۲۰۷ لغایت ۱۲۱۰

شیخ ابراہیم ذوق ایک غریب سپاہی شیخ محمد رمضان کے بیٹے تھے جن کو نواب لطف علیخان رئیس دہلی کی حرم سرا کے کاروبار کی خدمت سپرد تھی۔ گو وہ کسی بڑے گھرانے سے نسبت نہ رکھتے تھے مگر اپنے جوہر ذاتی اور فنی قابلیت سے ہزاروں شریفوں اور عالی خاندانوں سے بڑھ کر مشہور ہوئے۔ اُن کی ابتدائی تعلیم ایک شخص حافظ غلام رسول کے سپرد ہوئی جو معمولی درجہ کے شاعر بھی تھے اور جن کے پاس محلے کے اکثر لڑکے پڑھنے آتے تھے حافظ صاحب کو شعر سے بہت شوق تھا اور اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ انھیں کے ساتھ ہمارے نو عمر ذوق بھی مشاعروں میں جایا کرتے تھے۔ جہاں لوگوں کے اشعار سن کر اُن کو ایک روحانی لذت حاصل ہوتی اور شعر کہنے کا شوق دل میں پیدا ہوتا۔ اس زمانہ میں اکثر اچھے اچھے اشعار یاد کر لیتے اور اُن کو بار بار پڑھا کرتے تھے۔ اس زمانہ کا کلام حافظ جی ہی کو دکھاتے اور اُن ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ ذوق کے ہم محلہ اور ہم سبق میر کاظم حسین شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے جن کا اُس وقت دلی میں بڑا شہرہ تھا۔ اُن کی دیکھا دیکھی ذوق کو بھی خیال پیدا ہوا کہ شاہ نصیر کے شاگرد ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا اور ایک دن میر کاظم حسین کے ساتھ جا کر شاہ صاحب کے شاگرد ہو گئے۔ نوجوان شاگرد کی غیر معمولی ذہانت اور طباعی سے تجربہ کار استاد کو خیال پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شاگرد استاد سے بڑھ جائے۔ اسی خیال سے وہ کبھی اُنکی غزلوں کو بغیر اصلاح پھیر دیتے۔ کبھی منہ بنا کر کہتے یہ کچھ نہیں طبعیت پر زور ڈال کر کہو ادھر ذوق کو ان کے دوستوں نے استاد کے خلاف ابھار دیا۔ غرض کہ انھیں وجوہ سے رشتہ

استادی و شاگردی منقطع ہو گیا۔ ذوق اپنے کلام کو بنظر اصلاح خود دیکھنے لگے اور اسکی درستی و سستی میں بڑی کد و کاوش کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے کلام نے جلد شہرت حاصل کر لی اور اُن کی غزلیں محفلوں اور مجلسوں حتیٰ کہ کوچہ و بازار میں گائی جاتی تھیں۔ اس زمانہ میں مرزا ابو ظفر ولیعہد سلطنت کے یہاں اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اور بسا اوقات غزلیں فی البدیہہ کہی جاتی تھیں۔ جس سے شاعرانہ جودت اور تیز ہوتی تھی اور نواآموز شعر کا شوق اور زیادہ ہوتا تھا۔ ان مشاعروں میں اکثر نرپاے اور کمنہ مشق شاعر مثلاً فریق، احسان، شکیبہ، قاسم، عظیم، منت وغیرہ برابر شریک ہوتے تھے۔ انھیں میں تبوسط میر کا نظم حسین بقیرار ذوق کی بھی رسائی ہوئی۔ اتفاق سے اس زمانہ میں شاہ نصیر دلی چھوڑ کر کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور ولی عہد سلطنت ظفر کی غزلوں کی اصلاح میر کاظم حسین کے سپرد تھی اتفاقاً اُن کو بھی بحیثیت میر منشی جان افینڈن صاحب کہیں باہر جانا پڑا اور اب اصلاح کا کام ذوق کے سپرد ہو گیا۔ جس کا صلہ چار روپیہ ماہوار بطور مشاہرہ مقرر ہوا۔ یہ تنخواہ گو بہت کم تھی مگر اس کمی کی تلافی انکی قدر و منزلت اور شہرت کی زیادتی سے بخوبی ہو گئی اس وجہ سے کہ اب شہر کے تمام امیر و رئیس اور نیز کمنہ مشق شاعر اُن کو استاد ماننے لگے۔ دلی میں نواب الہی بخش خاں متخلص معروف (مرزا غالب کے خسر) ایک عالی خاندان امیر تھے اور علوم ضروری کے باخبر ہونے کے علاوہ کمنہ مشق شاعر بھی تھے۔ پہلے شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ جب ذوق کا شہرہ ہوا تو انھیں بھی شہتیاق ہوا اور دبقول مولانا آزاد ذوق کے شاگرد ہو گئے۔ اس وقت ذوق کی عمر تقریباً بیس سال تھی ان دو مشہور آدمیوں کی شاگردی سے نہ صرف ذوق کی شہرت میں اضافہ ہوا بلکہ اُن کو اپنے کلام کی پختگی و

صفائی کا انتہائی خیال ہوا۔ اور اسی وجہ سے وہ نہایت عمدہ شعر کہنے لگے اور یہی مشق آئندہ اُن کے کام آئی کیونکہ اُن کو نواب صاحب کے کلام کی اصلاح میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی اور اُن کی غزلوں کو جو کبھی سودا کبھی جرأت کبھی درد کے طرز میں ہوتی تھیں بڑی دقت نظر سے بنا دیا جاتا تھا۔

شاہ نصیر سے معرکہ جب شاہ نصیر دکن سے واپس آئے تو اپنا علم استاد ہی بھرنے لگا۔ ادھر موہنار اور طباع شاگرد کے دل کو بھی اتنے دنوں کی مشق اور کدوکاوش نے اور بڑھا دیا تھا مشکل مشکل بحروں اور ردیف قافیوں میں کہتے کہتے بڑی مشاقی اور روانی پیدا ہو گئی تھی۔ شاہ نصیر نے دکن میں کسی کی فرمائش سے نو شعر کی ایک غزل کہی تھی جسکی ردیف تھی ”آتش و آب و خاک و باد“ وہ غزل دلی کے مشاعرہ میں سنائی اور کہا کہ اس طرح میں جو غزل لکھے اُس کو میں استاد مانتا ہوں شاہ صاحب کی مبارک طلبی پر ذوق نے مقابلہ کا بیڑا اٹھا لیا اور ایک غزل اور تین قصیدہ لکھ کر تیار کیے شاہ صاحب کو شاگرد کی جرأت و گستاخی بہت ناگوار ہوئی ایک شاگرد سے اعتراض کرایا۔ جس کے جواب میں ذوق نے اکثر اسناد پیش کیے اور اس مقابلہ میں ذوق ہی کو کامیابی ہوئی اس کے بعد سے اُن کی استاد ہی مسلم ہو گئی۔

۱۔ مصنف مذکورہ گل رعنا اس معاملہ میں آزاد سے بالکل مختلف رائے رکھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ آزاد نے آب حیات میں صبطح سے ظفر حوم کی کاوش فکر پر پانی پھیرا ہے۔ ان کے (معرون کے) بھتیجے فکر کو اپنے استاد ذوق کے دامن کمال سے وابستہ کیا ہے اور جو دیکھ اس کمندہ مشق شاعر کی عمر اس وقت چھا سٹھ برس کی تھی اور ذوق مشکل اٹھارہ برس کے رہے ہونگے۔ مگر جوش عقیدت میں اسکا خیال نہیں رہا۔ (مذکورہ گل رعنا فٹ نوٹ صفحہ ۲۸۳) اور نیز نواب سعید الدین احمد خاں حلالہ حوم نے بھی ایک مضمون میں نہایت مدلل طریقہ سے آزاد کے اس بیان کی تردید کی ہے۔ ۱۲۔

اُن کے اعلیٰ قصائد کے صلہ میں اکبر شاہ ثانی نے اُن کو "خاقانی ہند" کا مغز خطاب عطا کیا تھا۔ جب مرزا ابوالظفر بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے تو انھوں نے پہلے یہ قصیدہ گزرا تا کہ

روکش تے رخ سے ہو کیا نورِ سحر رنگِ شفق ہے ذرہ تیرا پر تو نورِ سحر رنگِ شفق
اس کے صلہ میں اُنکی تنخواہ چار روپیہ سے پانچ روپیہ ہو گئی اور پانچ سے سات
رفتہ رفتہ سو تک اصناف ہو ا تھا اور عیدِ بقرعید کے موقع پر خلعت و انعام سے سرفراز
ہوتے تھے۔ آخر ایام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے جب شفا پائی تو انھوں نے
قصیدہ کہکر گزرا تا کہ

واہ و اکیا معتدل ہے باغِ عالم کی ہوا مثل نبض صاحبِ صحت ہے ہر ج صبا
اس کے صلہ میں خلعت کے سوا خطاب خان بہادری اور ایک ہاتھی معہ عوضہ نقرئی
عنایت ہوا پھر ایک دوسرے قصیدے کے صلے میں

شب کو میں اپنے سر پر خرابِ راحت نشہ علم میں سرستِ غرور و نخوت
ایک گانوں جاگیر میں عنایت ہوا۔ ذوق نے بھر اٹھ سال ۱۲۸۷ھ میں انتقال کیا۔

۱۷ شلادہ قصیدہ جس کا مطلع ہے کہ
جکے سلطان و اسد مہر کا ٹھہر سکے آب و ایلولہ ہوئے نشوونماے گلشن

۱۸ غالباً مرزا غالب نے اسی موقع پر یہ غزل کہی ہوگی جس کا مطلع و مقطع ہے

پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مرد مہ تماشا ئی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب شاہ دیندار نے شفا پائی

۱۹ ظفر نے تاریخ کہی

بحکم خداوند جاں دادِ ذوق

خراشید و فرمود استادِ ذوق

۱۲۷۱ھ

شب چار شنبہ ماہ صفر

ظفر دے اردو بہ ناخنِ زخم

ذوق اپنی تیزی ذہن، براقی طبع اور قوت حافظہ کے لیے مشہور تھے۔ بڑے خدا ترس اور بہرہ ردی انسانی سے لبریز تھے۔ خوف خدا کا یہ حال تھا کہ کبھی کوئی جانور بلکہ ایک چڑیا تک ہلاک نہیں کی۔ مختلف اذواق سے دلچسپی رکھتے تھے مثلاً موسیقی، نجوم، طب، تعبیر خواب وغیرہ شعر گوئی ان سب پر حاوی تھی۔ اس میں ان کو فطرت کا مرتبہ حاصل تھا۔ جوں جوں عمر گزرتی گئی ان کی قابلیت اور کمال میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کو فقہ، تصوف، تفسیر، حدیث، تاریخ وغیرہ میں دستگاہ کامل تھی، دنیاوی ترقی کے حوصلے ان کو مطلق نہ تھے۔ دلی سے ان کو اس قدر محبت تھی کہ جب راجہ چند دلال نے جو شادان تخلص کرتے تھے اور شعرو شاعری کے بڑے دلدادہ اور شعرا کے مرنے تھے، ان کو حیدر آباد بلوا بھیجا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا اور یہ شعر لکھ کر بھیج دیا۔

ان دنوں گرچہ دکن میں ہی بڑی قدر سخن کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر ایک تنگ گلی کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں رہا کرتے تھے۔ جس میں کوئی زیب و زینت بلکہ آرام و آسائش تک کا سامان مہیا نہ تھا۔ اسی مکان میں ہر وقت بند اپنی فکر شعرو سخن میں محو و مستغرق دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر رہتے تھے احکام قرآنی کے پورے عامل اور نماز روزہ کے سختی سے پابند تھے۔ دن رات میں اکثر اوقات اوراد و وظائف میں صرف کرتے تھے۔

تصانیف ایک ایسے شخص سے جس نے اپنی عمر کے سچا پس برس سے زیادہ شعرو سخن کی مشق میں صرف کیے ہوں اور سوائے شعرو سخن کے اُس کا کوئی دوسرا مشغلہ نہ رہا ہو امید کی جا سکتی تھی کہ متعدد دیوان لاکھوں ابیات کے اُس نے یادگار چھوڑے ہونگے۔

اسمیں کوئی کلام نہیں کہ اُنھوں نے بہت کچھ لکھا تھا۔ اگر اُن کا سب کلام اس وقت جمع کیا جاتا تو کئی جلدیں تیار ہوتیں۔ مگر افسوس ہے کہ سارا کلام زمانہ غدر کی لوٹ مار میں ضائع ہو گیا۔ مولوی محمد حسین آزاد اُن کے شاگرد رشید نے اس واقعہ کو نہایت دردناک طریقہ سے اپنی کتاب ”آب حیات“ میں لکھا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ اُن کا جس قدر کلام ہمارے سامنے ہے وہ خود اُنکی اور حافظ غلام رسول دیران کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔

”ذوق غزل اور قصیدہ دونوں کے استاد کامل تھے جنکی تعداد کافی مقدار میں وہ چھوڑ گئے ہیں۔ آب حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عشقیہ خط بطور ثنوی جسکا نام ”نامہ جہاں سوز“ رکھا تھا اور پانچ سو ابیات کے بعد تنہو زنا تمام تھا ایام غدر کی دستبرد میں ضائع ہو گیا۔ اُنھوں نے اکثر مخمس رباعیات اور تاریخیں بھی لکھی تھیں جنہیں سے اکثر ضائع ہو گئیں مگر چند دیوان موجودہ میں شامل ہیں۔ اپنے شاگرد رشید ظفر کوہی سے کچھ گیت وغیرہ بھی کہے تھے۔ البتہ سلام اور مرثیہ اور ہجو وغیرہ ان کے کلام میں نہیں پائی جاتیں۔ ذوق کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے زبان کو خوبصورت کیا اور اس پر جلادی۔ وہ ایک بہت بڑے صنّاع تھے اور الفاظ کی نشست اور مناسب استعمال سے کما حقہ واقف تھے، محاورات اور مثال کے استعمال میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ الفاظ کا بر محل استعمال فن عروض سے واقفیت۔ موسیقیت کلام۔ زور تخیل اور بلندی مضامین یہ سب چیزیں مل کر اُن کے کلام کا جوہر اعلیٰ بن گئی ہیں۔ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں لطف الفاظ کے ساتھ خوبی معنی اس قدر

ذوق کی خدمت
زبان کے ساتھ

۱۔ مصنف مخمّانہ جاوید اس سعی میں اور اور ظہیر کو بھی شریک بناتے ہیں۔ دیکھو حال انور دہلوی ۱۲

نہیں پائی جاتی -

انداز کلام

ذوق کی شاعری میں تکلف اور تصنع مطلق نہیں ہے۔ اُن کے یہاں تشبیہات و استعارات اور دیگر صنایع بدایع نہایت مناسبت سے کمالِ فی الطعام استعمال ہوئے ہیں جسکی وجہ سے شعر کا حسن دو بالا ہو جاتا ہے اُن کے کلام سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ شاعر اپنی قابلیت اور علم و فضل کا زبردستی اظہار کرنا چاہتا ہے۔ کلام میں روانی اور ترمیم بہت ہے۔ اعلیٰ تخیل اور بلندی مضامین کبھی الفاظ کی خوبصورتی اور صرف بر محل کے فراہم نہیں ہوتے ہر شعر بر محل اور خوش و زوائد سے پاک ہوتا ہے۔ سستا شعرا اُن کے دیوان میں نہیں ہیں۔ قوت کلام اور تنوع مضامین کے اعتبار سے اُن کا مقابلہ سودا سے کیا جاسکتا ہے اور انھیں کے وہ متبع تھے بھی مگر اُن کے یہاں اور استادوں کا بھی رنگ موجود ہے مثلاً خواجہ میر درد۔ اور جرأت و مصحفی قصیدہ میں وہ کامل استاد مانے گئے اور اپنے تمام معاصرین پر بقت لیگئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے اکثر قصائد صنائع ہو گئے۔ مگر جو کچھ ہمارے سامنے ہیں وہ اُن کی قادی کلامی اعلیٰ تخیل اور بلند پروازی اور روانی کلام کے بمثل نمونے ہیں۔ اس صنف میں وہ اپنی آپ نظیر تھے۔ اُن کی غزلیں، تازگی مضامین، خوبی محاورہ سادگی اور صفائی کے لیے مشہور ہیں۔ اُن کے کلام میں شاہ نصیر سودا، درد، مصحفی اور جرأت سب کا رنگ پایا جاتا ہے اسی وجہ سے ان کے کلام کو گلدستہ گلہائے رنگارنگ کہنا بیجا نہیں۔ ان کی وہ غزلیں جو جرأت کے رنگ میں ہیں مگر جرأت کے عیوب سے پاک ہیں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ اُن کے کلام پر بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ وہ معائب سے پاک نہیں ہے اور عام لوگوں کے لئے ہے۔

ایسی صورت میں جب آگے اکثر معاصرین بڑے بڑے فارسی و عربی داں شاعر تھے۔ جن کا کلام معمولی آدمیوں کی سمجھ سے باہر تھا۔ یہ اعتراض سبجا بھی نہیں ہے۔ باز خیالی اور معانی آفرینی میں اگرچہ وہ غالب سے کم ہوں مگر سادگی اور صفائی اور نرم الفاظ کے لحاظ سے وہ ان سے بڑھے ہوئے ہیں اور قصیدہ میں تو ان سے کہیں زیادہ ہیں۔ مختصر یہ کہ آسمان شاعری پر ذوق ایک درخشاں تارہ بن کر چمکے اور زبان اردو کے بہترین شعرا میں ان کا شمار کیا جاسکتا ہے۔

شاگرد اُن کے سیکڑوں شاگرد تھے جن میں نواب مرزا خاں داغ۔ ظفر، آزاد، ظہیر اور انور بہت نامور ہوئے ہیں۔ اُن کے ایک ہی بیٹے تھے خلیفہ محمد اسماعیل، جو اُن کے فرزندان روحانی کی طرح زمانہ غدر میں دُنیا سے اُٹھ گئے۔

ظہیر متونی رحمہ اللہ سید ظہیر الدین نام ظہیر تخلص سید جلال الدین حیدر کے بیٹے دلی کے باشندے تھے، اُن کے والد ابو ظفر بہادر شاہ کے خوشنویسی میں استاد مرصع رقم خان بہادر کے خطاب سے سرفراز تھے۔ خود ظہیر بھی کم سنی ہی میں شاہی ملازمت میں داخل ہو گئے تھے۔ اور راقم الدولہ خطاب اور ایک مرصع دوات انعام میں پائی تھی۔ شعرو سخن سے بچپن ہی سے شوق تھا۔ چودہ برس کے سن میں استاد ذوق کے شاگرد ہو گئے۔ غدرِ شہ کے ہنگامہ میں ناچار دلی سے نکلنا پڑا۔ جھجر۔ سوئی پت۔ نجیب آباد ہوتے ہوئے بریلی آئے اور یہاں سے لکھنؤ کا ارادہ کیا۔ مگر وہاں کے اتر حالات سُن کے کچھ دنوں بریلی میں رہ کر رام پور چلے گئے وہاں چار برس رہے اُس کے بعد دلی آئے اور محکمہ جنگی میں ملازمت مل گئی اُس کے تھوڑے عرصے کے بعد اخبار جلوہ طور کے ایڈیٹر ہو گئے جو بلند شہر سے نکلتا تھا۔ ان کے مضافات میں کوہ مارا جہ

شیو دھان سنگھ والی اور نے پڑھا اور بہت پسند کیا۔ ان کو اور بلوا بھیجا جہاں یہ چار برس رہے۔ وہاں کی سازشوں سے دل برداشتہ ہو گئے۔ مجبور ہو کر پھر دلی آئے اور نواب مصطفیٰ خاں شیفہ کی سفارش سے جے پور کے محکمہ پولیس میں ان کو ایک معقول جگہ مل گئی۔ جے پور میں کم و بیش اُنیس سال رہے۔ والی ریاست کے مرنے پر ان کا تعلق ریاست سے منقطع ہو گیا۔ چند روز پریشانی میں بسر ہوئے تھے کہ نواب محمد علی خاں خلف نواب امیر خاں والی ٹونک نے بلا بھیجا اور جب تک نواب زندہ رہے یہ بہت عزت و آبرو سے اُن کے ساتھ رہے۔ نواب کے مرنے کے بعد اُن کے صاحبزادے نواب ابراہیم علی خاں نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس طریقہ سے تقریباً پندرہ نوے برس ٹونک میں رہے۔ آخر عمر میں حیدر آباد جانے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ ٹونک سے رخصت لیکر حیدر آباد گئے جہاں آٹھ مہینے کے قیام کے بعد باریابی ہوئی۔ مگر تنخواہ مقرر ہونے کی نوبت نہ آئی تھی کہ موت نے ساری امیدوں اور آرزوؤں کا خاتمہ کر دیا۔ بیکاری کے زمانہ میں جب پریشاں حال ہو گئے تھے تو ہمارا جہ سرشن پرشاد نے اُنکی بہت مدد کی تھی۔

ظہیر ایک پرگوشاعر تھے تصنیفات کا حال یہ ہے کہ ایک دیوان سٹی گلستان سخن“ اگرہ میں چھپ گیا ہے۔ دیوان دوم و سوم کا حق تصنیف قاضی عبدالکریم مالک مطبع کریم علی نے خرید لیا تھا اور یہ بھی چھپ گئے ہیں۔ چوتھا دیوان جس میں بقول حسرت موہانی تین سو غزلوں کے علاوہ بہت سے قصائد اور مسدس شامل ہیں، اُن کے نواسے کے پاس ہے۔

ظہیر اپنے زمانہ کے مشہور شاعر تھے۔ گوکہ ذوق کے شاگرد تھے مگر کلام میں موخن کا

رنگ زیادہ پایا جاتا ہے۔ جس کا اعتراف بعض غزلوں کے مقطعوں میں خود انھوں نے کیا ہے۔ ۵

طرز مومن سے نہ گاہ تھا جب تک کہ ظہیر سچ قویہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا
کیا نہ ہی طرز مومن اے ظہیر طاق ہیں لاریب اپنے فن میں ہم
آخری دور کے بڑے نامور شاعر تھے اور اپنے زمانہ میں زبان اور شاعری دونوں کے
استاد مانے جاتے تھے۔ ان کے مشہور شاگرد نجم الدین احمد ثاقب بدایونی ہیں جو پہلوان
سخن کے لقب سے مشہور ہیں۔

آؤر سید شجاع الدین عرف امرامز مخلص بدایونی ظہیر مذکورہ بالا کے چھوٹے بھائی
تھے اور یہ بھی ذوق کے شاگرد تھے۔ ذوق کے بعد اپنا کلام مرزا غالب کو دکھلاتے تھے
نہایت قابل اور ہونہار شاعر تھے۔ مگر انوس ہے کہ جے پور میں عین جوانی میں عمر
۳۸ سال انتقال کیا۔ ان کے تمام معاصرین ان کی بڑی عزت اور قدر کرتے تھے۔
اور یہ ان سب مشاعروں میں شریک رہ چکے ہیں جو غدر کے دس سال بعد دلی میں
ہوا کرتے تھے جن میں درغ، حالی، ظہیر، تجروح، سالک، ارشد، مشاق،
وغیرہ اپنی لاجواب غزلیں سناتے تھے۔ ان کے دو دیوان ضائع ہو گئے مگر محترمی
لالہ سری رام صاحب قابل مصنف نمنخانہ جاوید نے بڑی محنت اور مشقت سے
متفرق اور پریشان مسودوں سے ایک دیوان جمع کر کے چھپوایا ہے۔ انور کی بڑی
خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ذوق، غالب، اور مومن تینوں کا رنگ کچھ ملتا ہے۔
غالبؒ لکھنؤ ۱۲۵۵ھ تا ۱۲۵۹ھ
۱۲۵۹ھ لغنائہ ۱۲۵۹ھ اعیسوی

فلسفی شاعر مرزا اسد اللہ خان متخلص بآسد و غالب سلسلہ مطابقت ۱۷۹۶ء
 میں بمقام اگرہ پیدا ہوئے۔ لقب مرزا نوشہ تھا اور خطاب نجم الدولہ دبیر الملک
 نظام جنگ بادشاہ دہلی سے عطا ہوا تھا۔ مرزا کو جس طرح اپنی ذاتی قابلیت پر
 اسی طرح اپنی اصل و نسل اور عالی خاندان ہونے پر بھی بڑا فخر و ناز تھا۔ جیسا کہ
 اُن کے اکثر اردو و فارسی کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے لئے یہ چند شعر
 کافی ہیں۔

غالب رخاکِ پاکِ تو را نیم	لاجرم در نسب فرہمندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی	بسترگانِ قوم پیوندیم
ایکیم از جماعتِ اتراک	در تمامی زمانہ دہ چندیم
فیض حق را ہمینہ شاگردیم	عقل کل را ہمینہ فرزندیم
بتلاشے کہ ہست فیروزیم	بہ معاشے کہ نیست خورندیم
ہمہ برخویشتن ہست گرتیم	ہمہ بر روزگارے خندیم

اشعار مذکورہ بالا سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا خاندانی سلسلہ ایک ترکمانوں
 سے جو وسط ایشیا کے رہنے والے تھے ملتا ہے جو اپنے آپ کو سلاطین سلجوقیہ کی
 وساطت سے فریدوں کی نسل میں سمجھتے تھے۔ مرزا کے دادا سب سے پہلے ہندوستان
 آئے اور شاہ عالم کے دربار میں عزت پائی۔ مرزا کے والد مرزا عبدالسبگ خاں نے
 ایک متلون زندگی بسر کی۔ کچھ دنوں دربار اودھ میں رہے پھر حیدر آباد گئے جہاں
 نواب نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہے۔ کئی
 برس بعد گھر آئے۔ اور اودھ میں رجعت اور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں کسی سرکش

گڑھی کی لڑائی کے موقعہ پر ۱۲۱ھ میں مارے گئے۔ اس وقت مرزا کا سن پانچ برس کا تھا مرزا عبدالسببگ خاں کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی جو فوج کے کمیدان اور آگرہ کے مشہور رئیس تھے۔ والد کے انتقال کے بعد مرزا کی پرورش اور تعلیم و تربیت اُن کے چچا مرزا نصر السببگ خاں کے سپرد ہوئی جو انگریزی فوج میں رسالدار تھے اور حسن خدمات اور وفاداری کے صلہ میں سرکار انگریزی سے جاگیر مائی تھی۔ اُن کا انتقال بھی ۱۲۱ھ میں ہو گیا اُس وقت غالب کی عمر نو برس کی تھی اسکے بعد اُن کی خبر گیری انکی نانہال میں ہوتی رہی اور انکے چچا کی جاگیر کے عوض میں سرکار انگریزی سے پنشن بھی ملتی رہی۔ مرزا کا بچپن آگرہ میں گزرا جہاں وہ ایک کہنہ مشوق استاد شیخ معظم سے تعلیم پاتے رہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں شاعر نظیر اکبر آبادی سے بھی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں جب اُن کی عمر چودہ برس کی ہوئی تو ہرمز نام ایک پارسی سے جو زند و بازند کا عالم اور بڑا سیاح تھا، انکی ملاقات ہو گئی۔ ہرمز نے آخر میں مذہب اسلام قبول کر لیا تھا اور عبدالصمد نام رکھا تھا۔ یہ اُن کے ساتھ تقریباً دو برس رہا۔ اور چونکہ فارسی کی طرف اُن کو قدرتی مناسبت تھی لہذا اُس سے اُنھوں نے پوری طرح اکتساب کمال کیا۔ اس کے فیضانِ صحبت کا مرزا کو فخر تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اُنکی تعلیم و تربیت کے اثر سے مرزا میں وہ صحیح اور با محاورہ فارسی قدیم لکھنے کا مادہ بخوبی پیدا ہو گیا جو صرف ایک اہل زبان ہی کی مدد سے ہو سکتا ہے۔

غالب دہلی میں پہلی مرتبہ ۱۲۱ھ میں آئے جب اُن کے چچا کی شادی نواب فخر الدولہ کے خاندان میں ہوئی تھی۔ اور خود اُن کی شادی نواب آہی بخش خاں معروف کی بیٹی کے ساتھ جو نواب فخر الدولہ والی لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے ۱۲۵ھ میں ہوئی



نجم الدوله دهرالملك مرزا اسدالله خان غالب دهلوي



جبکہ اُن کا سن تیرہ برس کا تھا۔ دہلی کی فضا میں اسوقت شاعری گونج رہی تھی،
مشاعرے جگہ بہ جگہ ہوا کرتے تھے۔ شادی بھی ایک مشہور و معروف شاعر کی بیٹی
کے ساتھ ہوئی، ان سب اسباب سے نو عمر غالب کی نوخیز طبیعت پر شاعری کا گہرا اثر
پڑا۔ شروع میں وہ فارسی کہتے تھے اور اُس میں بہت کچھ کہا۔ مگر رفتہ رفتہ اُردو شاعری
کی روز افزوں ترقی اور ماحول کے اثر سے اُردو کی طرف توجہ کی۔ پہلے اسد تخلص کرتے
تھے جب کسی شخص کا یہ شعر سنا:

اسد م نے بنائی یہ غزل خوب ارے اوشیر رحمت ہے خدا کی
یہ سنتے ہی اس تخلص سے نفرت ہو گئی۔ کیونکہ اُن کا یہ بھی قاعدہ تھا کہ عوام الناس
کے ساتھ شریک حال ہونے کو بہت بُرا جانتے تھے چنانچہ ۱۲۷۳ھ میں اسد اللہ غالب
علی بن ابطالب کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا لیکن جن غزلوں میں اسد تخلص تھا
انہیں اُسی طرح رہنے دیا۔ مرزا سلیمان علی خان نے کلکتہ بھی گئے تھے بسلسلہ اپنی نیشن کے جو
ان کے چچا کو جاگیر ضبط ہو جانے کے عوض ملتی تھی اور آخر میں بند ہو گئی تھی مگر باوجود
مستعد و کوششوں کے اور ولایت میں اپیل دائر کرنے کے بھی مرزا اپنی اس کوشش
میں ناکام رہے۔ کلکتہ کے راستے میں مرزا نے لکھنؤ اور بنارس کی بھی سیر کی تھی اور
ایک قصیدہ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے واسطے اور ایک نثر وزیر سلطنت کی
مرج میں پیش کی تھی۔ آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کی سرکار سے بھی پانچ سو روپیہ
سال ان کے واسطے مقرر ہوئے تھے مگر دو برس کے بعد جب نزع سلطنت ہوا تو
وہ موقوف ہو گئے۔ ۱۲۶۳ھ میں غالب تین ماہ کے واسطے کوئٹہ شہر کی عداوت کی
وجہ سے قید ہو گئے تھے مگر قید میں ان کے مرتبہ کے موافق ان کا احترام کیا گیا۔

سلسلہ ۸۲۴ء میں غالب ایک فارسی پروفیسری کے لئے جو دلی کالج میں خالی ہوئی تھی امیدوار تھے مگر چونکہ ٹامسن صاحب سکرٹری گورنمنٹ نے بروقت ملاقات مرزا کا استقبال نہیں کیا۔ اس لئے انھوں نے اپنی کسر شان سمجھ کر ملازمت قبول نہ کی۔

سلسلہ ۸۲۵ء (مطابق ۱۲۴۵ء) میں خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ بادشاہ نے دربار میں عطا کیا۔ اور ایک تاریخ خاندان تیموریہ لکھنے کا حکم دیا اور پچاس روپیہ مہینہ اس کے صلہ میں مقرر کیا۔ ۱۲۴۵ء میں آدق کی وفات کے بعد مرزا استاد شہ مقرر ہوئے اور اصلاح کا کام اُن کے سپرد ہوا۔ غدر کے ایام میں بوجہ سلسلہ ملازمت اور تقرب شاہی کے مرزا بھی مصائب میں مبتلا ہو گئے تھے نیشن بند ہو گئی اور اُن کے چال چلن کے متعلق تحقیقات کی جانے لگی آخر میں جب پوری صفائی ہو گئی اور یہ بیگناہ ثابت ہوئے تو انکی نیشن بحال ہوئی اور عزت سابق واپس دی گئی۔ غالب نواب یوسف علیخان والی رام پور کے استاد بھی تھے جو اُن کو سور و پیہا ہوار بطور نیشن کے عمر بھر دیتے رہے۔ غالب کا انتقال ۱۲۵۵ء مطابق ۱۵ فروری ۱۲۵۵ء بمقام دہلی چارہاہ بمقام دہلی ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔

غالب نہایت خلیق اور ملنسار واقع ہوئے تھے۔ اور ایک بڑی جماعت احباب اور قدردانوں کی رکھتے تھے۔ دوستوں کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا جسکو وہ نہایت باقاعدہ طور پر وقت کی پابندی کے ساتھ انجام دیتے تھے دور دراز شاگردوں کے کلام کی اصلاح بھی مرسلت ہی کے ذریعہ سے ہوتی تھی اور وہ جواب دینے میں بہت مستعد تھے۔ اُن کی یہ عادت تھی کہ ہمک جاری رہی محبت و ہمدردی اُن کے خمیر میں بڑی تھی جیسا کہ اُن کے خطوط اور

عام حالات اور

طبعی عادات

اشعار سے مترشح ہوتا ہے۔ مذہبی تعصبات اور غلو سے کوسوں دور تھے۔ سچ پوچھو تو ان کا مذہب بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی اور محبت تھی جس میں کسی فرقہ اور جماعت کا مطلق خیال نہیں کرتے تھے۔ اُن کی مذہبی آزادی اور غیر متعصبی کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے دوستوں اور شاگردوں میں متعدد ہندو تھے جن میں سب سے زیادہ نامی و گرامی منشی ہرگوپال تفتہ تھے جو فارسی شعر کہنے میں بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ گو کہ مرزا کبھی آسودہ حال اور دنیاوی جاہ و ثروت کے اعتبار سے فارغ البال نہیں ہوئے مگر پھر بھی ہمدردانگی آمدنی تھی۔ وہ اپنی ضروریات کے ساتھ اپنے احباب اور ارباب احتیاج کے واسطے بلا تکلف وقف تھی سخاوت کے ساتھ وہ صاف گوئی اور صاف باطنی کے لئے بھی مشہور تھے۔ چنانچہ خود اپنے عیوب اور کمیوں کو بھی کبھی نہیں چھپاتے بلکہ علی الاعلان اُن کو ظاہر کر دیتے تھے مثلاً یہ سب جانتے ہیں کہ وہ شرب پیتے تھے مگر اس واقعہ کو اُنھوں نے کبھی نہیں چھپایا بلکہ اپنے اشعار میں اور نیز احباب کے خطوط میں کسی معقول توجہ کے ساتھ لکھتے تھے اور اس طرح گویا کہ وہ اپنی ملامت کا اظہار کر رہے ہیں۔ خلق و تواضع کے ساتھ اُن کو اپنی خود داری اور عزت اور اپنے مرتبہ کا بھی بہت بڑا خیال رہتا تھا۔ بڑے بڑے امرا سے وہ برابری سے ملتے اور اپنی علو شان کا ہر وقت خیال رکھتے تھے جیسا کہ اُس واقعہ سے پایا جاتا ہے جب اُنھوں نے دلی کالج کی پروفیسری کو نامنظور کیا۔ کبھی کبھی اُن کا یہ خیال حد اعتدال سے متجاوز بھی ہوتا تھا۔ مگر اپنے وسیع حلقہ احباب کے ساتھ وہ ہمیشہ رفیق و مدار اور نکسار و تواضع ہی سے پیش آتے تھے۔ اُن کے خانگی تعلقات خاص کر اپنی بیوی کے ساتھ شگفتہ نہ تھے مرزا کی شادی تیرہ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ اپنی بیوی سے زیادہ محبت نہیں

رکھتے تھے مگر پھر بھی کوئی ظاہری بخشش نہ تھی اور نہ میل ملاپ میں کوئی فرق تھا۔ مرزا کی کئی اولادیں ہوئی تھیں مگر وہ سب بچپن میں مرگئیں۔ مرزا کے چھوٹے بھائی جو فائر لنچل تھے اور انھیں کے ساتھ رہتے تھے غدر کے زمانہ میں مرے۔ مرزا اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف سے بہت محبت کرتے تھے۔ یہ بہت ہونہار شاعر تھے۔ اور مرزا کے سامنے ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے دو بچوں سے مرزا صاحب کو مکمل محبت تھی۔ آخر عمر میں مختلف امراض و آلام نے مرزا صاحب کو بہت پریشان کر دیا تھا پھر اس زمانہ میں انکی مالی حالت بھی درست نہ تھی۔ ایسی صورت میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اپنے افکار و مصائب کو شراب نوشی سے ہلکا کر دیتے تھے۔

مے سے غرض نشاط ہو کس وسیاہ کو اک گونہ بخود ہی مجھے دن رات چاہیے
میر کی طرح غالب بھی مصائب و آلام کا مزہ چکھے ہوئے تھے اسی وجہ سے ان کے کلام میں بھی مثل میر کے ایک خاص درد و اثر ہے۔ مرزا صاحب کے کلام میں تفاخر و سجا نہیں ہے بلکہ اُس سے حسن شعر میں اضافہ ہوتا ہے اور کلام کی قیمت بڑھ جاتی ہے اس لیے کہ وہ نہایت مدلل اور لطیف پیرایہ میں ادا کیا جاتا ہے جیسے فرماتے ہیں۔
ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب میرے دعوے پر یہ حجت ہو کہ مشہور ہیں
سب سے زیادہ قیمتی اور نمایاں جو ہر مرزا صاحب کے کلام میں انکی نہایت لطیف ظرافت اور نگفتمرا جی ہے۔ جسکی بدولت بڑی سے بڑی تکلیفوں کو بھی سنس کھیل کر کاٹ دیتے تھے۔ اسی خیال کو نہایت فلسفیانہ طریقہ پر ظاہر کرتے ہیں۔

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

تاریک سے تاریک موقعوں پر بھی انکی ظرافت اور لطافت کی بجلی چمک جاتی ہے جس سے مصائب کی تیرگی کا فور ہو جاتی ہے۔ اُن کی ظرافت میں کسی قسم کی تیزی اور بزمزگی نہیں ہوتی بلکہ اُس میں مناسبت اور جدت اسلوب کے ساتھ ہمدردی کی جھلک نظر آتی ہے کہیں کہیں اُن کے کلام میں بیزاری کا پرتو ہے مگر یہ کیفیت تنفر سے پیدا نہیں ہوتی۔ اُن کی ظرافت و مذاق سے کوئی نہیں چھوٹا۔ حتیٰ کہ اپنی بیوی کی نسبت بھی ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ایک اوپر سپا پس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے۔ تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اگر مرزا صاحب کے اس قسم کے لطائف و ظرائف بالاستیعاب دیکھنا ہوں تو مولانا حالی کی یادگار غالب دیکھنا چاہیے جس میں ایسی باتیں بکثرت مذکور ہیں۔

غالب بحیثیت شاعر کے مرزا کا پایہ شاعری میں بہت بلند ہے اور اُس کو سب تسلیم کیا ہے۔ وہ نہایت وسیع نظر اور کثیر معلومات تھے اور اُن کے معاصرین بھی اس بارہ میں اُنکی بڑی قدر کرتے تھے۔ اُن کو فارسی سے اس قدر شغف تھا کہ وہ ہمیشہ یہ خواہش ظاہر کرتے کہ میری قابلیت کا اندازہ میرے فارسی کلام سے کیا جائے۔ اور اس بات پر نہایت افسوس کرتے کہ لوگ سقہ فارسی سے بیگانہ ہوتے جاتے ہیں کہ اُن کے کلام کا قد و دان اور سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔

بیاورید گراںجا بود زباندانے غریب شہر سخناے گفتنی دارد
یہ عجیب بات اور نیرنگی قسمت ہے کہ اُن کی شہرت کا باعث اُنکی فارسی شاعری نہیں بلکہ اُردو شاعری ہوئی جسکی خود وہ کوئی قدر نہیں کرتے تھے ۵
فارسی میں تابدانی کا اندرا قلم خیال مانی دار زنگم و آنسخہ زنگ من است

اُردو وہ کبھی کبھی تبدیل ذائقہ کے لیے اور اپنے احباب کے اصرار سے کہہ لیا کرتے تھے۔ مختلف کتابیں انکی نظر سے گزری تھیں اور نہایت تعمق کی نظر سے اُن کو پڑھا تھا۔ قوت حافظہ کا یہ حال تھا اور اُس پر اتنا اعتبار تھا کہ کتابیں عاریت لیکر پڑھتے اور خود کبھی نہ مَول لیتے تھے۔ فی البدیہہ اشعار کہنے کی بھی عادت تھی جیسا کہ اُس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے جبکہ کلکتہ میں ایک دوست مولوی کرم حسین کی فرمایش سے چکنی ڈلی کی تعریف میں فوراً چند اشعار کہ دیے تھے۔ عربی میں گواغلوں نے درس نظامیہ کی تکمیل نہیں کی تھی مگر مہارت کافی حاصل تھی۔ فی عرض کے استاد کامل تھے اور اس کے علاوہ نجوم میں بھی کچھ دخل تھا۔ تصوف سے کما حقہ واقف تھے اور اُس کے مسائل اپنے اشعار میں نہایت خوبی کے ساتھ نظم کئے ہیں۔ تاریخ، ریاضی اور ہندسہ سے اُن کو مطلق دلچسپی نہ تھی۔ گو کہ تعجب یہ ہے کہ دو تین کتابیں تاریخ کی خود تصنیف کر گئے ہیں۔ اسی طرح مرثیہ اور تاریخ کوئی سے بھی اُن کو کوئی لگاؤ نہ تھا۔ البتہ فارسی میں بہت سے

۱۔ یہ کنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ مرزا کو تاریخ کوئی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ یوں تو اُن کے اردو دیوان میں بھی دو سائیکس موجود ہیں گرنہ فارسی میں تو متعدد عمدہ تاریخیں اُن کے قطعات میں شامل ہیں مثال کے طور پر ہم دو تاریخیں مانے لگتے ہیں جو بالکل ایک نئے دھنگ سے نکالے گئے ہیں۔ تاریخ وفات مرزا مسیتا بیگ

زماں واقف میرزا مسیتا بیگ	کات رہست شمار المہ امجاد
صحیفہ سادہ بیستین از عشرت	حدیقہ ہائے ہشتی شخص از آحاد
بحریت دہ و دوا دی و چار کتاب	کہ دشمنیہ از ہشت خلد جایش باد

اس بارے میں سیکڑے چارہائیاں اور آٹھ اکائیاں یعنی ۱۲۵۵ھ نکلتے ہیں۔ بیطرح ایک سری تاریخ میں فرماتے ہیں۔

جُست از سال جلالتش اثرے	گفت غالب کہ خود زروے شمار
از بروج سپہرچے مات	عشرات از کو اکب سِیّار
گفتم آحاد گفت شرمست باد	از خداوند واحد القہار

اس میں بارہ سیکڑے سات دہائیاں اور ایک اکائی یعنی کل ۱۲۷۱ نکلتے ہیں۔ ۱۲۔

نوعے موجود ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک بہت بڑے فلسفی شاعر تھے اور اُن کی ذہانت کے مختلف پہلو تھے۔ جسکی وجہ سے ایک شاعر کا تجربہ ایک مصور کی جابکدستی کے ساتھ مل گیا تھا۔

تصانیف حسب ذیل تصانیف اُنکی یادگار ہیں۔

- (۱)۔ عود ہندی (۲) اُردوئے معلیٰ (۳) کلیات نظم فارسی -
 (۴) کلیات نثر فارسی - (۵) دیوان اُردو (۶) لطائف غیبی
 (۷)۔ تیغ تیز (۸) قاطع برہان (۹) پنج آہنگ
 (۱۰) نامہ غالب (۱۱) مہر نیمروز (۱۲) دستنبو۔

(۱۳) سبچین - ”عود ہندی“ اور ”اُردوئے معلیٰ“ اُردو خطوط کا مجموعہ ہیں جو اُنھوں نے اپنے احباب کو لکھے تھے۔ اور اول مرتبہ بصورت کتاب ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئے تھے۔ عود ہندی میں علاوہ خطوط کے چند دیباچے اور تقریظیں بھی شامل ہیں ”لطائف غیبی“ مباحثہ میں ہے اور سیف الحق کے فرضی نام سے لکھی ہے ”تیغ تیز“ اور ”نامہ غالب“ بھی اُسی مناظرہ سے تعلق رکھتی ہیں جو قاطع برہان کی وجہ سے ہوا تھا۔

”پنج آہنگ“ میں فارسی انشا پردازی کے مختلف نمونے ہیں کلیات نظم غالب اُن کے فارسی قصائد اور غزلیات، قطعات، مثنویات، رباعیات وغیرہ کا بیش بہا مجموعہ ہے۔ ”مہر نیمروز“ تاریخ ہے۔ مرزا نے اسکو حکیم احسن اللہ خاں طبیب خاص بادشاہ کے ایما سے لکھا تھا۔ اسکی پہلی جلد میں امیر تمپور سے ہمایوں تک کا حال قلمبند کیا اور مہر نیمروز نام رکھا۔ ارادہ تھا کہ اکبر سے لیکر بہادر شاہ تک کا بھی حال دوسری جلد

میں لکھیں اور ماہ نیم ماہ نام لکھیں کہ اس اثنا میں غدر ہو گیا اور وہ کتاب رہ گئی۔
 ”دوست بنو“ میں گیارہ مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۷ء تک حال بغاوت تباہی شہر
 اور اسکے ساتھ اپنے حالات بھی بیان کیے ہیں۔ ”سب صہین“ میں چند قصائد اور قطعات
 فارسی میں اور کچھ خطوط ہیں۔

مرزا صاحب سے مباحثے پہلا مباحثہ اس طرح ہوا کہ جب مرزا کلکتہ میں تھے تو بعض
 لوگوں نے اُن کے کلام پر کچھ اعتراض کیے اور سند میں قتل کے اقوال پیش کیے۔
 مرزا صاحب جن کا قول تھا ۵

آنکہ ملے کردہ این مواقف را چہ شناسد قاتل و واقف را
 وہ بھلا قاتل کو کب ماننے والے تھے۔ انھوں نے اپنے کلام کی تائید میں اساتذہ
 اہل زبان پیش کیے اور کہا ۵

فہرست نوٹ (حاشیہ) متعلق صفحہ (۳۸۳)

نام مدوح	تعداد قصائد	نام مدوح	تعداد قصائد
کوئین وکٹوریا	۳	مسٹر اسٹرننگ	۱
لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل	۱	ولیم فریزر	۱
لارڈ الن برا ایضاً	۲	مسٹر کالون	۱
سر چارلس ٹکاف ایضاً	۱	لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل	۱
جیمس ٹامسن	۱	مسٹر ایڈمنسٹن	۱
مسٹر پرنسپ	۱	لارڈ کیننگ گورنر جنرل	۱
ٹامس میڈرک	۱	مسٹر فنگمری لٹنٹ گورنر	۱

ان کے علاوہ تین چار قطعات بھی انگریزوں کی شان میں ہیں ۱۲

داسن از کف کمر چگونہ رہا طالب و عرفی و نظیری را
 خاصہ روح دروان معنی را آں ظہوری جہان معنی را
 محاصمین جو قتل کے شاکر دتھے اس پر اور پر افروختہ ہو گئے اور مرزا صاحب کے کلام پر
 اور اعتراض وارد کئے۔ یہ سب واقعات ان کی مثنوی ”باد مخالف“ میں مذکور ہیں۔
 دوسرا مباحثہ اس جہ سے ہوا کہ مرزا نے فارسی کی مشہور لغت ”برہان قاطع“ پر اعتراض
 کیے اور ان کو کتابی صورت میں شائع کیا اور ”قاطع برہان“ نام رکھا۔ اُس کے ایک
 سال بعد اس کتاب کو ترمیم کر کے اُس کا نام ”دش کاویانی“ رکھا۔ اس کتاب سے
 مرزا کی انتہائی قابلیت اور سحر کا پتہ چلتا ہے اس کے اکثر جواب لکھے گئے بلکہ تہ سے
 ایک شخص مرزا احمد بیگ نے ”مؤید البرہان“ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ غالب نے
 اس کا جواب ”یتغ تیز سے دیا۔ اور ایک دوسری کتاب ”ساطع برہان“ کا جواب
 ”نامہ غالب“ سے دیا گیا۔

مرزا کے فارسی کلام پر اس کتاب میں کوئی رے دینا بیوقوف ہے مگر
 اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ وہ نظم و نثر فارسی دونوں کے استاد کامل تھے اور اُن کا
 مقابلہ ہندوستان اور ایران کے بڑے بڑے شعرا خسرو، نظیری، فیضی، بیدل و
 حزمی وغیرہ سے بے تکلف کیا جاسکتا ہے۔

غالب کی شاعری تین مراتب یا ادوار پر تقسیم کی جاسکتی ہے جس سے
 انکی شاعری کی ترقی اور نیز ہر دور کی خصوصیات کا پتہ بخوبی
 چل سکتا ہے۔ یہ بات ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے کہ غالب اپنی قابلیت اور کلام کو اپنے
 اُردو دیوان کی معیار سے کبھی نہیں چانچنا چاہتے تھے۔ اُن کا قول تھا

غالب کی شاعری
 کے تین دور

فارسی میں تابین نقشبائے رنگ رنگ بگوزار از مجموعہ اردو کہ سیرنگ من است
 اور وہ ہمیشہ اپنے فارسی کلام ہی کو اپنا مایہ ناز سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنا مقابلہ
 کبھی کسی اردو شاعر سے نہیں کیا۔ البتہ اہل زبان کے کلام سے اپنے کلام کو تولنے پر
 ہمیشہ مستعد تھے۔ مگر با انیمہ انکی ذہانت و طباعی اور ان کی فطری شاعری کا پورا اثر
 ان کے اردو کلام میں بھی نہیطرح جلوہ گر ہے جس طرح ان کے فارسی کلام میں ہے مرزا کا
 اردو دیوان تقریباً اٹھارہ سو ابیات سے زیادہ نہوگا مگر اس کو زبان اردو کا بہترین نمونہ
 اور اردو شاعری کا نہایت گر افندہ سرمایہ سمجھنا چاہیے۔ مرزا کی شاعری کا پہلا دور
 اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سے کہ انھوں نے شعر کہنا شروع کیا۔ تا عمر
 پچیس سال جبکہ انھوں نے اپنے اردو دیوان کو چھانٹا اور انھیں سے فارسی کی غزلوں
 ترکیبیں اور بندشیں نکال ڈالیں۔ اب وہ قدیم کلام جو مروجہ دیوان سے خارج کیا گیا
 تھا ایک عرصہ دراز کے بعد بڑی کوشش اور کاوش سے ہم پہونچا کر چھپا گیا ہے۔
 اور اس کے مطالعہ سے بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے
 کہ ابتدائی افکار مرزا کی کس قسم کی ہوتی تھیں۔ نیز یہ کہ کن کن ترکیبوں اور بندشوں کو
 انھوں نے ترک کیا جو ابتدائیں ان کو پسند تھیں۔ اس نئے دریافت شدہ کلام کی
 ناز کنجیاں اور نئی نئی ترکیبیں قرون وسطی کے ان یورپی شعرا سے ملتی جلتی ہیں
 جن کو انگریزی اصطلاح میں ”سکولن“ کہتے ہیں۔ اس دور کی شاعری میں فارسی
 ترکیبوں اور ناز کنجیاں کی بہت کثرت ہے علی الخصوص مرزا عبدالقادر سید کی کا بہت
 تنوع معلوم ہوتا ہے چنانچہ خود کہتے ہیں ۵

مطرب دل نے مرے تارِ نفس سے غالب ساز پر رشتہ پئے نغمہ بیدل باندھا

مجھے راہ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالب عصاے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا
 ”طرز ناز کنجیالی کے متبعین کی خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حقائق شعری کو
 سیدھے سیدھے الفاظ میں کہنے کے بجائے وہ مضمون کو تخیل کی سچیدہ گھاٹیوں سے
 گزارتے ہیں اور اسی اشکال میں وہ اپنی خصوصیت اور ناموری سمجھتے ہیں بعض اوقات
 اُن کی یہ بلند پروازیاں اور ناز کنجیا لیاں اس قدر بلند ہو جاتی ہیں کہ نظروں کے اوجھل ہو کر
 شعر کا مطلب اور اثر بالکل جاتا رہتا ہے۔ ایسے ہی اشعار ”کوہ کندن کاہ بر آوردن“
 کی مثل پوری طرح صادق آتی ہے۔ یہ قدرتی بات تھی کہ مرزا کو یہ رنگ بہت پسند آیا
 اس وجہ سے کہ اُن کے مزاج کی اقتاد یہ واقع ہوئی تھی کہ وہ ہر چیز میں اپنے آپ کو
 عام لوگوں سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے شاعری میں بھی اُنھوں نے
 یہ رنگ اپنے واسطے منتخب کیا۔ اس وجہ سے کہ اس میں فارسیت کا غلبہ تھا۔ اور
 فارسی کا ذوق اُن کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہ طرزان کے اعلیٰ خیالات
 کے اظہار کا ایک بڑا آلہ کار تھا۔ مرزا بیدل کے وہ صرف متبع ہی نہیں بلکہ خلوص کے
 ساتھ اُن کے معرف بھی ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا شعروں سے معلوم ہوا۔ یہ رنگ
 اگرچہ کچھ اچھا نہ تھا۔ مگر تھوڑی مدت تک مرزا کی طبیعت پر غالب رہا۔ بعد کو وہ خود
 سنبھل گئے اور اپنے واسطے ایک نیا راستہ نکالا جس میں نہ صرف بیدل کی پیروی
 ترک کی بلکہ اُس طرز کا کلام بھی اپنے دیوان سے خارج کر دیا۔ اُن کے ابتدائی
 کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔ عجیب و غریب تشبیہیں ایسی بلند پروازیاں
 جن سے شعر کے معنی مبہم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فارسی کی ایسی بندشیں اور ایسے
 غیر مانوس الفاظ جو شعر کی روانی اور فصاحت کلام کے منافی ہیں۔ ابتدائی کلام میں

وہ بچتہ کاری۔ وہ اثر اور وہ عمیق جذبات جو اُن کے بعد کے کلام میں ہیں نہیں پائے جاتے۔ ان کے ایسے اشعار محض فارسی الفاظ کی لڑیاں معلوم ہوتے ہیں جن میں اردو کی آمیزش محض سوجہ سے ہے کہ شعراُ دو کہا جاسکے اور ادنیٰ تغیر سے وہ فارسی ہو جاتا ہے۔ گو اُن کے ابتدائی کلام کا مضحکہ بھی اُڑایا جاتا تھا جیسے کہ حکیم آغا جان عیش نے جل کر کہا کہ قطعہ

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے مزا کہنے کا جب ہوا کہ اور دوسرے سمجھے
کلام میر سمجھے اور زمان میر زاب سمجھے مگر ان کا کہنا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے بھی اُن کے اعلیٰ درجہ کی دماغی قوت اور آئندہ کے ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔ اُنکی اس دور کی شاعری بھی نہایت ممتاز اور مخصوص ہے اور اُن کی اُفتاد طبع سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آئندہ وہ کتنی ترقی کرنے والے ہیں۔ ان کی ابتدائی فکر میں بھی ایسی ایسی ناز کنیا لیاں نئی نئی نکلیں اور پُر لطفت تشبہیں ملتی ہیں کہ اردو شعرا میں اور کسی کے یہاں نظر نہیں آتیں اپنے مخالفین کے اعتراضات اور مضحکہ انگیز نقالی اور اپنے مخلص احباب مثلاً مولانا فضل حق خیر آبادی اور مفتی صد الدین خاں آزادہ وغیرہ کی دوستانہ صلاح اور خود اپنی انصاف پسند طبیعت کے تقاضا سے مزانے آخر کار یہ رنگ ترک کر کے ایک دوسری روش اختیار کی۔

دوسرے دور میں فارسییت کا وہ غلبہ اور ناز کنیا لیوں کا وہ انداز نہیں جو پہلے مزا کو مرغوب تھا۔ اس میں زبان صاف ہو گئی ہے۔ الفاظ پر پوری قدرت ہے اور فارسی بندشوں اور محاورات میں ایک معتد بہ کمی ہے مگر فارسی کے اعلیٰ خیالات ویسے ہی ہیں جو مذاق سلیم پر گراں نہیں گزرتے بلکہ سامع کے دل و دماغ میں ایک

پر لطف ہیجان پیدا کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار تھوڑی سی کاوش کے بعد جب سمجھ میں آجاتے ہیں تو مسرت کاوش غضب کی ہوتی ہے۔

مرزا کی شاعری کا تیسرا دور اُن کے کمال فن کا لب لباب اور ارتقاے کمال کی آخری منزل ہے۔ اس دور کے بعض اشعار جامعیت اور اختصار میں فی الحقیقت اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اس عہد کی غزلوں میں ندرت خیال کے ساتھ لطافت زبان اور سنگی کلام عجیب لطف دیتی ہے۔ اُن میں اسجاز کے ساتھ سادگی سلاست و روانی نازِ خیالی اور جدتِ تخیل سب کچھ بدرجہ آسن موجود ہے۔ اور انھیں سے غالب کو شعرِ اردو کی صفت اولین میں نہایت ممتاز جگہ ملی ہے۔

ہماری رائے میں مرزا کے قصہ شاعری کی مستحکم بنیاد۔ اُن کی جدت طرازی پر قائم ہے۔ جس میں جدتِ تخیل، جدت طرازی اور

غالب کے خصوصیات

پہلی خصوصیت جدتِ تخیل

جدتِ تشبیہات، جدتِ استعارات، جدتِ محاکات، جدتِ الفاظ، غرض ہر قسم کی تجزیہ شامل ہیں۔ پامال مضامین مرزا صاحب کی خاص طرزِ ادا سے بالکل نئے معلوم ہونے لگتے ہیں اور معمولی سے معمولی واقعات اک ایسے اسلوب سے بیان کر جاتے ہیں کہ گویا اس سے پہلے کبھی نہیں سنے گئے تھے۔ نئے خیالات کے ادا

کرنے کا طریقہ بھی نیا ہوتا ہے۔ اس جدتِ اسلوب سے معمولی سے معمولی خیال اور پامال سے پامال مضمون بہت مرتفع ہو جاتا ہے۔ اس جدت طرازی اور اُرخیلہ کی وجہ سے شعر میں کبھی کبھی ہما کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے جس کا حل ایک خاص لطف پیدا کرتا ہے۔ غالب اور اکثر شعرِ اردو اور نیز بعض شعرِ فارسی میں بڑا فرق یہ ہے کہ غالب کے یہاں الفاظ خیالات کے تابع ہوتے ہیں اور اور لوگوں کے یہاں

مُعاملہ برعکس ہے جس سے اُن کے اشعار میں تصنع اور بزمِ گنگی پیدا ہو جاتی ہے اور اسی قسم کے کلام سے اُن کے دیوان بھرے پڑے ہیں مرزا صاحب کے یہاں بخلاف ان کے ہنگام بندی اور قافیہ پیمائی نہیں بلکہ خیال آفرینی ہے۔

تقابلہ بود شیوہ من قافیہ بندی ظلمے ست کہ بر کلک و ورق میکنم مشب

دوسری خصوصیت نظریہ طرزِ تحریر اسی سے متعلق اور ملتی جلتی اُن کے کلام میں نظر فرمائی اور بات سے بات پیدا ہوتا ہے۔ وہ ایک سرچھپرتے ہیں اور سامع کا

ذہن پورا رگ منضبط کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مہجول الکلیف سامع مرزا غالب کے شاعرانہ ترانوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے مرزا کسی چیز کا تفصیلی ذکر نہیں کرتے۔ بلکہ پڑھنے والے کا خیال خود اُس کے لوازم جمع کر لیتا ہے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے مرزا صاحب کی شاعری کا خاص طغرائے امتیاز جادہ عام سے علیحدگی ہے جس کا شوق بلکہ عشق اُن کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ وہ کسی چیز میں اپنی شرکت عام لوگوں کے ساتھ پسند نہیں کرتے تھے۔ تخلص بدلنے کا واقعہ جبکا ذکر اوپر ہوا اسکا بین ثبوت ہے۔ اسی طرح وہ اپنے لباس، وضع قطع، بات چیت، طرزِ تحریر، غرض کہ ہر چیز میں اسی علیحدگی کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ اُن کے خطوط، اُن کے اشعار، ہر چیز سے مترشح ہے کہ وہ عام باتوں سے سخت متنفر تھے۔

کیا آبروے عشق جہاں عام ہو جفا ڈرتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھکر
ان کی ابتدائی مشکل پسندی اسی علیحدگی پسندی پر مبنی معلوم ہوتی ہے، ایسی وجہ سے ان کی شاعری سے عام دماغ لطف نہیں اٹھا سکتے۔ ان کے الفاظ میں خیالات کا اتقد زور ہر کہ معلوم ہوتا ہے کہ خیالات قید الفاظ کو توڑ ڈالیں گے آگینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے :

تیسری خصوصیت مرزا میں بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے اشعار اُن کے خیالات ذاتی جذبات کا ادا کرنا کا صحیح فوٹو ہوتے ہیں۔ وہ زندگی اور مختلف کیفیات زندگی کے ترانے گاتے ہیں۔ وہ اپنے اشعار کے ذریعہ سے اپنے دلی کیفیات اپنے کلام کے پڑھنے والے کے سامنے پیش کرتے ہیں جن میں کہیں غم و الم کے نالے کہیں اُن کی باعظمت کامرغ کہیں اُنکی حراں نصیبی کہیں ہجوم ناامیدی کہیں جانکا ہوا صائب کہیں سعی بیجا صل کہیں دُنیا سے تنفر اور بیزاری کہیں رحم خداوندی پر پورا پورا اعتماد کہیں تعلقات دنیاوی سے دل بستگی اور اُنکی خوشی اور اُس کے آلام کا بیان ہوتا ہے غرض کہ اُن کے لطیف اشعار اُن کی کیفیات قلبیہ کا جو وقتاً فوقتاً اور کائناتاً وار د ہوتی رہتی ہیں صحیح پیرامٹر ہیں۔

چوتھی خصوصیت مرزا ایک بہت بڑے فلسفی ہیں اور اُنکے اکثر اشعار حقائق فلسفہ کو فلسفیت حقیقت طرازی نہایت آسانی اور سادگی سے ظاہر کرتے ہیں وہ محض حقائق تصوف سے

پوری طرح واقف و فریقہ بندی اور مذہبی تعصبات سے بالکل مبرا تھے۔ فرماتے ہیں ۛ ہم موجود ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجڑے یاں ہو گئیں اور اُن کے خیال نہ بانی نہ تھے بلکہ وہ اپنی پوری طرح عامل تھے۔ اُنکی زندگی مذہبی رواداری، آزاد روی کی ایک دلخشاں مثال تھی اس طرح انکا تخیل عبادت بھی بہت بلند ہی کہتے ہیں ۛ ہے پرے سرحدِ دراک سے اپنا سجود قبلہ کو اہل نظر قبلہ منسا کہتے ہیں جنت کے اس خیال سے کہ اُس میں نہریں جاری ہوں گی اور وہی سب لطف حاصل ہونگے جو دُنیا میں ہوتے ہیں ۛ متفق نہیں بلکہ اسکو اخلاق اعلیٰ سے گرا ہوا سمجھتے ہیں کہتے ہیں ۛ ہمارا معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش رکھنے کو غالب خیال اچھا ہے

طاعت میں تاہم نہ ہو گیس کی لاگ دوزخ میں ڈال دے کوئی لیکر بہشت کو
 ان کے نزدیک مصیبت عظمیٰ خود زندگی ہے جس سے احساس وجود پیدا ہوتا ہے
 اس وجہ سے کہ وہ اپنے مبداء سے جدا ہو جاتی ہے۔ لغمہ زندگی کو ایک نالہ نے
 سمجھنا چاہیے جو نستان سے جدا ہونے پر نے بے اختیار نہ کرتی رہتی ہو۔ اسی مضمون کو
 مرزا صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈر لیا مجھ کو ہونے نے نہ تو میں تو کیا ہوتا
 بحیثیت ایک صوفی صافی کے وہ دنیا کے شادی و غم سے بالکل متاثر نہیں ہوتے
 بلکہ ایک مرتفع مقام سے ترانہ سنجی کرتے ہیں۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا
 کس قدر خوبصورتی سے وہ اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ عالم ظاہر مظهر روح حیات
 ہے مگر خود روح حیات نہیں ہے۔ بقول برگسن کے یہی روح حیات اجسام میں
 جلوہ گر ہے مگر وہ خود اس عالم سے منزہ ہے۔ غالب کہتے ہیں۔

ہے غیب غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

تھابتی فلسفہ کے علاوہ مرزا صاحب کی شاعری جذبات سے بھی مخلو ہے ان کے
 یہاں جانکاہ مصائب دلدل از تکلیفیں ناقابل برداشت مصیبتیں جو لازمہ
 زندگی ہیں نہایت مؤثر الفاظ میں بیان کی گئی ہیں گویا زندگی ایک ایسا جنازہ ہے جسکے ساتھ
 دور سے قصا کے قہقہوں کی آوازیں آرہی ہیں چنانچہ اسی زندگی اور غم کے لازم و ملزوم ہونے
 کے متعلق مرزا کہتے ہیں۔

قیر حیات بند غم صل میں دنوں ایک ہیں موت پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یا چوں شخصیت

جذبات نگاری

غم اگر چہ جاں گسل ہو پیکر کیا کہ دل ہے غم عشق اگر نہ تو غم روزگار ہوتا
 غم ہستی کا آس کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہو سحر ہونے تک
 مرزا کے کلام میں سچوں کی سی ضد اور اپنے معاصر انگریزی شاعر شلی کی طرح تنک مزاجی پائی جاتی
 ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکتے کہ ان کو انکے حال پر کیوں نہ چھوڑا جائے۔ اور ان کے معاملات
 میں کیوں دست اندازی اور مزاحمت کی جائے۔ چنانچہ کہتے ہیں ۷
 دل ہی تو ہے نہ سنگ و نہشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
 بچہ کی بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس کو تکلیف کیوں ہو۔ اسی طرح اس شعر میں
 نفس میں مجھ سے رُوداد چہن کہتے نہ ڈر ہمد
 گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیانہ کیوں ہو
 مرزا کے اشعار میں خود انھیں کے کلام و مصائب کے نقشہ نظر آتے ہیں۔ انکے شعرا کو ٹپھک
 رنج و غم کی نصبت اور مصیبت کی عظمت معلوم ہوتی ہو اور گناہ کی ظلمت دور ہو کر سب میں ایک
 نورانیت معلوم ہونے لگتی ہے۔ مندرجہ ذیل شعر میں انتہا درجہ کا نکسار اور عاجزی اور دلی
 پشمانی اور اپنی بے حقیقتی کا اظہار کس پُر اثر اور درد انگیز طریقہ سے کیا ہے۔

قدیر سنگ سیرہ رکھتا ہوں سخت ازراں ہے گرانی میری
 کلام میں ظرافت و شوخی مرزا کی شاعری میں جو ایسی اور درد کی تائید کی ہے اس کو ان کی
 طبعی ظرافت اور شوخی اکثر دُر کر دیتی ہے۔ اکثر اشعار میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حُزن
 و یاس کے ابر میں ظرافت کی دھوپ بھکی ہوئی ہے۔ ان کی ظرافت کی لطافت اور
 شوخی کلام کی نزاکت کو ہم بے تکلف ایک نازک پھول کے ساتھ تشبیہ دے سکتے ہیں۔

مگر ان کی ظرافت کبھی حد اعتدال سے بڑھ کر پھکڑ نہیں ہو جاتی۔ اور متین سے متین آدمی اُس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

اُن کے اکثر اشعار نفس شاعری کی جان اور فصاحت و بلاغت کے روح و ادا ہیں۔ سادہ الفاظ کی سطح کے نیچے عمیق معنی سطح پنہاں ہیں جیسے دریا کے شفاف پانی کے نیچے دریا کی تہ۔ اُنکی ہر تصویر الفاظ کے پیچھے اُن کے ہر نقش خیال کی پشت پر ایسے ایسے تخنیل کے وسیع مناظر نظر آتے رہتے ہیں جنکی محیط فضا حیات و ممات کے سر بستہ رازوں سے معمور ہے۔

غالب ایک کامل مصوّر ہیں اور اُن کو خیالی تصویروں کے کھینچنے کا عجیب و غریب

ملکہ حاصل ہے یہ
 نیند لگی ہو داغ اسکا ہر راتیں ٹھکی ہیں تیری زلفیں جسکے بازو پر پریشاں گئیں
 مَن گئیں کھولتے ہی کھولتے نکھیں غالب یار لائے مرے بالیں پُرسے پر کس وقت
 مَن گئیں کھولتے ہی کھولتے نکھیں ہر جزوِ وقت آئے تم اس عاشق بیار کے پاس
 مرزا کو عجب قوت ایجاز حاصل تھی۔ اُن کے بعض اشعار ایجاز و اختصار اور ریاضی بات پیدا کرنے کے بمثل نمونے ہیں۔ مثلاً

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد مجھ سے مرے گنہ کا حساب بخدا نہ مانگ
 شعر نہایت پرتاثر ہے۔ ظاہر میں تو ارتکاب شدہ گناہوں کے حساب سے بچنا چاہتا ہے مگر در پردہ کہتا ہے کہ بہت سے گناہ ایسے بھی ہیں جن کے نہ کرنے سے دل میں حسرتوں کے داغ پڑ گئے۔ یہ ایک نڈر اور صاف گو گنہ گار کی تصویر ہے جو خدا سے بیدھڑک کہتا ہے کہ کردہ گناہ میرے کم ہیں مگر ناکردہ گناہوں کی حسرت زیادہ ہے۔

اور اسی کی میں تجھ سے داد چاہتا ہوں۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

غالب کا مقابلہ اپنے معاصرین شعرا سے علو خیال، فلسفہ حیات، اور ذہانت و طباعی میں غالب اپنے معاصرین ذوق و مومن سے بڑھ کر ہیں۔ مگر دوزمرہ اور سادگی

بیان اور محاورہ بندی کے اعتبار سے ذوق اُن سے بڑھے ہوئے ہیں گو کہ مومن اس میں بھی اُن سے کم ہیں۔ یورپ کے شاعروں میں جو ان کے ہم عصر یا قریب العہد تھے اُن کے کلام کا توازن شعر کے ذیل کے کلام سے کیا جاسکتا ہے۔

(۱)۔ رابرٹ براوننگ سے جو انگلستان کا اسی عہد کا ایک فلسفی شاعر تھا۔ پروفیسر سنیشیری براوننگ کی نسبت لکھتے ہیں کہ اُس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ روح کا تجزیہ کرتا ہے۔ مرزا غالب تجزیہ اس قدر نہیں کرتے جتنا کہ رموز روحانی کے عمق کو دریافت کرتے ہیں۔ حقایق کی جھلکیاں وہ دیکھتے ہیں اُن کا کلام مثل مولانا روم وغیرہ کے سراپا اسرار تصوف نہیں ہے اور نہ من اولہ الی آخرم کوئی فلسفہ ہے مگر حقائق اور رموز کا ان کے کلام میں جا بجا پر تو موجود ہے۔ ان کو صوفی براوننگ کہنا بجا ہے۔ ہر چہ کہ براوننگ کے کھڑے پن اور اکھڑ پن سے ان کا کلام پاک ہے۔

(۲) مضامین حُزن و یاس میں اُن کا مقابلہ جرمنی کے شاعر "ہین" سے

لے مرزا کے اس خیال کی تائید کہ اکثر گناہ ایسے تھے جن سے میں بچا ہوں اُن کی حسرت کی بھی داد دی جائے یعنی اس کا ثمرہ نیک ملے اس آیت وافی الہدایت سے ہوتی ہے۔ وَآَمَنَ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَ نَسَى الْفِتْنِ عَنِ الْهُوْلِ۔ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۝ سورۃ النازعات

خوب ہو سکتا ہے۔

(۳) مگر فی حقیقت اگر کوئی فلسفی شاعرانہ کا مقابل یورپ میں گزرا ہے تو وہ جرمنی کا مشہور و معروف ”گیٹے“ ہے۔ غالب میں ان تین چیزوں کا اجتماع ہو گیا ہے یعنی فلسفی کی عقل دراک صوفی کی نگاہ۔ دور بین۔ چاکر دست مصور کا نازک ہاتھ۔ ان کی صنعت پرکاری اور پرکاری صنعت ہے۔ اور حسن حق ہے اور حق حسن ہے وہ ایک صوفی صاف دل تھے اور ان کا یہ قول بالکل صحیح ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں غالب صریح خامہ نولے سروش ہے اُن کا تصوف کوئی شغل دیکھسی نہیں اور نہ اُن کی شاعری محض خیالی شاعری ہے بلکہ وہ واقعات اور واردات سے لبریز ہے اور اسی وجہ سے اُسکا شمار دنیا کی بہترین شاعری میں کیا جاسکتا ہے۔

غالب کے شاگرد غالب کے بکثرت شاگرد تھے جن میں اصحابِ فیل کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نواب ضیاء الدین خاں نیروخشاں تخلص کہ اُن کے عزیز بھی تھے میر ہمدی تبریز مرزا قزوین علی بیگ سارک خواجہ الطاف حسین حالی مصنف یادگار غالب فنی ہر گویا تفتہ۔ نواب علاء الدین خاں علوی۔ ترکی عزیز مشاق و جوہر وغیرہ۔ ان میں سے بعض کے مختصر حالات آگے درج ہیں۔

۱۔ مصنف کتاب بابور گھوڑی سہارے صاحب اور مہر صلاح الدین خدا بخش اور انریل شیخ عبد القادر صاحب کا دلی شکر یہ ادا کرتے ہیں کہ ان حضرات کے پیش ہما مضامین سے جو غالب کی شاعری پر نکلے اُنھوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔

میر ہمدی مجروح

متوفی سنہ ۱۲۹۷ھ

میر ہمدی مجروح خلف میر حسین نگار مرزا غالب کے محبوب اور
 سب سے عزیز شاگرد دلی کے رہنے والے تھے۔ غدر کے ہنگام میں
 وطن چھوڑ کر پانی پت چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کی کچھ عرصہ بعد جب کہ غدر کا
 طوفان فرو ہوا اور دلی میں گونہ امن و امان کی صورت پیدا ہوئی تو یہ پھر دلی آ گئے۔
 اور اپنے قدیم مشغلہ شعر و سخن سے دلچسپی لینے اور مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔
 بعد چند روز کے تلاش معاش اور گئے جہاں ہمارا جہ شیوہاں سنگھ والی ریاست نے
 انکی قدردانی کی۔ آخر عمر میں نواب صاحب رامپور کی قدردانی اور عنایت و مہربانی
 سے اسی ریاست میں چلے آئے اور بغراغت زندگی بسر کی سلسلہ میں اپنا ایک یوں
 ”مظہر معانی“ کے نام سے چھپوایا۔ میر مجروح کی زبان نہایت صاف و سادہ اور
 شیریں ہے چھوٹی بھروں میں ان کا کمال بوجہ حسن معلوم ہوتا ہے خیالات میں
 ندرت اور مضامین میں جدت ان کے کلام میں نہیں ہے۔ مگر طرز ادا استادانہ ہے
 اور اشعار عیوب شاعری سے پاک ہیں۔ مولانا حالی ان کے بڑے معترف تھے۔
 میر مجروح ان لوگوں میں ہیں جنکو اردو شاعری کی آخری یادگار سمجھنا چاہیے۔
 انھوں نے اردو شاعری کی روایات قدیمہ کو حتی الامکان خوب نباہا مرزا غالب کے
 اکثر و کچھ خط عود ہندی اور اردو سے معلیٰ میں ان کے نام موجود ہیں۔

سالک متوفی سنہ ۱۲۹۷ھ

سالک متوفی سنہ ۱۲۹۷ھ مرزا قربان علی بیگ سالک نواب مرزا عالم بیگ کے بیٹے
 تھے حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ مگر بعض کے نزدیک مسقط الراس دلی ہے غرض کہ
 دلی میں نشوونما پائی پہلے قربان تخلص کرتے اور مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے۔
 مگر جب ان کا انتقال ہو گیا تو یہ غالب کے شاگرد ہوئے اور سالک تخلص اختیار کیا

غدر کے زمانہ میں یہ دلی چھوڑ کر اور چلے گئے جہاں کچھ عرصے تک وکالت کرتے رہے۔ اس کے بعد حیدر آباد گئے اور وہاں محکمہ تعلیمات میں سررشتہ دار ہوئے حیدر آباد میں مخزن الفوائد کے نام سے ایک اردو رسالہ زیر سرپرستی نواب عماد الملک بہادر نکلتا تھا سالک کچھ عرصے تک اسکے مدیر رہے۔ ۱۲۹۵ھ میں حیدر آباد ہی میں انتقال کیا۔ ”ہنجا رسالک“ دیوان کا نام ہے۔ یہ بھی غالب کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔ کلام خیال اور زبان دونوں کے اعتبار سے اچھا ہے مگر جدت سے خالی ہے۔ ان کا شہر شوب دہلی کی تباہی پر اور اپنے استاد غالب کا مرنیہ بہت پر زور اور ذرا گنیز جوڑی متوفی ۱۲۹۳ھ نواب سید محمد زکریا خاں رضوی متخلص بہ زکی ایک عالیخاندان شخص تھے۔ دلی میں ۱۲۳۹ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب سید محمد خاں اور نانا نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں اعظم جنگ متخلص بہ سرور ہیں۔ یہ دونوں بھی مشہور شاعر اور صاحب دیوان ہیں اور سرور کا ایک تذکرہ بھی رخیۃ گوشترا کا ہے۔ زکی کی تعلیم دلی میں ہوئی اور ان کو زبان فارسی و عربی پر عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ فن طب حدیث و فقہ اور تصوف اور نجوم وغیرہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ موسیقی اور فن خوشنویسی سے بھی باخبر تھے۔ مولانا صہبائی اور پنڈت رام کشور سہل کے علوم درسیہ میں شاگرد تھے۔ فن شعر میں مرزا غالب کو کلام دکھلاتے تھے جن سے ان سے کچھ قرابت بھی تھی۔ مرزا ان کا بہت خیال کرتے اور بہت محبت سے پیش آتے تھے۔ مرزا کے ہاتھ کی ایک سند کا عکس ان کے دیوان میں دیا ہوا ہے۔ زکی کو شعر و سخن سے بہت شوق تھا اور اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے رہتے تھے۔ جہاں کہیں جاتے تھے شعر و سخن کی محفلیں گرماتے تھے۔ غالب کے شاگرد رشید اور ان کے طرز کے متبع تھے۔



نواب سيد محمد زكريا خان ذكي دهلوي



میرزا حاتم علی مہر

خیال آفرینی اور جدت تکمیل ان کے کلام کا جوہر ہے۔ البتہ درد و اثر اس قدر کلام میں نہیں ہے مثل ظہیر و انور و سالک وغیرہ کے ان کو بھی تلاش معاش میں وطن سے نکلنا پڑا۔ میرٹھ۔ گورکھپور آکے آباد وغیرہ میں ملازمت سرکاری کر کے سلسلہء ع میں بدایوں میں بحیثیت ڈپٹی انسپکٹر مدرس نشن پائی اور وہیں سلسلہء ع میں انتقال کیا اُن کا دیوان اُن کی زندگی میں چھپ گیا تھا اپنے زمانہ میں طرز قدیم کے استاد مانے جاتے تھے بہت سے شاگرد چھوڑے جن میں مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ اصفیہ اور پربت جواہر ناتھ کول ساقی تخلص زیادہ مشہور تھے۔

رخشاں متوفی سنہ ۱۲۸۷ء نواب ضیاء الدین احمد خاں تخلص بہ رخشاں نیز نواب احمد بخش خاں رئیس لوہارو کے چھوٹے بیٹے تھے۔ نواب صاحب لوہارو نے اپنی جاگیر اپنے چھوٹے بیٹوں کے نام منتقل کر دی تھی جس کا انتظام نواب امین الدین احمد خاں کرتے تھے۔ نیز اور غالب سے رشتہ داری بھی تھی اور مرزا اُن کو اپنا خلیفہ کہا کرتے تھے۔ نیز اپنے زمانہ کے اہل علم اور اہل ثروت میں ایک خاص درجہ امتیاز رکھتے تھے اور شعر و سخن کے بڑے ماہر اور پرکھنے والے سمجھے جاتے تھے۔ تاریخ سے بھی ان کو بہت دلچسپی تھی۔ چنانچہ الیٹ صاحب نے اپنی مشہور تاریخ ہندوستان کی تیاری میں انکی جامعیت اور معلومات سے بہت کچھ مدد لی۔

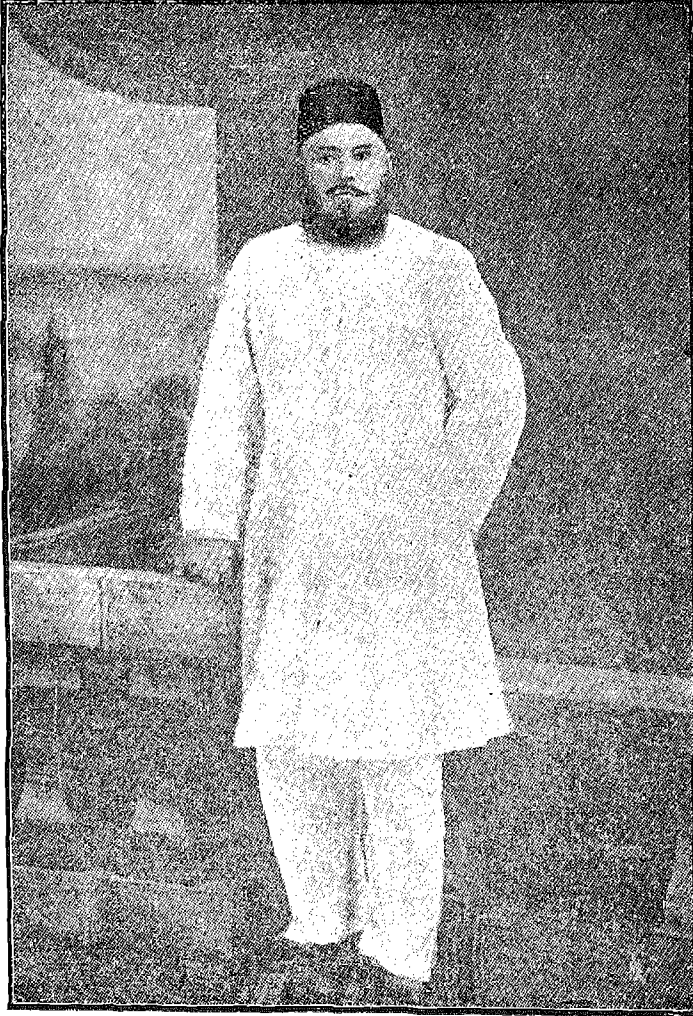
نواب شہاب الدین احمد خاں تخلص بہ اقب نیز کے بڑے بیٹے غالب کی بیوی کے بھتیجے اور غالب کے شاگرد بھی تھے شعر اردو و فارسی دونوں میں کہتے تھے سلسلہء ع میں عین عالم شباب میں ہجرتیں سال انتقال کیا۔
دوسرے بیٹے نواب سعید الدین احمد خاں تخلص بہ طالب، جن کی ولادت

۱۸۵۲ء میں ہوئی، اپنے بڑے بھائی ثاقب اور اُن کے مرنے کے بعد میر محمد جرح و سالک و حالی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ کچھ عرصے تک دلی کے انگریزی مجسٹریٹ رہے پھر ۱۸۵۸ء میں پنجاب کے کسٹرس اسسٹنٹ کمشنر ہو گئے۔ ۱۸۵۸ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنے عہدہ سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔

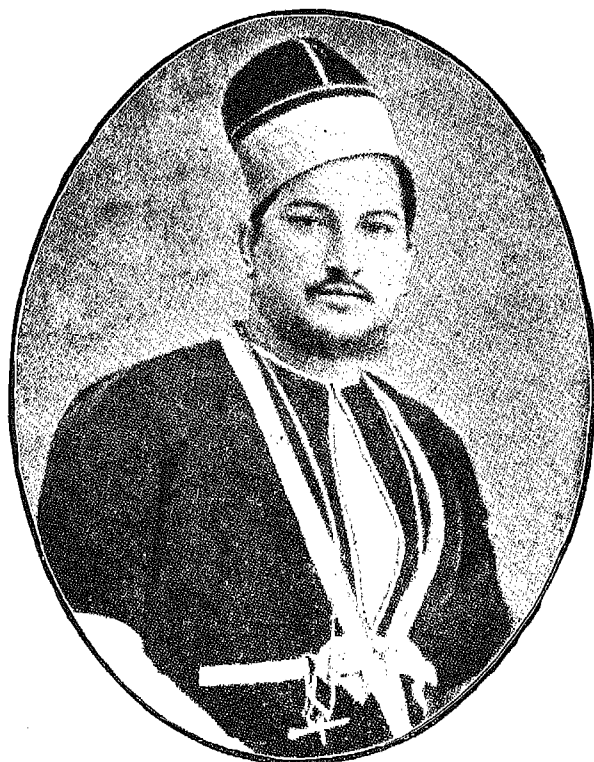
مرزا شجاع الدین احمد خاں متخلص بہ تاناں نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے بیٹے شاداں اور داغ کے شاگرد ہیں۔ اُن کے دو دیوان ہیں۔ ان کی شادی مرزا باقر علی خاں کامل کی لڑکی سے ہوئی اور یہ وہی مرزا باقر علی خاں ہیں جنکو غالب نے پالا تھا۔ تاناں اب حضور نظام کے نیشن خوار ہیں۔

نواب مرزا سراج الدین احمد خاں متخلص بہ سائل خلف نواب شہاب الدین احمد خاں داغ کے ایک سربراہ اور ایک مشہور و معروف شاعر ہیں۔

آزادہ مسئلہ ۱۲
نفاہت مسئلہ ۱۲
مفتی صدر الدین خاں آزدہ خلف الرشید مولوی لطیف اللہ کشمیری اپنے زمانہ کے جید فاضل اور متبحر عالم تھے۔ اُس زمانہ کی علمی اور ادبی سوسائٹی میں ان سے بڑھ کر اور کوئی ممتاز شخص نہ تھا۔ شاہ عبدالغفر نیر صاحب محدث دہلوی اور مولانا فضل امام سے فیض تربیت حاصل کیا تھا۔ عہدہ صدر الصدور پر فائز تھے جو اُس زمانہ میں ہندوستانیوں کے واسطے سب سے بڑا عہدہ سمجھا جاتا تھا عربی، فارسی، اردو، تینوں زبانوں میں اُن کو دستگاہ کامل حاصل تھی۔ ان کے علم و فضل کی اس قدر شہرت تھی کہ نواب یوسف علی خاں والی رامپور اور نواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم رئیس بھوپال نے اُن کے سامنے زانوئے شاگردی نہ کیا تھا۔ سرسید مرحوم بھی اُن کے شاگرد تھے اور ہمیشہ ان کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کرتے تھے۔ اُن کو

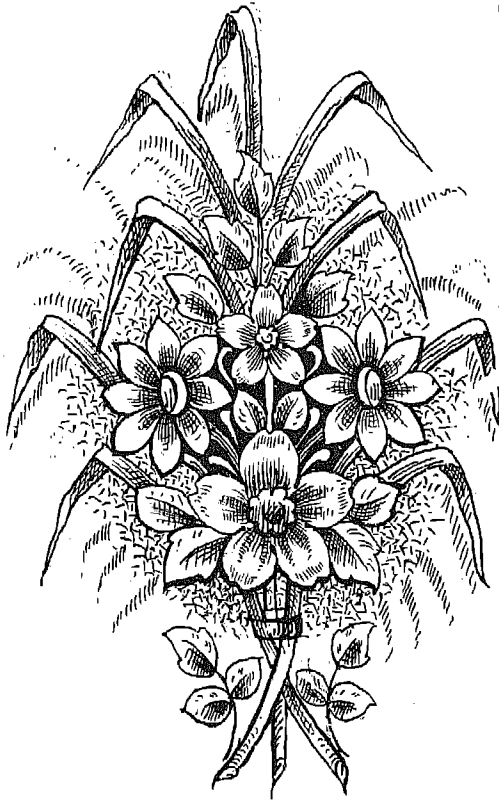


مولانا سید امی حیدر صاحب طبعی شاعر دیوان غالب



زواب ، رزا سعيد الدين احمد خان طالب دهلي

درس و تدریس کا اسقدر شوق تھا کہ بعد انجام دینے اپنے فرائض منصبی کے اپنے اکثر شاگردوں کو سبق دیتے تھے۔ غالب مومن ذوق شیفتہ وغیرہ اُن کے احباب میں سے تھے۔ غدر کے زمانہ میں یہ بھی مصیبت میں مبتلا ہوئے اور نصف جاگیر ضبط ہو گئی۔ آذرہ تینوں زبانوں یعنی عربی، فارسی، اردو میں شعر کہتے تھے۔ اردو میں صلاح سخن پہلے شاہ نصیر سے اور پھر محرم اکبر لدھی اور آخر میں میر مومن سے لیتے تھے۔ ان کے اشعار نہایت صاف سلیس اور مچاثر ہوتے ہیں مگر کبھی یوان کی صورت میں مرتب نہیں کیے گئے۔ اُن کا ایک تذکرہ شعر لے اردو کا بھی ہے مگر انہیں بتا۔ اُن کی شہرت بحیثیت ایک شاعر یا تذکرہ نویس کے اسقدر نہیں ہے جتنی کہ اُن کے علم و فضل کی ہے



باب ۱۲

دربار رام پور و حیدر آباد

آمیر و دلغ کا زمانہ

بلاندر سلطنت اور دھواؤں غدر سے جبکہ واجد علی شاہ کلکتہ اور ابو ظفر بہادر شاہ قیصر کے رنگون بھیجے گئے لکھنؤ اور دہلی جو ایک عرصہ تک اردو شاعری کے مسکن و امن رہ چکے تھے ادبی لحاظ سے بالکل ویران ہو گئے اور یہاں کے شاعر اب ہندوستانی ریاستوں کی طرف نہایت اشتیاق اور حسرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

وہ شعراء لکھنؤ جو لکھنؤ میں حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ کے دامن دولت سے وابستہ تھے ان میں سے بعض تو اپنے

مٹیا بروج کلکتہ میں

شعر کا جمع

آقائے نامدار کے ساتھ ہی اور بعض غدر کے بعد جب کسی قدر تسلط اور امن و امان ہو گیا تو راہی کلکتہ ہوئے۔ چنانچہ بادشاہ نے جن کو مناسب نام و خطاب دینے کا خاص ملکہ تھا ان سات بڑے شاعروں کو جو مٹیا بروج میں ان کے ساتھ تھے سب سے تیارہ کا خطاب دیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک بڑے بڑے مغز شاہی خطاب بھی سرفراز تھا۔ ان لوگوں کی وجہ سے مٹیا بروج کی صحبتوں میں بڑی گراں گرامی تھی مشاعرے آئے دن ہوا کرتے تھے اور مٹیا بروج سواد کلکتہ نہیں بلکہ لکھنؤ کا ایک محلہ معلوم ہوتا تھا۔ ان سب سے تیارہ میں جن کا ذکر اوپر ہوا بعض شعراء کے نام یہ ہیں:-

فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برق۔ ممتاز الدولہ کوکب الملک ستارہ جنگ متخلص
 بہ درخشاں۔ الملک الدولہ صولت یگلشن الدولہ حاجی مرزا علی متخلص بہ بہار شاگرد رشک۔
 عیش مظفر علی ہنر۔ جو غزل میں صبا کے اور مرثیہ میں مرزا دبیر کے فنا کرد تھے اور خدر ^{عظا} رکھ
 نواب بادشاہ محل متخلص بعالم اور نواب محبوب عالم صاحبہ کے کہ یہ دونوں بیویاں
 واجد علی شاہ کی تھیں استاد تھے۔ اسی پر لطف مجمع میں داغ اور نظم طباطبائی بھی
 پہنچ گئے تھے۔ ان صحبتوں اور مشاعروں سے زبان اور شاعری اُردو کا بنگال
 میں بہت چرچا ہو گیا تھا۔ وہاں کے مقامی شعرا میں اُس زمانہ میں مولوی عبدالغفور
 نساخ جو اس وقت راج شاہی کے ڈپٹی کلکٹر تھے بہت ممتاز اور مغز سمجھے جاتے تھے۔
 نساخ ایک ذی کمال سخن گو سخن سنج اور اچھے نقاد سخن تھے چنانچہ تذکرہ سخن شعراء
 و قریب مثال، قطعہ منتخب، چشمہ منیض، شاہ عشرت، مرغوب دل، اشعار نساخ،
 گنج تواریخ، قند پارسی، ارمغان، باغ فکر وغیرہ اُن سے یادگار ہیں۔ دبیر و
 انیس کے کلام پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے جو اکثر مقامات پر صحیح تو نہیں مگر دیکھ
 اور مفید ضرور ہے۔ اُن کے مشہور شاگردوں میں انسخ تھے۔

شعر نے دہلی اپنا وطن پہلا سفر شعرے دہلی کا اپنے وطن مالوت سے جبکہ اشارہ

چھوڑ کر مچلتے ہیں

صفحات گذشتہ میں کئی بار ہو چکا ہے چند اسباب پر مبنی ہے

اور وہ یہ ہیں یعنی افغانوں اور مرہٹوں کے حملے اور دہلی کی تباہی اُن کے ہاتھ سے

شاہان دہلی کی عظمت قدیم کا جاتا رہنا۔ رعایا کی جان و مال کا عدم تحفظ۔ تلاش

معاش کی دقتیں شعرا کی بے قیدی اور بیکاری پس ہی وجہ تھیں جنکی بنا پر شعر اپنا

وطن چھوڑنے اور دوسرے مقامات میں تلاش روزگار کے لئے نکل جانے پر مجبور ہو

چنانچہ فرخ آباد فیض آباد عظیم آباد - مرشد آباد اور حیدر آباد دکن نے دہلی کے ان شورہ سختوں کو اپنی آغوش محبت میں بے تکلف جگہ دی۔ فرخ آباد اور فیض آباد دہلی سے بہ نسبت دوسرے مقامات کے زیادہ قریب تھے۔ مگر چونکہ فرخ آباد ایک چھوٹا مقام تھا اور رؤسا وہاں کم تھے لہذا شاعر دہلی نے پہلے فیض آباد کا اور جب فیض آباد بدل کر لکھنؤ دار السلطنت قرار پایا تو پھر لکھنؤ کا رخ کیا۔ لکھنؤ کے انتخاب کے خاص اسباب آگے چل کر ہم وضاحت سے بیان کریں گے۔

فرخ آباد فرخ آباد میں نواب مہربان خاں زند جو نواب احمد خاں بنگش کے ایک معزز رکن دربار تھے خود بہت بڑے شاعر اور موسیقی داں تھے شعر و سخن میں انھوں نے میر سوز سے اور جب مرزا سودا دلی سے فرخ آباد آئے تھے تو ان سے بھی اصلاح لی تھی سودا نے انکی تعریف میں کچھ قصیدے بھی کہے ہیں۔ کچھ دنوں بعد جب نواب موصوف کا خاندان برسرِ اقتدار نہ رہا تو شعر و شاعری کا چرچا بھی وہاں کم ہو گیا۔

عظیم آباد ہمارا چہ شتاب اسے جو اُس زمانہ میں بنگال کے حاکم اعلیٰ تھے۔ شاعروں کے قدرداں اور خود بھی شاعر کہلاتے تھے۔ ان کے بیٹے جو راجہ تخلص کرتے تھے میر ضیاء الدین ضیاء معاصر سودا کے شاگرد تھے کہ وہ لکھنؤ کے بعد عظیم آباد چلے گئے تھے اسی طرح اشرف علی خاں قنات بھی ہمارا چہ موصوف کے دربار میں پہنچ گئے تھے اور انکی مہاراجہ بہت قدر کرتے تھے۔ میر باقر حزیں شاگرد مرزا مظہر جان جاناں نواب سعادت جنگ ریس عظیم آباد کے دامن دولت سے وابستہ تھے اور وہیں انتقال کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے شاعر دہلی کی بڑی قدر تھی اور شعر و سخن کا چرچا یہاں خوب تھا۔

مرشد آباد نوابان مرشد آباد نے بھی اسی طرح شعر لکھ دیے کوہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کی قدردانی اور ان کے ساتھ بڑی مہربانی کی۔ میر سوز اور میر قدرت اللہ قدرت معاصر میر و سودا مرشد آباد گئے اور آخر الذکر وہیں شہنشاہ میں پیوند خاک ہوئے۔ مرزا ظہور علی خلیق، نواب نوازش محمد خاں شہاب جنگ کے بلانے سے بہرہ مستشاہ بادشاہ دہلی مرشد آباد آئے تھے یہ اُس زمانہ کے ایک مشہور شہسوار اور مرثیہ خواں تھے۔

ٹانڈہ ٹانڈہ جو آٹھ ضلع بریلی اور رامپور کے قریب واقع ہے، نواب محمد یار خاں متخلص بہ امیر کا قیام گاہ تھا۔ نواب صاحب نواب فیض اللہ خاں والی رامپور کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے اور خود بھی شاعر اور شعرا نواز تھے۔ انھوں نے پہلے میر سوز اور سودا کو بلوایا مگر جب وہ نہیں آئے تو قائم چاند پوری کو جو خواجہ میر درد و سودا کے شاگرد تھے طلب کیا اور ان کو وہ سورتیں دے دیے تھے اور انھیں کے شاگرد بھی تھے۔ قدوی لاہوری، میر محمد نعیم پروانہ اور عشرت وغیرہ بھی اس دربار کے زلمہ خوار رہ چکے ہیں۔ نواب صاحب کا انتقال بمقام رامپور ۱۱۸۸ھ میں ہوا۔

حیدر آباد پہلی مرتبہ شعر اُس ملک کی جانب کم متوجہ ہوئے۔ اس وجہ سے کہ دور و دراز کا سفر اور راستہ مرہٹوں اور پٹھانوں کی غارتگری کیوجہ سے پر خطر تھا۔ مگر سپہ بھی کچھ باہمت لوگ پہونچ ہی گئے۔ چنانچہ خواجہ حسن اسد تیان شاگرد مظهر آصف جاہ ثانی کے عہد میں حیدر آباد پہونچے اور وہیں ۱۲۱۸ھ میں رحلت کی۔ اُن کے ایک شاگرد راعی گلاب چند سہم نے ”اُستاد از جہاں رفت“ تاریخ کمی۔ شاہ نصیر بھی متعدد بار حیدر آباد گئے تھے۔

فیض آباد لکھنؤ انتخاب فیض آباد کے وجہ :-

- (۱) دلی سے فیض آباد بہ نسبت دیگر مقامات مذکورہ کے قریب تر تھا۔
 - (۲) شعر کی قدر وہاں بہ نسبت دیگر مقامات کے زیادہ ہوتی تھی۔
 - (۳) امیر الزہرہ بیگم معروف بہ بیگم صاحبہ شجاع الدولہ کی بیوی اور آصف الدولہ کی ماں محمد شاہ بادشاہ دہلی کی بہت لاڈلی سے پالک بیٹی تھیں۔ ان کا وطن اصل دہلی تھا اس وجہ سے ان کو اپنے اہل وطن یعنی دلی والوں سے کمال محبت اور ہمدردی تھی اور ان کے ساتھ علی قدر مراتب بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتی تھیں۔
 - (۴) نواب آصف الدولہ بہادر کو دہلی کے رئیس اعظم خانخاناں کی بیٹی منسوب تھیں اسوجہ سے لکھنؤ کو دہلی کے ساتھ ایک دوسرے پہنچ نہ محبت نصیب ہو گیا تھا۔
- کچھ شعر پر موقوف نہیں، دہلی کے تجارت، ارباب حرفہ و پیشہ، ارباب نشاط، غرضکہ ہر جماعت اور پیشہ کے لوگ فیض آباد میں کثرت تھے مشہور تواریخ ہے کہ بیگم صاحبہ کی داد و دہش کا شہرہ سن کر آدھی دہلی ادھر کھینچ کر آگئی تھی۔ برخلاف اسکے ریاستہائے نظام و میسر سلطان اور کرناٹک اور مرشد آباد دلی سے بہت دور تھے۔ پس کوئی تعجب نہیں کہ فیض آباد میں اتنا مجمع ہو گیا ہو۔ پھر جب نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ کا رخ کیا اور اس کو اپنا مستقل دار الحکومت بنا لیا تو یہ ساری محفل ہاں سے اٹھ کر لکھنؤ چلی آئی۔ چنانچہ اسی زمانہ میں یا اس کے قریب قریب یہ لوگ فیض آباد اور لکھنؤ پہنچ گئے تھے یعنی مرزا سودا، میر تقی، میر سوز، مرزا محمد تقی خاں ترقی شاگرد میر سوز، طالب علیخان عیشی شاگرد قتیل، جعفر علی حسرت، بقا اللہ خاں بقا، میر حسن، میر ولی اللہ محب شاگرد سودا۔ میر حیدر علی حیران شاگرد سرپ سنگھ دیوانہ میر ضاحک

میرزا فخر کین، میر غلام حسین برفستہ شاگرد میر ضیاء، آغاں، قالم، مصحفی، انشا، جرأت، رنگین، قتیل، قاضی محمد صادق خاں اختر (جو ہوگلی کے رہنے والے تھے) ان کے علاوہ دیگر شعرا بھی مختلف اوقات میں دہلی سے لکھنؤ آتے اور لکھنؤ کی صحبت شعرو سخن کو گماتے رہتے نیز مرزا جواں نخت و بیعد شاہ عالم جو چھوڑے دنوں لکھنؤ کو کر بنا اس چلے گئے اور مرزا سلیمان شکوہ، مرزا جواں نخت کے چھوٹے بھائی جو بعد کو آئے اور بڑے ترک و احتشام سے لکھنؤ میں رہتے تھے انکی وجہ سے بھی شعرو شاعری کو بہت فروغ ہوا بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ گلستان لکھنؤ عادل خوش الحان سخن کے دلکش تراؤں اور پر لطف نواں سنجیوں سے معمور اور مست ہو رہا ہے۔

طرز لکھنؤ کو نقصان پہونچانے والی پہلی ضرب انتزاع سلطنت
دوسرے دہلی و لکھنؤ کا
دوسرے مقامات پر نشر جانا
اددھ کو سمجھنا چاہیے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ واجد علی شاہ کلکتہ

بھیج دیے گئے۔ اسی کے ساتھ دوسری ضرب کاری جس نے ہماری اردو شاعری کو سخت نقصان پہونچایا۔ غدر شاہ اور دہلی اور لکھنؤ کی تباہی و بربادی کی صورت میں ظاہر ہوئی اسوجہ سے کہ یہی دونوں شہر بغاوت اور نیز انتقام بغاوت دونوں چیزوں کے بڑے مرکز تھے۔ بہادر شاہ کو مجرم ٹھہرا کر اور قید کر کے ہندوستان سے باہر بھیج دیا قلمہ معنی کے رہنے والے جو اب تک شعرے دہلی کا ملجا و ماوا بنا ہوا تھا ادھر ادھر تشریف لے ہو گئے شعرو سخن کا کیا خاک خیال آتا جب جان و مال کے ساتھ عزت و آبرو بھی خطرہ میں پڑ گئی تھی۔ انھیں اسباب سے اور اسی حالت میں لکھنؤ اور دہلی کے شاعر اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ اکثروں نے رامپور کا رخ کیا کیونکہ وہ دہلی اور لکھنؤ سے قریب تھا۔ پھر دانکے والی ریاست بھی اہل سخن کے بڑے قدردان اور مرتبی تھے۔

کچھ لوگ حیدر آباد پہنچے۔ کچھ اطراف و جوانب کی ہندوستانی ریاستوں مثلاً آور
جے پور۔ بھرت پور۔ پٹیا لہ۔ کپورتھلہ وغیرہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ اسلامی ریاستوں
یعنی ٹونک۔ بھوپال منگروڑ (کاٹھیاوار) مالیر کوٹلہ۔ اور بھادلیپور نے بھی کسٹ
خانماں برباد شاعروں کو اپنی طرف کھینچا۔ چنانچہ کچھ تو یہاں کے درباروں میں نوکر
ہو گئے کچھ ان ریاستوں میں بکروہاں کے دالیان ملک کی فیاضیوں سبہرہ مند ہونے لگے
مختصر یہ کہ راسپور اور حیدر آباد ہی ایسے دو بڑے دربار تھے جنہوں نے ان خستہ اور
دل شکستہ شاعروں کی بڑی قدر کی۔ لہذا ان دو مقامات کے شعر کا کچھ حال ہم اسی
باب میں آگے کسی قدر تفصیل سے لکھیں گے۔ آور نے بھی جہاں کے حکمران مہاراجہ
شیو دھان سنگھ مشہور قدردان سخن تھے۔ ظہیر تصویر کشہ شاگردان ذوق۔ اور
میر مجروح اور سالک شاگردان غالب کی بڑی قدر کی۔ مہاراجہ موصوف نے
مرزا حب علی بیگ سرور مصنف فسانہ عجائب کو بھی اپنے یہاں بلایا تھا۔ سیطرح
ظہیر اور ان کے چھوٹے بھائی آور جے پور چلے گئے اور آخر الذکر کا انتقال بھی یہیں
ہوا۔ ارشد گورگانی مالیر کوٹلہ اور بھادلیپور میں رہے۔ ٹونک منگروڑ اور بھوپال
کا علیحدہ علیحدہ ذکر آتا ہے۔

ٹونک [] والی ٹونک نواب محمد ابراہیم علی خاں ۱۲۳۷ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے
پدر بزرگوار نواب محمد علی خاں کی معزولی کے بعد ۱۲۶۷ھ میں مسند آراء حکومت
ہوئے۔ یہ شاعر ہیں اور خلیل تخلص فرماتے ہیں۔ پہلے اسماعیل خیر آبادی شاگرد ظہیر مینائی
کے شاگرد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی مضطر خیر آبادی سے
مشورہ سخن کرنے لگے۔ ان کے دربار میں اور بھی بہت سے شاعر تھے جن میں ظہیر اور

نواب سلیمان خاں متخلص بہ اسد زیادہ مشہور ہیں اسد میر مظفر علی اسیر کے شاگرد اور صاحب دیوان ہیں۔ نواب صاحب موصوف نے ان کو خاص طور پر نونک طلب کیا تھا۔ ان کے اکثر شاگرد وہاں موجود ہیں مثلاً اصغر علی خاں اکبر و حبیب اللہ ضبط۔ عبد الرحیم خاں شرف۔ خواجہ سید کرامت علی خاں داغ کے شاگرد تھے انھوں نے اپنے بعد ایک غیر مطبوع دیوان اور بہت سے شاگرد چھوڑے اور سلسلہ عیسوی میں انتقال کیا۔ نواب صاحب موصوف کے صاحبزادے بھی شاعر ہیں اور اپنے پدر بزرگوار کے قدم قدم چلتے ہیں۔

منگول کاٹھیاوار میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست ہے اس دور و دراز مقام میں بھی اردو شاعری کا خوب چرچا ہوا۔ جسکی وجہ والی ریاست نواب حسین علی شاہ کی توجہ اور قدر دانی کہی جاسکتی ہے۔ ان بزرگوار نے لکھنؤ اور دلی کے اسوقت کے اکثر نامور شاعروں کو اپنی ریاست میں یکے بعد دیگرے طلب کیا تھا چنانچہ داغ تسلیم۔ جلال اور شمشاد جوناسخ کے مشہور شاگرد اور لکھنؤ میں استاد مانے جاتے تھے اس قدر ان سخن کی فیاضیوں سے وقتاً فوقتاً بہرہ یاب ہوتے رہے۔ مقام کی دوری اور آب و ہوا کی ناسازگاری کی وجہ سے ان لوگوں نے وہاں قیام تو زیادہ نہیں کیا مگر اکثر ان میں کے ریاست سے ماہانہ تنخواہ پاتے رہے۔ جو ان کو انکے مکان پر برابر بھیج دی جاتی تھی۔

بھوپال فرمانروائے ریاست ہزارائیس نواب سلطان جہاں بیگ صاحبہ باقباہا اپنی ریاست کیا بلکہ تمام ہندوستان کے تعلیمی معاملات میں سجدہ کجپی لیتی ہیں چنانچہ

لے موجودہ فرمانروائے ریاست ہزارائیس نواب حمید اللہ خاں بہادر باقباہ ہیں ۱۲

مسلم یونیورسٹی اور اسطرح کی دیگر قومی تعلیم گاہوں کے قیام میں انھوں نے ہمیشہ بہت بڑی فراخ دلی سے حصہ لیا ہے اور شاہانہ عطیے اُن کو عنایت کیے ہیں۔ خود بھوپال میں صدہا اسکول اور مدارس اُن کے عہد مبارک میں اور ریاست ہی کے روپیہ سے قائم ہوئے جو ہمیشہ ان کی علم دوستی اور ہنس پروری کی یادگار رہینگے۔ آپ مختلف علوم و فنون میں کافی دستگاہ رکھتی ہیں اور متعدد کتابوں کی مصنف ہیں بہت سے قابل بنائے وطن کو جو ناسازگاری زمانہ کی وجہ سے اپنے علمی کارناموں کو شائع نہ کر سکے آپ کی ذات سے بہت بڑی مدد پہنچی ہے۔ سیرت نبوی کی تکمیل کے واسطے جس کا بہت بڑا حصہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے تیار کر دیا تھا اب تک معقول رقم ماہانہ عطا فرماتی رہتی ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ بھی بہت اچھی شاعرہ تھیں اور اردو میں شیریں اور بعد کو تاجور اور فارسی میں شاہ جہاں تخلص کرتی تھیں۔ انھوں نے اپنا عقد ثانی نواب صدیق حسن خاں صاحب کے کر لیا تھا۔ نواب صاحب موصوف عربی و فارسی کے بڑے عالم و فاضل اور اپنے زمانہ کے ایک مشہور محدث اور مفسر سمجھے جاتے تھے مفتی آزرہ کے شاگرد تھے۔ اور تقریباً ڈیڑھ دو سو کتابوں کے مصنف تھے شعر اور اہل علم کے بڑے قدرداں تھے۔ اردو میں توقیق اور فارسی اور عربی میں نواب تخلص کرتے تھے۔ نواب شاہ جہاں بیگم کے والد ماجد نواب جہانگیر محمد خاں مرحوم بھی خوب شعر کہتے تھے اور دولت تخلص کرتے تھے۔ اُن کا دیوان چھپ گیا ہے۔ علاوہ خاندان ریاست کے بھوپال میں اور بھی بہت خوشگو شاعر ہمیشہ رہے ہیں۔

چونکہ ترقی شاعری کے آخری عہد میں راسپور و حیدر آباد نے شعرا کے

اجتماع اور قدردانی میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ لہذا ان کا حال مختصر کے ساتھ
علحدہ علیحدہ لکھا جاتا ہے۔

رامپور ہمارے نزدیک اس امر کی کہ رامپور میں بمقابلہ اور شہروں کے شعرا کا مجمع
خاص طور پر زیادہ ہوا تین وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دلی اور لکھنؤ کے درمیان
اور ان دونوں شہروں سے مساوی فاصلہ پر واقع ہے۔ دوسرے یہ کہ فرمانروا یا
ریاست خود بھی زبردست شاعر اور سخن سنج اور شعرا کے قدردان تھے اور شعرا کی محنت
وجہ کرکڑی کے بدلے ہمیشہ ان کو بیش بہا انعامات و وظائف سے سرفراز کرتے رہتے
تھے۔ تیسرے یہ کہ وہ علماء و ادباء اور شعرا کو اپنا ملازم نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان سے
مساویانہ برتاؤ کرتے اور اکثر ان کی نازک مزاحیاں برداشت کرتے تھے۔ ان کا دربار
اسی قسم کے اہل علم و فضل کا مجمع تھا اور نواب صاحب خود ان کی دلچسپیوں میں حصہ
لیتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ لوگ بڑی بڑی تنخواہوں پر بھی اول تو رامپور سے
بیکلنا ہی نہیں چاہتے تھے اور اگر جاتے بھی تو ہمیشہ رامپور کو یاد کرتے رہتے تھے۔
نواب یوسف علی خاں نواب یوسف علی خاں خلف نواب محمد سعید خاں طے علم دوست

ہنس پرور اور شعرا کے مہربان تھے خود بھی شاعر تھے اور اردو و فارسی دونوں میں
شعر کہتے تھے۔ اردو میں تاظم تخلص کرتے تھے صاحب دیوان ہیں ابتدا میں حکیم
مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے بعد مرزا نوشہ غالب پھر میر مظفر علی اسیر کو
کلام دکھانے لگے دلی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد جو شاعر وہاں سے نکلے ان کو
رامپور ہی میں جگہ ملی تھی۔ مولانا فضل حق خیر آبادی۔ مرزا غالب۔ میر حسین تسکین۔
میر مظفر علی اسیر اور بہت سے علماء و شعرا ان کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔

نواب صاحب موصوف نے شعرائے دہلی و لکھنؤ کو اپنے دربار میں جمع کر کے اردو شاعری کو گنگا جمنی کر دیا تھا۔ یعنی ان دونوں طرزوں کو ملا کر ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی تھی جس نے اُن کے بلند اقبال صاحبزادے نواب کلب علی خاں کے زمانہ میں بڑی ترقی کی۔

نواب کلب علی خاں،
نواب کلب علی خاں کے عہد میں جو ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۵ء
۱۲۵۰ھ تا ۱۲۸۵ھ

میں اپنے والد نواب یوسف علی خاں کی جگہ مستنشین ہوئے اردو شاعری نے اُمپو میں پہلے سے بھی زیادہ ترقی کی۔ برخلاف فریدک اعظم بادشاہ جرنی کے جو اپنے زمانہ میں کل بادشاہان یورپ میں علم و ہنر کا بڑا مربی اور قدردان سمجھا جاتا تھا نواب صاحب موصوف بڑے سخی اور فیاض تھے اور ہمیشہ انعام و اکرام سے شعرا کی قدر افزائی کرتے تھے۔ اُن کا مبارک عہد ادبی حیثیت سے رام پور کا زرین عہد کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنی دشمنی قدر دانی اور مردم شناسی سے اپنی چھوٹی سی ریاست میں بڑے بڑے اہل کمال اور ارباب فن کو جمع کر لیا تھا جسکی نظیر ہندوستان کی کسی دوسری ریاست میں نہیں ملتی تھی۔ اس ریاست میں اُس وقت کے بہتر سے بہتر حکماء کمال نثار، شعراء خوشنویس یہاں تک کہ ہر ایک حرفہ اور پیشہ کے بھی مشہور اہل کمال مثلاً چوبدار، باورچی، رکابدار وغیرہ سب موجود تھے۔ علما کے گردہ میں علامہ عبدالحق خیر آبادی، علامہ عبدالحق مہندس، مولانا ارشاد حسین، سید حسن شاہ محدث اور مفتی سعد اللہ وغیرہ جکما اور اطباء کے طبقہ میں حکیم محمد براہیم اور ان کے صاحبزادہ حکیم عبدالحق علی حکیم علی حسین اور حکیم احمد رضا و حکیم حسین رضا وغیرہ تھے۔ شعرا کی جماعت بہت زبردست تھی۔ یوں تو اور بہت تھے مگر مشہور لوگوں میں یہ حضرات زیادہ نامور ہیں۔ میر مظفر علی اسیر شیخ امداد علی بھڑ



نواب سید یوسف علی خان بہادر خردوس مکان والی رامپور



جناب نواب سید کلب علی خان بہادر علی خان

امیر - داغ - جلال - تسلیم - منیر - قلی - عروج - حیا - جان صاحب - غا جھوٹو شرف
 شاگرد آتش - انس شاگرد - اسخ - شغل - شاداں - غنی - ضیا - خواجہ محمد بشیر -
 منصور - رضا وغیرہ - ان مشاہیر کے علاوہ اور سیکڑوں قابل اور لائق شخص
 پڑے ہوئے تھے جنکی پرورش اور قدردانی ریاست کرتی تھی - مقرب لوگوں کے
 قیام کے واسطے ایک اعلیٰ درجہ کا مکان مخصوص تھا - جو صاحب منزل کے نام سے
 مشہور تھا - مگر باوجود ان اخراجات شانہ کے اسراف کا الزام ریاست پر عائد
 نہیں ہوتا تھا - کیونکہ یہ جتنے لوگ تھے سولے مولانا ارشاد حسین - مولوی عبد الحق
 اور ششی امیر احمد مینائی کے کسی کی تنخواہ سو روپیہ سے زیادہ نہیں تھی - علاوہ اس کے
 کسی کو مفت اور فضول تنخواہ نہیں ملتی تھی - اور یہ سب لوگ ریاست کے مختلف
 کاموں پر باعتبار اپنی قابلیت اور سن کے مقرر تھے - مگر یہ ضرور ہو کہ نواب صاحب
 اپنے تمام ملازمین سے قطع نظر انعام و اکرام کے نہایت شفقت اور محبت سے پیش
 آتے تھے - عید بقرعید اور اکثر خوشی کے موقعوں پر تمام معزز اور مقرب لوگوں کو
 خلعت اور انعام سے سرفراز فرماتے اور جن سے زیادہ خصوصیت ہوتی انکی خبر گیری
 خاص طور پر فرماتے - قرضداروں کا قرض ادا کر دیتے اور مختلف طریقوں سے انکو
 رہن منت کرتے تھے -

نواب کلب علی خاں نے دریا ت معقول و منقول مولانا فضل حق خیر آبادی سے
 پڑھی تھیں - پہلے انھوں نے اردو و فارسی شکر لکھنے کی فراغت کی - اور اکثر کتابیں
 تصنیف کیں منجملہ جن کے بلبل نغمہ - سنج - ترانہ غم - قذیل حرم - اور شگونہ خسروی
 زیادہ مشہور ہیں - فارسی میں ان کا دیوان تاج فرخی کے نام سے مشہور ہے -

لہو و میں اپنا کلام امیر مینائی کو دکھاتے اور انھیں سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ چار دیوان انکی یادگار اور انکی اعلیٰ قابلیت کے نمونے ہیں۔ نشید خسروانی۔ دستبنو و خاقانی۔ درۃ الانتخاب۔ اور ترقیع سخن۔ نواب صاحب نواب خالص کرتے تھے اور نہایت عمدہ شعر کہتے تھے۔ ان کو تحقیق لفظی کا خاص شوق تھا۔ اور الفاظ کی صحت و عدم صحت کے مناظرے ان کے سامنے اکثر ہوا کرتے تھے جن میں تاجر تسلیم۔ جلال۔ امیر اور منیر وغیرہ جو اس فن خاص میں خاص بصیرت اور دلچسپی رکھتے تھے، نمایاں حصہ لیتے تھے۔ اسی وجہ سے نواب صاحب کا بیشتر کلام متروکات اور غیر فصیح الفاظ اور ترکیبوں سے پاک ہے۔

اس اجتماع شعرا کا یہ نتیجہ بہت اچھا ہوا کہ اسکی وجہ سے دلی اور لکھنؤ کے مختلف طرز آپس میں مل گئے اور ایک نئے طرز کی بنیاد پڑی جسکی ابتداء نواب یوسف علیخان کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ یہ اردو شاعری کا ایک ایسا اہم اور غور طلب مسئلہ ہے جسکی طرف کافی توجہ اب تک منعطف نہیں ہوئی ہے۔ ناسخ کا طرز ان کے شاگردوں کے زمانہ میں جو کہ اپنے استاد کی استادانہ روش کو قائم نہ رکھ سکے تھے بد سے بدتر ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کے کلام میں اس طرز کے تمام عیوب تو موجود تھے مگر خوبیاں مفقود تھیں۔ اس طرز کے برتنے والے رامپور میں تاجر منیر قلیق اور آسیب تھے۔ برخلاف اس کے طرز دلی کے پیرو داغ و تسلیم تھے۔ داغ گو کہ ذوق کے شاگرد تھے مگر انھوں نے ایک ایسا دلکش طرز اختیار کیا تھا جس میں جرأت کا کچھ رنگ ملتاجلدا تھا۔ ان میں اور لکھنؤ والوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ان کے اشعار بہت مقبول ہوئے شہرخص ان کے رنگ کا دلدادہ تھا۔ تسلیم گو کہ لکھنؤ کے تھے مگر رنگ بالکل

دلی کا اختیار کیا تھا۔ وہ نسیم دہلوی کے شاگرد تھے جو مومن کے شاگرد تھے۔ نسیم کے طرز کی کیفیت ہم اُن کے حالات میں مفصل بیان کر چکے ہیں۔ اُن کے شاگرد تسلیم پر ناسخ کے رنگ کا جادو کبھی نہ چلا۔ وہ اُس کو ہمیشہ برا سمجھتے رہے اور جہاں کہیں اپنے استاد اور استادِ استاد یعنی نسیم اور مومن کی پیروی کرتے رہے۔ مومن اور غالب تھوڑے عرصہ تک رامپور میں رہے تھے اسوجہ سے اُن کا اثر کچھ زیادہ نہ پڑ سکا اور حیرتیں تسکین کوئی ایسے بلند مرتبہ شخص نہ تھے کہ اپنا اثر اپنے وقت کی زبان اور شاعری پر ڈالتے مختصر یہ کہ یہ دونوں اکول یعنی لکھنؤ اور دلی۔ آپس میں لڑتے جھگڑتے اور مباحثہ کرتے رہے جس کا نتیجہ شاعری کے لئے عموماً اچھا ہوا یعنی ناسخ کے زمانہ سے جو ایک سجا لفظ اور تصنع کا شوق داخل زبان ہو گیا تھا وہ جاتا رہا یا کم سے کم اُسکو شدید نقصان پہونچا۔ اور اسی کے ساتھ لفظی تحقیق کا یہ مبارک نتیجہ ہوا کہ ایسے الفاظ اور ترکیبیں جو قدما کی یادگار اور اہل دہلی کی مایہ ناز تھیں خست ہو گئیں۔ اب لوگ شاعری کے صحیح جذبات اور اُن کے مناسب الفاظ سے واقف ہو گئے۔ لکھنؤ کے طرز قدیم کے شیداؤں نے دیکھ لیا کہ اب اس جدید رنگ کے سامنے اُن کا رنگ نہیں جم سکتا مجبوراً اُنکو طرزِ دہلی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ چونکہ داغ کو مقبولیت عام حاصل ہو رہی تھی جیسا کہ ہم ابھی اوپر کہہ چکے ہیں۔ لہذا اُن کے معاصرین کو اسکے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ سبک کی پسند کا اتباع کرتے ہوئے دہی طرز اختیار کریں۔ چنانچہ امیر جو داغ کے بڑے حریف اور مد مقابل تھے اُن کو بھی اس رائے عامہ کے سامنے تسلیم ختم کرنا پڑا۔ اور اسی وجہ سے اُن کا دوسرا دیوان یعنی ”صنمخانیہ عشق“ داغ کے رنگ میں ہے گو کہ کہیں کہیں اپنے خاص رنگ میں بھی کہہ جاتے ہیں۔

اسی طرح اُنھوں نے ”جوہر انتخاب“ اور ”گوہر انتخاب“ ایک تیسرا اور دوسرا خواجہ میر درد کے رنگ میں لکرا اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ دلی کے رنگ کو لکھنؤ پر ترجیح دیتے ہیں شاگردان امیر علی مخصوص ریاض جلیل۔ اور حفیظ نے ایک قدم اور بڑھایا بلکہ ان کے اکثر اشعار تو ایسے ہیں جو داغ اور شاگردان داغ کے کلام سے علیحدہ نہیں کیے جاسکتے یہی حال جلال کا بھی سمجھنا چاہیے۔ جلال رشک اور برق کے شاگرد تھے اور ان کی نشوونما بالکل لکھنؤ کے طرز پر ہوئی تھی مگر تعجب ہے کہ اُنھوں نے بھی اس رنگ کو چھوڑ کر دلی کا رنگ اختیار کیا چنانچہ ان کا ایک دیوان بالکل اُسی رنگ کا ہے۔ اور ہمیں اُنھوں نے تیسری بہت پیروی کی ہے۔ مگر ہمارے اس لکھنے سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ امیر و جلال بالکل اپنے رنگ کو بھول گئے تھے۔ البتہ ایک بڑی حد تک اُنکی پیروی کرتے تھے۔ ہمارے خیال میں قدیم رنگ کا خاتمہ اُس وقت ہوا جبکہ انجمن معیار لکھنؤ میں قائم ہوئی جس کے ماہواری رسالے اور اُنکی تحقیقات نے طرزِ قدیم کو لوگوں کے دل سے محو کر دیا۔

موجودہ فرمانرواے راجپور موجودہ فرمانرواے راجپور یعنی ہنر مانس نواب سید علی خان صاحب بہادر جمیع القاب ایک نہایت روشن خیال تعلیم یافتہ اور مثل اپنے سلاف کرام کے نہایت اعلیٰ درجہ کے شاعر اور سخن فہم اور شعراء کے مربی اور سرپرست ہیں۔ ان کے زمانہ میں بھی شعراء اور ہر قسم کے بالکالوں کا راجپور میں مجمع رہتا ہے اور یہ لوگ ہمیشہ ان کے جو در و سخا سے بہرہ یاب ہوتے رہتے ہیں۔ اس زمانہ کی تمام قومی درگاہیں اور مفید تحریریں ان کے فیوضِ نابتناہی سے فیضیاب ہوتی رہتی ہیں۔



امیر مینائی سلسلہ ۱۲

انفایت سلسلہ ۱۲

منشی امیر احمد مینائی کو امیر تخلص خلف مولوی کرم محمد سلسلہ ۱۲ میں
 بعد نصیر الدین حمید رکھنوی میں پیدا ہوئے حضرت مخدوم شاہ مینا
 کے جن کا مزار لکھنؤ میں مرجع خاص و عام ہے خاندان میں ہیں اسی تعلق سے مینائی
 کہلاتے ہیں۔ درسی کتابیں مفتی سعد اللہ مرحوم اور ان کے معاصر علمائے فرنگی محل سے
 پڑھی تھیں اور عربی و فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے منشی صاحب اپنی ذات سے
 بڑے منکسر المزاج صاحب زہد و تقویٰ اور صوفی مشرب بزرگ تھے۔ خاندان صابریہ
 چشتیہ کے سجادہ نشین حضرت امیر شاہ صاحب سے بیعت رکھتے تھے۔ طب جعفر
 نجوم وغیرہ سے بھی واقف تھے۔ نہایت ذکی و طباع محنتی اور جفاکش تھے۔
 اسی وجہ سے اپنے معاصروں میں حسب طبع اپنی وضع داری اور سادگی کی وجہ سے
 مشہور تھے اسی طرح اپنے علم و فضل اور کمال و قابلیت میں بھی ان سے ممتاز تھے۔
 شعر و سخن کا شوق بچپن ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس فن میں آپ کو منشی مظفر علی
 امیر سے تلمذ تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہمہ دانی اور طبیعت کی روانی سے اپنے
 استاد سے بھی بڑھ گئے۔ ان کے وقت میں تمام فضائے لکھنؤ شاعری سے بھری ہوئی تھی
 شاگردان آتش و ناسخ کے مناقشے روزمرہ کے مشاعرے جس میں شہر کے اساتذہ مثل
 صبا و خلیل درند و سحر وغیرہ کے شرکت کرتے تھے مراشی کے زور و شور اور انیس و دس
 کے معرکے غرض کہ ان تمام چیزوں نے ہونا شاعر کی منجلی طبیعت پر بہت بڑا اثر ڈالا
 جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کی محنت و جان کا ہی میں ایسی شوق سخن بہم
 پہنچائی اور اتنی شہرت حاصل کی کہ سلسلہ ۱۲ میں ان کے اشعار کا تذکرہ سلطان عالم
 واجد علی شاہ کے دربار میں ہوا اور ان کو بلا کر ان کا کلام سنا گیا اور حسب حکم سلطانی

دو کتابیں ”ارشادِ سلطان“ اور ”ہدایتِ سلطان“ انھوں نے تصنیف کیں۔
 جن کے صلہ میں خلعت فاخرہ اور انعام عطا ہوا۔ اُسی وقت سے اُنکی شہرت کا زمانہ شروع
 ہوا جو برابر ترقی کرتا گیا۔ مگر الحاقِ اودھ اور غدر کی وجہ سے شعرا کے تمام
 حوصلے پست ہو گئے۔ اور وہ ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ بعد غدر امیر نے دوستوں کے
 کہنے سے سرکاری ملازمت کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر جب عہدِ صدرِ مہنی کیواسطے
 صاحبِ کج کو درخواست دینے کے متعلق اُن سے کہا گیا تو اُن کو یہ بات اچھی معلوم
 ہوئی اور ملازمت کا خیال ہی ترک کر دیا۔ تھوڑے روز کی بیکاری اور خانہ نشینی کے بعد
 فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں والی ریاست رامپور نے اُن کو طلب کیا جو شعرا
 لکھنؤ دہلی کے اُس وقت بڑے سرپرست تھے۔ نواب موصوف کے انتقال کے بعد
 خلد اشیاں نواب کلب علی خاں بہادر کا عہدِ حکومت آیا جس میں اردو شاعری کو اور بھی
 فروغ ہوا۔ ان سخن فہم اور ژبہ ناسل کیس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تمام ہندوستان کے نامی
 و گرامی شعرا اور باکمالوں کو بلا کر اپنے دامنِ دولت کے سایے میں لے لیا تھا۔ غرض کہ
 یہ زمانہ یعنی امیر کے قیامِ رامپور کا زمانہ ان کی شاعری اور اقبال دونوں کے عروج
 کا زمانہ تھا۔ اسی میں اُن کو نواب کی اُستادی کا فخر حاصل ہوا۔ رام پور میں اُن کو
 بڑی عزت حاصل تھی اور وہ ایک بڑی ادبی اور سوشل ہستی سمجھے جاتے تھے۔
 تنخواہ بھی معقول تھی جسکی وجہ سے بڑے مزے سے آزادانہ زندگی بسر کرتے اور
 شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔ غرض کہ ۴۳۔ برسِ امپور
 میں نہایت عزت و آبرو سے بسر کر کے جس میں اکثر مرتبہ لکھنؤ بھی آنا ہوا تھا بالآخر
 حیدرآباد کو روانہ ہوئے۔ وہاں جانے کی تقریب اس طرح ہوئی تھی کہ شاعر میں

جب نظام حیدر آباد کلکتہ سے واپس آ رہے تھے تو راستہ میں بنارس میں بھی ٹھہرے
امیر نے ایک قصیدہ ان کی تعریف میں کہکر مقام بنارس انکی حضور میں پیش کیا تھا
حضور نظام کو وہ بہت پسند آیا اور امیر سے حیدر آباد آنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ
نسلۃ میں وہ عازم حیدر آباد ہوئے۔ یہاں تھوڑے دن قیام کیا تھا کہ بیمار ہو گئے
اور تتر بتر دس دس مہینے کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت کی علالت کے زمانہ میں
داغ اور پٹت رتن ناتھ سرشار انکی عیادت کو جاتے تھے اور مہاراجہ کرشن پرشاد بھی
اکثر قدم رنجہ فرماتے تھے جیسا کہ منشی صاحب کی اس رباعی سے ظاہر ہوتا ہے۔

رباعی

ہے آپ کا اخلاق جو ہمدرد مرا رشک دم عیسیٰ ہے دم سرد مرا
فرماتے ہیں ہر روز عیادت میری دریاں مرے حق میں ہو گیا درد مرا
داغ نے دفات کی یہ تاریخ کھی

دلے ویلا چل بسا دنیا سے وہ جو مرا ہم فن تھا میرا ہم صغیر
مصطفیٰ آباد سے آیا دکن یہ سفر تھا اُس مسافر کا اخیر
کیا کہوں کیا کیا ہوئیں بیماریاں کیا لکھوں تفصیل امراض کثیر
مبتلاے حدت صغیرا و تپ مورد آزار اسہال و زحیر
گو بظاہر تھا امیر احمد لقب در حقیقت باطناً پا یا فقیر
شاہ مینا سے ہے نسلی سلسلہ شاعری میں خاص تلمیذ اسیر

ہے دعا بھی داغ کی تاریخ بھی

قصر عالی پاسے جنت میں آمیر

تصانیف امیر بہت پر گوشاعر تھے اُن کی بعض نشر کی کتابیں اور ایک اردو دیوان موسوم بہ "غیرت بہارستان" سنا جاتا ہے کہ زمانہ غدر میں تلف ہو گئے۔ پھر دوسری آفت یہ آئی کہ ۱۹۵۷ء میں اُن کے مکان میں آگ لگ گئی جس میں انکی اکثر تصانیف اور قیمتی کتابیں جل کر خاک ہو گئیں۔ موجودہ تصانیف میں جنکی فهرست ذیل میں دی جاتی ہے اُن کے دو دیوان عاشقانہ یعنی "مرآۃ الغیب" اور "صنمخانیہ"۔ اور ایک نقدیہ اشعار میں موسوم بہ "محمد خاتم النبیین" اور نیز "امیر اللغات" نہایت قابل قدر اور مشہور و معروف تصانیف ہیں۔ انکی تصانیف ترتیب وار حسب ذیل ہیں :-

- (۱) - ارشاد الشلطان - (۲) ہدایت الشلطان -
- (۳) - غیرت بہارستان - اسمیں وہ غزلیں ہیں جو قبل غدر مشاعروں میں پڑھی تھیں۔ نیز چند قصائد درج واجد علی شاہ۔ یہ کلام غدر میں تلف ہو گیا۔
- (۴) نور تجلی - (۵) ابر کرم۔ یہ دونوں تنویاں بھی غدر سے پہلے لکھنؤ میں لکھی تھیں۔
- (۶) ذکر شاہ انبیا بصوت مسدس لود شریف
- (۷) صبح ادل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے بیان میں -
- (۸) شام ابد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بیان میں -
- (۹) لیلۃ القدر معراج کے حال میں (۱۰) مجموعہ واسوخت چھ واسوختوں کا مجموعہ جن کے تاریخی نام حسب ذیل ہیں اور سنہ تصنیف ۱۳۵۷ھ ہے۔ یعنی "ہنگام خطر"، "واسوخت اردو"، "خسکایات رخس"، "صفیۃ تشبہ"، "حسد غبار"، "غبار طبع"۔ اس مسدس کو ایک عمدہ دیباچہ کے ساتھ "میناے سخن" کے نام سے دائرہ ادبیہ لکھنؤ نے چھاپا ہے۔ (۱۱) محمد خاتم النبیین۔ مؤلفہ ۱۳۵۹ھ۔



اسیر میناٹی



دانش دهلوی

نعتیہ دیوان ہے۔ (۱۲) انتخاب یادگار۔ رام پور کے شعراء اردو کا تذکرہ ہے جو نواب کلب علی خاں بہادر کے حکم سے سنہ ۱۱۹۷ھ میں لکھا تھا جیسا کہ تاریخی نام سے ظاہر ہوتا ہے (۱۳) خیابان فریش نیشن میں لود شریف ہے (۱۴) مرآۃ الغیب۔ اردو غزلوں اور قصائد کا پہلا دیوان ہے۔

(۱۵) صنم خانہ عشق مطبوعہ سنہ ۱۱۹۷ھ (۱۶) جوہر انتخاب (۱۷) گوہر انتخاب مؤلفہ سنہ ۱۱۹۷ھ۔ یہ دونوں میر تقی میر اور خواجہ میر درد کے رنگ میں کچھ غزلیں لکھی گئی ہیں۔ (۱۸) تیسرا دیوان جو ہنوز غیر مطبوع ہے۔ اس میں چند قصائد اور رباعیات شامل ہیں۔ (۱۹) سرمۂ بصیرت۔ جو ایسے عربی و فارسی الفاظ کی ایک فرہنگ ہے جو اردو میں غلط استعمال ہوتے ہیں اس میں ان کا صحیح طریقہ استعمال معلوم کیا گیا ہے۔ (۲۰) بہار ہند۔ ایک مختصر لغت اردو محاورات و الفاظ کی جسکو امیر اللغات کا نقش اول کہنا چاہیے۔ (۲۱) امیر اللغات جس کو منشی صاحب

کاسب سے بڑا کا نام سمجھنا چاہیے مگر افسوس ہے کہ وہ نام تمام مدہ گئی صرف دو جلدیں الف محدودہ اور الف مقصورہ کی اب تک تیار ہوئی ہیں۔ اس کتاب میں قابل مصنف کے تبحر اور جامعیت اور نیز انکی سجدہ کدو کاوش اور محنت و جان نثاری کا پتہ چلتا ہے۔ اسکی دو جلدیں چھپ گئی ہیں۔ تیسری بھی تیار تھی مگر ضائع نہ ہو سکی۔ ابتداءً آٹھ جلدوں میں اس کے نکالنے کا ارادہ تھا۔ نواب کلب علی خاں بہادر کے عہد میں شروع ہوئی تھی اور اس کے بڑے سرپرست ہزار سرالفرڈ لائل لفٹنٹ گورنر مالک متحدہ تھے جنرل عظیم الدین خاں نائب پریسیڈنٹ کونسل آف بھینسی رامپور نے بھی اسکی سرپرستی کی تھی منشی صاحب نے اپنے خطوط میں اس کتاب کا کثرت ذکر کیا ہے

(۲۲) خطوط اور متفرق چیزیں نظم و شریں۔ منشی صاحب کے شاگرد اور دوست بہت کثرت سے تھے اور منشی صاحب کو خط لکھنے کا بہت شوق تھا لہذا ان کا مجموعہ خطوط بہت دھپپ ہے اس کو ان کے شاگرد رشید مولوی حسن اسد خاں ثاقب نے ایک نہایت مفید اور دھپپ دیا چہ کے ساتھ شایع کیا ہے۔ ان خطوط سے منشی صاحب کے عادات و اطوار اور کیر کڑ پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے اور اگر کوئی لکھنا چاہے تو انکی سونجھری کا بہت عمدہ مواد ان سے فراہم ہو سکتا ہے۔ نیز ان میں فن نظم اور زبان کے متعلق اکثر مشکل مسائل کو حل کیا ہے۔ رسالہ اسرار نظم اور ”زاد الامیر“ اور ”مناجات“ وغیرہ کو ان کے متفرق تصانیف میں سمجھنا چاہیے۔

شاگرد منشی صاحب کے سیکڑوں شاگرد تھے جنہیں سے چند کے نام یہ ہیں۔
 ناظم۔ نواب۔ صفدر۔ جاہ۔ جلیل۔ ریاض۔ برہم۔ زاہد۔ کوثر خیر آبادی۔
 وسیم۔ حیران۔ محسن کا کوردی۔ عابد۔ رضا۔ دل۔ قرار۔ ثاقب۔ صغیر مضطر۔
 سرشار۔ حفیظ جونپوری۔ آہ۔ اختر۔ قمر۔ ان میں ریاض۔ جلیل مضطر اور حفیظ بہت مشہور ہیں۔

امیر کی شاعری امیر نہ صرف ایک طباع شاعر بلکہ ایک متبحر عالم بھی تھے۔ اور ادبی دنیا میں انکی شہرت انھیں دونوں باتوں پر مبنی ہے۔ انکا پہلا مطبوعہ دیوان مرآۃ الغیب کسی قدر ناہموار ہے کیونکہ ابتدائی کلام کے ساتھ جو بھڑا اور بفرہ ہے بعد کی غزلیں جن سے مشافی اور سختگی معلوم ہوتی ہے ملی جلی ہیں ان کے ابتدائی کلام میں وہ سب عیوب موجود ہیں جو ناسخ کے رنگ کے لئے مخصوص ہیں یعنی جاوید بجا

رعایت لفظی۔ ابتداء کی ایک ریختہ شہین۔ عورتوں کا لباس اور سامان زینت
مثلاً انگیا کرتی۔ اور کنگھی چوٹی وغیرہ غرض کہ ہمیں کوئی چیز نئی اور اور کینل نہیں ہے
بلکہ وہی پرانے فرسودہ مضامین ہیں جو الٹ پلٹ کر رنگین عبارت میں بیان کیے گئے
ہیں۔ البتہ اُن کا دوسرا دیوان ”صنعا نہ عشق“ اُن کے بڑے حریف اور معاصر
داغ کے طرز پر ہے۔ اور اس میں اعلیٰ تخیل سلاست و روانی اور دلکش عاشقانہ
ترکیبیں بکثرت موجود ہیں۔ اُن کے نعتیہ اشعار گو کہ قدیمی مقررہ طرز میں ہیں مگر اکثر
اعلیٰ تخیل۔ فصاحت و بلاغت اور جوش اعتقاد کے بہترین نمونے ہیں غرض کہ
منشی صاحب کو مختلف اصناف سخن۔ غزل۔ قصیدہ۔ رباعی۔ مخمس۔ مسمون وغیرہ
پر عبور تام حاصل ہے اُن کا کلام اعلیٰ خیالات فصاحت و بلاغت۔ روانی و
سلاست توازن الفاظ اور ایجاز کے لئے مشہور ہے۔ شعور و انداز و صنائعِ بدیع
لفظی کی کثرت سے اُن کا کلام پاک ہے۔ ان کے اشعار میں شگفتگی، نزاکت خیال
بلند پروازی۔ شیرینی۔ زور اور قادر الکلامی بدرجہ حسن موجود ہے۔ تصوف کی
چاشنی بھی کہیں کہیں جلوہ گر ہے جو مشرقی شاعری کی جان اور ادب آموزی کی
خاص پہچان ہے۔ اس قسم کے خیالات کسی ایک شاعر کی ملک خاص نہیں ہوتے
بلکہ مختلف لوگوں کے کلام میں بہ تبدیل الفاظ پائے جاتے ہیں۔

منشی صاحب ایک پیکر متانت اور مجسم تہذیب تھے۔ شرم

اخلاق و عادات

وحیا ان کے اخلاق کا خاص جوہر تھی۔ طبیعت نہایت محبت والی پائی
تھی راستباز، ہمدردی سے بھرے ہوئے نہایت متقی و پرہیزگار اور سادہ مزاج
واقع ہوئے تھے کبھی کسی لفظ فحش سے زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ اور نہ کسی ہجو لکھی

سچے پاکباز۔ صوفی مشرب احکام قرآنی کے پورے عامل تھے۔ اسی وجہ سے اُنکے تقدس اور سیرائی کی شہرت لوگوں میں اُسی قدر تھی جس طرح اُن کے علم و فضل اور کمالات شاعری کی مزاج میں انکسار اور تواضع اس قدر تھی کہ اپنے معاصر حریفوں علی الخصوص داغ سے کبھی مسابقت کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ تمام اپنے ہم عصروں سے نہایت خلوص اور محبت کا برتاؤ رکھتے تھے۔ ادبی مسائل کا جواب اُسے پوچھے جاتے تھے نہایت آزادی سے جواب دیتے تھے۔ اور کسی شخص یا جماعت کی پاسداری کبھی نہیں کرتے تھے اپنے بعد چار بیٹے چھوڑے۔ قمر۔ آرزو۔ ضمیر۔ اختر۔ جو خدمات زبان کی منشی صاحب نے انجام دیں اُسکا ذکر ہم امیر اللغات کے سلسلہ میں اوپر کر آئے ہیں۔ منشی صاحب ایک بہت قابل اور طباع شاعر تھے۔ اور اُن کے اکثر شعرا زبان زد خلافت ہیں۔ اُن کا مرتبہ شعر اے اردو میں بہت بلند ہے۔

چند اشعار بطور نمونہ

چند اشعار بطور نمونہ یہاں لکھے جاتے ہیں۔ ۵

قریب ہے یار روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر

جو چُپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

(اس شعر کو مسٹر حبٹس محمود نے اپنے ایک فیصلے میں بطور سند کے لکھا تھا)

اے روح کیا بدن میں پڑی ہے بدن کو چھوڑ

میلا بہت ہوا ہے اب اس پیر مہن کو چھوڑ

سیدھی نگاہ میں ہیں تری تیر کے خواص

ترکش میں تیر میان میں شمشیر بے قرار

کہتا ہوں شعر سن کے کوئی واہ کوئی آہ

کچھ سیر کے مجھ میں ہیں کچھ میر کے خواص

کیا یہ شوق نے اندھا مجھے نہ سوچھا کچھ
وہ مزایا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب
جو نگاہ کی جتنی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی
ایک دل ہدم مرے پہلو سے کیا جاتا رہا
کھو گیا دل کھو گیا رہتا تو کیا ہوتا امیر
موقوف جرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا
صورت تری دکھا کے کہو نگاہ یہ روز حشر
بلا جب وہ کھلا تب یہ معما
کیا کرتے تھے اپنی جستجو ہم

جدا ہے دختِ زر کا نام ہر صحبت میں اے ساقی

پری ہے میکشوں میں عور ہے پرہیزگاروں میں

لا کر خاک میں بھی ہائے شرم اُن کی نہیں جاتی :-

نگہِ نیچی کیے وہ سامنے مدفن کے بیٹھے ہیں

نیچاں کر کے مجھے سر پہ کھڑے ہیں چپکے

ہر بات میں لذت ہر اگر دل میں مزا ہو

آفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو

اب ہم ہیں خفا تم سے کہ تم ہم سے خفا ہو

آئے جو مری لاش پہ وہ طنز سے بولے

وہ شکل نہ سامنے سے سر کی

آنکھیں کھولیں بھی بند بھی کیں

ہر وار پہ کہتا ہے کہ ظالم کہیں مگر بھی

کیا تنگ ہے جلا دمری سختی جاں سے

وہ بھی عاشق کی التجا نہ سُنے

وہ قیمت جو سب کی سُننا ہے

ہوش و خرد و تاب تو ان جاچکے کب کے

باتی ہر امیر تو فقط جان کا جانا

خودی سے بخودی میں جو شوق حق پرستی ہر
 بڑھاپا آہ رسا اب کنگوے پر عرش کے پہنچی
 نہ گھبراے دل امانہ اب منزل قریب آئی
 نہ شاخ گل ہی اونچی ہے نہ دیوارِ چین بلبل
 وصل ہو جائے ہمیں حشر میں کیا رکھا ہے
 ہم چلے دیر سے کعبہ کو تو وہ بُت بولا
 انگور میں تھی یہ نئے پانی کی چار بوندیں
 خود ترے ہونٹ یہ کہتے ہیں کہ بوسہ لیلو
 تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ بھی کچھ مل جائے
 نہ چوک وقت کو پا کر کہہ دے وہ معشوق

داغ دہلوی سلسلہء
 لغایت سلسلہء
 نواب مرزا خان داغ سلسلہء مطابق سلسلہ ہجری میں
 دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب شمس الدین خاں
 نواب ضیاء الدین خاں والی لوہارو کے بھائی تھے۔ ان کا انتقال سلسلہ ۱۲۸۷ھ میں ہوا
 جبکہ داغ تقریباً چھ سات برس کے ہوں گے۔ دادا کا نام نواب احمد حسین خاں تھا
 والد کے انتقال کے بعد داغ کی ماں نے مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخر و بہادر خلف
 بہادر شاہ کے ساتھ نکاح کر لیا اور شوکت محل کا خطاب پایا۔ ان کے ساتھ یہ بھی
 لال قلعے ہوئے جہاں انکی تعلیم و تربیت ہوئی۔ قلعہ میں شعر و سخن کا ہر چاہت تھا،
 داغ کی مغلی طبیعت پر اپنے گرد و پیش کا بڑا اثر ہوا اور یہ بھی شاعری کی مقناطیسی قوت
 کے اثر سے متاثر ہو گئے۔ چونکہ بادشاہ اور مرزا فخر و دونوں ذوق کے شاگرد تھے یہ بھی

اُستاد ذوق کے شاگرد ہو گئے اور ان کے ساتھ مشاعروں میں جاتے اور دادِ سخن لیتے رہے۔ ابتدا میں فارسی اور عربی کی تعلیم بھی کچھ حاصل کی تھی چنانچہ فارسی مولوی غیاث الدین مؤلف غیاث اللغات اور مولوی احمد حسین سے پڑھتے تھے۔ خوشنویسی شہسواری۔ بانک پٹے وغیرہ کا بھی بہت شوق تھا۔ اور یہ فنوں اُنھوں نے باقاعدہ اُستادوں سے حاصل کیے تھے شعر کا شوق ان کو جلتی تھا۔ اور طبیعت چونکہ مناسب پائی تھی اس لئے تھوڑے ہی دنوں کی مشق سے بختہ کار شاعر ہو گئے بڑھاپے میں مرزا فخر نے وفات پائی مرنے کا مرزا ان کے واسطے کیا کم مصیبت تھی کہ دوسرے ہی سال یعنی سہ ماہی کے عالم آشوب ہنگامے نے اُن کے رہے سے حواس اور کھو دیے اور وہ بھی ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی طرح دلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ جب کسی قدر ہنگامہ فرو ہوا تو معہ اہل خاندان کے رام پور گئے جہاں نواب یوسف علیخان بہادر جو اُن کو پیشتر سے جانتے تھے اُسوقت سر پر آئے حکومت تھے۔ داغ پہلی مرتبہ ولیعہد ریاست نواب کلب علیخان بہادر کے صاحب مقرر ہوئے اور داروغہ اصمطل کی خدمت ان کے سپرد ہوئی۔ اس خدمت کو اُنھوں نے نہایت قابلیت اور محنت کے ساتھ انجام دیا تھا اور اسوقت سے اُن کو گھوڑوں اور شہسواری سے دلچسپی ہو گئی تھی داغ نے اپنی عمر کے ۲۴ سال نواب کلب علیخان بہادر کی ملازمت میں رامپور میں گزارے۔ جہاں یہ نہایت عزت و آبرو عیش و آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔ رام پور میں ان کو اس قدر آرام تھا کہ اُس کو آرام پور کہتے تھے۔ نواب کی ہمراہی میں حج و زیارت سے بھی مشرف ہوئے تھے۔ اُنھوں نے دلی۔ لکھنؤ۔ ٹپنہ اور کلکتہ کا بھی سفر کیا۔ جہاں اُنکی بڑی قدر ہوئی اور اُن کے واسطے مشاعرے منعقد

گئے، کلکتہ میں تین چار ماہ قیام کیا اور وہاں کے مشاعروں میں برابر شرکت کی۔
 اپنے قیام کلکتہ کا ذکر انھوں نے اپنی شاعری ”فریاد داغ“ میں کیا ہے۔ شاعری میں
 نواب کلب علی خاں کی بے ہنگام موت سے انکی تمام آرزوؤں اور امیدوں پر پانی پھر گیا
 ان کو بھی بعض اور لوگوں کی طرح جن کو اس مصیبت عظمیٰ سے نقصان پہنچا تھا رامپور
 چھوڑنا پڑا چنانچہ وہ دلی چلے گئے اور وہاں کچھ دن قیام کر کے نیکلے اور راستے میں
 مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے سلسلہء مطابقت مشائخہ میں حیدر آباد پہنچے۔
 راستے میں لاہور، امرتسر، کشن کوٹ، اگرہ، علی گڑھ، متھرا، جے پور اور ریاست
 سنگرول واقع کاٹھیاواڑ میں ٹھہرتے ہوئے اور تھوڑے تھوڑے دن قیام کرتے ہوئے
 گئے تھے اور ان سب مقامات میں میسویں آدمی ان کے شاگرد ہوئے۔ پہلی مرتبہ علی حضرت
 حضور نظام سے توسط راجہ گردھاری پرشا و تخلص بن باقی ملاقات ہوئی تھی مگر چونکہ کوئی
 صورت حسب مراد اُس وقت نہیں نکلی لہذا دلی واپس آئے مگر تھوڑے ہی عرصہ
 کے بعد مشائخہ میں سرسماں جاہ ہمدانی کی طلبی اور حکم سے پھر حیدر آباد گئے اور انکی
 مرتبہ قسمت نے یادری کی علی حضرت (میر محبوب علی خاں) کے استاد مقرر ہوئے اور
 بیش قرار تنخواہ اور انعام و اکرام کے علاوہ ”مقرب السلطان بلبل ہندوستان
 جہاں استاد ناظم یار جنگ دیرالدولہ فصیح الملک“ کا معزز خطاب عنایت ہوا۔ نظام
 ہے کہ ایسی عزت افزائی کے بعد داغ کی عمر حیدر آباد میں نہایت کامیابی اور خوشی
 و خوشی سے گزرنے لگی۔ ان کی تنخواہ پہلے ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے تھے
 مگر چند روز کے بعد ایک ہزار اور پھر پندرہ سو روپیہ ماہوار مقرر ہو گئے، جو ہمیشہ با
 صلے اور انعام و اکرام تقریبوں کے موقع پر یا قصائد وغیرہ کے صلے میں ملتے تھے

وہ اس کے علاوہ تھے حیدر آباد میں داغ کو دنیاوی ثروت کا عروج حاصل ہوا۔ ہمارے خیال میں کسی اردو شاعر کی کسی رئیس کے دربار میں نہ اس قدر عزت اور قدر و منزلت کی گئی اور نہ اتنی بیش قرار تنخواہ کبھی کسی کو ملی ہوگی۔ یہ ترقی ایسی نہ تھی کہ جو حاسدوں کی آنکھوں میں نہ کھٹکتی چند لوگوں نے اعتراضات کرنا شروع کیے۔ ان میں ایک ڈاکٹر امل حیدر آبادی بھی تھے۔ تھوڑے مقابلے کے بعد مخالفین کے منہ بند ہو گئے۔ داغ تقریباً اٹھارہ برس حیدر آباد میں رہے جہاں حضور نظام سے لیکر تمام امراء و رؤسا کی عزت کرتے تھے ان کی وجہ سے بازار شاعری جو شاہ نصیر کی وفات کے بعد کسی قدر سرد پڑ گیا تھا، پھر گرم ہو گیا۔ سیکڑوں شاگردان کے حیدر آباد میں ہو گئے اور شاعرے کثرت سے ہونے لگے۔ داغ کے فروغ اور ترقی کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ریاست کے سیاسیات سے بالکل الگ رہے اور نہ کسی پارٹی یا جماعت کی سازشوں میں کبھی شریک ہوئے۔ اسی وجہ سے وہ وہاں بہت ہرول عزیز اور نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے آخری زمانہ قیام حیدر آباد میں آمیر مینائی بھی رامپور سے آگئے تھے۔ اور ان ہی کے ساتھ رہتے تھے مگر قبل اسکے کہ حضور نظام کی حضوری حاصل ہو انتقال کر گئے۔ داغ بعارضہ فالج سنہ ۱۲۹۱ھ میں حیدر آباد میں مرے اور وہیں دفن ہوئے۔

عام عادات و اخلاق [نواب مرزا خاں داغ خوش طبع، رنگین مزاج، بذلہ سبج اور ہشاش بشاش تھے۔ مزاج میں خود داری تھی۔ خوشامد اور تملق سے دور رہتے تھے۔ کثیر الاحباب تھے اور اپنے سب احباب کے ساتھ نہایت شفقت و محبت سے پیش آتے تھے اپنے معاصر مثلاً جلال، آمیر تسلیم، ظہیر وغیرہ سے ان کے تعلقات

بہت مخلصانہ اور دوستانہ تھے۔ رقابت پیشہ کی وجہ سے کبھی دوستی اور ملاقات میں فرق نہیں آیا۔ انھوں نے کبھی کسی کی ہجو نہیں کہی اور نہ کبھی اپنے مخالفین اور معترضین سے لڑے جھگڑے البتہ معاصرین سے کبھی کبھی شاعرانہ نوک جھوک رہتی تھی۔ بڑے رسا اور اسرار ذرائع ترقی سے واقف تھے اور یہی بڑی وجہ دراز نظر میں اُن کی ترقی کی تھی۔

داغ کی شاعری داغ اپنے زمانہ کے بہت مشہور شاعر تھے۔ اُن کی زبان میں فصاحت و سادگی اور بیان میں ایک خاص قسم کی شوخی اور بانگین ہے جسکی وجہ سے وہ اپنے معاصرین امیر، جمال، تسلیم وغیرہ سے زیادہ مشہور ہوئے۔ اُن کا طرز عام پسند اور بہت دلچسپ ہے۔ اسی وجہ سے اُن کے متبعین کثرت سے ہیں مشہور ہے کہ اُن کے شاگردوں کی تعداد پندرہ سو سے متجاوز ہے۔ یہی شہرت و عزت اور شاگردوں کی کثرت اُن کے جوہر ذاتی اور شاعرانہ قابلیت پر دال ہے۔ داغ نے ایک باضابطہ دفتر کھول دیا تھا جس کے کارکن بعض اُن کے شاگرد اور اکثر تنخواہ دار منشی بھی تھے۔ اس دفتر میں اصلاح کلام کا کام جاری تھا۔

تصانیف چار دیوان اُن سے یادگار ہیں۔ گلزار داغ۔ آفتاب داغ، مہتاب داغ، یادگار داغ۔ آخر الذکر یعنی یادگار داغ کا ایک ضمیمہ بھی ہے اور ضمیمہ وصل دیوان دونوں انکی وفات کے بعد شائع ہوئے تھے۔ ایک مثنوی موسوم بہ فریاد داغ بھی لکھی ہے اُن کے علاوہ چند تصانیف حضور نظام اور نواب صاحب رامپور کی تعریف میں، ایک پُر جوش شہر آشوب دلی کی تباہی پر اور چند قطعات و رباعیات بھی اُن سے یادگار ہیں۔ ”گلزار داغ“ اور ”آفتاب داغ“ دونوں رامپور میں چھپے تھے اور ان میں زیادہ تر وہ

غزلیں ہیں جو رام پور کے مشاعروں میں امیر مینائی اور تسلیم و جلال وغیرہ کی ہمطرحی
 میں کہی گئی ہیں۔ اس زمانہ کے کلام میں انکی بے انتہا شاعری اور نیرٹری محنت و جانفشانی
 معلوم ہوتی ہے۔ مہتاب داغ اور یادگار داغ دکن کی تصنیف ہیں ان میں بھی کلام
 کی روانی اور فصاحت جو ان کا خاص انداز ہے، خاص طور پر قابل تعریف ہے۔ مگر یادگار
 جوانی کی تصنیف ہے۔ جب جذبات عشق و محبت محض خیالی نہ تھے بلکہ ذاتی تجربہ کا
 آئینہ تھے۔ آفتاب داغ بھی اسی زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جس میں واردات قلبیہ و جذبات
 حقیقی کی اصل تصویریں شاندار الفاظ میں کھینچی گئی ہیں۔ مگر برخلاف ان کے مہتاب داغ
 اس زمانہ کی تصنیف ہے جبکہ حرارت عشق و جوانی دھیمی اور ملکی ہو کر ضیاء مہتاب کے
 مانند نہایت خوشگوار ہو گئی ہے اور شباب کی ولولہ انگیز باریاں اور ہنگامہ آرائیاں رخصت
 ہو کر ان کی جگہ کھولت کی نچتہ کاری اور سکون و اطمینان نے لے لی ہے۔ مثنوی
 فریاد داغ میں اپنے عشق کا حال جو کلکتے کی ایک مشہور رنڈی مٹنی بانی تاجا کے ساتھ
 ان کو بٹھا اور جو رامپور کا میلہ بنیظیر دیکھنے کی غرض سے آئی تھی ایک شاعرانہ رنگ
 میں بیان کیا ہے۔ اس مثنوی کے بہت سے اشعار نہایت اعلیٰ درجہ کے ہیں اور
 سادگی اور روانی و عمدگی انکی قابل داد ہے علی الخصوص عاشق کا معشوق کی تصویر سے
 مخاطب نہایت دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مگر بعض جگہ تعیش اور خراب جذبات
 کی تصویریں متانت اور تہذیب سے گری ہوئی ہیں۔ قصائد میں ان کا مرتبہ بہت کم
 ہے یعنی سودا اور ذوق وغیرہ سے تو کوئی نسبت ہی نہیں ہمارے نزدیک امیر مینائی
 کے قصائد کو بھی وہ نہیں پہنچتے ان میں کسی طرح کے بلند ضامین اور اعلیٰ تخیل نہیں ہیں
 غزل گوئی کا رنگ ان پر غالب ہے اور اکثر اشعار قصیدے کے نہیں بلکہ غزل کے

معلوم ہوتے ہیں اور مقررہ قواعد قصیدہ گوئی کے منافی ہیں۔ تشبیہ و استعارے میں بھی کسی قسم کی حدت نہیں پائی جاتی اور ان میں بھی وہی عاشقانہ رنگ جھلکتا ہے۔ انکی رباعیات کا بھی یہی حال ہے یعنی بجائے ادب و اخلاق وغیرہ سکھانے کے ان کے مضامین زیادہ تر عاشقانہ ہی ہیں البتہ تاریخیں بہت اچھی اور استادانہ کسی ہیں

طرز کلام داغ کی عظمت ان تین چیزوں پر موقوف ہے یعنی (۱) انکی شہرت عام (۲) ان کا طرز خاص (۳) وہ خدمات جو انھوں نے زبان کے ساتھ انجام دی ہیں داغ میٹھی سُری اور عاشقانہ شاعری کے مسلمہ الثبوت استاد ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سچیدہ اور گنجشک ترکیبوں اور موٹے موٹے غیر مانوس فارسی اور عربی الفاظ کو انھوں نے اپنے کلام میں جگہ نہیں دی اسی سے ان کا کلام تصنع اور تکلف سے خالی ہے۔ الفاظ نہایت سادہ اور معمولی ترکیبیں سیدھی سادی اور درست۔ بندش نہایت چست۔ شعر کی ظاہری زیب و زینت یعنی صنائع بدائع کی کثرت اور دراز کار تشبیہوں اوربالغہ اور حشو زد وائد سے بھی ان کا کلام پاک ہے۔ اشعار بالکل تلے نیچے زور دار اور موثر ہوتے ہیں۔ کلام میں زندگی اور چونچالی پائی جاتی ہے۔ ان کا کلام مختلف مضامین سے مملو اور غزل کے حسب قدر موضوع ہیں ان سب پر حاوی ہوتا ہے کہیں شوخ حاضر جوابی، کہیں ظریفانہ بذلہ سخی، کہیں کسی واعظ پر چوٹ کی ہے، کہیں کسی زاہد کی داڑھی کھسوٹی ہے، کسی جگہ معاملہ بندی میں نیاز عاشقانہ اور ناز معشوقانہ کے بے مثل مرتعے کھینچے ہیں کسی مقام پر ہجر کی حرمان نصیبیوں کا ذکر ہے کسی موقع پر قسیوں کی عیاریوں اور سازشوں کا بیان ہے غرض کہ اشعار کسی نہ کسی جذبہ انسانی کے سچے فوٹو ہیں اور چونکہ ان جذبات کا اظہار نہایت سلیس

اور عام فہم عبارت میں ہوتا ہے اس لیے وہ دلوں پر ہمیشہ تیر و نشتر کا کام دیتے ہیں۔ اُن کے اکثر اشعار میں جرأت کی معاملہ بندی اور زندگی صفائی ملی جلی معلوم ہوتی ہے اور خوبی محاورہ اور لطافت زبان اُس پر طرہ۔ اُن کا رنگ اُن کے زمانے میں اس قدر مقبول ہوا کہ سیکڑوں سپرو اور ناقل اُن کے پیدا ہو گئے یہاں تک کہ اُن کے بڑے حریف مقابل منشی امیر احمد مینائی نے بھی اپنے دوسرے دیوان میں زیادہ تر اُن ہی کا رنگ اختیار کیا۔

کلام پر اعتراض زیادتی شہرت بعض وقت الزام و اعتراض کا باعث ہوتی ہے۔ داغ پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ ارباب نشاط کے شاعر تھے اور اُن کے شعار میں سچ اور مخرب اخلاق ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بڑی زیادتی ہے اس وجہ سے کہ اُن کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں شعرا ایسے نکلیں گے جن میں خیالات نہایت پاک صاف اور بہت بلند ہیں۔ اُن کی ہر چیز کھوٹی نہیں ہے بلکہ اسی ذرا اندو دکلام میں سونے کے ریزے بھی بہت ہیں۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُن کے یہاں صلیت (اور نجی ملی) اور متانت بہت کم ہے۔ فلسفہ اُن کے کلام میں مطلق نہیں نہ کسی اعلیٰ خیال کی شرح و بسط ہے۔ فلسفہ حیات اور فلسفہ عشق سے وہ بہت کم تعلق رکھتے ہیں۔ جس عشق کا وہ بیان کرتے ہیں اُس میں بھی کوئی عظمت کوئی سچائی اور حقیقی حُسن کی جلوہ گری نہیں ہے۔ اُن کے معشوق اکثر معشوق بازاری ہیں جو اپنے حُسن اور ناز و انداز کو سر راہ لیکر بیٹھتے ہیں۔ جن کا بوس و کنار اور اختلاط مثل اشیاء بازاری کے خرید اور بیچا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کے بعض اشعار مہذبانوں کے سننے کے لائق نہیں ہوتے اور صرف ایسی محفلوں میں گائے جاسکتے ہیں جہاں مذاق و خوا

جمع ہوں اور ارباب نشاط کے جھگڑے ہوں ظاہر ہے کہ ایسے اشعار میں عشق و عاشقی کے
 صرف سطحی جذبات ہوتے ہیں اور ان سے قلب کے اندرونی پردے متاثر نہیں ہوتے
 اور نہ اُن کے سمجھنے میں جولانی خیال کا موقع ملتا ہے۔ داغ کے اشعار صرف ایسے
 عشق سے تعلق رکھتے ہیں جسکو خلوص اور روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ اُن میں
 میر کا ایسا درد و اثر ہے نہ غالب کی سہمی آفرینی و ناز کنیالی۔ اُنکی تشبیہات بھی
 نادار و رعلی نہیں بلکہ وہی معمولی اور پاپال تشبیہیں ہیں جسکو سننے سننے کان تھک گئے
 ہیں اُن میں جدت اور ندرت مطلق نہیں ان کی مثنوی (فریاد داغ) میں تو ایک
 معشوق بازاری کے عشق کا حال ہے جس میں کوئی لب "اکٹیل" مطلق نہیں۔
 مگر اب اس ہمہ وہ ایک لب مرتبہ شاعر ضرور ہیں اور اُن کی زبان کے ساتھ اس
 خدمت کی ضرورت قدر کرنا چاہیے کہ انھوں نے سخت اور مغلط الفاظ ترک کیے اور
 سیدھے سادے شیریں الفاظ اور محاورے اپنے کلام میں استعمال کیے جس سے کلام
 کی بیباختگی اور فصاحت اور بڑھ گئی۔ یہ بھی اُن کا کمال ہے کہ طویل اور مشکل جبریں
 سرے اور میٹھے الفاظ میں لکھیں چھپت اور برجستہ اور نہایت فصیح اور بے خشو و زوید
 اشعار نکالے غرض کہ انہی سب خوبیوں کی وجہ سے اور نیز اس وجہ سے کہ اُن کو اکثر
 مشہور و معروف لوگوں کی اُستادی کا فخر حاصل ہے ان کا مرتبہ شعرائے متاخرین
 میں بہت بلند ہے۔ تغزل میں داغ کی شاعری کا اعتراف سب نے کیا ہے۔
 حالی لکھتے ہیں ے

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
 نہ سنے گا کوئی لبیل کا ترانہ ہرگز

اقبال نے بھی ایک پرزور مرثیہ انکی نسبت لکھا ہے۔ اُن کے حرفین و معاصر
امیر مبنائی کا صحیح معنوں میں کوئی مد مقابل اگر ہے تو یہی ہیں۔

شاگرد شاگردوں کی فہرست بہت طولانی ہے جن میں سے چند نام جو بہت
مشہور ہیں یہاں لکھے جاتے ہیں :- اعلیٰ حضرت حضور نظام حیدر آباد دہلی لکھنؤ
نواب میر محبوب علی خاں متخلص بہ صنف۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال سیال دہلوی۔ تاجود دہلوی
آسن ہارہروی۔ تاجود دہلوی۔ نوح ناروی نسیم بھرتپوری۔ جگر مراد آبادی۔ آغا شاعر
دہلوی وغیرہم۔

امیر و داغ کا مقابلہ یہ مقابلہ بھی اسی قبیل سے سمجھنا چاہیے جیسا کہ میر و مرزا کا مقابلہ
اُن کے حالات میں لکھا گیا ہے۔ امیر اور داغ دونوں اپنے اپنے رنگ میں
مسلم الثبوت استاد مانے گئے ہیں۔ دونوں بزرگوار اپنے زمانہ کے بہت
بڑے غزال تھے اور اکثر ہر طرح غزلوں پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ دونوں نے ماشاء اللہ
بکثرت شاگرد پائے اور دونوں کا حلقہ احباب وسیع تھا اخلاق و عادات کے
اعتبار سے دونوں وسیع الاخلاق دوست پرست اور حلیم الطبع تھے۔ دونوں کی الطبع
اور ذہین اور شاعری کے دلدادہ تھے۔ داغ کو امیر پر اس معنی میں فوقیت ہے کہ
دنیاوی جاہ و جلال اور مرفہ الحالی کے اعتبار سے اپنے آخر زمانہ میں وہ اُن سے
بڑھ گئے۔ اسی کا نتیجہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اُن کو امیر سے زیادہ شہرت بھی
حاصل ہوئی۔ داغ کا کلام مطبوع عام و پسندیدہ انام ہے جس طرح اُس سے
عالم و فاضل اور شاعر محفوظ ہو سکتے ہیں اُسی طرح اُسکو بڑھکریا دوسرے سے سُکر
ایک عامی بھی اُس سے لطف اٹھاتا ہے۔ مگر صاحب ذوق جو قوت ممیزہ سے

کام لیتے ہیں اور جنکو داغ کے سطحی اور معمولی اشعار پسند نہیں آتے اُن کو امیر ہی کا کلام اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ انہیں متانت و تہذیب کے ساتھ بلند خیالی بھی ہے اور وہ ضروریات شعر یہ کو بھی پورا کرتا ہے مگر اصل یہ ہے جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ کلام کا فرق دراصل کلیم کا فرق ہے۔ خود شاعر کے مزاج ماحول اور افتاد طبیعت کو اس کے کلام میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ داغ ایک ٹٹے زہد دل زندہ مشرب شخص تھے اُن کا مزاج پارہ کی خاصیت رکھتا تھا پھر اُنکی نشوونما دلی کی شاعرانہ فضا میں ہوئی تھی۔ برخلاف اس کے منشی صاحب ایک مولوی منش تقدس باب بزرگ تھے لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں عرصہ تک رہے۔ دامن سلطنت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اُس عہد کے شعرے شاہی سے بھی کاڑھا دوستانہ رکھتے تھے اسیر اُن کے استاد اور برق، حبیب، بھر، قلق، وغیرہ اُنکے یار تھے پس اُن لوگوں کے اثر اور نیز اُن کے طرز سے وہ کیسے بچ سکتے تھے۔ وہ اُس زمانہ کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور یہی حالت اُن کی برابر رہی یہاں تک کہ قیام رامپور اور داغ وغیرہ کی صحبت نے اُن کا پُرانا رنگ ایک حد تک زائل کر دیا۔ منشی صاحب کا اوائل عمر کا جسدِ رکلام ہے وہ ناسخ اور شاگردانِ ناسخ کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ چنانچہ اُن کا پہلا دیوان ”مرآۃ الغیب“ اس دعوے کی بڑی دلیل ہے۔ انہیں اگر کہیں کہیں عمدہ اشعار ملتے ہیں تو اُن کے ساتھ ہی ساتھ رکیک و مبتذل خیالات بھدی اور بزمِ تشبیہیں، انگلیا کرتی، کنگھی چوٹی وغیرہ نامناسب رعایتِ لفظی کی بھی بھر مار ہے۔ دیوان مذکور اگرچہ لائقِ مصنف کی استادی اور قدرتِ کلام کا پتہ دیتا ہے مگر پھر بھی ناہمواری مندرجہ بالا سے مٹو ہے۔ داغ کا رنگ اگرچہ

دلی میں قائم ہوا مگر انھوں نے انہیں کچھ جدت پیدا کر کے اپنا ایک خاص طرز بنالیا۔
 یعنی حرارت کی معاملہ بندی کو آتش کی صفائی زبان اور محاورہ گوئی کے ساتھ سمجھو یا
 اور اسی سے وہ چیز پیدا ہو گئی جو داغ کا طرز خاص کہلاتا ہے یعنی روزمرہ اور
 زبان، محاورات کا بر محل استعمال، لفظوں کی نشست و ترتیب اور خیالات کی نشانی،
 ان کے اشعار کا ظاہری یا خارجی حصہ تو بہت اچھا ہوتا ہے مگر داخلی یا معنوی
 حصہ بہت سطحی ہے۔ اُن کا کلام لوگوں کو بہت پسند آیا کیونکہ اُن کے مذاق کے
 موافق تھا اور یہی بہت بڑا راز اُن کی شہرت و کامیابی کا ہے۔ منشی صاحب نے
 داغ کے رنگ کی مقبولیت اور اپنی شہرت کے میٹ جانے کے خیال سے انھیں کا
 رنگ اختیار کیا۔ اور ہر چند یہ صحیح ہے کہ اس تبدیل رنگ کی وجہ سے اُن کے
 مابعد کے کلام میں پیشتر سے بہت زیادہ صفائی اور روانی پیدا ہو گئی مگر پھر بھی
 وہ داغ تک نہ پہنچ سکے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں وہ اُن سے کم رہے
 اسی وجہ سے اُن کا دوسرا دیوان ”صنعتیٰ نہ عشق“ ”گلزار داغ“ سے، اگر وہ داغ
 کے طرز کے اعتبار سے دیکھا جائے تو بہت کم ہے۔ بہر حال یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے
 کہ منشی صاحب نے یہ کیا کم کمال کیا کہ اپنے طرز قدیم کو چھوڑ کر طرز جدید میں اچھی خاصی
 کامیابی حاصل کر لی۔

اگر ایک بن نقطہ نظر سے ان دونوں استادوں کی شاعری کو دیکھا جائے
 تو یہ انسا پڑے گا کہ وہ حقیقی شعریت اور آتش الہامی جو قدیم استادوں کے یہاں پائی
 جاتی ہے ان دونوں کے یہاں بہت کم ہے۔ مگر بائیمہ باعتبار شکوہ الفاظ اور
 متانت اور ناز و کنجالی کے امیر کو داغ پر فوقیت حاصل ہے عروض اور ضرورتاً شاعری

کے اعتبار سے امیر بہت بڑے استاد تھے اُن کے کلام میں اس قسم کے تقشیر و فساد ہی ملینگے۔ اور قصیدہ گوئی میں تو وہ داغ سے یقیناً بہتر ہیں۔ داغ کو اس صنف خاص سے زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ گو کہ اُن کے معتقدین اس بارہ میں بھی اُنکی فضیلت کے قائل ہیں حقیقت یہ ہے کہ داغ ایک بہت بڑے غزل گو اور ایک طرز خاص کے موجد تھے اور یہی اُن کی شہرت کا باعث کہا جاسکتا ہے۔ منشی صاحب جامع الکملات تھے۔ شاعر کے علاوہ وہ بہت بڑے نثار اور ناقد بھی تھے اور علمی قابلیت تو داغ سے یقینی بہت بڑھی رکھتے تھے «امیر اللغات» اور اُن کے وہ خطوط جنہیں اُنھوں نے اکثر نہایت سچیدہ نکات ادبیہ حل کیے ہیں اُن کی قابلیت اور تلاش کے شاہد عادل ہیں۔ قصیدہ میں وہ سودا اور ذوق کے ہم پلہ کہے جاسکتے ہیں۔ البتہ نظیر بلوی شاگرد ذوق اس صنف میں اُن کے قریب قریب ہیں۔ ان دونوں میں یہ بھی ایک بہت بڑا فرق ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ منشی صاحب کی شاعری ترقی کرتی رہی اور داغ کا رنگ آخر عمر میں کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ اُن کا بہترین زمانہ اُن کے قیام رامپور کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ جب سے کہ وہ حیدر آباد گئے اور وہاں ثروت و عیش اُن کو نصیب ہوا شاعرانہ جگر کا دی اور محنت کے وہ عادی نہ رہے۔ مگر یہ ہے کہ آخری فیصلہ کن چیز اس معاملہ میں نقاد کا رنگ طبیعت اور رجحان مذاق ہے۔

داغ کا کلام اس قدر مقبول اور مشہور ہے کہ اُس کا کچھ انتخاب دینا ایک فعل عبث معلوم ہوتا ہے مگر پھر بھی چند اشعار بطور نمونہ کے یہاں پیش کیے جاتے ہیں تاکہ ناظرین اُن سے لطف اٹھائیں۔

خدا کریم ہے یوں تو گرہ ہے اتنا شک آج راہی جہاں سے داغ ہوا ڈر گئے نامِ شفا سُنکے نے خواہش مرگ جو عاشقی میں خاک ہوا کیسا ہوا دلِ غفلت کہ اب کیا ہم نے	کہ میرے عشق سے پہلے تجھے جمال دیا خانہ عشق بے چراغ ہوا مُنہ ذرا سا نکل آیا ترے بیماروں کا کہتا تھا آج خاک میں کوئی ملا ہوا جو ہمیں پہلے کام کرنا تھا
---	--

جو ہو سکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا
مگر دیکھو تو پھر کچھ آدمی سے ہو نہیں سکتا

کچھ آگے دائرہ محشر سے ہے اُمید مجھے لطف فرما جو وہ رہتا تو ٹھکانا ہی نہ تھا خاطر سے یا لحاظ سے میں بان تو گیا دیکھا ہر تکتہ میں جو اس شیخ کچھ نہ پوچھ وعدے پہ مے اُنکے قیامت کی ہر تکرار کل تابِ فغاں تھی تو یہ تاثیر کہاں تھی میں خانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہی کیسا جوابِ حضرتِ دل دیکھئے ذرا لطفِ محوِ تجھ سے کیا کہوں زاہد اُگائی یوں وفا زمانے سے بظاہر رہتا ہیں اور دل میں بدگمانی ہو	کچھ آپ نے مرے کہنے کا اعتبار کیا عینِ حکمت تھی وہ کا فر جو دلِ آزار دہا جھوٹی قسم سے آپکا ایمان تو گیا ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا اور بات ہوتی کہ اُدھر کل ہر ادھر آج کیا کیا لبِ خاموش یہ قرباں ہر اثر آج ہر شخص پوچھتا تھا کہ حضرت ادھر کہاں سب کی ہر کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں پیغامبر کے ہاتھ میں ٹکڑے زبان کے ہیں ہائے کمِ سخت تو نے پی ہی نہیں کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں تکے کو چیریں جو جاتا ہر آگے ہم بھی ہوتے ہیں
--	---

<p>جو کش آتا ہو مجھ پر تو نہ راؤں دم بھی موتے ہیں اُدھر جاتا ہو دیکھیں یا دھر پروانہ آتا ہو کہ زندہ کوئی بھی تیار دار باقی ہے چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے ملتی نہیں فریاد سے منہ ریا کسی کی مکسخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صحت تیری ہندوستان میں دھوم ہماری زبان کی ہے</p>	<p>جو کہتا ہوں کہ مرنا ہوں تو فرماتے ہیں مر جاؤ سُخ و شن کے گے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں مرض عشق کی کیا پوچھتے ہو یہ پوچھو گرے ہوتے اُلجھ کر آستان سے ہر دل میں نئی طرح سے ہے یاد کسی کی نئے پی تو سہی تو یہ بھی ہو جائے گی زاہد یاد سب کچھ ہیں مجھے حجر کے صدمے ظالم اُردو ہے جس کا نام نہیں جانتے ہیں داغ</p>
--	--

<p>جلال کھنوی مسئلہ ۲۵ تا ۳۰</p>	<p>حکیم سید ضامن علی جلال حکیم صفر علی داستان گو کے بیٹے تھے کھنوی میں ۱۲۵۷ھ میں پیدا ہوئے کتب درسیہ فارسی و عربی سے نواب آصف الدولہ کے مدرسے میں فراغت حاصل کر کے اپنے آبائی پیشہ طبابت کی تکمیل کی طرف توجہ کی زمانے کے رنگ کے موافق اُن کو شعر و سخن کا شوق بچپن ہی میں پیدا ہو گیا تھا اور کچھ دنوں بعد اس میں اسقدر محو ہو گئے کہ بجائے حکمت کے شاعری کو اپنا مستقل فن قرار دیا ابتدا میں امیر علی خاں ہلال سے اصلاح لیتے تھے۔ جب کلام میں کچھ پختگی آگئی تو انھیں کے توسط سے اُن کے استاد رشک کے شاگرد ہو گئے۔ رشک اُس زمانے میں ایک خاص شہرت رکھتے تھے وہ ناسخ کے بہت ممتاز شاگردوں میں تھے اور استاد اسقدر ان کا خیال کرتے تھے کہ جو غزلیں صلاح کے واسطے اُن کے پاس آئیں وہ اُن کو بنظر صلاح رشک کے حوالے کرتے۔ جب رشک صفر علی پر روانہ ہونے لگے تو انھوں نے فوجوان جلال کو</p>
---------------------------------------	---

نواب فتح الدولہ برقی کے سپرد کیا جن کی شاعری کا اس زمانہ میں بڑا زور و شور تھا روزانہ مشاعرے منعقد ہوتے جن میں بڑے بڑے اساتذہ وقت مثل حجازی، آسیر، امیر قلی وغیرہ کے شریک ہوتے تھے جلال بھی ان مشاعروں میں بے تکلف جاتے اور استادوں کے کلام کو سنتے اور خود اپنی غزلیں سناتے۔ عہدِ شہ ۷ نے ان صحبتوں کو درہم و برہم کر دیا اور شعر کو بجائے شعر کی تخیل کے اب اپنے پیٹ کا خیال پیدا ہوا۔ اسی زمانہ میں اور انھیں انکار کی بدولت جلال نے ایک دو خانہ شہر لکھنؤ میں ایک شخص بخشی نندراے کے مکان میں کھول لیا تھا جو ان کے والد کے دوستوں میں تھے اور شاعر بھی تھے مگر اس شغل میں بھی وہ اپنی محبوب شاعری کو کبھی نہیں چھوڑا اور اس میں بھی اس کی مشق برابر جاری رہی۔ بالآخر نواب یوسف علی خاں والی رامپور کی قدردانی نے ان کو رامپور گھسیٹ بلا یا جہاں ان کے والد داستان گویوں میں ملازم تھے تھوڑے عرصہ بعد جب نواب کا انتقال ہوا اور والی ریاست نواب کلب علیا ہوئے تو انھوں نے حکیم صاحب کو بمشاہرہ سو روپیہ ماہوار ملازم رکھ لیا حکیم صاحب اپنی تنک مزاجی اور نازک دماغی کی بدولت کئی مرتبہ ملازمت سے کنارہ کش ہوئے مگر نواب صاحب کی قدردانیوں اور فیاضیوں نے کبھی ان کو رامپور سے ترک تعلق نہ کرنے دیا۔ وہ تقریباً بیس سال رامپور میں رہے اور برابر مشاعروں میں شریک ہوتے رہے جہاں ان کے معاصر و حریف نواب مرزا خاں دلغ، منشی امیر اللہ تسلیم اور منشی امیر احمد مینائی بھی شریک ہوتے تھے۔ اس زمانے کی ان چاروں استادوں کی غزلیں جو اکثر ہر طرح ہوتی تھیں خالی از لطف نہیں ہیں کیونکہ ان سے تقابل کلام کا اور ہر ایک شاعر کا رنگ طبیعت دریافت کرنے کا بہت اچھا موقع ملتا ہے۔

نواب کلب علیاں بہادر کے انتقال اور کونسل آف رجنسی کے قائم ہونے سے یہ
پر لطف صحبتیں بھی قائم نہ سکیں اور شعر اسب تر بہتر ہو گئے حسن اتفاق یہ کہ ایک
چھوٹی سی ریاست منگرو دل واقع کاٹھیاوار کے رئیس با اختیار نواب حسین میاں نے
جن کو شعر کی قدردانی اور شعر کی سرپرستی کا بڑا فخر حاصل ہے، حکیم صاحب کو
اپنے یہاں طلب کر لیا، مگر وہاں بوجہ دوری اور ناموافقیت اب ہلکے عرصہ تک ہو سکے
چند ہی دن میں اپنے وطن بالوف لکھنؤ میں واپس آ گئے جہاں نواب صاحب
موصوف ان کو بچیس روپیہ ماہوار اور مبلغ سو روپیہ ہر قصیدے کا صلہ جو وہ
ان کی خدمت میں بھیجتے تھے برابر عنایت کرتے رہے۔ آخر عمر میں حکیم صاحب کا
سولے شعر و شاعری اور صلاح کے کوئی اور شغلہ نہ تھا۔ العمر چھ ہتر سال تاریخ ۱۰ اکتوبر
سنہ ۱۹۰۹ء انتقال کیا۔

تصانیف تصانیف حسب ذیل موجود ہیں :-

(۱) چار دیوان۔

(۲) ”سریہ زبان اردو“ جو محاورات و اصطلاحات زبان اردو کی ایک
مبسوط کتاب ہے۔

(۳) ”افادہ تاریخ“ فن تاریخ گوئی پر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے۔

(۴) ”منتخب القواعد“ اس میں اکثر ہندی الفاظ کی اصل بتائی ہے اور
مفرد و مرکب الفاظ کی تحقیق کی ہے۔

(۵ و ۶) دو لغات زبان اردو کے موسوم بہ ”تنقیح اللغات“ و ”گلشن فیض“۔

(۷) ”رسالہ دستور لفظی“ جو فن عروض پر ایک مختصر رسالہ ہے۔



ڊاڪٽر سر محمد اقبال بي-ايڇ-ڊي

(۸) ”مفید الشعر“ ایک رسالہ درباب تحقیق تذکرہ و تانیث -

فہرست مذکورہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو تحقیق زبان کے ساتھ بڑا شغف تھا اور مثل اپنے استاد رشک کے اُنھوں نے بھی اکثر رسالے اور لغات زبان اُردو کے الفاظ و محاورات و اصطلاحات کے متعلق تصنیف کئے بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ جس کام کو رشک نے شروع کیا تھا اُس کو اُنھوں نے درجہ تکمیل کو پہنچایا ہرچند کہ اُن کی یہ تصانیف ایک ابتدائی صورت میں ہیں اور اُن کے بعد اب بڑی بڑی کتابیں اسی موضوع میں نہایت شرح و بسط اور زیادہ تفصیل و تنقید کے ساتھ لکھی گئی ہیں مگر پھر بھی جلال کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہیے۔ اُن کو بچپن سے حجت و تکرار اور بحث و مباحثہ کا شوق تھا چنانچہ اُس زمانے میں بھی وہ اساتذہ وقت کے اسقام سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے۔ بے تکلف اُن کی غلطیاں اُن کے مُنہ پر کہہ دیتے تھے۔ اور یہ عادت اُن کی آخر عمر تک باقی رہی اسکی وجہ سے اُن سے اور اُن کے معاصرین سے معرکہ الکرا مناظرے اور مباحثے اس معاملہ میں ہوتے رہے۔

زواج کی کیفیت کما جاتا ہے کہ جلال ایک مغرور و متکبر اور ہنچورن دیگر نے نیست کے خیال کے آدمی تھے مشہور ہے کہ وہ اکثر مشاعروں میں صرف اس وجہ سے شرکت نہیں کرتے تھے کہ غرور سخن اُن کو اسکی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اپنے زمانے کے اکابر شعر تک سے ملنے میں اُن کو عار تھا۔ دوسروں کے اشعار کی تعریف کرنے کی اُنھوں نے قسم کھائی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا حقارت آمیز برتاؤ جھگڑے اور فساد کا باعث ہوا کرتا ہے چنانچہ تسلیم کے ایک شاگرد ظہیر حسن شوق نیوی نے

دو کتابیں لکھ ڈالیں جس میں کہ جلال کی خوب خبر لگی ہو اور اُن کے کلام کی غلطیاں
 نکالی گئیں اور اُن پر صداہا اعتراض وارد کئے گئے مگر حق یہ ہے کہ جلال اپنے
 شاگردوں اور دوستوں سے بہت اچھی طرح پیش آتے تھے اور دوسروں کے
 کلام کی اصلاح بہت محنت اور محبت سے دیتے تھے۔

خصوصیات کلام | جلال کو طرز لکھنؤ کا آخری متبع سمجھنا چاہیے۔ وہ قدیم اساتذہ
 لکھنؤ کے قدم بقدم چلتے تھے اور اس شاہراہ عام سے کبھی ہٹنا نہیں چاہتے تھے۔
 ان کے متعدد دیوانوں میں کسی قسم کی دلاویزی اور خصوصیت اور مبالغہ لاقتیاز کوئی
 شے نہیں ہے۔ البتہ زبان میں تصنع بہت کم اور بے عیب ہے۔ پھڑکتے ہوئے
 اشعار کہیں کہیں نکلتے ہیں۔ مگر عام طور پر کلام بے نمک و معمولی ہے۔ جذبات
 یا انوکاس کا اُسیں کہیں بہتہ نہیں۔ خیال آفرینی کم ہے۔ اکثر وہی معمولی
 معمولی باتیں ہیں۔ اور بعض اشعار تو انکی اُستادی کے درجہ سے بہت گرے
 ہوئے ہیں مگر اُسیں بھی شک نہیں کہ کنگھی چوٹی اور عورتوں کی زیب زینت
 کے مضامین جو قدیم طرز لکھنؤ کا مایہ ناز تھے اُن کے یہاں نہیں پائے جاتے۔
 اس کے علاوہ صحت الفاظ کا بھی اُن کو بڑا خیال رہتا ہے اور کلام تعقید
 اور نامناسب الفاظ سے پاک ہوتا ہے۔ جلال اپنے آپ کو صحت الفاظ و محاورہ
 کا بادشاہ سمجھتے تھے بہت پرگو تھے۔ اور شاید یہ پرگوئی ہی بد مزگی کلام کا باعث
 ہو۔ مشہور ہے کہ بیش کپیس غزلوں کی اصلاح اور تین چار غزلوں کی تصنیف اُن کا
 روزمرہ کا معمول تھا۔ چنانچہ اُس زمانہ کے گلدستے انکی اور اُن کے شاگردوں کی
 غزلوں سے بھر رہے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ کلام کے بہت اچھے ناقد تھے۔

اور اردو کے دوسرے درجہ کے شعرا میں اُنکا پایہ بلند ہے۔

شاگرد ان کے مشہور شاگردوں میں اشخاص ذیل قابل ذکر ہیں۔ یعنی خود ان کے بیٹے کمال جو ریاست رامپور میں ملازم تھے اور اب انتقال ہو گیا۔ میرزا کریم حسین اس اور اُن کے صاحبزادے آرزو۔ احسان شاہ جہاں پوری اور سردار اودھ سنگھ۔

آرزو سید انور حسین صاحب لکھنؤی آرزو تخلص خلف سید ذاکر حسین بایں مثل اپنے والد کے جلال کے شاگرد ہیں۔ لکھنؤ کے بہت نامور شاعروں میں ہیں۔ اور کمال کے انتقال کے بعد جلال کے جانشین ہی سمجھے جاتے ہیں۔ پہلے اُمید تخلص کرتے تھے اب آرزو کرتے ہیں۔ فن عروض میں اُنکو پوری تنگاہ حاصل ہو اور تمام اصناف سخن میں شعر کہنے پر قادر ہیں۔ مرثیے بھی کہے ہیں اور ڈب رمانوسی کا شوق ہے۔ گوکہ لکھنؤ کے باشندے ہیں مگر طرزِ دلی والوں کا ہے۔ آرزو کا کلام ان کے اُستاد جلال کے رنگ کا بہت اچھا نمونہ ہے جبکہ اُنھوں نے اپنے طرزِ کودلی کے رنگ میں سمو دیا تھا۔ ان کے کلام میں سادگی اور روانی اور صلاوت اور جذبات سب کچھ موجود ہے۔ موجودہ شعراے لکھنؤ میں بلند پایہ رکھتے ہیں۔

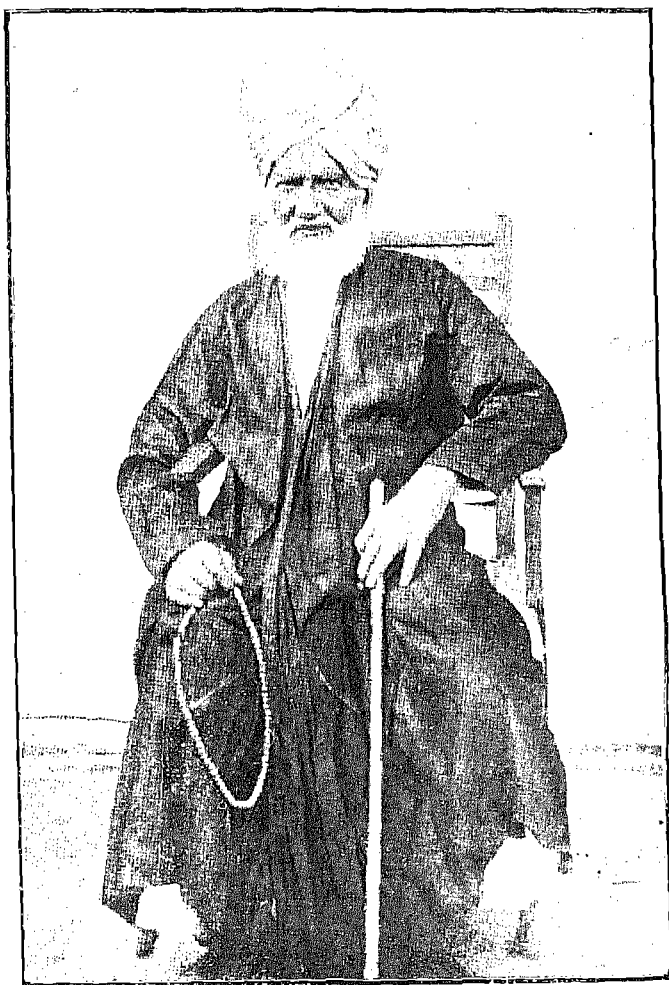
احسان احسان علی خاں نام احسان تخلص قاسم علی خاں کے صاحبزادہ ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں بمقام اوٹھ ضلع بریلی پیدا ہوئے اسکے بعد ان کے والدین شاہ جہانپور چلے گئے جہاں اُنکی تعلیم و تربیت ہوئی۔ سولہ برس کی عمر سے اُن کو شعر کہنے کا شوق ہوا۔ ابتدائی کلام حافظ نثار احمد خاں نائب کو دکھاتے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں جلال کے شاگرد ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں محکمہ بندوبست گورکھپور میں سرکاری

لازمت پائی اور بعد کو قانون گوئی منصرمی اور پیشکاری کے عہدوں پر فائز ہوئے
 سلسلہ ۱۱ میں لازمت چھوڑ کر سختاری کا امتحان دیا اور شاہجہاں پور میں کام
 شروع کیا۔ سلسلہ ۱۲ میں ایک گلدستہ موسوم ”بہ گلدستہ ارغوان“ نکالا جو کچھ عرصہ
 کے بعد بند ہو گیا۔ سلسلہ ۱۳ میں اُن کا پہلا دیوان ”شمکہ خیال“ چھپا تھا۔ اس کے
 علاوہ کچھ اور کتابیں بھی اُن کی تصنیف سے ہیں۔ سلسلہ ۱۴ میں منگول اور
 وہاں سے حیدر آباد گئے تھے۔ آحسان ایک خوشگو شاعر ہیں مگر کوئی خصوصیت
 اُن کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ جلال کے مشہور شاگردوں میں ہیں۔

تسلیم سلسلہ ۱۵
 قصر شاعری رام پور کے چوتھے رکن منشی امیر اللہ تسلیم تھے۔ سلسلہ ۱۶
 میں بمقام منگلی جو نواح فیض آباد میں ایک گائوں ہے پیدا ہوئے
 ان کے والد مولوی عبد الصمد پہلے بدوسرائے میں جو دریا آباد کے قریب واقع ہے
 قیام کرتے تھے۔ بعد کو فیض آباد چلے آئے اور وہیں توطن اختیار کیا۔ تھوڑے عرصہ
 کے بعد لکھنؤ آگئے اور محمد علی شاہ کے عہد میں صیفہ فوج میں مبشائر تیس و بیسہ
 ماہوار ملازمت کر لی۔ تسلیم بھی بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ فوج میں داخل ہوئے
 تھے اور انکی علیحدگی کے بعد اُن کے عہدے پر فائز ہوئے۔ فارسی و عربی کی تعلیم
 غوث اپنے والد سے اور مولوی شہاب الدین اور مولوی سلامت اللہ رام پوری سے
 حاصل کی تھی۔ فن خوشنویسی کے استاد تھے اور مطبع منشی نو لکھنؤ میں مبشائر
 بیس روپیہ ماہوار ملازم تھے شعر و سخن میں وہ نسیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ اور طرز
 دہلی کے متبع پر بڑا فخر کرتے تھے چنانچہ کہتے ہیں ۵

لہذا قلم محروم ہے بھی فن خوشنویسی میں چند درآپ سے استفادہ کیا ہے ۱۲ مترجم





مذشي اميرالک تسليم ليرندي

میں ہوں اے تسلیم شاگرد نسیم دہلوی
مجھ کو طرزِ شاعران لکھنؤ سے کیا غرض

تھوڑے عرصہ کے بعد واجد علی شاہ کے زمانہ میں جہان کی بلٹن توڑ دی گئی
تو یہ بیکار ہو گئے۔ انھوں نے ایک منظوم عرضداشت اپنے ہاتھ سے خوشخط
لکھ کر مقبول الدولہ راز احمدی علیخان قبول شاگردِ نسخ کی وساطت سے پیش کی۔
بادشاہ نے دیکھا اور اُس پر یہ حکم لکھا۔

بشنو او خوشنویس او خوش گو	ہر دو فن میکنی و ہر دو نگو
اسم تو مندرج بہ دفتر شد	بست و دہ روپیہ مقرر شد

چنانچہ ان کا تین روپیہ ماہوار مقرر ہو گیا اور شعرے شاہی کے زمرہ میں داخل
ہو گئے۔ بعد از نزاع سلطنت یہ رامپور چلے گئے جہاں کچھ عرصہ تک کوئی معقول
ملازمت ملی اور نہ مقبول شعر کے حلقے میں داخل ہو سکے۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک
قصیدہ مدحیہ نواب کلب علیخان کے حضور میں جو اس وقت ولیعہد ریاست تھے
پیش کرنے کا موقع ملا۔ غدر کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد تسلیم رامپور سے لکھنؤ واپس
آئے اور یہاں اپنے بچپڑے ہوئے اعزاز سے ملے۔ اسکے کچھ عرصہ بعد وہ منشی
نوکشور کے مشہور مطبع میں جب کو قائم ہوئے اس وقت تھوڑا عرصہ گزرا تھا مصحفوں میں
ملازم ہو گئے جہاں انکے استاد نسیم نے بھی کچھ دنوں ملازمت کی تھی لکھنؤ میں
نواب محمد تقی خاں کی سرکار سے بھی دس روپیہ ماہوار ان کو ملتے تھے اور نواب صاحب
اپنا کلام اصلاح کے لئے اُن کو دکھاتے تھے جب ۱۲۸۷ھ میں نواب کلب علیخان
سرکار اے ریاست تھے تو ان کے طلب فرمانے سے یہ پھر رامپور گئے۔

اور اکی مرتبہ تیس روپیہ ماہوار تنخواہ ہوئی جو بعد کو پچاس روپیہ تک بڑھا دی گئی اور عہدہ نظارت و پیشکاری سے ترقی کر کے وہانکے ملاس کے ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے۔ نواب صاحب موصوف کی حلت کے بعد یہ پھر رامپور سے مکملے اور ٹوناک ہوتے ہوئے منگرو دل پہونچے جہاں کچھ دنوں قیام کر کے نواب عالیشان نواب سید حامد علی خان بہاولی رامپور کے طلب فرمانے سے پھر رامپور آ گئے اس مرتبہ نواب صاحب نے اندراہ قدر دانی چالیس روپیہ ماہوار بطور منشن مقرر کر دیے جو ان کو آخر وقت تک ملتے رہے تسلیم نے اگانوے برس اس دنیا سے ناپائدار کی سیر کر کے ۱۹۷۷ء میں سفر آخرت اختیار کیا۔

تصانیف کہا جاتا ہے کہ ان کا پہلا دیوان زمانہ غدر میں صنائع ہو گیا۔ مطبوعہ دیوان ان کے حسب ذیل ہیں :-

- (۱) "نظم الرحمن" یہ لکھنؤ میں چھپا ہے اور اس میں قبل غدر کا بھی کچھ کلام اور ان کی دو شنویاں بھی ہیں۔ (۲) "نظم دل افروز" مطبوعہ رام پور۔
 - (۳) "دفتر خیال" ایضاً۔ جو تھا دیوان ناتمام سنا جاتا ہے کہ ان کے کسی شاگرد کے پاس رام پور میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ شنویاں حسب ذیل ہیں :-
 - (۱) نالہ تسلیم۔ (۲) شام غریباں (۳) صبح خنداں (۴) دل و جان
 - (۵) نغمہ لب لب۔ (۶) شوکت جہانی (۷) گوہر انتخاب (۸) تاریخ رامپور
- ان کے علاوہ انھوں نے نواب صاحب رامپور بالقابہ کا سفر نامہ یورپ منظوم لکھا ہے جس میں تقریباً بیس پچیس ہزار شعر ہیں۔

انداز کلام کلام نہایت سلیس بے تکلف ٹھوس اور زور دار ہر تمام صنائع سخن

میں مثنوی سب سے اچھی ہے اور آپس وہ اپنے ہمعصوروں پر گویے سبقت لی گئے
ہیں۔ اسی میں وہ خوب پھلتے پھولتے ہیں۔ بعض قصیدے بھی بہت زوردار لکھے
ہیں۔ غزلیں اکثر پر معنی اور پر لطف ہوتی ہیں اور ان کا پہلا دیوان ”نظم ارجمند“
ہماری رے میں سب دیوانوں سے بہتر ہے۔ مگر پر گوئی نے ان کے ساتھ بھی وہی
کیا جو دیگر شعرا کے ساتھ کیا ہے۔ یعنی کلام کو پھیکا اور یکسرہ بنا دیا ہے۔ تسلیم میں باتوں
کے واسطے مشہور ہیں۔ اپنی غزلوں اور مثنوی کے لئے۔ دوسرے مومن کے تتبع کے
واسطے تیسرے اس وجہ سے کہ ہمارے زمانہ کے ذہین اور قابل شاعر حسرت موہانی
کے وہ استاد ہیں۔

تسلیم نے اپنی عمر کا اکثر حصہ مصیبت و افلاس میں بسر کیا یہاں تک کہ بعض
اوقات فقر و فاقہ کی نوبت آگئی۔ اکثر اوقات ان کے احباب اور ان کے شاگرد
انکی اعانت کرتے تھے۔ ان کی طویل عمر مصائب کی ایک طولانی دہقان تھی
جو آخر کار موت پر ختم ہوئی۔ مگر مفلسی اور پریشانی حالی نے ان کے مزاج میں کسی قسم
کا چڑچڑاہٹ اور غم و غصہ پیدا نہیں کیا تھا۔ بلکہ برعکس اسکے وہ نہایت ملنسار
اور قانع واقع ہوئے تھے۔ اور کسی مرفہ الحال ہم پیشہ شاعر پر ان کو رشک و حسد
کبھی نہیں ہوا۔ تسلیم کے ساتھ قدیم رنگ کا خاتمہ ہو گیا۔

ان کے شاگرد کثرت میں جن میں مولانا حسرت موہانی عرش گیا وہی۔
حاجی محمد اسماعیل خاں قصبر معروف بلبیل تسلیم بہت ممتاز اور قابل ذکر ہیں۔
حسرت موہانی کا کچھ مختصر حال ہم آگے چل کر حصہ شریں لکھیں گے۔
چند چیدہ اشعار بطور نمونہ نذر ناظرین کیے جاتے ہیں۔

اتو دامن بھی نہیں ہو کہ بہل جاؤں گا
 تو کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا
 قطرہ نیساں صدف میں اکے گوہر ہو گیا
 وہ بلا بھی کبھی تنہا تو میں تنہا نہ ہوا
 ہاے تر ہو گی زبان تیر کی
 توڑو نہ آسرا دل اُمید وار کا
 کیا اعتبار وعدہ بے اعتبار کا
 غم تمھیں کا ہے کا ہے جاتا رہا جاتا رہا
 کیا تر اے آسمان پر جفا جاتا رہا
 سمجھا میں پس مرگ مے ساتھ گڑی ہوئی
 میں نسیم دہوی کے کفش بڑاؤں میں ہوں
 اب تک پڑا ہوا ہے حرام و حلال میں
 یہ بات مے دلیں ہر بار گ جنا میں
 مرا حصہ نہیں ہو کیا خدا کے فضل و حساں میں
 چل کے میخانہ میں اب گردش ساغر دیکھو
 کیا جانے وہ شوخ کہاں ہو کہاں نہ ہو
 وہ فتنہ جوانی میں قیامت نہ ہو کیا ہو
 آجائے وہ بُت سامنے اسدم تو مزا ہو

اے بکتک میں گھبراؤنگا اور دست جنوں
 نہ کہھنچا ہو دل پر خفا فوق ہو اُداس
 آبرو گر چاہتا ہوں کنج خلوت کو قبول
 عمر بھر رشک عدو ساتھ تھا کہتا کیا جا
 قطرہ خون بھی نہیں دل میں مے
 کچھ کہہ دو جھوٹ سچ کہ توقع بندھی ہے
 تسلیم سکے واسطے بیٹھے ہو گھر چلو
 دل مرا تھا اگر گیا، گم ہو گیا جاتا رہا
 ٹھونڈا تھا ہر روز و شب لیکر چراغ مہراہ
 مرقہ میں سفیدی جو کفن کی نظر آئی
 اور میں جنکو ہر شاگردی پہ اے تسلیم ناز
 واعظ خدا شناس نہ ہو گا تمام عمر
 بسناستم چرخ سے اُن منہ سے نہ کرنا
 ڈرانایا کیوں ہر اے تسلیم واعظ مجھ کو درخسے
 اگر دش نخت بہت دیکھ چکے اے تسلیم
 کرتے ہیں سجدے اس لیے دیر حرم میں ہم
 طفلی سے جو بت شوخ ہوا فت کا بنا ہو
 کعبے کا ارادہ کیے بکھلے تو ہیں گھر سے

عرش ضمیر الدین عرش صوبہ ہمارے تعلق رکھتے ہیں فشی بندہ علی وکیل گیا

کے صاحبزادہ ہیں ایک عرصہ تک اخبارات و رسائل سے تعلق رکھنے کے بعد انھوں نے ریلوے کی ملازمت اختیار کر لی۔ پہلے شمشاد شاگرد ناخ کے شاگرد ہوئے مگر بعد کو تسلیم کو کلام دکھانے لگے۔ ان کے اکثر تصانیف غیر مطبوعہ ہیں۔ پہلے ایک دیوان موسوم ”فکر عرش“ داغ کے رنگ میں لکھا مگر وہ شائع نہیں ہوا۔ دوسرا دیوان موسوم ”نظم نو نگار“ تسلیم کے رنگ میں اور انھیں کا اصلاح کردہ ہے۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا دیوان بھی لکھا ہے۔ دو مختصر رسالے زبانِ اودھن عروضی اور ایک تاریخِ آگرہ و دہلی موسوم ”بارگاہِ سلطانی“ بھی ان کی یادگار ہیں۔ کچھ عرصہ تک بہار پنچ کی ایڈیٹری بھی کی ہے۔ اکثر غزلیں نیچرل رنگ میں خوب لکھتے ہیں اور اسی رنگ میں مشہور ہیں۔

دربار حیدر آباد

حیدر آباد دکن اپنی روایات علم و ادب کے واسطے ہمیشہ سے مشہور ہے۔ نظام الملک آصفجاہ اول جس طرح شاہانِ بجاپور اور گولکنڈہ کے ملک کے وارث قرار پائے اسی طرح ان کے مذاقِ علمی اور سرپرستیِ سخن کے بھی وارث وہی ہوئے۔ حیدر آباد ہمیشہ سے علم و فن اور شعر و شاعری کا مرکز اور ملکی و غیر ملکی ہر قسم کے شعرا اور اہل کمال کا ملجا و دار ہا ہے۔ فرمانروایانِ سلطنت اور امراءِ دولت کا آوازہ سخاوت اور شہرہ فیاضی سن سکر شعرا، علما، فقہاء، محدثین شمالی ہند اور نیز دور و دراز قطار و مصافحہ مثلاً ایران، عربستان، بخارا، سمرقند وغیرہ سے آتے تھے اور یہاں کی فیاضیوں سے

بہرہ مند ہوتے تھے۔ یہ بالکل لوگ افکار دنیاوی سے فارغ ہو کر علم و ادب کی خدمت کرتے اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے اور ریاست کی بڑی زینت بن جاتے تھے۔ خود فرمانروا بھی محض شاعری کے قدردان اور سرپرست ہی نہ تھے بلکہ خود بھی شعرو سخن کا ذوق سلیم رکھتے تھے۔ اگرچہ بعض عہدوں میں شاعری کا بازار سرد رہا مگر پھر بھی شمع سخن جو ایک مرتبہ روشن ہو چکی تھی وہ کبھی بجھی نہیں۔ فرمانروایان سابق اُس زمانہ کے دستور کے موافق فارسی زیادہ کہتے تھے۔ مگر زمانہ حال میں اردو کا چرچا زیادہ ہو گیا ہے۔ جسکی تفصیل آئندہ سطور میں کی گئی ہے۔

بانی خاندان نظام الملک آصفجاہ اول کا نام میر قمر الدین

نظام الملک آصفجاہ اول
سلسلہ ۶ تا سلسلہ ۱۶

خاں تھا۔ فارسی میں شعر کہتے تھے اور دودیاں اس زبان میں یادگار چھوڑے ہیں۔ ”شاکر“ تخلص کرتے اور مرزا عبدالقادر تہیل سے اصلاح لیتے تھے کلام میں تصوف کا رنگ بہت غالب تھا۔ مشہور ہے کہ نظم و نثر کسی زبانوں میں لکھ سکتے تھے۔ ممکن ہے کہ اردو میں بھی کہا ہو مگر اُن کا کلام اب دستیاب نہیں ہوتا۔

ہنرمائیں مظفر الملک فتح جنگ نواب میر محبوب علی خاں بہا

میر محبوب علی خاں تخلص آصف
سلسلہ ۱۶ تا سلسلہ ۱۹ عیسوی

نظام الملک آصفجاہ ششم ۱۸ اگست ۱۷۶۶ء

مطابق ۶۔ ربیع الثانی ۱۱۲۷ھ میں پیدا ہوئے اور کچھ کم تین برس کی عمر میں ۲۶ فروری ۱۷۶۹ء کو سند آرا سے ریاست ہوئے۔ آپ کی تعلیم و تربیت مختلف علوم و فنون میں مختلف اوقات میں اصحابِ نیل کے سپرد ہوئی۔ مولوی محمد باخاں شہید مولوی مسیح الزمان خاں۔ مولوی انور الدین خاں۔ مولوی شرف حسین مظفر حسین خاں۔

مرزا نصر اللہ خاں - مسٹر کلارک - سرور جنگ - افسر جنگ اور طوخواں وغیرہ -
آپ کو زبان عربی و فارسی اردو و انگریزی سب میں عبور حاصل تھا۔ علوم مروجہ کے
علاوہ فنون سپہ گری و شسواری کے ماہر کامل تھے۔ نشانہ بمبیل لگاتے تھے۔ آپ کے
علم و فن اور شعور و سخن کی قدردانی کیوجہ سے تمام علماء و فضلاء عصر اور مشہور شعراء
عہد کا مجمع دار السلطنت حیدرآباد میں ہو گیا تھا جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں
مولانا کریمت علی - مولانا حمید علی مصنف منتہی الکلام - مولوی امین الدین خاں
خلف علامہ رشید الدین خاں دہلوی - مولوی وحید الزماں خاں مولوی مہدی علی
مولوی مشتاق حسین - مولوی سید حسین و سید علی بلگرامی - مولوی نذیر احمد -
مولوی عزیز مرزا وغیرہ اور ان کے علاوہ سیکڑوں باکمال تھے کہ جو لکھنؤ اور دہلی
اور نیز دیگر مقامات سے شہر یار دکن کی فیاضیوں اور حیدرآباد میں جن برسے کا
شہرہ منسن کر حیدرآباد چلے گئے تھے۔ نظام مرحوم کی علمی سرپرستی اور قدردانی
کی بین مثال مولوی سید احمد دہلوی کی مشہور اردو لغت فرہنگ کصفیہ کی طباعت
و اشاعت ہے جس کے واسطے اعلیٰ حضرت نے نہ صرف ایک زر کثیر مصنف کو عنایت
کیا بلکہ اسکے صلہ میں پچاس روپیہ ماہوار بطور پنشن کے عمر بھر کو واسطے مقرر کر دیا تھا۔
اسی شاہانہ فیاضی اور سرورانہ قدردانی کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بعض اور مشہور کتابیں اس
مبارک عہد میں تصنیف کی گئیں مثلاً تمدن عرب مرتبہ و مترجمہ مولوی سید علی بلگرامی
سوانح مخبری نواب سرسار جنگ بہادر تاریخ دکن وغیرہ۔ اسی در دولت سے مولانا
شبلی نعمانی - مولانا حالی - مولوی عبدالحق صاحب مصنف تفسیر حقانی - قدر بلگرامی -
پنڈت رتن ناتھ سرشار - مولوی عبدالحلیم شرر - پروفیسر شہباز اور بیسویں ایسے

کاملان فن برابر مضیاب ہوتے رہے اور عمر بھر نہایت لطیفان کے ساتھ اپنے اپنے مشاغل علمیہ میں مصروف رہے۔ استاد شاہ بلبل ہندوستان نوابی راخان داغ کی شہرت اور ثروت کا ایسا عروج ہوا جو اس سے پیشتر کسی رئیس کی وجہ سے کسی شاعر کو میسر نہیں ہوا تھا۔ مشہور ہے کہ آخر میں انکی تنخواہ پندرہ سو روپیہ ماہوار ہو گئی تھی۔ علاوہ ان پیش ہا انعامات اور خلعت وغیرہ کے جو وقتاً فوقتاً ان کو ملتے رہتے تھے۔ ہر چند کہ امیر مینائی اس معاملہ میں ناکام رہے اس وجہ سے کہ ان کی عمر نے دفا نہیں کی مگر ان کے صاحبزادے اختر مینائی اور ان کے مشہور شاگرد حافظ جلیل حسن جلیل اب تک درباری شاعر ہیں۔ اور جلیل کو تو موجودہ حکمران کی استادی کا فخر حاصل ہے۔

میر محبوب علیخان آصف تخلص فرماتے تھے اور اپنے استاد داغ کے متبع تھے۔ دو دیوان آپکی یادگار ہیں۔ کلام میں داغ کا رنگ ہے اور حسن الفاظ کے ساتھ حسن معنی بھی بہت کچھ جلوہ گر ہے۔ نہایت سلیس فصیح اور با محاورہ چٹ پٹا کلام ہوتا تھا اور حسن ظاہری کے ساتھ حسن باطنی بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

موجودہ فرمانرواے دکن ہزار گز الٹھامنس علیحضرت سر عثمان علیخان ہاؤس جمیع القابہ شعرو سخن میں اپنے پدر بزرگوار کے متبع ہیں آپ بھی نہ صرف قدردان و مرئی فن بلکہ بہت بڑے ناقد اور دلدادہ سخن ہیں۔ آپ نے بھی اپنے درباردار میں ایک مجمع شعر وادبا اور علما و فضلا کا جمع کیا ہے۔ آپ کے مبارک عہد میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام جس سے کہ زبان اردو کی ترقی اور وسعت میں بہت بڑا اضافہ اور اسکو بے انتہا استحکام حاصل ہوا اور نیز دارالترجمہ کا قیام جس سے بہت سی پیش ہا غیر زبانوں کی



اعلیٰ حضرت نظام الملک نواب میر محمد یوسف علی خان آصف جاہ
جنت آرام گاہ



هز اکرالتی هانئیس اعلیٰ حضرت خسرو دکن خلد اللہ ملکہ

کتابیں اردو میں ترجمہ ہو گئیں۔ آپ کے عہد میں کی ایسی یادگاریں ہیں جس کے احسان سے ہماری زبان اور ہمارا ادب کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ آپ عثمان تخلص کرتے ہیں اور آپ کا ایک دیان غزلوں کا چھپ گیا ہے۔ آپ حضرت جلیل سے استفادہ سخن کرتے ہیں۔ کلام میں صفائی سادگی بے تکلفی اور فصاحت کوٹ کوٹ کر بھری ہے زوائد سے کلام پاک ہے۔ ہزار گز اللہ ہائے فارس زبان فارسی عربی میں بھی اچھا دخل رکھتے ہیں اور کبھی کبھی ان زبانوں میں بھی طبع آزمائی فرماتے ہیں۔

امراور و سائے ریاست عہد قدیم میں حیثیت سرپرست
شعر اور اہل کمال کے جو مرتبہ ہمارا چند دلال کو

ہمارا چند دلال شاداں
ستہ ۱۲۵۳ء

حاصل ہو وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا شاداں تخلص کرتے تھے اور ایک عرصے تک پیشکار ریاست یعنی وزیر اعظم کے عہدہ جلیلہ پر ممتاز رہے۔ ہمارا جہ بہادر قوم کے کھتری تھے۔ علاوہ خود اہل کمال ہونے کے اہل کمال کے بڑے مربی اور سرپرست تھے اور اس عہد میں جو دو سخا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے اُن کی سخاوت کی مثالیں اب تک بطور ضرب المثل حیدر آباد میں مشہور ہیں۔ اپنے زمانہ میں اس قدر مشہور تھے کہ ریاست حیدر آباد کو ان کے نام کے ساتھ نسبت دی جاتی تھی اور حیدر آباد چند دلال کا حیدر آباد کہلاتا تھا۔ اُن کی سخاوت کا شہرہ سن کر ہندوستان اور ایران کے اکثر شعرا اور اہل کمال وہاں جمع ہو گئے تھے اور جو مشاعرے خود انھیں کے محل سرا میں ہر رات کو ہوتے تھے اُن میں یہ صاحبان فن جمع ہو کر اپنا اپنا کمال دکھاتے تھے۔ انھیں مشاعروں میں نصیر بلوی نے بھی اکثر شرکت کی ہے اور بیش بہا انعامات سے مالا مال ہو کر

واپس ہوئے ہیں۔ ذوق اور تاسخ بھی طلب کیئے گئے مگر جب وطن اور راہ کی تعب نے اس طرف جانے سے اُن کو باز رکھا۔ ہمارا راجہ موصوف اردو فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ چنانچہ دو دیوان اردو اور ایک دیوان فارسی انکی یادگار ہیں۔ مشہور ہے کہ اُن کے زمانہ میں تین سو سے زیادہ شاعر حیدرآباد میں جمع تھے۔ جنکی ماہوار تنخواہ سو روپیہ سے ہزار روپیہ تک فی کس تھی۔ ایک کتاب موسوم ”عشر تکرہ آفاق“ بھی انکی تصنیف ہے۔ اسمیں انھوں نے اپنے خاندانی حالات اور خود اپنے سوانح اور اپنی خدمات کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔

راجہ گردھاری پرشاد باقی راجہ گردھاری پرشاد معروف بہ محبوب نواز راجہ بی دھر سنگھ ۶ تا سن ۱۹۰۶ء قوم کے مکسینہ کا لیٹھ تھے۔ فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے اور عربی میں بھی اچھا دخل رکھتے تھے۔ یہ بھی شاہیر حیدر آباد سے ہیں اور ان کو بھی شعر و سخن کا ذوق اور سرپرستی شعر کا شوق تھا۔ انھوں نے نواب مرزا غلام داغ کی جب وہ حیدرآباد گئے ہیں بڑی قدر اور مدد کی۔ اکثر کتابیں انکی تصنیف ہیں جن میں حسب ذیل زیادہ مشہور ہیں۔ بھگوت گیتا کا ترجمہ فارسی منظوم کیشو نامہ کلیات باقی قصائد باقی۔ پرس نامہ۔ کنز التایخ۔ بقائے باقی۔ سیاق باقی۔ پیرائے عروض۔ آئینہ سخن۔ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی رواداری۔ کس قدر برتتے تھے۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ بہت ہے۔ فلسفہ اور مذہب سے اُن کو بڑی دلچسپی تھی اور ایک سچے درویش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ انکی رباعیات نہایت مؤثر اور دلچسپ ہیں۔ ان کے کلام سے بڑی علمی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شمس الدین فیض کے شاگرد تھے۔

ہمارا راجہ سرکشن پرشاد تخلص شاد

سنہ ولادت ۱۲۵۷ھ عیسوی

ہمارا راجہ سرکشن پرشاد بہادر وزیر عظیم حیدر آباد زمانہ
حال کے بہت ممتاز اور مشہور شاعر اور اسکالر ہیں

سلسلہ خاندانی ایک نہایت قدیم اور محرز دلی کے خاندان سے ملتا ہے جن کا
کوئی رکن نظام ہمارے سابق میں سے کسی کے ساتھ حیدر آباد آیا تھا۔ اُن کے دادا
ہمارا راجہ نرندر پرشاد اُس کو نسل آٹ بچنسی کے ایک رکن تھے جو جنت آشیان
میر محبوب علی خاں کے زمانہ نابالغی میں قائم ہوئی تھی۔ ہمارا راجہ چند ولال اور یہ ایک ہی
خاندان سے ہیں۔ ان کے دادا نے ان کو زبان عربی و فارسی میں بڑے قابل
استادوں سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلائی تھی۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے انگریزی
اور تہلکی اور مرہٹی زبانوں میں بھی کافی دستگاہ ہم پہنچائی۔ ہمارا راجہ صاحب موصوف
عربی و فارسی و اردو نہایت بے تکلفی اور صفائی سے لکھتے ہیں۔ علاوہ نظم کے
نثر کا اسلوب بھی نہایت دلکش ہوتا ہے۔ شاد تخلص فرماتے ہیں اور حضور نظام سابق
یعنی میر محبوب علی خاں کے شاگرد ہیں جنھوں نے ان کو ”شاگرد خاص آصفیہ“ کے
معزل لقب سے ممتاز کیا تھا۔ دو اردو جرائد یعنی ”دبدبہ آصفیہ“ اور ”محبوب الکلام“
کی کرسی ادارت پر بھی چند روز آپ متمکن رہے۔ ”محبوب الکلام“ میں حضور نظام سابق بھی
اپنا کلام اکثر شائع ہونے کے لئے عطا فرماتے تھے۔ ہمارا راجہ صاحب موصوف ایک
اچھے خاصے صوفی ہیں اور اُن کا کلام مسائل تصوف سے بھرپور ہے۔ اُن کے
دیوان اردو و فارسی شائع ہو چکے ہیں ایک دیوان معروف ”بہ شکرہ رحمت“ میں
صرف نعتیہ اشعار ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تعصبات سے مر تفع ہو کر آپ مذہب
کو کس بلند نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اخوت انسانی کے کس قدر قائل ہیں خاندانی

روایات بدل و عطا پر بھی آپ پوری طرح عامل ہیں اور مہاراجہ چند دلال کے نقش قدم پر چلنے کے لیے ساعی رہتے ہیں۔ تقریباً ۴۰ تصانیف آپ کی موجود ہیں جنہیں سے بعض کے یہ نام ہیں۔ بزم خیال (۳ جلدوں میں)۔ رباعیات شاد۔ ہدیہ شاد۔ فراد شاد۔ مطلع خورشید۔ آریان شاد۔ بخار شاد۔ نغمہ شاد۔ آرمان وزارت مخزن القوافی۔ مثنوی اکینہ وجود۔ مثنوی سر وجود وغیرہ۔ کلام بہت دلچسپ اور بے تکلف ہوتا ہے علی الخصوص فارسی اور عربی اشعار کا اردو شعر میں ترجمہ یا تضمین بہت دلکش اور دل فریب ہوتی ہے۔ کلام میں حسن صوری و معنوی دونوں موجود ہیں۔ ۱۹۰۷ء میں اپنے خاندانی عہدہ وزارت سے سرفراز ہوئے اور خطاب ”راجہ راجگاں مہاراجہ بہادر“ جو ان کے بزرگوں کا تھا ان کو عطا ہوا۔ ۱۹۰۷ء میں وزیر اعظم مقرر ہوئے اور ”بین السلطنہ“ کا خطاب عنایت ہوا۔ ۱۹۰۳ء عیسوی میں کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ اور ۱۹۰۷ء میں جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ گورنمنٹ انگلشیہ سے ملا۔ ۱۹۰۷ء میں عہدہ وزارت سے کنارہ کش ہو گئے تھے مگر تھوڑے عرصہ سے پھر قلمدان وزارت آپ کو سپرد ہوا ہے۔

انجمن ترقی اردو یہ مشہور و معروف انجمن حیدرآباد میں تیرہ جودہ برس سے قائم ہے۔
جب سے یہ عالم وجود میں آئی اپنے قابل اور ہر دلعزیز آنریری سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے کی سرپرستی اور نگرانی میں یہ برابر ترقی کر رہی ہے۔ سکریٹری صاحب موصوف کی ان تھک کوششوں اور چند لائق اور قابل اشخاص کی قلمی امداد و اعانت اور سب سے بڑھ کے اعلیٰ حضرت فرمانرواے دکن کی نظر کیما اثر کی بدولت یہ انجمن زبان اردو کی ترقی اور اشاعت کے نہایت مفید کام انجام دے رہی ہے۔ زبان

انگریزی کی اکثر مفید اور مشہور کتابیں نہایت قابلیت اور احتیاط کے ساتھ ترجمہ ہو گئیں یا ہو رہی ہیں۔ مثلاً بکل کی تاریخ تمدن۔ ایڈٹ کی سوانح عمری نیپولین بوناپارٹ۔ پلوٹارک کی سوانح عمریاں حکماء یونان وغیرہ کی۔ لیکلی کی تاریخ اخلاق۔ ان کے علاوہ بیسیوں مستند کتابیں۔ سائنس۔ فلسفہ۔ اخلاق۔ اقتصادیات۔ تاریخ کی خواہ بصورت تالیف یا ترجمہ شائع ہو چکی ہیں یا پیش نظر ہیں۔ اسی طرح اردو کی اکثر نثری کتابیں اور تذکرے بھی نہایت صحت اور عمدگی اور مفید فاضلانہ دیباچوں کے ساتھ نکل چکے ہیں۔ اردو رسم الخط کی اصلاح و ترقی اور اسکو باقاعدہ اور سہل القراءة بنانے کے واسطے قابل اور تجربہ کار صحاب کی کمیٹیاں بنائی گئی ہیں۔ پروفیسر برون کی تاریخ ادب ایران اور نکلسن کی تاریخ ادب عرب بھی سنا ہو کہ ترجمہ ہو گئیں اور چھپنے کے واسطے تیار ہیں۔ انگریزی و اردو کے علاوہ عربی فارسی و فرانسسی کی پیش ہاتھ تصانیف سے بھی انجمن غافل نہیں ہے۔ ترجمہ کی آسانی کے واسطے سائنس اور علوم و فنون کے اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کر دیا گیا ہے اور وہ بصورت لغت یا فرہنگ کے شائع بھی ہو گیا ہے۔ اسی طرح لغات اور محاورات اور صناعات اور پیشہ وروں کی مخصوص اصطلاحیں بھی مرتب کی گئی ہیں۔ آکسفورڈ کی مختصر زبان انگریزی کی لغت کے اردو ترجمہ کا حکم ہو گیا ہے اور اس کام کے لئے تقریباً بیس پچیس آدمی مقرر ہیں جب یہ تیار ہو جائیگی تو یقیناً مفید چیز ثابت ہوگی سنا گیا ہے کہ انجمن اردو کا نستعلیق ٹائپ تیار کرنے کی فکر میں ہے جس سے کتابوں کے چھپنے اور بعد کو ان کے پڑھنے میں بہت آسانی ہوگی۔ مختصر یہ کہ انجمن کے اشغال متعدد اور مختلف ہیں اور سب قابل تعریف ہیں۔ البتہ

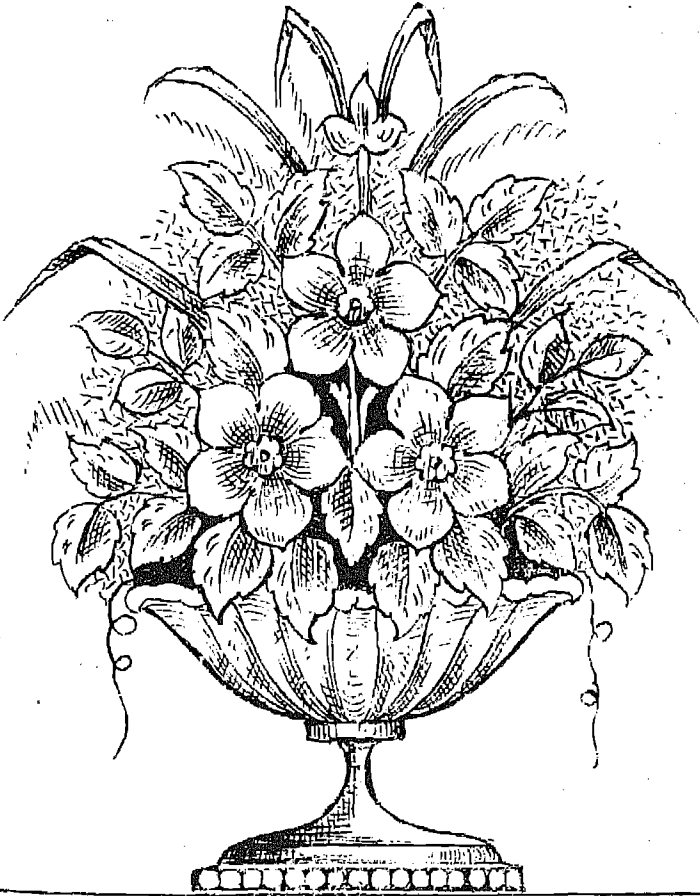
زیادہ ہمت زیادہ مستعدی اور زیادہ محنت کی ضرورت ہے اور کام کرنے والے بھی زیادہ ہونا چاہئیں تاکہ جو کام شروع کیا جائے وہ جلد ختم ہو جائے اور بیک کو ہمت انتظار نہ اٹھانا پڑے۔ انجمن کا مشہور و معروف سہ ماہی رسالہ ”اردو“ جو زیر ادارت سکرٹری صاحب موصوف نکلتا ہے ہندوستان کے نہایت کارآمد و مشہور رسائل اور جرائد میں سے ہے۔ اور اس میں زبان اور ادب اردو کے متعلق نہایت قابل قدر اور دلچسپ مضامین ہوتے ہیں۔ حال میں انجمن نے ایک رسالہ موسوم ”بسانیں“ زیر ادارت ڈاکٹر مظفر الدین صاحب قریشی جاری کیا ہے جس میں صرف مضامین ہوتے ہیں۔ یہ بھی مثل ”اردو“ کے نہایت مفید اور کارآمد مضامین کا حامل ہوتا ہے جس سے انشاء اللہ ملک کی بہت کچھ توقعات پوری ہوں گی۔

عثمانیہ یونیورسٹی عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے وہ روز افزوں علمی و ادبی عمیق قومی جذبات پورے ہو گئے جو اعلیٰ تعلیم کی زبان مادری میں نشر و اشاعت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں عرصہ دراز سے موجزن تھے اور جن کے واسطے وہ بہت سہیلی سے انتظار کر رہے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا تقرر ابتدائی مباحث و مراحل طے ہو جانے کے بعد بالآخر ہزار گز اللہ ہائے انس حضور نظام کے فرمان خسروی مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۱۷ء کے بموجب عمل میں آیا۔ بالفعل تمام شعبہ اے علوم کی تعلیم زبان اردو میں ہوتی ہے انگریزی صرف بطور زبان ثانوی کے ایک ضروری سبکدہ رکھی گئی ہے تاکہ طلباء اس زبان سے بھی نا آشنا اور انگریزی بولنے والی دنیا کے حالات و خیالات سے بخیر نہ رہیں۔ اب تک صرف ایک کالج یونیورسٹی سے متعلق ہے جس کا افتتاح سالہ ۱۹۱۷ء میں ہوا تھا۔ یونیورسٹی نمایاں ترقی کر رہی ہے اور طلباء کی تعداد برابر

بڑھتی جاتی ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے یونیورسٹی کی حیثیت تسلیم کر لی ہے اور اس کے امتحانات اور ڈگریوں کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو اسی درجہ کی برٹش انڈیا کی کسی یونیورسٹی کے امتحانوں اور ڈگریوں کو حاصل ہے۔ بالفعل یونیورسٹی میں شعبہائے انبیاء (تہیالوجی) علوم و فنون (سائنس و آرٹس) اور قانون کی تعلیم دی جاتی ہے۔

دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کے واسطے ضروری کتابیں فراہم کرنیکی غرض سے دارالتصنیف و الترجمة قائم ہے جو یونیورسٹی کے زیر نگرانی نہایت عمدہ اور مفید کام انجام دے رہا ہے۔ ابھی پانچ ہی چھ برس کی مختصر عمر میں اسکی قابل قدر کوششوں سے وہ تمام کتابیں تیار ہو گئی ہیں جو یونیورسٹی کے انٹر میڈیٹ اور بی۔ اے کے درجوں کے واسطے درکار ہیں۔ اس میں آٹھ قابل مترجم زیر نگرانی ایک افسر عالی کئے جو ایک مشہور فاضل مصنف ہیں کام کرتے ہیں دارالترجمہ کی خدمات قابل تحسین و آفریں ہیں۔ خاص کر جب ہم اُن دفتروں کا خیال کرتے ہیں جو علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمہ میں اور اردو میں سائنٹفک الفاظ کے وضع کرنے یا ان کے مرادف قائم کرنے میں مترجموں اور مصنفوں کو ہوتی ہیں۔ سنا گیا ہے کہ اس خاص کام کے واسطے ماہرین فن کی کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں جن کے متعلق وضع الفاظ و اصطلاحات علمیہ کا کام سپرد ہے۔ حال ہی میں اس موضوع پر ایک مفید لغت بھی شائع ہو گئی ہے۔ دارالترجمہ کی ابتدا شروع میں بطور ایک عارضی دفتر کے ہوئی تھی مگر کام کی اہمیت کے لحاظ سے ہرگز الٹ ڈھک ہانس نے محکمہ میں دس برس کی اور توسیع کر دی ہے۔ دارالترجمہ کی خدمات میں

علاوہ مکمل یونیورسٹی کورس کے علوم ذیل کی کتابوں کی تصنیف تراجم داخل ہیں۔ تالیف
 جسمیں مشرقی اور مغربی اور قدیم و جدید ہر قسم کی تالیف داخل ہے (فلسفہ اقتصادیات۔ ریاضی
 (خالص اور مخلوط دونوں) طبیعیات۔ کیمیا اور قانون۔ جب فن تعلیم و انجینیری اور
 طب کے شعبے یونیورسٹی میں کھلیں گے تو ان فنوں کی کتابیں بھی ترجمہ کی جائیں گی
 جس کے واسطے ابھی سے خیال رکھا گیا ہے مصنفہ اور مترجم کتابوں میں ٹیڑھ
 سے زیادہ تیار اور شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے اکثر داخل درس ہونے کے
 قابل ہیں مختصر یہ کہ دارالترجمہ زبان اردو کی اشاعت اور توسیع کے واسطے
 ایک نہایت مفید محکمہ ہے۔ اور خدمات کے لحاظ سے درازی عمر کا مستحق ہے۔



باب ۱۲

اُردو شاعری کا جدید رنگ

آزاد اور حالی کا زمانہ

طرز جدید کے پیشرو اُردو مرثیہ نگاروں اور نیز نظیر اکبر آبادی نے اُس نئی روشنی کی جھلک دیکھ لی تھی جو بالآخر زمانہ مابین میں جدید رنگ میں جلوہ گر ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے اس جدید رنگ کے واسطے ایک شائع عام اپنے زمانہ کے خیال کے موافق تیار کر دیا تھا جس پر راستہ چلنے والے بعد کو آئے۔ اور شاعری میں اصلاح کا نسخہ دکھا دیا تھا۔ ہماری رائے میں قدیم زمانہ کے مرثیوں میں طرز جدید کا تخم یقیناً موجود تھا جس کی آبیاری بعد کے آنے والوں نے کی اور انھیں کے مبارک ہاتھوں سے وہ درخت پروان چڑھا اور برگ و بار لایا۔ مناظر قدرت و واقعات کے سچے فوٹو الفاظ میں انسان کے قلبی جذبات کا من و عنان اظہار فصاحت و انوری کیفیات قلبیہ کا اظہار الفاظ میں لاسٹ زانی، تشبیہ و ہتھوارے کا حد سے متجاوز ہونا یہ سب باتیں جو زمانہ حال کی شاعری کی جان ہیں پُرانے مرثیوں میں کم و بیش ضرور پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح نظیر اکبر آبادی نے بھی اپنے کلام میں اس نئے انقلاب کی خبر دیدی تھی اور ہمارے نزدیک زیادہ صفائی اور زیادہ وضاحت سے دی تھی اس وجہ سے کہ مرثی میں تو یہ چیزیں بطور فروع و مہمید کے تھیں اور نظیر کے یہاں

وہ ایک مستقل عنوان کی صورت میں ہیں مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اُس زمانے کے لوگوں نے اس رنگ کو قہ کی نگاہوں سے نہیں دیکھا اور اس کو ایک فضول چیز سمجھ کے اختیار نہیں کیا۔ اسی وجہ سے مرثیہ گو مگر بڑے شاعر کہلاتے تھے اور نظیہ کو تو طرز قدیم کے دلدادہ ایک عامی اور جاہل شاعر سمجھتے تھے اور اب بھی سمجھتے ہیں کیونکہ اُس نے اُن کے خیال کے بموجب قواعد مقررہ کی پابندی نہیں کی اور وہ عالم و فاضل نہیں تھا اور الفاظ کی تراش و خراش کی اُس نے کبھی پرواہ نہیں کی یہ لوگ چونکہ شعر کے حسن ظاہر کو دیکھتے تھے اس وجہ سے نظیہ کا بے تکلف اور نیچرل کلام اُن کو پسند نہیں آیا۔ ان پرانے خیالات کو محو کرنے کے لئے کسی زبردست قوت کی ضرورت تھی جسکی مختصر کیفیت سطور ذیل میں بیان کی گئی ہے۔

انقلاب کا اثر انقلاب زمانہ اردو شاعری کے قدیم رنگ کے موافق ثابت نہیں ہوا دلی اور لکھنؤ کی سلطنتیں مٹ جانے سے شعر کے سرپرست اُٹھ گئے۔ اب یہ لوگ بے پشت و پناہ رہ گئے اور معمولی آدمیوں کے دست نگر ہو گئے جنکی نسبت زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کے دل میں شوق تو تھا مگر اتنا روپیہ اُن کے پاس کہاں تھا کہ مثل بادشاہوں یا اُمرا کے شعر کی سرپرستی کر سکیں۔ ہر چند جیسا کہ پیشتر کہا جا چکا ہے اکثر لوگ روزی کی تلاش میں رام پور و حیدرآباد اور دوسری ہندوستانی ریاستوں میں چلے گئے۔ مگر وہاں بھی عرصہ دراز تک اُن کے پانوں نہ جم سکے اور تھوڑے عرصے کے بعد یا تو ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہے یا اپنے وطن کو واپس آ گئے۔ اسی کے ساتھ انقلاب زمانہ نے اُمرا کو صرف دولت کے

اور بھی بہت سے مفید استعمال سکھائے جس سے شعر کی قدر اور شاعروں کے مالی نفع پر بہت کچھ اثر پڑ گیا۔ لوگ اب زیادہ مادہ پرست اور کارباری ہو گئے تھے جنکی دنیا میں شرکی صاف اور سادی صبح نظم کی خوش رنگ شفق سے بہتر ہے اب وہ پرانے رنگ کے تغزل میں کوئی لطف نہیں پاتے تھے ہر چند کہ صنف غزل مقبول رہی اور اب تک مقبول ہے۔ دہلی کی تباہی، انتراع ملک و دھندلے شہر اور ان ہنگاموں کے انقلابات نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں اور اب وہ خواب غفلت سے چونکے اور انکا دنیاوی میں مبتلا ہو گئے۔ ہندوستانی ریاستیں گوان ہنگاموں سے محفوظ تھیں مگر رفتا زمانہ کے موافق ان کو بھی اپنے معاملات کی اصلاح کرنا ضرور تھی اس وجہ سے وہ ریاستیں جو شعر کی لمبا و ابنی ہوئی تھیں وہ بھی اس انقلاب سے محفوظ نہ رہ سکیں جبکہ اثر شعر کی تنخواہوں اور منافع پر بھی بہت کچھ پڑا۔

انگریزی تعلیم کا اثر انگریزی تعلیم سے بھی اردو نظم و نثر دونوں پر بہت کچھ اثر پڑا اور
 انکوٹری تقویت پہنچی انگریزی تعلیم نے زبان اردو کے ساتھ ہندوستان میں وہی کیا جو انگلستان میں خود زبان انگریزی کے ساتھ ریٹا سانس لے سولہویں صدی میں اوررومانس (افسانہ نگاری) کے شوق نے اٹھارہویں صدی میں کیا تھا۔ ترجموں سے اس انقلاب کی ابتدا ہوئی۔ انگریزی ادب نے جس میں نظم نثر اور ڈراما سب کچھ داخل ہے بہت گہرا اثر ڈالا اور ہمارے رہنماؤں کے دل میں اردو زبان کے

لے نشاۃ ثانیہ یعنی پندرہویں صدی عیسوی میں یورپ میں اور علی الخصوص اٹلی میں فنون لطیفہ بلکہ جمیع مروجہ علوم و فنون کا قرون وسطی کے اثر سے نکل جانا اور ایک نیا طرز

اسی نئے طرز پر ترقی کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ابتدائی نقوش البتہ زیادہ گہرے نہیں تھے کیونکہ نقاش یا تو زبان انگریزی سے بالکل نا آشنا تھے یا بہت کم واقفیت رکھتے تھے وہ اس جدید رنگ سے اُن تراجم کے ذریعہ سے واقف ہوئے تھے جو خود انگریزوں کے ایما سے کرائے گئے تھے۔ مگر باوصف اس کمی کے وہ اس جدید رنگ کی تمام خوبیوں سے بخوبی واقف تھے اور انھوں نے اب ارادہ کر لیا تھا کہ طرز قدیم کو جس میں ما نہ حال کی روش کے اعتبار سے اکثر خرابیاں پائی جاتی تھیں بدل ڈالیں اور اُس میں ایک جدت کی چاشنی پیدا کریں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ تغیر فوراً اور دفعتاً نہیں ہوا۔ بلکہ آہستہ آہستہ اور بتدریج عمل میں آیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے طرز کے ساتھ پُرانا طرز بھی قائم رہا۔ برخلاف رینا سانس اور رومانس کے دلدادوں کے ہماری زبان کے راہ نماؤں نے اپنے قدیم شعرا کے ادب و احترام اور نیز اُن کے رنگ کی طرح سرائی اور قدردانی میں کسی قسم کی کمی نہیں کی۔ مولانا حالی کی ”یادگار غالب“ اور آزاد کا ”مطبوعہ دیوان ذوق“۔ ہمارے اس دعوے کی پوری طرح تائید کرتے ہیں۔ ہمارے راہبر قدامت شکن نہ تھے بلکہ جدید رنگ کی تائید و تلقین کرنے کے باوجود وہ قدامت پرست رہے۔ اُن کی غرض صرف یہ تھی کہ ادب اُردو کا دائرہ اتنا وسیع ہو جائے کہ اُس میں جدید رنگ بھی شامل ہو کر اُس سے پُرانے رنگ کا تصنع اور تکلف جاتا رہے۔ فضول مبالغے، دوار کا تشبیہیں بے مزہ لفاظی، ان چیزوں کے وہ مخالف تھے اور اُنکی اصلاح کی بنیاد انھیں خرابیوں کے دور کرنے پر پڑی تھی۔

جدید رنگ کی خصوصیات جو جو جدید رنگ پھیلتا گیا اور قوی ہوتا گیا اُسی قدر وہ مقبول ہوا اور اُسکے معرّف اور برتنے والے پیدا ہوتے گئے۔ نئی پود جو قدیم رنگ سے

بالکل نا آشنا تھی اُس نے اس جدید رنگ کو بہت شوق کے ساتھ اور بہت جلد قبول کیا۔ اس رنگ کے خاص خصوصیات یہ ہیں۔ نئے سبکٹ اور مضامین تلاش کیے گئے۔ غزلوں کا دائرہ جدید خیالات کے اظہار کے لئے تنگ اور بے مناسب پایا گیا۔ مسدس اور مثنوی کا دور دورہ ہوا کیونکہ ان اصناف کے لکھنے والوں کو زیادہ آسانی ہوتی ہے قافیوں پر قابو ہوتا ہے اور اظہار خیال مسلسل کیا جاسکتا ہے جو غزل میں مشکل ہے۔ ایسے مضامین جنکی عبارت میں تکلف اور تصنع کی ضرورت تھی ترک کئے گئے۔ رباعی اور قطعات پر زیادہ توجہ لگی۔ نچرل مضامین جو قدیم شاعری میں پس پشت ڈال دیے گئے تھے اب پیش پیش ہو گئے اور ان پر بالاستیعاب لکھا جانے لگا مثلاً برکھارت، جاڑے اور گرمی کی بہاریں، دریا کی روانی، پہاڑوں کے خوشنما مناظر، اب ہماری جدید شاعری میں داخل ہو گئے جو قدما کے یہاں خال خال نظر آتے ہیں۔ اسی طرح خیالی نظمیں، بیانیہ نظمیں، تاریخی نظمیں، نصیحت آمیز اور اخلاقی نظمیں، پوشیل نظمیں، اشعار بصورت سوال و جواب وغیرہ وغیرہ بھی جدید شاعری میں جگہ پانے لگے۔ غزلوں میں بھی بہت بڑا انقلاب ہوا اب وہ پُرانے فسادہ مضامین لفظ کا کل انگلی، چوٹی، ہستی کا جل وغیرہ کے معیوب سمجھے جانے لگے، اب جذبات انسانی، اور کیفیات قلبی کا من و عن اظہار اور بے ثباتی دنیا وغیرہ کا نہایت پر اثر الفاظ میں بیان کیا جانا داخل فیشن ہو گیا۔ حسرت موہانی اور عزیز لکھنوی کی غزلیں اسی قبل کی ہوتی ہیں۔

ایجاد اور اختراع کے شوق کی ترقی کے ساتھ کچھ ایسے لوگ بھی

اصناف سخن میں جدید

پیدا ہوئے جنہوں نے انگریزی نظموں کی بعض بحریں اردو میں داخل کرنے کی
 کوشش کی۔ مگر اس بات کا خیال نہیں رکھا کہ اُس قسم کی نظمیں بہ لحاظ اپنی
 نوعیت کے زبان اردو سے میل نہیں کھاتیں۔ اسی طرح بلینک درس (نثر مرجز)
 کے بھی بہت شائق پیدا ہو گئے مگر اس کو بھی پبلک مذاق نے پسند نہیں کیا اور
 یہ صنف بھی اردو میں بالکل نامقبول رہی۔ ابتدا میں بعض مشہور اور کلمہ شوق استادوں
 نے اس پر طبع آزمائی کی تھی، مثلاً مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی مولانا شری
 مرحوم آزاد کا کوروی وغیرہ۔ اور اب بھی کچھ لوگ اس قسم کی بے قافیہ نظمیں لکھتے ہیں۔
 مگر ان کو رواج عام شہرت نہیں دیتا۔ مولوی عظمت اللہ نے یہ جدت کی ہے کہ
 ہندی دوہروں کی پیروی اردو نظم میں شروع کر دی اور الفاظ اور مضامین وغیرہ
 بھی ہندی ہی ہوتے ہیں۔ اکثر ایسی نظمیں نہایت دلکش اور بامزہ ہوتی ہیں۔
 اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ قدیم طرز اور معمولی اصناف سخن بالکل بھلا دیے گئے
 تھے۔ ایسا نہیں ہوا۔ مسدس یعنی چھ مصرعہ والی نظم کو جو مرثیہ کے واسطے مخصوص
 ہو گئی تھی مولانا حالی نے اپنی مشہور کتاب ”مد و جزر اسلام“ معروف مہندس حالی
 لکھ کے شہرت جاودانی بخشی۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد سے اس صنف خاص کا
 بہت رواج ہو گیا اور اب یہ اس قدر مقبول ہے کہ ہر قسم کی نظمیں نچرل، بیانیہ،
 مدحیہ، اخلاقی، سیاسی، وطنی ترانے، تاریخی نظمیں، سب اسی صورت میں لکھی جاتی ہیں۔
 اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اس کی بحریں نہایت زور دار اور خوش آئین معلوم ہوتی ہیں۔
 سلسلہ بیان کا اس صنف میں بہت موقع ملتا ہے۔ چاروں مصرعوں کے ہم قافیہ
 ہونے کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوتی جس سے شعر کا لطیف اور ترنم

بڑھ جاتا ہے۔ مسدس کے علاوہ اور اصنافِ نظم میں بھی مضمون کے ساتھ مناسبت اور میل کا بہت لحاظ رکھا جاتا ہے۔ نفسِ شعر میں یہ تغیر ہوا ہے کہ یا وہ گوئی اور مبالغہ آمیز باتیں ترک کر دی گئی ہیں۔ اور اب سادگیِ صفائی اور واقعیتِ شعر کی جان سمجھی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے زمانہ موجودہ کی نظمیں بہت مؤثر اور جذباتی بھری ہوتی ہیں۔

جدید رنگ کے اثرات انگریزی طرزِ تعلیم نے اُس عام افسردگی کو دور کر دیا جو آخرِ آخر میں لکھنؤ اور دہلی کی شاعری پر چھپا گئی تھی۔ اُس نے شاعری کا دائرہ وسیع کیا اور ایک نئی روح آزادی اور بلند خیالی کی پھونکی۔ شرکی ترقی اور جدید فنِ تنقید اور ڈراما کے رواج کا بھی وہی باعث ہوئی۔ اُسکی وجہ سے ایک وسیع اور قیمتی ذخیرہ الفاظ، نئے تخیلات، نئی تشبیہات، نئے نئے مناظر اور شعر کے نئے نئے سامانِ زینت فراہم ہوئے۔ نئے نئے مضمون اور خیال ہاتھ آئے۔ اور ان خیالات کے اظہار کے لئے نئی طرزیں اور صورتیں اختیار کی گئیں۔ اُسکی مدد سے اکثر جدید الفاظ و بان میں داخل ہوئے اور زبان اس قابل ہو گئی کہ معنی کا نازک نازک فرق الفاظ کے ذریعہ سے ادا کر سکے۔ انگریزی تعلیم کے اثر نے زبانِ اردو کو قدامت پرستی کی زنجیروں سے آزاد کیا۔ جس نے لوگوں کے دل و دماغ کو ایسا جکڑ رکھا تھا کہ ان کے خیالات میں تنوع باقی نہیں رہا تھا۔ ان کا طبع نظر محدود ہو گیا تھا اور انکی ذہانت و طباعی رنگ خوردہ ہو گئی تھی۔ ہندوستان کی ویسی زبانوں میں اُسکی وجہ سے گویا کایا پلٹ ہو گئی۔ اور اب وہ ایک درخشاں مستقبل اپنے سامنے رکھتی ہیں اور نئے تجارب اختیار کرنے اور نئے خیالات کے اظہار میں ان کو اپنے اوپر پورا بھروسہ ہے اُسے ان میں اتنا تغیر عظیم

پیدا کر دیا ہے کہ زمانہ حال کی تصانیف اُن زبانوں میں گویا دوسری زبان کی تصنیفیں معلوم ہوتی ہیں۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ ان خوبیوں کے باوجود بعض خرابیاں بھی اُسی کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔ مثلاً مقررہ قواعد عروض سے لاپرواہی۔ ہر قسم کے قابل و ناقابل مضمون کو شعر کے سانچے میں ڈھالنا۔ انگریزی الفاظ کی بھرمار۔ پھر بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کے فوائد نقصانات سے زیادہ ہیں اور یہ خرابیاں بھی جو آج پیش نظر ہیں کسی وقت دفع ہو جائیں گی۔

جدید ادب کے تین طرز پہلا طرز ان لوگوں کا ہے جو پس پشت دیکھنا اپنا نصب العین سمجھتے ہیں۔ یعنی قدامت پسند فرقہ جو بجائے زمانہ موجودہ کے

جدید ادب کے تین طرز
پہلا طبقہ

گزشتہ زمانہ میں زندگی بسر کرتا معلوم ہوتا ہے۔ ان کو اگلے وقت کی زبان تو پسند ہے اور خود اپنی زبان کسی طرح پسند نہیں آتی۔ اپنے کلام کو قدیم سانچے میں ڈھالتے اور جدید طرز سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک معمولات زندگی پر غور کرنا بھی ایک گناہ کبیرہ ہے اور یہ اس کو ایک بڑے فخر کی بات سمجھتے ہیں کہ ایسے مضامین جن میں کچھ فلسفہ کچھ تصوف اور کچھ عاشقانہ رنگ کی آمیزش ہو بس انھیں میں اشعار کہے جائیں۔ اگر ان کو حقیقی تصوف اور عاشقانہ رنگ سے لگاؤ ہو تو البتہ معذور تھے۔ مگر بغیر کسی تعلق کے یہ یا تو قدامت کے محض نقال کہے جاسکتے ہیں یا الفاظی کے شعبہ باز پرانے مضامین کے ساتھ پُرانی بجز اور الفاظ استعمال کرنے میں بھی اُن کو انہماک ہے۔ یہ لوگ اس وجہ سے شعر کہتے ہیں کہ صرف شاعری کو دلیل علم و قابلیت جانتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں پر گزیری شاعر پوپ کا وہ شعر صادق آتا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔

”وہ شعر اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اُن کے باپ بھی شعر کہتے تھے۔ اور اپنی

عدم ذہانت سے اپنی ماضی کا اظہار کرتے ہیں۔“
 ظاہر ہے کہ ایسے لوگ سچے شاعر کہلانے کے کیونکر مستحق ہو سکتے ہیں البتہ شاعروں
 کے نقال کہے جاسکتے ہیں۔ اسی قسم کے لوگوں کے کلام سے آجکل کے رسالے اور
 گلدستے بھرے ہوتے ہیں۔ مگر ان کے ساتھ ہی کچھ ایسے بھی ہیں جو قدیم طرز کی پیری
 زیادہ قابلیت اور ہوشیاری سے کرتے ہیں اور قدما کی جانشینی کے مستحق سمجھے جاسکتے
 ہیں مگر ہمارے ملک کے بعض طبیعت دار و جوان ان لوگوں کے کلام کو بھی پسند نہیں کرتے غرض کہ
 طرز قدیم کے قابل اور ناقابل دونوں قسم کے پیرو زمانہ موجودہ کی رفتار سے پیچھے ہٹتے
 جاتے ہیں۔ اور فی الحقیقت اگر زمانہ موجودہ کی ضروریات پر نظر ڈالی جائے تو یہ کوئی
 مفید خدمت بھی انجام نہیں دیتے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انکی کوششوں سے
 شاعری کا لنگر حرکت میں ضرور ہے۔

دوسرا طبقہ یہ طبقہ طبقہ اول کی بالکل ضد ہے۔ یہ ہر مغربی چیز کا عاشق و دلدادہ
 ہے۔ اپنے ملک کی پرانی روایات کو نظر حقارت سے دیکھتا ہے مغربی شاعری کی
 تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے اور اتنا نہیں سمجھتا کہ مغربی شاعری
 مشرقی لوگوں کے کہانت تک حسب حال اور مناسب ہو سکتی ہے۔ یہ اس وجہ سے
 ہے کہ مغربی تعلیم کی شراب نے ان لوگوں کے دماغ کو چکر دیا اور اتنا مدہوش کر دیا ہے
 کہ وہ کوئی صحیح رائے نہیں قائم کر سکتے۔ اس طرز کے بانیوں نے محض نقل کو اصل الاصول
 قرار دیا ہے۔ وہ ہر چیز کو نئے رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ پرانے زمانے سے اور
 پرانے زمانے کی باتوں سے یا تو شرماتے ہیں یا ان کو بے اعتنائی سے ٹال دیتے ہیں
 ایسے لوگوں کے نزدیک جدت اور صرف جدت شاعری کی جان ہے۔ یہ لوگ

اس بات کی مطلق پڑ نہیں کرتے کہ اُن کا کلام کسی قسم کا اثر کرتا ہے یا نہیں اور حالاتِ ملکی کے مناسب ہے یا نہیں۔ اسی قسم کے لوگوں نے کتابوں کے مارکٹ کو ترجموں سے بھر دیا ہے۔ وہ بھی نہایت بے سلیقگی سے محض فروخت کی غرض سے کئے گئے ہیں۔ ان ترجموں میں یہ بہت بڑا نقص ہے کہ علاوہ غلط اور غیر معتبر ہونے کے وہ عمدہ اور مستند کتابوں کے بھی ترجمے نہیں ہوتے بلکہ صرف ایسی کتابوں کے ترجمے ہوتے ہیں جو پسندیدہ عوام میں مثلاً انگریزی ناولسٹ رینالڈس کے تراجم۔ اور اسپر بھی غضب یہ ہے کہ اکثر ترجمے اصل سے نہیں کیے جاتے بلکہ ترجمہ در ترجمہ ہوتے ہیں جس سے اصلیت بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔ اس ترجمہ کے شوق بلکہ ناکارہ کتابوں کے ترجمہ کے شوق کے ساتھ ایک نیا طرزِ تحریر بھی اختیار کیا گیا ہے۔ جس کو انگریز جوئلیس، کہتے ہیں یعنی ایک ایسی ناقص اور نامکمل زبان جو نہ پوری طرح سے خیالات کے اظہار پر قادر ہے نہ معنی کے نازک نازک فرقوں کے الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر کر سکتی ہے۔ یہ حال عام طور پر اُن کرایہ کے ٹیٹو ناول نویسوں کا ہے جنکی لفو اور مضرتصانیف سے بازار بھرا ہوا ہے نیز جلد باز اخبار نویسوں کا بھی یہی حال ہے۔ اُن نے طرز کو ترک کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ طرز ادا نامکمل ہو۔ رنگ فوق البھڑک ہو۔ اور عبارت طرفہ معجون بن جائے۔ ادیبوں کو اس کا ضرور خیال رکھنا چاہئے کہ بُرائی کو خوبصورتی پڑ بھدے پن کو حسن تناسب پڑ اور شور و غل کو نفیس پرہیز گز ترجیح نہ دیں۔

تیسرے طبقہ یہ اُن اعتدال پسندوں کا اہم طبقہ ہے جو قدیم و جدید دونوں طرزوں کی خوبیوں کا خیال رکھتے ہوئے دونوں کو ملانا چاہتے ہیں۔ یہ گورمانہ موجودہ میں ہیں مگر زمانہ گزشتہ کی عظیم الشان روایات سے بھی پوری طرح باخبر ہیں۔ یہ روایات قدیم

بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں مگر اپنے خیالات اپنے ہی ماحول سے حاصل کرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان میں اور بچیلٹی یعنی اہلیت ہے۔ انکی غرض وہی ہے جو قدیم یونانی علم الاصنام کی روایات کے مطابق حبیس کی تھی جو ایک سنہری بھٹی کی تلاش میں ملکوں ملکوں پھرتا تھا یہ لوگ بھی اُسی طرح اپنے کسی محبوب تخیل کی تلاش میں ملکوں ملکوں کے ادب و شاعری کی سیر کرتے ہیں۔ ان کو ایک ایسا تاجر نہ سمجھنا چاہیے جو ایک ملک میں مال خریدتا اور دوسرے میں بیچ دیتا ہے بلکہ یہ اس المال شاعری کے صنّاع ہیں اور اپنے مصنوعات کے واسطے جنس خام اپنے ہی ملک سے تلاش کرتے ہیں اور ان سے کسی نئی خوبصورت چیزیں بناتے ہیں یا اپنے شعروں سے اپنے دلیرانہ قوم کے دل و دماغ کی واسطے غذائے روحانی تیار کرتے ہیں یہ زمانہ گذشتہ کو خوب سمجھتے ہیں اور اُس سے محبت رکھتے ہیں جو اپنے زمانہ کی بڑی قدر کرتے ہیں اور زمانہ آئندہ سے مقابلہ کا خوف نہیں کرتے۔ اسی طبقہ میں ذیل کے مشہور شعرا و شاعران کو دخل سمجھنا چاہیے مثلاً حالی آزاد، شرر، شرار، سرور، مولوی محمد اسماعیل، اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر سر محمد اقبال، اور حسرت وغیرہ جن میں سے بعض کے مختصر حالات ذیل میں غلبند کیے جاتے ہیں۔ ان حضرات نے دونوں طرزوں کی خوبیوں اور عمدگیوں کو اخذ کر لیا ہے اور انھیں پرآئندہ ترقی کی اُمیدوں کا دار و مدار ہے۔

حالی سلسلہ ۶
شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی سلسلہ ۶ میں پانی پت میں
تاسلسلہ ۶ پیدا ہوئے۔ انصاریوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے
تھے۔ انھیال سادات کے ایک معزز گھرانے میں تھی اور پدری سلسلہ ان کا ایک
بزرگ خواجہ ملک علی تک پہنچتا ہے جو اپنے وقت کے ایک مشہور معروف عالم تھے

اور زمانہ غیاث الدین بلبن ہرات سے ہندوستان آئے تھے اور کچھ گاؤں پانی پت کے قریب اُن کے گزارہ کے واسطے بادشاہ نے مقرر کر دیے تھے۔ وہ پانی پت کے قاضی بھی مقرر ہوئے تھے اور اجناس بازاری کے نرخ کا تقرر اور عیدین میں نماز پڑھانے کی خدمت اُن کے سپرد ہوئی تھی۔ خواجہ صاحب کے والد خواجہ ایزد بخش غربت اور ناداری کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے جب اُن کا انتقال ہوا تو خواجہ صاحب کی عمر نو برس کی تھی۔ اُن کے والد کو ایک مجنونانہ کیفیت رہتی تھی لہذا اُنکی تعلیم و تربیت کا بار اُنکے بڑے بھائی اور بہن پر پڑا۔ اُس زمانہ کے دستور کے مطابق قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد اُنھوں نے رسمی تعلیم عربی و فارسی کی شروع کی۔ سید جعفر علی میرمنون دہلوی کے بھانجے سے فارسی پڑھی اور مولوی ابراہیم حسین انصاری سے جو بعد فراغت علوم لکھنؤ سے واپس گئے تھے عربی شروع کی۔ ابھی درسیات سے فراغت نہیں ہوئی تھی اور ہنوز سترہ برس کی عمر کو نہیں پہنچے تھے کہ ان کی شادی ان کی مرضی کے خلاف کر دی گئی۔ تحصیل علم کے شوق میں اور نیز اس خیال سے کہ بیوی کے خبر گیران خوشحال ہیں یہ چپکے سے گھر چھوڑ کر ۸۵۲ھ میں دلی چلے گئے۔ یہاں مولوی نوازش علی سے جو اس زمانہ کے ایک مشہور معلم اور واعظ تھے سال ڈیڑھ سال تک عربی پڑھتے رہے۔ اس وقت ان کو صرف نحو منطق عروض وغیرہ میں کافی دستگاہ ہو گئی تھی۔ مگر ۸۵۴ھ میں اپنے اعزاء کے اصرار سے پھر پانی پت واپس گئے یہاں اپنے طور پر کتب بینی کا مشغلہ جاری رہا۔ ۸۵۴ھ میں کلکٹری حصار میں ایک ملازمت کر لی مگر ۸۵۶ھ کے ہنگامہ کی وجہ سے پھر اپنے وطن واپس آئے۔ اُنکی مرتبہ منطق و فلسفہ کے ساتھ حدیث و تفسیر کی کتابیں بھی نظر سے گذریں۔ غرض کہ

تین چار برس پانی پت میں قیام کے بعد ان سے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے
 جو کہ جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے رئیس اعظم تھے ملاقات ہو گئی اور نیرنگی مصاحبت میں
 رہنے کا موقع مل گیا۔ نواب صاحب موصوف ایک جید فاضل اور مشہور شاعر تھے
 اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ آیا
 حالی نے اپنا کلام شیفتہ کو دکھلایا اور ان سے اصلاح لیتے تھے یا نہیں مگر ہمیں
 کوئی شک نہیں جیسا کہ خواجہ صاحب کو خود اعتراف ہے کہ نواب صاحب کی
 ملازمت اور صحبت سے ان کو بہت کچھ فائدہ پہونچا۔ ان کے اس شعر سے اتنا ضرور
 ثابت ہوتا ہے کہ وہ شیفتہ سے استفادہ سخن کرتے تھے ۷

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
 شاگرد میرزا کا مُقلد ہوں تمیر کا

جہانگیر آباد کی شاعرانہ فضا۔ نواب صاحب کی صحبت و ہانکی فارغ البالی کی
 زندگی۔ ان سب چیزوں نے پُرانا شعر و شاعری کا شوق جو ایک مدت سے افسردہ
 ہو رہا تھا از سر نو تازہ کر دیا اور اب یہ اپنی غزلیں مرزا غالب کے پاس منظر اصلاح
 دلی بھیجنے لگے وہ شیفتہ کے پاس بحیثیت اُن کے رفیق اور ان کے بیٹوں کے معلم کے
 تقریباً آٹھ برس رہے۔ اسکے بعد وہ قسمت آزمائی کے لیے لاہور آئے جو اس وقت
 دلی سے بعد غدر نکلے ہوئے لوگوں کا ملجا و ادا ہو رہا تھا۔ یہاں اُن کو گورنمنٹ بک ڈپو
 میں ایک جگہ مل گئی جس میں اُن کو سرٹیفکیٹ تعلیم کی انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی
 کتابوں کی عبارت دیکھنا اور درست کرنا پڑتی تھی۔ چونکہ اس کام میں انگریزی ادب سے
 ایک قسم کی بالواسطہ واقفیت حاصل ہو گئی اور انگریزی خیالات اور طرز اداسے

ایک خاص مناسبت پیدا ہو گئی تھی لہذا مشرقی شاعری اور مشرقی انشا پردازی کی فضول باتوں کی وقعت اُن کے دل میں کم ہو گئی اور اسی کے ساتھ اپنی زبان اور اپنی شاعری میں بھی اُسی طرز کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا یہ اس جگہ پر تقریباً چار برس رہے ہونگے کہ وہاں سے دلی واپس آنا پڑا جہاں اُن کو انگلو عربک اسکول میں ٹیچری کی جگہ مل گئی۔ لاہور میں حفیس کلج میں بھی آٹھ مہینے تک وہ ٹیچرہ چلے گئے مگر وہ جگہ اُن کو پسند نہیں آئی تھی۔ دلی میں سرسید مرحوم سے اُن سے ملاقات ہوئی جنکی خاص فرمائش سے مشہور و معروف ”مسدس حالی“ لکھا۔ عشاء میں جبکہ وہ عربی کلج میں معلم تھے سر آسمان جاہ علی گڑھ آئے ہوئے تھے جن سے سرسید مرحوم نے اُن کا تعارف کرا دیا اور انھوں نے ازراہ قدر دانی و مردم شناسی کچھ تر و پیہ ماہوار نظام گورنمنٹ سے ادبی خدمات کی انجام دہی کے واسطے اُن کا مقرر کرا دیا۔ بعد کو جبکہ مولانا حالی علی گڑھ کلج کے ڈیپوٹیشن کے ساتھ حیدر آباد گئے تھے تو یہ تنخواہ مبلغ سو روپیہ ماہوار کر دی گئی تھی۔ ملازمت سے دست کشی کے بعد مولانا نے پانی پت میں سکونت اختیار کر لی تھی جہاں ایک قسم کی فارغ البالی کے ساتھ اپنے محبوب شغل تصنیف و تالیف میں وہ زندگی بسر کرتے تھے۔ سن ۱۹۰۷ء میں خطاب شمس العلامجلد ۷؎ کی قابلیت اور تعلیمی خدمات کے سرکار سے عطا ہوا۔ بالآخر ستر برس کی طویل عمر میں ۱۳ صفر ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۴ء کو اس دارنا پاؤں دار سے رحلت کی۔

مولانا حالی پُرانے زمانے کے یادگار لوگوں میں تھے۔ نہایت خلیق ، منسار، حلیم الطبع اور سچے فدائی قوم تھے۔ دنیوی جاہ و ثروت کا خیال اُن کے

دل میں مطلق نہ تھا۔ اُن کی زندگی ایک سچے انشا پرداز کی زندگی تھی جس نے اپنے تعلیمی تصنیفی مشاغل کے آگے دنیوی مرتبہ و عزت کو ہمیشہ پس ہٹا رکھا۔ قومی ہمدردی اُن میں کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی مگر اُس کے ساتھ فرقہ وارانہ اختلافات سے وہ بالکل علیحدہ تھے۔ اُن کا طبع نظر بہت بلند تھا اور اُن لم تَقْوُونَ مَالًا تَفْعَلُونَ ۛ کے وہ پورے عامل تھے۔

حالی کی شاعری اور اُس پر غالب اور شیفہ کا اثر

حالی کی شاعری کی ابتداء ہلی میں ہوئی جبکہ وہ سترہ برس کی عمر میں ٹھپ کر گھر سے نکل گئے تھے۔ دلی میں وہ مرزا غالب کی صحبت میں اکثر آتے جاتے تھے اور انہیں کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا تھا۔ اس اثنا میں وہ مشاعروں میں بھی شریک ہوتے اور نکات شعریہ مرزا غالب ہی سے حل کرتے تھے۔ مرزا بھی اُن سے بہت خوش تھے اور اُنکی طباعی اور مستعدی کی قدر کرتے تھے۔ دلی چھوڑنے کے بعد وہ ہمایوں آباد آئے جہاں نواب مصطفیٰ خاں شیفہ کی صحبت میں اُنکی شاعری کے رنگ میں سختگی آئی۔ نواب صاحب کی صحبت اُنکی شعر گوئی کی محرک ہوتی تھی اور یہیں اُنھوں نے اپنا رنگ بدلا اور مقصد شاعری کو بھی تبدیل کیا۔ اب اُن کو پُرانے رنگ کی فضول باتیں اور بے لطف مبالغے پسند نہیں آتے تھے۔ کسی چیز کا من و عن بیان سیدھے سادے الفاظ میں جہمیں حقیقی جذبات کا بھی کچھ شمول ہو، اب اُن کو مرغوب ہونے لگا۔ مرزا غالب سے اب بھی وہ اصلاح لیتے تھے اور اُنھیں کا رنگ اُن پر غالب تھا۔ ہر چند کہ شیفہ کا اثر اور رنگ اُن کے اس زمانہ کے کلام میں بہت کچھ پایا جاتا ہے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد وہ ہمایوں آباد سے لاہور آئے۔ مگر یہاں اُن کا دل نہیں لگتا تھا اور

یہاں کا قیام وہ اپنے واسطے ایک قید سمجھتے تھے چنانچہ اس زمانہ کے لاہور کے حالات اور وہاں کے لوگوں کی بے اعتنائی کا حال جو انھوں نے قلمبند کیا ہے اس سے اُن کے دلی خیالات کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے مگر ہمیں لاہور میں گورنمنٹ بکڈپو کی ملازمت میں اُن کو انگریزی علم ادب سے ترجموں کے ذریعہ سے واقفیت حاصل ہوئی جس کا اثر ان پر بہت اچھا پڑا۔ یہ زمانہ انکی علمی زندگی کے نوج بد لجانے کا زمانہ تھا اور ان کے اس زمانہ کی تحریروں میں ہم کو اُس جدید رنگ کی ابتدائی نظر آتی ہے جو بعد کو ان کی زندگی کا بہت بڑا کامیاب ثابت ہوا۔ وہ انگریزی شاعری کے بڑے مداح تھے اور انکی سادگی اور صفائی اور بلند نظری کو بہت پسند کرتے تھے۔ اُن کا دل چاہتا تھا کہ کاش یہی سب چیزیں ہمارے ملک کی شاعری میں بھی داخل ہو جائیں۔ اسی زمانہ میں لاہور میں ۱۲۸۷ھ میں ایک ادبی انجمن قائم ہوئی جسکے بانی مولانا محمد حسین آزاد اور کنیل ہال رائیڈ اور گٹر سرٹھ تعلیم پنجاب اُسکے سرپرست تھے۔ اس انجمن کے جلسوں میں گو مشاعرے ہوتے مگر وہ اُس زمانہ کے مشاعروں کی طرح نہیں تھے یعنی نہ تو کوئی مصرعہ طبع مقرر کیا جاتا نہ کسی خاص ردیف و قافیہ کی پیروی کی جاتی۔ لوگ اپنے اپنے اشعار جو کسی خاص مضمون پر لکھے جاتے، جو انجمن کی طرف سے پہلے سے مقرر ہو جاتا تھا انجمن کے جلسوں میں پڑھتے تھے۔ خالی گو کہ اس انجمن کے بانیوں میں نہ تھے مگر اسکے ابتدائی شرکاء میں ضرور تھے اور اسکے جلسوں کی شرکت میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے تھے چنانچہ اُن کی چار نظمیں ”برکھارت“، ”نشاط اُمید“، ”مناظرہ رحم و انصاف اور حب وطن“، اسی انجمن کے مشاعروں میں پڑھی گئی تھیں اور بہت

مقبول ہوئی تھیں۔

سر سید کا اثر غالب و شفیقہ کا اثر اُن کی شاعری پر بطور بالا میں بیان ہوا اب دیکھنا چاہیے کہ سر سید مرحوم نے اُن کی شاعری پر کیا اثر ڈالا۔ سر سید اس زمانہ میں مسلمانوں کو اُن کے خواب غفلت سے چوکمانے اور انکی اصلاح کے کام میں مشغول تھے جب انھوں نے حالی کی طبیعت کا رنگ دیکھا تو ان سے کہا کہ موجودہ مسلمانوں کے زوال کے متعلق ایک نظم لکھ دو۔ مسدس حالی اسی کوشش کا نتیجہ تھا۔ یہ نہایت کامیاب کتاب ثابت ہوئی اور چھپنے کے ساتھ ہی فوراً مقبول عام ہو گئی۔ اُن کا رنگ اس قدر مقبول ہوا کہ اُس کے بہت سے ناقل پیدا ہو گئے اگر اب تک کسی شخص کو اس صنف میں وہ کامیابی نہیں نصیب ہوئی جو مولانا حالی کو ہوئی جسکے وہ فی الواقع مستحق تھے اب وہ ایک قومی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ مسدس کے بعد بعض نظمیں دہلی کی تباہی اور بربادی پر اور حکیم محمد خان صاحب کا مثنویہ حمیں مسلمانوں کی زمانہ گزشتہ کی عظمت اور زمانہ موجودہ کی پستی کا نہایت مؤثر الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے اسی رنگ میں لکھا گیا۔ ان نظموں سے اُن کی شہرت ایک رفاور اور خطیب کی ہو گئی۔ وہ اپنے ہم مذہبوں کو اپنے پرزور اور مؤثر الفاظ کے ذریعہ سے ابھارتے تھے کہ اب وقت آگیا ہے کہ کمر ہمت باندھیں اور اپنی قوم کو قعر مذلت سے نکالنے میں جو کچھ ان سے ہو سکے مدد دیں۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اُن کے مخاطب اُن کے اہل مذہب ہی نہیں بلکہ کل اہل وطن یعنی اہل ہند تھے۔ اُن کے اعلیٰ خیالات شریف عورتوں کے متعلق ”چپ کی داد“ اور ”مناجات بیوہ“ کی صورت میں ظاہر ہوئے جو نہایت مؤثر اور دلکش نظمیں ہیں۔

آخر عمر میں اُن کے اشعار فلسفیانہ اور عمیق ہوتے تھے جیسا کہ اُن کے ترکیب بند ”تحفۃ الاخوان“ سے ظاہر ہے۔

تصانیف مولانا حالی کی منظوم تصانیف حسب ذیل ہیں۔ اُن کی نشر کی تصانیف نشر کے باب میں بیان کی جائیگی :-

(۱) ثنویاں - مناظرہ تعصب والضاف - رحم والضاف - برکھارت - نشاط اُمید حُب وطن - (۲) مسدس حالی - (۳) شکوہ ہند - (۴) کلیات حالی جس میں اُن کا دیوان مع مقدمہ شعر و شاعری شائع ہوا ہے - (۵) مناجات بیوہ، اور چُپ کی داد - (۶) مرثی غالب و حکیم محمود خاں و تباہی دہلی وغیرہ (۷) مجموعہ نظم حالی جس میں اردو کی متفرق نظمیں ہیں - (۸) مجموعہ نظم فارسی جس میں فارسی کا کلام ہے۔

ثنویاں انکی ثنویاں بہت مقبول ہوئیں۔ یہاں تک کہ بعض تو یونیورسٹیوں کے کورس میں داخل ہیں۔ ان کی عبارت بہت صاف اور بے تکلف مشرقی مبالغہ اور صنائعِ بلاغ سے خالی ہے۔ ان میں اخلاقی تعلیم نہایت مؤثر اور دل فریب انداز سے دی گئی ہے اور کہیں کہیں بصورتِ مکالمہ ہے جس میں ہر فرق کی اچھائیاں اور بُرائیاں نہایت حُسن و خوبی کے ساتھ واقعات تاریخی کے حوالوں سے بیان کی گئی ہیں مثلاً ثنوی رحم و انصاف میں رحم اور انصاف دونوں اپنی اپنی فضیلتیں اور دوسرے کی خرابیاں اور نقص ایک دلکش انداز سے بیان کرتے ہیں۔ ان کا فیصلہ عقل کے سپرد کیا جاتا ہے جو فیصلہ کرتی ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم اور معاون و مددگار ہو۔ ثنوی برکھارت بھی نہایت عمدہ اور دلچسپ ثنوی ہے

اس میں ہندوستان کے موسم بہار یعنی برسات کا حال بڑی خوبی اور دلچسپی سے بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً بارش کے فائے پہاڑوں اور میدانوں میں اس موسم میں فرس فرس کرنا، بچھ جانا۔ کل جاندار ہستیوں میں ایک خاص قسم کی زندگی اور امنگ کا پیدا ہونا وغیرہ۔ اس کی زبان بے تکلف اور سہل اور طرزادانہایت نیچرل ہے۔ فضول مبالغے اور دراز کا تشبیہیں اور استعارے اس میں مطلق نہیں۔ یہ اس رنگ کی ابتدائی تصنیف ہے جس میں مولانا کو آخر عمر میں کمال حاصل ہوا۔ البتہ اگر پرانے شعرا کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو نظمیں بلحاظ زبان و خیال کے کوئی اعلیٰ درجہ کا کمال نہیں کہتیں۔ مگر اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک ایسے رنگ کی راہبر ہیں جس میں لوگوں کے اب یہ دلچسپ ہوتا جاتا ہے کہ علاوہ معمولی فرسودہ مضامین شاعری کے کچھ اور بھی چیزیں ہیں جن پر شاعر بخوبی طبع آزمائی کر سکتا ہے۔

مسدس حالی مولانا کی یہ سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ مشہور تصنیف ہے۔ یہ ایک نیا دور پیدا کرنے والی کتاب ہے۔ اس کی مقبولیت اب بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ یہ ایک اہم کتاب ہے اور اس کو تاریخ ارتقاء ادب اردو میں ایک سنگ نشان سمجھنا چاہیے۔ یہ ایک نیا تار ہے جو اردو کے اُفق شاعری پر طلوع ہوا۔ اس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی نظموں کی بنیاد پڑی اور اس نے یہ ثابت کر دیا کہ ایسی نثر اور نثر در نظمیں کے واسطے مسدس نہایت موزوں چیز ہے۔ اسکے بہت سے نقال پیدا ہوئے مگر کوئی شخص اب تک بہ لحاظ جوش اور زور و تخیل اور طرزاد کے مولانا تک نہیں پہنچا، اس میں اسلام کی گذشتہ عظمت، مسلمانان سابق کے کارنامے، ان کے بلند خیالات اور اولوالعزمیاں اور برخلاف اس کے

زمانہ موجودہ میں انکی پستی و ذوال اور سستی دکاہی کا ذکر ہے۔ آخر میں مسلمانوں سے اپیل کی گئی ہے کہ تاریخ عالم میں جو ان کا مرتبہ پہلے تھا اب پھر اُس کو حاصل کرنے کے لئے کمر ہمت باندھیں۔ یہ کتاب بوڑھے جوان۔ بچے سب کے دلپسند ہے اس نے کاروانِ مسلم کے لئے بانگِ جرس کا کام کیا کہ اٹھیں اور آمادہ کار ہوں۔ طبع ہوتے ہی اسکی عظیم الشان اشاعت ہوئی۔ زمانہ حال کی کوئی اردو کی کتاب مقبولیت میں اسکا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا مسلمان اس سے آشنا ہے اور کچھ عرصہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کو تو یہ حفظِ حق ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تمام قومی اچھائیوں اور بُرائیوں کا ایک ساتھ جائزہ لیتی ہے یعنی اچھائیاں زمانہ گزشتہ کی اور بُرائیاں زمانہ موجودہ کی۔ ہمیں شاعرِ زمانہ جاہلیت کی حالت، جزیرہ نماے عرب کی تمام تمدنِ دنیا سے انقطاعی صورت، عربِ اقوام کا آپس میں ذرا ذرا سی بات پر لڑنا جھگڑنا۔ اُن کا تعصب اور نارواداری، اُن کا طفیان و بُت پرستی وغیرہ وغیرہ نہایت صحیح واقعہ نگاری کے طریق پر دکھاتا ہے۔ اسی حالت میں پیغمبرِ اسلام کا ظہور ہوتا ہے۔ آپ کی تبلیغ کے ابتدائی ثمرات۔ اعلائے کلمہ حق۔ توسیعِ علوم۔ استیصالِ ظلم و تعصب۔ اصلاحِ اخلاق اور اُن تمام خوبیوں کی نشر و اشاعت جن کے مفقود ہونے سے آج کل اہل اسلام موردِ آفات ہو رہے ہیں اور جنکی کیفیت آخر کتاب میں نہایت وضاحت اور اثر سے لکھی ہے۔ ہمیں اسلام کی وہ تمام بیش بہا خدائیں بیان کی گئی ہیں۔ جو اُس نے اپنے علوم و فنون کے ذریعہ سے اخلاقی اور علمی نیامیں کی ہیں۔ پھر مسلمانوں کی تعمیرِ بلاد اور سیر و سیاحت کا ذکر ہے جس میں یہ بتایا ہے کہ وہ اپنے وطن سے

یکل کر دور و دراز مقامات پر مثلاً اسپین میں جبرالٹر اور ہندوستان میں کوہ
ہمالہ تک پہنچ گئے۔

ہمالہ کو ہیں واقعات اُن کے ازبر	نشان اُن کے باقی ہیں جبرالٹر پر
---------------------------------	---------------------------------

سر سید مرحوم اس کتاب کے متعلق یوں لے زنی کرتے ہیں :-
”یہ کہنا بالکل مناسب ہوگا کہ اس کتاب نے ہماری صنف نظم میں ایک
نیا دور پیدا کر دیا۔ اسکی عبارت کی خوبی اور صفائی اور روانی کی حقیقت
تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ امر کچھ تعجب خیز نہیں کہ اتنا مہتمم بالشان مضمون
استقدراعقیت کی پابندی کے ساتھ اور بلاغراق و مبالغہ اور تخیل و استعارہ
کے جو کہ ہماری شاعری کی جان اور شاعروں کا ایمان ہے اور پھر اسقدر
مؤثر اور سلیس اور فصیح طریقہ سے بیان کیا جائے۔ اُس کے بہت سے بند
تو ایسے ہیں کہ اُن کو پڑھ کر سخت سے سخت دل کے لوگ بھی بغیر آنسو بہائے
نہیں رہ سکتے کیوں نہ ہو جو چیز دل سے نکلتی ہے وہ ضرور دل میں گھر کرتی ہے“

شکوہ ہند [شکوہ ہند اور قصیدہ غیاثیہ بھی مسدس مدو جزر اسلام کے طرز میں
ہیں یعنی انہیں بھی وہی بیان اسلام کی قدیمی شان و شوکت اور موجودہ پستی شکست
کا ہے جو اب ہندوستان میں رونما ہے۔ ترک لذات کی جگہ مزیداری، سادگی کی
جگہ آرام طلبی، قوت اور مردانگی کے عوض ضعف اور بودا پن، چالاکی و مستعدی کے

۱۔ اس کا جواب بیان یزدانی نے ”خصت عروس“ کے نام سے لکھا ہے جس طرح شکوہ میں حال نے
ہندوستان کی شکایت کی ہے کہ اُس نے ہم کو خراب کیا اُسی طرح خصت عروس میں یزدانی نے خود
اپنی شکایت کی ہے کہ ہم نے ہندوستان کو خراب کیا ۱۲

بد کے سستی و کاہلی اب گھر گھر نظر آتی ہے۔ اس موقع میں کہیں کہیں تصاویر کا رنگ
شورخ اور تیز ہو گیا ہے مگر صرف اس غرض سے کہ خوابیدہ جماعت چوکنے اور
اپنے خواب غفلت سے بیدار ہو۔

مراثی [] مراثی مرزا غالب و حکیم محمود خاں وغیرہ بھی نہایت دلچسپ مثنوی اور
قابل قدر نظمیں ہیں۔ اول الذکر علی الخصوص نہایت ہی درد انگیز اور پُر زور
مرثیہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا رنج و غم مشکل بہ نظم ہو گیا ہے۔ وہ سچے جذبات
اور حقیقی تاثر سے ہرگز اور ایک غمزدہ دل کی کیفیات کی سچی تفسیر ہے سادگی یعنی
شائے عراق و مبالغہ سے اُس کا معرا ہونا جو مشرقی شاعری کا جوہر ہے اُسکا نشان
اقتیاز ہے اور فی حقیقت یہی ایک کتاب مولانا حالی کی شہرت شاعری کے واسطے
بالکل کافی ہے حکیم محمود خاں صاحب کے مرثیہ کا رنگ مسدس اور شکوہ کا رنگ
ہے۔ اس میں دلی کی تباہی اور مسلمانوں کی ہستی کا ذکر نہایت اثر کے ساتھ عبرت انگیز
طریقہ سے کیا ہے۔

مناجات بیوہ [] یہ چھوٹی سی عجیب و غریب کتاب مولانا کی ہمارے نزدیک مسدس
”اور شکوہ“ سے بھی زیادہ مطبوع خلائق ہے اسکی ہر کسی قدر غیر معمولی ہے جو اصطلاح
علم عروض میں ”صوت الناقوس“ کہلاتی ہے۔ فعلن فعلن فعلن فعلن۔ شوشل
معاملات کی اصطلاح کی ہوا اس کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں ہندوستان بھر
میں پھیلی ہوئی تھی۔ بنگال میں ویدیا ساگر بیوہ عورتوں کے حامی تھے ”مناجات بیوہ“
میں بیوہ عورتوں کی دردناک حالت اس انداز سے بیان کی گئی ہے کہ اس کو پڑھ کر
یاسن کر دل پھٹ جاتا ہے۔ اسکا ترجمہ ہندوستان کی اکثر زبانوں میں ہو گیا ہے

اس کتاب کے متعلق کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اس کو پڑھتے وقت اکثر شوہر دار عورتیں کہتی ہیں کہ کاش ہم بیوہ ہوتے تو اس سے زیادہ لطف اندوز ہوتے۔ اسکی تعریف اس سے بڑھکر اور کیا ہو سکتی ہے۔

چُشب کی داد اس کتاب میں عورتوں کی خوبیوں اور نیز ان کے اعلیٰ فرائض منصبی کا ذکر ہے۔ یہ حیدر آباد دکن میں مصنف نے ایک بہت بڑے جلسہ میں جسکے صدر مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر اعظم ریاست تھے پڑھکر سنائی تھی۔ یہ کتاب بھی مولانا کے خاص رنگ کی ہے یعنی اس میں بھی وہی سلاست بیان اور صفائی زبان اور سیدھی سیدھی باتیں ایک لطیف پیرایہ میں ہیں جو ان کا خاص شیوہ ہے۔ ان تمام نظموں کی یہ خاص خوبی ہے کہ فرقہ دارانہ اختلافات سے مصنف مُرتفع ہیں۔

دیوان حالی اس کے شروع میں مقدمہ شعر و شاعری ہے جس میں کہ نفس شاعری کی حقیقت سے نہایت فاضلانہ طور پر بحث کی گئی ہے۔ دیوان میں حسب معمول قدیم غزلیات قدیم و جدید دونوں رنگ کی رباعیات قصائد ترکیب بند تاریخیں سب کچھ ہیں۔ قطعاً میں اکثر کسی اخلاقی مسئلہ کو بصورت قصہ یا مکالمہ کے بیان کرتے ہیں۔ بعض قطعات فی الواقع نہایت بلند اور عمیق خیالات پر مشتمل ہیں غزلیات اور اصناف سخن میں سب سے زیادہ ہیں اور مغلوق و سچیدہ خیالات سے خالی ہیں بطرز جدید کی غزلوں میں پرانا رنگ بدل کر زمانہ حال کی روش کی ابتدا معلوم ہوتی ہے۔ یہ سب غزلیں جذبات سے لبریز ہیں بعض اشعار میں کوئی خیال یا واقعہ مسلسل قطعہ بند صورت میں بیان کیا گیا ہے جو موجودہ رنگ کی خاص پہچان ہے۔ رباعیات مختلف مضامین پر اکثر اخلاقی اور نصیحت آمیز ہیں۔ ان میں مفید اور کارآمد باتیں مؤثر اور زوردار الفاظ ہیں۔

قدما کے طرز پر بیان کی گئی ہیں جو بہت مقبول ہیں اور قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ اُن کا ترجمہ انگریزی میں مسٹر جی۔ اسی۔ وارڈ نے کر دیا ہے۔ قصائد کی یہ شان ہے کہ برخلاف طریقہ سابق کے مادی کی ساری قابلیت مدوح کی مدح اور محض لفظی شان و شکوہ میں صرف نہیں ہوتی بلکہ مدوح اپنے اہم فرائض اور اُردمہ داریوں سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے اور موقع موقع پر نصیحت و عبرت کی باتیں بھی اُس کو سنائی جاتی ہیں۔ موجودہ حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی تخت نشینی کا قصیدہ مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری اس میں نفس شعر و شاعری سے بحث اور شعر کے اعلیٰ آئینہ میل یعنی فہمائے مقصود کا ذکر ہے۔ ماہیت شعر کے متعلق مشرقی اور مغربی شعرا اور ناقدین کی رائیں نہایت تفصیل و وضاحت سے مثالوں کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ مقدمہ گو کہ بڑی قابلیت سے لکھا گیا ہے مگر کسی قدر سطحی ہے۔ لائق مصنف کا خیال ہے کہ اردو غزل اور نیز دیگر اصناف سخن اصلاح کے محتاج ہیں لہذا ان میں ضروری اصلاح ضرور ہونا چاہیئے۔ وہ غزل میں مروجہ بیان حسن و عشق کو نہیں پسند کرتے بلکہ اُس کو اُس بلند پایہ پروردہ کھنا چاہتے ہیں جس میں صرف بہترین اور اعلیٰ ترین مظاہر دوستی و محبت کا بیان ہو۔ اسی طرح وہ عورتوں کے بناؤ سنگار اور شیخ و زنا ہد سے چھٹ چھاڑ کے بھی غزل میں حامی نہیں ہیں۔

۱۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ لائق مصنف نے اس موقع پر مولانا حالی کا مفہوم نہیں سمجھا اور عام طور پر لکھ دیا کہ شیخ و زنا ہد پر جو پھبتیاں کہنے اور اُن کو بنانے کا اردو شاعری میں عام رواج ہو گیا ہے اُس سے لوگوں کو باز رہنا چاہیئے۔ مولانا نے اس موقع پر جو عبارت (باقی صفحہ آئندہ)

دائرہ غزل کو وسیع ہونا چاہیے اور انہیں صرف عاشقانہ فلسفیانہ صنویا نہ اور اخلاقی مضامین
ہوں بلکہ ان کے علاوہ انہیں نیچرل قومی اور سیاسی مضامین بھی جگہ پائیں

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ (۲۸۶)

واعظ اور زاہد کے سائرنے ادران پر نکتہ چینی کے متعلق لکھی ہے اسکا حاصل یہ ہے کہ اس قسم کی نکتہ چینی
صرف دو صورتوں میں جائز ہو سکتی ہے درنہ بالکل بیکار ہے اور اسکو ترک کر دینا چاہیئے۔ پہلی
صورت یہ ہے کہ اس قسم کی نکتہ چینی انھیں لوگوں کو زیبا ہے جن کو فی الواقع اس جماعت سے
کسی قسم کی مخالفت ہو دوسری صورت یہ ہے کہ اگر اس قسم کی کوئی مخالفت نہ ہو تو یہ طنز و تشنیع
ایسے طریقہ سے کیجائے جس سے مقصود اصلی اُن معائب کا اظہار ہو جو اس جماعت میں عموماً پائے
جاتے ہیں مثلاً ریا۔ مکر۔ سالوس۔ خنونت۔ درستی۔ بخلقی وغیرہ نہ یہ کہ انکی ذات پر بلا وجہ حملہ
کیا جائے یا انکی سستی میں اپنی بلندی ثابت کیجائے مولانا حالی نے اس مجوزہ نظریہ کے ثبوت
میں ذوق کے دو شعر پیش کیے ہیں ۷

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نیڑ تو

زہد خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو

اور اس کے آگے لکھا ہے کہ چونکہ اس شعر میں اس خصلت کی طرف اشارہ ہے جو طبقہ زہاد و عقباد
میں اکثر پائی جاتی ہے کہ اور دل کو تو ذرا اسی بات پر ملامت کرتے ہیں اور آپ اپنی اصلاح سے
بیخبر ہیں۔ لہذا اس قسم کے اشعار پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ دوسرا شعر یہ ہے ۷

ذوق زہا ہے جو ہو ریش سفید شیخ ہر

وسمہ آب بنگ سے بھندی نے گلبرگ سے

اس شعر میں کوئی بات ایسی نہیں بائی جاتی جو شیخ پر طعن کی وجہ معقول ٹھہرے۔ سوائے اسکے
کہ بیچارے شیخ کی داڑھی سفید ہے اور محض اس جرم میں اسکو بھنگڑ اور شرابی بنایا گیا ہے۔
اسی اصول کے تحت میں دو چار شعر مختلف لوگوں کے اس سبب پر لکھے جاتے ہیں
جن سے ناظرین خود اندازہ کر لیں گے کہ کون سا قاعدہ کس پر منطبق ہوتا ہے اور کس قسم
کی طعن و تشنیع کی اجازت اور کسکی ممانعت ہے۔ (باقی اشعار متعلق مضمون ہذا صفحہ ۲۸۸)

دستی زبان بھی بہت ضروری شے ہو اور الفاظ اور محاورات کی صحت کا ضرور خیال رکھا جائے۔ اسی طرح صنائع بدائع یعنی شعر کے ظاہری تکلفات کی بہتات نہ ہو چاہیے اور نہ شعر کی خوبی کا دار و مدار اُن پر رکھا جائے سنگلاخ زمینیں اور شکل ردیف قافیہ جن کے تصحیفی اور شاہ نصیر وغیرہ دلدادہ تھے اُن سے استرازا کرنا چاہیے۔ حتیٰ الامکان ردیف بھی اُڑا دی جائے۔

ادبیات حالی | حالی کا مرتبہ ادب اردو میں خاص طور پر ممتاز ہے۔ سب سے پہلے

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ ۲۸۷

<p>اور جو کوئی چپٹ کی آجائے (ریاض)</p> <p>اب ہاتھ مل رہا ہوں کہ اچھی پڑی نہیں "</p> <p>جناب شیخ ٹھیکہ لچکے ہیں باغِ غول کا (راسخ)</p> <p>پیش اس قوم بشورائے زمزم نہ رسد (غالب)</p> <p>کیا کلس سواک کا ہے گنبد تار پر</p> <p>پرانا جانتے ہیں کل نہ جاتا تھا کہ ہم نکلے</p> <p>شیخ صاحب غماز کیا جانیں (داغ)</p>	<p>شیخ صاحب برائیاں نے کی</p> <p>اگر ٹیپ می تھی حضرت زہد کو اور ریاض</p> <p>کسی میکش کو دینگے تحفہ انگود کی خدمت</p> <p>نے بڑا دکن عرض کہ اس جو بہ نواب</p> <p>دیکھنا نسخ سر شیخ نعم کی طرف</p> <p>کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں غلط</p> <p>کب کسی در پہ جبہ سائی کی</p>
--	--

۵۔ اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہو کہ مولانا حالی ردیف کے خارج کرنے کی صلاح نہیں دیتے بلکہ اُن کا مشاہدہ ہے کہ غزل گوئی میں جہاں تک ممکن ہو آسانی مد نظر رکھی جائے۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں کہ شاعر کو چاہیے کہ ہمیشہ ردیف ایسی اختیار کرے جو قافیہ سے میل کھاتی ہوئی ہو۔ اور ردیف و قافیہ دونوں ملکر دو مختصر کلموں سے زیادہ نہ ہوں بلکہ رفتہ رفتہ مردف غزلیں لکھنی کم کرنی چاہئیں اور سردست محض قافیہ پر فصاحت کرنی چاہیے ۱۲

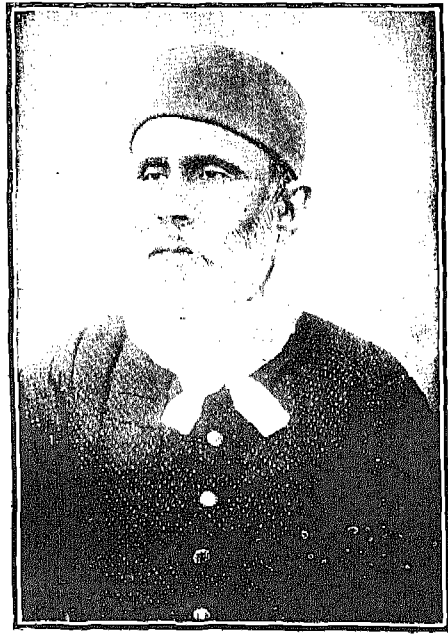
انہی نے غزل و قصیدہ میں جدید رنگ شامل کیا۔ مسدس کی اہمیت عملی طور پر ثابت کی اور مسلمانوں کے انحطاط کا تذکرہ غزل اور مسدس میں مؤثر طریقہ سے کیا۔ وطن یعنی مادہ ہند پر نظمیں لکھیں۔ طرز و تدبیر پر کہ جسمیں تکلف تصنع اور خلاف واقعہ باتیں جزو غالب تھیں ضرب کاری لگائی۔ ہمواری خیال کو مد نظر رکھا اور عبارت کو تعقید و تکلف سے پاک کیا۔ سیاسی مضامین اپنے کلام میں داخل کیے۔ آزاد کے ساتھ حالی کو بھی اردو شاعری کے جدید رنگ کا بانی سمجھنا بالکل سچا ہے۔ ان کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔ نیچر کی پیروی مبالغہ اور اغراق سے احتراز۔ سادگی اور صفائی۔ جذبات اور درد و اثر۔ انکی عبارت بہت صاف سادہ اور جلد سمجھ میں آنے والی ہے صنائع بدیع بہت کم اور احتیاط کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ فضول قافی اور بجا اظہار علم و فضل سے محترز رہتے ہیں۔

نقائص حالی وہ کہیں کہیں قواعد عروض سے باہر نکل جاتے ہیں اور صحت الفاظ و محاورات کا خیال نہیں رکھتے۔ غیر مانوس انگریزی الفاظ بھی کہیں کہیں لکھ جاتے ہیں شاید اس غرض سے کہ کلام میں ایک خصوصیت پائی جائے اور معاصرین کے کلام سے متمیز ہو۔ کبھی انکا تخیل بہت اعلیٰ ہوتا ہے اور کبھی محض شک بند کی دلہل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں ایک رفارم اور رینسٹ کی حیثیت بھی کہیں کلام کے مزے کو چھیکا کر دیتی ہے لیکن باوجود اس کے بھی ان کے کمال شاعری پر کوئی حرف نہیں آتا اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ جس طرح وہ قومی اور وطنی نظموں کے موجد ہیں اسی طرح مناظر قدرت اور نیچر شاعری میں بھی ان کا کلام لا جواب ہے اور ان کا یہ احسان کبھی نہ بھولے گا

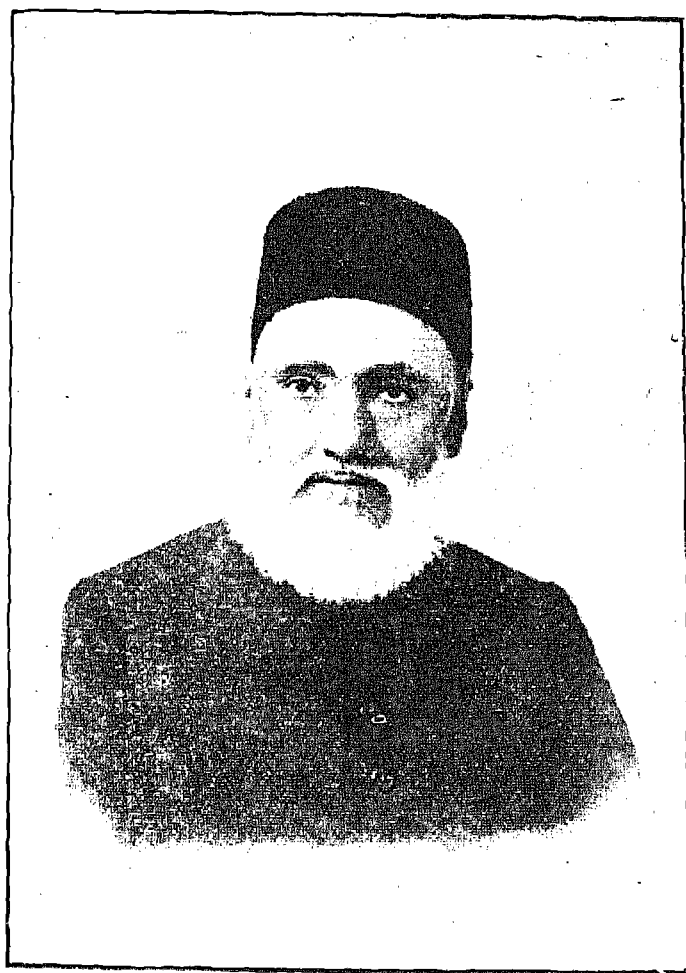
کہ انھوں نے اُردو شاعری کو ایک نئی حد تک اُن مبصر خلاق چیزوں سے پاک صاف کر دیا جو اُس میں سرایت کیے ہوئے تھیں اور اُس میں ایک نئی روح بھونکی مختصر یہ کہ ہر چند وہ شعر اُردو کی صنفِ اولین میں شامل نہ بھی کیے جائیں مگر ادبِ اُردو کے سب سے بڑے محسن وہ ضرور شمار کیے جائیں گے۔

مولانا محمد حسین آزاد شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کو جدید رنگ کا بانی اور ادبِ اُردو کا مجدد سمجھنا بالکل بجائے۔ زمانہ حال کے بہت بڑے ادیب بہت شہور نثار نامی گرامی نقاد فنِ تعلیم کے بہت بڑے ماہر اور ایک مشہور و معروف اخبار نویس تھے۔ ان کمالات کے علاوہ جدید فارسی کے استادِ کامل اور فلاسفی (علمِ الاسنہ) کے بھی بڑے ماہر تھے اُنکی خدمات اور احسانات زبانِ اُردو پر بیحد ہیں اُردو شاعری میں اس رنگ کا بانی اور اُس میں ایک نئی روح بھونکنے والا اگر کوئی فی الحقیقت کہا جاسکتا ہے تو وہ مولانا کی ذات ہے وہ صحیح معنوں میں ادیب تھے اُن کے کچھ مختصر حالات آئندہ حصہ ششم میں بھی بیان کیے جائیں گے جس سے اُن کا حقیقی تعلق ہے۔ یہاں اُنکی شعر و شاعری کا ذکر نہایت اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

آزاد کی شاعری آزاد فطری شاعر تھے اور ازل سے شاعرانہ طبیعت لائے تھے۔ اُن کی نثر بھی اس قدر دلچسپ اور شاعرانہ تخیل رکھتی ہے کہ کسی طرح شعر سے کم نہیں ہے اُن کے والد چونکہ استادِ ذوق کے دوست تھے اور اُنکی صحبت میں بیٹھتے اُٹھتے تھے لہذا آزاد بھی اوائلِ عمر میں اپنے والد کے ساتھ استاد کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے اور اُنکی صحبت سے فیضیاب ہوتے۔ انھیں کی معیت میں دلی کے بڑے بڑے مشاعرے میں شریک ہوتے تھے جہاں مشہور اساتذہ فن سے شناسائی کے علاوہ اُن کے کلام کے



خواجه اطفال حسين حالي



مولوي محمد اسماعيل خان

حُسن و قبح سے بھی بخوبی واقف ہوتے جلتے تھے۔ استاد ذوق سے نوجوان
 آزاد کو بڑی حُسنِ عقیدت تھی اور انھیں کے فیضِ صحبت اور حُسنِ تربیت کا یہ اثر ہوا
 کہ آزاد کے دل میں جذبہ شاعری پیدا ہو گیا۔ دلی کی آخری عظمت و شان کی یاد دلائی والی
 صحبتیں گرم تھیں کہ سہ ماہ کا غدر ہوا اور فلکِ تفرقہ پر دازنے اُن مجنوں کو
 منتشر کر دیا۔ اب لوگ ادھر ادھر تلاشِ معاش میں سرگرواں ہو گئے۔ چونکہ لاہور
 دلی سے قریب تھا اس وجہ سے دلی کے اکثر تباہ حال اشخاص وہاں چلے گئے۔ انہی
 لوگوں میں محمد حسین آزاد، رے بہادری، پیارے لال، پنڈت من پھول میرنشی،
 مولوی سید احمد، مولف فرہنگِ صفیہ، مولوی کریم الدین، اور خواجہ الطاف حسین جانی
 تھے جن کو تقدیر نے ایک جگہ جمع کر دیا تھا حسنِ اتفاق سے پنجاب میں اس وقت کرنل
 ہارلڈ ڈائرکٹر تعلیمات تھے جو علاوہ زبانِ فارسی اور اردو پر عبور رکھنے کے زبانِ اردو
 کی توسیع و ترقی کا دل سے خیال رکھتے تھے۔ انہیں کے ایما سے مولانا آزاد نے
 ایک ادبی انجمن ”انجمن پنجاب“ کے نام سے لاہور میں قائم کی جسکے جلسے اُسی انجمن کے
 مکان میں ماہوار ہوا کرتے تھے۔ اس انجمن کے قیام کی خاص غرض یہ تھی کہ
 اردو شاعری میں جو مبالغہ کے طوفان اور تشبیہ و استعارہ کے انبار ہیں وہ
 سب نکال دیے جائیں، نیز یہ کہ مشاعروں میں جو طریقہ مصرعہ طرح دینے کا مروج
 ہے وہ موقوف کیا جائے اور بجائے اس کے شعراء خاص خاص مضامین و
 عنوان پر طبع آزمائی کیا کریں۔ قبل اس کے کہ اس قسم کے مشاعرے شروع ہوں
 مولانا نے انجمن کے جلسوں میں اپنے فاضلانہ لکچر اور دلچسپ نظموں سے پہلے لوگوں
 کو تیار اور آمادہ کر دیا اور یہ دکھا دیا کہ یہ جدید رنگِ عنقریب مقبول عام ہو جائے گا۔

اور حقیقی شاعری کیا چیز ہے۔ اسکی ضروریات بتائیں اور وہ خرابیاں بھی دکھادیں جو بالفعل پُرانے رنگ کی شاعری میں پائی جاتی ہیں۔ یہی سلسلہ ۱۹۳۷ء میں جوائڈ ریس انجمن کے افتتاح کے موقع پُر انھوں نے پڑھا تھا اُس میں اردو شاعری کے عیوب و کمالات، مضامین، غلو و مبالغہ، فضول تشبیہات و استعارات، اس کا تصنیع اور خلاف فطرت رنگ۔ غرض کہ جو عیوب موجودہ شاعری میں پائے جاتے ہیں وہ سب بہ وضاحت بیان کر دیے اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اردو شاعری کی بقا منظور ہے تو ہر کو چاہیے کہ عشق و عاشقی کے پُرانے ڈھکوسلے ترک کریں۔ اور عروس شاعری کو تیرہ و تار جھروں سے کھال کر زمانہ موجودہ کی روشنی میں لائیں۔ شاعروں سے کہا گیا کہ پُرانے مضامین ترک کرو۔ سادگی، اظہارِ صلیت اور درد و اثر بھاشا سے اور صاف بانی فائدہ رسانی اور وسعتِ نظر مغربی شاعری سے سیکھو۔

تصانیفِ منظوم آزاد نے جو کچھ زبان سے کہا اُس پر خود عمل بھی کیا۔ انھوں نے اسی نئے رنگ میں متعدد چھوٹی چھوٹی شہزادیاں اور نظمیں لکھیں۔ اور پر بیان ہو چکا ہے کہ استاد ذوق کی صحبت نے اُن کے دل میں شاعری کا شوق اور جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ استاد کی وفات کے بعد وہ حکیم آغا جان عیش سے صلاح لینے لگے اور اپنا کلام دلی کے مشاعروں میں منانے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کا اس زمانہ کا کلام غدر کے ہنگامہ میں سب ضائع ہو گیا۔ غدر کے بعد ان کو ریاستِ جیندھ میں ایک جگہ بل گئی تھی جہاں وہ مشقِ نظم کرتے اور سلام، رباعیاں، مرثیے، غزلیں، قصیدے وغیرہ سب کچھ کہتے رہے۔ اس زمانہ کا کچھ کلام اُن کے بیٹے مولوی محمد ابراہیم نے ۱۹۹۹ء میں ”نظم آزاد“ کے نام سے شائع کیا ہے۔ لاہور میں ۱۹۹۷ء عیسوی میں

اُس مشاعرے کی بنیاد پڑی تھی جبکا ذکر اوپر ہوا۔ اسی میں انھوں نے اپنی وہ دلچسپ نئے رنگ کی نظم پڑھی تھی جو ثنوی شب قدر کے نام سے مشہور ہے اور جس رات کی آمد اور شام کی کیفیت کا ذکر ہے پُرانے خیال کے لوگوں نے اس جدت کی بڑی مخالفت کی جس سے نئی امنگوں پر تو کوئی اثر نہ پڑا مگر اتنا ضرور ہوا کہ مشاعرہ ایک سال سے زیادہ قائم نہ رہ سکا۔ مشاعرہ کے بند ہو جانے سے بھی مولانا اپنی کوششوں سے باز نہ آئے اور کچھ نہ کچھ اس رنگ میں کہتے رہے کبھی کبھی وہ اردو نظمیں انگریزی نظموں کے طرز پر کہتے تھے جن میں کسی انگریزی چیز کا ترجمہ نہیں ہوتا تھا بلکہ انگریزی خیالات کو زبان اردو کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔ مثلاً اُن کی نظم ”راووا الغری کے لئے کوئی سدا رہ نہیں“ انگریزی شاعر ٹینیسن کی نظم ”کنسلیر“ کے انداز پر ہے مگر اُس کا ترجمہ ہرگز نہیں ہے۔ اسی رنگ کی دوسری نظمیں حسب ذیل ہیں ثنوی شرافت حقیقی۔ معرفت الہی۔ سلام علیک جیسے چاہو سمجھ لو۔ جغرافیہ طبعی کی پہیلی۔ مبارکباد جشنِ جوہلی۔ ایک تارے کا عاشق۔ محنت کرو۔ یہ نظمیں مجموعہ نظم آزاد میں موجود ہیں۔

آزاد کا قدیم دھند رنگ قبل اس جدید رنگ اختیار کرنے کے آزاد اُسی پُرانے رنگ میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ چنانچہ مجموعہ نظم آزاد کے آخر میں اُن کے پُرانے رنگ کی غزلیں اور قصائد موجود ہیں جن میں کچھ کچھ اشعار دلچسپ زوردار اور صوفیانہ رنگ کے بھی نکل آتے ہیں اسی کو ان کے آئندہ رنگ کا سنگ بنیاد سمجھنا چاہیے۔ جدید طرز کی مثنویاں حسب ذیل ہیں (۱) ثنوی شب قدر۔ یہ اُن کا شاہ کار ہے اور ان کے مختلف لوگوں کے اشغالِ شب کے وقت کے نہایت عمدگی اور رنگ آمیزی سے

بیان کیے ہیں۔ طالب علم۔ مہاجن اور چور کی کیفیت۔ علی الخصوص
پڑھنے کے قابل ہے۔

طالب علم

ہیں مدرسہ کے طالب علم اپنے حال میں کل صبح امتحان ہے سوا کے خیال میں
مل کے یاد کرتے ہیں آپس میں دور سے پڑھتے جدا جدا بھی ہیں کچھ فکر و غور سے
کریں جو کچھ کہنا ہے شب درمیان ہے کل صبح اپنی جان ہے اور امتحان ہے
جی چھوڑ بیٹھے مردیہ ہمت سے دور ہے
قسمت تو ہر طرح ہے پے محنت ضرور ہے

مہاجن

اور وہ جو کچھ پتی ہے مہاجن جہان میں آدھی بجی ہے پردہ ابھی ہے دکان میں
گنتی میں دام دام کی ہے دم دیے ہوئے بیٹھا ہے گود میں ہی کھاتا لیے ہوئے
ہے سارے لین دین کی میزان تمام کی لیکن غضب ہر پردہ نہیں ملتی چھ دام کی

چور

لے رات تیرے پردہ دامن کی اوٹ میں دزد سیاہ کا بھی ہے اپنی چوٹ میں
بیٹھا نقب لگا کے کسی کے مکان میں ہے اور ہاتھ ڈالا اسکے ہر اکینہ میں ہے
اسباب سب اندھیرے میں گھر کا ٹٹول کر ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھول کر
لے جائے گا غرض کہ جو کچھ ہاتھ آئے گا
دیکھو کمایا کسے ہے اور کون اڑائے گا

شاعر

اس تیرہ شب میں شاعر روشن دماغ ہے بیٹھا اندھیرے گھر میں جلانے چراغ ہو
 ڈوبا ہے اپنے سر کو گریباں میں ڈال کے اڑتا گرہے کھولے ہوئے پر خیال کے
 لانا فلک سے ہے کبھی تارے اُتار کر جاتا زمیں کی تہ میں ہر پھر غوطہ مار کر
 پڑھتا ہے ذرہ ذرہ پہ انسوں نئے نئے

ہو جاتے ہیں وہی مضمون نئے نئے

مضمون تازہ کر کوئی اس آن مل گیا یوں خوش ہے جیسے نقش سلیمان مل گیا
 اس تیرہ شب کے پردہ میں شاعر جو چور ہے پھرتا ٹٹولتا ہوا ماسند کو رہے
 مطلب لڑاتا شعر سے مضمون غزل کے ہو لاتا پھر ایسے ڈھب لفافہ بدل کے ہو

تقریبیں اُنکی کرتے ہیں جو شعر سُنتے ہیں
 مضمون گیا ہے جن کا وہ سر مٹھے دھنتے ہیں

اپنے متعلق

عالم ہے اپنے بستر راحت پہ خواب میں آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں
 پھیلا ہے ہاتھ صورت امیدوار ہے اور کرتا صدقِ دل سے دعا بار بار ہے
 مجھ کو تو ملک سے ہر نہ ہو مال سے غرض رکھتا نہیں زمانہ کے جنجال سے غرض

یا رب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے

وہ بات دے زباں پہ کہ ولیں لٹر کرے

آجاتی پر کبھی جو ہے شوخی مزاج میں کرتا ہے اُسکو خرچِ عدو کے عللج میں
 کر جاتا صاف دشمن بد میں بہ چوٹ ہے اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل میں کھوٹ ہی
 کھوٹا اگر زبان کا ہے دل کا کھرا تو ہے اتنا ضرور ہے کہ ذرا مسخرا تو ہے
 (۲) ثنوی حُجُطْن اَسْمِی اُنھوں نے ایک دوسرا رنگ اختیار کیا ہے اور
 اپنے مطالب کو بعض سچے اور بعض فرضی واقعات سے ثابت کیا ہے۔

(۳) ثنوی خوابِ امن ایک نہایت زوردار مثنوی ہے جس میں یہ دکھلایا
 ہے کہ ہر قسم کی تمدنی ترقیاں کسی ملک میں صرف امن ہی کی صورت میں ہو سکتی ہیں۔
 (۴) ثنوی برکرم میں ہندوستان کے موسم بہار یعنی برسات کا سماں دکھلایا ہے
 یہ حالی کی برکھارت کے طرز پر ہے۔

(۵) صبح امید۔ اسمیں نہایت مؤثر طریقہ سے دکھلایا ہے کہ مختلف کارِ بار
 عالم مثلاً زراعت، تجارت، ملک گیری، تعلیم وغیرہ میں امید ہی کام کرتی ہے اور
 کامیابی کا دار و مدار اسی پر ہے۔

آزاد و حالی کا فرق
 آزاد مثلِ حالی کے شاعری کے دلدادہ نہ تھے اُن کا کلام
 بھی عیوبِ شاعری سے پاک و صاف نہیں۔ حالی سرسید مرحوم کی وجہ سے
 اور نیز اپنی مناسبتِ طبعی سے ایک قومی شاعر ہوئے اور تنزلِ اسلام کے راگ کو
 اکثر اپنے پُر جوش کلام کی لے میں الاپا۔ آزاد کو اس قسم کی کوئی فضیلت حاصل نہیں
 ہے۔ اُن کی اُفتادِ طبیعت عالمانہ تھی اور وہ علاوہ کاملِ نثار و شاعر ہونے کے ایک
 مشہور ماہرِ تعلیم اور جریدہ نگار اور ناقد بھی تھے اُنھوں نے ضرورتِ زمانہ کا لحاظ کر کے
 اپنے میلانِ طبیعت کو جو اُس زمانہ کا عام رنگ تھا جدید رنگ سے بدلا اور انشاِ نفس سے

کام لیکر اسی میدان میں شہادت علمی کا درجہ حاصل کیا۔ اُن کے مختصر مجموعہ نظم سے پایا جاتا ہے کہ وہ نظم سے شکر کو زیادہ ضروری اور مقدم سمجھتے اور اسی میں اپنے ملک اور اپنے ہم وطنوں کی فلاح و بہبود دیکھتے تھے چنانچہ اُن کے دلی جذبات اور قلبی واردات کا اظہار حسب قدر کہ نثر میں ہوا وہ نظم میں نہ ہو سکا۔ انکی نثریں گو نظم نہیں مگر حقیقی معنی میں بے تکلف اُن پر شعریت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی مولوی محمد اسماعیل صاحب ۱۲۔ نومبر ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے۔ میرٹھ وطن تھا۔ سولہ سال کی عمر میں شریعت تعلیم کی ملازمت اختیار کی تھوڑے عرصہ کے بعد ترقی کر کے فارسی کے ہیڈ مولوی مقرر ہوئے۔ پہلے سہارنپور میں پھر میرٹھ میں ایک عرصہ تک اسی عہدہ پر رہ کر ۱۸۹۷ء میں سنٹرل نارمل اسکول آگرہ کو تبدیل ہوئے۔ یہاں بارہ برس تک قیام کر کے ۱۸۹۹ء میں نیشن لی۔ بعد نیشن اپنے وطن مالوٹ یعنی میرٹھ واپس آئے اور وہیں قیام اختیار کر کے بقیہ عمر تالیف و تصنیف میں ختم کر دی۔ انکی اعلیٰ قابلیت اور خدمات ادبی کے صلے میں خطاب ”خال صاحب“ بھی سنا کر سے عنایت ہوا تھا۔ بالآخر یکم نومبر ۱۹۷۷ء کو اس دنیا سے ناپائدار سے رحلت کی آگرہ کے قیام میں مولوی صاحب موصوف نے اپنی وہ اردو ریڈریں اور پرائمری تصنیف کیں جو گورنمنٹ کی منظوری سے ایک عرصہ دراز تک داخل کورس رہیں۔ یہ درسی کتابیں نہایت سادہ بے تکلف اور دلکش طرز میں لکھی گئی ہیں جو بچوں کی سمجھ میں بخوبی آسکتی ہیں اور اُن کے لیے نہایت موزوں ہیں۔ اس معاملہ میں مولوی صاحب موصوف نے ممالک متحدہ کے واسطے وہی کیا جو مولانا محمد حسین آزاد نے صوبہ پنجاب کی واسطے کیا تھا بلکہ ایک معنی میں اُن سے بھی زیادہ خدمت انجام دی۔ یہ سب ریڈریں

سلاست زبان اور عمدگی مضامین کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ بلکہ سچ پوچھے تو ان کا جواب سرشتہ تعلیم کی منظور شدہ کتابوں میں کسی صوبہ میں اب تک نہیں ہوا ہے۔

مولوی صاحب شاعر اور نثر دان دونوں تھے۔ اُن کا خاص رنگ ان دونوں صنفوں میں سادگی اور صفائی ہے جسکے وہ اُستاد کامل تھے شاعری میں طرز جدید اور طرز قدیم دونوں پر انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور تمام صنات سخن میں کچھ نہ کچھ کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے۔ چنانچہ عاشقانہ، سیاسی، اخلاقی، سوشل اور نیچرل غرض کہ ہر قسم کی نظمیں انکی کہی ہوئی موجود ہیں اور حق یہ ہو کہ بے تکلفی اور سادگی میں اپنا جواب نہیں دھکتیں۔ مولانا شبلی نعمانی کا قول تھا کہ حالی کے بعد اگر کسی نے سننے کے لائق کچھ کہا ہے تو وہ مولوی اسماعیل میرٹھی ہیں۔ مولوی صاحب موصوف کا کلیات سن ۱۳۱۶ء میں شائع ہوا تھا اور اُس میں انکی تمام قدیم و جدید ہر رنگ کی نظمیں ہیں۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ بھی کچھ پایا جاتا ہے اور طباعی اور قادر الکلامی اُن کے لفظ لفظ سے ظاہر ہے۔ مولوی صاحب کو تصوف کا بھی ذوق تھا اور حضرت غوث علی شاہ پانی پتی کے مربیان خاص میں تھے۔ اُن کے جدید رنگ کی نظمیں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں اور زمانہ موجودہ کی نیچرل نظموں کی پیشرو ہیں۔ اردو میں بلنیک درس یعنی بغیر قافیہ والی نظم یا شرم جز ہیں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی اور نہایت دل آویز طریقہ سے خیالات کو ادا کیا ہے۔ علاوہ غزلیات کے جس میں صوفیانہ اور اخلاقی مضامین ہیں۔ انھوں نے اکثر اخلاقی نظمیں قصے کہانی کے طرز پر مثل ”ایسا پس خلیس“ کے لکھی ہیں جن سے عمدہ اخلاقی نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

تلقہ اگرہ کے متعلق بھی ان کی ایک مشہور نظم ہے اس میں انھوں نے مسلمانوں کی ابتداء سے ترقی کے دور نہایت مؤثر طریقے سے دکھا کر موجودہ ترقی کے راستے بتائے ہیں۔ اُن کا یہ بھی قصد تھا کہ لغات اُردو کی ترتیب اور قواعد اُردو کی تکمیل نئے طرز سے کریں چنانچہ اُن کے مسودات محفوظ ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ کسی نہ کسی وقت ضرور شائع ہوں گے۔ آخر عمر میں وہ حضرت امیر خسرو کے کلام کی تنقید اور ان کی سوانح عمری مستند کتابوں اور تاریخوں کے حوالے سے مرتب کر رہے تھے اور قرآن السعدین کی تنقید مکمل ہو چکی تھی کہ موت نے اس کام کو روک دیا۔ اسی طرح یہ بھی سنا جاتا ہے کہ ادب اُردو کی ایک تاریخ لکھنے کا بھی ارادہ تھا مگر وہ بھی پورا نہ ہو سکا۔ مختصر یہ کہ مولوی صاحب زمانہ حال کے شاعروں اور نثر کاروں میں بہت بلند پایہ رکھتے تھے اور طرز قدیم و جدید دونوں کا مجموعہ تھے۔

سُورجھاں آبادی منشی درگاہ سہاے سرور کو بھی اُردو شاعری کے طرز جدید کا ایک رکن رکین سمجھنا چاہیے۔ یہ اُن لوگوں میں تھے جنہوں نے رنگ جدید کی طرف سب سے پہلے تہنائی کی جہاں بادِ ضلعِ پیلی ہیمیت کے پہننے والے تھے سلسلہء اع میں پیدا ہوئے شعر و شاعری سے فطری مناسبت تھی۔ اور کلام پُرانے اور نئے دونوں رنگوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ ان کا عمل ”خدا ما صفا دورع ماکدر“ پر تھا۔ یعنی پُرانے اور نئے رنگوں میں جو جو باتیں عمدہ اور قابلِ قدر تھیں وہ لے لیں اور باقی کو چھوڑ دیا مثلاً قدما کا درد و اثر اور بلند خیالی اور الفاظ کے ایجاز و اختصار کے ساتھ جدید رنگ کے تازہ مضامین اور حُب الوطنی کے جذبات نہایت خوبی کے ساتھ ملے جلے ہیں اور زمانہ حال کی معمولی بے لطف باتوں اور زمانہ گذشتہ کی غیر مزید معالجہ بندی سے

کلام پاک ہے۔ شستگی الفاظ کے ساتھ بلند خیالی اور پاکیزگی ملی ہوئی ہے۔

سُرور کو شعر و شاعری سے حد درجہ کا شوق تھا بلکہ اُن کی نسبت یہ کہنا بجا ہے کہ اُن کو فنا فی الشعر کا درجہ حاصل تھا اُن کے تمام افعال و اقوال حرکات و سکنات شعریت میں ڈوبے ہوئے تھے اور ایک حقیقی شاعر کا پتہ دیتے تھے جیسا کہ اکثر شعرا کا حال تھا۔ سُرور بھی نہایت آزاد مزاج اور زہد مشرب واقع ہوئے تھے فکر فردا سے ہمیشہ آزاد رہتے تھے اسی وجہ سے وہ مصیبت و عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے مگر یہ عسرت و مصیبت اُن کے شاعرانہ شوق اور جذبات کو کبھی دھیمانہ کر سکی۔ وہ مذہبی نقشبند اور تعصب سے بالکل بیگانہ تھے۔ نہ اُن کو نائش اور ظاہر داری کا شوق تھا۔ بلکہ اُن کی زندگی بے پروائی اور سادگی کا ایک بہترین نمونہ تھی۔ اُنہیں دنیا کا کمزور و فربہ مطلق نہ تھا اور جو کچھ عیوب اُن میں تھے وہ بھی ہنس معلوم ہوتے تھے۔ سب سے بڑا عیب اُن میں دُشمنی کا تھا مگر یہ بھی مرزا غالب کی طرح اُن کی شاعری اور خیال آفرینی میں اکثر عیب ہوتی تھی۔ گو کہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اسی کمجنت عادت کی بدولت اُنکی ہونہار اور قابلِ قدر زندگی کا بہت قبل از وقت خاتمہ ہو گیا۔ صرف بعمر ۳۷ سال ۱۹۱۷ء میں انھوں نے انتقال کیا۔

ان کی شاعری کے	(۱) سب سے بڑی خصوصیت اُن کی شاعری کی جذبات نگاری
خصوصیات	اور درد و اثر ہے۔ اس رنگ میں وہ اپنے زمانہ میں اپنا جواب

نہیں رکھتے تھے مثل ابتداء الشعر میر تقی میر کے سُرور کے مزاج میں بھی حزن و یاس اور رنج و دام کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے مثل میر کے اُنکا کلام بھی جذبات نگاری کا



حضرت سرور جہاں آبادی



ہفتشی فوہت رائے فٹار

ایک موقع ہوتا تھا۔ اُن کی اس قسم کی نظمیں حسبِ میل ہیں :- دیوارِ اکبر، حسرتِ شباب، اندوہِ غربت، مرغِ انِ قفس، یادِ طفلی، ببل کا فسانہ، حسرتِ دیدار، ماتمِ آرزو وغیرہ۔

(۲) دوسری خصوصیت حسبِ الوطنی ہے اس میں بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے مگر یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ وہ کسی خاص جماعت یا فرقہ کی جذبہ داری نہیں کرتے بلکہ اُن کو ہندوستان کا قومی شاعر کہنا بالکل بجائے۔ اُن کے مخاطب صرف اُن کے ہم مذہب نہیں بلکہ ہندوستان کی پوری پیپلک ہے۔ اس قسم کی انکی نظمیں یہ ہیں - خاکِ وطن، عروسِ حُبِ وطن، حسرتِ وطن، یادِ وطن، مادرِ ہند وغیرہ۔ یہ مادرِ ہند یا بونکم چندر چٹرجی کی مشہور نظم بندے ماترم کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ ان تمام نظموں میں حبِ وطن کا سچا جوش اور اعلیٰ خیالات ہیں۔ ان کے سوا بعض عاشقِ شانہ نظمیں بھی اسی طرز کی ہیں مثلاً فسانہ گل و بلبل، شمع و پروانہ وغیرہ۔

(۳) اس کے بعد ان کی تاریخی اور مذہبی نظموں کا نمبر ہے۔ ان میں بھی صحیح جذبات، صداقت، فصاحت، بے تکلفی اور روانی بدرجہ کمال پائی جاتی ہیں۔

پدینی، پدینی کی چٹا، بیتا جی کی گریہ و زاری، مہاراجہ دسرتھ کی بقیاری، جہنا - گنگا پرگاک کا سنگم - ستی - نور جہاں کا مزار - حسرتِ دیدار اور لذنتی اسی قسم کی نظمیں ہیں جو سب اعلیٰ خیالات اور دردِ واثر سے مملو ہیں۔ ان سب میں گنگا اور جہنا خاص طور پر تعریف کے قابل ہیں جو محاسنِ شعری کے علاوہ جذبات اور اثر سے لبریز ہیں۔ یہ فی حقیقت نہایت اعلیٰ درجہ کی نظمیں ہیں۔ جہنائیں علی الخصوص ہندوؤں کے قدیم تاریخی حوالے بہت دیکھ چکے ہیں۔

(۴) سرور کی چوتھی خصوصیت جو ان کو ان کے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے

یہ ہے کہ انھوں نے اُردو اشعار میں ہندی الفاظ کو کھپایا اور اس طرح کھپایا کہ اُس سے شعر کے محاسن میں اضافہ ہو گیا۔ علیٰ خصوص مذہبی نظموں میں انھوں نے پُرلے ٹھیسٹ ہندی اور بھاشہ کے لفظ بہت استادِی سے صرف کیے ہیں جن سے کلام کا لطف دو بالا ہو جاتا ہے اسی طرح رابین اور دیگر مذہب ہنود کی کتابوں کے بعض سین نہایت پُر زور لکھے ہیں۔ ان کی تمام اس قسم کی نظمیں اہل ہنود نہایت ذوق شوق سے پڑھتے ہیں۔

انگریزی نظموں کے ترجمے سرور کو زبان انگریزی کا بہت محدود علم تھا۔ مگر چونکہ طبیعت نہایت رسا اور شاعرانہ پائی تھی اس وجہ سے انھوں نے جو ترجمے انگریزی نظموں کے کیے ہیں وہ ہر چند کہ لفظی نہیں مگر پھر بھی صلی معلوم ہوتے ہیں۔ اس قسم کی حیریں بہت ہیں۔ تقریباً بیس سے کم نہونگی۔ بعض میں انھوں نے صرف کسی انگریزی نظم کا نام لے لیا ہے اور اُس پر بالکل ہندوستانی طریقہ سے طبع آزمائی کی ہے مرغابی نزلہ خواب بچہ اور ہلال۔ کارزار ہستی۔ اُمید و طفلی۔ موسم سرما کا آخری گلاب۔ یہ سب اسی قسم کی نظمیں ہیں اور اپنے طریقہ میں بہت عمدہ اور دلکش ہیں ایسی ہی نیچرل نظموں میں اُن کی ”بیر ہوٹی“ اور ”کوئل“ کو بھی سمجھنا چاہیے۔

سرور نے بعض اخلاقی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مگر یہ خیال رکھا ہے کہ شعر کی خوبی اور دلکشی و عطف و نصیحت کی روکھی پھکی باتوں سے کم نہونے پائے۔ وہ شاعری کو وعظ پر مقدم جانتے تھے۔ زن خوشخو۔ بے ثباتی دُنیا۔ اداسے شرم۔ اسی قسم کی نظمیں ہیں جن میں اعلیٰ خیالات نہایت حسین پیرایہ میں ظاہر کیے گئے ہیں۔

سرور کو شعر گوئی میں کمال حاصل تھا وہ ہمیشہ شاعرانہ خیالات میں غرق

رہتے تھے اور نہایت زود گو اور بے تکلف کہنے والے تھے۔ ہر چند کہ انھوں نے
 شہنوی غزل۔ رباعی قطعہ۔ قصیدہ۔ ترجیع بند۔ ترکیب بند۔ غرض کہ سب اصناف سخن
 میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ مگر سدس ان کو بہت محبوب تھا اور اس میں وہ بہت دلچسپیت
 دکھاتے تھے۔

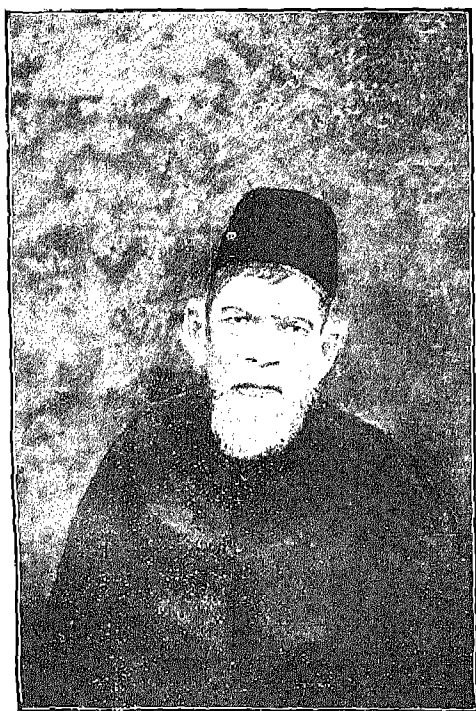
مختصر ان کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں ۱۔ جذبات نگاری۔
 درد و اثر۔ اعلیٰ تخیل۔ نہایت پیاری اور میٹھی زبان۔ قلبی کیفیات کا مدنی عن اظہار
 تنوع خیالات اور ان کا اظہار نہایت شاعرانہ اور لطیف طریقہ سے خوبصورت الفاظ
 میں اور وسیع انتظری۔ ان کا کلام دو مجموعوں میں شائع ہوا ہے۔ ایک وہ جو
 زمانہ پریس کا نیور سے ان نظموں کا بکلا جو اوقات مختلف سالہ زمانہ میں خیمہ شکر کے نام سے
 چھپیں۔ دوسرا جام سرور کے نام سے انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا ہے۔ ان کا اکثر
 کلام صنائع ہو گیا مگر اس سے بھی بڑھکے قابل افسوس یہ بات ہے کہ اکثر لوگوں نے ان کا
 کلام ہتھیالیا۔ کبھی معاوضہ کے ساتھ اور کبھی معاوضہ بھی مضامین کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد
 جو خطوط شائع ہوئے ان سے صاف طور سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی صاحب نے ان سے
 مختلف مضامین پر کچھ نہیں کھوئی تھیں اور ان کو اپنے نام سے شائع کر دیا تھا اس سے
 یہ حقیقت کھل گئی کہ بعض حضرات جو خود تو شاعری سے بہرہ نہیں رکھتے مگر شعرا کی
 صفی اول میں اپنا شمار کرنا چاہتے ہیں دوسروں سے کچھ دے لیکے کہوا لیتے ہیں
 اور پھر اس کلام کو اپنے اسم گرامی کے ساتھ بے تکلف شائع کر دیتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی اکبر اپنے زمانہ کی ایک بہت بڑی ہستی تھے انھوں نے ایک نئے
 طرز کی بنا ڈالی جسکے وہ خود ہی موجد اور خود ہی خاتم تھے اور اس طرز خاص میں انکی نقل

پہل محال ہر اُن کا کلام متنوع تقلید اور ناقابل رسائی ہے۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ایک بمثل شاعر ہونے کے علاوہ ناصح قوم اور بلند پایہ صوفی صافی بھی تھے۔ ان کے خطوط بھی نہایت دلچسپ لکھتے تھے اور ان سب کے ساتھ ادب سوسائٹی اور حکومت کے زبردست نقاد اور ماہر سیاسیات تھے۔ پھر مذاق و ظرافت میں تو مکیاتے روزگار تھے۔

سید اکبر حسین رضوی نام ۱۶۔ نومبر ۱۹۲۶ء تا تاریخ ولادت ہے۔ اُن کے والدین مرفہ الحال نہ تھے۔ ابتدائی تعلیم مدارس اور سرکاری سکولوں میں پائی۔ ۱۹۳۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیلدار مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں ہائیکورٹ کی مثل خوانی کی جگہ علی ۱۹۳۸ء میں وکالت کا امتحان پاس کر کے ۱۹۳۸ء تک وکالت کی پھر ملازمت سرکاری کی طرف میلان طبع ہوا اور نصف مقرر ہو گئے۔ ۱۹۳۸ء میں سبارڈنٹ جج اور ۱۹۴۲ء میں عدالت خفیفہ کے جج ہوئے۔ اسکے بعد خان بہادر کا خطاب گورنمنٹ حاصل کر کے ملازمت سے کنارت کش ہو گئے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے۔ ستمبر ۱۹۴۲ء میں انتقال فرمایا۔ اور دنیا سے ادب کو اپنا سو گوار چھوڑ گئے۔

اخلاق و عادات طبعاً نہایت خلیق اور منکسر المزاج تھے۔ مذاق اور ظرافت ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ سوسائٹی کی روح رواں سمجھے جاتے تھے۔ احباب کو جو ان سے ملنے آتے تھے اپنی بذلہ سنجی اور ظرافت طبعی سے بہت مسرور کرتے۔ خلق و مدارا۔ تہذیب، صداقت، ہمدردی اور مہمان نوازی اُن کے خاص جوہر تھے۔ بعض باتیں جو اُن کے کلام میں ”پالیسی“ یعنی مصلحت اندیشی اور زوانہ سازی پر مبنی سمجھی جاسکتی ہیں وہ اُن کے اُن خطوط میں جو خواجہ حسن نظامی، عزیز لکھنوی، منشی دینار حسین وغیرہ



اکبرالہ آبادی



شاه نظام آبادی

کے نام ہیں انکی استنبازی اور صداقت شکاری پر دلالت کرتی ہیں۔ انھوں نے بعض ایسی چیزیں بھی کہی ہیں جنکی اُن سے توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر وہ صرف اس لئے کہ وہ خود کو اور دوسروں کو پریشانی میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ مذہباً وہ سُنی تھے مگر شیعوں سے کوئی مخالفت اور تعصب نہیں رکھتے تھے۔ اسی طرح عقائد میں جہنم کہ وہ ایک پکے مسلمان تھے مگر مذہبی نارواداری اور عصبیت سے کوسوں دُور تھے۔ آخر عمر میں عوارض اور مصائب سے دل شکستہ ہو گئے تھے۔ اپنی اہلیہ اور محبوب بیٹے ہاشم کے انتقال سے اُن پر بڑا اثر پڑا۔ چنانچہ آخر الذکر کی وفات پر ایک دردناک قطعہ لکھا تھا جسکے دو شعر یہ ہیں۔

وہ جہن ہی مٹ گیا جس میں کہ آئی تھی ہمارے اب تجھے پا کر میں لے باہر ہاری کیا کروں
 بزمِ عشرت میں بٹھانا تھا جسے وہ اٹھ گیا / اب میں ای فردا تری امید واری کیا کروں
 اکبر کی شاعری اکبر فطری شاعر تھے بچپن سے اُن کو شعر کا شوق تھا۔ چنانچہ انکا ابتدائی شعر
 کا کلام انکی کلیات میں موجود ہے۔ شروع میں اپنا کلام غلام حسین وحید کو دکھاتے تھے
 جو آتش کے شاگرد تھے۔ اسی زمانہ میں فارسی اور عربی کی درسیات سے فراغت حاصل
 کی اور یہ معلومات اُن کو آخر عمر میں بہت مفید ثابت ہوئیں۔ ملازمت کے زمانہ میں
 انھوں نے انگریزی پڑھی اور اُس میں بھی اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی۔ اکبر کا دور
 شاعری ایک بسیط دور ہے جسکو انھوں نے خود پانچ حصوں پر تقسیم کیا ہے۔

پہلا دور ابتدائے مشق سے سلسلہء تک کا ہے۔ - اس
 زمانہ کا کلام پُرانے رنگ کا ہے۔ جو اُس زمانہ کا رنگ تھا۔ یہ
 زمانہ انکی نو مشقی کا سمجھنا چاہیے۔ اس میں انھوں نے لکھنؤ اور دہلی کے مستند اساتذہ کی تقلید

اور ان کے رنگ میں غزلیں کہیں اور اکثر مشاعروں میں پڑھیں۔ ان غزلوں کا وہی رنگ ہے جو قدیم میں برتا جاتا تھا۔ مضامین بھی وہی مقررہ تھے جن پر برابر طبع آزمائی کی جاتی تھی۔ اگرچہ ان میں کہیں کہیں جذبات عشقیہ بھی ہیں مگر صفائی، سادگی، حسن بندش، روانی وغیرہ بدرجہ حسن پائی جاتی ہیں۔ اس وقت کے کلام سے آئندہ کی ترقی کا پتہ چلتا ہے اگرچہ انہیں کچھ تصنع بھی شامل ہے۔

اس عہد میں صداقت اور جذبات کلام میں زیادہ ہیں۔ صلیبت بھی صاف طور پر نمایاں ہے۔ مشاقی کی جلا کلام کا جوہر ہے۔

دوسرے درجہ شاعر سے
سندھ عیسوی تک

اور قادر الکلامی کا بھی پتہ چلتا ہے مروجہ و معینہ مضامین کم ہوتے جاتے ہیں۔ مگر بھر بھی کہیں کہیں ان پر بھی طبع آزمائی کی گئی ہے۔ تصنع بے تکلفی اور صلیبت سے بدل گیا ہے۔ ذاتی رنگ حدود معینہ پر غالب آ رہا ہے۔ اشعار نے خشو زوائد سے پاک ہو کر انہی کی نیکل بدل دی ہے مگر غزلیں اس میں بھی دل پر چڑھی ہوئی ہیں۔ بہ طور اشعار کے درد و اثر بندش اور طرز ادا میں بے فرق معلوم ہوتا ہے۔

یہ زمانہ بہت بڑی ترقی کا زمانہ ہے۔ انہیں شاعر کو اپنے کلام پر پوری طرح قدرت حاصل ہو گئی ہے۔ وہ راستہ کو ٹٹولتے نہیں

تیسرے درجہ شاعر سے
سندھ عیسوی تک

اور نہ کہیں ٹھٹکتے ہیں بلکہ ہمت اور اعتبار کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اب ان کے کلام میں پورا استادانہ رنگ آگیا اور تجربہ اور نو مشقی کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ اب کلام میں نوکاری کی جھپک در تردد نہیں باقی رہا۔ غزلیں اس دور میں بھی عنصر غالب ہیں۔ مذاق و ظرافت کا غلبہ ہے جس میں ابھی وہ بات نہیں جو کہ بعد کو حاصل ہوئی۔ طنز سے بھی کلام آشنا ہوتا جاتا ہے۔ غزلوں کا رنگ اب پُرانے رنگ سے علیحدہ ہو کر

اُن میں ایک اخلاقی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ جدتِ ادا اور ظرافت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے روحانیت اور تصوف بھی جلوہ گر ہے۔ غزلوں کا رنگ باعتبار مضامین اور طرزِ ادا کے تو بہت کچھ ترقی کر گیا ہے مگر پھر بھی خارجی رنگ زیادہ ہے۔ اس زمانہ کا کلام ان کے کلیاتِ اول و دوم میں داخل ہے۔

چوتھا دور سنہ ۱۹۰۷ء سے

۱۹۱۲ء عیسوی تک

یہ دور بہت بڑی ترقی کا حامل ہے۔ اس میں اور دورِ سابق کی نوعیت میں کوئی زیادہ فرق نہیں بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ اسی کا متمم ہے۔ اس دور میں اکبر فی الواقع "لسانِ عصر" ہو گئے ہیں۔ اسیں قدیم رنگ کی غزلگوئی گھٹتی جاتی اور حسیات و فلسفہ بڑھتا جاتا ہے۔ مذاق و ظرافت بدستور ہے بلکہ اور تیز ہو گئی ہے اور اسی رنگ میں واقعاتِ حاضرہ اور مغربی تہذیب پر نہایت زبردست کلمتہ چینی کیجاتی ہے۔ اب ظرافت و شوخی بے لگام ہو گئی ہے اخلاقی، روحانی، فلسفیانہ اور سیاسی رنگ کا کلام میں زور ہے۔ مگر ساتھ ہی عاشقانہ رنگ بھی موجود ہے حسن و عشق کی زیر لبی گفتگو خاموش نہیں ہوئی مگر وہ اب سیاسیات کے غل غیاڑہ میں مدھم پڑ گئی ہے۔ اکبر اب اپنی صنعت کے صنّاعِ کامل ہو گئے ہیں اور کلام میں پختہ کاری آگئی ہے۔ خیالات میں تنوع ہے۔ قوتِ ابداع و ایجاد فنِ عروض کے قواعد اور مشکلات سے دہتی نہیں۔ اظہارِ خیال کے نئے نئے طریقے اور راستے ذہن میں آتے ہیں۔ اور ان کے واسطے نئے نئے دھچپ قافیوں اور جدید متعارف اور تشبیہوں سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ تصوف اور روحانیت بھی جلوہ گر ہے۔

پانچواں دور سنہ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۷ء تک

اس زمانہ کا کچھ کلام کلیاتِ سوم میں شائع ہو گیا ہے

اس دور میں عاشقانہ رنگ گھٹ کر بہت قدر قلیل رہ گیا ہے اور اب اشعار بالکل سیاسی، اخلاقی، روحانی رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ یا پھر وہی ظرافت جلوہ فرما ہے۔ اس دور کو ان کی شاعری کی معراج سمجھنا چاہیے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس زمانہ کے کلام میں وہ جوش و خروش اور بانگپن نہیں جو زمانہ شباب کے کلام میں ہر اور یہ سچ بھی ہے۔ اس لیے کہ طویل عمر نے ان کو زمانہ کے نشیب و فراز اور حقایق سے آگاہ کر دیا ہے اب زندگی ان کی نظر میں ایک عمیق معنی رکھتی ہے اور دنیا کی بے ثباتی پر ان کی نظر زیادہ جاتی ہے۔ اب چونکہ تجربہ وسیع ہو گیا ہے لہذا اکثر اشعار اس قابل ہیں کہ آدمی ان کو اپنا دستور العمل بنائے۔ اس زمانہ کا ان کا کلام بہت سہ ہے۔ اس قدر کہ دو کلیات مرتب کیے جاسکتے ہیں مٹنا ہے کہ بعض اشعار ایسے بھی ہیں جنکو وہ صیغہ راز میں رکھنا چاہتے تھے یعنی جنکی اشاعت ان کو منظور نہ تھی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ انھوں نے اپنے مرنے سے پہلے ایک کتاب مسمیٰ ”بہ گاندھی نامہ“ لکھی جسکو نان کو اپریشن کی ایک تاریخ سمجھنا چاہیے مگر اس کتاب کو انہوں نے مصلحتاً نہیں شائع کیا۔

ان کا مطبوعہ کلام تین کلیات میں شامل ہے جنہیں سے دو انکی زندگی میں طبع ہوئے تھے اور تیسرا ان کے صاحبزادہ نے ان کے انتقال کے بعد شائع کیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ابھی ایک اور شائع ہونے کو باقی ہے۔ اگر نثر کے خطوط بھی بہت خوب لکھتے تھے۔ ان کے مکتوب الیہ کثیر التعداد تھے جن سے ان سے خط و کتابت کا سلسلہ برپا رہا تھا جو خطوط کہ انھوں نے خواجہ حسن نظامی، منشی دیاندرائن گم حسن مارہروی، مرزا محمد ہادی، عزیز اور مولوی عبدالمجید بی لے کے نام لکھے ہیں وہ چھپ گئے ہیں ان کے اصلی مزاج کا رنگ بعض رنج کے واقعات بخوبی معلوم ہو سکتے ہیں اور ایک عمدہ

سواخمیری تیار ہو سکتی ہے یہ خطوط نہایت دلچسپ و لطیف مقولوں کی شان رکھتے ہیں۔ مگر پھر بھی مرزا غالب کے خطوط کی بات ان میں کہاں۔ اکبر کوئی بڑے نثار نہ تھے لہذا ان کی کوئی نثر کی چیز سولے ان خطوط اور اودھ پنچ کے مضامین کے جو پڑھنے کے قابل ہیں موجود نہیں ہر اودھ پنچ ہی سے انھوں نے غالباً نظر فیانہ رنگ اخذ کیا ہوگا۔

اکبر کی غزلیات جستی بندش، روزمرہ، سلاست، روانی، بے تکلفی، اعلیٰ تخیل، اور عمدہ تشبیہیں اکبر کی غزلوں کی جان ہیں۔ اُن کے اشعار دنیا کی بے ثباتی، دنیاوی جاہ و ثروت کی بے حقیقتی، اور دنیاوی مسرتوں کی ناپائیداری کے مضامین سے ملو ہیں اور درد و اثر اور حزن و یاس کے مضامین بھی بکثرت اُن میں موجود ہیں۔ مگر اکبر کی شہرت زیادہ تر اُن کی غزلوں پر مبنی نہیں کیونکہ انہی انکی مجموعی قابلیتوں کا صرف ایک منہج نظر آتا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند منتخب اشعار ان کی غزلوں کے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

رنگ قدیم

چال ہر تیغِ قضا کی جنبش ابرو سے دوست	جاں خواروں کے سوا کوئی نہ دیکھے سود دوست
گلشنِ دل سے اڑا لائی ہو شاید بوسے دوست	قص کرتی ہے نیم صبح کیوں ستانہ دار
غیرتِ دامانِ گلچین ہو رہا ہے کسے دوست	کیسے کیسے گل کھلے ہیں نقشِ پائے یار سے
جسمیں جو ہر کے عوض رہا ہو عکسِ دوست	میں رہ آئینہ ہوں اس حیرتِ سرے دہر میں
خیال تک نہیں جاتا کبھی ہنسی کی طرف	لکھا ہوا ہے جو رونا مرے مقدر میں
وہ آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتے کسی کی طرف	نگاہ پڑتی ہے اُن پر تمام محفل کی

یہی نظر ہے جواب قاتل زمانہ ہوئی
 یہی نظر ہو کہ اٹھتی نہ تھی کسی کی طرف
 ہزار جلوہ حسن تھاں ہوا سے اکبر
 تم اپنا دھیان لگائے رہو اسی کی طرف
 کوئی پہونچا نہیں ایسا تیرے قدر عنانک
 ہماری فکر عالی سر سے ہو آئی طوبے تک
 زمیں پر شمع روشن ہو فلک پر ماہ تاباں ہے
 تمھارے نور سے ہیں فیضیاء بنی سے علی ہر کہ
 جو آنے ناز سے بوجھا کہ تیری آرزو کیا ہے
 خوشی سے یہ ہوئے بخود کہ ہم بھولے تنانک
 کہیں دل ہوں کہیں میں باعثِ بیتابی دل ہوں :

کہیں اندازِ بسمل ہوں کہیں میں نازِ قاتل ہوں
 کہیں جلوہ ہوں صورت کا کہیں ہوں شاہِ معنی
 کہیں ہوں محلِ سلی کہیں لیلہ سے محل ہوں
 کہیں عاشق کا مطلب ہوں کہیں معشوق کی خواہش
 کہیں مجبورِ مطلق ہوں کہیں مختارِ کامل ہوں
 کہیں تصویرِ حیرت ہوں کہیں محو پریشانی
 کہیں ہوں شیفۂ رخ کا کہیں زلفوں کا امل ہوں
 کہیں ہوں دولہ دل کا کہیں ہوں ضبطِ عاقل کا
 روانی میں کہیں دریا کہیں رکنے میں ساحل ہوں

زنگِ متوسل

دنیا کا دیدنی وہ تماشا نکل گیا
 اب گردِ رہگئی ہے وہ میلا نکل گیا
 ہزارادہ میں نظر آتی ہر اک صورتِ یاس
 شغل اب کچھ بھی نہیں فسخِ غریب کے ہوا

مطمئن ہو کے لگاتا ہوں لحد میں بستر
 اب اٹھاتا ہر مجھے کون قیامت کے سوا
 پیغام آ رہا ہے دل بیستہ ار کا
 قائم ہے سلسلہ مرے شکوں کے تار کا
 شائق ہوا ہے بوسہ دامانِ یار کا
 اللہ رے حوصلہ مرے مشتِ غبار کا
 باغِ جہاں میں کوئی روشِ بخلش نہیں
 دوڑاؤں گل بہا تھ تو کھٹکا ہے خار کا
 شمسِ قمر کو دیکھتے ہیں تجھ کو بھول کر
 کیا شعبہ ہے گردشِ لیل و نہار کا
 اب تو ہے عشقِ بتاں میں زندگانی کا نذر
 جب خدا کا سامنا ہو گا تو دیکھا جائیگا
 ہے سببِ جوش جنوں کا رنجِ ہجرانِ محضو
 آپ تو تشریف لائیں ہوش بھی آجائے گا
 عشقِ بُت میں کفر کا مجھ کو ادب کرنا پڑا
 جو برہمن نے کہا آخر وہ سب کرنا پڑا
 تجربہ نے حُبِ دُنیا سے سکھایا احتراز
 پہلے کہتے تھے فقط مُرنے سے اور اب کرنا پڑا
 عالمِ ہستی کو تھا مدِ نظر کتمانِ راز
 ایک شے کو دوسری شے کا سبب کرنا پڑا

شعر غیروں کے اُسے مطلق نہیں آئے پسند

حضرت اکبر کو بالآخر طلب کرنا پڑا

(رنگِ آخر)

جب یہ دیکھا کہ ہاں میں کوئی میرا نہ رہا
 شدتِ یاس سے میں کپ بھی اپنا نہ رہا
 اسکی پروانہ رہی خوش رہے دُنیا مجھے
 عاقلوں میں مری گنتی ہو یہ سودا نہ رہا
 حیرت افزا ہے مراحلِ مگر کون سنے
 دیدنی بھی ہے مگر دیکھنے والا نہ رہا
 دیکھنے کی تو ہے یہ بات رہا کیا اُس میں
 آپ اکبر سے عبت پوچھتے ہیں کیا نہ رہا

بے تعلق منزل ہستی سے گذر ادا دل مرا
 اسکی نظروں میں سزاوارتنا کچھ نہ تھا
 نہیں ہے کام زباں کا کچھ اب عا کے سوا
 نظر کسی پہ نہیں ہے مری خدا کے سوا
 کروں کیا غم کہ دنیا سے بلا کیا
 کسی کو کیا ملا دنیا میں تھا کیا
 یہ دونوں مسئلے ہیں سخت مشکل
 نہ پوچھو تم کہ میں کیا اور خدا کیا
 وہاں قالوا بلے یاں بُت پرستی
 ذرا سوچو کہا کیا تھا کیا کیا
 اکی اکتبر بیکس کی ہو خیر

یہ چرچے ہو رہے ہیں جا بجا کیا

میرے دل سے امتیاز دی و فدا اٹھ گیا
 حشر بھی ماضی نظر آیا جو پردا اٹھ گیا
 جہان فانی کی حالتوں پر بہت توجہ بحث ہو کبر
 جو ہو چکا ہے وہ پھر نہ ہوگا جو ہو رہا ہو وہ ہو چکا
 ترک دنیا کے خیالات کو دھوکا پایا
 غور جب ہم نے کیا سانس کو دنیا پایا
 نبی کو سمجھا نہیں ہوں اب تک اگرچہ وہ اصل مدعا ہے
 خدا کو البتہ جانتا ہوں خدا یہی ہے جو ہو رہا ہے
 جدائی نے میں بنایا مجھ کو جدا نہ ہوتا تو میں نہ ہوتا

خدا کی ہستی ہے مجھ سے ثابت خدا نہ ہوتا تو میں نہ ہوتا
 دو نگہ ذرا سمجھ کے جواب انکی بات کا
 رخ دیکھتا ہوں سلسلہ واقعات کا
 دل میں ہو خون تو سودا کا خریدار نہ ہو
 دہریں سوختہ گرمی بازار نہ ہو
 نقش دل ہو صفت معنی رنگیں دوست
 رنگ ظاہر پہ نہ جانفش بہ دروار نہ ہو
 سانس کی طرح چلے منزل ہستی میں بشر
 مدعا یہ ہے کہ دم بھر کو بھی بیکار نہ ہو

نہیں آزاد جوائیوں سے تعلق کرے قطع وہ ہے آزاد جو غیروں کا گرفتار نہ ہو
 بزم ہے شعلہ مزاجوں کی سنبھل اور اکبر برق خرمین کہیں یہ گرمی گفتار نہ ہو



جنوں عشق سے انسا کی طینت سنورتی ہو یہی سستی وہ ہو جو عقل کو ہشیار کرتی ہو
 یہ سچ ہے، یہ سچ ہے نصف دنیا نصف دنیا کہ یہ ماتم میں ہو مصروف اور وہ چین کرتی ہو

وہ ایذا میں مجھے مایوں نے دی ہیں اور اکبر
 کہ امید اب قدم رکھتے ہوئے بھی دلیں دیتی ہے

اکبر کی خوش طبعی اور ظرافت اکبر کی خاص شہرت انکی ظرافت، بذلہ سخی اور لطیف طنز و مزاح
 پر مبنی ہے جو ان کی زریں نظموں میں ابداموتیوں کی طرح چمک رہی ہیں۔ ان کا ابتدائی
 ظریفانہ رنگ دودھ پنچ کی نامہ نگاری سے شروع ہوا مگر وہ بہت جلد اُس سے گزر کر
 ترقی کے مدارج اعلیٰ تک پہنچ گیا۔ انہیں کوئی شک نہیں کہ اوائل عمر ہی میں انکو
 اس رنگ سے خاص لگاؤ تھا کیونکہ اس زمانہ کے کلام میں بھی تین اشعار کے ساتھ
 کہیں کہیں مذاق و ظریفانہ اشعار کہہ جاتے ہیں۔ اُس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا
 اور سوسائٹی کا رنگ بدلتا گیا ان کے اس رنگ میں ترقی ہوتی گئی اور سنجیدہ کاری آتی گئی
 اس رنگ نے انکی شوخ طبیعت کے واسطے نئے نئے راستے کھول دیے اور انھوں نے
 اس سے نہایت مفید خاص خاص کام لینا شروع کیے۔ اس رنگ میں حقیقتاً وہ
 بیمثال رہے اور ہر چند کہ بہت سے لوگوں نے انکی نقل کرنا چاہی مگر صحیح معنوں میں

۱۔ مقابلہ کرو آدم اسمتھ کے اس مقولہ سے کہ ”مفلسی ایک لازہ ہے جو نصف دنیا نصف دنیا
 سے چھپاتی ہے۔“ ۱۱۔

کوئی ناقل نہ ہوا سبقتاً ہے۔ وہ حقیقی ظرافت اور شاعرانہ دل و دماغ کا مجموعہ تھے۔ اُن کا تیسرے دور کا کلام خاص کر اس رنگ میں بہت کامیاب ہے۔ اسیں ان کی ظرافت محض ظرافت ہے آخر عمر میں البتہ اس طرز و روش میں فرق آگیا ہے اور وہ ظرافت کے پردہ میں اور بہت سے مفید مضامین ادا کر جاتے ہیں۔ اس وقت اگرچہ وہ نحیف و زار ہو گئے تھے مگر شاعرانہ دل و دماغ برابر اپنا کام کرتا تھا۔ اس زمانہ میں وہ ظرافت اور بذلتہ سخی کو۔ اخلاقی، سیاسی و روحانی مسائل کے ادبے مطالب کا ایک مؤثر ذریعہ بنائے ہوئے تھے مقصود بالذات صرف ظرافت نہ تھی بلکہ تعلیم حقایق مقصود اصلی تھی۔

اکبر کی ظرافت کے اجزاء حسب ذیل ہیں :-

(۱) جدید اور لطیف تشبیہیں اور تشلیس جو عام مشاہدے کی چیزوں میں برقی جاتی ہیں۔ اُن میں وہ تصنع اور ناز کنجیالی سے کام نہیں لیتے بلکہ انھیں چیزوں کا ذکر کرتے ہیں جبکہ ہر شخص دیکھتا ہے اور جانتا ہے اور انھیں کے بیان میں ایک خاص جدت اور لطیف پیدا کر دیتے ہیں جس سے دل مزے لیتا ہے۔

(۲) نئے نئے با مذاق الفاظ مختلف زبانوں کے آخر شعر میں بطریق قافیہ استعمال کرتے ہیں۔

(۳) معمولی الفاظ ایسے انوکھے طریقہ سے استعمال کرتے ہیں جو اُس سے قبل کبھی نہیں سنے گئے تھے۔

(۴) ایسے معمولی اور سبک الفاظ جن کو شعرا عام طور پر استعمال نہیں کرتے وہ شعر میں نہایت جدت طرازی اور شوخی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اس قسم کے

الفاظ کی اتنی کثرت ہے کہ اُن کی ایک مختصر فرہنگ تیار ہو سکتی ہے مثلاً گلو۔
صلو۔ بدھو۔ جمن۔ وغیرہ۔ کہ یہ اُن کے خاص اصطلاحات ہیں اور وہ انکو خاص
خاص معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ معمولی معمولی الفاظ مثلاً گٹ پیٹ فالتو۔
یا اکثر بازاری محاورے جو شعر میں نہیں کھپ سکتے اور عام طور پر کانوں کو بُرے
معلوم ہوتے ہیں مگر اُن کے کلام میں وہ نہایت عمدگی سے استعمال ہوئے ہیں
اسی طرح ایسے بھی الفاظ ہیں کہ جو دیگر شعر کے یہاں اور معنی میں استعمال ہوئے
ہیں مگر اکبر اُن کو بالکل دوسرے معنی میں استعمال کرتے ہیں بعض ایسے انگریزی
الفاظ بھی لکھ جاتے ہیں جو اردو میں ہنوز مروج نہیں ہوئے اور کلام میں ثقیل اور
بے میل معلوم ہوتے ہیں۔ اس تراش خراش میں اُنھوں نے محض اپنی طباعی اور
نہانت سے کام لیا ہے۔ کوئی رنگینی عبارت یا عمق معنی پیدا کرنا مقصود نہیں ہے
بلکہ صرف ہنسنا ہنسانا مقصود ہے۔

اکبر کی ظرافت کو محض بدلہ سخی اور مسخرہ سمجھنا چاہیے، اُسکی تہ میں نہایت
لطیف اور عمیق معنی ہوتے ہیں اور کوئی نہ کوئی حقیقت خواہ وہ اخلاقی ہو یا تعلیمی
سیاسی ہو یا معاشرتی، ادب آموز ہو یا روحانی ہمیشہ اُس میں پنہاں ہوتی ہے۔
اُن کے الفاظ اور معانی میں ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے پند و نصائح
کبھی تلخ نہیں معلوم ہوتے اور نہ اُن کا مذاق عامیاناہ اور سو قیاناہ ہوتا ہے۔ انکی ظرافت
بہت جامع اور وسیع ہوتی ہے۔ وہ کبھی کسی مخصوص شخص یا جماعت کا خاکہ نہیں
اُڑاتے بلکہ ان کی ظرافت کے تیر بلا لحاظ مراتب سب طرف چلتے ہیں۔ البتہ واقعات
و سیاسیات حاضرہ انکی خاص دیکھی کی چیز ہے۔ مغربی طرز تعلیم اور ہندوستان میں

انگریزی تہذیب کی دلدادگی پُر اُنھوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ ہیٹھ رح سوسائٹی کی خرابیوں اور تعلیمی اور مذہبی نقائص کو بھی نشانہ ظرافت بنایا ہے۔ امیر و غریب عالم و جاہل ہندو مسلمان سنی شیعہ سب کی بلا امتیاز و تفریق خبر لگائی ہے۔ اُن کے کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ سیاسیات سے اُن کو خاص دلچسپی تھی۔ اس قسم کے بعض اشارہ بادی النظر میں تو معمولی معلوم ہوتے ہیں مگر نظر غور سے دیکھا جائے تو ان میں تیر و نشتر بھرے ہیں۔

اکبر کی خاص اصطلاحات یہ ہیں۔ مس۔ شیخ۔ سید۔ اونٹ۔ گائے۔ کلیسا۔ مسجد۔ مندر۔ بُت۔ کالج۔ برہمن۔ لالہ۔ اور اسی قسم کے دیگر الفاظ جو ایک خاص معنی رکھتے ہیں۔ مس سے مغربی تعلیم کی نظر فریبی اور دلکشی۔ شیخ سے پُرانے رنگ کے مسلمان جو اپنے مذہب کی باتوں سے تواقف ہیں مگر انگریزی تہذیب سے بالکل نا آشنا ہیں۔ سید سے سرسید مرحوم جو انگریزی تعلیم و تہذیب کے دلدادہ تھے۔ لالان کے متبعین یعنی علیگڑھ کالج کی تعلیم کے عاشق۔ اسی طرح اونٹ سے مسلمانوں کی قدیم شان و شوکت اور گائے سے مسلمان ہندوؤں کا اتحاد مُراد ہے۔

اقسام ظرافت اکبر کی ظرافت مندرجہ ذیل اقسام پر تقسیم ہو سکتی ہے۔ مذہب۔ سیاسیات۔ تہذیب جدید۔ پردہ و تعلیم نسواں۔ ظرافت الفاظ۔ طنز بات۔ ان سب اقسام کے نمونے بالترتیب مختصر پیش کیے جاتے ہیں۔

مذہب

داڑھی خدا کا نور ہے بیشک مگر جناب فیشن کے انتظام صفائی کو کیا کروں

چہرے کے نیچے تہہ در تہی کا جھول جھال
اس فرد کو بجائیے تفصیل ذیل سے
بجائیں شوق سے ناقوس برہمن اکبر
یہاں توشیح کو دھن ہو بگل بجانے کی
مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی
اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو
پتیا ہوں شراب اب زفرم کے ساتھ
رکھتا ہوں اک اونٹنی بھی ٹم کے ساتھ
سہے عشق حقیقی و مجازی دونوں
قوال کی بھی صدا ہے چم چم کے ساتھ
صاف کہتا ہوں رہیں خوش یا ہوں ناخوش مولوی

آسمان اب چاہتا ہے مولوی کش مولوی
پیارا ہے ہمو شیخ ہمارا برا سہی
چاقو دلاکتی نہیں دیسی چھرا سہی
مصیبت میں بھی اب یاد خدا کی نہیں لگو
دُعائے سے نہ نکلی پاک پڑوسے اعضا نکلیں
بے نازوں میں ہیں وہ اور اسپہ شہزادے نہیں
یہ غنیمت ہے کوئی ٹوکے تو گمراہ تے نہیں
نیست کس مصروف کار دیں قلب مطمئن
یک فنا فی الارست یک فنا فی اللہ ارون
شیخ پر گو کہ رشک آتا ہے
اونٹ کے سب لغات جانتے ہیں
ہیں مگر اونٹ پر ہیں قابض
کام کی ہم یہ بات جانتے ہیں
اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے
کو نسل میں بہت سید مسجد میں فقط جُمن
آج بنگلے میں مرے آئی تھی آواز اذان
جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے دے
اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے
انگہ تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے

سیاسیات

حرفیوں نے رپ لکھوائی ہو جاگے تھانے میں کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

انوکھے پیش شاغل حضرت اکبر کے ان فرزند
 مریدان کے تو شہروں میں اڑے پھرتے ہوئے پڑے
 بابو کہنے لگے سبٹ پہ لڑو
 کہدیا صاف ہم نے او مہراج
 مایقمان کو سے دلداریم
 کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
 یہ دال لب گنگ کبھی گل نہیں سکتی
 کامیابی کا سدیشی پر ہر اک بستہ ہے
 اصل کا اُس بت خود میں کوئی نہٹ کہاں
 ممبر علیزاد ہیں یا سکھ ندہاں ہیں
 الم ترکیف بیٹھے پڑھ رہے ہیں فیل خانے میں
 نظر آتے ہیں لیکن شیخ جی اب تک میانے میں
 ملک کو دیکھو اپنے حق پہ اڑو
 ہو مبارک تھیں یہ کام یکاج
 یا ڈپوٹیشن ست یا غم میم
 جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو
 کلو کے پٹاخے سے بلا ٹل نہیں سکتی
 چونچ طوطا رام نے کھولی مگر پرستہ ہے
 صرف بوسہ میں بھلا سلف گورنٹ کہاں
 لیکن معائنہ کو وہی نابدان ہیں

تعلیم و تہذیب جدید

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
 شوق لیلایے سول سٹریٹس نے اس مجنون کو
 جامہ ہستی کے ٹکڑے اڑ رہے ہیں نزع میں
 نہ تیرنگنی ہے نہ اب حکمرانی
 کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باب کو خطی سمجھتے ہیں
 اتنا دوڑا یا لنگوٹی کر دیا پتلون کو
 پھینکیے اب کوٹ کو تہ کیجیے پتلون کو
 نہ وہ وضع ملت نہ قرآن خوانی
 یہی کہتی پھرتی ہر لڑکے کی نانی
 مرالال کالج کا کا کا تو ہے
 جو عقل سکھائی جاتی ہو وہ کیا ہو فقط کلاسی
 ہم ادب ہے نہ وہ مہربانی
 ہرک شاخ میں باس یارے بوسے
 تعلیم جو دی جاتی ہو ہمیں وہ کیا ہو فقط بازار ہستی

ٹرخا دیا ہر اک کو مغرب نے پاس کر کے
سنتے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات
سید بھی کورے کھسکے برسوں مساس کر کے
انجن کی ان کے کان میں ابھاپ دیئے

پرودہ و تعلیم نسواں

پرودہ اٹھتا ہے ترقی کے یہ سامان تو نہیں
عرب اکبر نے بحث پرودہ کی کی بہت کچھ لکھ لکھا
عوریں کالج میں پہنچ جائیں گی علمائے تو ہیں
نقاب لٹ ہی ہی اسے لکھ کر کہہ رہی لیکٹور لکھ لکھا
بے پکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے
صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے
نظر میں تیرگی ہو اور رگوں میں ناتوانی ہو
تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
زی علم و تقویٰ ہوں جو ہوں ان کے منتظم
ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسمان نکلیں
حاجہ چکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
جہاں لے ملک میں ہونا ہو کیا تعلیم نسواں کے
بجز اسکے کہ باوا اور بھی گھبراہٹیں آتاں سے

خرافات الفاظ

ح حکومت کی جب بیاں نہ رہی
ہر طرح اب ہو عاجزی ہم میں
خفی نفی ہیں معطل ہیں
اب ہمارے امام جنبل ہیں
اذانوں سے سوا بیدار کن انجن کی سیٹی ہے
اسی پر شیخ بیچارے نے چھاتی اپنی پٹی ہو

کہاں باقی ہے ہم میں ہا اور اسحر گاہی
 آگے شربت کے دن یاروں کے آگے اتنا کبر
 شیخ ثلث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ
 عاشقی کا ہو برا سنے بگاڑے سارے کام
 شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور یہ فرما دیا
 پچالیس سپکرو روٹیاں تھوڑے جولا نا
 عہد اسلام و عہد انگلش میں
 پہلے توحید تھی تو اب تحصیل
 وظیفہ کی جگہ یا پانیس یا آئی ڈی ٹی ہے
 کبھی سوڈا کبھی لٹنڈ کبھی ہسکی کبھی ٹی ہے
 گھر میں بیٹھے ہوئے وائٹن پڑھا کرتے ہیں
 ہمتو لے بی میں لے لے اغیار بی لے ہو گئے
 آپ بی لے پاس ہیں اور بی بی بی پاس ہے
 ہماری کیا ہر ای بھائی نہ مسٹر نہیں مولانا
 سنیے قول اکبر سخنگو کا
 آگے غل ایک کا تھا اب دو کا

طنز بایت

آئنا گرے جو ہے نام و نمود میں
 کیا ہر ج زندگی ہو اگر حال زشت میں
 دوزخ کے داخلے میں نہیں ان کو عذر کچھ
 نوٹ کوئی لگا لے جو ان کا بہشت میں
 نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہر نہ حج ہے
 تو خوشی پھر سکی کیا ہر کوئی جنت کوئی حج ہے
 ہماری مجلس اب بھی لطیف اجزا سے ملو ہیں

بُزِ اخفش تھے قبل اسکے اب اسپر کے ٹٹو ہیں

حال دنیا سے بیخبر ہیں آپ
 گو تقدس آب بنیاک ہیں
 شیخ جی پر یہ قول صادق ہے
 چاہ زفرم کے آپ مینڈک ہیں
 شیخ جی کو جو ایک غصہ
 لگے کہنے یہ پھینک کر دھو سا
 تم ہوشیطان کے مطیع و مرید
 تم کو ہر ایک جانتا ہے پلید



-رضا جعفر علي خان اڻڙ لکهنوي



مولانا حسرت موهانی

ہے تمھاری نمودیں اتنی جس طرح ہو پڑی پر پڑید

استحصال بالجبر

یعنی ایسے اشعار جو ادنیٰ التعلیل الفاظ سے کلام اکبر بن گئے ہیں -

کر یا بہ بخشائے بر حال قوم	صلوۃ است رائج در ایشاں نہ صوم
کر یا بہ بخشائے بر حال بندہ	کہ ہستم اسیر کمیٹی و چندہ
رشتہ در گردنم انگندہ پیٹ	مے بردہ ہر جا کہ کیا است و پیٹ
پہلے ہم لوگ یہ سمجھتے تھے	ہر چہ از باپ میرسد نیکوست
ہو گئی اب خیال کی اصلاح	ہر چہ از آپ میرسد نیکوست
انکوں کو ادا مرغ کہ پُرسد ز پانیر	کزن چہ گفت و مل چہ شنید و طرح کرد
ہیٹ رانہ بر سر من جاے دستار العزیز	مردتا مسطر تو اند شد چرا قبلہ شود
عمر گزری ہوا اسی بزم کی طراری میں	دوسری پشت ہو چندہ کی طلبگاری میں
ڈنر سے محکم فرصت یہاں فاقہ سے کم خالی	چلوں ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی
الایا ایتھا اطفالک بحو راحت بہ ناوہا	کہ قرآن سہل بود اول دے افتاد مشکہا
ابن ترمین پائے خود بہ بوط دامن قیلوں	کہ سر سید خبر دار در راہ و رسم منزلہا
سکہ زر با بوسے در دھوتی نہ زتا رداشت	با وجودش ناہماے زار در اخبار داشت
گفتش در عین وصل اس نالہ و فریاد حسیت	گفت مارا خوف نہیں و شکس دیں کا داشت
دیس ہر گریہ آخر خندہ ایست	بعد ہر اسپنج آخر چندہ ایست
یاد داراں قول مولاناے روم	مرد آخر میں مبارک بندہ ایست

ہم ڈنر خواہی وہم آرد غ صاف ایں خیال ست و محال ست و گزاف
 اکبر کی سیاسی نظمیں اس قسم کی نظمیں دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جن میں محض ظرافت ہی
 ظرافت ہے یعنی ایک عمدہ خیال ظریفانہ طرز میں ادا کیا گیا ہے اور سن ان کا مقصد
 صرف خوش طبعی ہے۔ دوسری وہ کہ جن میں ظرافت کے پردہ میں سیاسی معاملات
 اور حقائق منضم ہیں۔ اس قسم کے اشعار میں مصنف کی رائے کے ساتھ انکی ذاتی ناراضی
 اور غیظ و غضب بھی شامل ہے۔ ان میں ظریفانہ انداز صرف اس لیے اختیار کیا گیا ہے
 کہ حق بات کی تلخی دور ہو کر شاعر کا دلی مطلب سامع کے دل میں اتر جائے۔ اس قسم کے
 اشعار سے وہ وہی کام لیتے ہیں جو ایک ہوشیار ڈاکٹر شکر آلود و تلخ گویوں سے لیتا ہے۔
 معمولی اشخاص کے واسطے ایسے اشعار صرف ہنسنے ہنسانے کا کام دیتے ہیں۔ مگر
 جو لوگ ان کے انداز طبیعت سے واقف ہیں ان کے لیے وہ بہت عمیق معنی رکھتے
 ہیں۔ پڑھنے والے کو چاہیے کہ اس قسم کے اشعار کا مطلب سمجھنے کی واسطے وہ ذرا غور و فکر
 سے کام لے۔ سیاسی اشعار میں وہ مغربی طرز معاشرت کی حقیقی اور اصلی کیفیت دکھاتے
 ہیں ان کے نزدیک یہ سب دام ہیں جو مشرقی روحانیت کو شکار کرنے کے لئے بچھائے
 گئے ہیں۔ سیاسی حقوق کو وہ محض زنجیر غلامی کی مختلف کڑیاں تصور کرتے ہیں جو سید
 سائے ہندوستانیوں کے پھانسنے کی تدبیریں ہیں۔ ان کے نزدیک سرکاری اسکول
 ایسے کارخانوں سے زیادہ نہیں جن میں کلارک لوگ تیار کیے جاتے ہیں اور غلامی سہیت
 اور بڑھائی جاتی ہے اور انگریزی تعلیم سے زنجیر غلامی کی کڑیاں اور بھی کستی جاتی ہیں
 وہ محکمہ سی۔ آئی۔ ڈی سے معشوق کی مگر کی تلاش کراتے ہیں اور کہتے ہیں۔
 کیا پوچھتے ہو اکبر شوریہ سر کا حال خفیہ پولیس سے پوچھ رہا ہے مگر کا حال

عیسائیت کے اس فرسودہ اعتراض کے جواب میں کہ اسلام بذریعہ شمشیر پھیلا گیا
 وہ پوچھتے ہیں کہ کیا یورپ بھی اپنی توپوں اور مغربی ساز و سامان کی چکا چوندھ سے
 روپیہ وصول نہیں کرتا اور رعایا کو دائمی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ بند کرنا نہیں چاہتا۔
 مگر اس قسم کے اشعار کو انکی ذاتی رائے سمجھنا ضروری نہیں۔ کیونکہ اکبر ایک بڑے شاعر
 تھے۔ سیاست داں نہ تھے۔ انھوں نے علم بالٹیکس کی تعلیم نہیں پائی تھی بلکہ وہ ایک
 سرکاری ملازم تھے اور مختلف عہدہ ہائے سرکاری پر اپنے فرائض منصبی قابلیت سے
 انجام دیکر منشن پا گئے تھے اور حسن خدمات کے صلے میں خان بہادری کا خطاب بھی
 ملا تھا۔ چونکہ وہ شاعر تھے لہذا ہر قسم کے خیالات کا اظہار شعر ہی میں کرتے تھے اس سے
 غرض نہیں کہ وہ خیال ان کا ذاتی ہوتا یا کسی دوسرے کا ہوتا تھا۔ ان کو خیال کی
 واقعیت سے سروکار نہ تھا بلکہ اُسکے طرزِ ادا سے تھا۔ وہ کبھی گورنمنٹ کے موافق اور کبھی
 گورنمنٹ کے خلاف لکھتے تھے۔ اور چونکہ شاعر تھے لہذا نتائج کی گرفت سے بخون تھے
 انکی رائیں جیسا کہ ان کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہیں کسی ہر سیاسیات کی مستند رائیں
 نہیں شمار کی جاسکتیں کیونکہ ان کے مقولوں میں بعض جگہ اختلافات بھی ہیں۔ وہ
 فطرتاً بہت محتاط تھے اور کوئی ایسی رائے نہیں ظاہر کر سکتے تھے جسکے نتیجہ میں انکو
 دشواریاں پیش آتیں۔ وہ شاعر پہلے ہیں اور اسوائے شاعر بعد کو۔ ان کا مقصد
 فرض منصبی خوش کرنا ہے خیالات کا اظہار اُس کے بعد ہے۔ وہ کسی گروہ یا جماعت
 کی کمزوریوں کی گرفت کرتے ہیں اور ان کو اپنے اشعار میں نہایت مختصر جامع اور
 ظریفانہ انداز سے پیش کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ مسلمانوں کے معرے ہیں کہ وہ انگریزی
 تعلیم حاصل کرنے میں کوشاں ہیں۔ دوسرے مواقع پر وہ اسی تعلیم مغربی کے سخت

مخالف ہیں کیونکہ یہ ہیدینی اور لاندہبی کا زینہ ہے۔ وہ اخلاقی مسائل کو کسی رفارم یا
 فلسفی کی طرح شرح و بسط سے بیان کرنا نہیں چاہتے بلکہ اُن کو اپنے اشعار میں محسوس
 مختصر طریقہ سے بیان کر جاتے ہیں مگر یہی مختصر مضمون کو بہت معنی خیز اور پُر زور
 بنا دیتا ہے۔ پھر الفاظ کے انتخاب میں اُن کو وہ یدِ طوئی حاصل ہے کہ ایک ہی لفظ
 سے کئی کئی معنی نکالتے ہیں جو بادی النظر میں عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اُنکے
 نزدیک تمام سیاسی امراض کی جڑ ہندوستان کی کمزوری ہے ہماری خوشامد اور گڑبگڑ
 سے اور اسی طرح آہ وزاری اور اضطراب سے ہم کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔
 یہ تو بے کار بیکار مصروف اور کمزوری کی نشانی ہے۔ اسی طرح اُنھوں نے کانگریس کی
 کارروائیوں انتہا پسند جماعتوں ”اور جابرانہ“ حکومت کے نقائص کا بھی خوب ذکر کیا ہے
 یہ سب مضامین نہایت نادر استعارات لطیف اشارات اور بلینغ ظرافت کے پردہ میں
 چھپے ہوئے ہیں معمولی پڑھنے والوں کے واسطے تو وہ محض ایک زعفران زار ہیں
 اگر چشمِ حقیقت ہیں انکی تہ میں ایک معنی دکھتی ہے۔ اُن کے اشعار میں محض سماعی اثر
 سے بہت زیادہ اثر ہے۔ ان کے بعض اشعار پر گورنمنٹ کو جنگِ عظیم اور بلوہ مسجد کلنچو
 کے زمانہ میں ان کو متنبہ کرنا پڑا تھا کہ شورشِ انگیز مضامین لکھنے سے آئندہ اجتناب
 کریں۔ اُن کے اشعار بہت مؤثر تھے اور ہر شخص کی زبان پر تھے اس واسطے کہ آدے سے
 اعلیٰ اور عامی سے عالم تک اُن کو پڑھتے اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اُن کا مطلب
 نکال کر اُن سے محفوظ ہوتے تھے۔ اُن کے کلام کی یہ بھی ایک خاص صفت ہے
 کہ اردو اور ہندی زبان کے دلدادہ دونوں اُسکو مساوی طریقہ پر پسند کرتے ہیں۔
 سیاسی اور اخلاقی میدان میں اکبر ایک قومی شاعر ہیں وہ اپنی قوم کے

لوگوں کو تنبیہ کرتے ہیں کہ تم نے اپنا قومی امتیاز اور قومی آئیڈیل چھوڑ دیے اور مغربی معاشرت اور مغربی تعلیم کے دلدادہ ہو گئے۔ اُن کا یہ اعتقاد ہے کہ روحانیت اور دین پر ضرور غالب آئیگی۔ تمام سیاسی مشکلات کا اُن کے نزدیک حل یہ ہے کہ احکامِ خداوندی کی تعمیل کی جائے اور قدرتِ خداوندی پر پورا بھروسہ رکھا جائے۔

اکبرؒ کی شاعری کی نمود کا زمانہ وہ تھا جبکہ ہندوستان گویا نیا جنم لے رہا تھا۔ مغربی تعلیم اور مغربی معاشرت کی شرابِ خالص ہندوستانیوں کے دماغوں میں اثر کر گئی تھی جسکی وجہ سے اعتدالِ دماغی وہ کھو بیٹھے تھے ہندوستان ایک عجیب انقلاب کا جولانگہ تھا۔ مغربی تمدن، مغربی اخلاق و معاشرت، غرض کہ ہر قسم کی مغربیت آنکھوں کو خیرہ اور دماغوں کو تیرہ کر رہی تھی۔ ہندوستانی لوگ مغربیت کے انے دلدادہ ہو گئے تھے کہ انگریز بننا اپنا فخر سمجھتے تھے۔ اس قسم کے لوگوں کو اس میں خاص لطف آتا تھا کہ پرانی تہذیب اور پرانے خیالوں کا خاکہ اڑائیں۔ وہ ہر ہندوستانی چیز کو نگاہِ حقارت سے دیکھتے تھے۔ یورپی نام۔ یورپی لباس۔ یورپی طعام۔ یورپی وضع و قطع مرغوب خاطر تھی۔ انگریزی گفتگو ایک خاص طغرائے امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ ہر انگریزی چیز خواہ کیسی ہی ہو ہندوستانی چیز سے بہتر خیال کی جاتی تھی مختصر یہ کہ فاتحوں نے مفتوحوں کے عقل و تمیز ہوش و خرد پر بھی تسلط پالیا تھا۔ قدیم رسم و رواج حتیٰ کہ مذہب کی بھی بے احترامی اور رسومِ شکنی کی ہوا چلی ہوئی تھی۔ یہی پر آشوب زمانہ تھا کہ اس میں کچھ انجام میں ہستیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ یہ لوگ آئندہ خطرے سے واقف تھے۔ اُنھوں نے اُن تیز رفتار لوگوں کو جو شر بے ہمار کی طرح منہ اٹھائے چلے جاتے تھے آگے بڑھنے سے روکا اور راستہ کے

خطرات سے آگاہ کیا۔ بنگال کا نامور افسانہ نگار بنکم چندر چٹرجی اسی قبیل کا آدمی تھا۔ اسے اپنے پُزور اور دلچسپ ناولوں میں انگریزی تہذیب اور انگریزی سوسائٹی کا جو خاکہ اڑایا ہے اور جو کام اس کے افسانوں سے بھلا وہ بہترین و عظیم نصیحت اور سخت ترین نکتہ چینی سے ہرگز نہیں کھل سکتا تھا۔ اکبر نے بھی یہی روش اختیار کی مگر اُن کا حربہ بجائے نشر کے نظم تھا۔ اُنھوں نے بھی اُس زمانہ کی حماقتوں کو خوب لتاڑا اور لوگوں کے غرور اور طرزدوش کا لطیف جوابات الزامی سے خوب خاکہ اڑایا مگر بعض جگہ وہ چوک گئے ہیں اور نشانہ خطا کر گئے ہیں۔ اُنھوں نے مناسب حالات اور مصالح وقت کا خیال نہ کر کے بسا اوقات مغربی تہذیب کے درخت کو بیج و بون سے اکھاڑنا چاہا ہے۔ وہ وقت کے ساتھ چلنا نہیں چاہتے تھے۔ اور مغربی تعلیم کے مستقل اور دیرپا فوائد کے بھی قائل نہ تھے۔ شاید اسی وجہ سے یعنی انتہائی قدامت پسندی سے پوری پہلک اُن کے ساتھ نہ تھی۔ اور اسی وجہ سے اُنکی شہرت پر کسی قدر اثر پڑا۔ اس نئے انقلاب کے زمانہ میں سر سید سب سے پہلے شخص تھے جو مغربی تہذیب کے فوائد سے بہت متاثر ہو گئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو اُن کے

۱۔ یہ مصنف صاحب کی ذاتی رائے معلوم ہوتی ہے۔ اصل یہ ہرگز کہ ایک بہت مذہبی شخص تھے اور آخر عمر میں تو علی الخصوص اُن کا کلام مذہب اور روحانیت سے مملو تھا۔ وہ ترقی اور تہذیب کے کسی حال میں منکر نہ تھے عام اس سے کہ وہ مردوں میں ہو یا عورتوں میں۔ مگر حبائیت تہذیب کا تصادم مذہب سے ہوتا تھا تو وہ ہزار تہذیبوں کو مذہب پر قربان کرنا پسند کرتے تھے۔ مگر اس سے اُنکے کمال اور شہرت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اور کوئی طبقہ یا جماعت ایسی نہیں ہے کہ جو ان کے کمال فن کی قائل اور معترف ہو محض اسوجہ سے کہ وہ ابن الوقت نہ تھے۔ بلکہ برعکس اسکے ہی احترام مذہب مثل ظرافت کے ان کا طرہ امتیاز ہے۔

خواب غفلت سے چونکائے اور اُن کو قعرِ زلت سے نکالنے کا بس یہی ایک ذریعہ ہے
 برخلاف اس کے اگر تہذیب جدید کی کامل تقلید اور اس کی ہر بات ماننے کے مؤید
 نہ تھے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ خیال کہ مغربی تعلیم و تہذیب تمام تر بُری اور ناقابل
 تقلید ہے صحیح نہ تھا۔ وقت کے سیلاب کو روکنا یا اُسکے مخالف چلنا عقل کی بات
 نہیں ہے۔ اگر جدید تعلیم کے اس وجہ سے مخالف تھے کہ اس میں مذہب کو بالکل بھلا دیا گیا
 ہے اور اسی وجہ سے لوگ آزاد خیال ہو کر مذہب کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ وہ پُرے
 کے قیود کم کرنے یا توڑنے کے بھی سخت مخالف تھے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک اس میں
 بڑے بڑے نقصان ہیں۔ اُن کو معلوم تھا کہ انگلستان اور یورپ و امریکہ وغیرہ میں
 اس جنسی آزادی اور ارتباط سے بڑے بڑے نتیجے آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں۔
 وہ اس خیال سے کانپتے تھے کہ اگر اسی قسم کا اختلاط مردوں اور عورتوں میں ہندوستان
 میں واقع ہوا تو اس سے کتنا بڑا طوفان برپا ہوگا۔ ان کے نزدیک مشرقی اور مغربی
 تہذیب و تمدن میں بعد از شرقین واقع ہے۔ اس ملک کے حالات خیالات روایات
 رسوم و رواج یورپ سے بالکل مختلف اور اکثر متضاد ہیں۔ یورپی خرابیوں کی اصلاح
 کی تدابیر ہندوستان کے لئے موزوں نہیں ہیں کیونکہ اس میں اور ان میں زمین و آسمان کا
 فرق ہے۔ اس طرح وہ مغربی طرز پر تعلیم نسواں کے بھی سخت مخالف ہیں کیونکہ اس سے
 عورتوں کے اخلاق پر ضرور اثر پڑے گا۔ انھیں وجہ سے انھوں نے مغربیت پسندی
 کا اپنے اشعار میں خوب خاکہ اُڑایا ہے اور جا بجا اس پر طنز کیے ہیں۔ ہندوستانی عشاق
 کو انکی رائے میں کتابِ محبت کا سبق اپنے ہم مشرانِ یورپ سے لینا پڑے گا۔ اور ہندوستانی
 معاشیق کو ادا و اناز اور کرشمہ و غمزہ کا انداز اپنی یورپین ہنجیسوں سے سیکھنا پڑے گا

کمیسٹیوں اور چندوں کا زمانہ ہے مردوں اور عورتوں دونوں کے خیالات اور جذبات اور اخلاق ہر چیز میں اک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا ہے۔ پرانے قومی انیڈیل لوگ کھو بیٹھے یا انکو عمداً احوالہ ماضی کر دیا۔ علما و عرفانے اپنی قدیمی وضع چھوڑ کر شہرت پرستی اور نفس پرستی اختیار کر لی۔ صوفی اب اپنے زہر و دودھ کی تجارت کرنے لگے۔ علما مثلاً سابق کے شمع ہدایت نہیں رہے۔ عورتیں ”چراغ خانہ“ سے ”شمع انجمن“ بن گئیں۔ مادیت کا دور دورہ ہے۔ قناعت اور خودداری چھوڑ کر لوگوں نے ترقی کا زینہ خوشامد و جاہلپڑی کو ٹھہر دیا۔ غرض کہ یہ امور مذکورہ بالا اس نئے زمانہ کے تبرکات ہیں اور ان سے کسی قسم کا بھی فائدہ متصور نہیں ہے۔ اسی انتہائی قدامت پسندی کی وجہ سے وہ سرسید اور ان کے متبعین یعنی تعلیم علی گڑھ کے حامیوں کے سخت مخالف تھے جبکہ سرسید کی رفتار ان کے نزدیک تیز تھی اس قدر ہمارے نزدیک ان کی روش سست تھی۔ لکن اس قسم کے اختلافات ضرورت شعری پر بھی مبنی کہے جاسکتے ہیں۔

اکبر نہ صرف جدید خیالات اور جدید تہذیب کی اشاعت کے شاکی ہیں بلکہ وہ قومی تہذیب و تعلیم کے زوال کے بھی نوحہ گر ہیں۔ وہ درستی اخلاق احیاء علوم قدیمہ اور ان خرابیوں کے جو مشرقی شائستگی میں بیرونی اثرات سے داخل ہو گئی ہیں دور کرنے کے بڑے حامی ہیں۔ وہ تعلیم نہ ان کے اصولاً خلاف نہیں مگر اُس کا صحیح طریقہ پر رواج چاہتے ہیں۔ انکی غرض یہ ہے کہ عورتیں تعلیم پا کر اچھی بیویاں اور اچھی مائیں بنیں۔ قومی جائداد نہ بنیں۔

دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو وہ پرانی پاس وضع۔ بچائی۔ ہمدردی۔ قناعت۔ خودداری وغیرہ کے

فقدان کا افسوس کرتے ہیں اور زمانہ موجودہ کے مایہ ناز صفات پالسی - دور وئی - خود غرضی - بے رحمیتی پر غصہ اور افسوس کرتے ہیں - اُن کو افسوس آتا ہے کہ اپنی ذاتی ترقی کی کورانہ روش کے پیچھے لوگ اپنے والدین بھائی بہن اور دیگر متعلقین اور وسطوں کے واجبی حقوق فراموش کر بیٹھے یہاں تک کہ خدا کا بھی احساس اُنکے دل سے اُٹھ گیا - دنیا کے کچھڑوں کے پیچھے دین کو بھلا بیٹھے ہیں - یہ مادہ پرستی کا دور جو صرت تیز رفتاریل اور سیلیگراف و ٹیلیفون کے معجزہ اثرات کا قائل ہے ہمارے دلوں کو کسی قسم کا سکون وطمینان نہیں بخشتا موجودہ دور کی سائنس کی معجز نمایاں اور نئی نئی مشینوں کی سحر فرمیاں سر پا فائدہ ہی فائدہ نہیں ہیں - مرگ ناگہانی جو اکثر کثرت مضطرب اور تیز حرکتوں کا نتیجہ ہے اور کمی عمر اور خرابی صحت یہ سب اُسی کے برکات ہیں - جدید طریقہ تعلیم بھی جیسا کہ خیال کیا جاتا تھا اخلاقی و روحانی امراض کے لئے کسیر صفت ثابت نہیں ہوا سائنس کی ترقی اور سچ کی مفلوہیت نے دل کی تکلیفوں کو کسی طرح رفع نہیں کیا اور نہ وہ مصائب دور کئے جسکے رفع کرنے کی امید کی جاتی تھی - دونوں تہذیبوں کے درمیاں میں ایک عمیق خلجی حاصل ہے مغربی تہذیب ہمہ تن دنیاوی جاہ و ثروت تجارت و دولت کی طرف متوجہ ہے اور مشرقی تہذیب کا منتہاے نظر روحانی ترقی ہے وہ بہ آسانی مختصر اور تھوڑی چیز پر قانع ہو جاتی ہے فتوحات اور ملک گیری کا اسکو شوق نہیں قناعت اور تسلیم و رضا اسکا آئین ہے -

آگبر کے مذہبی عقائد علاوہ شاعر کے وہ ایک ماضی قوم ریفارمر اور غلط اور فلسفی بھی تھے وہ خدا کی وحدانیت اور تاثیر دعا کے دل سے قائل تھے، اُن کا دلی اعتقاد تھا کہ مذہب کا تعلق دل سے ہے اور اس فلسفہ سائنس اور منطق کا کوئی دخل نہیں -

وہ مذہبی جھگڑوں اور جزئی اختلافات اور تعصبات سے بالکل بری تھے مذہب ان کے نزدیک ایک زندہ اور محبت کرنے کے قابل شے ہے اسکو چنکارا اور حقایق فلسفیانہ کا مجموعہ نہ سمجھنا چاہیے البتہ کوئی ایسی نکتہ چینی گوارا نہیں کر سکتے جو اعتقاد کے منافی ہو کیونکہ یہی مذہب کی جان ہے ان میں تعصب اور کٹرین مطلق نہیں اور اسی وجہ سے وہ ملائیت کی تنگ خیالی کو برا سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلام اور دیگر مذہب کے جزئی اختلافات ایک وسیع انظر موحد کی نظر میں بالکل بے حقیقت معلوم ہوتے ہیں وہ کشتہ اشعار میں انسان کی بے حقیقتی کا ذکر کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی کامیابی پر مغرور نہ ہو۔ ان کا قول ہے کہ ہر چند سائنس کی ترقیوں کے قائل ہو مگر خدا کو کسی حال میں دل سے نہ بھولو۔ وہ اصول اخلاق اور فلسفہ اور حقایق معارف کے بیان کرنے میں یطولی رکھتے ہیں غلو ہر مذہب کی وہ پرواہ نہیں کرتے۔ وہ نفس کشی اور ضبط خواہشات کو بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ رسوم ظاہری مثل پوسٹ کے ہیں اور اصول اور افعال و اطوار مثل مغز کے۔ وہ تعصب اور غصہ کو بہت برا سمجھتے ہیں کیونکہ اس سے تنگ خیالی پیدا ہوتی ہے۔ وسعت نظر اور بلند خیالی ان عیوب کو رفع کر دیتی ہے۔ آخر عمر میں وہ فلسفہ اور تصوف بہت کہتے تھے۔ ایک جگہ انھوں نے معاوضہ آخرت کا مضمون بہت خوب لکھا ہے۔

نادر کا کویتی فی ۱۹۱۳ء نادر علیخان نادر طرز جدید کے بہت عمدہ کہنے والوں میں سے تھے

اس زبان میں انکی اکثر نظمیں بہت مشہور ہیں۔ درد و اثر اعلیٰ تخیل جب وطن ان کے کلام کے مخصوصات سے ہیں۔ یہ انگریزی شعر بائرن اور ٹامس مور کے دلدلہ تھے اور چاہتے تھے کہ انھیں کا زبان نہایت سلیس اور عمدہ طریقہ سے اردو میں بھی داخل

ہو جائے۔ انکی نظمیں ”شمع و پروانہ“، ”شعاع امید“ پیکر بے زبان“ ”فلسفہ شعری“ بہت مشہور ہیں۔ اُن کو اپنے وطن یعنی ہندوستان سے عشق تھا۔ چنانچہ اسی وطنی جذبات کی نظمیں ”مقدس سرزمین“ اور ”مادر ہند“ دیکھنے کے قابل ہیں۔ ماس مور کی مشہور کتاب ”لالہ رخ“ کے طرز پر انھوں نے بھی ایک نثری لکھی ہے اور اس کا بھی نام لالہ رخ رکھا ہے۔ اُن کا انتقال عین جوانی یعنی پندرہالیس برس کی عمر میں ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ اس بے ہنگام سانحہ سے ادبی دنیا نے جو امیدیں انکی ذات سے قائم کی تھیں اُن سب پر پانی پھر گیا۔

حصہ نظم تمام ہوا

1. The first part of the document is a list of the names of the persons who have been appointed to the various offices of the city of New York.

2. The second part of the document is a list of the names of the persons who have been appointed to the various offices of the city of New York.

3. The third part of the document is a list of the names of the persons who have been appointed to the various offices of the city of New York.

4. The fourth part of the document is a list of the names of the persons who have been appointed to the various offices of the city of New York.

5. The fifth part of the document is a list of the names of the persons who have been appointed to the various offices of the city of New York.

6. The sixth part of the document is a list of the names of the persons who have been appointed to the various offices of the city of New York.

7. The seventh part of the document is a list of the names of the persons who have been appointed to the various offices of the city of New York.

8. The eighth part of the document is a list of the names of the persons who have been appointed to the various offices of the city of New York.

9. The ninth part of the document is a list of the names of the persons who have been appointed to the various offices of the city of New York.

10. The tenth part of the document is a list of the names of the persons who have been appointed to the various offices of the city of New York.

11. The eleventh part of the document is a list of the names of the persons who have been appointed to the various offices of the city of New York.

12. The twelfth part of the document is a list of the names of the persons who have been appointed to the various offices of the city of New York.

فہرست مضامین

حصہ نثر

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
			باب
			نشر اردو کی ابتدا اور ترقی
۵	ڈاکٹر جان گلکرسٹ ۱۸۵۹ء	۱	نشر اردو کی تعویق آغاز کے اسباب
۷	انفایت ۱۸۴۷ء	۲	زبان کھنی میں قدیم اردو نثر کی تصانیف
۸	میرامن دہلوی	۳	دو مجلس فضلی مصنفہ ۱۸۳۲ء
۹	میر شیر علی افسوس		نوط از مرصع ترجمہ قصہ چار درویش
۱۰	میر بہادر علی حسینی		مصنفہ ۱۸۹۰ء
۱۱	سید حیدر بخش حیدری	۳	فورٹ ولیم کالج سے نشر اردو کے
۱۲	مرزا کاظم علی جوان	۴	تعلق کے اسباب
۱۳	نہال چند لاہوری		
۱۴	مظہر علی خاں ولا		
۱۵	حفیظ الدین احمد		
۱۶	مولوی اکرام علی		
۱۷	لکڑال جی		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	اور دور جدید	۱۲	بہمنی نرائین
۲۰	مطبوعات لکھنؤ	۱۵	مرزا علی لطف
۲۱	فقیر محمد خان گویا بستان حکمت	=	مولوی امانت اللہ
۲۱	مرزا حبیب علی بیگ سرود متوفی ۱۲۸۲ھ	=	اس عہد کے دیگر پیشی اور نثار
۲۲	فائدہ عجائب		تراجم قرآن شریف از مولانا
۲۴	سرود کی دیگر تصانیف		شاہ ولی اللہ و شاہ عبدالعزیز
=	الف لیلہ کے ترجمے		دشاہ عبدالقادر و شاہ
۲۸	اردو نثاروں میں سرور کا مرتبہ	۱۶	رفیع الدین
=	غالب بحیثیت نثار	=	مولوی محمد اسماعیل دہلوی
۲۹	اردو میں علی اور عرو و مہندی	۱۷	ترتیب صرف و نحو و لغات اردو
۳۰	نمونہ نشر مرزا غالب		ہندوستانیوں کی مرتب کردہ
	مرزا کا قدیم رنگا یعنی مقفی اور	۱۹	لغات و دیگر کتب
۳۲	سن عبارت		عیسائی پادریوں کے کارنامے زبان
۳۳	کتب و رسائل اسلامی سے اردو کو تقویت	=	اردو کی توسیع اور ترقی میں
۳۵	چھاپہ کی ابتدا		باب ۱۶
۳۷	رسائل و جرائد و اخبارات		نثر اردو کا دور متوسط
۳۸	سر سید احمد خان		
۴۲	سید صاحب کا طرز تحریر		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۳	مقدمہ شعر و شاعری	۴۲	سید صاحب کے رفقاءے کار
۵۴	یادگار غالب	۴۳	نواب محسن الملک
"	حیات جاوید	۴۵	نواب وقار الملک
۵۵	مضامین حالی	"	مولوی چہراغ علی
"	طرز تحریر	۴۶	مولوی محمد حسین آزاد
"	مولانا ندیر احمد	۴۸	تصانیف
۵۷	تصانیف	"	ریڈرین وراسکو کی کتابیں -
۵۸	کتب منظر و متعلق مذہب	۴۹	آبجیات
"	اخلاقی ناول	۵۰	نیزنگ خیال
۶۰	لیکچر و تقریریں	"	سخن دان فارس
"	بحیثیت شاعر کے	"	قند پارسی و نصیحت کا کرن پھول
"	اخلاق و عادات	۵۱	ذیوان ذوق
۶۱	طرز تحریر	"	دربار اکبری
"	مولوی ذکاء اللہ	"	دیگر تصانیف
۶۲	تصانیف	۵۲	آزاد کا مرتبہ اردو و فارسی
۶۳	مولوی سید احمد دہلوی	۵۳	حالی
۶۴	فرہنگ آصفیہ	"	ابتدائی تصانیف
۶۵	شبلی نعمانی	"	حیات سعدی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۸۰	مولوی امام بخش صہبائی	۶۵	تعلیم اور ابتدائی مشاغل
۸۱	مولوی غلام امام شہید	۶۶	✓ قیام علیگڑھ
۸۲	منشی غلام غوث بیخبر	۶۷	ابتدائی تصانیف
۸۳	شمس العلماء سید علی بگلری	۶۸	قیام حیدر آباد
۸۴	سید حسین بگلری	۶۹	ندوۃ العلماء
۸۵	مولوی عزیز مرزا	۷۰	دارالمصنفین عظیم گڑھ
۸۶	مولوی عبدالحق سکرپٹری انجمن	۷۱	قابلیت اور خدمات کا
۸۷	ترقی اردو	۷۲	اعتراف
۸۸	مولوی وحید الدین سلیم	۷۳	اخلاق و عادات
۸۹	شیخ عبدلقدیر بی۔ اے	۷۴	تصانیف
۹۰	پنڈت منوہر لال زرنشی	۷۵	مولانا بکھیت مورخ کے
۹۱	منشی دیانترائن نغم	۷۶	مولانا بکھیت ناقد کے
۹۲	لالہ سرپریم دہلوی ایم۔ اے	۷۷	طرز تحریر
۹۳	تذکرہ نثر اردو	۷۸	سید سلیمان ندوی
۹۴	بہ خٹانہ جاوید	۷۹	مولوی عبدالسلام ندوی
۹۵	دیگر نثر اردو	۸۰	مولوی عبدالمجید دریا آبادی
۹۶	جدید نثر اردو کے دو طرز	۸۱	جدید علوم کی ترویج دلی کالج کا قیام
۹۷	پہلا طرز عربی اردو اور اس کے	۸۲	پروفیسر رائے چندر

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۰۶	نواب سید محمد آزاد	۹۴	مقابلے میں بجا شہ آئین اردو
۱۰۷	جو الابرشارد برق	"	دوسرا طرز خیالی یعنی ٹیگیدی اردو
"	احمد علی شوق	۹۶	پرفانی اخباری دنیا
۱۰۸	پنڈت رتن ناتھ سرشار	۹۷	ادبی اردو رسالے
۱۱۰	عام عادات و اخلاق		
"	تصانیف		
۱۱۱	فسانہ آزاد		
۱۱۳	سرشار کی مرقع نگاری		
۱۱۵	سرشار کی شوخی و غرافت		
۱۱۷	سرشار کی کیر کمر نگاری		
	سرشار نے اپنے ناولوں سے	۹۸	اردو کے پرانے قصے
۱۱۹	ان نیچرل چیزوں کو خارج کر دیا	۹۹	مطبع نشی نو لکشیور
"	نقائص کلام	۱۰۰	داستان امیر حمزہ صاحبقران
۱۲۰	سرشار بحیثیت ایک صاحب طرز کے	۱۰۱	بوستان خیال
۱۲۱	سرشار اور سرور کا مقابلہ	۱۰۲	اودہ پنج اور اس کی ادبی خدمات
۱۲۶	مولوی عبدالحلیم شرر	۱۰۵	نشی سبجا و حسین اڈیٹر اودہ پنج
۱۲۷ تا ۱۲۸	اُن کی زندگی کے خود نوشتہ حالات	"	مرزا ٹھپو بیگ عاشق
۱۳۷	مرزا محمد ہادی رسوا	۱۰۶	ترہون ناتھ ہجر

باب

اردو ناول کی ابتدا سرور اور سرشار کا زمانہ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۳۵	ہندو مرکل پے	۱۳۸	حکیم محمد علی
۱۳۶	سواگات و نقیص و غیرہ	=	راشد الخیری
۱۳۷	اسلامی نظمیں اور روایات	۱۳۹	نیاز فتحپوری
=	انگریزی: سیٹج	=	خواجہ حسن نظامی
=	اردو ڈراما کے اقسام	۱۴۰	پریم چند ✓
	اردو ڈراما پرست اہی دربارونکا	۱۴۱	سدرشن
۱۴۸	اثر	۱۴۲	دیگر ناول نویس
۱۴۹	اندر سجا امانت		
۱۵۱	اردو ڈراما اور پارسی		
=	اورنجیل تھیسٹر کی کمپنی		
۱۵۲	وکتوریہ نامک کمپنی		
=	طالب نبارسی		
=	الفریڈ تھیسٹر کی کمپنی	۱۴۲	اردو ڈراما
۱۵۳	احسن لکھنوی	۱۴۳	ڈراما کی عمومیت
=	بی تاب دہلوی		سنسکرت اور ہندی ڈراما نے اردو پر کیوں
۱۵۴	نیو الفریڈ کمپنی	=	نہیں اثر کیا۔
۱۵۵	آغا حشر کشمیری	۱۴۴	اردو ڈراما کے عناصر خمسہ
۱۵۶	دوسری کمپنیاں	۱۴۵	سنسکرت ڈراما

باب ۱۸

اردو ڈراما

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	لوگوں کی قیمتی رائیں	۱۵۶	آخر انیسویں صدی کے مشہور ڈراما نویس۔
۱۶۶	اردو ایک فصیح اور شیریں زبان ہے	۱۵۷	شروع بیسویں صدی کے بعض ڈراما نویس
"	ہندو مسلم اتحاد کی علامت ہے	"	اردو ڈراما کی ترقی میں مختلف لوگوں نے کیا حصہ لیا۔
"	ہندوستان کی عام زبان ہے۔	۱۵۹	ابتدائی ڈراموں کے نقائص۔
۱۶۷	ایک وسیع زبان ہے	۱۶۱	موجودہ ڈراموں میں صلاح و ترقی
"	بعض یورپین محققین کی رائیں	۱۶۳	آئندہ صلاح و ترقی کی ضرورت
۱۶۸	اردو کی نام نہاد کلمہ مانگی	۱۶۴	اردو ڈراما کا مستقبل
۱۶۹	اقسام ادب	۱۶۵	
"	تصانیف		
"	تراجم		
۱۷۱	نذہبی طرزِ تحریر		
"	ادب اردو کے سرچشمے		
"	ہندوستانی اکیڈمی قائم شد		
"	۱۹۲۷ء		
۱۷۳	اردو کا رسم الخط		

باب ۱۹

زبان اردو کی خاص
خوبیاں اور اسکے
متعلق بعض اہل الرائے

فہرست تصاویر حصہ نہر

صفحہ	تصویر	صفحہ	تصویر
۱۰۲	خواجہ امان دہلوی	۲۸	مرزا غالب کی کچھ تحریریں فرما رہے ہیں
۱۰۶	نفسی سجاد حسین	۴۰	سرسید احمد خان
۱۰۷	مرزا محبوب بیگ عاشق	۴۱	مولوی جبرائیل علی
"	نہایت تہکون ناتھہ ہجر	۵۰	مولوی محمد حسین آزاد
۱۰۸	نواب سید محمد آزاد	۵۱	مولوی نذیر احمد
۱۰۹	جوالا پرشاد برق	۶۰	مولوی ذکاء اللہ
۱۱۰	سرشار	۶۱	مولوی سید احمد دہلوی
۱۱۱	نہایت لشن نراہین در	۷۰	مولانا شبلی نعمانی
۱۱۲	شوق قدوائی	۷۱	اراکین دارالمصنفین
۱۲۶	مولوی عبدالحلیم شرر	۸۴	سید علی بلگرامی
۱۲۸	نیاز فختوری	۸۵	مولوی عمر نیر مرزا
۱۲۹	چکبست	۹۲	شیخ عبدالقادر بے اے
۱۳۴	نفسی پریم چند	۹۳	لالہ سرایم دہلوی
۱۳۵	ہاشمہ سدرشن	۱۰۰	نفسی نوکشور
۱۷۲	مہندوستانی اکادمی	۱۰۱	نفسی نراہین مالک مطبع نوکشور

تالیخ ادب

باب
نہشت

نثر اردو کی ابتدا اور ترقی
فورٹ ولیم کالج کلکتہ

نثر اردو کی تعوین اردو نثر کی ابتدا واقعی فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی۔ شمالی ہند میں اسکی عدم ترقی آغاز کے اسباب کی خاص وجہ تھی کہ وہاں فارسی کا رواج تھا۔ درباری اور تعلیم یافتہ نثر فارسی زبان ہی تھی۔ مرسے لٹا ہون کی تقریظیں اور دیباچے یہ سفارسی ہی میں لکھے جاتے تھے۔ اردو نثر کے تذکرے جن میں انکے کچھ حالات بھی ہوتے تھے یہ بھی فارسی ہی میں ہوتے تھے۔ نثر کی شان یہ تھی کہ عبارت مقفی اور مسجع ظہوری اور بیدل کے طرز پر مروج تھی۔ اس وقت کے اردو نثر نگار ظہوری اور سچر قلعہ کی ایسی سچید اور مخلص عبارت لکھنے کے شایق تھے اور انہی قسم کی عبارت لکھنے میں ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کرتے تھے۔ فارسی کی مروجہ قسم نثر یعنی مرہرہ مقفی مسجع اور عاری اردو میں بھی بے تکلف اختیار کی گئی تھی اور جب کبھی کوئی بات شریفین لکھنا ہوتی تو وہ نہایت رنگین اور پر تکلف عبارت میں لکھی جاتی تھی۔ نظم کا عام رواج تھا یہاں تک کہ خطوط بھی نظم میں لکھے جاتے تھے۔ نظم لکھنا قابلیت اور علمیت کی بڑی دلیل سمجھی جاتی تھی اور ایک پڑھے لکھے آدمی کا یہی نشانہ تھا۔ نظم کا یہ عام رواج اور مقبولیت نثر کو بھی نظم بنانے ہوئے تھا۔ نثر پر پاری ایک گوشہ گمنامی میں پڑی ہوئی اپنی ترقی کا موقع دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ وہ دور نظم کے عروج کا دور تھا اور نثر کی طرف کیسی توجہ نہ تھی۔ یہ سب اسکی ابتداء کی تاخیر کے ہوئے۔ اور

ہی ان بات کی بھی وجہ ہے کہ اسکی ابتداء ایسے مقام سے ہوئی جو شمالی ہند اور اہلی مرکز سے دور تھا۔

محققین زبان اور ریسرچ اسکالروں نے محققین میں غوطہ زنی کر کے دکن کی قدیم
نثر کے بہت سے نمونے دستیاب کیے ہیں۔ یہ کارروائی ہنوز جاری ہے اور امید کی جاتی

زبان دکنی میں قدیم
اردو نثر کی تصانیف

ہے کہ بہت عرصہ نہیں گزرے گا کہ کافی مواد ایک مکمل اور معتبر تاریخ نثر اردو کی تیاری کے لئے فراہم
ہو جائے گا۔ ایسے محقق ہمارے نزدیک مولوی عبدالحق صاحب احرار سیکم شیخ مسالہ قادری ہیں کہ جنکی خوشین

اسبارہ میں بہت تحسین اور آفرین کے لائق ہیں۔ جہاں تک کہ قدیم ترین نمونے ہوتے ہیں تو وقت تک دریافت ہوئے
ہیں انہیں چہ چلتا ہے کہ نثر اردو کی تاریخ آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے۔ یہ نمونے چھوٹے

چھوٹے رسالوں کی صورت میں ہیں جن میں دکن اور گجرات کے فقر اور اہل دل کے اقوال امثال ظہن کے گئے
ہیں۔ یہ رسالے اکثر فارسی اور عربی کتابوں کے ترجمے ہیں اور زیادہ تر مذہبی رنگ میں ہیں۔ مثلاً شیخ

عبدالدین گنج العلم (متوفی ۹۵۰ھ) کی تصانیف اور معراج العاشقین مصنفہ حضرت خواجہ
اکیسوار گنیر گوی جو اگرچہ کوئی ادبی حیثیت تو نہیں رکھتا مگر پھر بھی اس زمانے کی زبان کا حال بخوبی اس

سے معلوم ہوتا ہے۔ اور آپ کے نواسے سید محمد عبداللہ حسینی نے حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی
کے رسالہ شاطہ احش کو کھنی میں تحریر کیا ہے۔ یہی طرح شاہ میر نجی شمس العشق سیجا پوری نے شرح مرغوب القلوب لکھی

اور انکے فرزند شاہ برہان الدین حسام متوفی ۹۹۰ھ نے متعدد کتابیں لکھیں
جن میں سے دو کے نام "جل رنگ" اور "گلہاس" ہیں۔ مولانا دہی کی "سہرس" ۱۰۰۰ھ کی تصنیف

ہے جسکا ذکر نظم میں مولانا دہی کے بیان میں آچکا ہے۔ میران یعقوب نے "شمائل الانبیاء و الاولیاء" کا اردو ترجمہ نہایت سلیس اور سادہ دکنی زبان میں ۱۰۰۰ھ میں کیا۔ یہ شاہ محمد قادری نے بھی جو اردو گریب

کے زمانے میں تھے اور رانچور کے نور دریا خاندان سے تعلق رکھتے تھے مختلف مذہبی رسالے لکھے ہیں۔
گیارہویں صدی میں سہیلیہ میر نے ایک مذہبی کتاب زبان دکنی میں "اسرار التوحید" کے نام سے لکھی۔

وہ مجلس مفتی مصنفہ ۱۰۰۰ھ قبل اسکے کہ دکن کی اردو شمالی ہند میں آئے بیان بھی کچھ کتابیں نثر میں لکھتی
گیان جو زیادہ تر قصے کہانیوں کی صورت یا مذہبی رنگ میں تھیں اور فارسی سے

ترجمہ ہوئی تھیں۔ انہیں کتابتِ فیضی کی وجہ مجلس ہے جو محمد شاہ بادشاہ دہلی شاہی مطابق ۱۱۷۷ھ
 میں لکھی گئی یہ وقت مصنف کی عمر اسی برس کی تھی جیسا کہ وہ خود اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ یہ کتاب
 فارسی کی روضۃ الشہداء کا ترجمہ ہے جو ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف ہے۔ فیضی نے اس کے دیباچہ میں
 لکھا ہے کہ میری بڑی تناسخ کی یہ کتاب نہایت سہل اور عام فہم زبان میں جو اس وقت مروج تھی لکھی جائے
 مگر چونکہ مذہبی کتاب تھی اور میرے سامنے اس سے قبل کوئی نمونہ موجود نہ تھا لہذا مجھے اس کی تحریر میں بہت
 پس و پیش تھا اسی حالت میں میں نے خواب میں سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کو دیکھا کہ آپ شریف
 لائے ہیں اور آپ نے میرے مشکلات کو حل کیا اور ارادہ فرمایا فیضی نے جو مذہب امامیہ رکھتے تھے ائمہ صوفیہ
 کی شان میں کچھ نظمیں اور مثنوی بھی لکھے ہیں مگر انکو کچھ شہرت نہیں ہوئی۔ وہ مجلس جمعی صلی میں بارہا سن
 ہیں نثر اردو کی ایک کتاب انہیں کچھ جکتی البتہ وہ اس زمانے کی اردو نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ عبارت میں غامی
 ہے جیسا کہ ہر استاد الی کام میں ہو کر کرتی ہے مجھے سچیدہ پر قصص اور متقی ہیں۔ سیم طرح ایک مختصر نمونہ
 زمانہ کی نثر اردو کا سودا کے کلیات کے شروع میں موجود ہے جس سے اس زمانہ کا رنگ بخوبی معلوم ہوتا ہے
 زمانہ حال کی پابندی صرف دیکھنا نہیں ہے صرف قافیہ دار الفاظ مثل نظم کے جملوں
 کے آخر میں رکھ دیے گئے ہیں۔ مضمون بھی تشبیہوں اور استعاروں سے ملبوس ہے ایسی عبارت صرف موزون
 ہونے کی وجہ سے نثر کہی جاسکتی ہے ورنہ آہیں اور نظم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ انشا اور قتل
 کی دریاے لطافت کو فارسی میں ہے مگر نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ انہیں اسوقت کے مختلف پیشہ وران
 کی برلیان مختلف رسوم و رواج اور معمولی بول چال اور ضرب الامثال اور ردی اور لکھنؤ کی زبان کا فرق اور
 مترذکات قدیم اور مختلف ملکوں کی زبان کا زبان دہلی لکھنؤ میں شامل ہونے سے اغزو وغیرہ وغیرہ سچ
 ہیں۔

نظرِ مرقع ترجمہ قصہ دوسری مشہور کتاب اس عہد کی فوٹو زمرہ میں ہے جو میر محمد عطاء حسین خان متخلص
 چہار درویش مصنفہ ۹۹۷ھ تخمین نے اسے خسر کے قصہ چہار درویش سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کا تصنیف
 ۱۱۹۷ھ ہے اور یہ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں مکمل ہوا جن کی تحریف میں ایک قصیدہ دیباچہ کے

آخر میں دیا ہوا ہے مصنف مذکور صغ رقم کے لقب مشہور تھے اور محمد باقر خان شوق کے بیٹے اور ابو المنصور خان صفدر جنگ کے دربار سے وابستہ تھے۔ بعد اُسکے وہ جنرل اسمتھ کے میزبانی مقرر ہوئے اور انہیں کے ساتھ کلکتہ گئے جہاں صاحب صوف ولایت گئے تو حسین بیٹہ چلے آئے اور وہاں وکالت کرنے لگے اپنے باپ کے انتقال کے بعد وہ بیٹہ سے فیض آباد آگئے جہاں نواب شجاع الدولہ کے ملازم ہو گئے یہ سلسلہ ملازمت نواب آصف اللہ کے زمانہ تک قائم رہا تحسین علاوہ خوشنویس ہونے کے منشی بھی نہایت اچھے تھے چنانچہ خصوصاً بطاغر میری جو اس زمانہ کی گورنمنٹ ہند کے قوانین کا مجموعہ ہے اور تواریخ قاسمی انکی تصنیف ہیں یہ دونوں کتابیں فارسی میں ہیں۔ "نظر صبح" کی عبارت نہایت رنگین اور فارسی و عربی الفاظ سے ملبوسہ غالباً یہی وجہ ہوگی کہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے قصہ چہار درویش کا ایک دوسرا ترجمہ موسوم بہ "باغ و بہار" نہایت صاف اردو زبان میں میرامن دہلوی سے کرایا جسکا مفصل حال آگے آتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج سے نکلے ہوئے انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے تجارتی تعلقات کے سلسلہ میں بڑے کے تعلق کے اسباب بڑے قطعاً ملکا حاصل کر لئے تھے جن کے عمدہ انتظام کے واسطے ضروری تھا کہ انکے اعلیٰ عمال اس ملک کی زبان سے جس کا انتظام عاملانہ خواہ تاجرانہ انکے سپرد تھا اچھی طرح واقف ہو جائیں تجارتی تعلقات یوں نافذ ہوتے جاتے تھے مگر انتظامی معاملات بڑھتے جاتے تھے۔ سترجم جن کے ذریعہ سے اہل ملک کی زبان اور خیالات کو یورپی عمال یا تاجر سمجھ سکتے تھے اب بیکار ہو گئے تھے کیونکہ یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ کوئی قوم تادقیقہ مفتوح قوم کی زبان اور رسوم درواج اور روایات تباہی و تخریب سے کما حقہ بلا واسطہ واقف نہ ہوگی اس پر پورے طور سے حکومت نہیں کر سکتی۔ اور ان سب باتوں کے لئے یہ ضروری تھا کہ حاکم اپنے محکوموں کی زبان سیکھیں۔ لہذا کونٹ آف ڈائریکٹرز نے یہ دیکھ کر انکے عمال ہندوستان میں اپنے فرائض منصبی محض دیسی زبانوں کے جاننے کی وجہ سے بہت بڑی طرح سے ادھر سے طریق پراد کرتے ہیں یہ تا کہ جی شکم دیدیا کہ آئندہ سے انکے حکام مقامی اپنے عمال کی واسطے دیسی زبانوں کا حقہ واقفیت کو ضروری قرار دیں۔ اسی کے ساتھ چونکہ بڑے بڑے قطعاً ملک انگریزی عملداری میں داخل ہوتے جاتے تھے لہذا پارلیمنٹ انگلستان کو اب یہ محسوس ہو گیا

کہ رعایا کی فلاح و بہبود اور تعلیم و ترقی کی ذمہ داری بھی ہمیں پر عاید ہوتی ہے چنانچہ اب اس کی کوشش ہونے لگی کہ جو رکاوٹ خانہ جنگیوں اور ملکی الاٹمیوں کی وجہ سے لوگوں کے تعلیم میں پڑی تھی جبکی وجہ سے تعلیم کو بہت سخت صدمہ پہونچ رہا تھا اب دور ہو جائے۔ اسی اصول پر تعلیم انگریزی کی اشاعت شروع ہوئی جس سے خیالات اور زبان میں دونوں میں انقلاب عظیم پیدا ہو شروع ہوا۔ جس کا اثر کہیں نظر پر پڑا اور کہیں اثر پر غصہ ہے کہ تعلیم انگریزی نے ہندوستان کو واسطے دی کیا جو اسے بائیں چہ سو برس پیشتر ریئاسنس (نشاة ثانیہ) نے یورپ کی واسطے کیا تھا۔ یہ قاعدہ ہے کہ ہر تہذیب اور انقلاب کیساتھ اچھا یون کے ساتھ ساتھ کچھ بُرائیاں بھی ضرور آجاتی ہیں مگر اس صورت میں اچھا یون کا تہ بھاری رہا۔ یعنی اس تسلیمی تہذیب سے دیسی زبانوں کو بہت فائدہ پہونچا۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ جو انیسویں صدی کے شروع میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے منتظم تھے انھوں نے نثر اردو کے مرتبی (باب) کہلائے جانے کے فی الحقیقت سخت بین نہیں کی ان تہذیب کو ششون سے ملک کی دیسی زبان یعنی اردو کو مکمل ہو کر سرکاری زبان بننے کے لائق ہوئی اور انہیں اتنی صلاحیت پیدا ہو گئی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں فارسی کی جگہ وہ سرکاری اور درباری زبان قرار پائی۔ ڈاکٹر موصوف اسکاٹ لینڈ کے باشندے تھے جو ۱۸۴۷ء میں بمقام ایڈمنسٹریٹو سروس چارج ہیرٹ کے درس گاہ میں جو اسی شہر میں واقع تھی تعلیم پائی ۱۸۶۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں بحیثیت ڈاکٹر داخل ہوئے۔ ابتدا ہی سے یہ خیال لگے دل میں راسخ تھا کہ انگریزی افسروں کو فارسی دینی کی اس قدر ضرورت نہیں (جیسا کہ اس وقت دستور تھا) جتنی کہ ملک کی دیسی زبانوں علی الخصوص زبان ہندوستانی کی ہے جو اس وقت ہر طبقہ اشخاص سے میل جول کے لئے سب سے زیادہ مشہور زبان سمجھی جاتی تھی گلکرسٹ نے خود اس معاملہ میں سبقت کی۔ انکی نسبت لکھا ہے کہ وہ ہندوستانی کپڑے پہنے ان تمام میں جہان اردو بہت صحیح اور با محاذ بولی جاتی تھی برابر بھولتا کرتے تھے۔ اور اردو کے علاوہ سنسکرت فارسی و دیگر مشرقی زبانوں سے بھی باخبر تھے۔ انکی کامیابی کو دیکھ کر دیگر ملازمین کمپنی کے دل میں بھی اردو بولنے کا شوق پیدا ہو غصہ ہے کہ انگریزوں میں اردو پڑھنے کا رواج اُسی وقت سے ہو گیا ملازموں کی سیلی نے جو

اسوقت گورنر جنرل تھے اس تجویز کی اہمیت اور ضرورت پر نظر کر کے اور گلکرسٹ کے مفید کاموں کے مدد
 تاج کو دیکھ کر انکو مالی امداد بھی بہت دی اور فورٹ ولیم کالج کا فاسل علی مقرر کر دیا۔ یہ کالج سلسلہ
 میں اس غرض سے قائم ہوا تھا کہ لائسنس کمپنی کے انگریزی ملازمین کو ملک کی دیسی زبانوں میں تسلیم کیا
 گلکرسٹ عرصہ تک اپنی جگہ پر نہ رہ سکے۔ علالت کی وجہ سے مستعفی ہو کر سلسلہ میں نیشن لیکر ولایت
 چلے گئے۔ زبان اردو سے انکو اس قدر عشق تھا کہ ایڈمنسٹریٹو سلسلہ میں قیام کر کے لندن آ گئے
 جہاں امیدواران انڈین مل ٹرس کو وہ مشرقی زبانوں میں پرائیوٹ طریق پر تعلیم دیا کرتے تھے۔ سلسلہ
 میں وہ اور ٹیلنٹسٹوٹ میں زبان اردو کے پروفیسر مقرر ہو گئے جبکہ اس سال ایسٹ انڈیا کمپنی نے
 لندن میں قائم کیا تھا سلسلہ میں بند ہو گیا تھا۔ اسکے بند ہونے کے بعد بھی وہ تقریباً سال بھر تالیفین
 زبان کو پرائیوٹ طور پر اردو پڑاتے رہے اور اپنے بعد اپنی جگہ پر سینڈ فورڈ آؤٹ اور ڈکن فوربس کو
 جو مشہور مستشرق تھے مقرر کر گئے۔ گلکرسٹ کا انتقال ۸۲ برس کی عمر میں بمقام پیرس سلسلہ میں ہوا۔ وہ
 بہت سی کتب متعلقہ زبان ہندوستانی کے مصنفین جنکی پوری فہرست ڈاکٹر گریرسن نے اپنی
 مشہور تصنیف لنگوئسک سرورے آف انڈیا (ہندوستانی زبانوں کے نقشبات) کی جلد نہم میں بی
 ہے۔ انکی بعض مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں (۱) انگریزی ہندوستانی ڈکشنری ۲ حصوں میں۔
 مطبوعہ ۱۸۶۹ء (۲) اور ٹیلنٹسٹوٹ (مشرقی زبان دان) جو زبان اردو کا آسان مفہوم مطبوعہ ۱۸۶۵ء
 (۳) ہندوستانی گرامر مطبوعہ ۱۸۶۷ء (۴) ہندوستانی فلاو جی۔ گلکرسٹ ہی کے انتظام اور
 ماتحتی میں ایک جماعت ہندوستانیوں کی کالج میں قائم ہو گئی تھی جنہوں نے نہ صرف انگریزوں کے
 پڑھنے کے واسطے درسی کتابیں بلکہ زبان اردو ہندی میں مستقل تصانیف نہایت اعلیٰ درجہ کی
 تصنیف کیں سلطنت مغلیہ کی تباہی کے بعد بعض مشہور اہل زبان و اہل قلم اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر ڈاکٹر
 گلکرسٹ کی شہرت اور فیاضی کا شہر سنکر کلکتہ پہنچ گئے تھے انہوں نے ان سب کو وزیر اکثر کلکتہ
 کے لوگوں کو اپنے کالج میں خوشی سے جگہ دی۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کے ساتھ بعض اور مشہور افسروں مثلاً
 کپتان روبک کپتان ٹیلر ڈاکٹر ہنٹر وغیرہ کی خدمات بھی ضرور قابل تعریف ہیں۔ ڈاکٹر گلکرسٹ

کے زمانہ میں مشہور ہندوستانی اہل قلم جو کالج میں جمع ہو گئے تھے حسب ذیل ہیں۔ میرامن افسوس حسینی۔
 لطف۔ حیدری۔ جوان۔ لولال جی۔ نہال چند۔ اکرام علی۔ ولایت محمد میر۔ سید بشیر علی افسوس۔ اور
 مداری لال گجراتی۔

میرامن دہلوی میرامن دہلوی میرامن دہلوی تخلص بہ لطف دلی کے رہنے والے تھے۔ انکے آباواجداد سلاطین غلیہ
 کے زمانہ میں دطالین اور جاگیر دے معزز و ممتاز تھے۔ احمد شاہ درانی نے جب ہلی پر حملہ کیا تو فوج
 اکی لوٹ مار میں میرامن کا گھر بھی شامل تھا اور سو رحل جاٹ نے انکی خاندانی جاگیر پر قبضہ کر لیا تھا۔ میرامن
 اس مصیبت میں دلی سے ٹھکر پٹنے ہوئے یہاں کچھ عرصہ تک رہ کر کلکتہ روانہ ہوئے۔ جہاں نواب
 دلاور جنگ بہادر کے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خان کی تعلیم و تربیت انکی سپرد تھی۔ اسی زمانہ میں میرامن
 بہادر علی حسینی نے انکا تعارف ڈاکٹر گلکرسٹ سے کرا دیا جنکی فرمائش سے انہوں نے اپنی مشہور و معروف
 کتاب قصہ چہار درویش لکھی جسکا تازخی نام باغ و بہار ہے یہ قصہ اصل میں فارسی میں تھا اور اسکو
 امیر خسرو دہلوی نے اپنے پیرو مشد حضرت نظام الدین اولیا کے بحالت علالت دل بہلانے
 کیواسطے تصنیف کیا تھا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد جب حضرت کو صحت ہوئی تو اپنے دعادی کہ اس
 قصہ کو جو کوئی سنے گا وہ حکم خدا بیماری سے شفا پائے گا۔ یہ قصہ فارسی میں ہی بہت مقبول ہے اور
 اس کے دونوں اردو ترجمے یعنی تحسین اور میرامن کے ترجمے مع دیگر تراجم کے جو ہندوستان کے اکثر دیسی
 زبانوں اور نیز غیر ملکی زبانوں میں ہوئے ہیں بہت مقبول ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۵۱ء مطابق ۱۲۷۱ھ میں ختم ہوئی
 تحسین کے ترجمہ کو میرامن نے اپنی زبان میں لکھا ہے کیونکہ اس میں اکثر غیر مانوس فارسی و عربی الفاظ
 تھے جنکو میرامن نے نکال دیا اور اپنی کتاب کو مقدار صاف و سلیس و امجاد و رہ عبارت میں لکھا کہ قبول
 سر بہ مرحوم کے جو مرتبہ ترقی میرامن کو نظم میں حاصل ہے وہی میرامن کو شعر میں ہے۔ یہ قصہ نہ صرف دلچسپ
 ہے بلکہ اس میں اس زمانہ کے رسم و رواج اور طرز معاشرت کے رقبے نہایت وضاحت سے کھینچے گئے ہیں۔
 دیباچہ میں سبب تالیف کتاب اور اپنا حال لکھ کر زبان اردو کی ایک مختصر سی تاریخ بھی بتا دی ہے جو زیادہ
 صحیح نہیں سمجھی جاسکتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ کتاب باغ و بہار انگریزوں میں بہت مقبول رہی ہے۔

چنانچہ اب تک وہ انگریزی حکام کے اردو امتحانوں میں داخل درس ہے۔ علاوہ اس کتاب کے گنجینہ خوبی بھی میراٹن کی تصنیف ہے جو ملا حسین واعظ کا شفی کی اخلاق محسنی کے طرز پر ۱۸۰۰ء میں تحریر کی گئی منشی کریم الدین کا خیال ہے کہ میراٹن نے کوئی دیوان بھی ضرور مرتب کیا ہو گا مگر اسکا کہیں پتہ نہیں۔ ڈاکٹر نیلن نے خود میراٹن کی زبان سنا تھا کہ انکو کسی سے فن شعر میں ملندہ نہ تھا۔

افسوس ۱۳۷۷ء میر شیر علی دہلوی تخلص بہ افسوس میر علی ظفر خان کے بیٹے تھے جو نواب میر قاسم کے لڑکپن میں انتقال فرما گئے۔ سرکار میں داروغہ سلخ خانہ تھے۔ یہ حضرت امام جعفر صادق کی اولاد میں تھے اور انکے

آباؤ اجداد اصف کے رہنے والے تھے۔ انکے بزرگوں میں سے ایک شخص سید بدر الدین نامی رنول میں جاگیر کے قریب سکونت گزین ہوئے محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں انکے باپ درچا سید غلام علی خان جاگیر سے دہلی آئے اور عہدہ الملک نواب امیر خان کی سرکار میں ایک پیش فرائض خواہ پر ملازمت اختیار کی

افسوس دہلی میں پیدا ہوئے جسکو انکے بزرگوں نے بطریق وطن کے اختیار کیا تھا۔ ۱۳۷۷ء میں جب نواب امیر خان کا انتقال ہوا تو افسوس کے والد ٹپنہ چلے گئے۔ جہاں نواب میر قاسم اور انکے بعد نواب

میر جعفر کی ملازمت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب آخر الذکر معزول کئے گئے تو وہ لکھنؤ آگئے اور وہاں سے حیدر آباد گئے جہاں ان کا انتقال ہوا۔ افسوس بھی اپنے والد کے ساتھ ٹپنہ سے لکھنؤ آئے تھے اور چونکہ

میلان طبیعت شعر و شاعری کی طرف بہت تھا اور فضلے لکھنؤ میں ترانہ شاعری اسوقت گونج رہا تھا لہذا انہوں نے بھی شعر کہنا شروع کر دیا۔ وہ اپنا کلام میر حیدر علی حیران کو دکھلاتے تھے اور بعض کہتے

ہیں کہ میر حسن۔ میر تقی۔ اور میر سوز سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ لکھنؤ میں انکی سرپرستی نواب لار جنگ بہادر اور انکے بعد انکے بیٹے نواب مرزا نواز علی خان کرتے رہے لکھنؤ ہی کے قیام میں نواب

حسن علی خان نے نواب صاحب اللہ کی وساطت سے افسوس کو ریشل اسکات صاحب سے ملے جنہوں نے انکی قابلیت اور فہانت و ذکاوت کو بہت پسند کر کے دوسروں پر مشابہہ ہر پر انکو کلکتہ بھیجا اور پانچ سو روپے

نوادارہ کے لئے بھی عنایت فرمائے افسوس راستہ میں مرشد آباد میں مرزا علی لطف صاحب کلکتہ پہنچے بھی ملے تھے۔ کلکتہ پہنچ کر وہ فورٹ ولیم کالج کے زمرہ اساتذہ میں ایک معزز عہدہ پر فائز

ہوئے انکی تصانیف حسب ذیل ہیں (۱) اردو ترجمہ گلستان سعدی موسوم بہ باغ اردو جو
 کلکتہ میں پہلی مرتبہ ۱۸۰۳ء میں چھپا تھا اور نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ (۲) سنگٹہ
 میں انہوں نے اپنی مشہور کتاب آرائش غفل لکھنا شروع کی جس میں علاوہ ہندوستان کے
 جزائریاتی حالات کے فتح اسلام تک ہندو راجاؤں کی ایک مختصر تاریخ بھی ہے
 اسکی تصنیف میں اکثر تاریخوں سے مدد لی گئی مگر اصل مانتہ فی سوجن رائے پٹیا لوسی کی
 خلاصہ للتاریخ ہے۔ انکے علاوہ انوس نے میر بہادر علی کی شریٰ نطیسہ منشی عزت اللہ کی
 ذہب عشق اور لوسی محمد سہیل صاحب کی بہادرانش کی تصنیف میں بھی مدد دی تھی اور کلیات
 سودا بھی اپنی تصحیح سے چھپوایا تھا۔ ان تصانیف کے علاوہ انکا ایک دیوان بھی جو قدیم کی نگاہوں سے دیکھا
 جاتا ہے انوس کا انتقال ۱۸۰۳ء میں ہوا۔

میر بہادر علی حسینی [ان کے مفصل حالات معلوم نہیں ہو سکے بہر طور اتنا معلوم ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج
 میں میر منشی تھے اور کتب ذیل کے مصنف ہیں (۱) خلاق ہندی جو ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش سے
 ۱۸۰۳ء میں لکھی گئی یہ پتو پدیش کے ایک فارسی ترجمہ کا جو شاہ نصیر الدین بہاری کے حکم سے
 مفتی تاج الدین نے مفرح القلوب کے نام سے کیا تھا صاف اور سلیس اردو ترجمہ ہے (۲) شریٰ نطیسہ
 یعنی شریٰ نطیسہ جو ۱۸۰۳ء میں تصنیف اور ۱۸۰۳ء میں یعنی دو برس قبل اصل شریٰ نطیسہ کے
 شائع ہوئی (۳) رسالہ گلکرسٹ یعنی گلکرسٹ صاحب کی گرامر کا خلاصہ زبان اردو کی صرف دوا اور فن عروض
 کا رسالہ ہے مطبوعہ کلکتہ ۱۸۱۶ء (۴) ترجمہ تاریخ آسام مصنفہ شہاب الدین تالش
 جس میں اوزرگزب کے مشہور جرنیل میر جلیہ کے حملہ آسام ۱۷۶۲ء کا ذکر ہے حسب الحکم کو لبرک صاحب
 ترتیب پایا۔ انکے علاوہ قصہ لقمان اور قرآن شریف کے ایک ترجمہ میں بھی حسینی نے شرکت کی تھی
 سید حیدر بخش حیدری [سید حیدر بخش حیدری سید الحسن کے بیٹے دلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے
 آباد اجداد نجف کے باشندے تھے۔ ان کے والد لالہ سکھ پور سے کے ساتھ دلی سے نکل کر بنارس پہنچے اور
 وہیں سکونت اختیار کر لی حیدر بخش اپنے والد کے ساتھ تھے۔ بنارس میں اس وقت نواب علی بابا خان

متخلص بن خلیل مصنف تذکرہ گلزار ابراہیم عدالت انگریزی کے جج تھے۔ انکی سپردگی میں حیدری دیے گئے تاکہ ان صاحب کے فیض صحبت کے اچھی طرح مستفیض ہوں علوم مذہبی کی تعلیم انکی مولوی غلام حسین غازی پوری کے سایہ عاطفت میں ہوئی جو ان صاحب موصوف کی عدالت کے ایک سربراہ اور مولوی تھے سنہ ۱۸۷۸ء میں یہ سنکر فوراً دیکھ کالج کلکتہ میں قابل نشیون کی مانگ ہے حیدری نے ایک کتاب موسوم بہ قصہ ہمدانہ ترتیب دی جس کا سنہ تصنیف ۱۲۸۷ھ ہے اور اسکو ڈاکٹر گلکرسٹ کی خدمت میں بطور اپنی کتاب کے منظر کے پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسکو بہت پسند کیا۔ اور حیدری کو کالج مندر کی ایک منشی مقرر کر دیا۔ پر متاذکیا حیدری کی اکثر تصانیف میں جو زیادہ تر فارسی کتابوں کے تراجم ہیں۔ کتب ذیل زیادہ مشہور ہیں (۱) قصہ لیلی مجنون جو اسیر خسرو کی اسی نام کی شہنوی کا اردو ترجمہ ہے یہ غالباً مازنی کلکتہ سے پیشتر تحریر ہوا تھا (۲) طوطا کبابی سید محمد قادری کے فارسی طوطی نامہ کا ترجمہ مصنف سنہ ۱۸۷۸ء حکم ڈاکٹر گلکرسٹ صاحب اصل میں یہ قصہ سنسکرت میں شوکا شپنتی کے نام سے تھا۔ فارسی میں اسی نام کی ایک کتاب جو باون قصہ پر مشتمل تھی ضیائے بخشی نے سنہ ۱۳۳۷ھ میں لکھی تھی جس سے یہ دوسرا طوطی نامہ تیس قصص کا سید محمد قادری نے سنہ ۱۳۱۹ھ میں مختصر اور صاف کر کے ترتیب دیا۔ یہ سب قصے مثلاً انگریزی کنگ آف تھر کے فنانوں کے ہندوستان میں بہت مقبول ہوئے اور ان کے ترجمے مختلف زبانوں میں مختلف اوقات میں ہوئے مثلاً انگریزی میں اسماعیل صاحب نے سنہ ۱۸۷۸ء میں کیا۔ بنگلہ میں چند ہی جرن سیرام پوری نے سنہ ۱۸۷۸ء میں کیا اور طوطا اتھاس نام رکھا ہندی میں انبا پرشاد را سائے۔ زبان دکنی میں نظم میں غواصی نے اور فرخ میں ایک غیر معلوم شخص نے ہندی میں اصل سنسکرت سے بھیرن پرشاد نے۔ گجراتی نظم میں سما لاجپٹ نے اور مرہٹی میں کسی غیر معلوم شخص نے (۳) آرایش محفل ترجمہ قصہ حاتم طائی اسکو میر شیر علی انوس کی آرایش محفل سے خلط ملط کرنا چاہئے۔ یہ قصہ سب سے پہلے سنہ ۱۸۷۸ء میں کلکتہ میں چھپا تھا اور اس کی زبان نہایت سلیس سہل اور دلچسپ ہے۔ اسکا ترجمہ بھی بنگلہ ہندی اور گجراتی میں ہو گیا ہے (۴) تاریخ نادری ترجمہ نادرشاہ شہنشاہ مرزا ہندی مرتبہ سنہ ۱۲۸۷ھ (۵) گل مغفرت جسکو انہیں کے گلشن شہیدان کا خلاصہ سمجھنا چاہئے جو ملا حسین واعظ کاشفی کے روضۃ الشہداء کا ترجمہ ہے

اسکا دوسرا نام وہ مجلس بھی ہے۔ سنہ تصنیف ۱۸۱۲ء اور مقام طباعت کلکتہ ہے۔ اسکا ترجمہ زبان
فرہنگی میں بھی ہو گیا ہو (۶) گلزار دانش شیخ عنایت اللہ کی بہار دانش کا اردو ترجمہ عورتوں
کے مکروکید کے قصے درج ہیں (۷) ہفت پیکر نظامی کی مشہور تنویری ہفت پیکر کا جواب صنف ۱۸۰۷ء
(۸) انکے علاوہ چند مرثیہ ایک دیوان غلیات اور مجموعہ صد حکایات بھی انکی تصانیف سے ہیں جیدی
کا انتقال ۱۸۲۳ء میں ہوا جیسا کہ ڈاکٹر اسپرنگر نے فہرست کتب ادوہ میں ذکر کیا ہے۔

مرزا کاظم علی جان اصل میں دلی کے باشندے تھے مگر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی جہاں ۱۸۰۷ء
میں وہ موجود تھے ان کا ذکر نواب علی ابراہیم خان نے اپنے تذکرہ گلزار ابراہیم میں کیا ہے جسکے پاس
بنارس میں انہوں نے اپنا کچھ کلام منوٹا بھیجا تھا ۱۸۰۷ء میں کرنل اسکاٹ صاحب نے ان کو نشی گری
کی ایک جگہ کر لکھنؤ سے کلکتہ روانہ کیا تھا فحشی بینی ناراین اپنے تذکرہ جہان میں جو ۱۸۱۲ء کی
تصنیف ہے لکھتے ہیں کہ یہ اس وقت زندہ تھے۔ بلکہ ۱۸۱۵ء میں جو مشاعرے فورٹ ولیم کالج کلکتہ
میں ہوئے تھے اس میں بھی یہ موجود پائے جاتے ہیں۔ کتب ذیل انکی طرف منسوب ہیں (۱) کالیداس کی
مشہور کتاب شکنتلا نالک کا اردو ترجمہ جسکے دیباچہ میں بطور تمہید کے دہ لکھتے ہیں کہ کالیداس کی اصل
کتاب کا ترجمہ برج بہاشہ میں ۱۸۰۷ء میں ایک شاعر نواز کیشو نامی نے مولے خان سپر خدای خان سپر سالار
شہنشاہ فرخ سیر کے حکم سے کیا تھا اور ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش سے یہ ترجمہ برج بہاشہ سے زبان
اردو میں کیا گیا۔ اور اسپر نظر ثانی لولال جی کشیر نے کی اور کلکتہ میں ۱۸۰۷ء میں طبع ہوا۔
(۲) قرآن میں کا ایک اردو ترجمہ فرمائش گلکرسٹ صاحب (۳) ترجمہ تاریخ فرشتہ
متعلقہ خاندان بہمنی (۴) سنگھاسنی جی کی تصنیف میں لولال جی بھی شریک تھے (۵) بارہ اسمہ
یا دستور ہند مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۷ء میں ہندوستانی مختلف فضلوں اور موموں اور ہندوؤں اور
مسلمانوں کے تہواروں کا ذکر ہے یہ کتاب بعد ترجمہ شکنتلا نالک کے تحریر ہوئی۔

جوان نے "خرد افروز" (جب کا حال آگے آتا ہے) اور میر و سودا کے کلام کے کچھ منتخبات بھی
شائع کئے تھے انکے دو بیٹے عیان اور ممتاز بھی کسب قدر مشہور ہوئے۔

نہا پختہ لاہوری ولی میں پیدا ہوئے مگر چونکہ لاہور میں زیادہ رہے اسوجہ سے لاہوری کے لقب سے مشہور
ہیں ۱۲۱۱ھ میں کلکتہ گئے تھے۔ انکے کچھ مزید حالات معلوم نہیں سوائے اسکے حبیب اللہ اپنی کتاب
مذہب عشق کے دیباچہ میں وہ خود لکھتے ہیں کہ کپتان دلاور نے ڈاکٹر گلکرسٹ سے انکا تعارف کرایا جسکی
فرمائش سے انہوں نے قصہ تاج الملوک اور بکا دلی کا ترجمہ فارسی سے اردو میں کیا۔ انکی تصانیف حسب
ذیل ہیں (۱) مذکورہ بالا مذہب عشق (جو تاریخی نام ہے) معروف رو بہ قصہ گل بکا دلی جو بیچ عروت اللہ
بکالی کے اسی نام کے فارسی قصہ مصنفہ ۱۱۳۴ھ کا اردو ترجمہ ہے۔ ایک دوسرا اردو منظوم ترجمہ اسی قصہ کا
کسی شخص بھان نامی نے ۱۲۱۲ھ میں کیا ہے حسین چالیس باب میں جو گلگشت کے نام سے موسوم ہیں
نیز ایک اردو مثنوی موسوم بہ تحفۃ المیاس اسی قصہ کی بہت قدیم موجود ہے یہ نام تاریخی ہے جس سے
۱۰۵۲ھ تکلتے ہیں۔ اور اس سے بھی ایک قدیم مثنوی کا پتہ چلتا ہے جو زبان دکنی میں ہے جسکا تصنیف
۱۰۳۵ھ ہے۔ مگر ان سب کے زیادہ مشہور مثنوی گلزار نسیم ہے جسکا تصنیف ۱۲۵۲ھ ہے۔ مذہب عشق کا
تصنیف ان تاریخوں سے جو کتاب کے آخرین دی ہوئی ہیں ۱۲۱۱ھ اور ۱۸۱۳ھ عیسوی
نکلتا ہے۔

مظہر علیخان ولا مرزا لطف علی معروف بہ مظہر علیخان متخلص بہ ولا سلیمان علیخان و دادا کے بیٹے
ولی کے رہنے والے تھے۔ مرزا جان طیش اور مصحفی کے شاگرد تھے گلشن سنجا میں میر نظام الدین ممنون کو کبھی
انکا آساؤ لکھا ہے یہ بھی کلکتہ کے کالج میں منشی تھے اور اکثر تراجم انکی طرف منسوب ہیں مثلاً (۱) ہندنامہ
سہدی کا اردو ترجمہ منظوم مصنفہ ۱۸۵۲ھ (۲) ناصر علیخان بلگرامی واسطی کی ہفت گلشن کا ترجمہ
جو اخلاق و موعظ کی ایک کتاب ہے اور سات بابو پیر شمل ہے جو تاریخین اسکے آخرین دی ہوئی ہیں
ان سے تصنیف ۱۸۰۱ھ نکلتا ہے۔ آئین اخلاقی حکایتیں آداب گفتگو۔ بزرگوں کی اطاعت و فرمانبرداری
اور چند احادیث نبوی و اقوال حضرت علی رضی اللہ عنہ درج ہیں (۳) قصہ مادہ ہونل و
کام کش لاہوری رام کبیشری برج بہاشہ کا اردو ترجمہ ہے سنہ تصنیف ۱۸۰۱ھ ہے (۴) صورت
کبیشری بیتا کبیشی بہاشہ کا اردو ترجمہ جو لالہ لال جی کی شرکت میں کیا گیا وجہ تسمیہ یہ ہے کہ کبیشی قصہ

کسی بتیال بھوت) نے راجہ بکراجیک کے سامنے کہے تھے یہ ہندوستانی پبلک مین بہت مقبول ہے مگر مین کوئی ادبی ندرت نہیں ہے (۵) فارسی تیارخ شیرشاہی کا ترجمہ جو بعد کو انگریزی مین بھی ہو گیا ہے (۶) ایک دیوان ریختہ تقریباً ساڑھے تین سو صفحات کا جس مین غزلیات قصاید رباعیات وغیرہ مسہر سو انجمی مصنف کے ہن۔ اسکا ایک نسخہ خود مصنف نے بطور یادگار کے فورٹ ولیم کالج کو ۱۸۱۰ء مین دیا تھا۔

حفیظ الدین احمد انہوں نے خروافروز کے نام سے ۱۸۰۰ء مین ابوالفضل کی عیار دانش کا اردو ترجمہ کیا۔ اور عیار دانش خود ملا حسین واعظ کاشفی کی انوار سیلی کی تلخیص اور انوار سیلی کلید و منہ عربی کا ترجمہ ہے جو سنکرت سے ماخوذ ہے۔ انہیں قصوں کا ایک ناتمام ترجمہ انوار سیلی سے ایک شخص مرزا ہمدی نامی نے کیا تھا جو کپتان ناکس کے منشی تھے اور لکھنے ساتھ کلکتہ اور گیا گئے تھے کپتان کس نے کیا مین ایک مشہور داستان گو ہینگا خان نامی سے بھی اسی کتاب کا ترجمہ کرایا تھا۔ اور ان دونوں کو مقابلہ کر کے مرزا ہمدی کے ترجمے کو ترجیح دی تھی۔ انوار سیلی کا ایک ترجمہ دکنی زبان مین بھی موجود ہے جو ایک شخص سمس محمد ابراہیم بیجا پوری کی تصنیف ہے اور اس مین ۱۸۰۰ء مین چھپا ہے۔ بتان حکمت فقیر محمد خان گویا کی بھی اسکا ترجمہ ہے اور یہی سب سے بہتر ہے۔ نواب امیر علی خان واسطی نے ۱۸۰۰ء مین ایک مختصر ترجمہ ستارہ ہند کے نام سے کیا تھا اور ایک منظوم ترجمہ موسوم بہ ارژنگ لکھنی بہاری لال رضی بہت خوبصورت ہے ۱۸۰۹ء مین کیا تھا۔

مولوی اکرام علی انہوں نے عربی کی مشہور و معروف اخلاقی کتاب اخوان الصفا کا اردو مین ترجمہ کیا۔ اصل کتاب کے خاتمہ پر کشف الظنون کا حوالہ دیکر یہ لکھا ہے کہ رسائل اخوان الصفا کو جو تعداد مین اکاون ہن اشخاص ذیل نے تحریر کیا۔ محمد بن نصر البستی معروف بہ مقدسی۔ ابو الحسن علی بن اردن الزنجانی۔ ابو احمد النہجوری عوفی۔ زید بن رفاعہ اور یہ سب کے حسب کیم تھے۔ اس پوری کتاب کا ترجمہ انگریزی مین ڈاکٹر ڈیٹرس نے ۱۸۰۰ء لٹریچر مین کیا مولوی صاحب موصوف نے اردو مین صرف اُس قدر حصہ کا ترجمہ کیا ہے مین کہ حیوانات اور انسان کی برتری کا سوال شاہ جن کے سامنے پیش کیا گیا ہے مختصر

مضمون یہ کہ جانور اپنے مالک انسان کے ظلم و تعدی سے عاجز آگئے ہیں اور انہوں نے اپنا یہ مراغہ بادشاہ اجیتہ کے پاس جب کا نام پور سے پیش کیا ہے اس مقدمہ کے فیصلہ کا ایک دن مقرر کیا گیا جس میں سب جانور جمع ہوئے ہیں اور ہر ایک اپنے اپنے فضائل و فوائد اور یہ کہ وہ انسان کو کیا نفع پہنچاتا ہے اور انسان اس کے ساتھ کیا بریلو کی کرتا ہے بیان کرتا ہے چنانچہ گھوڑے گدھے۔ اونٹ اور بھڑی کے بیان کیے بعد دیگرے لے جاتے ہیں جو سب ایسے ہی دلچسپ ہیں جیسے کہ کنگری کی مشہور گزری کتاب ابو ننگز ایٹ ہوم۔ یہ ترجمہ کپتان ٹیلر صاحب کی فرمائش سے نہایت سلیس اور آسان اردو میں کیا گیا اور ۱۸۷۱ء میں شائع ہوا کپتان لاکٹ کی سفارش سے جو اس وقت فورٹ ولیم کالج کے انسر علی تھے مولوی اکرام علی ^{۱۸۷۱} میں محافظ دفتر مقرر ہوئے تھے۔

لولال جی یہ گجراتی زبان میں تھے مگر شمالی ہند میں سکونت گزین ہو گئے تھے۔ باوصف اسکے کہ ہندو تھے مگر اردو کے بھی بڑے ماہر تھے چنانچہ شکنتلا نامک۔ سنگھاسن ہتسی۔ بیتال چسپی اور قصہ ماد منول تصنیف میں انہوں نے اصل مصنفوں کو بہت مدد دی تھی جب کا حال اوپر بیان ہوا علاوہ اسکے ۱۸۷۱ء میں انہوں نے ایک کتاب زبان ہندی میں لطیف حکایات کی تصنیف کی جو "لطایف ہندی کے نام سے مشہور ہے۔

بینی نرائن بینی نرائن تخلص بہ جہان دیوان جہان کے مصنف ہیں جن میں ایک تذکرہ ہندوئی شعرا کا بھی شامل ہے جو کپتان روہک صاحب کو ٹری فورٹ ولیم کالج کی فرمائش سے ۱۸۷۱ء میں لکھا گیا اور انہیں کے نام پر مضمون بھی ہے۔ اسکے علاوہ انہوں نے ایک فارسی قصے کا ترجمہ "چار گلشن" کے نام سے کیا جس میں بادشاہ کیوان اور فرخندہ کے حالات درج ہیں۔ یہ قصہ ۱۸۷۱ء میں منشی انانکیش کے ایما و اصرار سے تیار کیا گیا اور کپتان ٹیلر صاحب کے سامنے پیش کیا گیا جنہوں نے اسکو پسند کر کے مصنف کو انعام سے سرفراز کیا اور اسکی اصل کتب خانہ کالج میں داخل کر دی گارن ڈیٹا سی کی تحقیق ہے کہ انہوں نے شاہ رفیع الدین صاحب کی تنبیہ الغافلین کا بھی ترجمہ اردو میں ۱۸۷۱ء میں کیا۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بینی نرائن مسلمان ہو گئے تھے اور مولانا سید احمد صاحب بریلوسی سے بیعت بھی کر لی تھی۔

مرزا علی لطف کاظم بیگ خان کے بیٹے تھے جو ستر آباد کے رہنے والے تھے اور علامہ مین نادر شاہ کی پہلی مین آئے تھے اور بعد کو ابو المنصور خان صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی دہلی مین داخل ہو گئے لطف فارسی مین بھی شعر کہتے تھے اور اپنے باپ کے شاگرد تھے جس کا تخلص حجریا ہجری تھا۔ اردو شعری کی نسبت لطف کا خود بیان ہے کہ مین کسید کا شاگرد مین ہوں دکن حیدر آباد کے سفر کے ارادہ سے نکلے تھے کہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے انکو روک لیا۔ اور انکا مشہور تذکرہ گلشن ہند لکھو ایا چنانچہ اس قصہ کا ذکر انہوں نے اپنے تذکرہ کے دیباچے مین کیا ہے۔ اسکا سنہ تصنیف ۱۸۱۷ء اور ماخذ نواب علی ابراہیم خان کا تذکرہ گلزار ابراہیم ہے گو کہ اس مین بہت کچھ اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ بالکل نایاب تھا جب حیدر آباد مین طوفان عظیم آیا تو اسکی ایک جلد موسیٰ ندی مین بہتی ہوئی جاری تھی اتفاقاً وہ کسی قدردان کے ہاتھ آئی اور اب وہ ایک نہایت نفیس مفید اور دلچسپ مقدمہ کے ساتھ مولوی عبدالحق صاحب سکر ٹری انجمن ترقی اردو کے اہتمام سے شائع ہو گیا ہے۔ یہ تذکرہ نہایت دلچسپ اسوجہ سے کہ اس زمانہ کا طرز تحریر اسوقت کے مشہور مشہور شاعروں کے دلچسپ حالات جن سے کہ مصنف سے ملاقات ہوئی اور اسوقت کی سوسائٹی کے مرتعے اس مین موجود مین۔ ہر چند کہ صحت واقعات کے لحاظ سے یہ بہت زیادہ قابل وثوق نہیں اور عبارت بھی ضرورت سے زیادہ پر تکلف و پر صبیح و مقفی ہے۔

مولوی امانت اللہ انکا تخلص شیدا تھا انہوں نے اخلاق جلالی کا ترجمہ ”جامع الافلاک“ کے نام سے پستان جمیونیٹ صاحب کے حکم سے ۱۸۱۷ء مین کیا۔ دیباچے مین پستان مذکور اور نیز گورنر جنرل ماکوئس آف ولزلی کی نہایت مبالغہ آمیز الفاظ مین تعریف ہے مولوی امانت اللہ نے ۱۸۱۷ء مین کتاب ہدایت الاسلام زبان عربی وارد و تحریر کی جس کا ترجمہ خود گلکرسٹ صاحب نے انگریزی مین کیا ۱۸۱۷ء مین انہوں نے ایک منظوم صرف نثر اردو موسوم بہ ”صرف اردو“ تصنیف کی۔

اس عہد کے دیگر منشی اور نثار علاوہ ان لوگوں کے جن کا ذکر اوپر ہوا اس عہد کے بعض دیگر منشی و نثار یہ تھے۔ سید جعفر علی آوان لکھنوی افتخار الدین شہرت۔ عبدالکریم خان کریم دہلوی مرزا باشم علی عیان مرزا باشم علی ممتاز میر عبد اللہ مسکین مرزا جان طیش مولوی خلیل علی خان آشک اور مرزا محمد فطرت۔

اشک نے سلسلہ عین اکبر نامہ کا ترجمہ ”واقعات اکبر“ کے نام سے تیار کیا مگر وہ شائع نہیں ہوا پیش نے ایک کتاب اردو محاورات پر لکھی اور سلسلہ عین اکبر طویل غمنوی بہار دانش کے نام سے لکھی۔ ان کا کلیات نورث ولیم کلج کی طرف سے شائع ہو گیا ہے۔

تراجم قرآن شریف از مولانا شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی مشہور محدث و صوفی اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں ہوئے ہیں ان کے متعدد تصانیف ہیں جن میں حجۃ اللہ البالغہ۔ اور ازالۃ الخفاء عن سیرۃ الخلفاء نہایت مشہور و ممتاز ہیں ان کے بڑے صاحبزادہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب بھی علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں اپنے والد بزرگوار سے کم نہ تھے۔ ان کا انتقال ۱۲۳۹ھ میں ہوا۔ دوسرے صاحبزادے مولانا شاہ رفیع الدین ۱۲۳۳ھ بھی نہایت جلیل عالم تھے جنہوں نے سب بڑا کام یہ کیا کہ قرآن شریف کا سب سے پہلا اردو ترجمہ کیا تیسرے صاحبزادے مولانا شاہ عبدالقادر تھے (۱۲۶۱ھ) جو اپنے علم و فضل اور کمالات ظاہری و باطنی کے واسطے مثل اپنے پدر بزرگوار اور برادران محترم کے مشہور تھے۔ انہوں نے سلسلہ عین اکبر دوسرا اردو ترجمہ قرآن شریف کا کیا اور ایک تفسیر موضح القرآن کے نام سے تصنیف کی۔ ان کا ترجمہ نہایت سلیس سادہ اور بامحاورہ اردو میں ہے جس سے ان کا ترجمہ علمی بدرجہ اتم ظاہر ہے۔ یہ ترجمہ اس قدر مقبول ہوا اور اب تک ہے کہ مولوی انصاری صاحب اپنے ترجمہ قرآن شریف میں ان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کا پورا خاندان اس علمی خدمت کے واسطے مشہور ہے اور حق یہ ہے کہ یہ حضرات مترجمین متاخرین کے واسطے کچھ نہیں چھوڑ گئے کیونکہ ان لوگوں کے تراجم اصل میں قرآن شریف کے تراجم نہیں ہیں بلکہ خاندان شاہ ولی اللہ کے تراجم کے تراجم ہیں۔ ہمارے نزدیک شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمے فی الحقیقت اس تفسیر عظیم کا پتہ دیتے ہیں جو زبان اردو میں ہونے والا تھا جبکہ فارسی کا ان خطاط ہو رہا تھا مولوی محمد اسماعیل دہلوی مولوی عبدالغنی کے بیٹے اور شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے پوتے تھے۔ خلافت اور رسائی فکر میں بچانہ روزگار اور اپنے عہد کے بہت بڑے عالم باعمل تھے۔ سید احمد مجاہد دہلوی کے ہمراہ جہاد کی نیت سے نکلے مگر قلعہ بالا کوٹ ملک پنجاب کے قریب شہر شہادت

سے سیراب ہوئے یہ واقعہ ۱۲۲۷ھ کا ہے۔ شاہ نصیر نے اس واقعہ کو مذاق کے طور پر ایک قصیدہ کی صورت میں لکھا تھا۔ جسکے دو شعر یہ ہیں۔

کلام اللہ کی صورت ہوا دل اُنکا سپارہ نہ یاد آئی حدیث اُنکو نہ کوئی نص قرآنی
ہر ن کی طرح میدانِ غامین چو کڑی بھولے اگرچہ تھے دمِ شملہ سے وہ شینِ نیا نی
جب اس قسم کے طنز آئینہ شکار کے مریدوں نے سنے تو وہ شاہ نصیر کے مکان پر چڑھ دوڑے اور اُنکی خوب
خبر لے لیا چاہی۔ مرزا خانی کو تو ال شہر کو جب سکی خبر ہوئی تو وہ موقعِ واردات پر پہنچے اور شاہ صاحب کو
اُن لوگوں سے چھڑایا۔ مولانا نے موصوفی کی مشہور تصانیف حسبِ نیل ہیں۔ رسالہ توحید۔ صراطِ مستقیم۔
تہذیبِ العینین۔ تقویۃ الایمان وغیرہ۔

ترتیب صرف نسخہ کتب درسیہ اور تراجم کے علاوہ ترتیب صرف و نحو و تراجم کے اوپر بھی پوری توجہ
دلغات اردو مبدول گنگائی کتب مذکورہ ذیل اُن یورپین اصحاب کی تصنیف و تالیف ہیں جنکو
زبان اردو کی ترقی سے بہت دلچسپی تھی سب سے پہلی ہندوستانی گرامر وہ ہے جو ۱۷۷۱ء میں جہان
جو شو اکیٹل نے تصنیف کی تھی جو زبانہ شاہ عالم و جہاندار شاہ یعنی ۱۷۷۱ء میں مملکت ہالینڈ کی طرف
سے ہندوستانی سفیر تھے۔ انہوں نے اگرہ لاہور دہلی وغیرہ کی بھی سیر کی تھی اور ۱۷۷۱ء میں اپنے ملک
کی طرف سے ایران میں بھی سفیر ہوئے تھے۔ انہوں نے ہندوستانی زبان کی ایک لغت تیار کی جسکو ایک
انگریز ڈیوڈل نے ۱۷۷۳ء میں شائع کیا۔ کیتلر مذکور کی گرامر میں نہ صرف ہندوستانی افعال کی گزرتین
ہیں۔ بلکہ حکام عشرہ قورات اور لاٹ دس پر پیر کا ترجمہ بھی اردو میں کیا ہے۔ ۱۷۷۴ء میں ایک مشہور
جرمن پادری شلر نامی نے ایک دوسری ہندوستانی گرامر موسوم بہ گرامٹیکا ہندوستانی کا زبان لاطینی
میں تیار کی جس میں ہندوستانی الفاظ بخط عربی و فارسی مع خط انگریزی کے تحریر کئے۔ اسی سنہ میں مل نے
ہندوستانی حروف تہجی اور کچھ ہندوستانی الفاظ کے اوپر ایک سالہ لکھا۔ ۱۷۷۸ء میں بھی اسی شخص نے
۱۷۷۸ء میں مرزا خانی راقم آئم (منہج) کے دادا تھے جنکی تعریف میں اسی قصیدہ میں بطورِ شکر یہ کہ شاہ صاحب نے یہ شعر
کہا ہے نصیر الدین سجادہ درستہ طوس کا لیتا۔ نبوتے شمعہ دلی اگر یان میرزا خانی (دیکھو آبِ حیات و ذکر شاہ نصیر)۔

ایک کتاب جی اے فٹز نے تصنیف کی جس میں ہندوستانی حروف تہجی کا دوسرے مالک کے حروف سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ اور علامہ مین اسمیٹسم کی ایک تیسری کتاب ایک اٹالوی پادری کیسینو بیگلی گالی نے تصنیف کی جس کا نام الفا بیٹیم برہا کلم رکھا۔ اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندوستانی حروف اپنی خاص شکل میں ٹائپ میں لکھے گئے علامہ مین ہیڈلی کی گرامر اور علامہ مین زبان پنگالی میں ایک ہندوستانی گرامر موسوم بہ گرامیڈکا اندوستانا چھپیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر گلکرسٹ کی تصانیف کا زانا نہ آتا ہے جنہوں نے نہایت تلاش اور شوق سے متعدد رسائل گرامر اور لغات اور فرہنگیں اور تحقیقات زبان کے متعلق دوسری کتابیں تصنیف کیں اور چھپوائیں انکی مدت تصنیف ۱۲ برس ہے اور علامہ سے شروع ہوتی ہے۔ انہوں نے تقریباً پندرہ کتابیں تعلق بہ صرف و نحو و علم الاسماء و لغات و جراحم و امثال وغیرہ تصنیف کیں۔ اکثر ہندوستانی ملشی اور پنڈت جو فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے انکے ساتھ بھی یہ شریک تصنیف رہے۔ اسکے علاوہ ان کی نگرانی میں متعدد عمدہ ادبی کتابیں تیار ہوئیں۔ مختصر یہ کہ اس عہد کی تصنیفات و تالیفات کے وہ روح رواں تھے۔ اور علاوہ علمی قابلیت و استعداد کے ایسے طبع متواضع اور ہمدرد واقع ہوئے تھے کہ مختلف اقطاع ملک سے قابل قابل لوگ انکی قدردانی کا شہرہ منکران کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ انکی سب سے زیادہ مشہور تصنیف ایک انگریزی ہندوستانی ڈکشنری مطبوعہ ۱۸۹۹ء اور ایک ہندوستانی گرامر مطبوعہ ۱۹۰۱ء ہیں۔ اسید طرح کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہرنل نے بھی ایک ہندوستانی انگریزی ڈکشنری ۱۸۹۷ء میں اور مولوی امامت اللہ نے ایک مختصر ہندوستانی صرف و نحو منظوم موسوم بہ صرف اردو علامہ میں تصنیف کیں۔ جان شیکسپیر کی ہندوستانی گرامر علامہ مین اور ہندوستانی انگریزی ڈکشنری علامہ مین شائع ہوئیں۔ کپتان پرائس اور بیٹیس نے بھی ہندوستانی کتابیں لکھیں گارسن ڈیٹاسی مشہور مستشرق فرانس نے زبان اردو کے متعلق متعدد کتابیں زبان فرانسیسی میں تصنیف کیں اور ڈوکن فارس نے اپنی متعدد تصانیف سے جو اردو گرامر اور لغت ہیں اور نیز اردو کی قدیم کتابوں کو ایڈٹ کر کے زبان اردو کو نمونہ بنایا کیا۔ مولیم بائیر بانی انیشیاٹک سوسائٹی بنگال اور ڈاکٹر فیلن نے بھی نہایت مفید کتابیں بصورت گرامر اور

لغت کے تصنیف کین پلیٹ کی گرامر ۱۸۷۴ء میں اور ڈکشنری ۱۸۷۵ء میں اور پادری کرپون صاحب کی مختصر ڈکشنری ۱۸۸۱ء میں چھپ کر نکلیں اور یہ سب کتابیں طلباء کے لئے نہایت مفید سمجھی جاتی ہیں۔
 اب دیکھنا چاہئے کہ خود ہندوستانیوں نے اپنی زبان کی ترقی و ترقی میں کیا حصہ لیا۔ انشا اور قبتل کی متحدہ تصنیف ”دریائے لطافت“ جسکو زبان اردو

ہندوستانیوں کی مرتب کردہ
 لغات و دیگر کتب

کی سب سے زیادہ مشہور اور قدیم صرف و نحو کی کتاب سمجھنا چاہئے ۱۸۷۵ء میں تحریر اور ۱۸۷۶ء میں بمقام مرشد آباد پہلی بار شائع ہوئی۔ منشی محمد ابراہیم نے ایک اردو کی صرف و نحو معروف بہ تحفۃ الفنون ۱۸۷۲ء میں لکھی مولوی احمد علی دہلوی کا رسالہ ”چشمہ فیض“ اردو کی صرف و نحو پر ۱۸۷۴ء اور مولوی امام بخش صہبائی کا ترجمہ حیات البلاغت ۱۸۷۴ء اور منشی کریم الدین کی قواعد المبتدی - تمار علی بیگ فیض اللہ خان اور محمد احسن کے رسالجات صرف و نحو مولوی محمد حسین آزاد کی کتاب ”جامع القواعد“ مطبوعہ لاہور ۱۸۷۴ء۔ جلال کی ”گلشن فیض“ مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۷۵ء جو ایک اردو ہندی الفاظ و محاورات کی تحقیق کی لغت ہے یہ سب اسی زمانے کی تصنیفات ہیں۔ زمانہ محال کی نقاشیں منشی امیر احمد صاحب کی مشہور لغت امیر اللغات (جوانوس ہے کہ ناتمام ہے) مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگ صحیفہ چابلدین جو سالہا سال کی کاوش و محنت کا بہت اچھا نتیجہ اور حضور نظام کی سرپرستی اور دیوانہ دلی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اور مولوی نذیر الحسن صاحب تیر کا کوری کی نوز اللغات قابل ذکر ہیں۔ انجمن ترقی اردو نے ایک مختصر رسالہ صرف و نحو ایک نئے طریقے سے ترتیب دیا ہے۔ مگر ہماری ناچیز رائے میں باوجود ان تمام کتب کے جنہیں سے اکثر فی زمانہ موجود ہیں پھر بھی ایک مکمل سائنٹفک اردو گرامر کی اب بھی سخت ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ اگر اس زمانہ کے فضلا کم ہمت باندھ لیں اور امیر اللغات کی باقی جلدیں پوری کر دیں اور کوئی دریا دل ایسی طباعت کا اہتمام کر دے تو اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کے تکمیل سے زبان اردو کی نہایت معقول اور عمدہ خدمت سر انجام پائیگی۔

عیسائی پادریوں کے کارنامے
 سب سے قدیم اردو ترجمے بائبل کے وہ ہیں جو پنجمن شلر اور کالبرگ نے ۱۷۷۵ء لغات ۱۷۷۵ء میں کے مرزا محمد فطرت اور دیگر کالج کے فیشنوں نے محمد حیدر کا

ترجمہ اردو میں کیا جو نظر ثانی ڈاکٹر نضر ۱۸۵۵ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ اس طرح سیرام پور کے پادریوں نے بھی بائبل کے ترجمے اردو ہندی میں نکالے۔ پادری ماڈن نے ۱۸۵۷ء میں عہد جدید کا ترجمہ زبان یونانی سے اردو میں کیا جس پر مرزا محمد فطرت نے نظر ثانی کی۔ پوری بائبل کا ترجمہ سیرام پور کے پادریوں نے پانچ جلدوں میں ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۱ء میں شائع کیا۔ پادری لوگل نے مطالب عوام الناس پر نویشن کر نیے واسطے انہیں کی زبان میں اپنی تحریریں اور تقریریں کرتے تھے اور اشاعت دین کی غرض سے متعدد درسا لے پمفلٹ اور اخبار وغیرہ نکالتے تھے جنہیں مذہبی ایٹون اور گیتوں کے علاوہ بہت سی مفید چیزیں بھی شامل ہوتی تھیں جس نے زبان کو بہت وسعت اور ترقی حاصل ہوئی۔

باب ۱۶

نثر اردو کا دور متوسط اور دور جدید

مطبوعات لکھنؤ ہر چیز کہ نثر اردو کی ابتدا فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی تھی۔ مگر لکھنؤ بھی جو دلی کی تباہی کے بعد علم و ادب اور شعر و سخن کا مرکز بن گیا تھا نثر نگاری میں فورٹ ولیم کالج سے کچھ کم نہ رہا کتب ذیل سب اسی اشرف البلاذکی طباعت کی یادگار ہیں بستان حکمت کلیدہ و منہ۔ گل بکاوی۔ گلشن نوہار۔ گل و صنوبر۔ لوزن مصنفہ محمد بخش مہجور شاگرد جرات وغیرہ وغیرہ۔

نواب فقیر محمد خان لکھنؤ کے ایک نامور رئیس در فوج شاہی کے ایک مشہور رسالہ فقیر محمد خان گویا۔ بستان حکمت ۱۲۶۱ء سے ختم الدولہ خطاب اور گویا تخلص کرتے تھے ناسخ کے شاگرد تھے مگر خواجہ ذبیحہ سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ صاحب دیوان ہیں گو کہ دیوان ان کے مرثیے ایک عرصہ کے بعد مطبع فنی نولکھنؤ لکھنؤ میں چھپا گیا کا انتقال ۱۲۶۱ء مطابق ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ انکی تصنیف بستان حکمت انوار کبلی کا مشہور ترجمہ ہے جو ۱۲۶۱ء میں ختم ہوا اور شیخ ناسخ نے تاریخ کہی جبکہ مصرع تاریخ یہ ۷۷۷۷ خرد گفت بستان سیراب حکمت سبب تالیف اس کا مصنف یون بیان کرتے ہیں کہ ایک دن وہ اور

خواجہ وزیر اور میان فرخ شاعر کہ یہ دونوں شیخ ناسخ کے شاگرد تھے، اور چند احباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور انوار سہیلی کا ذکر ہو رہا تھا۔ اور سب لوگ اسکی تعریفیں کر رہے تھے کہ انہاں گفتگو میں سب اہل محفل نے مصنف سے اصرار کیا کہ اکثر زبانوں میں اس کتاب کا ترجمہ ہو چکا ہے اگر تم اردو میں ترجمہ کر دو تو خوب چیز ہو۔ غرض کہ ان لوگوں کے اصرار پر مصنف نے کمر ہمت باندھی اور ترجمہ شروع کر کے انجام کو پہنچایا۔ اگر کتاب کو بلاستیعاب پڑا جائے تو معلوم ہوگا کہ ترجمہ لفظی نہیں ہے بلکہ موقع موقع پر ایجاز و اطناب کو دخل دیا ہے البتہ عربی و فارسی الفاظ بہ کثرت ہیں اور زبان بھی شگفتہ اور سلیس نہیں عربی الفاظ اور امثال بہ کثرت استعمال کئے گئے ہیں جس سے کہیں کہیں عبارت بے مزہ اور مخلق ہو گئی ہے۔ مگر یہ بات قابل توجہ ہے کہ عبارت معنی اور صیغہ نسین جیسا کہ سرور کی فسانہ عجائب کی ہے مختصر یہ کہ یہ کتاب ایک مانہ میں مقبول تھی مگر اب لوگ اسکو کم پڑھتے ہیں۔

مرزا حبیب علی بیگ سرور
متوفی ۱۳۸۵ھ

لکھنؤ کے سب سے قدیم اور مشہور نثار مرزا حبیب علی بیگ سرور ایک جامع لکھا لاٹ شخص تھے باپ کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا۔ سن ۱۲۸۵ھ یا ۱۲۸۶ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما اور تعلیم پائی۔ عربی و فارسی میں اچھا دخل رکھتے تھے اور اپنے زمانہ کے مشہور خطاطوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اس فن میں حافظ ابراہیم کے شاگرد تھے جنکا ذکر فسانہ عجائب میں موجود ہے۔ موسیقی سے بھی علمی اور عملی دونوں طور پر بخوبی واقف تھے فن شعر میں آغا نواز شلمیزیر کے شاگرد تھے جنکا ذکر اپنی کتاب میں بہت محبت و ادب سے کرتے ہیں۔ حریف ظریف ہشاش بشاش وجہ اور خوش رو آدمی تھے۔ انکے دوستوں میں شرف الدین میرٹھی اور مرزا غالب بھی تھے اور آخر الذکر نے فسانہ عجائب اور گلزار سرور پر فاضلانہ تقرظیں بھی لکھی ہیں۔

سن ۱۲۸۵ھ میں سرور کا پنور گئے اور کہا جاتا ہے کہ غازی الدین حیدر کے حکم سے لکھنؤ سے جلا وطن کر دیے گئے تھے۔ وہ کاپنور سے نہایت بیزار ہیں چنانچہ لکھتے ہیں کہ بیچ الثانی کے مہینہ میں کہ سنہ ہجری بنو صلیح بارہ سو چالیس تھے آئینکا اتفاق مجھ کو کردہ کاپنور میں ہوا۔ بسکہ یہ سستی پورچ دلچسپ اشرف یہاں عتقا صفت نامید ہیں۔ اچانا جو ہونگے تو گوشہ نشین عزالت گزین۔ مگر چھوٹی امت

کی بڑی کثرت دیکھی۔ یہ طور دیکھ کر دل وحشت منزل گھبرا یا کلیجہ منہ کو آیا۔ قریب تھا جنوں ہو جائے۔
 تیرہ بجتی روز سیاہ پیش لائے، اس کے بعد لکھتے ہیں کہ مہین کا پور میں حکیم سید اسد علی صاحب ملاقات
 ہو گئی جو میرے حال پر بڑی عنایت فرماتے تھے ایک دن اُن سے کہا کہ میں ایک قصہ لکھنا چاہتا ہوں۔ سنکر
 فرمایا بیکار مباحث کچھ کیا کر۔ اسوقت یہ حکم تو سن طبع کو تازیانہ ہوا۔ یعنی باعث تصنیف کتاب بن گیا۔ پھر
 اسکے آگے ایک طنز پر طور پر لکھتے ہیں کہ میں سچمیر زمین ٹھکڑ زبان کا دعویٰ نہیں۔ اگر شاہجہان آباد
 کا رہنے والا ہوتا تو زبان دانی کا دعویٰ کرتا۔ جیسا کہ میرسن نے کیا ہے۔ جنکی نسبت یوں گلفشانی کرتے ہیں
 اگر وہاں (شاہجہان آباد میں) چندے بود و باش کرتا فصحیوں کو تلاش کرتا تو فصاحت کا دم بھرتا
 جیسا کہ میرسن نے چار درویش میں بکھیرا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے ذہن و حصہ میں یہ بات آئی ہے دتی
 کے روٹے ہیں محاورے کے ہاتھ منہ توڑے ہیں۔ پتھر پٹین ایسی سمجھ پر پی خیال انسان کا خام
 ہوتا ہے۔ مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے بشر کو دعویٰ کب سزاوار ہے۔ کالموں کو یہودہ گوئی سے
 انکار بلکہ ننگ عار ہے۔ مشک آنست کہ خود بہ بود۔ نہ کہ عطار بگوید۔ مختصر یہ کہ کانپور سی میں یہ کتاب
 لکھی گئی۔ اسکے شروع میں چند سطور بادشاہ وقت غازی الدین حیدر کی مرح و ثنائیں شاید اس عرض سے
 لکھی ہیں کہ ان کا قصور معاف کیا جائے اور لکھنؤ آنے کی اجازت دیجائے۔ یہ کتاب غازی الدین حیدر کے
 زمانہ میں شروع ہوئی تھی اور نصیر الدین حیدر کے عہد میں تمام ہوئی۔ جنکی تعریف میں سمور نے لکھنؤ کے
 حالات کے سلسلہ میں بہت کچھ لکھا ہے اور آخر میں ایک عائبہ غزل ہی انکی شان میں ہے جسکا مطلع ہے
 تا ابد قائم رہے فرمانروائے لکھنؤ یہ نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ
 اسی غزل کے چند مشہور شعر یہ ہیں۔

یا تو ہم پھرتے تھے انہیں یا ہوا یہ انقلاب	پھرتے ہیں آنکھوں میں ہر دم کوچہ ہائے لکھنؤ
انکی استغنائے کیا کیا آرزو کرتی ہر رشک	جام ہم پر تفت نہیں کرتے گدا لکھنؤ
جن دانش و حش و طایر کیوں نہ سکھم ہوں	ہے سلیمان اندون فرمانروائے لکھنؤ
یہ رہے آباداریا یہ دور مستحضر	میں کہیں ہوں مالک ہوں رولکھنؤ

اس سخت تنقید کا جواب خواجہ میر الدین صاحب نے اپنی ہجو میں لکھ دیا ہے۔ ان کی غزل دیکھو یا میر الدین صاحب

مقبل شیراز کو ہے رشک اسخ کا سرور صفہاں اُسے کئے ہیں کو پہائے لکھنؤ
 سرور کے اکثر شعراء سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب لکھنؤ میں نہیں بلکہ کسی اور جگہ تحریر ہوئی مگر بعد
 اختتام بعد نصیر الدین حیدر لکھنؤ میں آئی اسکا سنہ تصنیف ۱۲۸۶ھ ہے جیسا کہ آخر کے قطعات تاریخ
 سے معلوم ہوتا ہے۔ ۱۲۸۶ھ میں سرور کی بیوی کا انتقال ہوا اور اسی سال سرور واجد علی شاہ کے
 درباری شعراء میں بشاہرہ بچاس روپیہ ماہوار داخل ہوئے۔ اور انہوں نے اپنا مدحیہ قصیدہ حضرت
 نعل سبحانی کی تعریف میں معرفت قطب الدولہ صاحب شاہی پیش کیا ۱۲۸۶ھ میں بادشاہ کے
 حکم سے کتاب شیرخانی کا ترجمہ موسوم بہ سرور سلطانی کیا اور ۱۲۸۶ھ اور ۱۲۸۷ھ کے اثنا میں اکثر
 چھوٹے چھوٹے قصے تصنیف کئے جن میں سے ایک "شرع عشق" ہے جو نواب سکندر بگم والی بھوپال
 کے حکم سے لکھا گیا ۱۲۸۷ھ میں شگوفہ محبت "امجد علی خان رئیس سندیلہ کی فرمائش سے تحریر ہوا ابتداء
 سلطنت ۱۲۸۶ھ کی وجہ سے سرور بہت خستہ حال اور پریشان روزگار ہو گئے تھے کچھ دنوں قیام علی
 سرشتہ دار کا رنگی صاحب درمنی شیرپشاہ ملازم کمریٹ نے انکی اعانت کی لیکن ۱۲۸۷ھ کے بعد
 اس ذریعہ کو بھی منقطع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مہاراجہ اشیشی پرشاد نرائن سنگھ والی بنارس
 کی طلبی پر سرور ۱۲۸۹ھ میں بنارس گئے اور مہاراجہ صاحب نے وہاں ان کی بہت قدر افزائی اور خاطر
 و مدارات کی۔ بنارس میں انہوں نے "گلزار سرور" شہستان سرور" اور دیگر نظم و نثر کی چھوٹی چھوٹی
 کتابیں تصنیف کیں۔ مہاراجہ بنارس کی طرح سرور کو مہاراجہ الورا اور مہاراجہ ٹپپالہ نے بھی اپنی اپنی
 ریاستوں میں طلب کیا تھا اور آخر الذکر نے ایک جوڑی طلائی کڑوں کی انکو مرحمت فرمائی تھی۔
 سرور کے ایک خط سے جو انکی انشائے سرور میں چھپ گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دہلی لکھنؤ میرٹھ
 اور راجپوتانہ بھی گئے تھے اسوجہ سے کہ اس خط میں انہوں نے اپنے سفر کی تکلیفوں کا حال شرح
 طور پر لکھا ہے۔ انشائے مذکور میں جو خطوط درج ہیں وہ انکے سوانح زندگی اور اس عہد کے حالات
 پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک مرتبہ انپر ایک الزام قتل بھی لگایا گیا تھا۔ ۱۲۸۶ھ میں سرور اپنی آنکھوں
 کے علاج کے لئے کلکتہ گئے تھے۔ اور واجد علی شاہ سے بھی ملے تھے جو اسوقت ٹیپا برج میں نظر بند

تھے مگر سرور و بان سے ناکام آئے اور بالآخر اپنی آنکھوں کا علاج لکھنؤ میں ایک ہندوستانی ڈاکٹر سے کرایا۔ ایک بعد وہ بنارس گئے جہاں ۱۸۶۷ء (مطابق ۱۲۸۵ھ) میں (یعنی غالبؔ کے ایک سال پیشتر) انتقال کیا۔

فسانہ عجائب سرور کا سب سے بڑا کارنامہ انکی تصنیف فسانہ عجائب ہے۔ اس کا قصہ معمولی حسن و عشق کا افسانہ ہے جسکے مضمون و واقعات میں کوئی جدت نہیں اور عبارت اسی زمانہ کی مروجہ فارسی کی تقلید میں پر تکلف و تصنع متغنی اور مسجع ہے۔ یہ ایک ایسا فرضی افسانہ ہے جس میں طلسم سحر دیوتے لڑائی جادو گروں سے مقابلے سفر کے عجائب و غرائب کثرت ہیں۔ یہ نوجوان طبیعتوں کو بہت مرغوب ہے مگر سن رسیدہ لوگ نفسِ قصہ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے البتہ انکی زبان اور صیغہ عبارت کو اکثر پسند کرتے ہیں۔ اسکی عبارت پر تکلف ہے مگر اس میں واقعات کی فراوانی نہیں ہے، بعض فقرات ضرور ایسے ہیں جو مثل نظم کے دلچسپ اور ادبی مرصع کاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس کتاب کو زمانہ محال کے اصول تنقید سے جانچنا ایک فضول سی بات ہے اسوجہ سے کہ مصنف لکھے زمانہ کے لوگوں میں ہیں قصہ بھی پرانے رنگ کا ہے اور طرز عبارت اس زمانہ کا ہے جب فارسی عام طریقہ سے رائج تھی اردو کے خطوط تک میں تصنع اور تکلف شامل تھا اور سادگی عبارت کو لکھنے والے کی سادہ لوحی اور عدم قابلیت پر محمول کرتے تھے۔ ان قیود پر نظر کرنے ہوئے ہمارے لوگوں کا تہ دل سے ممنون ہونا چاہئے جنہوں نے قدیم فرسودہ طریقوں کو چھوڑ کر ایک نئی شاہراہ قائم کی۔ مثلاً مرزا غالب۔ اور سرسید وغیرہ جس طرح نظم اردو کی ابتدا مرثیوں غزلوں اور غزلوں سے ہوئی اسی طرح فرضی قصوں اور افسانوں پر نثر اردو کی بنیاد رکھی گئی اور جس طرح اصنافِ نظم مذکورہ تدریجی ترقی کرتی ہوئی اس درجہ کو پہنچیں اسی طرح نثر اردو بھی اپنے ابتدائی مدارج طے کر کے زمانہ محال کی سلیس اور سنجیدہ روش پر آگئی۔ فسانہ عجائب کا دیباچہ اس لئے اور بھی دلچسپ ہے کہ اس میں اس زمانہ کی شہر لکھنؤ کی سوسائٹی و بان کے طرز معاشرت اور اور و سار کی وضع داریوں انکے پر تکلف جلسوں۔ شہر کے رسوم و رواج۔ کھیل تماشوں۔ دلچسپ مناظر مختلف پیشوں اور اہل کمال کے حالات بازاروں

کی جبل جہل - سودا فروشوں کی آوازوں وغیرہ کی دلکش اور جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انکو سرشار کی مرقع نگاری سے علیحدہ سمجھنا چاہیے اسوجہ سے کہ سرشار کے یہاں کیرکٹر اور مختلف سوسائٹیوں کے بحیثیت مجموعی نمونے دکھائے گئے ہیں اسین تفصیل و تطویل سے کام لیا ہے اور اپنے ظریفانہ طرز بیان سے اسین ایک دلکش اور نظر فریب رنگینی پیدا کر دی ہے ہرکس اسکے سرور کے یہاں سوسائٹی کے مرقع یا کیرکٹر نگاری کے کشتے نہیں ہیں نیز یہ کہ سرور اپنے سلسلہ بیان میں ان چیزوں پر جنکو وہ بیان کرنا چاہتو ہیں ہر ایک سرسری نگاہ ڈالنے میں جیکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سرشار بحیثیت ایک ناولسٹ کے کیرکٹر نگاری اور تفصیل جزئیات کو مقدم سمجھتے ہیں اور یہی سرور کو چنداں ضرورت نہیں اس موقع پر پنڈت بشن نرائن در کے وہ فاضلانہ خیالات سننے کے قابل ہیں جو فسانہ عجائب پر ہر کہ انہوں نے انگریزی میں ظہور فرمائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "سرشار کے بہ نسبت سرور کے یہاں لکھنؤ کا بیان بہت زیادہ مکمل بہت زیادہ متناسب اور بہت زیادہ خوب صورت ہے۔ مگر سرور آدمیوں کا حال نہیں لکھتے صرف چیزوں کا مرقع کھینچتے ہیں۔ حلوئی کی دکان کے پاس سے ہم گزرتے ہیں اور ہمارے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ تنبلیوں کے یہاں کی گلو ربان دیکھ کر ہمارا جی لپٹا تا ہے۔ بالائی کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ لکھنؤ کی بالائی کے آگے ڈیونشائر کی کریم بالائی کوئی چیز نہیں۔ لیس فروش جو ہری سنبے بقال کپڑے سب جو کھا مال لئے بیٹھے ہیں۔ چوک اور دوسری بازار میں اور سیر گاہیں (جواب باقی نہیں رہیں) ہم اس کتاب میں دیکھتے ہیں اور انکی خوب سیر کرتے ہیں۔ ہماری نگاہ ان بلند عمارتوں اور گروہ پر بھی جاتی ہے جتنا سے کچھ حسین صورتیں اپنی جادو بھری نگاہوں سے ہمکو بھانکتی ہیں۔ ہم چوک میں ہو کر گزرتے ہیں مگر وہ ایک شہر خوشان ایکسٹنی بستی معلوم ہوتا ہے۔ راہ گیر اور دکاندار سب سو رہے ہیں ہم جمع میں چلتے ہیں مگر کھوسے سے کھوادہاں نہیں چھلتا۔ کمرے والیاں ہمارے اشاروں کا جواب نہیں دیتیں تنبلیوں میں کرشمہ دنا زمین صرف میں مگر منہ سے کچھ نہیں بولتیں کپڑے بہرے ہیں۔ بساطی بدست۔ حلوئی انکھ رہے ہیں جلوا انکی مٹھائیاں جیوں میں ہر کر لیلیں۔ زندگی کا کمین پتہ نہیں مشہور مشہور گویے ہمارے سامنے آتے ہیں مگر انکا گانا سننے میں نہیں آتا۔ شعرا۔ فوجی سپاہی پہلوان۔ بادشاہ

وزیر سب سلمے سے فائوسی تصویر دن کی طرح گزر جاتے ہیں سب خاموش معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ سب تصویریں بے ہوشی کے عالم کی کھینچی ہیں۔ لہذا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ سرور کا لکھنؤ وہ شہر خورشان ہے جس کا نقشہ ٹینس نے اپنی مشہور نظم ”ڈے ڈریم“ (خواب روز) میں کھینچا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

ملک میں ٹیلر (فانسان) اپنے دوڑن گھٹون کے بیچ میں شراب کی بوتل

دبا سے بیٹھا ہے جا آدمی رہی ہے۔ اور کہیں بڑا اسٹوڈنٹ (بادچی)

اپنے کام میں مصروف ہے۔ کہیں حسین میڈ (اما) کا ہاتھ نو عمر خادم (بیچ)

نے پکڑ لیا ہے۔ میڈ کچھ کہنے کیلئے اپنا منہ کھولا جا ہتی ہے بیچ بوسہ کیلئے

منہ پکڑتا ہے۔ اور شرم کی سرخی میڈ کے رخساروں پر دوڑ جاتی ہے۔“

اُس زمانہ میں مقفی مسیح عبارت اس درجہ مقبول اور مروج تھی کہ اس کے حتر از شکل تھا سیو جے سے خانہ عجائب کی عبارت کیس اور بول چال روزمرہ میں شارانین کی جاسکتی برعکس اس کے ہمین تعقید و تکلف بیحد ہے۔ اور سرور کی کھینچی ہوئی تصویریں جیسا کہ سندھت لشن نرائن در نے اوپر بیان کیا ہے شہر خاص قصہ کے صحیح خط و خال نہیں دکھاتیں بلکہ وہ محض اُن شخص کے ماحول اور گرد و پیش کو ظاہر کرتی ہیں قوافی کی پابندی کی وجہ سے سلسلہ بیان کی روانی اور سلاست میں فرق پڑ جاتا ہے اور اکثر جگہ پڑھنے والا الفاظ کے جال میں بھنس جاتا ہے۔ سرور نے اپنے جذبہ وطنی کے جوش میں ہیراتن بلکہ دی والوبہ اکثر جوڑیں کی ہیں جس کا ذکر اوپر ہوا قصہ میں کیرکٹر نویسی کم ہے مگر اس میں شک نہیں کہ ہر نگار کے کیرکٹر میں سچی محبت با وفائی۔ دلیری۔ معاملہ فہمی۔ جرأت اور تسانت و بردباری کو نہایت واضح طریقہ سے دکھایا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ضمنا بعض قصے ایسے بھی بیان کئے ہیں جن کے ہیرو انگریز ہیں مثلاً اسپر مجسٹن کا قصہ جس کے ذیل میں کچھ انگریزی الفاظ آگئے ہیں جو شاید اس سے پیشتر نثر اردو میں شاذ و نادر استعمال ہوئے ہوں۔ دنیا کی بے ثباتی کا سبق جو بندر کی تقریر سے ملتا ہے اور جوگی کی عبرت افزا نصیحتیں نہایت نثر اور دلکش ہیں اس کتاب کے جواب میں دو قصے اور بھی لکھے گئے ایک ”سروش سخن“ مولفہ خواجہ محمد خلد حسین سخن دہلوی جو ۱۹۲۱ء میں تحریر ہوا اور کہیں سرور پر بہت سی جوڑیں کی گئی ہیں اور دلی

والوں کی تیسویں ہین۔ دوسرا طلسم حیرت، مولفہ محمد جعفر علی خاں لکھنوی جو ۱۸۷۷ء میں تصنیف ہوا
جس میں ہر ایک اہل لکھنؤ کی طرف سے "سروش سخن" کے مطاعن کا جواب دیا گیا ہے۔

سردار کی تحریکات (۱) ۱۸۷۷ء میں سردار سلطانی ترجمہ شمشیر خانی جو شاہنامہ فردوسی کا تلخیص ہے۔

اس کا بھی طرز عبارت مثل فسانہ عجائب کے مقفہ اور سجع ہے جو تاریخ کے لئے مناسب نہیں اس میں ایک
مقام پر جذبہ وطنیت کے جوش میں ہندوستانی بہت تعریف کی ہے جو قابل دید ہے (۲) ۱۸۷۷ء

میں "شعر عشق" جس میں بھوبال کے جنگلون کے کسی واقعہ کو بیان کیا ہے کہ ایک سارس کا بھڑا جسکی
محبت مشہور ہے ایک جنگل میں پھر باغھا کہ نہ کو کسی نے مار ڈالا۔ مادہ نے لکڑیاں جمع کیں اور اس کے اوپر

نہایت باقاعدہ طریقہ پر پی تو لگی غوغا (۳) اسی سال "شکوہ محبت" بھی لکھا گیا جس میں ہر چند کھتری کا
پیرانا قصہ نئے انداز سے بیان کیا ہے اور واجد علی شاہ کے سفر حکمتہ کا بھی بیان ذکر ہے (۴) "گلزار سرور"

جو ایک فارسی کتاب حدائق العشاق کا ترجمہ ہے جس میں ایک فسانہ کی صورت میں روح اور عشق کا مجاہدہ
دکھایا گیا ہے۔ یہ ایک مذہبی مضمون ہے جسکو مصنف نے اپنی خاص رنگین عبارت میں لکھا ہے اسی پر

مرزا غالب نے ایک دلچسپ تقریظ اسی رنگ یعنی مقفی عبارت میں لکھی ہے (۵) "شبستان سرور"
یعنی الف لیلہ کے چند قصوں کا دلچسپ ترجمہ جس میں جا بجا چیدہ اشعار داخل کر کے کتاب کو بہت دلچسپ بنا دیا

الف لیلہ کے ترجمے الف لیلہ کے قصے ہندوستان میں ہیشیہ سے مقبول رہے اور ان کا ترجمہ اکثر

لوگوں نے کیا ہے فیضی شمس الدین احمد نے ۱۸۷۳ء میں مدراس سے ایک ترجمہ نکالا جس کا نام
"حکایات الجلیلہ" ہے۔ یہیں صرف دو سورتوں کی حکایات ہیں اور مدراس کالج کے طلباء کے واسطے

یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ دوسرا ترجمہ منشی عبد الکریم نے ۱۸۷۴ء میں فارسی صاحب کی انگریزی الف لیلہ
سے کیا جسکی زبان استدر صاف اور سہل ہے کہ ادبی ذوق کے لوگ اسکو معیار سے گرا ہوا سمجھتے ہیں

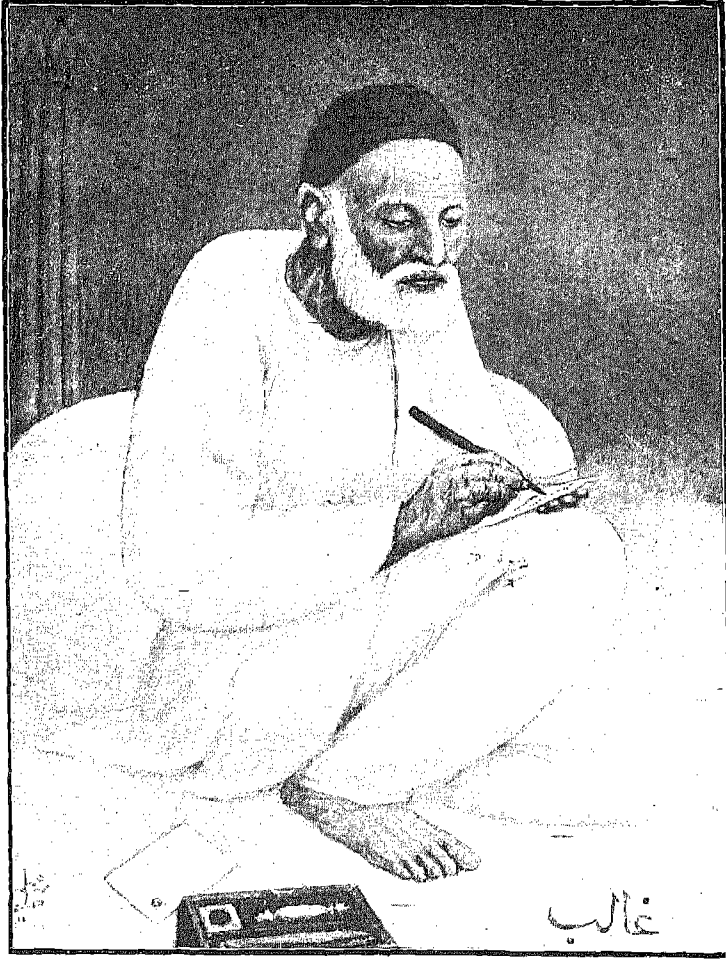
پھر ایک منظوم ترجمہ منشی نو لکشتور صاحب کی فرمائش سے ۱۸۷۶ء و ۱۸۷۷ء میں چار حصوں میں نیم دہلوی
منشی طوطا رام شایان اور منشی شادی لال چمن نے کیا جس کا ایک نثر کا ترجمہ منشی طوطا رام شایان نے ۱۸۷۷ء

میں نکالا۔ اس کے بعد ۱۸۷۹ء میں حامد علی نے ترجمہ کیا اور مرزا حیرت دہلوی نے ۱۸۹۲ء میں "شبان حیرت"

کے نام سے بطر زنادل ترجمہ کیا۔ (۶) شاہزادہ ایڈورڈ (جو بعد کو ایڈورڈ ہفتم ہوئے) کی شادی کے موقع پر سرور نے ایک تصنیف نامہ موسوم ”بہ نشر نشرہ“ لکھا۔ جس میں انگریزی حکومت کے فواید اور برکات نہایت عمدہ الفاظ میں بیان کیے ہیں (۷) انشائے سرور یعنی سرور کے خطوط جو انہیں کے خاص طرز میں ہیں۔

اردو نثاروں میں سرور کا مرتبہ آئین کوئی شک نہیں کہ قدیم طرز کے اردو نثاروں میں سرور کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اپنے طرز خاص میں وہ عظیم المثال ہیں۔ مگر یہ کہ جو ب زمانہ کارنگ بدلا اور کاروباری دود شریع ہوا تو اس قسم کی پر تکلف اور پر تصنع عبارت جسکے طویل جملوں اور قلیل عربی و فارسی الفاظ سے لوگوں کا جی اکتا گیا تھا اور موجودہ ضرورتوں کے اظہار کے لئے بھی وہ ناموزون تھی تاہم کی گئی۔ بہر طور سرور نے اپنا رنگ خوب برتا اور اس رنگ کے وہ بڑے ماہر تھے۔ انکی تمام تصنیفات میں لکھنؤ کے حالات اور یہاں کی سوسائٹی کے مرتعے خاص طور پر بہت دلچسپ ہیں۔ نشرین انکو اتنا شغف تھا اور اس میں وہ اتنے مشہور ہوئے کہ انکے دیگر کمالات یعنی انکی خوشنویسی انکی موسیقی دانی یہاں تک کہ انکی شاعری بھی اسکے سامنے فروغ نہ پاسکی۔ انکا دیوان مفقود ہے مگر ان اشارے سے جو انکی نشر کی کتابوں میں جا بجا ملتے ہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھی ضرور اعلیٰ درجہ کا ہوگا۔ سرور کو کہ لکھنؤ کے عاشقوں میں ہیں اور لکھنؤ ہی میں مگر پھر بھی انکے اشارے دلی کا تعلق معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ لکھنؤ کے تصنع اور مبالغہ سے وہ بری ہیں۔

غالب بحیثیت نثار عام لوگ غالب سے صرف بحیثیت ایک شاعر کے روشناس ہیں انکی نثاری کی حیثیت عام نظردوں سے پوشیدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فارسی اور اردو دونوں کے بے مثل نثار بھی اسی طرح ہیں جس طرح کہ بے نظیر و بے عدیل شاعر ہیں۔ انکی نثر اردو کی تصانیف زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں چند تقریظیں اور دیباچے ہیں اور تین مختصر رسالے یعنی لطائف غیبی تیغ تیز اور نامہ غالب جو ب برہان قاطع کے طرفداروں کے جواب میں لکھے گئے۔ اسکے سوا چند اجزا ایک نامہ تمام قسم کے بھی ہیں جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ مگر ان سب میں ان کے وہ خطوط جو اردو سے معلوم اور عود ہندی کے نام سے مشہور ہیں اور نیز وہ تقریظیں جو چند کتابوں پر لکھی ہیں نثار دو کا بہترین نمونہ



مرزا غالب کچھ تکریر فرما رہے ہیں

اور ان کے خاص رنگ کا آئینہ ہیں۔

اردو نے معلیٰ اور عود ہندی

سہ ماہ تک مرزا فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے جیسا کہ ان خطوط سے پایا جاتا ہے جو پنج آہنگ میں چھپے ہیں اور نیز بعض جگہ خطوط اردو میں بھی اسکا ذکر ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اردو میں خطوط لکھنا شروع کئے۔ ان کا رنگ بالکل مخصوص اور زمین پر نثار و دی کی ایک خاص طرز کی بنیاد قائم ہوئی۔ مگر جانتک خیال ہے کوئی شخص انکی پوری تقلید اور نقل میں کامیاب نہیں ہوا۔ پختہ بہت سی انشا اور رقعات کی کتابیں موجود ہیں اکثر مشہور لوگوں کے مکاتیب بھی شائع ہو چکے ہیں مگر غور سے دیکھا جائے تو مرزا کا رنگ سب سے علیحدہ ہے۔ اس میں کسی قسم کا تکلف اور تسنّع خشونت اور خشکی مطلق نہیں۔ عبارت کی روانی اور سلاست سے معلوم ہوتا ہے کہ قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں اور مضامین کی کثرت بہت دیتی ہے کہ ایک دریا کے مضامین اُٹا چلا آتا ہے۔ یہ ایک خاص صفت ہے کہ ہر حید عبارت حدود و حد کی بے تکلف اور روزمرہ ہے مگر ابتذال و ساقط نہیں بلکہ اس میں ایک ادبی شان ہے۔ بطور ہر فقرہ سے عیان اور ظرافت ہر جگہ کی تہ میں نہاں ہے۔ مرزا اکثر ایسے خیالات کا جن سے ان کا مکتوب البیہ موافق نہ بھی ہو اس جبارت اور صفائی سے اظہار کرتے ہیں جیسے کہ وہ جانتے ہیں کہ انکی تحریر کا زور اور انکا انداز بیان اس کی زبان بند کر دے گا بلکہ اسکو انکے دام محبت میں اسیر کر لے گا۔ انکی تحریر میں بالکل باتوں کا مزہ آتا ہے۔ اور بعض خطوط انہوں نے فی الواقع مکالمہ کی صورت میں لکھے ہیں۔ کسی میں کہ تو البیہ کو غائب فرض کر لیا ہو جس سے مکتوب البیہ کوئی دوسرا شخص معلوم ہونے لگتا ہے۔ قلم کی ایک جنبش سے وہ ایسی سحر آفرینی کر دیتے ہیں کہ دل مزے اٹھانے لگتا ہے۔ مرزا نے اپنے خطوط میں علاوہ ایک طرز خاص اختیار کرنے کے یہ جدت بھی کی کہ القاب و آداب کا فرسودہ طریقہ اور بہت سی اور باتیں جو عموماً خطوط میں لکھی جاتی ہیں مگر درحقیقت فضول و بیکار ہیں سب چھوڑ دیں۔ وہ پنج آہنگ میں لکھتے ہیں کہ خطوط نویسی میں میرا طریقہ یہ ہے کہ جب خط لکھنے کے لئے قلم کا غذا اٹھاؤ تو مکتوب البیہ کو کسی ایسے لفظ سے جو اس کی حالت کے موافق ہوتا ہے پکارتا ہوں اور اس کے بعد ہی مطلب شروع کر دیتا ہوں القاب و آداب کا پورا طریقہ اور شکر و شکوہ و شادی و غم کا قدیم رویت میں نے بالکل اٹھا دیا مثلاً ایہاں چہندونے

اُسی شان کے لکھے جاتے ہیں ”ابا ہا میرا پیارا ہمدی آیا آؤ بھائی فرخ تو اچھا ہے ٹھیکو سیدام لپ ہے
 دارالسرور ہے جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے“ ”آؤ میان سید زادہ آنلہ دلی کے عاشق دلدادہ
 طے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنؤ کو بڑا کتنے دلے...“ ”برخوردار نور چشم میر ہمدی کو
 بعد دعا حیات و صحت کے معلوم ہو بھائی تم نے تیار کو کیوں آنے دیا تب کو کیوں چڑھنے دیا۔ کیا بخار میرن صحت
 کی صورت میں آیا تھا کہ تم مانع نہ آئے...“ ”میری جان تو کیا کہہ رہا ہے بیٹے سے سیانا سودیوانا صبر و
 تسلیم تو کل دینا شیوہ صوفیہ کا ہے مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا“ ”سید صاحب اچھا ڈھکوسلا نکالا ہی
 بعد القاب کے شکوہ شروع کر دینا اور میرن صاحب کو اپنا ہزبان کر لیا۔“

یہاں ہم زکا کا ایک خط جو میر ہمدی کے نام پر تمام دکمال نقل کرتے ہیں تاکہ ہر زاکی وہ تمام خصوصیات
 سخن چین سے انکی تشریحی مثل نظم کے معجز نامعلوم ہوتی ہے بخوبی سمجھ میں آسکیں مثلاً خط سے القاب و آداب کا
 بالکل غائب ہونا اور بجائے اسکے ایک فرضی مکالمہ سے خط کا شروع کر دیا جانا۔ عبارت کی سادگی شوخی اور
 بے تکلفی۔ مذاق کے پیرایہ میں کچھ دوستانہ نصیحتیں بھی کرنا۔ جدید رنگ زمانہ یعنی جمہوریت پسندی کے برخلاف
 پرائیوٹ خط میں بھی ”ملکہ انگلستان“ کے پہلے لفظ ”جناب“ لکھنا جس سے ان کی حد درجہ کی قدامت پسندی
 اور تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔ ابتدائی چند سطروں کو جن سے خط شروع ہوتا ہے ہم مکملے کی صورت میں لکھے
 دیتے ہیں۔ غ سے غالب اور م سے میرن صاحب سمجھنا چاہئے۔

خط بنام میر ہمدی

غ۔ اے جناب میرن صاحب اسلام علیکم۔

م۔ حضرت آداب

غ۔ کہو صاحب آج اجازت ہے میر ہمدی کے خط کا جواب لکھنے کو۔

م۔ حضور میں کیا منع کرتا ہوں میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب مزید درست ہو گئے ہیں بخار جاتا رہا ہی
 صرف پیچش باقی ہے وہ بھی رنغ ہو جائیگی میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے لکھ دیتا ہوں آپ پھر کریں
 تکلیف کریں۔

غ۔ نہیں میرن صاحب اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خط ہوا ہو گا جواب لکھنا ضرور
م۔ حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں آپسے خط کیا ہونگے۔

غ۔ میان آخر کوئی وجہ تو بناؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو۔

م۔ سبحان اللہ سبحان اللہ اے حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہو
غ۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر ہمدی کو خط لکھوں۔

م۔ کیا عرض کروں سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور خط اٹھاتا اب جو
میں وہاں نہیں ہوں نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جائے۔ میں اب پختہ بننے کو روانہ ہوتا ہوں میری
روانگی کے تین دن کے بعد آپ خط شوق سے لکھنے لگے گا۔

غ۔ میان بیٹھو ہوش کی خبر لو تمہارے جانے سے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ میں پوڑا آدمی بھولا
آدمی تمہاری باتوں میں آگیا اور آج تک اس کو خط نہیں لکھا۔ (اس کے بعد مسلسل خط شروع ہوتا ہے)

لا حول ولا قوۃ سنو میر ہمدی صاحب میرا کچھ گناہ نہیں۔ میرے پہلے خط کا جواب لکھو تو رفع ہو گئی
پیش کے رفع ہونے کی خبر شتاب لکھو۔ پرہیز کا بھی خیال رکھا کرو۔ یہ جلدی بات ہے کہ وہاں کچھ کھانے کو

میتا ہی نہیں تھا اگر ہیز اگر ہو گا بھی تو عصمت بی بی اذیہ جاری ہو گا۔ حالات یہاں کے مفصل
میرن صاحب کی زبانی معلوم ہونگے۔ دیکھ بیٹھے ہیں کیا جانوں حکیم میرا شرف میں اور ان میں کچھ کونسل

ہو تو رہی ہے۔ پختہ بننے روانگی کا دن ٹھیرا تو ہے اگر حل نکلیں اور پہنچ جائیں تو اُن سے یہ پوچھو کہ جناب
ملکہ انگلستان کی سالگرہ کی روشنی کی محفل میں تمہاری کیا گت ہوئی تھی اور یہ بھی معلوم کر لیجیو کہ یہ جو

فارسی مثل مشہور ہے کہ فتر را گاہ و خور را سکے معنی کیا ہیں۔ پوچھو اور نہ چھوڑو جب تک نہ تباہی نہ آتی
پہلے تو آندھی چلی پھر منہ آیا اب پیچھے برس رہا ہے۔ میں خط لکھ چکا ہوں سرنامہ لکھ کر چھوڑ دگا۔ جب ترشح

موقوف ہو جائیگا تو کلیان ڈاک کو لجا بیگا۔ میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے اللہ اللہ تم پانی پیت کے
سلطان العلماء اور مجتہد العصر بن گئے۔ کہو وہاں کے لوگ تمہیں قبلہ و کعبہ کہنے لگے نہیں یہ نصیر الدین کو خط

اس کاٹ چھانٹ سے قدما کی طویل اور غیر دلچسپ طرز تحریر کی درستی ہو گئی اور یہ ایک نیا سیت

عمرہ جدت کی مثال قائم ہو گئی جس سے اردو خطوط نویسی پرانے تکلف و تصنع اور بے موقع اظہار علمیت سے آزاد ہو کر نہایت شیریں اور دلچسپ بن گئی ہر چند کہ یہ اختراع ان کے معاصرین کو پسند نہ آیا مگر جن جن زمانہ بدلتا گیا اور وقت گزرتا گیا اب لوگوں کو اس کی اہمیت کا حضور احساس ہو اور ہر طرف اس کی تسبیح پیدا ہو گئی۔ مولانا حالی سرسید مولوی ذکا، اللہ مولانا محمد حسین آزاد اور ان کے علاوہ دیگر اربابِ مسلم مثلاً امیر مینائی اکبر وغیرہ نے بھی سادگی عبارت کو پسند کیا اور اپنے اپنے طریق پر شیریں لکھیں مگر حق یہ ہے کہ مرزا کی سادگی و دلکشی شوخی و ظرافت جذبات نگاری اظہارِ مافی الضمیر میں کوئی ان کا مد مقابل نہ ہوگا ان کے رفقات کی ایک تین خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ان کے حالات زندگی کے مصنف اور قلم آئینہ بین یہاں تک کہ اگر کوئی شخص یہ زحمت گوارا کرے کہ ان کے خطوط کو تاجِ تحریر کی ترتیب سے جمع کرے اور ان کے وہ حصے جو مرزا کے حالات زندگی کے متعلق ہیں علیحدہ کرنا جائے تو مرزا کی ایک مختصر خود نوشتہ سوانح عمری اُسے مرتب ہو جائیگی۔ یہ خطوط ان کی زندگی اور جزئیات زندگی کی تصویریں ہیں ان سے جات احباب اور معاصرین سے تعلقات کے متعلق ان کے فطریے اور محصر اور قدیم شعرا کے متعلق ان کے خیالات سب بخوبی اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ بعض کو بڑا کمر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی غرض اصلی مکتوب الیہ کے حل کو خوش کرنا اور اس کا غم غلط کرنا ہے۔ ان کا مذاق ظرافت بھی سب نرالا ہے۔ اردو نظم میں تو اس کا جواب ہی نہیں اہل یورپ میں بھی اس قسم کی لطیف ظرافت مفقود ہے فریخ شاعر والیئر اور انگریزی نثار زمین سولینٹ اپنے اپنے طرز میں ایک خاص رنگ ظرافت رکھتے ہیں مگر مرزا ان سب علیحدہ ہیں والیئر کی طرح انہیں نقالی اور سولینٹ کی طرح ان میں تیزی اور دل آزاری نہیں ہے ان کی ظرافت کی لطافت اور نزاکت کا پرتو ایسے میں کچھ کچھ پایا جاتا ہے مرزا کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے نثر اور کوشکی اور بد مزگی کے الزام سے بچا لیا۔

مرزا کا قدیم رنگ یعنی مقفی اور سجع عبارت مرزا ہر چند خطوط میں سادگی اور سلاست عبارت کے دلدادہ تھے۔ مگر رواج زمانہ کے موافق احباب کی کتابوں پر تقریظیں اُسی پرانے انداز میں لکھتے تھے۔ اس کی وجہ مولانا حالی کی زبان سے سننا چاہیے وہ کہتے ہیں مرزا کو اس میں معذور سمجھنا چاہئے۔ جو لوگ

تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرنے والے تھے وہ بغیر ان تکلفات بارودہ کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانہ میں یو یو لکھنے کا نمکلا ہے اس کو اب بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں اور مرزا کے وقت میں تو اس کا کہیں نام و نشان ہی نہ تھا۔ یہاں انکی دو تقریظوں کی کچھ عبارت بطور نمونہ دی جاتی ہے تاکہ اس رنگ میں بھی ان کا انداز تحریر بخوبی معلوم ہو سکے۔ (۱) مرزا رجب علی بیگ سرور کی گلزار سرور کی تقریظ۔ ”سبحان اللہ خدا کی کیا نظر فرور صنعتیں ہیں تعالیٰ اللہ کیا حیرت آور قدرتیں ہیں یہ جو ”صالح العشق“ کا فارسی زبان سے عبارت اردو میں نگارش پانا ہے ارم کا بین دنیا سے اٹھکر بہارستان قدس کا ایک باغ بنجا ہے۔ وہاں حضرت رضوان ارم کے خلیفہ و آریا رہے یہاں مرزا رجب علی بیگ سرور صالح العشق کے صحیفہ نگار ہوئے۔ اس مقام پر یہ بھی پتہ چلے جو موسوم بہ اسد اللہ خان اور مخاطب بہ نجم الدولہ اور مخلص غلاب ہے خداے جہان آفرین سے توفیق کا اور خلق سے انصاف کا طالب ہے ان اے صاحبان فہم و ادراک سرور سحر بیان کا اردو کی نشر میں کیا پایہ ہے اور اس بزرگوار کا کلام شاہد معنی کیو اسطے کیسا گلزارن ہا پیرایہ جو۔ مجھ کو دعویٰ تھا کہ انداز بیان اور شوخی تحریر میں فسانہ عجائب بے نظیر ہے جس نے میرے دعویٰ کو اور فسانہ عجائب کی کیا کی کو مٹا دیا یہ وہ تحریر ہے.....“

(۲) مفتی میر لعل کی کتاب ”سراج المعرفت“ کی تقریظ۔ ”حق یون ہے کہ حقیقت از دی مثال اکثامہ در ہم پیچیدہ سرستہ ہے کہ جسکے عنوان پر لکھا ہے لا مؤثر فی الوجود الا اللہ اور خط میں مندرج ہے لا موجود الا اللہ اور اس خط کا لائن والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ آور اور نام آور ہے کہ جس پر رسالت ختم ہوئی ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنی غامض کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں۔ آثار الی انفعالی صفاتی ذاتی انبیاء پیشین صلوات اللہ علیہم اعلیٰ بنیا و علیہم اعلان مدارج سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیاء کو حکم ہوا کہ حجاب تعینات اعتباری کو اٹھا دیں اور حقیقت بے رنگی ذات کو صورت الاکن کما کان میں دکھا دیں اب گنجینہ معرفت خواص امت محمدی کا سینہ ہے اور کلمہ لا الہ الا اللہ منقول باب گنجینہ ہے۔.....“

ایک بہت بڑی تحریک جو ہر چند ادبی نوعیت نہیں رکھتی تھی کتب درسا کی اسلامی سے اردو کو تقویت

اگر اس سے بلاشبہ نغراؤ کو بہت فائدہ پہنچا اور اسکی تقویت کا باعث ہوئی مولوی سید احمد شہید بریلوی اور انکے بزرگ استادوں یعنی مشہور و معروف شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کے زمانہ میں اشاعت ہوئی اور دہلیت کی صورت میں رد نہا ہوئی جسکی وجہ سے تبلیغ دین کی غرض سے مختلف کتب و رسائل عوام الناس کے فائدہ کو واسطے صاف اور سہل زبان میں لکھے گئے۔ یہ خیال برابر زور پکڑتا اور قوت حاصل کرتا گیا اور گو اصل تحریک جو مولوی صاحب موصوف نے اٹھائی تھی انکی وفات کے بعد امتداد و زامہ سے دہلی بھی مگر مشہور راہبر قوم سر سید احمد خان کے تمام تعلیمی معاشرتی مذہبی اور سیاسی اصلاحات کی وہی روح روان تھی۔ سید صاحب اور انکے رفقاء کے کار کے جدید اصولوں کی اشاعت نے گو ملک میں اسوقت بہت بچپنی اور مخالفت پیدا کر دی تھی اور اختلافات کی آندہ ہی سے ملک کی فضا گردا گرد مگر گئی تھی مگر جتنے کتب و رسائل ان مسائل کی موافقت و مخالفت میں لکھے گئے ہر چند کہ وہ مذہبی رنگ کے تھے مگر چونکہ وہ سب صاف اور سلیس زبان میں ہوتے تھے اسوجہ سے زبان کو اس یقیناً بہت کچھ تقویت ملی۔

مولوی سید احمد شہید علیہ السلام میں پیدا ہوئے اور شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر صاحب ایسے بزرگوں سے علوم و دینیہ کی تکمیل کی جنہوں نے بعد کو تو سب کی صورت اختیار کر لی تھی۔ چونکہ بڑے قابل اور فصیح شخص تھے لہذا انکی تقریریں اور وعظ سن کر لوگ بکثرت ان کے مرید ہو گئے تھے۔ اپنے اصول کی تبلیغ پہلے دلی میں مکمل کر کے سلطانہ میں کلکتہ گئے اور وہاں سے سلطانہ میں حج بیت اللہ کی زیارت کے روانہ ہو گئے۔ وہاں کچھ دنوں قیام کر کے قسطنطنیہ چلے گئے۔ اور چھ برس تک ٹرکی کی سیر و سیاحت اور نیز اپنے ہجالیوں کی جماعت پیدا کرتے رہے جب دلی واپس آئے اور یہاں کے مسلمانوں کے

مصنف صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ جو تحریک مذہبی بصورت اشاعت و ہدایت مولوی سید احمد شہید کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی اور جو ترمیمیں اور تاویلین مذہب میں سر سید مرحوم نے پیش کیں یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں اسوجہ سے کہ وہ بیرون کے اصول کے مطابق جملہ احکام شریعت میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر بلا کسی توجہ اور تاویل کے عمل واجب ہے اور سر سید مرحوم اپنے معتقدات اور اصولوں کے ثابت کرنے میں دلائل عقلی اور تاویلات سے بہت کچھ کام لینا چاہتے تھے جو عقائد و بابہ کے بالکل منافی ہے۔

عقاید کا دیگر مالک کے لوگوں سے مقابلہ کیا تو نسبتاً زمین و آسمان کا فرق پایا۔ اور اسی سے ان کے دلیمن اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ چونکہ آدمی پر جوش تھے لہذا اشاعت دین کے متعلق ان کے جوش کی کوئی انتہا باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ پہلے سکھوں سے انہوں نے جہاد کا اعلان کیا اور ۱۸۳۷ء میں مولوی اسماعیل کو ساتھ لیکر لٹاؤر کی طرف روانہ ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے مریدوں اور معتقدوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی۔ اور اکثر امرا اور مشاہیر نے جو ان کے معتقد اور ہم خیال تھے اس مذہبی کام کے واسطے کافی روپیہ سے ان کی مدد کی تھی۔ ۱۸۳۷ء میں اپنے اس مشن میں ان کو اتنی کامیابی ہو گئی تھی کہ پورا پٹشاور ان کے قبضہ میں آ گیا تھا۔ لیکن بعد ازاں کے اصولوں کی سختی دیکھ کر افغانوں نے جنھوں نے ان کو مرد دینے کا وعدہ کیا تھا، اسے برفانی کی۔ یہ حالت دیکھ کر وہ دریائے انکاک کے کنارے پار پٹنہن جا چھپے۔ جہاں ۱۸۳۷ء میں سکھوں کے ایک دستہ سے جبکہ سردار شیر سنگھ تھا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے قرآن شریف کی تفسیر موسوم بہ تفسیر عزیزی فارسی میں لکھی جبکہ اب ترجمہ اردو میں ہو گیا ہے۔ اور ان کے بہائی شاہ عبدالقادر صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ اردو میں کیا۔ جو ۱۸۳۷ء میں ختم ہوا اور ایک شخص سید عبداللہ نامی نے جو مولوی سید احمد مذکور کے مرید تھے ۱۸۳۹ء میں مقام تہنگلی اسکو چھپوایا۔ اس طرح مولوی سید احمد صاحب کی کتاب تزیلہ لغافلین جو اصل میں زبان فارسی میں تھی اسکا بھی اردو ترجمہ انہیں مولوی عبداللہ نے ۱۸۳۳ء میں تہنگلی سے شائع کیا۔ مولوی اسماعیل صاحب مشہور رسالہ تقویۃ الایمان اور نیز دیگر مریدان مولوی سید احمد کی تصانیف مثلاً ترغیب جہاد۔

ہدایۃ المؤمنین نصیحۃ المؤمنین موضح الکبائر والبدعات۔ مائتہ مسائل وغیرہ یہ سب اسی زمانہ کی کتابیں ہیں جو اصل میں اشاعت دین کی غرض سے لکھی گئی تھیں مگر جن سے زبان اردو کو بھی ضرور تقویت پہنچی۔

چھاپہ کی ابتدا منجملہ ادرا سب کچھ چھاپے نے بھی اشاعت و ترقی زبان میں بہت بڑی مدد دی اور قدیم حالت میں ایک بہت بڑا تغیر پیدا کر دیا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ایک چھاپہ خانہ کھل گیا تھا جس میں ڈاکٹر گلکرسٹ اور کالج کے کشیدوں کی تصانیف خود ڈاکٹر گلکرسٹ کے اہتمام میں چھپ کر تیار ہوتی تھیں۔ مگر ان کی تیاری میں اس قدر روپیہ خرچ ہوتا تھا کہ آخر کار یہ مطبع بند کر دینا پڑا اور

ڈاکٹر گلکرسٹ کی بعض کتابیں بھی یہاں نہ چھپ سکیں۔ اسکے علاوہ اس زمانہ میں جو ٹائپ کے حروف
 مروج تھے وہ بھی نہایت بد نما اور بہدے تھے۔ اسی زمانہ میں سیرام پور واقعہ بنگال کے پادریوں نے بھی
 ایک چھاپہ خانہ کھولا تھا جس میں مختلف ہندوستانی زبانوں کی کتابیں چھپتی تھیں ۱۸۳۷ء میں اس چھاپہ
 خانہ میں آگ لگ گئی اور اکثر کتابیں جل کر خاک ہو گئیں ۱۸۳۷ء میں ایک لیتھوگراف چھاپہ خانہ دلی میں
 قائم ہوا جس نے اشاعت کتب کو بہت آسان کر دیا۔ یہیں پولی کتابوں کے ساتھ ساتھ انگریزی اور دیگر
 غیر ملکی زبانوں کے تراجم یا اور کتابیں اور رسائل مختلف مضامین پر طبع ہوتے تھے۔ غازی الدین حیدر
 کے عہد میں لکھنؤ میں بھی بہت صرف سے اور تکلف کے ساتھ ایک مطبع ٹائپ کھولا گیا تھا جس میں سب سے
 پہلے ہفت قلم چھپتی تھی دوسری کتابیں جو اس مطبع سے نکلیں حسب ذیل ہیں۔ مناقب الہیدریہ زبان عربی
 ۱۸۱۹ء میں۔ محامد حیدری فارسی میں ۱۸۲۷ء میں دیونون کتابیں غازی الدین حیدر کی تحریف
 میں ہیں۔ گلدستہ محبت حسین نواب گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز اور غازی الدین حیدر کی ملاقات کا
 حال فارسی میں ہے۔ پنج پورہ بخط طعرا تاج اللغات جو ایک عربی کی لغت زبان فارسی میں ۱۸۲۷ء
 میں ایک انگریز مسٹر آرچر جہنوں نے ایک لیتھوگراف چھاپہ خانہ کانپور میں کھولا تھا نصیر الدین حیدر کے حکم
 سے لکھنؤ آئے اور یہاں بھی ایک مطبع جاری کیا۔ ایک اور مشہور کتاب جو اس زمانہ میں لکھنؤ میں چھپی وہ
 ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ تھی جسکو لارڈ بروہم نے سائنس کے فوائد اور اعمال پر تصنیف کیا تھا۔
 اس کا ترجمہ سید کمال الدین حیدر معروف بہ سیر محمد علی لکھنؤی نے اسکول بک سوسائٹی کلکتہ کی فرائض
 سے کیا اور مطبع سلطانی میں ۱۸۳۷ء میں چھپا۔ یہ ترجمہ نہایت صاف اور سلیس اردو میں ہے۔ سب سے
 پہلی کتاب جو لکھنؤ میں لیتھوگراف چھپی شرح الفیہ تھی ۱۸۳۷ء میں تقریباً بارہ چھاپے خانے لیتھوگراف لکھنؤ
 میں موجود تھے جن میں مطبع میر حسن اور مطبع مصطفائی بہت مشہور ہیں۔ ۱۸۳۷ء میں منشی کمال الدین حیدر
 مذکور نے جو رصدا خانہ شاہی کے منشی تھے بادشاہ کی خوشنودی مزاج کے واسطے خاندان شاہی کی تاریخ
 لکھنا شروع کی مگر کچھ باتیں بادشاہ کو پسند نہ آئیں جسکی وجہ سے رصدا خانہ توڑ دیا گیا اور کتاب کی طباعت
 بھی روک دی گئی اور بہت سے اہل مطبع کانپور چلے گئے۔ مطالع کی تاریخ میں سب سے اہم واقعہ اس عہد کا

یہ ہے کہ لکھنؤ میں منشی نوکشور صاحب نے اپنا مشہور مطبع جاری کیا جسکی بدولت پڑائی پڑانی فارسی و عربی و نیز سنسکرت و ہندی کی وہ کتابیں چھپیں جس میں ہندی کی کتابیں پڑی تھیں اور اگر شائع نہ ہوتیں تو معدوم ہو جاتیں۔ اس مطبع نے علم کے محدود دائرے کو وسیع کر دیا اور اس کے فوائد ملک کے تمام طبقوں کو یکساں طور پر پہونچائے تعلیم و تعلم کی ارا زائی ہو گئی اس میں حدیث و تفسیر قرآن شریف و ترجمہ فقہ اصولی و غیرہ جملہ علوم اہل اسلام و نیز دیگر پان بیدک و غیرہ علوم اہل ہندو کیساں طور پر نہایت فراخ دلی سے شائع کئے گئے۔ قرآن شریف کے مترجم چھپنے سے لگوں کو اس کے مطالب سے آگاہی ہوئی اور اس سے وہی فائدہ مسلمانوں کو ہوا جو بائبل کے ترجمہ سے مسیحیوں کو پہونچا تھا۔

رسائل و جرائد و اخبارات طباعت کی آسانی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ رسائل و جرائد اور اخبارات زبان اردو میں بہ کثرت جاری ہوئے جس سے پبلک کے معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا اور انکو دنیا بھر کی خبریں بے تکلف معلوم ہونے لگیں۔ ہندوستانی اخبارات سے جو سبق میں چھپنے لگے پبلک کے لئے تمدنی و اقتصادی معلومات کا ایک دروازہ کھل گیا اور تقریباً ہر ایک راہن فرخ ہو گئے۔ اور مضمون نویسی کو علاوہ تو وسیع زبان کے یہ موقع بھی ملا کہ اپنی زبان کو یورپی مضامین اور طرز کے موافق ڈالیں۔ مثلاً عربی میں بجائے فارسی کے اردو سحرکاری زبان قرار پائی جس سے اسکا نہ صرف مرتبہ بڑا بلکہ عربی و فارسی کے وہ سب الفاظ اور مصطلحات جو اب تک اس زبان میں رائج تھے اردو زبان میں منتقل ہو گئے اور رواج پا گئے۔ مغربی تمدن کے اثر نے بھی زبان کو طرح طرح کے فوائد سے مالا مال کیا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ فارسی کی تقلید میں جو عبارت اور لفظوں پر زور دیا جاتا تھا وہ طریقہ متروک ہو کر زبان صاف اور سادہ ہوئی اور بجائے الفاظ کے نفس مطلب اور مضمون پر زور دیا جاتا لگا۔ اسکے علاوہ وہ درسی کتابیں جو تعلیمی ضرورت سے انگریزی یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کی گئیں انکا ترجمہ سوائے صاف اور سادہ زبان کے پیچیدہ عبارت میں ہو بھی نہیں سکتا تھا لہذا صاف اور سلیس عبارت میں ترجمہ کی گئیں۔ چنانچہ کلکتہ اور لاہور میں جو انگریزی کتابوں کے ترجمے کئے گئے وہ سب اسی قبیل کے تھے۔ اولاً اردو فارسی سے بے نیاز ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئی۔ اس اصلاح کو سر سید ایسے قابل بزرگ کے مساعی ہمید نے بہت تقویت پہونچائی۔ یہ انیسویں صدی کے نصف

آخرین ہندوستان کی ایک بزرگ تہق اور مسلمانوں کے ایک بہادر و مصلح عظم تھے جن کا کچھ مختصر حال آگے لکھا جاتا ہے۔

سید احمد خان ^{۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۷ء} جواد الدولہ عارف جنگ سرسید احمد خان بہادر۔ کے۔ سی۔

ایس۔ آئی۔ ہندوستان کے مشہور لیڈر اور ایک فصیح البیان اور جلیل القدر مصنف فلسفی و فیاض اور مدبر تھے۔

ان کی قابلیت ان کی ہر دلعزیزی اور ان کی مقناطیسی قوت کے اثر سے بہت سے قابل قابل اہل علم و فضل ان کے گرد جمع ہو گئے تھے جس کے ادبی کارناموں سے نہ صرف ادب اردو و مالال ہوا بلکہ وہ ایک طرز خاص کے موجود ہوئے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے طرز زندگی اور معاشرت پر ان کی مساعی جمیلیہ کا بہت گہرا اثر پڑا چونکہ سید صاحب کی زندگی مختلف شعبوں اور شاغل منقسم ہے لہذا ان سے سب سے قطع نظر کر کے ہم یہاں ان کا ذکر صرف ایک ادیب اور قومی لیڈر کی حیثیت سے کرتے ہیں۔

سید مرحوم دلی میں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہ خاندان علم و تربت اور اعزاز کے لحاظ سے ایک مشہور خاندان تھا۔ ان کے آبا و اجداد جو ابتداً عرب کے رہنے والے تھے دامن آئے اور وہاں کچھ دنوں قیام کر کے بہمان اور ہرات پہنچے۔ ان کے بزرگ شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور یہاں عہدہ جلیہ پر ممتاز ہوئے۔ عالمگیر ثانی نے سید صاحب کے دادا کو جواد الدولہ کا خطاب یا تھا جو حسن اتفاق سے خود سید صاحب کو بھی عنایت ہوا۔ سید صاحب کے والد میر تقی ایسے فاضل بزرگ تھے کہ کہا جاتا ہے جب اکبر شاہ ثانی نے انکو عہدہ وزارت پر ممتاز کرنا چاہا تو انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔ سید صاحب کی والدہ نے جن کا نام عزیز النساء بیگم تھا، جو ایک روشن دل خاتون تھیں، سید صاحب کی پرورش کی، اور انکو زمانہ کی ضروریات کے موافق تعلیم دلائی۔ سید صاحب نے خوش نصیبی سے ایسا زمانہ پایا تھا جس میں غالب صہبائی آکر زردہ شیفہ، مومن وغیرہ کی طرح کے زندہ دل ارباب کمال موجود تھے۔ مرزا غالب اور سید صاحب میں اس قدر ارتباط تھا کہ سید صاحب ان کو چچا کہتے تھے۔ ۱۸۳۸ء میں سید صاحب دلی میں بہمدہ ششتر داری مقیم ہوئے اور یہ ان کے پہلی ملازمت تھی۔ ۱۸۳۹ء

میں نائب دینشی اور ۱۸۴۸ء میں امتحان منصفی پاس کر کے منصف ہوئے۔ ۱۸۵۲ء سے ۱۸۵۵ء تک دہلی کے صدر امین رہے اور اسی زمانہ میں اپنی مشہور و معروف کتاب آثار الصنادید لکھی۔ حسین دہلی کے مشہور مقامات اور آثار قدیمہ اور نیر اپنے زمانہ کے دہلی کے تمام کاملین اور فقرا، علما اور شعراء و غیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کی اتنی شہرت ہوئی کہ اس کا ترجمہ انگریزی میں ہوا اور فرینچ میں گارسن ڈی لائی نے ترجمہ کیا جو ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا۔ سید صاحب نے ۱۸۵۲ء میں ایک کتاب موسوم بہ "حجرات القلوب" حسین انصاف صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا حال ہے ۱۸۵۲ء میں "تحفہ حسن" ۱۸۵۴ء میں "تحصیل فی جرح السایل" (ترجمہ معیار العقول) ۱۸۵۴ء میں "خواہد الا انکار" اور "قول امین"۔ ۱۸۵۹ء میں کلمۃ الحق ۱۸۵۹ء میں راہ سنت۔ ۱۸۵۶ء میں سلسلہ ملوک ہند حسین دہلی کے بااثران کے مختصر حالات راجہ جہت شہر کے وقت سے لکھے ہیں۔ اور ۱۸۵۷ء میں ترجمہ کیا "سعدت تصنیف کین ۱۸۵۷ء میں سید صاحب بخیر متقل ہو گئے جہاں انہوں نے تاریخ مجبور لکھی۔ آئین الہبری کی تصحیح و تفسیر کا فخر بھی سید صاحب کے حاصل ہے۔ مسٹر بلاکسین جنہوں نے آئین الہبری کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے سید صاحب کی کاوش کے معروف اور اچھی تصحیح کے متوفی ہیں ۱۸۵۷ء یعنی سال غدر میں سید صاحب نے مختلف طریقوں سے امداد کی۔ اور جب انکو ایک علاقہ ان کی خدمات کے صلے میں پیش کیا گیا تو انہوں نے اسے لینے سے انکار کر دیا ۱۸۵۷ء میں انہوں نے اپنا مشہور مفلط اسباب بجاوت ہند تصنیف کیا جو ۱۸۵۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ایک اور کتاب "وفادار مسلمانان ہند" کے نام سے شائع کی۔ برنی کی "تاریخ فیروز شاہی" کی ایٹاٹک سوسائٹی کی فرمائش سے تصحیح کی ۱۸۵۷ء میں انکی تفسیر بائبل موسوم بہ "تبیین الکلام" شائع ہوئی جس کو قدیم روش کے مسلمانوں نے ناپسند کیا اور اسپرکنتہ حبشی کی مگر ایلو پ نے اسکی بڑی قدر کی ۱۸۶۱ء میں سید صاحب بد لکھ غازی پور آئے جہاں سائنٹیفک سوسائٹی کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس سوسائٹی کے قیام کی غرض یہ تھی کہ مشہور اور مستند انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے تاکہ اہل اسلام یورپ کے خیالات اور وہاں کے تمدن سے واقف بن سکیں۔ آف آرگائیل جو اس زمانہ میں سکریٹری آف اسٹیٹ ہند تھے اس سوسائٹی کے ممبری (پیشین)۔

اور لفٹننٹ گورنران پنجاب و بنگال اس کے وائس میٹرن بنائے گئے۔ ایک زمانہ میں یہ سوسائٹی بہت مشہور و مقبول تھی اور اسکے ممبران نے نہایت عمدہ عمدہ رسالے مختلف مضامین مثلاً تاریخ یوگرانی زراعت و فلکات اقتصادیات پر لکھے۔ ۱۸۶۶ء میں وہ علیگڑھ آئے اور ان کے ساتھ سوسائٹی بھی منتقل ہو کر آگئی۔ ۱۸۶۷ء میں انہوں نے ایک انگریزی اسکول مراد آباد میں اور ۱۸۶۸ء میں اسی طرح کا ایک اسکول غازی پور میں قائم کیا تھا اور مختلف مقامات میں انگریزی تعلیم کے فوائد اور برکتوں پر لکھ کر دئے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں انہوں نے ایک انجمن قائم کی جس کا نام برٹش انڈین ایسوسی ایشن تھا۔ اور نیز اپنی سائنٹفک سوسائٹی کا ایک ماہوار رسالہ "علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" کے نام سے نکالا جس میں وہ خود بھی مختلف قسم کے مضامین پر کچھ نہ کچھ لکھتے تھے۔ انگریزی اخباروں کے بھی اچھے اچھے مضامین اس میں ترجمہ کر کے شائع کیے جاتے تھے۔ ۱۸۶۸ء میں انکا بنارس کو تبادلہ ہو گیا۔ مگر ان کے ادبی اور علمی کاموں میں اس سے کسی قسم کا حرج واقع نہیں ہوا۔ اسی عرصہ میں انہوں نے ایک ہندوستانی یونیورسٹی قائم کرنے کی بھی کوشش کی تھی اور گورنر جنرل کو اس مضمون کا ایک میموریل بھی بھیجا تھا اور ان کے اس خیال کے ساتھ ہمدردی بھی ظاہر کی گئی تھی۔ ۱۸۶۹ء میں رسالہ "احکام طعام باہل کتاب" تصنیف ہوا جس سے مذہبی لوگوں میں ایک قسم کی شورش پیدا ہو گئی اور شدید صاحب ان بات کو بھی دھڑکے سے بدنام ہو گئے۔ ۱۸۶۹ء میں اپنے بیٹے سٹر محمد کے ساتھ (جو بعد کو الہ آباد ہائیکورٹ کے جج ہو گئے تھے) ولایت گئے اور اہل دیوبند کے طرز معاشرت اور اخلاق و عادات اور نیز ان کے سیاسی اور تعلیمی انتظامات کا مطالعہ خوب کیا۔ اسی زمانہ میں سر ولیم میمور کی مشہور کتاب "لائف آف محمد" (سوانح عمری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک دلیل لے کر انہوں نے لکھا اور نیز مسلمانوں کے واسطے ایک رہنمائی کالج ولایت کے افسر پورہ اور کیمبرج کالجوں کے انداز پر ہندوستان میں کھولنے کا خیال پیدا ہوا۔ ولایت میں انکو سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا اور ۱۸۷۰ء میں ہندوستان واپس آئے۔ یہاں آکر انہوں نے اپنا مشہور و معروف ماہوار رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا جس کے مطالعہ سے مسلمانان ہند کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوا اس سے مسلمانوں کو وہی فوائد پہونچے جو اڈیسن اور ٹیل کے رسایل ٹیلیگراف اور "اسپیکٹٹر" سے



جواد الدولہ عارف جنگ سر سید احمد خان بہادر ایل ایل ڈی



نواب اعظم يار جنگ مولوي چراغ علي

اہل انگلستان کو حاصل ہوئے تھے اس کے جاری کرینکی بغرض تھی کہ مسلمانوں کے خیالات علی الخصوص
 مذہبی خیالات میں وسعت اور ترقی پیدا ہو اور وہ مغربی علوم کی طرف مائل ہوں جس سے ان کے تمام معاشرتی
 اور تمدنی معاملات میں ضرور اصلاح ہو جائیگی۔ اس میں مختلف قسم کے مضامین مذہب معاشرت اور تعلیم پر
 لکھے جاتے تھے اور لکھنے والے خود سرسید نواب حسن الملک نواب وقار الملک اور مولوی چراغ علی
 ایسے بزرگ تھے جو اپنے خیالات کو نہایت صفائی اور آزادی کیساتھ ظاہر کر دیتے تھے۔ اس رسالہ کی
 یہ بڑی کوشش تھی کہ مسلمانوں کے دل سے یہ غلط خیال کہ اسلام علوم و دنیاوی اور اصلاح کا دشمن یا مخالف
 ہے نکلی جائے اور ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ کن اسباب سے اس قسم کے خیالات ان کے پیش روؤں کے دل میں پیدا
 ہو گئے تھے۔ وہ نقصان پہنچانے والے اور تکلیف دہ رسوم و قیود کو ترک کریں۔ وہ اپنے افلاس اہل بار کا
 احساس کریں اور کٹھ ملاؤں کے پنجہ سے نجات پا جائیں۔ اسی زمانہ میں ایک تفسیر قرآن بھی سید صاحب نے
 تصنیف فرمائی جسکی چھ جلدیں شائع ہوئیں۔ مگر یہ نصف قرآن تک پہنچی۔ پہلی جلد ۱۲۹۷ھ میں طبع
 ہوئی تھی۔ اس تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہت سی باتیں ہیں جو قرآن شریف میں ہے بائبل
 کے قصص سے روشنی ڈالی گئی ہے جہاد۔ دونوں دہشت سراج وغیرہ پر جو دیگر اقوام نے اعتراضات اور
 نکتہ چینان کی ہیں انکا شافی جواب دیا گیا ہے بعض دیلات اور ضعیف وغیرہ مستند احادیث سے احتراز کی ہدایت
 کی گئی ہے اور جو شکوک کہ علوم وادی کے پڑھنے سے قرآن کی الہامی کتاب ہونے میں پیدا ہوتے ہیں وہ رفع
 کئے گئے ہیں۔ مگر ان دونوں چیزوں سے قدیم روش کے مذہبی پیرو سید صاحب کے سخت مخالف ہو گئے
 انکو کافر۔ لمحہ پنچری کے خطابات دیے گئے۔ اکثر اخبارات اور رسائل صرف اسی غرض سے جاری
 کئے گئے کہ سید صاحب اور ان کے جدید خیالات کا خاکہ اڑایا جائے اور دوسرے مشہور طریق اخبار اور دھپنچ
 میں ان کے کارٹون نکلے اور مسخر آمیز مضامین نظم و نثر ان کے نسبت لکھے گئے۔ مگر سید صاحب اپنے شاغل
 میں مگرم رہے اور اس مخالفت کا اپنے مطلق اثر نہ پڑا۔ آخر عمر میں انکو سوائے اپنے محبوب کالج کی ترقی
 کے اور کوئی خیال نہ تھا۔ ۱۸۷۷ء میں وہ سرکاری ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے اور بقیہ عمر تعلیمی اور
 سیاسی مشاغل میں گزاری۔ بالآخر ۱۸۹۱ء میں ایک طویل عمر پا کر اور ایک کامیاب زندگی بسر کر کے

اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور تمام ہندوستان کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے۔

سید صاحب کا طرز تحریر یقیناً سید صاحب اردو جراید نگاروں میں ایک بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کا قلم بہت زبردست اور ان کا تبحر علمی بہت اعلیٰ تھا۔ ان کا طرز تحریر زور دار مگر صاف اور سادہ ہے۔ سہین کسی قسم کی عبارت آرائی نہیں ہے۔ کچھ غلطیاں بھی سہین نکلیں گی مگر سید صاحب قواعد صرف و نحو کی پابندی کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے وہ مقررہ قواعد انشا پر دازی سے بالکل بے نیاز تھے۔ مگر یہی چیز ان کی شہرت اور قابلیت کو نقصان پہنچانے کے بجائے اس میں اور اضافہ کرتی تھی۔ ان کے طرز جذبہ نے قدیم تصنع نگاری پر جو بیدل اور ظہوری کی فارسی کی تقلید میں اردو میں بھی برقی جاتی تھی ایک ضرب کاری لگائی اور یہ ثابت کر دیا کہ سادہ اور بے تکلف عبارت میں تصنع سے زیادہ خوبیاں ہیں۔ مضمون کو دیکھو اور عبارت آرائی سے غرض نہ رکھو۔ سید صاحب کا عمل تھا اور حقیقت میں یہی حال ان کی تمام تحریروں کا ہے۔ ان کی عبارت ان کے اداسے مطالب میں کبھی قاصر نہیں ہوتی ان کو زبانی پر عبور حاصل ہے۔ شرار و دھکھنے میں وہ ایسے مشاق تھے کہ ان کے پیشتر کوئی ان کا ہم لمبہ نہیں تھا۔ مولانا حالی تو ان کو نشر اردو کا مورث اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی سید صاحب میں یہ تھی کہ وہ مشکل سے مشکل اور دقیق سے دقیق مضمون کو خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی۔ نہایت صاف اور بے تکلف زبان میں ادا کر سکتے تھے۔ اور نیز اپنے مضامین کے حسن و قبح کو بھی نہایت زور دار الفاظ میں وضاحت سے بیان کر سکتے تھے۔ مگر سید صاحب اور غالب کے موازنہ تعلقات کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ مرزا کی طرز خاص کا سید صاحب پر ایک خاص اثر پڑا اور جو سادگی اور بے تکلفی ان کی عبارت میں پائی جاتی ہے اس کا نقش اول غالب کے ہاتھوں صورت پذیر ہو چکا تھا۔

سید صاحب نے رفقاء کار دنیا کے تمام بڑے لوگوں کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ وہ اپنے ساتھ داؤن میں بھی اپنا ہی ایسا جوش و خروش اور صداقت و راستبازی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی حال سید حسرت کے حواریوں کا تھا جن کی زبردست جماعت نے اپنے ادبی اور سیاسی کارناموں سے ہندوستان میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔ خاص خاص لوگ جو اس جماعت میں شامل ہونے کا فخر رکھتے تھے یہ ہیں۔ نواب

محسن الملک - نواب قار الملک مولوی چلرخ علی مولوی ذکار اللہ - خواجہ الطاف حسین حالی - شبلی نعمانی
مولانا نذیر احمد - اور مولوی زین العابدین - انہیں سے اکثر اصحاب کے کچھ مختصر حالات اس کتاب میں قلمبند
کئے گئے ہیں حالی قومی شاعر تھے - مولوی نذیر احمد اپنے نصیحت آمیز افسانوں اور ناولوں کے لئے مشہور
ہیں - شبلی اور ذکار اللہ فن نقد اور تاریخ کے امام تھے - مولوی چلرخ علی اور نواب محسن الملک کے پیشوا
اور اگر انقدر مضامین نے ادب اُردو کو ہمیشہ کے لئے ممنون احسن کیا - ان تمام بزرگوں کی مساعی جلیلہ
جو مسلمانوں کی اصلاح حال کے لئے وقف تھیں نہایت بار آور اور کامیاب ثابت ہوئیں اور انکی تصانیف
سے زبان اُردو میں بیش بہا اضافہ ہوا -

نواب محسن الملک ۱۸۳۷ء
- ۱۹۰۷ء

محسن الملک نواب سید مہدی علی خان بہادر ۱۸۳۷ء میں - ۱۹۰۷ء میں پیدا
ہوئے - معمولی درسیات سے فراغت کر کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی سروس
ماہوار پر کلارک مقرر ہوئے - رفتہ رفتہ ترقی کر کے ۱۸۷۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی
تھیںڈر سیکرٹری مقرر ہوئے - اپنے خدمات کی انجام دہی میں انہوں نے انتہاء جدوجہد کی قابلیت اور
کارگزاری کا ثبوت دیا - اور اسی اثنا میں دو کتابیں اُردو میں ایک قانون مال اور دوسری قانون
نوجواری کے متعلق تصنیف کیں جنکو اس زمانہ میں شہرت ہوئی ۱۸۷۷ء میں ڈپٹی کلکٹر کی کاغذ
کا امتحان کامیابی سے دیکر ۱۸۷۷ء میں مرزا پور کے ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے - انکی قابلیت کی
شہرت دور دور پہنچتی تھی - چنانچہ سر سالار جنگ اول نے انکو حیدرآباد کا طلب کیا اور ۱۸۷۷ء میں وہ
بالیات کے افسر علی (انسپیکٹر جنرل) مقرر ہوئے - قیام حیدرآباد کے زمانہ میں انہوں نے اکثر کام نہایت
مفید انجام دیے مثلاً حکمہ بندوبست و پمپائش میں بہت مفید اصلاحیں کیں اور بجائے فارسی کے
اردو کو سرکاری زبان قرار دیا - ۱۸۷۷ء میں ریونیو سکرٹری یعنی اعلیٰ معتمد مال اور ۱۸۷۷ء میں فیاض
و پولیٹیکل سکرٹری کے عہدے پر متنازع ہوئے اور سرکار نظام سے "محسن الدولہ محسن الملک منیر
نواز جنگ" کا خطاب پایا - سفر انگلستان بھی کیا تھا اور گلیڈسٹون سے ملاقات کی تھی - بالآخر پولیٹیکل
سازشوں کے سبب اپنے عہدہ سے علیحدہ ہو کر آٹھ سو روپیہ ماہوار پنشن پا کر علیگڑھ چلے آئے جہاں

بقیہ عمر کا لچ کے انتظام اور سرپرستی اور تعلیمی خدمات میں صرف کی۔

سید صاحب سے اُننے بہت قدیم تعلقات تھے۔ مشہور ہے کہ جب سید صاحب شروع شروع میں مذہب میں کچھ دست اندازیاں کر رہے تھے تو عام مسلمانوں کی طرح یہ بھی اُنکو کافرو ملحد سمجھتے تھے مگر بعد کو جب اُنکی حقیقت سے آگاہ ہوئے تو اُنکے بہت بڑے دلچ اور معادن ہو گئے۔ چنانچہ ”تہذیب الاخلاق“ میں اکثر بیش بہا مضامین انہیں کے قلم سے ہیں جو ایک مذہبی اور تاریخی حیثیت رکھتے ہیں اور جنکی غرض اُصلی صرف یہ ہے کہ زمانہ حال کے مسلمان جو نکبت و فلاکت کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں اپنے بزرگانِ کُلف کے قدم بہ قدم چلیں اور اپنے آپکو حقیقت یعنی تعلیم و اخلاق و سیاست کے اعتبار سے کامیاب بنائیں۔

اسمیں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام مضامین اُنکے تہر علمی وسیع النظری اور انصاف پسندی کے شاہد عادل ہیں مولانا حالی نے بہت سچ لکھا ہے کہ ”سید ممدی علی مسلمانوں کے دلوں کو اُنکے بزرگوں کے کا زانے یا دلدلا کر ابھارتے تھے اور جو کچھ کائناتوں نے سرسید کی تائید میں لکھا وہ بڑے استدلال و استناد سے لکھا۔ اکثر اُن کے مضامین جو ایک اچھی خاصی کتاب کے برابر ہیں بڑی تلاش اور محنت سے لکھے گئے ہیں۔“ اسی طرح مولانا شبلی بھی اُنکی بہت تعریف کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ میدانِ ادب میں وہ کسی بڑے سے بڑے ستارے سے پیچھے نہیں رہے اور الکا ایک خاص طرزِ تحریر ہے۔“

اُن کے طرزِ تحریر کے خصوصیات یہ ہیں کہ عبارت نہایت زوردار ہوتی ہے مگر اس پر بھی صفائی اور سلاست اور حسن بیان میں فرق نہیں پڑتا۔ اگر کہیں پڑنے طرز کی تقلید میں عبارت آرائی اور رنگینی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اُنکے صنایعِ بدیع اور استعارات و تمثیلات بڑے نہیں معلوم ہوتے۔ بلکہ حسن عبارت کو اور بڑا دیتے ہیں۔ مگر یہ سمجھنا چاہیے کہ اس قسم کی پرکھ عبارت زیادہ نہیں لکھتے تھے۔ اُنکے زیادہ تر مضامین صاف سادہ اور سلیس ہیں۔ علاوہ مضامین مذکورہ بالا کے اُنکی کوئی مشہور تصنیف سوائے آیاتِ مبینات کے نہیں ہے اور یہ ایک مذہبی رنگ کی کتاب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مولوی ظفر علی خان نے ڈیرہ کی مشہور کتاب ”مصرکہ مذہب“ سائنس کا ترجمہ نواصیا حبیب صوفی کی فرمائش سے کیا تھا نواصیا حبیب نے ۱۹ء میں انتقال کیا اور سرسید قریب فن ہوئے۔

نواب وقار الملک

۱۸۳۹ء تا ۱۹۱۷ء

خلافت علیگڑھ کے خلیفہ ثانی نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین شیخ فضل حسین کے صاحبزادے تھے امر وہمہ (یوپی) کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ایک کنبہ خاندان سے تھے شروع میں کسی اسکول میں پڑھتے تھے اور زمانہ فقط میں امر وہمہ میں کچھ سرکاری خدمات انجام دین پھر رتہ رتہ سرشتہ دار اور منصر صدر الصدور ہو گئے اور سرسید کے ساتھ کام کرتے رہے سرسید ہی کی سفارش سے حیدر آباد پہنچے جہاں سرسید لارجنگ کے حکم سے ناظم دیوانی کے عہدہ پر ممتاز ہوئے اور اپنی قابلیت تنہی اور دیانت سے حکام اعلیٰ کو مطمئن اور خوش رکھا سازشوں کی وجہ سے کبھی حیدر آباد چھوڑنا پڑا مگر پھر جلد بلالے گئے اور دوبارہ انھوں نے نہایت عمدہ اور مفید صلاحین سرکاری کاموں میں کین جسکے صلہ میں معزز خطاب ”وقار الدولہ وقار الملک“ کا سرکار آصفیہ سے عنایت ہوا۔ ۱۸۶۱ء میں ملازمت سے کنارہ کش ہو کر لقیہ عمر قومی کاموں میں علی الخصوص علیگڑھ کالج کی صلاح و ترقی میں صرف کر دی۔ نواب صاحب موصوف ۱۸۶۶ء میں سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر اور ”تہذیب الاخلاق“ کے مہتمم بھی ہو گئے تھے انھوں نے آپ کی چند قیمتی مضامین ہیں۔ جو تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے اور ایک انگریزی کتاب ”پرنسپل ریویشن اینڈ ٹیولین“ کا اردو ترجمہ ”سرگزشت ٹیولین و ناپارٹ ہے جسکی تالیف میں منشی گلزاری لال اور بابو گنگا پری نے بھی کچھ حصہ لیا تھا اور ۱۸۷۱ء میں مطبع ذول کشور سے چھپ کر شائع ہوا۔

مولوی چراغ علی

۱۸۴۱ء تا ۱۸۹۹ء

نواب عظیم یار جنگ مولوی چراغ علی ۱۸۴۱ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی محمد بخش تھا انھوں نے میرٹھ سہارنپور اور پنجاب میں سرکاری ملازمت کر کے ۱۸۷۵ء میں انتقال کیا اور اپنے بعد چار لڑکے چھوڑے جن میں چراغ علی سب سے بڑے تھے۔ چراغ علی ابتدائی تعلیم سے فراغت کر کے ضلع بستی کے محکمہ خزانہ میں مبلغ بیوی پیا ہوا پر مقرر ہوئے ۱۸۷۶ء میں عدالت جڈیشل کشر اوچھ کے ڈپٹی منصر اور پھر سیٹاپور کے تحصیلدار ہوئے ۱۸۷۷ء میں سرسید کی کوشش سے حیدر آباد گئے جہاں نواب محسن الملک کی ماتحتی میں نائب مستمال پیشا ہرہ چار سو روپیہ مقرر ہوئے اور رتہ رتہ ترقی کر کے ریونیو اور پولیس کل سکرٹری کے معزز عہدہ پر پیشا ہرہ و پندرہ سو روپیہ یا ہوا و ممتاز ہوئے ۱۸۹۹ء میں انتقال کیا۔ مولوی چراغ علی نہایت بیدار مغز متدین غیر متعصب اور استباہ شخص تھے۔ کتب بینی کا انکو

اس قدر شوق تھا کہ مقامات و دروازہ مثلاً مصر و شام سے کتابیں منگواتے تھے۔ ابتدا سے عمر سے مضمون نگاری کا شوق تھا جس میں مذہبی رنگ غالب تھا کبھی کبھی عیسائی پادریوں سے بھی مقابلہ ہوجاتا تھا لیکن یہ مذہب اسلام کی خوبیوں کو نہایت شد و مد سے ثابت کرتے تھے۔ یہ مطالعہ کتب کے عاشق اور پابندی اصول کے ایک پیکر ختم تھے۔ انکی تصانیف کثرت سے ہیں۔ علاوہ ان کتابوں کے جو ملازمت حیدر آباد کے زمانہ میں حیدر آباد کے انتظامی معاملات اور سرکاری رپورٹوں وغیرہ کے متعلق انھوں نے لکھیں کئی میل جو عام دلچسپی کی ہیں مشہور ہیں تحقیق الہامیہ مسائل انوں نے اپنے زمانہ حکومت میں کیا کیا اصلاحات کیوں سول برحق۔ اسلام کی دنیاوی برکتیں۔ قدیم قوموں کی مختصر تاریخ۔ ان کے علاوہ ان کے مضامین تہذیب الاخلاق اور وہ خطوط جو مجموعہ رسائل کے نام سے چھپے ہیں اور چند اردو اور انگریزی منسلک بھی ہیں جو مسائل اختلافی پر لکھے گئے تھے۔ مولوی صاحب موصوف علاوہ ایک متبحر فاضل ورجید عالم ہونے کے فن مناظرہ میں ایک بہت بڑی دستگاہ رکھتے تھے اور انکو شکل شکل مسائل میں دلنشین جواب دینے کا ایک خاص حلیقہ تھا۔ اور عبارت بھی نہایت زوردار لکھتے تھے ہر چند کہ اسمیں ادبی شان کم ہوتی تھی۔

مولوی محمد حسین آزاد
شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد گذشتہ صدی کی تیسری دہائی میں دہلی میں پیدا ہوئے
سنہ ۱۲۹۶ھ

کی تھی ذوق کے دلی دوست تھے۔ اسوجہ سے آزاد کی ابتدائی تعلیم استاد ذوق کے سایہ عاطفت میں ہوئی انھیں کی بابرکت صحبت میں انھوں نے شعر گوئی اور فن عروض کیجا آزاد پرانے دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے جس سے مولوی نذیر احمد مولوی ذکا اللہ ماسٹر پیارے لال شوب ایسے لائق اور ہونہار لوگ پڑھ کر کھلے ایسا ذوق کے ساتھ پڑے پڑے مشاعروں میں شریک ہوتے اور بڑے بڑے شعراء سے روشناس ہوتے تھے۔ اور انھیں ادبی سرچشموں سے انکا ذوق سخن بے لرب ہوتا تھا۔ غدر سے انکی مصیبتوں کے بعد آزاد اپنے وطن سے نکل کھڑے ہوئے اور سرگردان پھرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ انکے والد کا انتقال غدر میں ہو چکا تھا استاد کا کام اور کچھ خود انکا کلام جو پہلے کا تھا غدر میں ضائع ہو گیا تھا اب گناہ غدر فرود ہونے کے بعد آزاد نے کسب معاش کے مختلف ذرائع اختیار کئے۔ کچھ دنوں تک ایک فوجی اسکول میں ماسٹر رہے مگر چند دنوں کے

بعد اس کام کو چھوڑ دیا۔ آخر کار پھرتے پھرتے ۱۸۶۴ء میں لاہور پہنچے اور مولوی رجب علی کے ذریعہ سے پنڈت من پھول لٹنٹ گورنر کے میٹھی سے ملے جنکی سفارش سے سرشتہ تعلیم کے محکمہ میں پندرہ روپیہ ماہوار کے ملازم ہو گئے۔ چھوٹے عہدے کی وجہ سے اتنا موقع نہیں ملتا تھا کہ بڑے بڑے افسران سرکاری سے ملیں جو انکی لیاقت اور قابلیت کا لحاظ اور قدر کر کے انکو کسی اعلیٰ عہدے پر پہنچائیں اتفاق سے ماسٹر پیارے لال آشوبک ذریعہ سے جو ان کے بہی خواہ اور دوست تھے سیر فلر صاحب انٹرکٹ سرشتہ تعلیم تک رسائی ہو گئی جو علوم دالسنہ مشرقیہ سے کمال ذوق رکھتے تھے۔ اور رسائی کی صورت یہ ہوئی کہ سیر صاحب نے لفظ ایجاد کو نوٹ لکھا تھا جسکی نسبت تذکرہ تائیت کا کچھ شبہ تھا۔ ماسٹر پیارے لال نے ان کو بلایا اور اُسے سکی بابت دریافت کیا گیا۔ انھوں نے "ایجاد" کو ذکر کیا۔ اور جب اندانگی گئی تو سیر صاحب سودا کا پڑا ہوا ہے یہ کس بھڑوسے کا ایجاد ہے۔ نسخہ میں عجوبہ زرباد ہے۔ اسوقت سے سیر صاحب کی خدمت میں انکی رسائی ہو گئی اور کچھ ترقی بھی ہو گئی۔ سب سے پہلے یہ اردو و فارسی کی دسی کتابیں لکھنے پر مامور ہوئے چنانچہ فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب۔ اردو کی پہلی۔ دوسری اور تیسری اور قصص ہند۔ اس زمانہ کی انکی مشہور تصانیف میں جو مبدیوں میں نہایت مقبول ہوئیں۔ اور انھیں تصانیف کی نسبت پنجاب میں اسکوئی تعلیم بہت رائج ہوئی۔ آزاد کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ انھوں نے انجمن پنجاب کے قیام میں بہت بڑا حصہ لیا جسکی وجہ سے صوبہ پنجاب میں اردو کی ترقی اور ترویج ہوئی جب سیر فلر کے بعد کرنل بالرائڈ انٹرکٹ تعلیم مقرر ہوئے جنکو زبان اردو کا حسن سمجھنا بالکل سجا ہے تو ۱۸۶۴ء میں آزاد نے کرنل صاحب موصوف کو اس بات پر آمادہ کیا کہ انجمن پنجاب کی سرپرستی میں ایک خاص مشاعرہ قائم کیا جائے جسکی غرض یہ ہو کہ اردو شاعری کی مبالغہ آمیز اور پر تصنع روش بدل جائے اور انھیں حقیقت اور سادگی کی روح پیدا کی جائے۔ ۱۸۶۵ء میں وہ کسی سرکاری کام سے کلکتہ اور پنڈت من پھول کی معیت میں ایک سفارتی مشن پر کابل و خارا گئے تھے۔ ایران وہ دو مرتبہ گئے۔ پہلی مرتبہ ۱۸۶۵ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۸۶۸ء میں۔ زبان فارسی سے انکو ایک خاص لگاؤ تھا اور اسید وجہ سے اسکا مطالعہ انھوں نے خاص طور پر کیا تھا اور ایران کے قیام نے ان کو جدید فارسی سے بھی آشنا کر دیا تھا۔ انہیں وجہ سے

انکی وہ تصانیف جو زبان فارسی کے متعلق ہیں دلچسپی اور معلومات سے پُر ہیں۔ کرنل ہارلڈ نے آزاد کو اتالیق
پنجاب (ایک سرکاری اخبار) کا سب ایڈیٹر بنایا۔ پھر رقیہ باہو اور مقرر کیا تھا۔ اور ایڈیٹر رائے ہمدرد
پیارے لال آشوب تھے۔ جب تھوڑے عرصہ کے بعد اخبار بند ہو گیا اور ”پنجاب میگزین“ انکی جگہ نکلا تو
آزاد انکے بھی سب ایڈیٹر مقرر ہوئے اور ان کے بعد مولانا حالی کچھ دنوں اس عہدے پر متعین رہے۔ آزاد
گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے پروفیسر بھی ہو گئے تھے۔ ۱۸۸۵ء میں ملکہ دکنور سے کجولی کے موقع
پراٹھو کی قابلیت کے صلہ میں انکو شمس الملک کا خطاب عطا ہوا۔ دماغی محنت اور سفر ایران کا تجربہ اور اپنی پاری
بیٹی کی بیعت موت کی وجہ سے جنکو وہ بہت عزیز رکھتے تھے اور جنکو نہایت عمدہ تعلیم دلائی تھی انکے قوائے
دماغی پر بہت بڑا اثر پڑا جسکی وجہ سے ۱۸۸۹ء میں کچھ جنون کے آثار معلوم ہونے لگے جس سے وہ کسلی دہلی
کا کام کے لائن نہیں رہے۔ آخر عمر تک یہی حالت جنون کی رہی اور ۲۲ جنوری ۱۹۱۹ء کو اس جان فانی
سے رحلت کی۔

تصانیف آزاد کی حسب ذیل تصانیف ہیں۔ فارسی ریڈرین (۲ حصے) قدیم اردو ریڈرین (۳ حصے)
اردو کا قاعدہ و قواعد اردو قصص ہند۔ جامع القواعد نئی اردو ریڈرین (۳ حصوں میں) آبجیات۔
نیزنگ خیال۔ بخندان فارس۔ قندبارسی۔ نصیحت کا کرن پھول۔ دیوان ذوق۔ نظم آزاد۔ دربار کجولی
نگارستان فارس۔ سپاک نمک۔ جاوڑستان۔

ریڈرین اور اسکولی کتابیں اردو اور فارسی ریڈرین اور ابتدائی رسائل صرف و نحو طلبائے سکول اور
مبتدیوں کے واسطے لکھے گئے تھے۔ ان سب کی عبارت نہایت سلیس اور عام فہم ہے اور فی الحقیقت طلباء
کے واسطے وہ بہت مفید اور کچھ عرصہ تک وہ داخل درس رہی ہیں علی الخصوص قصص ہند جس میں تاریخ
ہندوستان کے مشہور مشہور حالات و واقعات عجیب و دلچسپ بلطف اور پر زور عبارت میں لکھے گئے ہیں۔
یہ لا جواب کتاب جماعت طلباء اور نیز نیک میں ہی مقبول ہے اور اسکے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔
اس کو دلچسپ واقعات کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور پڑھ لکھے انکی عبارت کے دلدادہ ہیں۔ جملوں کا توازن عبارت کی
چستی الفاظ کی شکوہ۔ اور مضامین کی ترتیب اسکی بھنس کتاب نے اسکا درجہ بلند کر دیتی ہے۔

آب حیات

مولانا آزاد کا شاہکار اور انکی بہترین تصنیف آب حیات ہے۔ یہیں مشہور مشہور شعرا کے مختصر حالات مع انکے نمونہ کلام اور تنقید کے درج ہیں۔ اور زبان اردو کی تاریخ اور ان تغیرات کا بھی ذکر ہے جو زبان اردو میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں حقیقت میں اس کتاب کی تصنیف سے ایک بہت بڑی کمی پوری ہو گئی اسوجہ سے کہ گو کہ اس سے قبل اکثر تذکرے اور مجموعہ اشعار موجود تھے۔ مگر وہ قابل اعتناء تھے اور نامکمل بھی تھے بعض کا تو یہ حال تھا کہ مشہور مشہور شاعر دن کا حال صرف چند سطروں میں لکھ دیا اور پھر بھی آدھے سے زیادہ مضمون کلمات توصیف و تحسین۔ ادب اردو آزاد کا نمونہ ہے کہ انھوں نے ایک باقاعدہ اور مفصل تذکرہ شعر و ترتیب دیا۔ جسکے واسطے یقیناً انکو بڑی محنت اور کاوش کرنا پڑی ہوگی۔ وہ ایک ایسا خزانہ معلومات ہے کہ جس سے مابعد کے مصنفین بہت کچھ مدولے سکتے ہیں اور لیتے رہے ہیں علاوہ اس خوبی یعنی گنجینہ معلومات ہونے کے انکی اصلی خوبی اسکی بے مثال طرز عبارت ہے کہ جسکی نقل کی سب کوشش کرتے آئے ہیں مگر کیا حقہ کوئی نہیں کر سکا الحی آزاد نے آب حیات لکھ کر ادب اردو میں ایک جدید طرز کا اضافہ کیا جو مثل حالی کے سادہ اور عاری از زریب و زینت نہیں اور نہ مولوی نذیر احمد کی طرح ثقیل اور وزنی ہے وہ ایک زور دار اور سب سے جدا رنگ رکھتی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھیں کچھ ایسی ہی بیان ہیں جو حاطہ بیان سے باہر ہیں اور صرف دل اُنسے لطف اُٹھاتا ہے۔ مگر اُسی کے ساتھ فسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولانا نے اپنے جوش و شوق میں تاریخی مواد کو غور و خوض سے نہیں دیکھا غیر موثق اور غیر معتبر حوالوں کی بنیاد پر سرسنگ عمارتیں کھڑی کر دیں۔ اور بعض جگہ کتاب میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے اختصا میں کمی و بیشی اور تبدیلی تک کو جائز رکھا۔ مگر زمانہ حال کے تجسس و تلاش اور تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ آب حیات کے اکثر بیانات غلط یا کم از کم مشکوک ضرور ہیں۔ اکثر جگہ جانبداری کا الزام بھی مصنف پر عاید ہوتا ہے مثلاً اپنے استاد ذوق کی سجد تعریف و توصیف اور اُنکے حالات میں شغف اور مرزا غالب کے کمالات سے نسبتاً بے پردائی بلکہ جگہ جگہ لائق در پردہ چوٹیں۔ مرزا دبیر کے خاندان کو کم کر کے دکھانا۔ انشاکے آخری نام کے عورت انگیز غیر موثق حالات وغیرہ اور اسی قسم کی باتیں جو اب افق مطالعہ پر نظر آئی ہیں آب حیات کے اکثر بیانات کے متضاد اور مخالف واقع ہیں۔ پھر بھی اگر اس قسم کی اور بھی غلطیاں نکل آئیں تو اس سے ہماری

رائے نین کتاب کی اصل خوبی اور قدر و قیمت میں کوئی زیادہ فرق نہیں آتا۔ اسی کتاب سے تنقید کا صحیح معیار اردو میں قائم ہوا چالی کی یادگار غالب کو اسی کتاب کے مطالعہ کا نتیجہ سمجھنا چاہئے مختصر یہ کہ بحیثیت ایک قدیمی نگار کے بحیثیت ایک خزانہ واقعات و حکایات کے بحیثیت غیر قابل تقلید ہونے کے یہ کتاب آپ اپنی جواب دہی اور آئندہ بھی اس کا جواب مشکل معلوم ہوتا ہے۔

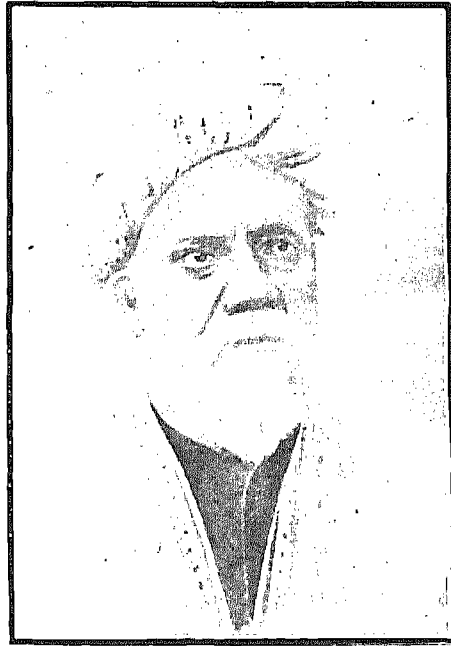
نیرنگ خیال [پہلی ایک جدید رنگ کی کتاب ہے حسین خیالی افسانوں اور خواب وغیرہ کے پردہ میں عمدہ اخلاقی نتائج نکالے ہیں۔ یہ دو حصوں میں ۱۸۷۱ء میں تصنیف ہوئی تھی۔ اس قسم کے فرضی افسانے اور حکایات ہر زمانہ اور ہر قوم میں لوگوں کے مبلوغ خاطر رہے ہیں۔ یونانی اور رومی لوگوں کو ان کا بہت شوق تھا۔ انگریزی میں ایڈسین جان نین اور اسپنسر کے ایلگیری (خیالی قصے) مشہور ہیں اور فارسی میں فتویٰ مولانا روم اور انوار سبلی سنسکرت میں ہتوا پدیش اور عربی میں اخوان الصفا وغیرہ۔ ہمارے خیال میں آزاد نے اپنے قصوں کی بنیاد یونانی قصوں پر رکھی ہے اور اس سے انکی یونانی علم الاضام کی واقفیت کا بہت کچھ پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر لیٹر نے انکو اس کتاب کے لکھنے کی ترغیب دی تھی اور اس کا خاکہ تیار کر دیا تھا۔ مگر بیڑی قابل تعریف بات ہے کہ مولانا آزاد باوجود انگریزی کم جاننے کے اس تعلق میں کامیاب ہو گئے یہ کتاب انکے خاص طرز تحریر میں لکھی گئی ہے مگر نفس مضمون سے زیادہ طرز بیان بہت دلچسپ ہے۔

سندھان فارسی [ادب فارسی کے متعلق یہ کتاب بھی بہت دلچسپ ہے۔ دراصل یہ ایک قیمتی رسالہ علم فلاوچی پر ہے حسین فارسی اور سنسکرت زبانوں کو متحد الاصل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں اہل ایران کے رسوم و رواج کا بھی ذکر ہے اور انکا مقابلہ ہندوستان سے کیا ہے۔ خود مصنف کے سفر ایران اور لکھے علمی مکاشفات کے حالات بھی درج ہیں مثلاً مولانا شبلی کی شعرا لہجہ کے یہ ایک مکمل کتاب نہیں کہی جاسکتی مگر پھر بھی بہت مفید اور ایک خیرہ معلومات ہے

قند پارسی اور نصیحت کا کرن پھول [قند پارسی ایک مفید کتاب ہے جس سے زمانہ حال کی فارسی کے حاصل کرنے میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ حسین مولانا کے سفر ایران کے بھی کچھ حالات درج ہیں نصیحت کا کرن پھول جو ایک مکالمہ اور نصیحت کے پیرایہ میں ہے بچوں اور عورتوں کے لئے بہت مفید ہے۔ اسکی



شمس العلماء مولوی محمد حسین رضا آزاد دہلوی



شہس العلماء قائمہ نذیر احمد ایل ایل ڈی

عبارت بہت صاف و سلیس ہے۔

دیوان ذوق اس کتاب کی ترتیب تالیف سے مولانا آزاد نے ادب اردو کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے اور اپنے استاد کے کلام کو گمنامی سے بچا لیا ہے۔ تذکرہٴ آجیات میں انہوں نے نہایت مؤثر اور درونک لہجہ سے اور تفصیل کے ساتھ استاد کے کلام کا ضالیج ہو جانا اور پھر ان اجزائے پرشیا کو ٹہری محنت اور دقتوں سے جمع کرنا بیان کیا ہے۔ دیوان کے شروع میں ایک مختصر دیا جا چکا ہے اور بعض بعض غزلوں کے ساتھ ان کے حالات تصنیف پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور شہر کے مطبوعہ کلام سے ایک تین اضافہ بھی اس میں موجود ہے۔ ان دلچسپ نوٹوں سے نہ صرف اشعار کی قدرو قیمت بڑھ گئی ہے بلکہ اس میں ایک ”رومان“ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے بعض لوگوں نے الحاقی کلام پر شک بھی ظاہر کیا ہے مگر ہمارے نزدیک اس ستر کے شکوک بے بنیاد ہیں اور انہیں زیادہ خیال کرنا چاہئے۔

در بار اکبری یہ مہتمم بالشان تصنیف اکبر بادشاہ کے عہد اور ان کے ارکین سلطنت کے حال میں ہے اس کتاب کی عبارت اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ افسوس ہے کہ اس پر نظر ثانی نہ ہو سکی۔ اس کتاب میں عہد اکبری کی جیتی جاگتی تصویریں دکھائی گئی ہیں۔

دیگر تصانیف سپاک و تناک و ”جا نورستان“ اس زیادہ کی تصانیف ہیں جبکہ مولانا صحیح الذراغ نہ ہے۔ اول الذکر ایک غیر مربوط مجموعہ مقصودہ خیالات کا ہے جو اسی عالم میں لکھے گئے تھے۔ اس سے کتنا بڑا شوق تصنیف و تالیف کا پایا جاتا ہے کہ باوجود طولِ دماغ کے بھی جب کبھی چند لمحے سکون کے ملتے تھے تو وہ ان کو ادبی کاموں میں صرف کرتے تھے۔ اسی زمانے اور اسی حالت کی تصنیف ”جا نورستان“ بھی ہے۔ جہین کچھ جانوروں کے حالات اور انکی آوازوں کا بیان ہے۔ ”گگارستان فارس“ جو بعد ان کے انتقال کے شائع ہوئی ایران ہندوستان کے فارسی شعرا کا ایک مختصر تذکرہ ہے جہین رودکی سے لیکر حریرین اور واقف آزاد تک تقریباً ۳۵ شعرا کے حالات مع ان کے نمونہ کلام کے درج ہیں۔ اسکی زبان بہت صاف و سادہ مگر مثل آجیات کے پر لطف نہیں ہے۔ شاید اسوجہ سے کہ یہ انکی ابتدائی تصنیفات میں سے ہو۔ آخری کتاب جو ان کے نام سے منسوب ہے نے شائع کی ہے ”الہیات“ ہے۔

آزاد کا ترجمہ اردو نثر نگاروں میں آزاد کی ایک بہت وقیع اور بہت نمایاں ہستی ہے بحیثیت بانی تحریک جدید ہونے کے بحیثیت جدید طرز کے شاعر کے بحیثیت ایک فارسی اسکالر کے جو قدیم رنگ کے ساتھ جدید رنگ کے بھی بڑے ماہر تھے بحیثیت ایک مروج تعلیم کے جنکی دہ سے پنجاب میں انگریزی کے ساتھ اردو و فارسی کی تعلیم نے بھی بڑا رواج پایا۔ بحیثیت ایک علامہ مضمون نگار کے بحیثیت ایک زبردست ناقد کے بحیثیت ایک مشہور پرفیئر اور مصنف کے بحیثیت حامی اردو کے بحیثیت ایک زبردست معزز کے آزاد اپنے زمانہ میں عظیم المثال تھے۔ مگر وہ چیز جس نے انکو زندہ جاوید کر دیا وہ ان کا خاص طرز تحریر ہے جو آسانی ہے اور جسکی تقلید محال ہے۔ زبان اردو نے انکی ذات میں اپنا ایک بہت بڑا مددگار اور حامی پایا تھا۔ انکے طرز تحریر کی یہ خاص صفت ہے کہ فارسی اور عربی کے غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں اردو دراز کا رصنائے مدللے جنکا آجکل بہت رواج ہے انہیں نہیں پائے جاتے۔ انکی عبارت کی یہ خاص شان ہے کہ بہاشہ کی سادگی اور سبے تکلفی۔ انگریزی کی صاف گوئی۔ اور فارسی کا حسن و خوبصورتی اس میں ملی جلی ہوتی ہے۔ وہ تصنیفات اور تکلفات سے گو کہ عاری ہے مگر لطیف استعارے اور خوب صورت تشبیہیں اس کے حسن کو دو بالا کرتی ہیں۔ وہ ایک موسیقیت رکھتی ہے۔ آزاد کا مقابلہ انگریزی انشا پردازوں میں ڈی کوئسی لمب اور اسٹیونسن سے جو صاحبان طرز خاص تھے بخوبی ہو سکتا ہے۔ اپنے زمانہ میں بھی آزاد بہت ہر دلہیز اور مقبول ہو چکے تھے اور انکے معاصرین انکو نہایت قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ حالی نے آبیات اور نیزنگ خیال کی تقریظوں میں انکی بہت تعریف کی ہے اور شاعری کے طرز جدید کا انکو بانی قرار دیا ہے بہ طرح مولانا شبلی انکو اردو کا ایک بہت بڑا ماہر و سمجھتے تھے اور انکی موت پر انکو خداے اردو کیلے یاد کیا۔ مولوی ندیر احمد اور مولوی ذکرا اللہ بھی انکے بڑے مداح اور قدردان تھے۔

آزاد ظریف الطبع۔ نہایت مہذب و متین۔ اور قصص بالکل آزاد تھے۔ وہ سربغ الغیظ مگر جلد معاف کرنے والے تھے بعض معاصرین سے جنگ رہتی تھی جسکا انجام بحث و مناظرہ کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔

حالی خواجہ الطاف حسین حالی کا ذکر بہ حیثیت شاعر کے حصہ نظم میں ہو چکا ہے۔ یہاں بحیثیت معزز نقاد کے انکا ذکر کیا جاتا ہے۔ انکی تصانیف حسب ذیل ہیں۔ تریاق سموم مطبوعہ ۱۸۶۷ء علم طبقات الارض کی ایک عربی کتاب کا ترجمہ مجلس النصار ۲ حصوں میں مطبوعہ ۱۸۷۷ء حیات سعدی مطبوعہ ۱۸۸۲ء مقدمہ شعر و شاعری۔ یادگار غالب مطبوعہ ۱۸۹۲ء حیات جاوید یعنی سرشید مرحوم کی سوانح عمری مطبوعہ ۱۹۰۷ء مضامین حالی یعنی ان مضامین کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً اخبارات و رسائل میں چھپے ہیں۔

ابتدائی تصانیف ”تریاق سموم“ پانی پت کے ایک شخص کے اعتراضات کا جواب ہے جو مسلمان سے عیسائی ہو گیا تھا اور جسے اسلام پر اعتراضات کئے تھے۔ اس میں کوئی ادبی خوبی نہیں محض اس لئے لکھی ہے کہ اس سے انکی ذکاوت اور طباعی کا پتہ چلتا ہے۔ ”طبقات الارض“ ایک عربی کتاب کا ترجمہ ہے جو خود فرانسیسی سے کیا گیا تھا۔ یہ کتاب ڈاکٹر لٹیر کے زمانہ میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی تھی ”مجلس النساء“ ایک انعامی رسالہ ہے جسکے صلہ میں مولانا کو مبلغ چار سو روپیہ کا انعام لارڈ نارمنٹ برک و سیرائے ہند نے عطا کیا تھا یہ عورتوں کے واسطے بہت مفید ہے اور لڑکیوں کے اسکولوں میں ایک عرصہ تک بحیثیت درستی ب کے داخل رہی ہے۔ اسمین بہت سے ایسے الفاظ و محاورات ہیں جو شریف گھرانے کی عورتیں بولتی ہیں۔ حیات سعدی یعنی شیخ سعدی شیرازی کی سوانح عمری اس سے مولانا نے اردو شاعروں کی صفحہ اول میں جگہ پائی اور انکی سوانح نگاری کی قابلیت اور اسلوب بیان کا پتہ چلا۔

مقدمہ شعر و شاعری مولانا کے دیوان کے شروع میں یہ معرکہ الآرا مقدمہ ہے جسے اردو کی ادبی دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور مولانا کی شہرت کا یہی سنگ بنیاد ہے۔ اسمین دونوں سے زیادہ صفحات ہیں۔ اور گو کہ دیوان کے ساتھ چھپا ہے مگر اسکودیوان سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ ایک نہایت قابل ملاحظہ تنقیدی مضمون نفس شاعری کے آئینہ (انتہائی نقطہ خیال) پر ہے۔ اسکی تصنیف سے بڑے تجسس و تلاش اور وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے۔ اسمین یونانی درومی انگریزی و عربی نقادان فن شعر کے خیالات شعر کی بابت سلیسند کئے گئے ہیں ہر چند کہ نہایت مجمل سطحی اور غیر بوطریق سے انکا ذکر کیا گیا ہے۔ یوروپین شاعری میں مولانا حالی تک غوطہ نہیں لگا سکتے کیونکہ اس بحر کے وہ شاعر نہیں ہیں سنسکرت کی شاعری کو بوجہ عدم واقفیت زبان

بالکل چھوڑ دیا ہے۔ مگر باوجود ان سب کے کتاب یک طرفہ معلومات ہے اور اسوجہ سے کہ اس قسم کے فن نقد میں سب سے پہلی تصنیف ہے نہایت قابل قدر ہے۔ اسکی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کے قلم سے نکلی جو مغربی تعلیم سے بالکل نا آشنا تھا۔ اس کے مطالعہ سے قدیم طرز کے شعرا کے سامنے جدید معلومات اور تخیل کے دروازے کھل گئے ہیں۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب کی تھلیف میں زمانہ موجودہ کے اکثر دوادین کے ساتھ اکثر مقدمات لا طائل شایع ہو رہے ہیں جن کا اخذ حقیقت ہی مقدمہ شعر و شاعری ہے اور کسی جدید بات کا اضافہ نہیں کیا جاتا۔

یادگار غالب مولانا کی سب سے زیادہ ہر دلعزیز تصنیف یادگار غالب ہے جس سے بہتر کوئی کتاب اس طرز کی ابتک نہیں نکلی۔ اس میں مرزا غالب کی زندگی کے حالات و واقعات انکے لطایف و ظرایف وغیرہ نہایت عمدہ اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کئے ہیں اس کے بعد انکے شہر کے کلام پر ناقذانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ چونکہ مصنف مرزا صاحب کے شاگرد تھے لہذا اکثر واقعات چشم دم پر لکھے ہیں مثلاً اشعار کے معانی بھی سمجھائے ہیں اور ان مواقع کا بھی بیان ہے جب وہ اشعار کہ گئے تھے جس سے اشعار کا لطف دو بالا ہو جاتا ہے اس تصنیف کے ذریعہ سے حالی نے اپنے استاد غالب کی شاگردی کا حق اسی طرح ادا کر دیا جس طرح کہ آزاد نے دیوان ذوق کو ترتیب بخیز ذوق کو زندہ جاوید بنایا۔ دولون اپنے اپنے استادوں کے شاگرد و رشید اور دوسے چاہنے والے تھے۔ یادگار غالب "تنقیدی کتابوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے تنقید گو کہ اعلیٰ درجہ کی ہے مگر پھر بھی جوش عقیدہ مندی کہیں کہیں جاوہ انصاف سے ہٹا دیتا ہے۔

حیات جاوید حالی کا سب سے بڑا کا زمانہ یہ کتاب ہے جسکی وجہ سے خود انہوں نے حیات ابدی پائی یہ ایک بہت مفصل اور جامع ضخیم کتاب ہے۔ اس میں سرسید مرحوم کی طویل اور مختلف الاحوال کثیر الاشغال زندگی کے حالات اس قدر تفصیل کے ساتھ درج ہیں کہ اسکو زبان اردو میں وہی مرتبہ حاصل ہو گیا ہو چاہے سبیل کی مشہور کتاب "ذاکرہ جانشن کی لالیف" کو انگریزی میں ہوا ہے۔ سرسید بحیثیت ایک لیڈر اور مدبر اور رفیق راہ اور اہل قلم کے دکھائے گئے ہیں۔ سرسید کے ساتھ انکے اکثر شرکائے کار کے بھی حالات اس میں درج ہیں۔ یہ ایک مہتمم بالشان تصنیف ہے لیکن اس میں بہرہ کی تعریف میں مبالغہ کیا گیا ہے اسوجہ سے کہ مولانا کا

یہ اعتراض بالکل صحیح ہے کہ اس کتاب میں تصویر کا صرف ایک رخ دکھایا گیا ہے، مناسباً تو چشم پوشی کی گئی ہو یا انگلی کوئی توجیہ کر دی گئی ہے۔ مگر ہماری رائے میں اس زمانہ کی تصانیف کو اتنی سختی کے ساتھ جانچنا مناسب نہیں ہے۔ اسوجہ سے کہ سوانح نگاری اور فن تنقید ہمارے یہاں ابھی ابتدائی حالت میں ہیں اور زیادہ تر قطع دبرید سے بجائے نفع کے نقصان کا احتمال ہے۔

مضامین حالی وہ مضامین ہیں جو مولانا نے وقتاً فوقتاً اخبارات و جرائد میں علی الخصوص تہذیب الاخلاق میں چھپوائے ہیں۔ انکے علاوہ نواب مصطفیٰ خان شیدائے کرم کا تیب کا ایک مجموعہ بھی انہوں نے ترتیب دیا ہے۔

طرز تحریر مولانا کی عبارت نہایت صاف سادہ زبردست اور زور دار ہوتی ہے۔ مگر اس کی آزادی اسی شوخی اور نگینی اور مولانا نذیر احمد کی سنی نازک و لطیف طرائف میں ہوتی۔ حالی گو کہ صاحب طرز نہیں مگر بہترین شمار ہیں۔ وہ اسلوب بیان سے زیادہ نفس مطلب کا خیال رکھتے ہیں چنانچہ بدلیج کی نہ انکے یہاں کثرت ہے اور نہ انکا بیجا استعمال و ن کرتے ہیں محض لفاظی اور عبارت اکرائی و کھی نہیں کرتے۔ اور عبارت کی ظاہری آرائش سے وہ قطعاً احتراز کرتے ہیں اسوجہ سے انکی عبارت بہت سلیجی ہوئی اور صفا ستھری ہوتی ہے۔ گو کہ وہ بلند چوڑی نہیں کرتے مگر زور بیان اور فصاحت سے انکی عبارت مالا مال ہوتی ہے۔ جدید نثر اردو نے انکو اپنا بہت بڑا حامی اور مددگار پایا اور انھوں نے مرزا غالب اور سر سید کے طرز تحریر کو زندہ رکھا۔ انکی تصانیف آئندہ نسلوں کے واسطے بہترین نمونہ سمجھی جاسکتی ہیں۔

مولانا نذیر احمد رحمہ اللہ شمس العلما، خان بہادر مولانا نذیر احمد وضع راہ ضلع بجنور میں ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے لغایت ۱۹۱۶ھ انکا خاندان علم و فضل کے لئے مشہور تھا۔ والد کا نام مولوی سعادت علی تھا۔ اور انہیں سے انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اسکے بعد مولوی نصر اللہ ڈپٹی کلکٹر بجنور سے بھی کچھ پڑا۔ اور دلی میں آکر ۱۳۴۷ھ میں مولوی عبدالخالق کے شاگرد ہوئے جنکی پوتی سے انہوں نے عقد بھی کیا۔ دلی کالج کے مشہور پروفیسر عربی مولوی مملوک علی کے اصرار سے وہ دلی کالج میں داخل ہوئے اور وہاں ادب عربی اور فلسفہ و ریاضی وغیرہ میں تکمیل حاصل کی۔ کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کی ترغیب سے انگریزی بھی شروع کی

مگر والد کی مخالفت کی وجہ سے چھوڑنا پڑی۔ اس زمانہ میں اُنکے ہم سبق حالی آزاد منشی کریم الدین مولوی ذکار اللہ اور پیارے لال آشوب تھے۔ مثل اس زمانہ کے اور بڑے لوگوں کے مولوی نذیر احمد نے بھی زندگی کی ابتدا ایک چھوٹی سی ملازمت سے کی لیکن وہ پنجاب میں کسی مقام میں نہیں پائے ہوئے۔

کے ٹیچر مقرر ہو گئے۔ تھوڑے دنوں کے بعد ڈپٹی انسپکٹر مدراس بشاہرہ سورویہ ماہوار مقرر ہوئے۔ عذر کے زمانہ میں اُنہوں نے کسی ہم کی جان بچائی تھی جس خدمت کے صلے میں ایک مقررہ اور کچھ زرقندہ سرکار سے ملا اور انسپکٹر مدراس کے درجہ پر ترقی ہوئی۔ اسکے بعد نکاح تبادلا کر آباد میں ہو گیا اور یہیں انہوں نے تھوڑی سی انگریزی سیکھی۔ کیونکہ انکو نہایت خرم و حجاب معلوم ہوا تھا کہ جو زبان حاکم و محکوم کے درمیان تبادلہ خیال کا ذریعہ ہے اس سے وہ محروم ہیں۔ اپنی طباعی اور ذہانت سے اُنہوں نے چھ مہینہ کے اندر انگریزی میں کافی مہارت پیدا کر لی اور بعد کو کتب بینی سے وہ اس قابل ہو گئے کہ ۱۸۷۱ء میں انڈین پینل کوڈ کے ترجمہ کی خدمت پر مچھلے دیگر اشخاص کے وہ بھی مقرر ہوئے۔ انکا ترجمہ مجموعہ تعزیرات ہند) ایسا مقبول ہوا کہ انکا اسکے بعد وہ تحصیلدار اور پھر افسر بندوبست ہو گئے۔ اُنہوں نے بخیر کی بھی ایک کتاب کا ترجمہ کیا تھا جسکو اس زمانہ کے ریڈیٹ کشمیر نے لکھا تھا۔ اور مبلغ ایک ہزار روپیہ انعام پایا تھا انکی قابلیت کا شہرہ سنکر سالار جنگ اقل نے انکی خدمات گورنمنٹ سے اپنے یہاں منتقل کرالین اور افسر بندوبست بشاہرہ آٹھ سو روپیہ ماہوار مقرر کیا۔ اسی عرصہ میں اُنہوں نے قرآن شریف بھی حفظ کیا۔ اور بعد کو سر سالار جنگ کے ایام سے انگریزی ملازمت چھوڑ کر حضور نظام کی مستقل ملازمت اختیار کر لی جن میں وہ ترقی کرتے کرتے اعلیٰ ممبر مال بشاہرہ سترہ سو روپیہ مقرر ہوئے اور اُنکے بیٹے اور اعزاء کو معقول کچھین اچھے اچھے عہد پر دی گئیں۔ سر سالار جنگ کے حکم سے انہوں نے ایک نصاب تعلیم تیار کیا تھا۔ اور سر سالار جنگ کے صاحبزادہ نواب لائق علی خان اُنکے شاگرد تھے۔ ایک عرصہ تک اپنے عہدہ کے فرائض منصبی انجام دیکر ملازمت سے دست کش ہو گئے اور بقیہ عمر اپنے وطن مالون دہلی میں یاد آگئی اور تصنیف و تالیف کے مشغلے میں بسر کی ۱۹۱۱ء میں ایک نہایت کامیاب مصروف زندگی کے بعد اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت کی اور ملک قوم کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے۔

مولانا موصوف سرسید کی اس جماعت کے ایک معزز فروختے کہ جنہوں نے اپنی تصنیف و تالیف اور اپنے لکچرزدن کے ذریعہ سے اپنے ہم مذہبوں کی ترقی میں بڑی اعانت کی تھی۔

تصانیف مولانا کی تصانیف بہ کثرت ہیں جن میں سے حسبِ میل بہت مشہور ہیں (از قسم ناول حکایات مرآۃ العروس۔ نبات النعش۔ توبۃ النورح۔ ابن الوقت۔ محضات۔ ایامی۔ رویائے صادقہ۔ منتخب الحکایات۔) (کتاب مذہبی و اخلاقی) ترجمہ قرآن شریف۔ ادعیۃ القرآن۔ وہ سورہ الحقوق و الفرائض۔ مطالب القرآن۔ اہمات اللہ۔ اجتہاد۔ (متفرق کتابیں) صرف صغیر رسم الخط۔ موعظہ حسنہ افسانہ غدر۔ نصاب خسرو۔ چند پند۔ مبادی الحکمہ۔ مائتیک فی الصرف مجموعہ لیکچر۔ اور انگریزی قانونی کتابوں کے ترجمے۔ مثلاً تعزیرات ہند قانون شہادت وغیرہ۔

مولانا کثیر التصنیف اور سرسید تصنیف نون تھے انکی اکثر کتابیں مثلاً مائتیک فی الصرف مبادی الحکمہ۔ منتخب الحکایات۔ رسم الخط وغیرہ۔ اسکول کے طلباء کے واسطے لکھی گئیں اور واقعی انکے واسطے بہت مفید ہیں۔ سرکاری اکیڈن کے ترجمے گورنمنٹ کے حکم سے کئے گئے مجموعہ تعزیرات ہند یعنی نیل کوڈ کے ترجمہ کو انکا ایک کارنامہ سمجھنا چاہئے۔ اس مشہور قانون کے واسطے پہلے مولوی کریم بخش اور مولوی عظمت اللہ مقرر ہوئے تھے پھر سر ولیم میور لٹنٹ گورنر کے حکم سے مولوی نذیر احمد انکے کام کی نگرانی اور نظر ثانی کے لئے مقرر ہوئے۔ اور انہوں نے بڑی محنت و جانفشانی اور بڑی قابلیت سے یہ کام انجام دیا۔ انکے تمام قانونی تراجم نہایت عمدہ اور صحیح ہیں جس میں اکثر جگہ نہایت مناسب اور ٹھیک الفاظ مشکل الفاظ انگریزی کے لئے اردو میں وضع کئے گئے ہیں جو اب زبانِ دخلِ باقی ہو گئے ہیں قانون شہادت یعنی ایوی ٹونس ایکٹ کا ترجمہ لہون کی کتاب سے کیا گیا ہے۔ "افسانہ غدر" ایڈورڈ صاحب کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے جس میں انہوں نے غدر کے بعض دلچسپ و سوانح کو قلب بند کیا ہے۔ ان کے علاوہ سات آٹھ چھوٹی چھوٹی مختصر کتابیں اور رسائل ہیں جو قیام حیدر آباد کے زمانہ میں وہاں کے عمال کے لئے بطور ہدایت لکھے گئے تھے مگر سچے نہیں۔

کتاب مناظرہ و متنازع مذہب اس زمانے میں مسلمانوں اور عیسائی و اعظفون سے جنہیں سے بعض دین اسلام کو چھوڑ کر مسیحی ہو گئے تھے اکثر مباحثے رہتے تھے اور بڑے بڑے لوگ مثلاً سر سید مولوی چراغ علی۔ نواب محسن الملک وغیرہ انہیں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ ایک عیسائی مبلغ احمد شاہ نامی نے اہمات المؤمنین کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں پیغمبر اسلام کی ازدواجی مطہرات کی نسبت کچھ بیجا الزامات قائم کئے تھے۔ مولوی نذیر احمد نے اس کے جواب میں ”اہمات المؤمنین“ لکھی جسکی بعض لوگوں نے تو بہت قدر کی مگر بعض نے سخت برا سمجھا اور اس کے بارہ میں اتنا اختلاف بڑھا کہ اسکی جلد میں آخر میں جلد دی گئیں اور دوبارہ بعد از مریم چھاپی گئی مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ انکا اردو ترجمہ قرآن شریف ہے جو نہایت آسان اور با محاورہ زبان میں کیا گیا ہے۔ اس سے ان لوگوں کو بڑا نفع پہونچا جو قرآن شریف کو از بر بلا منہ سمجھے یا ذکر لیا کرتے تھے۔ اس سے پیشتر حسب قدر ترجمہ قرآن شریف کے ہوئے تھے انکی زبان قدیم تھی اکثر الفاظ متروک ہو گئے تھے اور ترجمہ تحت اللفظ تھا اسوجہ سے مقبول عام نہ تھا مولانا نے چار عالمونکی مدد سے پورا ترجمہ نہایت محنت و جانکاہی سے تین برس کے عرصہ میں پورا کر دیا۔ مگر اس میں بھی اتنا نقص ضرور ہے کہ بعض جگہ ترجمہ کی قنانت و تاہم نہ رہی اور اصل الفاظ کا مطلب اردو الفاظ و محاورات کے سبب تصرف سے جانا رہتا ہے اور نیز یہ کہ کثرت تشریح اور اضافہ فضیلت کی وجہ سے ترجمہ ترجمہ نہیں رہتا بلکہ ایک تفسیر کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ آخر عمر میں انہوں نے ادعیۃ القرآن ہوئے اور الحقوق والفرایض تصنیف کیں جنہیں سے آخر الذکر ایک جہت مع اور مکمل کتاب ہے۔ انکی آخری تصنیف جو نامکمل رہ گئی ”مطالب القرآن“ ہے یہ اب چھپ گئی ہے۔ مولانا کے پاس ایک مطبع بھی تھا جسکا نام شمسی پریس تھا اسی میں انکی تصانیف چھپا کر تی تھیں۔

اخلاقی ناول سے پہلی کتاب جس سے مولانا کی شہرت کو ترقی ہوئی انکا ناول ملاء العروس ہے جو ایک سحرز مسلمان خاندان کی پرائیویٹ زندگی کا ایک قصہ ہے۔ اسکی تصنیف اسوقت ہوئی تھی جب مولانا ڈپٹی کلکٹر تھے قصہ کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ ایک جاہل بے پڑھی لکھی لڑکی ایک شریف گھرانے کی تعلیم کے ذریعہ سے کونو تبدیل گئی۔ یہ کتاب مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں میں

مقبول ہے اور عورتیں اسکو بہت ذوق و شوق سے پڑھتی ہیں۔ اسکی زبان نہایت سلیس اور با محاورہ ہے اور تعجب معلوم ہوتا ہے کہ مصنف عورتوں کی خاص زبان اسقدر صحیح اور با محاورہ لکھنے پر کیونکر قادر ہو۔ اس کتاب کو سبک میں بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور گورنمنٹ نے بھی ایک ہزار جلدیں خرید لیں اور ایک ہزار روپیہ لائق مصنف کو انعام دیا۔ اس کا ترجمہ ہندوستان کی اکثر دیسی زبانوں میں ہو گیا ہے۔ دوسری کتاب "نبات النعش" ہے جو مرآۃ العروس کے بعد اور اسی طرز پر عورتوں کی تعلیم کی غرض سے لکھی گئی۔ اس میں بھی نہایت مفید اور دلچسپ باتیں عام معلومات اور مبادی سائنس کے متعلق اکثر جگہ جگہ لکھی گئی۔ صورت میں درج ہیں۔ اسکی بھی سبک اور گورنمنٹ دو دنوں نے بڑی قدر کی۔ اسکے بعد "توبہ النصوص" کا نمبر ہے جو مولانا کا سب سے بہترین ناول سمجھا جاتا ہے۔ اس میں مختصر طور پر انہوں نے قصہ کے طریق پر یہ دکھلایا ہے کہ ایک فاسق و فاجر شخص جب کا نام نضیر ہے سخت ہمیضہ میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ایک خواب دیکھتا ہے، اسکے بعد بیدار ہو کر خوف خدا وندی سے لرز جاتا ہے اور پابند شرع ہو کر تمام نہیات سے توبہ کر لیتا ہے۔ اسکی بیوی اور بعض اور اعزاء بھی اسکے پیچھے ہو جاتے ہیں مگر اسکا بڑا لڑکا اسکی راہ پر نہیں آتا اور مصائب میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس میں مولانا نے ضمناً اولاد کی بڑی اٹھان کے بڑے نتیجے اور کسی میں انکی سخت گیری اور نگرانی کی اہمیت کو بڑی خوبی سے دکھلایا ہے۔ "ابن الوقت" میں ایک ہندوستانی شخص کا حال لکھا گیا ہے جو غدر کے زمانے میں اپنی خدایات کے صلے میں ایک بڑے عہدہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اور انگریزوں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے انہیں کی طرز معاشرت کو اختیار کر لیتا ہے اور یورپین سوسائٹی میں شامل ہو کر اپنے ہندوستانی عزیزوں اور دوستوں کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ پھر بعد کرب اس کے انگریز دوست سب چلے جاتے ہیں تو وہ کہہ رہی کہ انہیں رہتا اور آخر کار بڑی دقت سے پھر اپنی ہی قوم و جماعت کے لوگوں میں ملنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کتاب کی نسبت بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اس میں مصنف نے خود اپنی ہی سرگزشت ایک افسانہ کے پیرایہ میں بیان کی ہے۔ "ایامی میں" انہوں نے بیوہ عورتوں کی شادی پر بہت زور دیا ہے اور ہندوستان میں انکی افسوس ناک حالت کو بیان کر کے شرعاً ازواج ثانی کے جواز کو ثابت کیا ہے۔

محضات میں تعدد از دلج کا نقصان دکھایا ہے۔ ”دیوانے صادق“ میں اہل اسلام کے کچھ مذہبی عقاید کی بحث ایک لمبے کلمہ کی صورت میں کی گئی ہے۔ مذکورہ بالا سب کتابیں نہایت اخلاق آموز اور نصیحت خیز ہیں۔

لیکچر اور تقریریں ملازمت سے کنارہ کشتی کے بعد مولانا نے اپنی تقریریں اور لکچر شروع کر دیے تھے ہمارے خیال میں آپکا پہلا پبلک لکچر ۱۸۸۷ء میں ہوا تھا۔ وہ انجمن حمایت الاسلام لاہور اور مدرسہ طیبہ دہلی اور محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں پرزور تقریریں کرتے تھے۔ سرسید مرحوم کے اثر سے وہ ہر اسلامی اہم اجتماع میں شریک ہوتے تھے اور سامعین کو اپنی پرمختصر تقریروں سے محفوظ کرتے تھے۔ وہ نہایت خوش بیان اور طلیق اللسان مقرر تھے اور یہ بھی انکا قاعدہ تھا کہ اپنی وسیع معلومات اور دلچسپ حکایات اور علی الخصوص اپنے طرافت آمیز طرز بیان سے سامعین کو بہت محفوظ کرتے تھے انکا مجموعہ لکچر چھپ گیا ہے اور مختلف انواع مضامین مشتمل ہے اس میں عقاید مذہبی تعلیم و تربیت انسان وغیرہ پر نہایت موسو کا بحث کی گئی ہے۔

بحیثیت شاعر کے آخر عمر میں شاعری نے بھی طبیعت کو گدگدایا تھا اور شعر بھی کہہ لیتے تھے کبھی کبھی اپنے لکچروں کو اپنے اشعار سے دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر ہم نہایت ادب سے اس بات کے کہنے پر مجبور ہیں کہ وہ محض تبرک ہی تبرک ہوتے تھے اور شعریت انکین مطلق نہ تھی۔ درجہ کچھ کلام میں ترقی ضرور ہوئی مگر اصل جذبات شعر پر سے وہ ہمیشہ دور رہے۔ ان کا منظوم کلام چھپ چکا ہے اور مجاہد بنظیر کے نام سے موسوم ہے مگر اس سے انکی قابلیت میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوتا۔

اخلاق و عادات مولانا نہایت سادہ مزاج، مہذب اور بہت ظریف الطبع تھے زندگی نہایت سادگی بلکہ عسرت سے بسر کرتے تھے اسید وجہ سے خبریں مشہور تھیں۔ مگر پھر بھی بعض بعض غریب طلباء کی امداد بہت فراخ دلی سے کرتے تھے۔ آخر عمر میں روپیہ جمع کرنے کے شوق میں تجارت شروع کر دی تھی جس سے انکی آمدنی میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا تھا تعلیم و تعلم کے وہ تہذیبی تھے کہ مرتے دم تک یہی اشتغال جاری رکھے تھے علیگڑھ کالج کے وہ پرانے سرپرست اور معاون تھے ۱۸۹۷ء میں خطاب



خان به در مولوي : کلا لک خان



مروزی سید احمد (دقاری) مولف فرهنگ آشنایی

شمس العلماء نے فارمین یونیورسٹی آف ایڈنبرا کی طرف سے۔ ال ایل ڈی کی اعزازی ڈگری۔ اور ۱۹۰۷ء
میں پنجاب یونیورسٹی کی ڈی۔ او ایل لینے ڈاکٹر آف اوپریل رنگ (عالم علوم مشرقیہ) کی ڈگری حاصل
کی تھی۔ اور نواب لغٹنٹ گورنر پنجاب نے جو بحیثیت چانسلر جلسہ کانوکیشن کے صدر تھے ڈگری دینے وقت
انکے علم و فضل اور طباعی و ذہانت کی بہت تعریف کی تھی۔

طرز تحریر مولانا کی عبارت بہت آسان اور صاف و سادہ ہوتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی بڑے بڑے
عربی و فارسی کے غیر مانوس الفاظ آتے ہیں۔ اور کہیں نہ کہیں عبارت اور صنایع بدائع سے اور بعض
مواقع پر انگریزی الفاظ سے بھی کام لیتے ہیں۔ جن سے ہمارے نزدیک عبارت میں بجائے چستی اور خوبصورتی
کے بھونڈاپن اور خرابی پیدا ہو جاتی ہے آزاد کی سی لطافت اور شیرینی انکے بیان نہیں ہے البتہ حاصل
چیز جو انکی نشر کا جو ہر اعلیٰ ہے وہ ان کا طریقہ رنگ ہے جو ان کے ناول لکچر اور مضامین سب میں
بدرجہ اتم موجود ہے انکی ظرافت بہت ہلکی اور لطیف ہوتی ہے اور اس میں ہیکٹرین مطلق نہیں ہوتا
مولانا اپنے تمام معاصرین کا بجا ظاہر شہرت سبقت لیگئے ہیں۔ یہ اس لئے کہ قوانین کے تراجم سے
وہ گورنمنٹ اور سپلک میں روشناس ہوئے۔ قرآن شریف کے ترجمے سے مسلمانوں میں انکی شہرت
ہوئی۔ اور نادلون وغیرہ کی وجہ سے ہر گھر میں انکا نام پہنچ گیا۔

مولوی ذکا رائے شمس العلماء مولوی محمد ذکا رائے قدیم دلی کالج کے مشہور شاگرد و تلمیذ تھے اور
۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۷ء خود انہوں نے اپنی زندگی بچہ کی تعلیم و ترقی کے لئے وقف کر دی تھی
۱۸۳۷ء میں دتی میں پیدا ہوئے والد کا نام حافظ ثناء اللہ تھا اور مرزا کوچک سلطان بہادر شاہ
کے سب سے چھوٹے بیٹے کے تالیق تھے مولوی ذکا رائے بارہ برس کی عمر میں کالج میں داخل
ہوئے جہاں مولوی نذیر احمد اور مولوی محمد حسین آزاد بھی پڑھتے تھے لہذا ان تینوں میں عمر بھر رابطہ تھا
و محبت قائم رہا اور تینوں آدمی شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز ہوئے جب مولوی ذکا اللہ کالج
سے پڑھ کر نکلے تو پھر اسی کالج میں ریاضی کی تعلیم مقرر ہوئے جسکے بعد اگر کالج میں فارسی وارڈ کے پرنسپل
ہو گئے۔ سات آٹھ برس تک تعلیمی لائن میں رہ کر ۱۸۵۷ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس بمقام بلند شہر و

مراد آباد ہو گئے جس جگہ پر تقریباً گیارہ سال تک رہے۔ ۱۸۶۹ء میں دلی نارمل سکول کے پرنسپل علی ہوئے اور ۱۸۷۸ء میں اوڈیشہ کالج لاہور کی پروفیسری کے واسطے نامزد ہوئے۔ مگر قبل اسکے کہ اس نے عہدہ کا چارج لین سو رینڈل کالج آلاہ آباد میں عربی و فارسی کی پروفیسری اُنکو مل گئی چنانچہ ۱۸۷۲ء میں ملاومت کے بعد پٹنہ پائی اور تقریباً سہ ہجپس برس پٹنہ سے بہرہ یاب ہو کر ۱۸۷۹ء میں انتقال کیا۔

تصانیف تصانیف کثرت سے ہیں۔ اور متعدد مضامین پرنسپل ہیں۔ مثلاً ریاضی تاریخ جغرافیہ۔ ادب اخلاق طبعیات۔ گیہا۔ سیاسیات وغیرہ۔ مطبوعہ وغیرہ مطبوعہ کتابوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو سے کم نہ ہوگی۔ تصانیف کی کیفیت یہ ہے کہ زیادہ تر اسکولوں کے طلباء کے لئے لکھی گئی ہیں۔ لہذا رنگینی و عبارت آرائی اور ایک ادبی شان انہیں بالکل نہیں ہے۔ مولوی صاحب بحیثیت ایک ریاضی دان اور مترجم اور مورخ کے مشہور ہیں۔ مگر ریاضی میں اُنکا پایہ بلند نہ تھا اور انکی کوشش صرف انگریزی کتابوں کے ترجمے اور انکی ترجمین لکھنے تک محدود رہی۔ البتہ تاریخ میں انہوں نے ایک کارناما بیان ضرور کیا۔ انکی تاریخ ہندوستان دس جلدوں کی ایک ضخیم کتاب اور قابل قدر تصنیف ہے گواسمین ریسرچ سے کم کام لیا گیا ہے اور عامۃ الناس کے لئے ہے۔ ہمارے عظیم مین اُن بڑی لٹریچر کا ذکر ہے جو انگلستان اور دوسرے ملکوں میں کوئن و کٹوریہ کے عہد میں ہوئی تھیں۔ انکی ایک اور بھی عمدہ تصنیف ہے جیمین کوئن و کٹوریہ کے عہد کے حالات اور ترقیان و ہج میں جو تین جلدوں میں ہوئی ہیں۔ آئین قیصری میں کوئن و کٹوریہ کے عہد کی انتظامی تبدیلیاں جو ہندوستان میں ہوئیں اور فرہنگ فرنگ میں یورپین شائستگی کی تاریخ اور کوئن و کٹوریہ اور اُنکے شوہر کی زندگی کے حالات درج ہیں۔ مولوی سمیع اللہ خان بہادر سی۔ ایم۔ جی کی سوانح عمری بھی انکی تصنیف ہے آخر عمر میں ایک تاریخ اسلام لکھنے میں مشغول تھے مگر وہ ناتمام رہی۔ ان تمام کتابوں کا طرز تحریر نہایت صاف سلیس اور عبارت آرائی اور قلم سے بالکل پاک ہے اور وہ سب اسکولوں میں پڑانے کے قابل ہیں۔ مولوی صاحب میں ایک بڑی صفت یہ تھی کہ وہ اکثر مشہور جرائد اور رسالوں کے باقاعدہ مضمون نگار بھی تھے مثلاً تہذیب الاخلاق سائنٹفک گزٹ علیگڑھ۔ رسالہ حسن۔ ادیب فیروز آباد۔

محزن زمانہ خاتون وغیرہ انکی کثیر التصانیفی پر مولانا حالی نے یہ بھینتی کسی تھی کہ مولوی ذکا اللہ کا داغ ایک بننے کی دوکان ہے۔ جہن ہر قسم کی جنس موجود رہتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہی لطیف اشارہ ہو کہ بننے کے یہاں عمدہ اور قیمتی چیزیں کہاں ملتی ہیں۔

گورنمنٹ نے انکے علمی خدمات کی بڑی قدر کی تھی ترقی تعلیم سکولن کی کوششوں کے صلے میں انکو ایک خلعت عطا ہوا اور دیگر علمی خدمات کے واسطے پندرہ سو روپیہ کا انعام اور خطاب خان بہادر و شمل العلماء عنایت ہوا۔ مولوی صاحب سید جوم کے گھرے دوستوں میں تھے اور انکے تمام تعلیمی کاموں میں ہاتھ بٹاتے تھے۔

مولوی حسرت بیہاری مولوی شیدا احمد دہلوی اپنی مشہور و معروف اردو لغت "فرہنگ آصفیہ" کے مصنف ہونے کی حیثیت سے اردو دان پبلک میں ایک خاص شہر رکھتے

ہیں۔ دہلی میں ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے باپ کا نام حافظ سید عبد الرحمن تھا جو مستند سادات سے تھے اور ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم رواج زمانہ کی موافق دیسی مکتبہ میں ہوئی جب کچھ حرفت شناس ہو گئے تو سرکاری اسکول اور نارمل اسکول میں تحصیل علم کیا۔ اسکے بعد اپنی فطری طباعی اور شاہیر

اہل علم کی صحبت سے کچھ فائدہ اٹھایا بچپن ہی سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ چنانچہ طالب علمی ہی کے زمانہ میں ایک چھوٹی سی فارسی نظم "طفلی نامہ" کے نام سے اور ایک انشائیہ کتاب "تقریر الصبیان"

لکھ ڈالی ۱۸۹۷ء میں انکی کتاب کنز الخواہی منکلی جیسے سرکار سے دو سو روپیہ انعام ملا ۱۸۹۷ء میں انہوں نے اپنی جلیل القدر تصنیف فرہنگ آصفیہ کے واسطے سالہ جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں انکی

دوسری کتاب "دقائق و درویش" شائع ہوئی جس پر انکو مبلغ ڈیڑھ سو روپیہ انعام ملے۔ اس رقم سے انکی فرہنگ آصفیہ کی تیاری میں کچھ آسانیاں ہوئیں۔ اس انشاء میں ڈاکٹر فیض صاحب نے جو صوبہ بہار میں

انسپکٹر مدارس تھے انکو بلا ہرجا اور اپنی اردو اور انگریزی کی لغت کی تیاری میں اُن سے مدد لینا چاہی مولوی صاحب راضی ہو گئے اور فیض کی ڈکشنری سات برس کی محنت شاقہ کے بعد ختم کی مگر اسکے ساتھ ہی ساتھ اپنا

کام بھی کرتے رہے ۱۹۱۷ء میں انہوں نے ہمارا جہاں اور کا ایک سفر نامہ مرتب کیا۔ اسکے بعد ڈاکٹر

پنجاب کے سرکاری بک ڈپو میں نائب مترجم کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ فیلچ صاحب کی ڈکشنری کی تیاری کے زمانہ میں انہوں نے اپنی کتاب ہادی النساء، شائع کی جو بہت مقبول ہوئی۔ اسکے بعد انکی حسب میل تصنیفات شائع ہوتی رہیں جو اپنے طرز میں سب نہایت عمدہ اور مفید ہیں۔ ”تکمیل الکلام“ ہمیشہ درون کے اصطلاحات میں ”تحقیق الکلام“ اردو زبان کے نکات کے متعلق۔ ”رس مکان“ جس میں کچھ ہندی دوسرے اور سیلیان اور گیت ہیں۔ ”ریت کہان“ اہل ہندو کے رسم و رواج کے متعلق۔ ”ناری کتھا ہندو“ تو لکی بولی۔ قواعد اردو تعلیم نسوان اور عورتوں کے متعلق انکی حسب میل کتابیں بہت مشہور ہیں۔ لغات النساء، تحریر النساء (لوکیوں کی ریڈر) ”بی راحۃ زبانی کا قصہ“ عورتوں کو وقت کی قدر و قیمت سکھاتا ہے۔ ”اخلاق النساء“ بچوں کی پرورش اور تربیت کے متعلق۔ ”علم النساء“ زبان اور انکی ترقی کے متعلق۔ ”رسوم دہلی“ جہمیں دہلی کے مروجہ رسوم و رواج کا ذکر ہے غیر مطبوعہ کتابوں میں سیر شمشاد حسین شملہ کی تاریخ بھی داخل ہے۔ ”اردو ضرب الامثال“ ”روزمرہ دہلی“ ”رسوم علی ہندوان دہلی“۔ انہیں سے بعض اب شائع ہو رہی ہیں۔

فرنگ آصفیہ اس کتاب کی تیاری اور طباعت کی دقتوں اور پریشانیوں کے متعلق مصنف نے دیباچہ میں بہت طویل دیکر لکھا ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ مولوی صاحب کو اتنی بڑی تصنیف کے چھاپنے کے لئے ایک زکیر کی ضرورت تھی جسکی فراہمی سخت مشکل تھی۔ بالآخر خوش نصیبی سے ۱۸۸۷ء میں آسمان جاہ بہادر شملہ آئے جہاں مولوی جتنا بھی کسی سکول میں ملازم تھے۔ مولوی صاحب نے وزیر عظمہ حیدر آباد کی خدمت میں حضوری حاصل کر کے اپنا مسودہ بطور نذر کے گرانابا جو سید علی بگلاری کے معائنہ کے بعد منظور کر لیا گیا اور انعام کا وعدہ کیا گیا۔ جب ۱۸۹۶ء میں کتاب ختم ہوئی تو اس کا نام فرنگ آصفیہ رکھا گیا۔ اور اسکے سلسلہ میں مصنف صاحب کو حیدر آباد متعدد دفعہ جانا پڑا۔ آخر کار وہ اپنی امید و نین کامیاب ہوئے اور پچاس سو روپے بطور پیشین اور پانچ سو روپے انعام دیا گیا۔ سید طرح گورنمنٹ پنجاب نے بھی اسکی قدر افزائی میں بہت کچھ حصہ لیا۔ فی الحقیقت یہ کتاب لغات اردو کی کتب میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے اور ایک بڑی تحقیقات اور جانکا ہی کی یادگار ہے۔

شہلی نہانی ۱۲۵۰ھ تا ۱۲۹۱ھ

تعلیم اور ابتدائی مشاغل

مولانا شہلی نعمانی اپنے زمانہ کے مشہور ترین و قابل ترین بزرگوں میں تھے۔ بہت تہمتا کثیر الاشواق اور جامع الازواق تھے۔ اگر کوئی ایک شخص ایک شاعر فلسفی منطق ناقد ماہر تعلیم معلم واعظ رفارم جریہ نگار رفیعہ محدث سب کچھ ہو سکتا ہے تو وہ مولانا ہی کی ذات تھی کہ انہوں نے ان سب کمالات مختلفہ اور علوم و فنون متنوعہ کا اپنی ذات میں اجتماع کر لیا تھا اور اس شعر کے صحیح مصداق بن گئے تھے **وَلَيْسَ لِلَّهِ بَشَرٌ كَمَا كَانَ يَجْمَعُ الْعَالَمُ فِي الْوَاحِدِ مَكَانٍ تَبِينِ** ادب تایخ اور ریسرچ میں انکا رتبہ بہت بلند تھا۔ ۱۲۵۰ھ میں موضع مندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد شیخ حبیب اللہ (جو کیل تھے) کے سائیہ عاطفت میں تربیت پائی۔ ابتدائی کتابیں مولوی شکر اللہ نامی ایک شخص سے پڑھیں اور جب عربی و فارسی میں کچھ دستگاہ ہو گئی تو مولانا فادوق پیر یا کوٹی کے سامنے جو اس وقت عازمی پور میں ہیڈ مولوی تھے اور فلسفہ و ریاضی و ادب غیرہ کے استاد مانے جاتے تھے زانوئے شاگردی تہ کیا انہیں سے انہوں نے عربی ادب اور معقولات پڑھیں تھیں۔ پھر جذبہ شوق نے اہلارا اور تلاش علم کی واسطے وہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اعظم گڑھ سے رام پور پہنچے جہاں استاد زمانہ مولوی عبدالحق خیر آبادی سے معقول اور مولوی ارشاد حسین صاحب محدث سے حدیث و فقہ کے اسباق لئے۔ لاہور میں ادیب کامل مولوی فیض الحسن صاحب سے حماسہ پڑھا ہانے سہارنپور آئے اور تکمیل حدیث مولوی احمد علی صاحب سے کی ۱۲۵۸ھ میں جبکہ انکی عمر صرف ۹ سال کی تھی عازم حج بیت اللہ ہوئے اور راستہ میں وفور شوق اور جوش عقیدت سے ایک پروردِ قیسمہ فارسی کہا۔ بعد فراغت حج اعظم گڑھ واپس آئے اور سلسلہ درس و تدریس جاری رکھا۔ شوق کتب بینی کا یہ حال تھا کہ کتب فروشوں کی دکان پر ٹھیکر اکثر کتابیں دیکھا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں رد و لمبہ میں ۱۲۵۰ھ مولانا میرے حال پر اک خاص نظر عنایت و شفقت رکھتے تھے مچھلوان کے اس استغراق کتب بینی کا ایک چشم دید و قہر یاد ہے جس کا ذکر اس موقع پر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ منشی نثار حسین مرحوم ایڈیٹر پیام بار مولانا کے ایک بے تکلف دوست تھے انکی چوک میں عطری دکان تھی۔ جب مولانا لکھنؤ میں قیام کرتے تو سبزی منڈی میں خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز کے مکان پر فروکش ہوتے اور سہ پہر کو منشی نثار حسین کی دکان پر جو قریب ہی تھی آ بیٹھتے تھے۔ یہاں اکثر ارباب کمال (بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۶ پر ملاحظہ ہو)

بھی کچھ رسالے لکھے جس میں "اسکاتالہ المستدی" جو عربی میں ہے زیادہ مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے امتحان وکالت بھی پاس کیا تھا اور اعظم گڑھ اور سببی میں کچھ دنوں وکالت بھی کی تھی اور آخر کار جب اس پیشہ سے جی بھر گیا تو سرکاری ملازمت بھی چند دنوں کی تھی اور کہیں کے امین ہو گئے تھے چند دنوں کے بعد یہ ملازمت چھوڑ دی اور اب ہمہ تن خدمت علم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ۱۸۸۲ء میں اپنے چھوٹے بھائی محمدی سے ملنے کے لئے جو علیگڑھ کالج میں پڑھتے تھے علیگڑھ جانے کا اتفاق ہوا یہاں تہو وسط خان بہادر محمد کریم ڈپٹی کلکٹر مولوی سمیع اللہ خان سے ملے جنکے ذریعہ سے سرسید مرحوم کی خدمت میں باریاب ہوئے اور ایک درخواست فارسی پر و فیسی کی جگہ کے واسطے جو اس وقت خالی تھی گذرانی۔ جو منظور ہو گئی اور کچھ دنوں شہر میں قیام کے بعد خوش نصیبی سے سید صاحب کے ٹنگلے کے قریب رہنے کو جگہ مل گئی۔

قیام علیگڑھ | علیگڑھ کالج کی اس زمانہ کی فضا اس گل سرسید کی شگفتگی کے لئے بہت مفید ہوئی۔ ارباب کمال مثلاً سرسید اور مولانا حالی وغیرہ کی صحبت اور سرسید کے کتب خانے کی قربت سے مولانا نے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ علیگڑھ کے مشہور اسلام دوست پروفیسر آرنلڈ سے ملاقات ہو گئی مولانا نے اس سے فریج سیکھی اور انگوٹھی سکھائی جس طرح سے مولانا نے حکایت تنقید بطر زابل مغرب آرنلڈ صاحب

کا جمع ہوا تھا جس میں مولوی عبدالحلیم تشریف تو قدوائی۔ لڈن صاحب خورشید۔ ابو صاحب جلیس۔ سید شمشاد حسین رضوی دکنل مرحوم اور اور بے محنت احباب جمع ہوتے اور گھنٹہ دو گھنٹہ بٹیکر خوش گپیان کرتے۔ وزیر متولی کی خوش لائقہ لکھو ریون اور حسین بخش سانی کے معطر حق سے احباب کی صیافت کی جاتی کبھی کبھی پنڈت رتن ناتھ سرشار کو ٹپلون ڈالے عینک لگا لئے آنکھیں پچکاتے اور ہنستے اس جلسہ میں شریک ہو جاتے اور اپنی پر لطف باتوں سے سب کو مخطوط کرتے ایک دن جبکہ یہ سب یاران طریقت جمع اور مولانا بھی تشریف فرما تھے۔ شاید چھٹی یا ساتویں تاریخ محرم کی تھی وقت ۴-۵ بجے شام چکر میں جڑا جمع تھا تھوڑے معہ جلوس اور باجون وغیرہ کے گل رہے تھے شور و غل اور مجمع کی کوئی حد تھی سب لوگ اس سیر میں مشغول مگر مولانا دکان کی کوٹھری میں بند کسی کتاب کے مقابلہ میں جو کسی کاتب سے لکھائی گئی تھی اس قدر مشغول اور مہمک تھے کہ باوجود دوستوں کے سخت اصرار کے بھی سراٹھا کر نہ دیکھا اور اپنا کام کرتے رہے یہاں تک کہ پوری کتب بستی حالت میں تقریباً اس گیارہ بجے تک ختم کر دی۔ مترجم۔

سے حاصل کئے ہوئے اسطرح انصاف یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پروفیسر صاحب اپنی کتاب پر بچک آت
اسلام کی اکثر باتوں کے لئے مولانا کے ممنون ہیں۔

ابتدائی تصانیف غالباً علیگڑھ ہی میں مولانا کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اسلام کی قدیم شان و شوکت
اور اکابر سلف کے زرین کارنامے قلمبند کئے جائیں۔ اس مبارک کام پر سرسید نے بھی انکی بہت
افزائی کی یہاں سرسید کا کتب خانہ موجود ہی تھا جس میں دور دراز مقامات صر و شام تک کی مطبوعہ
کتابیں دستیاب ہو سکتی تھیں ۱۸۸۷ء میں ننوی صبح امید کا شمار مولانا کے اہم تصنیفات پر
جلوہ کر رہا تھا جس میں اسلام کی شان و شوکت موجودہ مسلمانوں کی محبت و ملاکت اور انکے اہلکاروں
کے لئے سرسید کی کوششوں کا ذکر نہایت پُر زور طریقے سے کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک زمانہ میں
اس قدر مقبول اور علیگڑھ کالج کے طلباء کو اتنی پسند تھی کہ اکثر اوقات وہ اسکو اسٹیج پر خوش آوازی
سے پڑھتے اور لوگوں کے دل کو بے چین کرتے تھے "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" جو ۱۸۸۷ء کی ایجوکیشنل
کانفرنس میں بطور ریڈریس پڑھی گئی تھی ۱۸۸۷ء میں چھپ کر شائع ہوئی جس سے لوگوں کو مولانا
کی تاریخی معلومات اور تجربہ علمی کا پورا پتہ معلوم ہوا۔ اب دنیائے تصنیفات میں انکی شہرت بہت
بڑھ گئی تھی۔ انکے دلیں خیال آکا ایک مکمل اور مفصل تاریخ بلاد اسلام اور خلفائے عباسیہ کی مرتبہ کچھ
اور اس کا نام "ہیر و زآف اسلام" (مشاہیر اسلام) انگریزی کی تقلید میں رکھا جائے۔ اس سلسلہ
میں انہوں نے "المأمون" اور "سیرۃ النعمان" لکھی اور "الفاروق" شروع کرنے والے تھے کہ ۱۸۹۰ء
میں سفر روم و شام اختیار کیا جس میں پروفیسر آرنلڈ بھی انکے ہمراہ تھے اور انہوں نے قسطنطنیہ اور ایشیا
کو چک اور شام و مصر کے بڑے بڑے شہروں کی سیر کی۔ اس سفر کی زیادہ تر یہ غرض تھی کہ "الفاروق" کی
تیاری کے واسطے صحیح اور مستبر کاخذ کا پتہ لگایا جائے نیز یہ بھی کہ بلاد اسلامی کی شان و شوکت اپنی آنکھ سے
دیکھی جائے۔ سفر سے واپسی کے بعد انکا "سفر نامہ روم و شام" نکلا جس میں پورے سفر کے حالات بہت
دلچسپ طریقے سے قلمبند ہیں ۱۸۹۰ء میں جب کہ سرسید کا انتقال ہو گیا تو مولانا بھی دل برداشتہ
ہو گئے اور اپنا سلسلہ کالج سے منقطع کر لیا اور اعظم گڑھ گئے اب وہ "الفاروق" کی تیاری میں ہمت

مصروف ہو گئے اور ایک قومی انگریزی اسکول کی ترقی میں بھی بہت کوشش کی جس کا افتتاح ۱۸۸۷ء میں ہو چکا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں سفر کشمیر پیش آیا۔ مگر اتفاق سے وہاں مولانا بیمار ہو گئے اور اسی حالت میں ”الفاروق“ اختتام کو پہنچی۔

قیام حیدر آباد مولانا کا سفر حیدر آباد نواب وقار الامرا کی وزارت کے زمانہ میں ہوا تھا۔ سب سے پہلے وہ مولوی سید علی بلگرامی کی کوشش سے ناظم محکمہ تعلیم بمشامہ دوسو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے جو بعد کو تین سو روپیہ ہو گیا تھا۔ مولانا یہاں چار برس رہے اور اس زمانہ میں انہوں نے محکمہ تعلیم میں بہت کچھ ترقیاں کیں اور اس کے ساتھ اپنا سلسلہ تالیف و تصنیف بھی براہ جاری رکھا۔ سید علی بلگرامی نے جو سلسلہ کتب تصنیف کا جاری کیا تھا اُس میں مولانا کی بھی بعض کتابیں شامل ہیں۔ اسی قیام حیدر آباد کے عرصہ میں جب کہ مولوی عزیز مرزا صاحب کا دور دورہ تھا مولانا نے حیدر آباد میں ایک مشرقی یونیورسٹی کھولنے کا اسکیم تیار کیا تھا اور ”الغزالی“ سوانح مولانا دوم ” الکلام“ ”علم الکلام“ اور ”موازنہ افیس و دبیر“ یہ سب اسی زمانہ کی تصانیف ہیں۔

ندوۃ العلماء ندوۃ العلماء کا قیام ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں ہوا تھا اُس کے قیام کی غرض اصلی یہ تھی کہ عربی مدارس کے لئے ایک معینہ نصاب تعلیم ضروریات زمانہ کا لحاظ رکھ کر بنایا جائے نیز یہ کہ مسلمان ہندوستان کے آپس میں یا ان کی جماعتوں میں جو اختلافات ہیں وہ رفع کئے جائیں۔ اس عمدہ خیال کے محرک مولوی عبدالغفور صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے مگر اس کی تکمیل مولوی محمد علی صاحب کا پوری

۱ مقاصد ندوۃ العلماء جو سودہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے آخری صفحہ کے پشت پر درج ہیں حسب ذیل ہیں۔

- (۱) نصاب تعلیم کی اصلاح اور علوم دین کی ترقی اور تہذیب اخلاق اور شائستگی الطوار۔
- (۲) علماء کے باہمی نزاع کا دفع اور اختلافی مسائل کے رد و طرح کا پورا پورا اسناد۔
- (۳) عام مسلمانوں کی صلاح و فلاح اور اسکے تدابیر مگر سیاسی اور ملکی معاملات اس سے علیحدہ ہیں۔
- (۴) ایک عظیم الشان اسلامی دارالعلوم قائم کرنا جس میں علوم و فنون کے سوا عملی صنائع کی بھی تعلیم ہوگی۔
- (۵) دینی امور میں فتنے دینے کی واسطہ حکمہ افتاء کا ہونا جس میں بڑے بڑے عالم اور مفتی ہوں گے۔

خلیفہ حضرت مولانا فضل رحمن صاحب مراد آبادی کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی جو اس کے بانی اور ناظم اول تھے۔ مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق دہلوی صاحب تفسیر حقانی نے اسکے قواعد و ضوابط مرتب کئے اکابر قوم مثلاً سر سید نواب محسن الملک و نواب وقار الملک وغیرہ نے بھی اسکے اغراض و مقاصد کو پسند کیا اور تحریر و تقریر کے ذریعہ سے اس کا خیر مقدم کیا۔ کہا جاتا ہے کہ نواب وقار الملک سورہ پیمہ یا ہوا زندہ کو اپنے پاس سے دیتے تھے پھر مولانا شبلی کی تجویز ہوئی کہ اس جماعت کے تحت میں ایک مدرسہ کھولا جائے جو ضروریات و امت کا لحاظ رکھ کے طلباء کو تعلیم دے سکے چنانچہ سال ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں اسی تجویز کے موافق دارالعلوم کے کچھ ابتدائی درجے کھول دئے گئے۔ اور سال ۱۸۹۹ء میں رؤسا، شاہماہنور کی فیاضی سے کچھ زمینداری بطریق وقف اندوۃ العلماء کو حاصل ہوئی جسکو ندوۃ العلماء نے ٹھیکہ پر دیدیا ہے اور مبلغ سات روپیہ سالانہ اُسکی آمدنی سے ملتا رہتا ہے۔ ایک عظیم الشان کتب خانہ کی بھی بنیاد ڈالی گئی جس میں تقریباً دس ہزار کتابیں داخل ہو چکی ہیں اور علاوہ مطبوعات یورپ، مصر، قسطنطنیہ، تونس، طرین وغیرہ کے تقریباً ایک ہزار کتابیں قلمی اور اکثر نادار الوجود ہیں جو مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں یا مصنفین کے قریب زمانہ میں لکھی گئی ہیں اور ان پر نامور علماء کے دستخط موجود ہیں۔ اس نوبت پر ایک منسوس ناک واقعہ پیش آیا کہ سر ریڈیو نیکیڈ اٹل جو اسوقت ممالک متحدہ کے لفٹنٹ گورنر تھے ندوہ کے سخت بھٹ ہو گئے۔ اور اسکو سیاسی سازشوں کا ایک آلہ کار سمجھ کر نگاہ شک سے دیکھنے لگے۔ مولوی احمد خان بریلوی کے بعض رسائل بھی جو بہت پر جوش لہجے میں لکھے گئے تھے اسوقت تکھے اور ندوہ کے مقابلہ پر ایک جنگجو جماعت جدوہ قائم کی گئی جسکے اجلاس کلکتہ میں ہوئے تھے غرض کہ جب لاٹ صاحب ولایت چلے گئے تو مولانا شبلی حیدر آباد سے لکھنؤ آئے اور ندوۃ العلماء کے اہم انتخابات کو اپنے ہاتھ میں لیا اور پبلک اور گورنمنٹ کے دلیں جو بدگمانان اور شکوکا سکی طرف سے پیدا ہو گئے تھے انکے رفع کرنے میں بڑی کوشش کی۔ اس کام میں کرنل عبدالمجید خان صاحب نے بھی اعلیٰ ٹری مدد کی۔ ندوہ کی مالی حالت اسوقت ایسی خراب ہو گئی تھی کہ اسکے ٹوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ مولانا

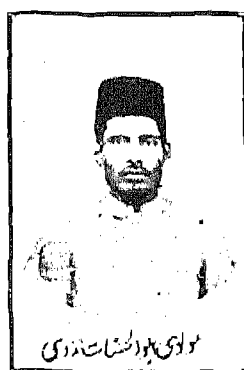
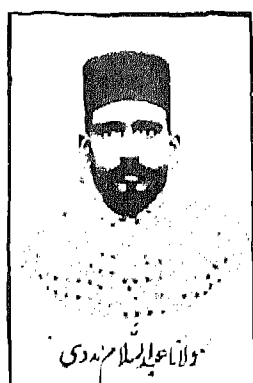
نے اسکو درست کرنے کے لئے اکثر طبی ریاستوں کا سفر کیا اور رام پور سے مبلغ پانچ سو روپیہ سالانہ اور بہوپال سے مبلغ ڈیڑھ سو روپیہ سالانہ اعانتی زمین مقرر ہوئیں اسید طرح ہزار کینس آغا خان نے پانچ سو روپیہ سالانہ اور نواب صاحب بہاول پور کی جدہ ماجدہ نے پچاس ہزار روپیہ تعمیر عمارت کے واسطے عنایت کئے گو رمنٹ سے ایک وسیع اور خوشنما قطعہ اراضی دیائے گو متی کے کنارے لکھنؤ میں دارالعلوم کے واسطے عطا فرمایا نیز چھ ہزار روپیہ سالانہ کی امداد انگریزی زبان اور علوم دینی کے لئے دنیا منظور فرمایا۔ سر جان ہیوٹ صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ نے دارالعلوم کاسنگ نبیا و ۲۸ نومبر ۱۹۰۷ء کو رکھا اس طرح مولانا کی کوششیں بارہوئیں مگر آپس کی زمین ہنوز قائم رہیں کیونکہ علماء اکا آپس میں متحد الخیال ہونا سخت مشکل کام تھا۔ وہ لوگ مولانا پر جب انگلی آزا خیالی کے پورا اعتماد نہیں رکھتے تھے۔ اسوجہ سے مولانا کچھ بدولت ہو کر ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ سے چلے گئے۔ اور اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی اسی اثنا میں ایک نہایت افسوسناک واقعہ پیش آیا کہ مولانا کی ٹانگ ایک اتفاقیہ گولی کے لگ جانے سے زخمی ہوئی اور آخر کار مجبور ہو کر اسکو کانٹا پڑا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی گذشتہ تاریخ ۱۹۰۷ء میں ندوۃ العلماء کی جمالی حالت بیان کی گئی ہے اس سے ندوۃ العلماء کی آمدنی حسب ذیل معلوم ہوتی ہے (۱) بہوپال سے تین ہزار روپیہ سالانہ جواہر ماہ ملتا ہے (۲) بہادر پور سے وظائف کی مدد میں سو روپیہ سالانہ (۳) مسلمانان مہاراش سے تقریباً دو ہزار روپیہ سالانہ اس رقم سے طلباء غیر مستطیع کو مدد دی جاتی ہے (۴) دولت احمدیہ حیدرآباد دکن سے تقریباً سو روپیہ ماہوار دفتر کے خرچ کے لئے۔

عزیز محترم عالیجناب نواب صفی الدولہ سیاحی حسن خان بہادر علی میاں صاحب جنسے مولانا مرحوم سے ربط محبت و یگانگت بہت بڑا ہوا تھا اور جنکی نظر سے یہ مصنفون گذر چکا ہے فرماتے تھے کہ "قیام دارالمصنفین کے متعلق میں نے مولانا کو نیم راضی کر لیا تھا کہ لکھنؤ میں کھولا جائے مگر انکی خواہش تھی کہ اسکا تعلق ندوہ سے ہنوا دیر ایک بالکل غلطیہ چیز ہے اسکے واسطے بعض مواقع لکھنؤ میں دیکھے گئے اور مولانا نے دو ایک جگہوں کو پسند بھی کیا پھر مولانا بھی تشریف لے گئے میں بھی وہاں موجود تھا وہاں سے اپنے چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحاق کی اچانک موت کی خبر سکر وقتاً آایا انکو آنا پڑا یہاں سے وہ بضرورت غم گڑھ گئے اور مجھ کو لکھا کہ دارالمصنفین یہاں قائم کرنے کا ارادہ ہے اسکے افتتاح میں تم بھی شریک ہو۔ میں گیا تو معلوم ہوا کہ مولانا نے اپنا باغ وغیرہ اسکے واسطے وقف کر دیا ہے اور بعض اور لوگوں نے اپنی جائیدادیں دی ہیں یہ کہ بہت بہتر ہوتا کہ دارالمصنفین لکھنؤ میں قائم ہوتا ہنسکر فرمایا کہ کیا مضائقہ ہے یہاں اسکو بغل رہنے دیکھے جب موقع آئے گا تو لکھنؤ میں منتقل ہو جائیگا۔



مولانا شاپلي زهماني



ندوہ نے جو خدمات ملک کی انجام دین گو کہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسکی وہ تکمیل کو پہنچیں
 مگر اس میں شک نہیں کہ وہ بہت قابل توفیق رہیں۔ سب سے بڑا کام اسنے یہ کیا کہ
 قدامت پسند عالموں میں جو ضروریات زمانہ سے خیر تھے ایک بیداری پیدا کر دی اور
 انکو بھی اسکی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ ان کا قدیم نصاب بدل کر موجودہ زمانہ کی ترقیوں کے
 حسب حال بنایا جائے۔ انگریزی زبان بھی داخل نصاب کی جائے۔ غیر مفید
 کتابیں اور علوم موقوف کئے جائیں اور ادب عربی و فارسی اور حدیث و تفسیر کی
 تحصیل پر زیادہ زور دیا جائے۔ ندوہ نے یہ بڑا کام کیا کہ علوم عربیہ اور اسلامی
 تہذیب کو دنیا کے سامنے صحیح طور پر پیش کیا۔ قیمتی قلمی اور نیز ہزار ہا مفید
 مطبوعہ کتابیں جمع کر کے ایک اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ قائم کیا۔ قرآن شریف کے
 صحیح انگریزی ترجمہ کا بھی کام ہاتھ میں لیا تھا۔ مسلمانوں کے عہد حکومت ہندوستان
 کے متعلق جو تاریخی غلطیاں نادانیت سے لوگوں میں مشہور ہو گئی ہیں ان کو رفع کیا۔
 اسی طرح مسلمانوں کے قانون وقف و میراث کے متعلق جو پیچیدہ مسائل قانونی اکثر
 پیش آجاتے ہیں انپر روشنی ڈالی۔ اسلامی علوم اور تمدن کا ایک مرکز قائم کیا جسکا اثر
 ممالک دور و دراز تک پڑا۔ ایک خاص رسالہ ”الندوہ“ بہ ادارت مولانا شبلی دہلوی
 حبیب الرحمن صاحب شروانی نکالا گیا جس میں نہایت عمدہ اور قابلیت کے مضامین
 شائع ہوئے۔ مگر حق یہ ہے کہ مولانا کے انتقال سے ندوہ کو جو نقصان عظیم پہنچا
 اسکی تلافی اب بہت مشکل ہے۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ لکھنؤ سے واپسی کے بعد مولانا ہمہ تن اپنی محبوب اور
 مایہ ناز تصنیف ”سیرۃ النبی“ کی تکمیل میں مصروف ہو گئے اور شعر العجبم کا
 پانچواں حصہ بھی اس وقت تمام کیا۔ مولانا چونکہ تالیف و تصنیف کے عاشقوں
 میں تھے لہذا مصنفین کی ایک جماعت قائم کر کے خیال جو بہت عرصہ سے انکے دلیں

جاگزین تھا خدا کر کے وہ اب پورا ہوا جس کے واسطے انہوں نے اپنی ذاتی جائداد یعنی ایک مکان اور باغ اور نیز اپنا قیمتی کتب خانہ وقف کر دیا۔ اسکے علاوہ مذہب میں ایک درجہ تکمیل بھی کھولا جس میں عربی و فارسی کے منہی طالب علم ریسرچ کی خدمات انجام دیتے ہیں۔

تابلیت اور خدمات کا اعتراف ۹۲ء میں سلطان ٹرکی نے متعہ مجیدی انکو غایت کیا تھا اور اسی کے قریب برٹش گورنمنٹ نے خطاب شمس العلماء عطا کیا۔ وہ آکھ آباد یونیورسٹی کے فیلو اور مختلف کمیٹیوں کے ایک معزز رکن تھے۔ مثلاً ترقی علوم مشرقیہ کی کمیٹی جو بہ مقام شہر مارکورٹ بٹلر کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی کمیٹی بابتہ نزاع مابین زبان اردو و ہندی اور کمیٹی اتحاد ہند و مسلم جسکو گورنمنٹ نے منعقد کیا تھا۔

اخلاق و عادات مولانا شبلی ایک نہایت سچے اور راستباز خلیق و متواضع آدمی تھے۔ انکی ایک زبردست شخصیت تھی۔ گفتگو نہایت شیریں اور دلچسپ اور پر از معلومات ہوتی تھی۔ حافظہ بہت زبردست پایا تھا۔ روپیہ کا مطلق خیال نہیں کرتے اور جو کچھ ملتا تھا نہایت آزادی سے خرچ کرتے تھے ہندو مسلم اتحاد کے دلسے خواہاں تھے۔

تصانیف مولانا کی تصانیف بہت کثرت سے ہیں جنہیں حسب ذیل مشہور ہیں۔ سیرۃ النبی۔ (صرف دو جلدوں کی تکمیل کر سکے) شعر الجم پانچ حصے۔ الفاروق۔ المامون۔ سیرۃ النعمان۔ الغزالی الکلام۔ علم الکلام۔ سوانح مولانا روم۔ موازنہ انیس و دبیر۔ سفرنامہ روم و مصر و شام۔ اور انکیب عالمگیر۔ الجزیرہ۔ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم۔ تاریخ اسلام و فلسفہ اسلام۔ حیات خسرو و تنقید جرجی زیدان۔ مقالات شبلی۔ مکاتیب شبلی۔ رسائل شبلی۔ (نظم میں) دیوان شبلی اور دستہ گل۔ ثنوی صبح امید۔ مجموعہ نظم اردو۔

مولانا بحیثیت مورخ کے مولانا کا بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کی قدیم شان و شوکت کی تاریخ کو طراجم دید میں پیش کیا اور ایسے دلچسپ طریق سے لکھا کہ عوام و خواص سب اس سے مستفیض ہو سکتے ہیں اور ہر نظر میں وہ نہایت دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ انکی تالیف میں انتہا کے

تجسس و تلاش اور عین مطالعہ سے کام لیا اور جدید طرق تنقید کی موافق غیر معتبر اور بیکار چیزوں کو ترک کیا۔
 الفاروق المامون۔ الغزالی۔ سیرۃ النعمان۔ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم۔ اور علی الخصوص انکی معرکتہ الآراء تصنیف
 یعنی سیرۃ النبی جبکہ انہوں نے نا تمام چھوڑا ایسی یادگار تصانیف ہیں جو انکے تبحر علمی و وسیع تحقیق عمیق
 مطالعہ اور سچید کرد و کاوش کا پتہ دیتی ہیں۔

مولانا جہانیت ناقد کے مولانا علاوہ جلیل القدر مورخ کے ایک زبردست ناقد بھی تھے۔ شاعر غیر متعال
 ہونیکے ساتھ قوت انتخاب۔ ذوق سلیم۔ رائے صائب بھی اعلیٰ درجہ کی رکھتے تھے۔ اگر کسی شخص کو
 زمانہ حال کی کوئی ایسی تصنیف دیکھنا ہو جو وسعت مطالعہ اور تحقیق کے ساتھ فصاحت و بلاغت اور
 سلاست زبان کا ایک بہترین مجموعہ کسی جاسکے تو اس کو شعر العجم دیکھنا چاہئے جسکی کیتانی پر پروفیسر
 ہرون ایسے مشہور زمانہ مستشرق کی شہادت موجود ہے یہ سچ ہے کہ مولانا کے انتقال کے بعد اسکی اکثر
 غلطیاں نکالی گئیں اور وہ ایک جارحانہ نظر سے دیکھی جا رہی ہے مگر پھر بھی ہمارے نزدیک کتاب
 کی قدر و قیمت اور مولانا کے تبحر علمی میں اس سے کوئی فرق نہیں آسکتا۔ کتاب مذکور نظم فارسی کی
 ایک مکمل تاریخ ہے اور نہایت سلیس اور دلچسپ زبان میں ہے۔ ”موازنہ انیس و دہیر“ بھی ایک بہت پیشہ
 تصنیف ہے۔ اور گو کہ اس سے بھی اختلاف کیا گیا اور بعض کتابیں اسکے جواب میں نکلیں مگر پھر بھی اسکی
 اکثر باتیں کارآمد و صحیح ضرور ہیں۔ اسکیل اور مضمون نگاری میں بھی مولانا ایک دیوولی رکھتے تھے۔
 اسکی اس قسم کی تحریریں نہایت دلچسپی اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں کیونکہ اسمین نہایت مفید اور
 کارآمد باتیں پائی جاتی ہیں۔ انکے مکاتیب بھی بہت دلچسپ ہیں جس سے انکے ذاتی حالات اور نیز
 انکے معاصرین اور ان کے ماننے والے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ”مقالات شبلی“ اور ”رسائل شبلی“ انکے اجازری
 مضامین کا اور ”مکاتیب شبلی“ انکے خطوط کا مجموعہ ہے۔

طرز تحریر مولانا ہمیشہ صفائی اور سادگی اور وضاحت کلام کو بہت پسند کرتے تھے۔ انکی عبارت
 کبھی گنجشک نہیں ہوتی۔ اسمین ایک خاص چمک اور تڑپ ہوتی ہے۔ سرسید مرحوم مولانا کو انکے طرز
 تحریر پر مبارکباد دیتے تھے اور کہتے تھے کہ تم تو لکھنؤ اور دہلی دونوں کے لئے باعث رشک ہو۔

مولانا کے یہاں صنایع بدلیع اور عبارت میں تکلف بہت کم ہوتا ہے۔ اور گو کہ اکثر جگہ فصاحت اور زور بیان مضمون میں چارچاند لگا دیتا ہے پھر بھی نفس مطلب نہایت واضح رہتا ہے۔ یہ بڑی قابل تعریف بات ہے کہ مختلف انواع تحریر کے لئے مولانا اُسی کے مناسب حال انداز بیان بھی اختیار کرتے ہیں۔ بعض تکلف پسند بیعتوں کو مثلاً وہ جکی زبان کو آزاد کی اردو کا چٹخارہ ہے ممکن ہے کہ مولانا کا رنگ روکھا پھیکا اور بے مزہ معلوم ہو مگر کا رو باری نہ رکاوٹ ہے مثل نمونہ ہے۔ جو کہ دور موجودہ کا سب سے بڑا کا زما ہے جیسا کہ لکھا گیا مولانا کا مرتبہ بحیثیت ایک موبخ اور نافذ کے بہت بلند ہے انھوں نے اسلامی تمدن کی توسیع و اشاعت میں بڑا حصہ لیا۔ انہیں ہم نیشلزم کی نئی نوع جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ اور یہ انہیں سب سے بڑا کمال ہے کہ علوم مشرقی کو وہ مغربی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ وہ ندوۃ العلماء کے کُرُوحِ طُوان اور دارالمنصفین کے بانی تھے۔ اپنے زمانہ کی نمایاں ہستیوں اور بلند شخصیتوں میں تھے۔ اور دراصل انہیں کی روحانی برکت ہے جو دارالمنصفین کی مساعی جمیلہ کی کامیابی کا باعث ہے۔ اُنکے لائق شاگردوں نے ابدالاً باذکم اُنکا نام روشن رہیگا۔

سلیمان ندوی مولانا سید سلیمان صاحب مولانا شبلی کے جانشین علوم مشرقی اور عربی و فارسی کے مجتہد فاضل ہیں۔ مولانا شبلی مرحوم اُنے اپنی زندگی میں بہت محبت کرتے اور ایک خاص نظرِ شفقت و عنایت انہر رکھتے تھے۔ اور اُس وقت وہ اپنی ذہانت و قابلیت و طباعی سے اُنکے اور شاگردوں کے ممتاز تھے۔ انہوں نے مولانا مرحوم کی روایات کو جاری رکھا اور بالفعل انہیں کی نگرانی اور ہتھام میں حلقہ دارالمنصفین عربی و فارسی کی نایاب کتابوں کے ترجمہ و تالیف کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ وہ المعارف کے ایڈیٹر بھی ہیں جو زبانِ اردو کا مشہور مجلے علوم اہل اسلام کی اشاعت کے لئے مخصوص ہے۔ اُنکے مضامین سے ادبی مضمون نگاری اعلیٰ قابلیت اور تحقیق علمی کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا دارالمنصفین اور معارف دونوں کی لوحِ روان ہیں۔ انہوں نے بلاد اسلامی اور یورپ کا سفر بھی کیا ہے۔ اور سیرۃ النبی اکا بقیہ حصہ اُسی شان و شوکت سے ختم کیا ہے۔ سیرۃ العالیثہ۔ ارض القرآن۔ لغات جدیدہ وغیرہ آپ کی مقبول اور مفید تصانیف سے ہیں۔

مولانا سلیمان صاحب کے علاوہ مولانا حمید الدین۔ مولانا عبد الباری۔ مولانا عبد الماجد دریابادی۔
پروفیسر نواب علی۔ اور مولانا عبد السلام۔ دارالمصنفین کے پروجیکشن اور معزز اراکین ہیں۔ مولانا حمید الدین
صاحب علاوہ انگریزی کے زبان فارسی و عربی کے مستند فاضل اور علم القرآن اور ادب عربی میں ایک
خاص بصیرت رکھتے ہیں۔ مولوی عبد الباری نے برکھ کے فلسفہ کا بہت سلیس ترجمہ اردو میں کیا ہے اور
بعض اور فلسفیانہ تصانیف بھی انکی ہیں مولوی عبد السلام اور مولوی عبد الماجد کے مختصر حالات
حسب ذیل ہیں۔

اس موقع پر یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ شعبہ دارالمصنفین اپنے سلسلے ایک درخشندہ مستقبل رکھتا ہے
اور اگر اس نے اپنی موجودہ رفتار ترقی جاری رکھی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان اردو کی تکمیل میں یہ
بہت بڑا حصہ لے گا۔ مگر ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنی تصانیف میں عربی اور فارسی الفاظ کی بہتات سے
احتراز کرے۔ تاکہ تمام بھی خواہ ان اردو کو اس سے سچی بہد روی رہے۔ اور اس طرح یہ بھی بچائے کہ تمام
سفری و دیگر علوم مشرقیہ سے قطع نظر کر کے اپنی توجہ صرف علوم اسلامی کی نشر و اشاعت پر مرکوز کرے
مولوی عبد السلام ندوی [مولوی عبد السلام صاحب کی ذات پر دارالمصنفین کو جقد رنا زہم کم ہے
وہ وقتاً فوقتاً معارف میں نہایت اعلیٰ درجہ کے مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ سیرت عمر بن عبد العزیزؓ
صحابیات۔ شعر الہند حصہ اول و دوم۔ ابن مین۔ وغیرہ انکی تصانیف ہیں۔ سنا ہے کہ مولانا شبلی کی زندگی
کے حالات بھی مرتب کر رہے ہیں مگر وہ اب تک شائع نہیں ہوئے شعر الہند میں جن نظم اردو کی ایک مبسوط
تاریخ ہے ان اثرات و حالات کو جو مختلف اوقات میں نظم اردو پر مرتب ہوئے ہیں مفصل اور نہایت خجائی
سے بیان کیا ہے۔ اپنی نوعیت میں یہ کتاب بہت عمدہ اور قابل تعریف ہے اور اس کتاب کو تصنیف
کر کے مصنف نے فی الحقیقت زبان اردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ مگر یہ کہنا پڑتا ہے کہ کتاب
کا نام اسم غیر سہمی ہے نیز اس میں بعض ضروری باتوں میں فرد گزاشتیں بھی ہو گئی ہیں اور اکثر ان
لوگوں کا ذکر بھی نہیں جنہوں نے زبان اردو کی ترقی میں بہت کوششیں کی ہیں ان اعتراضات کا
یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ اس کتاب میں نظم اردو کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھا گیا ہے۔ بہر حال کچھ

بھی ہو کتاب کار آمد اور مفید ضرور ہے اور مثل مولوی حکیم عبدالحی صاحب مرحوم کے ”گل رعنا“ کے جو قدیم طرز کا تذکرہ ہے اس میں بعض خاص خاص باتیں ایسی ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتی ہیں۔
مولوی عبدالمجید ریابادی مولوی عبدالمجید صاحب: بی اسے ریابادی خلف الصدق مولوی۔

عبد القادر ڈپٹی کلکٹر مرحوم ۱۸۹۳ء آپ کا سال ولادت ہے۔ ابتدائی عربی اور فارسی تعلیم سے گھر پر فراغت کر کے زبان انگریزی سیتاپورہائی اسکول میں پڑھنا شروع کی اور انٹرنیس پاس کر کے کینگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے جہاں سے ۱۸۹۷ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی پھر دھرم تیکمیل (پوسٹ گریجویٹ اسٹڈیز) کے لئے علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے مگر والد کے انتقال کے سبب وہاں زیادہ عرصہ تک قیام نہ کر سکے لکھنؤ چلے آئے اور یہاں آکر تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں مشغول ہو گئے۔ ۱۹۰۱ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ سے تعلق ہو گیا تھا مگر کچھ عرصہ بعد یہ تعلق ترک کر دیا۔ گویا اب بھی گورنمنٹ نظام کے وظیفہ خواہ ہیں اور عثمانیہ یونیورسٹی کے واسطے کچھ نہ کچھ ادبی کام کرتے رہتے ہیں مولانا سیاسیات سے بھی بڑی دلچسپی رکھتے ہیں اور سیاسی حلقوں میں ایک خاص عزت کے نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ہفتہ وار اخبار ”سچ“ آپ کی ادارت میں نکلتا ہے۔

مولانا کو ادبی دنیا میں ایک خاص شہرت حاصل ہے۔ کتب ذیل آپ کی تصانیف سے مشہور ہیں فلسفہ جذبات فلسفہ اجتماع۔ تاریخ اخلاق یورپ۔ مکالمات برکھ یعنی برکھ کی مشہور کتاب ”ڈائلاگس“ کا اردو ترجمہ۔ پیام امن بحر الحببت (مثنوی مصحفی)۔ زودیشیان (ناکھ)۔ سائیکالوجی آف لیڈرشپ (انگریزی میں) تصوف و اسلام۔ فلسفیانہ مضامین۔ (اسمیں وہ چھ مضامین داخل ہیں جو الناظرین چھپے تھے) مولانا کا مطالعہ فلسفہ بہت عمیق ہے اور فلسفیانہ کتابیں اور مضامین نہایت سلیس اور دلچسپ ہیں لکھنے کا آپ کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ آپ کے انگریزی کے ترجمے نہایت صاف و بامحاورہ اور زمین ہوتے ہیں۔ مصحفی کی مثنوی بحر الحببت جو غیر مطبوعہ تھی آپ نے نہایت محنت اور عرصہ قریزی سے چھپوائی اور اس پر ایک مفید اور بلیغ مقدمہ لکھا ہے۔ آپ کبھی کبھی اپنے مقررہ مسلک یعنی فلسفہ اور تصوف اور سنگین صناعات سخن سے ہٹ بھی جاتے ہیں اور تغزل طبع کے طور پر ہلکی اور سبک چیزوں کی طرف متوجہ

ہو جاتے ہیں اسی آخر الذکر صنف میں آپ کا ڈراما ”زودیشمان“ ہے جو ہر چند کہ اسٹیج کے لائق نہیں مگر پڑھنے میں بہت لطیف اور دلچسپ ہے۔ آپ کو شعر گوئی میں بھی کافی شہرت حاصل ہے گو کہ کم کہتے ہیں مگر جس قدر کہتے ہیں زیادہ تر متصوفانہ رنگ میں ہوتا ہے۔ موجودہ اخبارات و رسائل مثلاً معارف، الناظر، اردو، ہندوستان ریویو، ماڈرن ریویو، وغیرہ یہ سب آپ کے اعلیٰ مضامین کے مہیون منت ہیں۔ آپ کے مضامین معلومات سے پُر ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ اعتدال پسندی اور جملہ اعلیٰ اور علیت آپ کے کلام کا خاص جوہر ہے۔ قوت تنقید آپ کو خدا کا لالے نے بہت اعلیٰ درجہ کی دی ہے۔ سنا جاتا ہے کہ بالفعل آپ موقوفات مولانا روم کو شائع کرنے کی تیاری کر رہے ہیں آپ کی ذات ادب اردو کے لیے باعث فخر ہے اور آپ کی تصانیف سے زبان کو خاص فوائد پہنچتے رہتے ہیں۔“

جدید علوم کی ترویج۔ دلی کالج کے قیام سے جدید علوم و فنون کی ترویج و ترقی میں خاص مدد ملی۔ دلی کالج کا قیام بقول مسٹر انڈر ووز کے ”انیسویں صدی کے شرف میں جو ایک عجیب و غریب علمی روشنی چلی تھی اسکی وجہ زیادہ تر نئے نئے انگریزی علوم و فنون تھے جنکی تعلیم نے ہندوستان یونکے واسطے ایک بالکل طلسمی نظر پیش کر دیا تھا کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ انڈر ووز غیب سے کیا ظاہر ہو گا دلی کالج میں جو کمپیوٹری اور فزکس (کیمیا و طبعیات) کے نئے نئے تجارب طلباء کو دکھائے جائے تھے اُن سے وہ بنائیت سرور بلکہ مہوت ہر جلتے تھے اور نہیں کہہ سکتے تھے کہ آئندہ وہ کیا دیکھیں گے وہ بے تکلف خیال کرتے تھے کہ ہم لوگ ایک جدید دور کے بانی ہیں اور ترقی اور انکشافات کے وہ خواہجہ بھارت تھے اس جدید علمی نور نے اُس عہد کو منور کر دیا تھا جس میں سلطنت مغلیہ کے دور آخر کا زور و فراوان شان و شکوہ بھی کچھ شامل تھے مگر یہ روشنی تھوڑے عرصہ تک قائم رہا کچھ گئی اور اُس کے فنا ہو چکے باب میں غدر شہ کو بھی بڑا دخل ہے۔“

دلی کالج میں ۱۹۲۷ء میں ایک درجہ انگریزی کا بھی کھل گیا تھا اور باوجود انگریزی سے

مخالفت کے طلباء کی تعداد کم نہ تھی۔ سلسلہ کے رجسٹرون سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی کالج میں تین سو طالب علم انگریزی پڑھتے تھے اسکول انجیری دروازہ کے قریب تھا مگر جب وہ ترقی کر کے کالج ہوا تو کشمیری دروازہ اور دریائے جہلم کے قریب لایا گیا۔ سلسلہ میں اسکول انجیری دروازہ سے منتقل ہو کر شاہی کتب خانہ میں آگیا چونکہ جدید تعلیم سے لوگوں میں منافرت اور مخالفت پھیلی ہوئی تھی لہذا اس وقت طلبہ سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی بلکہ اچھے اچھے وظائف آئین انگریزی کا شوق پیدا کرنے کے واسطے انکو دیے جاتے تھے۔ کالج میں مغربی علوم کے ساتھ ایک مشرقی صیغہ بھی تھا۔ ریاضی کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی تھی۔ ادب اور زبان انگریزی کو لوگ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے مگر مغربی علوم اور ریاضی کے بہت گرویدہ تھے۔ تعلیم زیادہ تر لکچرون کی مدد سے ہوتی تھی نہ کہ کتابوں سے کیونکہ کتابیں دو دروازہ مقامات سے آتی تھیں اور وقت سے ملتی تھیں اور ظاہر ہے کہ اس وقت جدید علوم کی کتابوں کے ترجمے بھی نہیں ہوئے تھے۔ لکچرون کو طلبہ نہایت شوق سے سنتے تھے۔ نئے نئے ریاضی کے سائل سیکھ کر اور جدید تجارت کی مادی و برقی و مقناطیسی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر انکو خیال پیدا ہوتا تھا کہ ہم بالکل اک نئی علمی دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں۔ پروفیسر راجندر جواکے بہت شخصیت رکھتے تھے اور مسٹر ٹیلر پرنسپل کالج اور پرنڈٹ اجدو جیا پرشاد جودتی کے کشمیری پرنڈٹ اور اسٹنٹ پروفیسر تھے طلبہ کی تعلیم و ترقی میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔ مشرقی صیغہ میں عربی و فارسی کی تعلیم زبان اردو کی وساطت سے ہوتی تھی اور یہ صیغہ طلبہ میں بہت ہر دلچسپ تھا۔ مولوی امام بخش صہبائی فارسی کے بڑے زبان دان اور ماہر کالج میں فارسی پڑھاتے تھے ٹیلر صاحب اور مولوی امام بخش صہبائی دونوں غدر میں مارے گئے۔

دلی کالج سے پڑھ کر مشہور مشہور لوگ نکلتے جنہوں نے زبان اردو کی آئندہ توسیع و ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا مثلاً مولوی نذیر احمد مسٹر پیارے لال شوب۔ مولانا آزاد۔ مولانا حالی۔ اور مولوی ذکار اللہ کے نام پیش کئے جاسکتے ہیں۔ دنیاوی ترقیان بھی ان میں سے بعض نے بہت کیں چنانچہ مولوی شہامت علی ریاست اندر کے وزیر اعظم ہو گئے اور ڈاکٹر کن لال شاہی ہند میں نہایت شہید

معروف زمانہ حال کے طرز کے ڈاکٹر گزرے ہیں، ڈاکٹر چمن لال عیسائی ہو گئے تھے اور صدر مین مار سے
 گئے۔ ۱۹۳۷ء میں دلی کالج کی سرپرستی میں ایک ادبی انجمن کھولی گئی جس کے روح رواں پروفیسر
 راجندر اور مولانا صہبائی تھے اس انجمن کی قابل ستائش کوششوں سے اکثر مہمند کتابیں تیار
 ہوئیں جو دلی میں پھیلنے اور طلبہ کے بہت کام آئیں ان میں سے اکثر کتابیں انگریزی سے
 اور بعض فارسی سے ترجمہ ہوئی تھیں مدتی کی تقلید میں اور شہر دلی میں بھی مثلاً اگرہ اور لکھنؤ اور
 بنارس میں اسی قسم کی کتابیں تیار ہوئی تھیں جو انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہیں اور ان کے نام
 بلوم ہارٹ نے اپنی مرتبہ فہرست میں دیے ہیں اسی قسم کے تراجم اور تالیفات سے یہ بہت
 بڑا فائدہ ہوا کہ نثر اور بہت صاف سادہ اور بے تکلف ہو کر اس قابل ہو گئی کہ اُس میں کاروباری
 دنیا کی باتیں لکھی جائیں اور غیر زبانوں سے کارآمد ترجمے کیے جا دیں ۱۹۳۷ء میں راسے بہادر ہٹ
 پیارے لال آشوب نے دلی میں ایک اور ادبی سوسائٹی کی بنیاد ڈالی تھی جس کے وہ خود سکریٹری
 تھے۔ اس سوسائٹی کے انتظام میں بہت سے مفید کچھ دیے گئے اور نثر اور دو کا چراغ گو کہ ٹھٹھا مارا مگر بچھا
 نہیں۔ آشوب ہی کی توجہ اور مدد سے مولانا آزاد اور حالی نے جدید رنگ کی شاعری اختیار کی
 اور انہیں نے مولانا حالی کو اکثر انگریزی چیزیں ترجمہ کر کے دیں تاکہ وہ انکو اردو کا جامہ پہنائیں۔
 پروفیسر راجندر اور مولانا صہبائی کے مختصر حالات علیحدہ لکھے جاتے ہیں۔

پروفیسر راجندر یہ قدیم دلی کالج میں ریاضی کے مشہور پروفیسر تھے۔ ٹیلر صاحب پرنسپل کالج کے
 سیل جول اور ان سے عیسائی ہو گئے تھے۔ یہ اُن لوگوں میں ہیں جنہوں نے قدیم دلی کالج کے
 انگریزی اسکول میں سب سے پہلے تعلیم پائی تھی۔ بہت ذکی اور ذہین آدمی تھے انہوں نے ریاضی
 کا ایک نیا مسئلہ دریافت کیا تھا جسکی وجہ سے اُن کو اہل یورپ کے مشہور ہندسوں میں شہرت
 حاصل ہو گئی تھی۔ مولوی نذیر احمد مولانا آزاد مولوی ذکا رائے وغیرہ ایسے مشہور مشہور لوگ ان کے
 شاگرد تھے مولوی ذکا رائے کو علم ریاضی سے خاص مناسبت تھی اس وجہ سے وہ پروفیسر
 راجندر کے بہت محبوب شاگرد تھے۔ اور اسی وجہ سے ان دونوں میں ایک فنی محبت اور ارتباط

عمر بھر قائم رہا۔

پروفیسر راجندر کی نسبت لکھا ہے کہ نہایت بے خوف ریاست باز۔ راسخ الاعتقاد شخص تھے چونکہ ہندو مذہب چھوڑ کر عیسائی ہوئے تھے لہذا تمام تعلقات ذات و برادری کے منقطع ہو گئے تھے اور بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑی تھیں اور اسی وجہ سے مزاج میں ایک قسم کی سختی اور خشونت پیدا ہو گئی تھی جو کبھی کبھی مباحثے اور مناظرے کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی مگر پھر بھی رحم دل و معاہدے کے پکے تھے۔ غدر کے زمانہ میں انکی جان خطرہ میں پڑ گئی۔ ایک شاگرد نے اس سے اذیتوں کو مطلع کیا چنانچہ وہ کچھ دن اک مکان میں چھپے رہے بعد کو ہمیں بدل کر نکل گئے کچھ دنوں بعد جب شہر میں امن و امان ہو گیا تو واپس آئے اور اپنی کوشش سے اپنے بعض دوستوں کو بھی شہر میں بلوایا۔ کہا جاتا ہے کہ پروفیسر صاحب ریاست ٹیپالہ کے ڈاکٹر کی تعلیمات ہو گئے تھے۔ وہ مذکورہ الکالمین کے مصنف ہیں جس میں مردم اور یونان کے مشہور مشہور فلاسفہ اور شعراء کے مختصر حالات انگریزی اور عربی کتابوں سے اخذ کر کے لکھے ہیں یہ کتاب سب سے پہلے ۱۸۴۷ء میں چھپی تھی بعد کو ۱۸۸۷ء میں مطبع منشی نو کشور میں چھپی۔ اس میں بعض انگریزی شعراء اور فلسفی بعض فارسی شعراء اور بعض مشہور اہل ہند مثلاً والیک شنکر اچاریہ اور بھاسکر جوشی کے حالات بھی درج ہیں۔ پروفیسر صاحب "اصول علم ہیئت" اور "عجائب روزگار" کے بھی مصنف ہیں۔ یہ کتابیں سنہ ۱۸۸۷ء میں تیار ہوئی تھیں انکی زبان بہت صاف اور سلیس ہے اور انکے نشر کے لئے مولوی غلام محیی صاحب تنہا نے اپنی کتاب "سیر المصنفین" میں دیے ہیں۔

مولوی امام بخش صہبائی صہبائی قدیم دلی کالج میں فارسی اور عربی کے پروفیسر بہت روشن خیال اور اخلاقی جرات کے آدمی تھے۔ زبان فارسی میں انکو کمال حاصل تھا اور اس زمانہ میں بھی جبکہ فارسی کا دور دورہ تھا اک خاص عزت اور قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ انہوں نے سرسید مرحوم کو "آثار الصنادید" کی تصنیف میں بہت مدد دی تھی۔ طلبہ میں بہت ہر دل عزیز تھے اور انکی قابلیت اور شہرت کا طلبہ کے دل پر بڑا اثر تھا۔ فن شعر میں استاد مشہور تھے اور قلعہ کے افسر

شاہزادے اور توسلین اُن سے اصلاح لیا کرتے تھے متعدد کتایین اُن سے یادگار ہیں۔ زمانہ غدر
میں مارے گئے اور ان کا مکان کھود کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔

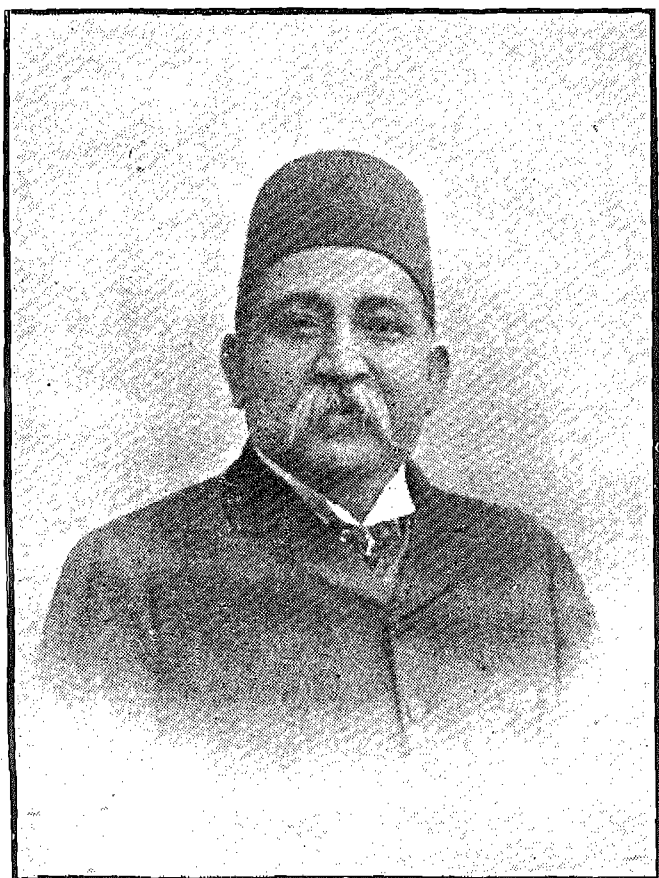
مولوی غلام امام شہید مولوی غلام امام شہید شاہ غلام محمد کے بیٹے ایٹھی ضلع کھنؤ کے رہنے
والے تھے۔ کھنؤ کے نام پر آوردہ شاعرون میں ہیں چونکہ لغت بہت کہتے تھے اس وجہ سے
ماہج بنی اور عاشق رسول کے لقب سے مشہور ہیں قتیل مصحفی سے اصلاح لیتے اور فارسی نظم و
نثر میں آغاسید اسماعیل بایزدرائی کے شاگرد تھے۔ الہ آباد میں پیشکار تھے ملازمت سے دستکش ہوئے
بعد ریاست حیدرآباد سے اک معقول رقم بطور وظیفہ کے آخر عمر تک ملتی رہی نواح کھنؤ سعید آباد
لوکن مراد آباد رام پور اور آگرہ میں کثرت سے شاگرد چھوڑے۔ سرسار جنگ اول، نواب
اکلب علیخان اور دیگر رؤسا و عہد انکی بڑی عزت کرتے تھے ”مجموعہ میلاد شریف“ انشا بہا بنیان
اور چند قصائد و غزلیات ان سے یادگار ہیں تاہم آگرہ کا حال پڑانے رنگ کی خرمین آنھوں نے خوب
لکھا ہے۔

منشی غلام غوث بیخبر خواجہ غلام غوث بیخبر کا اصل وطن کشمیر تھا جہاں انکے بزرگ معزز عہدوں پر ممتاز
تھے۔ انکے والد خواجہ حفصہ راہت کشمیر سے تبت اور وہاں نے خیال آئے جہاں خواجہ غلام غوث کی ولادت
۱۲۳۵ء میں ہوئی یہ اپنے والدین کے ساتھ بہت کم سنی میں جبکہ انکی عمر صرف چار برس کی تھی تیس
آئے یہاں کچھ قدیم رنگ کی تعلیم حاصل کر کے ۱۲۴۵ء میں اپنے مامون خان بہادر مولوی سید محمد خان
کی ماتحتی میں جو نواب لٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی کے میئر بنی تھے ملازم ہو گئے۔ وہ لارڈ الزبتھ
گورنر جنرل کی بھاری میں قلعہ گوالیار کی جنگ میں بھی شریک ہوئے تھے اور بعد اختتام جنگ ایک
اعزازی خلعت سرکار سے عنایت ہوا تھا۔ اپنے مامون کے انتقال کے بعد انکے عہدہ میئر منشی
پرنس فائز ہوئے جہاں عرصہ دراز تک نہایت قابلیت کے ساتھ خدمات منصبی انجام دیں ۱۸۸۵ء
میں ملازمت سے کنارہ کش ہوئے۔ خواجہ صاحب کو علاوہ خطاب خان بہادری کے بہت سے

انعامات اور خلعت طلالی ترقی قیصر ہند سرکار سے عنایت ہوا تھا۔ مرزا غالب کے بڑے دوستوں میں تھے
 چنانچہ مرزا کے اکثر دلچسپ خطوط الگ نام "اردو سٹلے" اور "عود ہندی" میں موجود ہیں "غسان بخیر" اور "خونابہ جگر" انکی
 گران بہا تصانیف ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں بہت کبرنی میں انتقال کیا۔ انکی تقریظ شہید کی "بہار سخنران" پر
 پُر اسے طرز اور خوشامدانہ رنگ میں ہے۔ خواجہ صاحب عام طور پر صاف اور سلیس نثر لکھتے تھے مگر
 تقریظوں وغیرہ میں دہری قدیم رنگ ہرتے تھے یعنی مقفی اور مسجع عبارت فارسی کی تقلید میں۔

شمس العلماء ڈاکٹر سید علی ہنگرامی ہنگرام کے ایک مشہور خاندان کی آپ یادگار
 تھے جو علم و فضل کے لحاظ سے بہت معزز و ممتاز تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ہندوستان میں ایک نمایان
 شہرت اور قابلیت سے تعلیم ختم کر کے تکمیل کے لئے انگلستان گئے جہاں آپ نے ہندوستان سے بھی
 زیادہ شہرت اور کامیابی حاصل کی۔ آپ کے اخراجات سفر کے متکفل سر سالار جنگ بہادر تھے آپ
 کو مختلف زبانیں سیکھنے کا خاص شوق تھا چنانچہ عربی و فارسی و سنسکرت میں کامل مہارت حاصل
 کرنے کے علاوہ یورپ کی مختلف زبانیں اور نیز ہندوستان کی اکثر زبانیں مثلاً بنگلہ مرہٹی ملنگی خوب
 جانتے تھے۔ آپ کی شہرت زیادہ تر آپکی مشہور کتب "تمدن عرب" اور "تمدن ہندوستان" سے ہے جس
 میں اول الذکر فرینچ مستشرق لیباں کی مشہور کتاب کا ترجمہ ہے۔ آپ نے ایک ڈاکٹر کی کتاب بھی
 ترجمہ کیا ہے۔ علاوہ تصنیف و تالیف کے آپ علیگڑھ کالج کے معاملات میں بھی بہت دلچسپی لیتے
 تھے آپ مذکورہ بالا دونوں کتابوں کی وجہ سے مصنفین زبان اردو کی صف اول میں جگہ پانے کے مستحق
 ہیں کیونکہ دونوں کتابیں علمیت اور قابلیت کے علاوہ آپکی قدرت زبان پر پوری گواہی دیتی ہیں۔

سید حسین ہنگرامی آئینہ نواب عاود الملک سید حسین ہنگرامی سی۔ آئی۔ اسی۔ ڈاکٹر سید علی ہنگرامی مذکورہ بالا
 کے برادر بزرگ ہیں اور گوکہ علمی اور ادبی قابلیت میں چھوٹے بھائی بڑے بھائی پر فوقیت رکھتے ہوں مگر سبک
 اور سیاسی زندگی میں نواب صاحب کو ڈاکٹر صاحب موصوف پر یقیناً فضیلت حاصل ہے آپ ایک صلہ
 دراز نمک حیدر آباد کن میں دولت آصفیہ کے اکثر معزز عہدوں پر ممتاز رہ کر سرکاری آف اسٹیٹ ہند



شمس العلماء ڈاکٹر مولوي سيد علي بلگرامي



مولوی محمد سید مرزا ابن سید - ایمہہ واسلے - ایسٹ

کی کونسل میں منتقل ہو گئے۔ افسوس ہے کہ آپ نے تصنیفِ تالیف کے میدان میں کوئی معرکہ آرا یادگار نہیں چھوڑی۔ صرف چند مضامین اور وہ ایڈریس جو علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھے گئے تھے اور رسائلِ عماد الملک کے نام سے چھپ گئے ہیں ادبی دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔ یہ کتاب تقریباً چار سو صفحہ کی ہے اور اس کے اکثر مضامین سے علی الخصوص ترقی تعلیم کے مضامین سے آپ کی قیمتی رہنمائی بخوبی ظاہر ہوتی ہیں۔ ”ہوا اور پانی“ کا مضمون علی الخصوص بہت عمدہ اور قابلِ قدر ہے۔ اور سائنس تک ہونیکے باوجود غیر ضروری اصطلاحات سے پاک ہے دائرۃ المعارف کا قیام جس کا مقصد کیا اب اور مفید عربی کنابوں کا شائع کرنا تھا آپ ہی کی مبارک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ آپ نے بہت کچھ وقت قرآن شریف کے انگریزی ترجمہ پر بھی صرف کیا مگر افسوس ہے کہ وہ ناتمام رہا۔

مولوی عزیز مرزا | مولوی عزیز مرزا بی اے اس زمانہ کے نہایت قابل اور مشہور تشاردون میں شمار کیے جاتے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں علی گڑھ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر کے حیدرآباد میں ملازمت اختیار کی یہاں مختلف جگہوں پر رہنے کے بعد موم سکریٹری کے حلیلِ اقدار عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ نہایت قابل تعریف بات ہے کہ وہ اپنے عہدہ کے اہم فرائض منصبی کی انجام دہی میں بھی اتنا وقت نکال لیتے تھے جس کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف اور مشاغلِ علمیہ میں صرف ہوتا تھا۔ تصانیف حسبِ ذیل ہیں (۱) نواب فتح نواز جنگ مولوی ہمدی حسن کے انگریزی سفرنامہ انگلستان کا ترجمہ جو گلگشتِ فرنگ کے نام سے مشہور ہے (۲) شاہانِ بہمنی کے مشہور وزیرِ خواجہ جہان عماد الدین محمد دگادان کے حالاتِ زندگی موسوم بہ سیرۃ المحمودہ (۳) کا لیداس کا مشہور ڈراما ”ڈاکر ماریسی“ کا اردو ترجمہ۔ جسکے شروع میں ایک فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں سنسکرت ڈراما کی اصل اور نوعیت کے متعلق بہت سی مفید باتیں لکھی ہیں۔ انکو پڑانے سے جمع کر نیکا بھی بہت شوق تھا چنانچہ انکا مجموعہ سکجات بہت اعلیٰ کا خیال کیا جاتا تھا۔ اکثر جرائد اور اخبارات میں جو مضامین لکھتے تھے وہ ”خیالاتِ عزیز“ کے نام سے لکھے اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن عکسی تصاویر اور نقشوں کے ساتھ مصنف مرحوم کے لایٹ فرنڈ کی طرف سے نظامی پریس بلاوین سے حال میں شائع ہوا ہے ۱۲۔

شایع ہو گئے ہیں۔ انکو بھی علی گڑھ کالج کی ترقی بلکہ عموماً مسلمانوں کی ترقی تعلیم سے بڑی دلچسپی تھی۔
 میں ملازمت سے کنارہ کش ہو کر آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سکرٹری ہو گئے تھے جس میں نہایت
 ہوشیاری اور قابلیت سے اپنے فرائض منصبی انجام دے تھے۔ اُن کا انتقال ۱۹۷۱ء میں ہوا۔ طرز تحریر
 نہایت سلیس اور دلکش ہے۔ بیجا الفاظی اور تطویل سے بہت بچتے ہیں۔ اپنے زمانہ کے مشہور نثر
 نگاروں میں خیال کے جاتے تھے۔

مولوی عبدالحق سکرٹری
 انجمن ترقی اردو
 زمانہ موجودہ کے مشہور افاضل اور مصنفین میں مولوی عبدالحق صاحب
 قابل مدیر رسالہ ”اردو“ اور آنریری سکرٹری انجمن ترقی اردو کا اسم گرامی
 خاص طور پر نمایاں ہے۔ سچ پوچھیے تو جس قدر زبان اردو کی ترمیم و ترقی اس وقت دکن میں
 ہے وہ آپ ہی کی ذات بابرکات کی بدولت ہے۔ آپ ہی انجمن مذکور کے روحِ روان اور
 آپ ہی کے ہاتھ میں اسکے کل کاروبار کی عنان ہے۔ انجمن نے آپ ہی کے زیر ہدایت دس برس
 نہایت مفید اور عمدہ کتابیں خواہ از مضمون الیقات یا تراجم کبیرت شایع کی ہیں اور اکثر مطبوعات
 انجمن پرچہ مفید اور فاضلانہ مقدمے اور دیباچے ہیں وہ آپ ہی کے رشحاتِ قلم کے نمونے ہیں
 جن سے آپ کی تحقیقات علمیہ اور معلومات کا پورا پورا پتہ چلتا ہے۔ انکے علاوہ جو مضامین آپ رسائل
 وغیرہ میں لکھتے رہتے ہیں وہ بھی نہایت موثر اور پُر اثر معلومات ہوتے ہیں۔ الحق آپ کی ذات
 ہمارے لئے بہت غنیمت اور یقیناً آپ کی شخصیت بہت زبردست ہے۔ آپ نے تمام
 عمر ادب اردو کی خدمت میں صرف کر دی اور اسی کی بدولت ہم کو آج یہ دن نصیب ہوا کہ صد ہا
 ہزار نے قلمی نسخے جو گوشتہ گمنامی میں پڑے پڑے ضائع ہو جاتے آج زبیر قمر اس ہو کر ہماری
 آنکھوں کو روشن کر رہے ہیں اور قدیم تاریخ نظم و نثر اردو سے جمعدہ رسم اس وقت بہرہ مند ہیں وہ بھی
 زیادہ تر آپ ہی کی مساعی جلیلہ کا نتیجہ ہے ایک عرصہ دراز تک آپ نے نظام گورنمنٹ کے حکم تعلیمین
 کام کیا۔ شل اکابر سلف کے آپ حد درجہ منکر المزاج اور خاموش کام کرنا والوں میں ہیں اور اسی وجہ
 سے اپنے زندگی کے حالات تک دینے سے گریز فرماتے ہیں۔ قوتِ نقد آپ میں بہت زبردست ہے

اور آپ کی تنقیدات ہمیشہ غیر جانبدارانہ اور منصفانہ ہوتی ہیں۔ اردو نثاروں میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے اور سب سے بڑی خوبی آپ کی تحریر میں یہ ہے کہ آپ کبھی عمدہ ہندی الفاظ کو نہیں چھوڑتے بلکہ ان کو اپنی عبارت میں نہایت خوبی اور اسادہی کے ساتھ کھپاتے جاتے ہیں۔ البتہ آپ کی عبارت کا مثل مولانا آزاد وغیرہ کے کوئی خاص طرز نہیں ہے جو لوگ آزاد کے طرز اور ان کی شوخیوں کو پسند کرتے ہیں انکو ضرور آپ کی عبارت روکھی پھکی اور بے مزہ معلوم ہوگی۔ مگر اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ آپ کو زبان پر پوری طرح قدرت حاصل ہے۔ ہمارے نزدیک آپ کی تحریر کا رنگ اگر کسی سے ملتا ہے تو وہ مولانا حالی ہیں بلکہ زمانہ حال کی ضروریات اور جدت طرازیوں کا لحاظ رکھا جائے تو ان پر آپ سبقت لگتے ہیں۔ علاوہ دیگر کمالات کے جس سے آپ متصف ہیں سب سے بڑی صفت آپ میں یہ ہے کہ آپ نے اس عہد میں اپنے اثر سے لوگوں کے دلوں میں نئی بان کا خاص شوق پیدا کر دیا ہے۔

مولوی وحید الدین سلیم مثل مولوی عبدالحق صاحب کے مولوی سید وحید الدین صاحب سلیم بھی زمانہ موجودہ کے نامور نثاروں اور محسنین زبان اردو میں ہیں۔ آپ مشہور خاندان سادات سے ہیں جنہوں نے پانی پت میں توطن اختیار کر لیا تھا جہاں آپ کے پدر بزرگوار حاجی مولوی ذوالعزیز صاحب کو شاہ شرف بوعلی قلندر کے مزار پر انوار کی تولیت کا شرف حاصل تھا۔ مولوی صاحب موصوف ابتدائی تعلیم سے فراغت حاصل کر کے لاہور گئے جہاں آپ نے ادب عربی کی تکمیل مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے کی اور معقول و منقول مولانا عبد اللہ ٹونکی سے پڑھا۔ زبان انگریزی میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور فارسی میں منشی فاضل کا درجہ حاصل کیا۔ ابتدا میں قانون کی طرف کچھ میلان خاطر تھا مگر اس خیال کو ترک کر کے ریاست بہاول پور میں صیغہ تعلیم میں کوئی جگہ حاصل کی جہاں کچھ عرصہ تک قیام کر کے رام پور ملی اسکول کے ہیڈ مولوی ہو گئے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد آپ کے قدردان و مربی جنرل عظیم الدین خان کے قتل کا ناگوار واقعہ پیش آیا تو ترک تعلق کر دیا۔ کچھ دنوں اپنے وطن پانی پت میں مطب بھی کھولا تھا اور ایک دواخانہ بھی قائم کیا تھا۔

اسکے بعد مولانا حالی کی دسالت سے سرسید مرحوم کی خدمت میں بار بار بی ہوئی وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور آپ کی وجاہت اور قابلیت کا انکے دل پر بہت اثر ہوا۔ سلیم صاحب سرسید کے پرائیوٹ سکرٹری ہو گئے اور عام طور پر انکی تصنیفات اور مضمون نگاری میں اعانت کرنے لگے۔ سید صاحب کے ساتھ انکے مرتے دم تک رہے۔ اس کے بعد اپنا رسالہ "معارف" نکالا جو کچھ عرصہ تک کامیابی سے چلا پھر نواب محسن الملک کے اصرار سے علی گڑھ گزٹ کے ایڈیٹر ہو گئے مگر تھوڑے دنوں بعد وجہ عدالت کے اسکو ترک کر دیا۔ اسکے بعد سلم گزٹ لکھنؤ کا ایڈیٹر ہوئے مگر مسجد کا پنور کے ہنگامے کے متعلق کچھ تیز مضامین لکھنے کی وجہ سے یہ جگہ بھی چھوڑنا پڑی پھر اخبار زندہ دار کے اشاعت میں بحیثیت چیف ایڈیٹر داخل ہوئے لیکن جب اسکی ضمانت ضبط ہو گئی تو ان کو بھی اپنے تعلقات اخبار سے منقطع کرنا پڑے۔ انکی مضمون نگاری اور ترجمہ کی شہرت نے حیدر آباد کے دارالترجمہ طبر اکو گیشا جہان انکی مشہور کتاب "وضع اصطلاحات" تصنیف ہوئی جب عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ہوا تو پہلے وہ اسسٹنٹ پروفیسر اور بعد میں مقرر ہوئے مگر چار برس کے بعد پورے پروفیسر ہو گئے۔

آپ کا طرز تحریر نہایت زور دار سلیس اور سنی خیر ہے کہیں کہیں آپ جذبات نگاری سے بھی کام لیتے ہیں۔ آپ اس زمانہ کے اکثر مشہور جرائد اور رسائل میں مفید مضامین لکھتے رہتے ہیں علی الخصوص آپ کے مضامین "تلسی داس کی شاعری"، "اندو دیو مالا" اور "عرب کی شاعری" جو رسالہ "لادو" میں چھپے تھے نہایت اعلیٰ درجہ کے اور قابل پڑھنے کے ہیں۔ اک بڑی صفت آپ کی تحریر میں یہ ہے کہ آپ غیر مانوس فارسی اور عربی الفاظ کے زیادہ شائق نہیں بلکہ مثل مولانا حالی کے ہندی کے شیریں اور سرلیے الفاظ اپنی تحریر میں بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ آپ کی قابل قدر تصنیف "وضع اصطلاحات" نہایت مفید اور اعلیٰ درجہ کی کتاب ہے جس سے آپ کے تحریر علمی اور تحقیق کا پتہ چلتا ہے۔ یہیں زبان اردو کی اصل کا نہایت غور سے مطالعہ کیا گیا ہے اور جدید اصطلاحات تکمیل الفاظ اور محاورات وضع کر کے لائے نہایت مفید قواعد قائم کئے ہیں۔

سید افسوس ہے کہ مولوی صاحب موصوف کا ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ انتقال ہو گیا ۱۲

شیخ عبدالقادر شیخ عبدالقادر صاحب زبان اور ادب اردو کے مستقل محسنوں میں ہیں۔ آپ تقریباً باؤن تریپن برس بیشتر لدھیانہ میں پیدا ہوئے جہاں آپ کے اسلاف کاؤن گوہرن کے معزز خدمات انجام دیتے تھے۔ آپ کے والد شیخ فتح الدین لدھیانہ کے محکمہ مال میں ملازم تھے۔ جو وقت ان کا انتقال ہوا شیخ صاحب کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی۔ زمانہ طالب علمی نہایت ناموری اور کامیابی سے ختم کر کے ۱۸۹۳ء میں فورمین کالج لکھنؤ سے بی اے کی ڈگری اول درجہ میں حاصل کی جس کے بعد پنجاب آکر رور کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۷ء میں چیف ایڈیٹر ہوئے ۱۹۰۳ء میں اخبار سے تعلق ترک کر کے بیرسٹری کی واسطے انگلستان روانہ ہوئے جہاں حسب معمول تین برس رہے اور اسی عرصہ میں ولایت کے اکثر مشاہیر سے ملنے اور پبلک معاملات کو بغور مطالعہ کر نیکار خوب موقع ملا۔ بعد حصول ڈگری اکثر مالک یورپ اور بلاد اسلامی کا سفر کیا جس سے معلومات میں اضافہ اور خیالات میں بہت کچھ ترقی ہوئی۔ ہندوستان واپس آکر پہلے دہلی میں کام شروع کیا تھا مگر دو برس بعد لاہور آگئے۔ ۱۹۱۱ء میں لائل پور میں سرکاری وکیل اور پبلک ایسیکیوٹر مقرر ہوئے ۱۹۲۱ء میں یہ عہدہ ترک کر کے لاہور میں پھر بیرسٹری شروع کی اور اب ان کا شمار درجہ اول کے بیرسٹروں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں ہائی کورٹ کے جج عارضی طور پر ہوئے اور پھر ایک سال تک ایڈیشنل جج بھی رہے۔ ۱۹۲۳ء میں لیجلیٹیو کونسل پنجاب کے ممبر منتخب ہوئے اور پھر پریسیڈنٹ اور پریسیڈنٹ بھی ہو گئے۔ ۱۹۲۵ء میں پنجاب کے وزیر تعلیمات مقرر ہوئے اور ۱۹۲۶ء میں لیگ اقوام کے ساتویں اجلاس مقام جینوا میں ہندوستان کی طرف سے بحیثیت ڈیلیگیٹ شریک ہوئے ان مناصب جلیلہ اور ادبی خدمات سے صاف ظاہر ہے کہ حسب قدرامیدیں آپ کے کامیاب زمانہ تعلیم میں آپ کی ذات سے وابستہ تھیں وہ سب پوری ہوئیں۔

شیخ صاحب کو زبان اردو کے ساتھ ایک خاص عشق ہے جب آپ انڈیا گریجویٹ تھے تو اپنے اسی زمانہ میں ایک سلسلہ لکچر زبان انگریزی میں زمانہ حال کے اردو شعرا اور نثر کاروں پر دنیا شروع کیا تھا جو ۱۸۹۷ء میں کتاب کی صورت میں شائع ہوا اور پبلک میں بہت مقبول ہوا۔ پنڈت ہنن لال

انجمنی نے بھی اس کی بڑی تعریف کی تھی گو کہ اسکے بعض نتائج اور رباؤں انکو اختلاف بھی تھا۔
 ۱۹۱۱ء میں اردو کا مشہور و معروف ماہواری رسالہ ”محزن“ جاری ہوا جس نے ادیبوں
 کی نہایت پیش ہوا اور قابل قدر خدمات انجام دین اور فی الحقیقت ہماری زبان پر اسنے اپنا سکہ جاڑا
 اس رسالہ کے اکثر مضمون نگاروں کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۹۱۱ء تک شیخ صاحب ہی اسکے
 ایڈیٹر تھے بلکہ ۱۹۲۰ء تک وہی اسکے آئیری ایڈیٹر رہے۔ اس رسالہ کی یہ خصوصیت تھی کہ اس کے
 اکثر مضامین اس قدر مشہور و مقبول ہوئے کہ کتاب کی صورت میں شائع ہو کر داخل کورس ہوئے۔
 ۱۹۱۱ء میں شیخ صاحب نے ”اردو کانفرنس“ کے اجلاس کلکتہ میں صدارت کی تھی اور بالفعل آپ
 ”انجمن ارباب علم لاہور“ کے صدر ہیں۔

پنڈت منوہر لال زتشی [پنڈت صاحب ۱۸۷۱ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے جہاں آپ کے والد
 پنڈت کنہیا لال زتشی پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ آپ کے والد کا انتقال ۱۸۷۷ء میں
 ہو گیا ۱۸۹۳ء میں آپ نے بی اے کی ڈگری کیننگ کالج لکھنؤ سے حاصل کر کے ۱۸۹۷ء میں
 امتحان ٹرننگ نہایت عزت کے ساتھ پاس کیا۔ پہلے کسی اسکول میں ٹیچر ہوئے پھر ۱۹۰۲ء میں امتحان
 ایم اے سے فراغت کر کے (جس میں آپ اہل ہوئے تھے) ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۷ء تک ٹرننگ کالج
 الہ آباد کے پروفیسر رہے اور اسی عرصہ میں آپ اکثر مضامین انگریزی ہندوستان ریویو اور اردو میں
 زمانہ ادیب اور کشمیری وپن کو بھیجتے رہے ۱۹۰۷ء میں ہیڈ ماسٹری کے بعد انسپکٹر مدارس ہوئے ایک
 سال جیٹر رنبارس دیو پورٹی اور ایک سال پرنسپل ٹرننگ کالج الہ آباد بھی آپ رہ چکے ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں
 لوکل گورنمنٹ کے ایڈریسٹر ٹری اور ۱۹۲۱ء میں ایک سال کیواسٹے قائم مقام اسسٹنٹ ڈائریکٹر صیغہ
 تعلیم رہے۔ بالفعل آپ جوبل کالج لکھنؤ کے پرنسپل ہیں۔ گلدرستہ ادب اور ایجوکیشن ان برٹش انڈیا (تعلیم
 برٹش انڈیا میں) آپ کی تصانیف سے ہیں۔ اسکے علاوہ آپ نے مرزا غالب اور حکیمت وغیرہ پر نہایت
 فاضلانہ مضامین بھی لکھے ہیں اور اکثر ادبی مباحثوں میں نہایت ذوق و شوق سے حصہ لیا ہے آپ کو

کتب بینی کا بھد شوق ہے اور ناقہ بھی آپ علی درجہ کے ہیں۔ آپ کے ریویو نہایت منصفانہ اور غیر جانبدارانہ ہوتے ہیں کبھی کبھی آپ نظم اردو کے پُرانے رنگ سے ناراض ہو کر زمانہ حال کے زبردستی کے شاعر و فن کی خوب خبر لیتے ہیں۔

منشی دیناز خان گلم دنیاے جدیدہ نگاری میں منشی دیناز خان گلم کے نام سے کون سا واقف ہے۔ ۱۸۸۲ء میں مقام کان پور ایک معزز کا سیتہ خاندان میں آپ پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا منشی شیخ سہاے صاحب اک مشہور وکیل اور وائس چیرمین ڈسٹرکٹ بورڈ تھے گلم صاحب ۱۹۰۹ء میں کرائسٹ چرچ کالج کانپور میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۳ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اور اسی سال اپنا مشہور پرچہ ”زمانہ“ نکالا جو اب تک بے قند نہایت کامیابی سے جاری ہے۔ ۱۹۱۲ء میں ”آزاد“ جاری کیا جو چند روز روزانہ رہا اب ہفتہ وار ہو گیا ہے۔ ۱۹۱۵ء میں آپ انگریزی مجسٹریٹ ہوئے۔

بالفعل آپ مختلف مصروفیتوں کے مرکز ہیں حسین معاشرتی سیاسی، علمی، ادبی، تعلیمی، اخباری، غرضکہ ہر قسم کے مشاغل اور مصروفیتیں شامل ہیں۔ سوشل رفرارم (اصلاح معاشرت) کے معاملات میں آپ نہایت روشن ضمیر اور آزاد خیال۔ اور سیاسیات میں آپ اعتدال پسند ہیں۔ تعلیمی اور ادبی مشاغل میں خاصہ کام آپ کو تو غل ہے اور ہمیشہ ایک مدیر اور جریدہ نگار کے تو آپ ہمارے فوجاؤں کے لئے خطرہ بقاء ہیں کہ وہ آپ کی مثال کو دیکھیں اور آپ کی کامیابی سے بہت حاصل کریں۔ آپ نے اپنی پوری عمر اپنے پیارے ”زمانہ“ کی بہبودی اور ترقی میں صرف کر دی اسی جہ سے وہ عرصہ زائد میں سال سے اس نمایان کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ ”زمانہ“ ہمارے صوبہ کا بہت پرانا نامور رسالہ ہے اور اس کا شمار اہل ہندو کے ان مخصوص چند پرچوں میں ہے جو فی الواقع زبان کی سچی خدمت کرتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں قابل ہندو اور مسلمان دونوں بلا تفریق مذہب ملت مضامین لکھتے ہیں اسکی تنقیدیں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہیں اور اس میں معاشرتی اور سیاسی مضامین پر ایسے اہل قلم کے مضامین درج ہوتے ہیں جو اپنے اصابت

کیواسطے مشہور ہیں۔ خود منشی صاحب کے مضامین جب کبھی نکلتے ہیں نہایت سچے تیلے اور غیر جانبدارانہ ہوتے ہیں مگر ہلکا افسوس اور شکایت ہے کہ انکے مضامین سے بڑھ کر زیادہ تر فیضیاب نہیں ہوتا۔ منشی صاحب ہندوستانی اکاڈمی کے ایک پُر جوش اور سرگرم نمبر بھی ہیں۔

لالہ سری رام دہوی۔ ایم۔ اے۔ لالہ سری رام صاحب اک مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جسکی شہرت اور عظمت کیواسطے یہ کیا کم ہے کہ اس کا سلسلہ جا کے اکبر کے مشہور وزیر راجہ ٹوڈر مل سے ملتا ہے۔ لالہ صاحب کے آبا جد اوسلاطین مغلیہ کے عہد میں ہمیشہ معزز و ممتاز رہے ہیں۔ آپ کے پڑ پڑ گوارے آئینہ دل راجہ بہادر مدن گوپال صاحب۔ ایم۔ اے۔ بیرسٹر ایٹ لا کے اسم گرامی سے دلی اور لاہور کا بچہ بچہ واقف ہے اور آپ کے عم نامدار راجہ بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب آشوب کو کون نہیں جانتا کہ اک مشہور و معروف استاد اور ماہر فن تعلیم صوبہ پنجاب میں گزرے ہیں اور خواجہ الطاف حسین حالی اور مولوی محمد حسین آزاد کے معاصر اور دوست تھے۔ لالہ صاحب موصوف ۱۸۵۷ء میں دلی میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم سے فراغت کر کے بارہ برس کی عمر میں والد کے ہمراہ لاہور گئے۔ ۱۸۷۵ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۸۷۸ء میں ایم۔ اے۔ اور منصفی کا امتحان پاس کر کے منصف مقرر ہوئے اور لاہور اور تیسرے دلی وغیرہ کی کرسی منصفی کو چند سال تک زینت دیتے رہے۔ مگر وہمہ کے موزی مرض میں مبتلا ہو جائیے ۱۸۹۰ء میں سرکاری ملازمت ترک کرنا پڑی اور علمی شغل اور اپنی وسیع ریاست کے اہتمام و انتظام میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ آپ اک اعلیٰ درجہ کی علمی قابلیت رکھنے کے علاوہ نہایت خوش تقریر خلیق اور ملنسار واقع ہوئے ہیں اور آپ کا خاندان ہمیشہ سے علم و فضل و مارت و سخاوت اور پبلک خدمات کیواسطے ضرب الثل ہے اور اسپر مولانا جامی کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے۔

این خانہ تمام آفتاب است

این سلسلہ از طلائے ناب است



تذکرہ ہزار داستان

المعرفۃ بنحو اندجاء

لالہ سری رام صاحب اس عظیم المثال تذکرہ کے مصنف ہیں جو انہوں نے لکھا ہے کہ ایک
 تمام کہنیں پہنچا یعنی اس کی چار ضخیم جلدیں چھپ گئی ہیں اور تقریباً چار ہی باقی
 ہیں۔ یہ شعر ارا رو کے حالات کا خزانہ اور ان کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے اور اسکو بلا استیعا مطالعہ
 کر نیسے سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس کے ترتیب اور تدوین میں کتنی وقت اور پیہ صرف ہوا ہوگا اور کس قدر
 تحقیق و تلاش اور کس قدر محنت کرنا پڑی ہوگی۔ اس کی ابتدا کے حالات فاضل مصنف نے جلد اول
 کے دیباچہ میں مفصل طور پر بیان کئے ہیں۔ اسکی چار جلدیں سین ذیل میں شائع ہوئیں یعنی جلد اول
 ۱۹۰۶ء جلد دوم ۱۹۱۱ء جلد سوم ۱۹۱۵ء اور جلد چہارم ۱۹۲۶ء میں اس لا جواب تذکرہ
 کو اگر معلومات کی کان کہیں تو بجا ہے اور اگر اسکو تاریخ الشعر کی جان سمجھیں تو زیبا ہے۔ اس نے صد
 بھولے بھٹکے شاعروں کو ردشاس خلق کیا جس میں بعض ایسے بھی ضرور ہیں کہ جن کا کلام ہم تک
 نہ پہنچتا تو کوئی زیادہ حرج نہ تھا۔ انداز بیان اس کا اس قدر مستین اور مہذب ہے کہ اچھون کا تذکر
 کیا بزدن کو بھی اچھا کر دکھایا ہے۔ بعض جگہ کچھ غلط بیانیان بھی ہو گئی ہیں مثلاً شاہ ولی اللہ صاحب کو
 شاعر دکھایا ہے اور ان کا تخلص اشتیاق بتایا ہے جبکہ غلطی سے مولانا حالی نے متنبہ کر دیا۔ اسی طرح تفتش
 کو انش کا بیٹا بتایا اور اس غلطی کو منشی حسن مرزا شاعر لکھنوی نے اپنی فاضلہ نہ تقریظ میں درست کر دیا۔ مگر
 انسان انسان ہے اور لا انسان مرکب من الخطا عدالہ النسیان "مشہور ہے۔ فاضل مصنف نے
 انتخاب کلام میں واقعی کمال دکھایا ہے کہ ہر شاعر کے صرف چوٹی کے اشعار منتخب کئے جو فی الواقع بڑی سلامتی
 مذاق اور صابت رائے کی دلیل ہے۔ عبارت اس قدر سلیس اور با محاورہ فصیح و بلیغ کہ چشم بد دور کئے
 کو جی چاہتا ہے اور مضامین اس درجہ اعلیٰ دارفہ کو نور علی نور کئے کو جی چاہتا ہے۔ تمام داختمام کے
 بعد یہ تذکرہ بنظر و بے عدیل الحی ہوگا اور نظم اردو کا انسائیکلو پیڈیا یعنی قاموس الاعظم کہلائے جائیگا
 بے شک مستحق ہوگا اور کیوں نہ ہو یہ قابل مصنف لالہ سری رام صاحب کی عمر بھر کی محنت اور ہمارے
 عہد کی بہترین ادبی خدمت ہے۔ تمام تذکرہ نویس اس زمانہ کے اس کے مرہون منت اور خوش چین ہیں
 اور سب بڑھکر مولف کتاب ہذا بالیقین ہے۔ اگر کسی کو تقریظوں کی بہار اور ریویو کے لالی آبدار دیکھتا رہن

تو وہ اس کی جلدوں کے آخری صفحات پڑھے اور دیکھے کہ کن کن لوگوں نے کس کس انداز اور
 کس کس اداسے نظم و نثر و وزن میں کیا کیا گلفٹا نیاں اور سحر بیان کی ہیں۔ ہمارے نزدیک اتنی
 کثرت سے اور اتنے اعلیٰ درجہ کے ریوی کسی ایک کتاب پر ہرگز نہ ہوئے۔ لالہ سرپر رام صاحب نے ۱۹۱۰ء
 میں دیوان انور اور ۱۹۱۲ء میں مہتاب داغ اور ضمیمہ یادگار داغ بھی نہایت عمدگی سے شائع کیا تھا
 غماز ہے کہ ایسے جامع تذکرہ کی فراہمی کیواسطے کتنی کتابیں کتنے صرف کثیر سے جمع کرنی پڑی ہونگی ع درود غم
 کتنے کیسے جمع تو دیوان کیا۔ اسی وجہ سے موصوف کا کتب خانہ جمین اکثر ناور قلمی کتابیں اور تصاویر بھی ہیں
 دیکھنے کے قابل ہے۔ اور آپ بالفعل اسی ادبی مضامین کمال فراغت ایک قابل رشک زندگی بسر کرتے
 ہیں۔ اور خواجہ حافظ کے اس شعر کے کم از کم دوسرے مصرع کے صرور مصداق ہیں۔

دوبارہ زیرک و از بادہ کمن دوسنے فراغت و کتابے دگوشہ چمنے

دیگر نشانہ ان اردو موجودہ زمانہ میں اردو نثاروں اور ناقدان سخن کی اتنی کثرت ہے کہ ان تمام
 اصحاب کے مختصر حالات لکھنا بھی تطویل کا باعث ہوگا۔ لہذا یہاں بعض ارباب ادب کے صرف نام
 بتائے جاتے ہیں۔ انکے مفصل حالات سے موجودہ شعرا کے ذکر کے ایک دوسری کتاب میں جو ہم
 تیار کر رہے ہیں انشاء اللہ ضرور جگہ پائیں گے۔

(۱) پنڈت بشن نرائن راج بھائی۔ اردو کے بڑے مبصر ہونیکے علاوہ شاعر شیریں سخن بھی تھے اردو
 پر اردو اور انگریزی دونوں میں نہایت فاضلانہ تنقیدی مضامین لکھتے رہتے تھے۔ علی الخصوص
 وہ مضامین جو سرشار کے متعلق ہیں۔ اور شیخ عبد القادر کی کتاب ”بڑا سکول آف اردو لٹریچر“ (جدید
 ادب اردو) پر جو فاضلانہ تقریظ لکھی ہے نہایت دلچسپ و معلومات سے پُر ہے۔

(۲) مرزا جعفر علی خان صاحب از لکھنؤی ڈبھی کلکڑ زمانہ حال کے نہایت خوشگو شاعر اور قابل
 سخن پنج ہیں۔ انکے مضامین سیر و سوا سے ہم نے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ کلام نہایت لیس
 صاف اور زوردار ہوتا ہے۔

(۳) احسن مارہروی فن نقد میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں دیوان ولی کو نہایت قابلیت سے ایڈٹ کیا
 ہے نہایت انوکھے سے سنا جاتا ہے کہ جو کچھ اسے عرصہ سے لالہ سری رام صاحب تحت علیل میں خدا کو صحت جلد عنایت کرے۔



شیخ عبدالقادر بی-اے-پی-ایچ-تی



لالہ سیدی رام صاحب ایم۔ اے۔ سبزیلہ خٹک خانہ، جاوید

کتاب "اُردو لشکر" بھی انکی تصنیف ہے جس میں نظم اردو کی درجہ بدرجہ ترقی کو نہایت خوبی سے دکھایا ہے
خیالات آزاد اور زبان زور دار ہوتی ہے مگر بعض اوقات ذاتیات کی بحث سے بد مزگی پیدا چلتی
ہے جس سے ہمارے نزدیک حتر از کرنا چاہئے۔

(۴) حامد انشاؤں شیدا احمد صدیقی۔ شید مسعود حسن رضوی۔ اور جلیل احمد قدوائی یہ سب ان اردو کے
اعلیٰ درجہ کے ادیب اور ناقد ہیں۔

(۵) اسی طبع پر پروفیسر نامی۔ پروفیسر ضامن علی الہ آبادیو نیوٹرٹی کے لکچرار اردو بھی ادب اردو میں
بڑی بصیرت رکھتے ہیں۔

(۶) حسرت موہانی۔ نظم اردو اور فن تنقید کے ایک ستوار ستون ہیں مضامین کو کہ مختصر لکھتے ہیں مگر
اور پختل اور بہت طبیعت داری کے ہوتے ہیں۔

(۷) خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب کثیر التصانیف ہیں مختلف مضامین پر صفائی اور سلاست
سے مگر عام رنگ میں لکھتے ہیں۔

(۸) سلطان حیدر جوش ایک مخصوص رنگ کے نہایت عمدہ لکھنے والے ہیں جنکے مضامین سے الناظر
کے صفحات کو زیب زینت ہوتی ہے۔

(۹) شیخ حیدر یلدرم۔ نثر افسانہ نما بہت خوب لکھتے ہیں۔ عبارت بہت دل فریب اور سلیس
ایک خاص فشریت ہوتی ہے۔ ترکی جانتے ہیں۔ اور ایک ترکی ناول اور ایک ترکی ڈرامہ موسوم بہ
خوارزم شاہ کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ انکا مجموعہ مضامین "خیالتان" مشہور ہے۔

(۱۰) مولانا ظفر علی خان ادبی اور اخبار نویس کی دنیا میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ زبردست مضمون نگار
اور حسن زبان ہیں۔ انکے اکثر تصانیف انجمن ترقی اردو کے ذریعہ سے چھپ چکی ہیں۔ سیاسی مضامین
لکھنے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔

(۱۱) مولانا ہاشمی فرید آبادی۔ ادبائے دکن میں خاص طور سے ممتاز ہیں۔ تصانیف بہ کثرت لکھتے ہیں

(۱۲) ہمدی حسن بہت اچھے لفظی مصور اور صاحب طرز تھے۔ انکی کتاب افادات ہمدی مشہور ہے

افسوس کہ نوجوانی کی موت نے انہی ہونہار زندگی کو قطع کر کے آئندہ امیدوں کا خاتمہ کر دیا۔

جدید نثر اردو کے دو طرز زمانہ حال میں نثر اردو اتنی کثیر الاشکال ہے اور ادیبوں نے اس قدر علیحدہ علیحدہ طرز انشاء اختیار کئے ہیں کہ ان سب کا استقصا اور ان پر رائے زنی کرنا دشوار ہے لہذا ہم یہاں صرف دو طرز دن کا مختصر ذکر کرتے ہیں۔

پہلا طرز عربی اردو اور ان کے مقابلہ میں بھاشا آئین اردو اکثر لوگوں کا میلان ہے اس طرز کے عبارت میں شکل و شکل اور غیر مانوس فارسی عربی الفاظ بالقصہ استعمال کئے جائیں تاکہ عبارت شاندار اور وسیع معلوم ہو۔

مکن ہے کہ اس طرز کی ابتدا اس طرح ہوئی ہو کہ سرسید اور ان کے رفقا اور تقلیدین ان کی تقلید میں نہایت سیدھی سادی مگر زور دار عبارت لکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ بعد کو بعض حدت پسند طبالیج کو حبیب رو دکھی پھسکی بد مزہ معلوم ہونے لگی تو انہیں رنگینیت اور علمیت کی چاشنی پیدا کرنیکے لئے عربی فارسی الفاظ کا بکثرت استعمال کیا جانا ضروری سمجھا گیا۔ گویا اس طرز کو سرسید مرحوم کے طرز کا رد عمل کہنا چاہئے۔ ہمارے خیال میں اس طرز کے مخترع مولانا ابوالکلام آزاد ہیں جنہوں نے اپنے مشہور اخبار الهلال میں اسکو بہت برتاؤ دیا اور موصوف مذہب و سیاسیات پر بڑے زبردست لکھنے والے نہیں ہیں۔ اور خود ان کے تحریروں میں اس قسم کی خرابیاں اور لغزشیں مطلق نہیں ہوتیں جو ان کے تقلیدین کے یہاں بکثرت پائی جاتی ہیں جبکہ عبارتیں سوائے تسلسل الفاظ کے کوئی خوبی نہیں رکھتیں۔ یہ طرز تحریر اس جماعت کو نہایت پسند آیا جو چاہتے ہیں کہ اہل اسلام کے مختص علوم مثلاً فقہ تفسیر حدیث وغیرہ کی نشر و اشاعت ہو اور اس ذریعہ سے لوگوں میں مذہبی جذبات پیدا ہوں۔ اس کے بالمقابل اور اسی کے جواب میں ایک فرقہ نے مسکرت اور ہندی کے الفاظ بکثرت استعمال کرنا شروع کئے۔ مگر غنیمت ہے کہ اس قسم کی تحریریں خواہ وہ کیسی ہی نیک نیتی پر معمول ہوں ایک مختصر جماعت تک محدود ہیں۔ اور یہی خواہاں اردو نے اس بدعت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔

دوسرا طرز۔ خیالی یعنی ٹیگوری اردو طرز مذکورہ بالا کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا طرز بھی مروج ہے جو خیالی اردو کہا جاسکتا ہے۔ اسکو ٹیگوری اردو بھی کہہ سکتے ہیں اسوجہ سے کہ یہ رابندرنا تھ ٹیگور کے اس طرز کا

متبع ہے جو انہوں نے اپنی تصانیف گیتان جلی وغیرہ میں اختیار کیا ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ نیگور اور بعض
 مشہور انگریز انشا پردازوں کا حقیقی متبع نہیں بلکہ انکے کلام کی محض نقل ہے جس میں ان لوگوں کے محاسن
 کلام مطلق نہیں پائے جاتے۔ یہ نقال نہ تو صلی بصورت سے واقف ہیں اور نہ ان میں حقیقی تخلیق
 کی روح ہوا یہ لوگوں کی انشا پر دازی سواے چند تنبیات کے عام طور پر بالکل خام ہوتی ہے۔ اس میں
 کسی قسم کا ادبی حسن نہیں ہوتا بلکہ زیادہ تر بے لائق آمیز اور مطلق العنان اور سطحی ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات
 تو وہ مجذوب کی بڑے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ان غیر مسلک پوتوں کو بے اوقات انکے صنائع
 قیمتی سچے ہوتی خیال کرتے ہیں۔ بعض وقت اس قسم کی تحریریں غیر مہذب بلکہ غش درجہ تک پہنچ
 جاتی ہیں۔ اس قسم کی نشر کی ابتدا افسانہ نویسی سے ہوئی۔ اس سے لوگوں کو بہت لطف آنے لگا
 اور نئی معلومات کے راستے کھل گئے۔ مضامین میں وسعت اور تنوع اور عبارت میں ایک خاص شان
 اور رنگینی اس سے پیدا ہوئی۔ صاحب تحریر بے تکلف صاحب طرز بن بیٹھے اور اپنے مفروضہ شاعرانہ
 خیالات اور شاعرانہ انداز کو بلا عرض کے بھجھٹ کے نشر کی صورت میں اکر اکر دکھانے لگے۔ تاکہ
 لوگ ان کو نشر شاعر سمجھنے لگیں۔ اور یہ سطح ہوا کہ کبھی تو عبارت عربی الفاظ اور ترکیبوں کا مجموعہ تنگی کبھی
 جدت کے واسطے نئے نئے الفاظ اور ترکیبیں تراشی گئیں اور کبھی ایک خاص زور اور انداز پیدا کر نیسے
 واسطے معمولی صرفی نحو کی ترکیبیں الٹ پلٹ کر عبارت ایک طرفہ معجون بنائی گئی۔ مضامین میں بھی
 علے ہذا القیاس عجیب و غریب تغیرات ہوئے کبھی انہیں جدت اور رنگینی پیدا کرنے کی واسطے مشرقی اور
 مغربی (رومی اور یونانی) دیوالا چھانی کسی کبھی نیچر کی بیجاں چیزیں جاندار تصور کر کے استعجاب و شورش
 اور ایسے مصنوعی شاعرانہ جذبات کے ساتھ اُسے مخاطب کیا گیا کہ بعض اوقات اسکو پڑ کر یا سن کر
 بے اختیار ہنسی آتی ہے اور وہ ایک جھوٹی نمائش اور شعبہ بازی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ایسے
 مضامین اور ایسی عبارت البتہ ایک استاد کے قلم سے تو فی الواقع رنگ و صن و موسیقیت کا جلوہ نہار
 بن سکتی ہے مگر نوا موزوں کے ماتہ میں وہ محض اک گھوندا بکر رہ جاتی ہے جس میں سوا کے الفاظ
 کے معنی کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔

۱۸۳۷ء میں پریس کو آزادی ملی۔ ۱۸۳۸ء میں مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر حسین نے اردو اخبار دلی سے جاری کیا جو حقیقت میں اخبار یعنی خبروں کا مجموعہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک ادبی پرچہ تھا جس میں اکثر اوقات ذوق و غالب مومن اور دیگر معاصر شعرا کی غزلیں اور کبھی کبھی مہر طرخ غزلیں بھی درج ہوتی تھیں۔ کبھی اس میں زبان اور محاورات کی بحث ہوتی تھی ذوق کی وفات کی تاریخیں اور شہیدی کی شاعری پر مباحثہ بھی اس میں چھپا تھا۔ گورنمنٹ اسکی سرپرستی کرتی تھی ۱۸۵۸ء میں منشی ہر سکھ رائے نے جو ایک بہت نگری کا ستھ تھا لاہور سے کوہ نور نکالا۔ یہ پرچہ برٹش انڈیا اور دیسی ریاستیں دونوں میں بہت مقبول تھا جہاں جگان کشمیر و پٹیالہ میں پرچہ کی اور نیز اس کے مالک کی بڑی قدر کرتے تھے۔ پہلے وہ ہفتہ وار تھا مگر بعد کو ہفتہ میں دو مرتبہ اور پھر تین مرتبہ نکلنے لگا۔ آخر میں اسکا زوال ہو گیا اور انہیں لوگوں کے ہاتھوں ہوا جنہوں نے اس میں کام سیکھ سیکھ کر اس کے رقیب دوسرے پرچے نکالنا شروع کئے۔ منشی نوکشور صاحب بھی اسکے اسٹاٹ میں کام کرتے تھے۔ پھر شعلہ طور اور مطلع نور کا پور سے۔ پنجابی اخبار اور انجم الاخبار لاہور سے۔ اشرف الاخبار دلی سے۔ کٹورہ اخبار سیالکوٹ سے۔ قاسم الاخبار بنگلور سے۔ کشف الاخبار بمبئی سے۔ کا زمانہ لکھنؤ سے اور جریح روزگار مدراس سے نکلے اور چند دنوں کے بعد اکثر انہیں سے بند ہو گئے۔ اور وسط جہاں جسکو منشی نوکشور صاحب نے ۱۸۵۸ء میں جاری کیا تھا اب بھی نکلتا ہے۔ بلکہ اس کا شمار ہمارے صوبے کے اعلیٰ درجہ کے اور مشہور روزانہ اخباروں میں ہے۔ شروع میں جب منشی صاحب موصوف کے زمانہ میں یہ اخبار نکلتا تھا تو یہ زیادہ تر ان خبروں کا مجموعہ ہوتا تھا جو انگریزی اخباروں کے تاروں یا نوٹوں سے ترجمہ کر کے چھاپی جاتی تھیں اور اسکی کوئی معینہ پالیسی بھی نہ تھی سوائے اس کے کہ یہ اسکی شورش کے یہ ہمیشہ خلاف تھا۔ پہلے یہ ہفتہ وار تھا اس کے بعد روزانہ ہوا۔ اس کا ساز و سامان اور اشرف اعلیٰ درجہ کا تھا۔ اسی کا ہم عصر شمس الاخبار تھا جو مدراس سے نکلتا تھا اور زیادہ تر مسلمانوں کی واسطے مخصوص تھا یہ کوئی مشہور پرچہ نہ تھا اور تھوڑے عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔ ایک دوسرا مشہور پرچہ اخبار عام لاہور ہے جسکو پینڈت مکندر ام نے نکالا تھا جو کوہ نور میں ملازم تھے اور ایک منشن یافتہ

سرکاری عہدہ داران کے معاون تھے۔ یہ ایک خاص خبروں کا پتہ تھا اور نہایت ارزان تھا۔ کچھ دنوں گورنمنٹ اسکی سرپرست رہی اور ہر سکول میں اس کے پرچے جاتے تھے مگر یہ سرپرستی اب موقوف ہو گئی۔ پہلے یہ بھی ہفتہ وار تھا اسکے بعد سہ روزہ اور دو روزہ ہوا۔ اسکی زبان اخباری زبان تھی یعنی اس میں کوئی ادبی خصوصیت نہ تھی۔ مگر یہ بات قابلِ تعریف ضرور ہے کہ اسکی ارزانی قیمت نے لوگوں کے دلیں اخبار بینی کا شوق پیدا کر دیا۔ ادوہ پنج لکھنؤ ۱۸۵۳ء میں وجود میں آیا یہ ایک طرافت کا پرچہ تھا اور اپنے عنوان شباب میں نہایت کامیاب۔ لوگوں کا اسکا انداز اس قدر پسند آیا کہ ملک میں اس کے اکثر نقال پیدا ہو گئے۔ اسکی خاص خوبیاں یہ تھیں کہ آزادی سے لکھتا تھا ظریفانہ رنگ میں لکھتا تھا جسکی ملک میں بڑی ضرورت تھی۔ انشا پر داندی اعلیٰ درجہ کی ہوتی تھی اور سب سے بڑے بکر یہ کسی خاص فرقہ یا جماعت یا کسی خاص مذہب کا طرفدار یا مخالف نہ تھا۔ منشی سجاد حسین مرحوم اسکے قابلِ ایڈیٹر تھے اور اکثر اس عہد کے قابلِ ظریف الطبع صحاب اس کے نام نگار تھے۔ ہندوستانی کی ابتدا لکھنؤ میں ۱۸۵۳ء میں ہوئی یہ سب پہلا ادوہ پرچہ تھا جس نے سیاسیات اور واقعات حاضرہ پر بلاستیم صاحب بحث کی۔ یہ ایک اعلیٰ درجہ کا پرچہ تھا اور کبھی چھوٹی چھوٹی باتوں اور جزئی مناقشوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔ پہلے ہفتہ وار تھا پھر سہ روزہ ہو گیا۔ اسکی زبان میں ادبیت نہ تھی ممکن ہے کہ ترجمہ وغیرہ کی جلدی اس کا باعث ہو اسی شان کا چرچہ رفیق ہند تھا جو لاہور سے نکلتا تھا۔ پیسہ اخبار ۱۸۵۳ء میں نکلا منشی محبوب عالم صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔ اسکی ارزان قیمت اور مضامین کی عمدگی سے لوگ اس کو بہت زیادہ پڑھتے تھے اور اسی وجہ سے اس میں اشتہارات بکثرت نکلتے تھے۔

ادبی ادوہ رسالے اس قسم کے رسالوں میں مولانا شرم مرحوم کا دلگداز بہت پڑانا رسالہ ہے جو اب بھی نکل رہا ہے۔ زمانہ کا پور کا ذکر منشی دیانند صاحب غلام کے ذکر میں گزر چکا۔ ادیب کہ آباد بھی نہایت عمدہ رسالہ تھا مگر افسوس ہے کہ حقوڑے دنوں میں اسکی عمر ختم ہو گئی۔ الناظر جسکے قابلِ ایڈیٹر مولانا ظفر الملک صاحب علوی ہیں نہایت آواز و خیال اور بڑی قابلیت کا پرچہ ہے۔

ہزار داستان لاہور میں صرف چھوٹے انسانے اور ناول نکلتے ہیں۔ ہمایون لاہور اور شباب اردو لاہور بھی اپنی صنف میں عمدہ پرچے ہیں۔ نگار لکھنؤ (جو پہلے بھوپال سے نکلتا تھا) ایک اعلیٰ درجہ کا ادبی پرچہ ہے اور اپنے فاضل ایڈیٹر نیاز فتحپوری کی شخصیت کا پتا دیتا ہے۔ معارف اعظم گڑھ اور اردو اور رنگ آباد یہ دو ذوق زائد موجودہ کے بہترین ادبی رسالے ہیں جنکے اکثر مضامین نہایت اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں سبیل علی گڑھ کو کہ حال ہی میں طلوع ہوا نہایت ہونہار رسالہ ہے اسکے مقاصد بہت اعلیٰ ہیں اور اگر ترقی کرتا رہا تو اسکا شمار بہترین اردو رسائل میں ہو جائیگا مولانا حسرت موہانی کا اردوئے معلیٰ ایک زمانہ میں بہت مشہور تھا مگر اب ویسا نہیں ہے۔ موقع لکھنؤ اور اکبر آباد سے نکلتے ہیں مخزن نے ادب اردو کی بہت بیش بہا خدمات انجام دی ہیں مختصر یہ کہ سب رسائل کو نام بنام گننا بہت مشکل ہے۔ مگر ان پرچہ نہیں جو ایک زمانہ میں شہرت رکھتے تھے اور اب بند ہو گئے دکن ریویو حسن اور العصر قابل ذکر ہیں۔

اکثر اخبار نویسوں کے حالات انکے نام کے تحت میں درج کئے گئے ہیں مولانا طفر الملک ملوی پیشوا احمد ایڈیٹر البشیر۔ اور تاجور نجیب آبادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں اسوجہ سے کہ یہ حضرات ادب اردو کی بہت قیمتی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اگر کیلوار دو روزانہ اخباروں کے ایڈیٹروں کے نام لکھنا ہوں تو ایک مختصر کتاب اخبار نویسوں کے حالات مولفہ محمد الدین فوق ایڈیٹر کشمیری میگزین کا مطالعہ کریں۔

باب

اردو ناول کی ابتداء

شیر اور سرشار کا زمانہ

اردو کے پُرانے قصے "افسانہ گوئی کا شرق و دنیا میں بہت قدیم اور انسان کے دل میں اس کا بہت گہرا اثر ہے۔ پُرانے اردو قصے یا تو فارسی سے ترجمہ ہوئے یا سنسکرت سے بذریعہ فارسی ترجمہ کئے گئے

یا انہیں دوزخ و جہنم لکھنا بڑا کچھ نئے قصے لکھ لئے گئے تھے۔ یہ سب اپنی نوعیت میں مختلف ہیں بعض بہت وشجاعت کے قصے ہیں۔ بعض میں دیون اور پریوں کا ذکر ہے۔ بعض اخلاقی ہیں اور بعض نہایت مخرب اخلاق۔ انداز بیان سبک وہی کابند ہا معمولی ہے۔ واقعات کا بیان قریب قریب یکساں ہے جنکو بار بار پڑھکر طبیعت اکتا جاتی ہے۔ عجائب و غرائب کا ذکر عام ہے۔ انسان دیون اور پریوں کے ساتھ بے تکلف ملتے جلتے ہیں۔ طلسم سحر جادو ہر قصے میں کسی نہ کسی صورت سے موجود ہے بلکہ اکثر اسی پر قصے کا دار و مدار ہوتا ہے۔ انداز بیان عام طور پر سادہ اور سہل آموز ہوتا ہے مگر کیر کمر نوہی کسی میں پتہ نہیں۔ اور نہ کوئی داخلی دلچسپی کسی پلاٹ کی تعمیر ہوتی ہے۔ زیادہ تر حسن و عشق کے حالات، ساحرون اور جادو گروں کی لڑائیاں، جادو گروں کے شاگردوں نے مقابلے اور آدمیوں کا جادو زدن کی صورتیں بدل جانا دکھایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر روزمرہ کے واقعات سے وہ خالی ہیں۔

اقام قصص خاص اقام قصص حسب ذیل ہیں (۱) الف لیلہ (۲) بوستان خیال (۳) دستان امیر حمزہ مع اس کے فروعات طلسم ہوشربا وغیرہ کے (۴) قصہ حاتم طائی و باغ و بہار وغیرہ (۵) ہندوستانی قصے جیسے میتال کلیسی، کلید منہ، سنگاسن پتھی، گل بکاؤلی، طوطا کہانی وغیرہ۔

سطح منشی ناول لکھنؤ اکثر اس قسم کے قصے سطح منشی نو لکھنؤ میں چھپے ہیں جسکے بانی خود منشی نو لکھنؤ صاحب سی۔ آئی۔ تھے۔ اس سطح نے زبان اردو کی بڑی خدمت کی اور اسکی ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا اور ناول در قدیم کتابوں کی اشاعت، مشہور کتب فارسی و عربی کے تراجم جدید کتابوں کی پبلکیشن کے موافق تیار کی۔ اور نیز اسکوئی کتابوں کی تیاری سے ادب اردو پر بہت بڑا احسان کیا۔ منشی صاحب موصوف ۱۸۳۷ء میں بستی مصلح علی گڑھ میں پیدا ہوئے انکے دادا منشی بالکن آگرہ میں سرکاری خزانچی تھے اور والد منشی جننا داس بھی کاروبار کرتے تھے۔ منشی نو لکھنؤ ایک خود ساختہ آدمی تھا اور بچپن ہی سے تجارت کی اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے انکو اخبارات سے بڑا شوق تھا منشی ہر سکہ رائے کی ماتحتی میں اخبار کوہ نور لاہور میں کچھ عرصہ تک رہے جہاں انکو چھاپہ خانہ وغیرہ

کے حالات کا بہت وسیع تجربہ ہو گیا۔ غدر کے بعد ملازمت ترک کر کے لکھنؤ آ گئے جہاں مشعلہء مین سربراہ برٹش گمری اور کرنل ایسٹ کی سرپرستی میں اپنا مطبع کھولا۔ تقدیر نے یادری کی اور انکے کام کو روز افزون ترقی ہوتی گئی۔ انکی قابلیت انکی دیانتداری انکی پابندی اصول سے یہ مطبع تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوستان کیا بلکہ ایشیائے سب کے بڑے مطابع میں شمار کیا جانے لگا۔ منشی صاحب نے از کثیر قیمتی نادر علمی کتابوں کی خرید میں صرف کیا جنہیں سے اکثر کو شائع کر کے پبلک کو بہت بڑا فائدہ پہونچایا۔ اس مطبع سے ہزار اعرابی فارسی سنسکرت اردو ہندی کتابیں جرے جرے صرف اور بڑے مختلف سے چھپر شائع ہوئیں۔ مختلف قسم اور مختلف قیمتوں کے قرآن شریف شائع ہوئے جسے اہل اسلام کو بہت بڑا نفع پہونچا۔ ادھر اجناب بھی مشعلہء مین انہوں نے جاری کیا تھا جیسا کہ اخبارات کے ذکر میں بیان ہوا۔ انکے موت و حشر میں واقع ہوئی اور وفات کے وقت انہوں نے تقریباً ایک کروڑ روپیہ انکی جائیداد اور کاروبار چھوڑا۔ انکے بعد انکے لائق فرزند راسے بہادر منشی پرگ نائن صاحب آجہانی نے ادب اردو و ہندی کی بڑی خدمت کی۔ اور اب انکے پوتہ فرزند منشی بشن نرائن صاحب بہار گرا اپنے والد کے قدم بقدم چل رہے ہیں۔ اور نوکشا پریس آپ کی کوششوں سے نہایت کامیابی سے ترقی کر رہا ہے۔

دستان ریزہ صاحبان ایک جمیم اور ضخیم کتاب متعدد جلدوں میں ہے۔ اصل کتاب فارسی میں شیخ ابو الفیض فیضی نے اکبر کی تفریح طبع کے واسطے تیار کی تھی اس کے آٹھ دفتر ہیں اور ہر دفتر میں سدا صفحات کی کئی کئی جلدیں ہیں جنکی مجموعی تعداد سترہ اور تعداد صفحات سترہ ایشادہ ہزار سے کم ہوگی سب سے مشہور دفتر اول سب سے نو شیردان نامہ دو جلدوں میں اور دفتر پنجم موسوم طلسم ابو مشربا سات جلدوں میں ہے اور نو شیردان نامہ بہت مقبول عام ہے طلسم ہوشربا کی اول چار جلدوں کا ترجمہ میر محمد حسین جاہ اور آخر تین جلدوں کا ترجمہ احمد حسین قمر کا ہے۔ ایک منظوم ترجمہ طوطا را نشان نے بھی کیا تھا۔ نو شیردان نامہ کا ترجمہ منشی نوکشا صاحب کی فریاد سے شیخ نصرت حسین شاہ نے کیا تھا۔ اس کتاب میں ایک فرضی طویل افسانہ امیر حمزہ کا ہے جو غیر اسلام صلوات اللہ علیہ اسلام



• مښي نول کشور
(سې - آڼي - اي)



پاکستان کے بانی قائد اعظم حضرت محمد علی جناح

کے عہد بزرگوار تھے جس میں ایک قصہ سے سیکڑوں قصے پیدا ہوتے چلے گئے ہیں۔

برستان خیال اس کی نو ضخیم جلدیں ہیں اور اس کے مصنف میر تقی خیال سمجھے جاتے ہیں جو اصل میں گجرات کے رہنے والے تھے مگر آخر میں دہلی میں آ گئے تھے۔ یہ قصہ مصنف نے اپنی معشوقہ کی دلچسپی کے لئے داستان امیر حمزہ کے رنگ میں تصنیف کیا تھا۔ اس کتاب کو محمد شاہ رنگیلے نے بہت پسند کیا اور وہ انہیں کے زمانہ میں اور انہیں کے حکم سے اختتام کو پہنچائی۔ اس کے تقریباً چار ہزار صفحات ہیں۔ پانچ جلدوں کا ترجمہ اردو میں خواجہ بدرالدین معروف بہ خواجہ امان دہلوی نے اور دو جلدوں کا ترجمہ لکھنؤ میں چھوٹے آغا نے کیا اور پوری کتاب پر نظر ثانی بھی کی۔

ان سب کتابوں میں بڑا عیب یہ ہے کہ صحیح جذبات نگاری اور رکیک لکھنؤیسی ان میں مفقود ہے۔ کوئی معین پلاٹ بھی نہیں ہے۔ چند مشہور لوگوں کے بعد از قیاس افسانے ہیں جنہیں جقات اور دیو زادوں سے لڑائی اور ساحروں سے مقابلہ کا ذکر ہے۔ کبھی کبھی وہ سحر و طلسم میں پھنس بھی جاتے ہیں مگر آخر میں فتیاب نکلنے ہیں اور اپنی محبوبہ کو ظالموں کے پنجہ سے نجات دلائے ہیں قصہ کے تمام واقعات میں ایسی کیسانی ہے کہ جی اٹتا جاتا ہے کوئی تنوع اور جدت نہیں اور روزانہ واقعات زندگی کا تو کہیں ذکر نہیں ہے۔ اکثر یہ قصے فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے شائع ہوئے اور اب منشی نو لکھنؤ کے مطبع میں بڑے آب و تاب سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

افسانہ اور ناول کی پہچان کرلی مرزا عجب علی بیگ سرور نے ناول کی آفرینش میں بہت کچھ مدد دی یعنی اپنی مشہور کتاب فسانہ عجائب کی تصنیف سے لوگوں کے دل میں افسانہ کا شوق پیدا کر دیا یہ ضرور ہے کہ اسکی مصنوعی مقفے اور مجمع عبارت نے کہیں کہیں مطلب کو گنجانک کر دیا۔ اور تسلسل بیان میں فرق ڈال دیا ہے۔ واقعات معمولی اور زبان نہایت پر تصنع اور پیچیدہ ہے۔

البتہ مولوی نذیر احمد صاحب کے بعض قصے موجودہ ناول کی حدود تک پہنچ جاتے ہیں گو کہ انہیں بھی موجودہ اصول ناول نویسی کی پوری پوری نہیں پائی جاتی۔ وہ اول سے آخر تک نصیحت آمیز ہیں اور کسی معاشرتی یا تعلیمی مضمون یا کسی مذہبی مسئلہ پر ایک زبردست وعظ کی حیثیت رکھتے ہیں

رویائے صادقہ توبۃ النصوح مرآۃ العروس وغیرہ کی تہ میں کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق ضرور ہے جو بہت
 زور کے ساتھ سکھایا گیا ہے۔ بیشک مولوی صاحب نے یہ بہت بڑا کمال کیا کہ مافوق العادات اور
 حیرت انگیز چیزوں کو اپنی تصانیف سے ایک قلم خارج کر دیا اور معمولی واقعات زندگی کو ایک
 منظم پلاٹ کی صورت میں دلچسپی سے بیان کیا۔ انکی قابل قدر تصانیف جو اس زمانہ کے رسم و
 رواج اور طرق و عادات کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں، انہیں شک نہیں کہ انکی قوت استدلال
 و مشاہدہ کے شاہد عادل ہیں۔ زبان پر انکو پوری طرح قدرت حاصل ہے اور گو کہ انہیں کہیں کہیں
 ثقالت پیدا ہو جاتی ہے مگر پھر بھی سلاست و روانی انکے ناولوں کی خاص ماہرہ الامتیاز چیز ہے
 سلسلہ واقعات بھی وہ خوب قائم رکھتے ہیں گو کہ کہیں کہیں اس قاعدہ کی خلاف ورزی سے
 قصہ کے تناسب میں فرق پڑ جاتا ہے۔ کیرکٹر دلچسپ مگر ضرورت سے زیادہ ادب آموز ہیں۔
 انشی سجاد حسین مرحوم نے لکھنؤ سے شش ماہ میں ادب و ہنر کا لکھ
 ہندوستانی اخبار نویسی اور ادب اردو پر احسان عظیم کیا، انکی ایک خاص شان پیدا کی مذاق و ظرافت
 جس سے اب تک ہمارا ادب خالی تھا داخل نظر ہوئے۔ زبان میں بلین الفاظ شامل کر کے گرائف دہی پیدا
 کی پر زور طریقہ سے کتابوں کی تنقید کی۔ ناول نویسی میں ترقی کی۔ ادب و ہنر کے پہلا اخبار ہے جسے
 ایک مقرر اور زمین پالیسی اختیار کی۔ وہ محض خبر رسائی نہیں کرتا تھا بلکہ پبلک معاملات میں اپنی
 آزادانہ رائے رکھتا اور قومی حقوق کا تحفظ کرتا تھا اور ہندوستانی۔ دوسا کا ناصح اور محتسب بھی تھا
 وہ اصول کانگریس کا حامی، ہندو مسلم اتحاد میں ساعی، البرٹ بل کی تحیلات ایکٹ انکم ٹیکس کے پاس ہونے
 کا سخت مخالف تھا لیکن اسی کے ساتھ سوشل معاملات میں بہت قدامت پرست سرسید اور انکی
 سجاد نیر کا دشمن اور تعلیم نسوان اور پردہ کے توڑنے کا بھی سخت مخالف تھا۔ غرض کہ اس اعتبار
 سے جدید و قدیم رنگ کا ایک عجیب مجموعہ تھا اسکے اکثر نامہ نگار نہایت قابل اور فاضل لوگ
 تھے مثلاً علامہ خود انشی سجاد حسین مرحوم کے مرزا پھو بیگ عاشق (جو تم ظریف کے نام سے
 ادب و ہنر میں مضامین لکھتے تھے) ترہون نامہ خبر انشی جوالا پرشاد بھتی۔ احمد علی کسمٹوی



خواجه بدرالدین خان عرف خواجه امان مترجم بوستان خیال

اکبر اکبر آبادی۔ نواب سید محمد آزاد جین سے بعض کے کچھ حالات علحدہ بھی لکھے جائینگے۔
 اودھ پنچ بونٹاک ظریفانہ موقر اخبار تھا مگر کبھی کبھی اسکی ظرافت کا رنگ بدل جاتا
 تھا اور وہ طعن و تشنیع اور ذاتی حملوں پر اتر آتا تھا۔ بعض مضامین کے پڑھنے سے مثلاً وہ جو فسانہ آزاد
 حالی۔ داغ۔ گلزار نسیم وغیرہ کے تعلق لکھے گئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اودھ پنچ کے صفحات ہند
 اور سنجیدہ ظرافت سے گزر کر پھکڑ کا ایک میدان بن گئے ہیں مگر قسم ذیل کے مضامین نہایت

اس زمانہ میں لوگ اسقدر ٹھس ہو گئے ہیں اور مذاق و ظرافت کا اُن میں اسقدر فقدان اور اس نئے لطیف
 کی اُنہیں اتنی کمی ہو گئی ہے کہ اودھ پنچ ایسا بیشل پہننے ہنسائے والا پرچہ جو مذاق کے پیرا پرین نصیحت اور ظرافت کے
 ساتھ عبرت سکھاتا اور انشا پر وازی کا بھی بہترین نمونہ سمجھا جاتا تھا اپنے سابق اڈیٹر منشی سجاد حسین صاحب کے ساتھ خود بھی
 مر گیا تھا۔ مگر خدا بھلا کر سہ حکیم ممتاز حسین عثمانی موجودہ ایڈیٹر کا کہ انہوں نے اسکو زندہ کیا اور اسکے تن بجان میں نئے
 سرے سے جان ڈالی۔ ایک معنی میں تو ہم حکیم صاحب موصوف کو منشی سجاد حسین مرحوم پر ترجیح دینگے موصوف سے کہ منشی
 صاحب مرحوم کے وقت میں تو بہت سے قابل اہل سخن انکے ہم مذاق اور یار و دردگار موجود اور انکا ہاتھ بٹانے کو ہر وقت
 تیار تھے بلکہ بھی قدردان تھی۔ حساس تھی۔ باحمیت تھی۔ اودھ پنچ کے تازیانہ ظرافت سے لوگ اسید طرح ڈرتے تھے
 جیسے شوخ۔ لڑکے ڈنڈے باز مولوی سے ڈرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک بدکردار شخص جب اپنا بدنامہ چہرہ صفحہ
 اودھ پنچ کے مجلے آئینہ میں دیکھتا تو اپنی ڈراؤنی صورت سے ڈر کر بڑے افعال سے توبہ کر لیتا اور اودھ پنچ کا خریدار
 بن جاتا تھا۔ ہر طرح ہم خرم ہم ثواب کے اصول پر خود اودھ پنچ کا بھی فائدہ ہوتا اور دوسروں کے اخلاق بھی درست
 ہو جاتے تھے۔ ع وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا۔ مگر اب وہ باتیں نہیں رہیں لوگوں کے اخلاق بدل گئے
 اطوار متغیر ہو گئے۔ ظرافت کے قدردان اور اس سے فائدہ اُٹھانے والے باقی نہ رہے۔ لوگوں سے حواس اثر پذیری کا
 مادہ جاتا رہا۔ اور ظرافت کا انداز بھی بدل گیا۔ مگر پھر بھی بری بھلی جیسی ہے ایسی ہے کہ اسوقت ہندوستان میں
 اودھ پنچ کا نظیر و عدیل نہیں۔ وہ اپنی آپ مثال اور قلم و ظرافت میں حاکم علیہ الاطلاق ہے۔ ہزار آفرین ہے
 اسکے فاضل ایڈیٹر کو کہ انہوں نے اسکی روایات قدیمہ کو قائم رکھا بلکہ زمانہ حال اور ضروریات کے مطابق مضامین

اور ششنگی کے ساتھ اسکے صفحات میں درج ہوتے رہے ہیں۔ لکھنؤ کی معاشرتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں، محترم چٹلم عید بقیر عید شیراز، ہولی دیرالی، بسنت، عیدش باغ کے مسئلے، نازنگ کے جلسے اور دعوتیں، شاعرے، اجلاس ہائے عدالت، مرغ و ڈیر کی پالیان الکشن کے مقابلے وغیرہ۔

کامیاب بلند کر دیا۔ پورا پورا سہارا دیا۔ تنہا کھائے ہیں اور ٹھیک وقت پر کھائے ہیں جو ہفتہ وار اور ماہوار رسالوں کے لئے قابل فخر اور قابل تقلید بات ہے۔

اس موقع پر ہم ایک بات اپنے مکرم فاضل دوست سے ضرور گزارش کریں گے۔ وہ یہ کہ وہ اپنے پرچم سے براہِ نصیبان کا ذکر بغیر ان کی بات چیت کا انداز ذرا کم کر دیں بلکہ اگر بالکل خارج کر دیں تو اور بھی اچھا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بعض مقامات پر ان کی بھی ضرورت پڑتی ہے اور اس جنس کی بھی مانگ جوتی ہے۔ ایک نمبر مولانا سہیل شمس محمد علی اپنی نثر شریف طالی لکھا اور عامرہ دارم چارچشم کے قاعدے سے پسند کر سہیلی کے اجلاس میں نشر پینٹ لے گئے۔ پینڈت من موہن مالویا ان کی اس نئی رچ کو دیکھ کر کہنے لگے کہ اٹھا ہوا محمد علی ہیں ہم تو سمجھتے تھے کہ بیگم صاحبہ بھوپال آرہی ہیں۔ مولانا نے جواب دیا کہ اس جگہ جہان مورتی ہی عورتیں ہیں اگر آپ بھگوان جی صاحب سمجھتے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ بہر حال یہ اصول کرادو ہم بیچ کے بعض ناظرین عورتوں کے زیادہ مرتبہ نہیں دیکھتے لہذا ان سے بھلا کام ہونے کے لئے بھی۔ براہِ نصیبان کی ضرورت پڑتی ہے ایک مذکر تو ضرور صحیح اور قابل تسلیم ہے۔ مگر جب اس میں عورتیں شامل ہوتی ہیں اور ان کی سیاسی و معاشرتی حیلہ و سلاطین میں جاوہری براہِ نصیبان یا ان کی سہیلی شفق آرا بیگم دریاے لطافت کی بی تون کی طرح آج کے دور کو ڈھکی چھپی تار اور دیس سے تاروں سے لیکر شیخ جیب احمد صاحب تک سے سیاسی اور علمی مسائل میں اپنے خاص انداز میں بھلا کام ہونے لگتی ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا انسان باقون کے واسطے کیا کوئی مرد دستیاب نہیں ہوتا تھا کہ عورتوں کی طرف سے اور ان کی زبان میں یہ مطالب ادا کئے گئے۔ اور اس سے نفس مسئلہ دراختیا کے ظریفانہ انداز میں کیا فائدہ ہوتا۔ ہمارے ملک میں تین سو سال پہلے ہی اس درجہ کو نہیں پہنچی کہ عورتیں پیدا ہو گئی ہوں جو سیاسی اور علمی معاملات میں کوئی صاحب رائے رکھتی یا اس کا اظہار کر سکتی ہوں۔ پچاس نئی آنکھ سے اور اخبار پر کتنی مشورہ کا الزام عاید کر نیسے کیا فائدہ ۹

منشی سجاد حسین ایڈیٹر
 اور دھرنج
 منشی سجاد حسین مرحوم منشی منصور علی ڈپٹی کلکٹر کے بیٹے تھے جو گورنمنٹ سے
 پنشن لیکر حیدر آباد دکن گئے اور وہاں سول جج ہو گئے تھے۔ منشی سجاد حسین
 ۱۹۳۷ء میں کاکوری میں پیدا ہوئے۔ انٹرنس کا امتحان کینگ کالج سے پاس کر کے اور کچھ دنوں
 مختلف ملازمتیں کر کے ۱۹۴۷ء میں اپنا مشہور اخبار اور دھرنج نکالا۔ انکی ذاتی قابلیت طبیعت داری
 اور وسیع الاخلاقی سے انکے بہت سے دوست ہم مذاق ہم مشرب پیدا ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ تک پٹنہ
 رتن نامہ سرشار بھی انکے اخبار میں مضمون نگاری کرتے تھے۔ مگر جب سے کہ وہ خود اور دھرنج کے
 ایڈیٹر ہوئے اور دھرنج کی نامہ نگاری چھوڑ دی جس کا ذکر سید قدیر تفصیل سے آگے آئیگا منشی سجاد حسین پہلے
 شخص میں جنھوں نے ہندوستان میں ایک ظرفانہ رنگ کا اردو اخبار نکالا جس نے ملک اور زبان دونوں
 کی معقول خدمت انجام دی۔ منشی صاحب نہایت نیک دل صاف باطن اور غیر متعصب شخص تھے اور
 کبھی مذہبی رنگ کے مضامین کو اپنے اخبار میں جگہ نہیں دیتے تھے۔ انکی تحریر کا ایک خاص
 انداز تھا جس میں واقفیت اور معلومات کے ساتھ مذاق و ظرافت اور لطافت و ظریفیت بکثرت ہوتے تھے
 عبارت میں بیانتگی اور شستگی بہت نمایاں تھی۔ انکے وہ فرضی خطوط ہندوستانی رو سار کے نام
 ہیں ایک عجیب انداز کے ہیں اور ان میں ایک خاص طریقہ سے نصیحت کی گئی ہے۔ منشی صاحب
 ایک زبردست ناول نگار بھی تھے۔ چنانچہ انکے ناول حاجی بھول۔ طرحدار لونڈی۔ پیاری دینا۔
 احمق الذین۔ بیٹھی چھری۔ کایا پلٹ۔ حیات شیخ حلی مشہور ہیں اور ان سب کی عبارت نہایت بلیغ
 اور دلچسپ ظرفانہ انداز میں ہے۔ ۱۹۷۷ء میں مرض فالج میں مبتلا ہوئے اور ایک عرصہ دراز تک
 جسمانی تکالیف اور آلام و مصائب میں مبتلا رہے ۱۹۷۸ء میں انتقال کیا۔ اور اور دھرنج سب ۱۹۷۸ء
 میں انکی زندگی میں بند ہو گیا تھا۔

مرزا چھو بیگ عاشق
 مرزا محمد رفیع عرف مرزا چھو بیگ عاشق تخلص مرزا اصغر علی بیگ کے بیٹے
 شرفا لکھنؤ میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ بچپن میں ورزش کا بڑا شوق تھا اور بانگ شاہ وغیرہ اپنے
 مانا سے سیکھا تھا۔ شاعری کا شوق فطری تھا۔ نیم دہلوی سے ملتا تھا۔ بہت خوشگوار و رنگین طبع

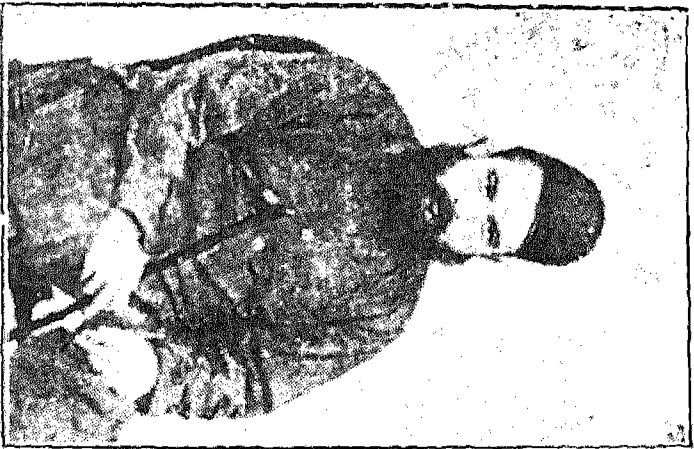
شاعر تھے۔ مگر نظم سے زیادہ نثر میں انکو شہرت حاصل ہوئی، جہاں وہ صفائی زبان صحت محاورہ اور
 بذلہ سخی کے لئے مشہور تھے۔ آخر عمر تک "تم ظریف" کے لقب سے اردو پینچ میں مضمون نگاری کرتے رہے
 انکے مضامین پڑھنے کے قابل ہیں اور محاورہ اور صفائی زبان کے لئے اپنی آپ مثال میں۔ مبلوئے نقشا
 نظم و نثر حسبِ ذیل ہیں گلزارِ نجابت۔ میلادِ شریف (منظوم) آفتابِ قیامت (لکچر کے انداز میں ایک
 طرفیانہ نظر چاکر آباد میں پڑھی گئی تھی) بہارِ ہند (اردو محاورات کی ایک ناتمام لستہ) شہنوی نیرنگِ خیال
 بعض مضامین جو اردو پینچ میں شائع ہوئے تھے اور پیمبرِ ہند کے نام سے علیحدہ شائع ہوئے ہیں۔ انکارِ دو دیوان انکے
 صاحبزادہ مرزا محمد صدیق کے پاس ہے جو ہنوز شائع نہیں ہوئے۔ انکے گیتا سابق ایڈیٹر بہارِ قمر
 کلکتہ انکے ایک مشہور شاگرد تھے۔ مرزا صاحب نہایت ہناش بنشاش، لطیف و متواضع اور وسیع الاحباب
 تھے۔ مزاج میں ظرافت اور بذلہ سخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ خود داری اور آزادی یہاں تک تھی کہ ملازمت
 سے ہمیشہ کنارہ کش رہتا، سوجھ سے کہ زمین پابندی عاید ہوتی تھی۔ سیاسیات سے بھی شوق تھا چنانچہ ایک مرتبہ
 انڈین نیشنل کانگریس کے ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے کانگریس میں شریک ہوئے تھے۔ مختصر یہ کہ صفائی
 زبان اور بذلہ سخی آپکے خاص جوہر ہیں۔

ترہون نامہ ہجر پینڈت ترہون نامہ سپر و تخلص تاج پینڈت شمسہ نامہ سپر و کے بیٹے تھے۔ ۱۹۵۳ء
 میں پیدا ہوئے۔ کیننگ کالج لکھنؤ میں تعلیم انگریزی سے فراغت کر کے اخبار نویس کا مشغلہ اختیار کیا، کچھ دنوں
 تک لکھنؤ میں وکالت بھی کی تھی۔ نہایت خرافات الطبع انسان اور ہر دلعزیز تھے۔

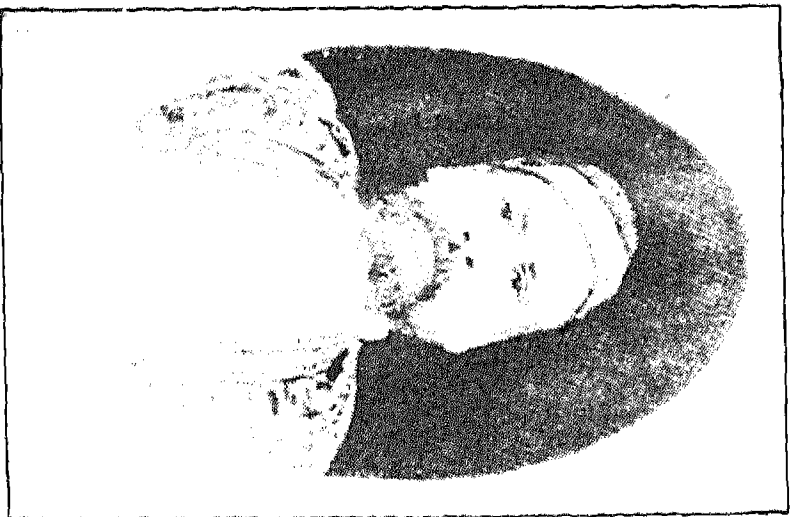
نواب سید محمد آزاد نواب سید محمد آزاد آئی۔ ایس۔ او ۱۹۵۳ء میں مقام ڈاکر پیدا ہوئے۔ شہرِ تینگال
 کے ایک معزز اور دردمند خاندان سے آپ کا تعلق تھا۔ ابتدائی تعلیم آغا احمد علی اصفہانی سے حاصل
 کی اور یہ وہی شخص ہیں جن سے مرزا غالب "برہانِ قاطع" کے بارہ میں مصرعے کہے ہیں۔ انگریزی گو کہ
 پراگٹ طور پر پڑھی تھی مگر اس زبان میں انکو مہارت کامل حاصل تھی۔ ابتدائے ملازمت سب جہڑاری سے
 ہوئی اور اسی لائن میں ترقی کرتے کرتے انکی مہارت کامل ہو گئی۔ ابتدا میں ملازمت سب جہڑاری سے
 بین دو فوٹو سی ممبری کو نہایت بخشی اور پیمبرِ یلہ سردس آرڈر (آئی۔ ایس۔ او) کا نشان اعزازی آپ کو



مفتی سید محمد سجاد حسین مرحوم ایڈیٹر اردو پانچ



Major General Sir John D. G. Gordon



Major General Sir John D. G. Gordon

عطا ہوا ۱۹۱۲ء میں سرکاری ملازمت سے کناراہ کش ہوئے۔ پہلے آپ ایک فارسی اخبار -
 ”دورین“ میں بزبان فارسی مضامین لکھتے تھے مگر اس کے بعد اودھ اخبار اودھ پنچ، اگرہ اخبار وغیرہ
 مختلف اخبارات و رسائل میں زبان اردو میں لکھنے رہے۔ ۱۸۷۸ء میں انکا ناول ”نوابی دربار“ نکلا
 جس میں کہ مذاق کے پیرایہ میں برائے رنگ کے فاقہ مست نوابوں کا خوب خاکہ اڑایا گیا تھا اور بہت
 مقبول عام ہوا۔ آپ انگلستان بھی گئے تھے اور وہاں سے جو خطوط بھیجے ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں۔
 آپ کی کتاب موسوم بہ ”نئی لنت“ طریفانہ رنگ کی مقفی نہایت دلچسپ کتاب ہے۔

جولاء پشاد برق [منشی جولاء پشاد تخلص بہ برقی اک نہایت ذہین اور قابل شاعر و نثر دان تھے
 ۱۸۶۳ء میں بمقام سیتاپور پیدا ہوئے۔ انٹرنس کا امتحان کھیری سے پاس کر کے ۱۸۷۸ء میں
 کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ ۱۸۸۸ء میں بی اے اور ۱۸۸۸ء میں قانون کی ڈگری
 حاصل کی ۱۸۸۸ء تک وکالت کر کے نصف ہو گئے زمین ترقی کرتے کرتے قائم مقام ڈسٹرکٹ
 ویشن جج کے درجے تک پہنچے۔ ۱۹۰۹ء میں گریفن کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۱ء میں
 بعارضہ پلگ اس دارفانی سے کوچ کیا۔ نہایت طبیعت دانا اور ذہین شخص تھے۔ فسانہ آزاد کی عبارت کے
 اس قدر دلدادہ تھے کہ خود بھی وہی طرز اک حد تک اختیار کیا آپ کی ”شہزادی بہار“ اک نہایت اعلیٰ درجہ کی
 تصنیف ہے جو سرسید مرحوم کو بہت پسند تھی برق علاوہ شاعر و شگوبہ نیکے مترجم بھی اعلیٰ درجہ کے نیکم چند
 چترچی کے اکثر مشہور ناولوں کے ترجمے آپ کے قلم سے نکلے ہیں مثلاً ”بنگالی دولہن“ ”پرتاب“ ”روہنی“ ”مزلنی
 مار آستین“ وغیرہ۔ آپ کا ترجمہ اس قدر صاف سلیس و سحر آمیز ہے کہ مطلق ترجمہ نہیں معلوم
 ہوتا۔ کتب مذکورہ بالا بہترین اردو ناول خیال کے جاتے ہیں انکے علاوہ ”شکسپیر کے بعض ڈراماؤں کا بھی ترجمہ
 آپ نے کیا تھا مگر افسوس کہ ان میں سے اکثر شائع نہ ہو سکے۔

احمد علی شوق [منشی احمد علی شوق قدوائی اسیر مرحوم کے معزز شاگردوں میں تھے غزل اور شہزادی خوجہ کہتے
 تھے چند نامک نثر و نظم بھی آپ کی یادگار ہیں جس میں ”قاسم و زہرہ“ ”اوسکیفرن ٹوٹی“ ”زیادہ مشہور ہیں۔
 فتویٰ ان آپ کی بہت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہیں علی الخصوص ”عالم خیال“ جس کی زبان نہایت لطیف و

غیرین ہے بچہ مقبول ہوئی، یہ کتاب ایک ستم رسیدہ عورت کی دکھ بھری داستان ہے جو اپنے بچہ پر
ہوئے شومیر کی واسپی کا انتظار بڑے شوق و ذوق سے کر رہی ہے۔ اسکی عبارت فارسی مضامین سے خالی
ہے، دیوان بھی آپ کا شائع ہو گیا ہے اور نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ آپ فن عروض اور نکات ادیبانہ
سے پوری طرح واقف تھے اور نثر کے مضامین میں بھی مغللی اور صحت زبان کا بہت خیال رکھتے تھے
آخر عمر میں ریاست رام پور سے تعلق ہو گیا تھا۔ آپکی وفات حسرت آیات سے ممتاز شعرا سے اردو
کی صف میں ایک جگہ خالی ہو گئی جسکی خانہ پرشی شکل ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار پنڈت رتن ناتھ متخلص بہ سرشار گدشتہ صدی کے آخر میں ایک عجیب و غریب
بالکمال شخص گزرے ہیں۔ اک سوز کشمیری خاندان سے تھے ۱۸۳۸ء یا ۱۸۳۹ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے
صرف چار برس کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ انکے چھوٹے بھائی پنڈت شمشیر ناتھ وٹھک
تھے جنکے بیٹے ریاست بلرام پور میں ملازم ہیں۔ سرشار کے صاحبزادے پنڈت رنجن ناتھ دوسرے کاروباری خزانہ
میں ملازم تھے مگر جوانی میں انتقال کر گئے۔ سرشار عربی فارسی انگریزی تینوں زبانوں سے واقف تھے
انگریزی انہوں نے کیننگ کا لکھنؤ میں پڑھی تھی مگر اس میں کوئی ڈگری نہیں حاصل کی۔ سب سے پہلے ضلع کل
الکھیری میں ٹیچر ہوئے اور یہیں سے وہ ماسٹر کشمیری میں جو اس زمانہ میں کشمیری پنڈتوں کا ایک ادارہ
وہ سالہ نکال کر لاتا تھا اور ادھر پنج "مین اپنے مضامین بھیجا کرتے تھے۔ یہ آرٹیکل گو کہ کوئی خصوصیت نہیں رکھتے تھے
مگر پھر بھی انکی آئندہ تصانیف اور شہرت ایک سنگ بنیاد بن گئے۔ سرشار ترجمہ میں بھی بڑی مہارت
رکھتے تھے اور وہ اپنا اس قسم کا کام سرشتہ تعلیم کے کسی رسالہ میں بھیجا کرتے تھے وہ بڑی قدر کی نگاہ
سے دیکھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر سرشتہ تعلیم اسکو بہت پسند کرتے اور ان کی قابلیت کی داد دیتے تھے سرشار
کبھی کبھی "مرآۃ الہند" اور "ریاض الانباء" میں بھی اپنے مضامین بھیجتے۔ ۱۸۷۸ء میں انہوں نے ایک
انگریزی کتاب کا ترجمہ کیا اور اس کا نام "شمس الضحیٰ" رکھا۔ اس میں انہوں نے اکثر سائنس کی
اصطلاحات کا ترجمہ عمدہ اور سلیس اردو میں کیا ہے۔ اسی سال وہ ادوہ اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور
یہ اس طور پر ہوا کہ ڈاکٹر سرشتہ ڈاکٹر سرشتہ تعلیم نے ان کا تعارف منشی نو لکشور صاحب مالک اخبار



نواب سید محمد خان بہادر آزاد آئی-ایس-ار



Portrait of a man with a mustache, wearing a suit and a shawl, standing next to a classical column.

سے کہ یا جن کو اس وقت اخبار کے لئے اک قابل آدمی کی ضرورت تھی سرشار نے اپنی مشہور و معروف تصنیف "فسانہ آزاد" کا سلسلہ اسی اودھ اخبار میں شروع کر دیا جو دسمبر ۱۸۹۷ء تک قائم رہا اور ۱۸۹۸ء میں "فسانہ آزاد" بصورت اک علیحدہ کتاب کے چھپا اور بہت مقبول ہوا۔ اسی عرصہ میں اودھ پنچ اور اودھ اخبار میں وہ مشہور سرکہ شروع ہوا جو عرصہ دراز تک قائم رہا۔ اودھ پنچ اودھ اخبار اور اسکے ایڈیٹر کو اپنے ظرفیانہ انداز میں سیکرٹون صلواتین سناتا تھا اور اس کا جواب بھی کلمہ بہ کلمہ دیتا تھا آخر بعض دوستوں کی کوشش سے مصالحت ہو گئی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا سرشار دو اور رہنماؤں میں بھی شریک ہوئے تھے ایک بیان نیروانی میرٹھی، ایڈیٹر ٹوٹی ہند اور دوسرا خواجہ الطاف حسین حالی کے ساتھ لے۔

سرشار کی تصانیف سیرکس، جام سرشار، کائناتی اور خدائی فوجدار بہت مشہور ہیں آخر الذکر ایک انگریزی ناول ڈان کوئی ڈوکا ترجمہ ہے۔ ۱۸۹۷ء میں انہوں نے ایک سلسلہ موسوم بہ "سرشار" شروع کیا تھا اور اسی زمانہ میں ان کے ناول "کرم و ہم"، "بھڑی دولہا"، "طوفان بے تیغی"، "پی کمان"، اور "نہو بھی شایع ہوئے مگر ان میں ان کا زور بیان کم ہے۔ حیدر آباد جانے سے قبل کچھ دنوں وہ الہ آباد ہائی کورٹ میں مترجم بھی ہو گئے تھے مگر قواعد دفتر کی سختی کے وہ تحمل نہو سکے اور حقوڑے ہی دنوں میں ملازمت ترک کر دی۔ ۱۸۹۷ء میں وہ حیدر آباد گئے۔ اپنے قیام حیدر آباد کا حال اک خط میں جو "کشمیری درپن" مارچ ۱۸۹۹ء میں شایع ہوا تھا اور جس کا ایک حصہ پنڈت برج نرائن چکبست صاحب نے اسی سے نقل کیا ہے اس طرح بیان کرتے ہیں:-

تقریباً چار برس ہوئے کہ میں ممبر کانگریس کی حیثیت سے مدراس آیا تھا۔ میری خوش نصیبی چھکو حیدر آباد والی جہان ہندو مسلمان امیر غریب سب نے نہایت گرمجوشی سے جھک لیا اور میرے اوپر لے۔ ہکو یاد پڑتا ہے کہ یہ رہائے سرشار سے نہیں بلکہ اودھ پنچ سے ہوئے تھے کیونکہ اودھ پنچ میں ایک سلسلہ "حضرات عالی" ایک عرصہ دراز تک اس سرخی سے چھپا رہا ہے۔ ابتر چارے جلون سے حالی کا حال ہے۔ میدان بانی پت کی طرح پائمال ہے اور آخر میں کچھ مضامین حالی کی تعریف میں بھی اس سرخی سے نکلتے تھے۔ عیب حالی کے بہت تم گئے اے پنچ، انک شادی کرو دو چار ہنر بھی کدو۔

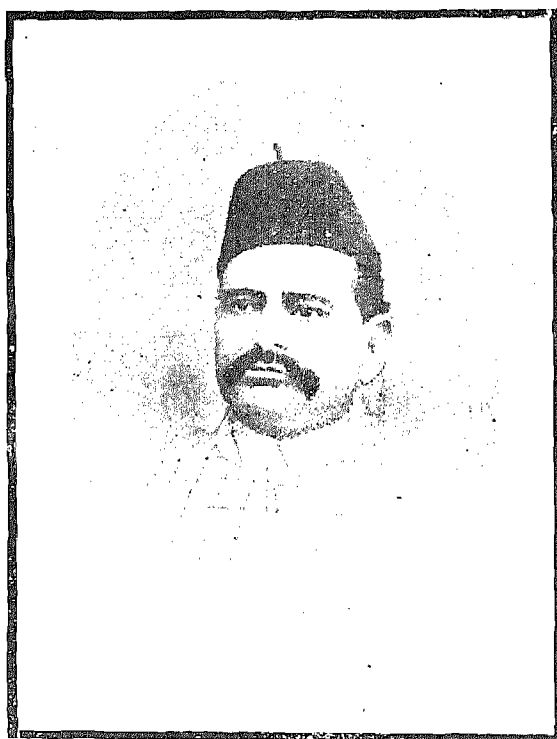
بڑی غنائتیں کیں۔ جہاں راجہ سرکشن پر شاد نے اپنے کلام نظم و نثر کی اصلاح کے لئے دور و دور و پسہ ماہوار مقرر کر دیا ہے اسکے علاوہ خلعت خوشنوی ادنیٰ شعر جو پسند خاطر ہو جاتا ہے ایک اشرفی عنایت فرماتے ہیں حضور نظام مجھے پہلے ہی سے واقف تھے پہلے دن جب میں حاضر خدمت ہوا تو نظر گذرانی اور اپنی کچھ کتابیں بھی پیش کیں اعلیٰ حضرت نے ذرہ نوازی کی لکاک مکر ڈار با کے بیان کا میرے سیرکسار سے اور ایک مقام جام سرشار سے سماعت فرمایا۔ میں نے ایک تاریخ شاہزادہ کی ولادت کی مبارک باد میں بند گان عالی کی خدمت میں پیش کی جسکو اعلیٰ حضرت نے بہت پسند فرمایا۔ میرا نام معزز دربارین کی خدمت میں شامل ہو گیا ہے اور کوشش کجا رہی ہے کہ منصب بھی ملے۔ اگر خدا نے چاہا تو میرا جدید ناول "گورنریاں" اک ہفتہ کے عرصہ میں شائع ہو جائیگا۔

کچھ عرصہ تک سرشار و دبیر آصفیہ کی ادارت کرتے رہے۔ اُن کا ناول چنیل اسی اخبار میں نکلتا تھا مگر پورا نہیں ہوا "گورنریاں" جس کا ذکر انکے خط میں ہے شائع نہ ہو سکا اور چنیل کوئی بادقعت تصنیف نہیں ہے۔ آخر عمر میں سرشار نے مے نوشی کی بڑی کثرت کر دی تھی اور یہی اُن کی قبل از موت کا باعث ہوئی چنانچہ انکا انتقال حیدرآباد ہی میں سن ۱۹۰۲ء میں ہوا۔

سرشار نہایت خوشگو شاعر تھے اسیر کے شاگرد تھے اور خوب کہتے تھے۔ سن ۱۸۹۷ء میں ماہون نے اپنا ایک قصیدہ کشمیری کا نفرنس میں پڑھا تھا اور ایک مثنوی تحفہ سرشار بھی لکھی جو جوں کا توں لکھی گئی تھی جبکہ نڈت بشن نرائن در کی واپسی انگلستان پر پرانے خیال کے کشمیری ہندوؤں میں ایک نم کے برہمن پیدا ہو گئی تھی۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور اسکی مقول باتوں سے لوگوں کی برہمنی سفر دلایت کی نسبت اک حد تک رفع ہو گئی۔

عام حالات و اخلاق

شیر قیسی معنی میں آزاد مزاج تھے۔ قوت حافظہ بہت قوی پائی تھی اور تعصب اور مذہبیت سے بالکل بری تھے۔ بائین بہت دلچسپ اور منہ کی کیا کرتے تھے اور طبعا ظریفیت ذات ہوتے تھے۔ شرا بخوار سی نے انکے ساتھ بھی وہی کیا جو درگا سہائے سرور کے ساتھ کیا تھا یعنی ایک مہنار زندگی کا ہلدی خاتمہ کر دیا۔ اور دنا دل کو انگریزی طرز پر لکھنے کا فخر نہیں کر



پاکستان رتن نواز سمرشار



حاصل ہے اور اسی کے ساتھ وہ ایک زبردست جرنلسٹ ایک مشہور مصنف اور دو کے زبردست زبان دان
 ظریف اور بذلہ سخ اور ایک طرز خاص کے موجد بھی تھے۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ انکی شہرت کو کچھ
 تو گوگنکے تصنیف اور کچھ انکی ذاتی بے پروائی اور لابی پن نے کم کر دیا۔ انکی فنانہ آزاد اور دیگر تصانیف
 میں اکثر جگہ جو طب و یابس اور درجہ سے گری ہوئی باتیں پائی جاتی ہیں انکی وجہ زیادہ تر انکے مزاج کی
 جلد مازی اور بے پروائی کوئی جاسکتی ہے۔ انکی شراب نوشی کبھی انکے تخیل میں پر لگا دیتی اور کبھی انکے
 ہمارے اُنکا دماغ معطل اور بیکار ہو جاتا تھا۔ انہیں وجہ سے نہ وہ کبھی اپنے مسودہ پر نظر ثانی کرتے
 ۔۔۔ کبھی پروف پڑھنے کے عادی تھے ہمیشہ جربستہ اور قلم برداشتہ لکھتے اور اگر کسی وقت پر قلم نہ ملتا
 تو تنکے سے کام نکال لیتے تھے۔ اسی بے پروائی اور بے اصولی سے انکے قائم کئے ہوئے پلاٹ انکے
 دکھائے ہوئے کیرکٹر انکے بیان کئے ہوئے واقعات میں اکثر جگہ حد درجہ بے ربطی اور عدم تسلسل
 پایا جاتا ہے جب کبھی انے کوئی مضمون لکھوانا ہوتا تو مالک مطبع شراب کی ایک بوتل پیش کرتے اور
 وہ اُس مضمون کو فوراً لکھ ڈالتے۔ مگر اس طبعی کمزوری کے ساتھ انہیں خود داری اور آزاد روی
 بھی اتنی تھی کہ کبھی کسی امیر و رئیس کی خوشامد نہیں کی، اور اپنی شہرت کے واسطے کسی دوسرے کے
 شرمندہ احسان نہیں ہوئے خود انکی قابلیت اور طباعی اور ذہانت انکی شہرت کا حقیقی باعث تھی۔
 آخر عمر میں البتہ وہ زمانہ کے اچھے سے تنگ آکر حیدر آباد گئے تاکہ دولت آصفیہ کے زیر سایہ کچھ دنوں غنت
 زندگی بسر کریں۔ مگر نصیبی نے پڑانی عادت کو نکلی طرح وہ ان بھی انکا ساتھ بچھڑا اور آخر کار وہیں ہی نہ چکا
 اور غالب کے اس قطعہ کے مصداق ہوئے۔

رہے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہو ہم سخن کوئی نہو اور ہنر بان کوئی نہو
 پڑے گر بیمار تو کوئی نہو تیس ہمار دار اور اگر مر جائے تو نہو خوان کوئی نہو

تصانیف انکے حسب ذیل تصانیف بہت مشہور ہیں۔ فنانہ آزاد۔ سیر کوہ سدا۔ جام شراب کامنی
 خدائی فوجدار۔ کرم و ہم۔ بھڑی مولھن۔ ہشو۔ طوفان بے تمیزی۔ رنگے سیار۔ پی کہان شمس الضحیٰ

والیس کی کتاب ریشا کا ترجمہ اردو میں۔ لارڈ ڈفرن کی کتاب "ریٹرز فرام ہائی لیشی ٹوڈس" کا ترجمہ اردو میں۔

فائدہ آزاد جیسا کہ اوپر بیان ہوا انسانہ آزاد و شریعت میں اور ہر اخبار کے کالمونین نکلتا تھا۔ اس کی اشاعت نے دنیائے اردو میں ایک عجیب بل چل ڈال دی۔ جب یہ اخبار میں نکلتا تھا تو لوگوں کو اتنا اشتیاق ہوتا تھا کہ دوسرے پرچہ کے لئے بیاب رہتے تھے۔ پنڈت بٹن ناراین دیا پنہانی اس کا بانی تھے۔

تصہ کا پلاٹ تو بہت سادہ بلکہ حد درجہ بے مزہ ہے مگر ڈالنی ہزار گنجان صنعتی ہوتے پلے جائے ذرا بے مزہ نہیں ہو جے گا بلکہ سطر سطر پر اشتیاق بڑھتا جائیگا بعض اسوجہ سے کہ عبارت آرائی غصب کی ہے۔ طرز اداسنایت بے تکلف اور آسان تازہ اور غیر چل۔ یقینی اور واضح۔ پھر اٹکے ساتھ جا بجا پر لطف ظرافت۔ پھر مکتے ہوس فقرے۔ مزید ارشویان۔ ترکی برو کی جواب۔ حماقت آئیز مضحک باتیں ہیکو پیکر کہتے جیسے پیٹ میں بل بڑ جائیگے۔ آزاد اصل تصہ کا ہیرد ایک دولتمند و جوان دنیا دار نفس بہت سین اور ہر حال و تعلیم یافتہ۔ کئی بڑوں سے واقف۔ سپاہی پیشہ۔ طرین۔ شاعر۔ عاشق و راج۔ دلچسپ واد باتیں کرنے والا۔ اور ہر اچھی صورت پر مرنے والا۔ ایک طرف اعلیٰ سوسائٹی کی زیب و زینت۔ دوسری طرف ایک جلیلا کا ناش جان باختہ۔ بیگمات کو بھی تلجائی ہوئی نظروں سے گھورنے والا۔ اتفاقاً یہ میان آزاد ایک حسین دولتمند حسن آرا نام پر لٹو ہوتے ہیں۔ اس سے عشقنا زبان کرتے ہیں۔ آخر وہ اٹکے ساتھ اس شرط پر عقد کر سیکے لئے ماضی ہوتی ہے کہ سچے وہ ترک باتیں۔ لیکر اسلام میں ام نکھائیں۔ روسو نے ہر دماغی کرین۔ آزاد اپنی مشرق کے حکام کی بجا آوری خوشی خوشی

لہ سرور و نند مکزی والیس۔ لارڈ ڈفرن اور مارکوئس آف لینسٹون کے پرائیوٹ سکرٹری نہایت قابل اور صاحب تصنیف اور بروٹ سیان تھے۔ انسانیکو پیڈیا برٹانیکا کی دسویں ادیشن کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں۔



شوقی قدراڻي

کرتے ہیں۔ اور بقول شخصے بندھا خوب مار کھاتا ہے ہل ہلکتے کودوں بھانکتے ٹرکی جاتے ہیں
 روسیوں سے لڑتے ہیں اور مظفر دمنصور واپس آتے ہیں۔ اپنی جانبازیوں کے بدلے اپنی
 معشوقہ سے ایفائے وعدہ چاہتے ہیں اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ ہے اصل
 اور جہان تک قصہ کے پلاٹ کا تعلق ہے۔ اس سے بدتر اور ہمزہ تر شاید ہی کوئی قصہ انسانی
 دماغ سے نکلا ہوگا۔ مگر اسی قصہ کو متن نامتہ در کی زبان سے سنئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک
 نگار خانہ بین میں چلے جا رہے ہیں جسکی دلکش جیتی جاگتی تصویریں الفاظ کا جساد
 تخیل کی کثرت۔ مناظر کی چونچالی ایسی ہے کہ جب اس آئینہ خانہ سے گزرتے ہیں تو
 کچھ لعین کچھ شک کرتے ہوئے ایک طلسم کد ہمارے نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور یہ معلوم
 ہوتا ہے کہ کسی زبردست باز گیر نے اپنے کرتبی ڈنڈے سے پیارا آسمان ہمارے سامنے
 کھینچ دیا ہے۔

مندرجہ بالا رویو لفظاً لفظاً صحیح ہے۔ فسانہ آزاد کو پلاٹ کے تناسب کی کڑنگاری کے اسلوب
 اور قصہ کی تدبیر کی ترقی اور دلچسپی کے لحاظ سے نہ پڑھنا چاہئے۔ اصل قصہ کو اک کھوٹی سمجھنا چاہئے
 جس پر ہزاروں واقعات ٹنگے ہوئے ہیں اور انہیں علیحدہ علیحدہ واقعات کے پڑھنے میں ہمارا
 لطف آتا ہے۔ وہ ان کا مذاق و ظرافت اور دلچسپ کی کڑنگاری و شوخیان اور حاضر جوابیان یہی
 سب باتیں کتاب کی جان ہیں۔ فسانہ آزاد میں مثل ڈو ما کے ناولوں کے ساری عمدگی اور دلچسپی
 اشخاص قصہ کی باتوں میں ہے نہ کہ نفس قصہ کے بیان میں۔ سرشار کا کلمہ کے استاد ہیں اور
 کی کڑنگاری کی خوبیاں طول طویل بیان سے نہیں بلکہ خود ان اشخاص کی گفتگو سے نہایت کامیابی
 سے دکھلاتے ہیں۔

شیراز کی مرقع نگاری | سرشار مثل مرزا رجب علی بیگ سرور کے پرتکلف اور متقی عبارت نہیں

اس نام کے دو ناولسٹ باپ اور بیٹے فرانس میں گزشتہ صدی میں بہت مشہور و معروف گذرے ہیں

ان کے اکثر ناول نہایت دلچسپ ہیں ۱۲۔

پسند کرتے نہ وہ بڑا یوں کو چھپاتے اور اچھا یوں کو چھپاتے ہیں بلکہ وہ ہوں تصویر میں کھینچتے ہیں اور
 علی الخصوص اشخاص لکھنؤ اعلیٰ دادے "اسیر و غریب" کے سب سے مثل مرتے اپنے اس لاجواب کتاب
 میں کھینچ دے ہیں۔ ان کے اشخاص قصہ سایہ کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں گذرتے، بلکہ وہ
 ہمارے آپ کی طرح گوشت و پوست کے بنے ہوئے چلتے پھرتے جیسے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔ پنڈت
 بشن نرائن در اسکی نسبت لکھتے ہیں :-

"اگر تم نے مجھ کو نکال دیا تو غل غپاڑے والے طوفان بے تیزی کے مجھے تو تھوڑی تھوڑی
 سے جاتا ہوگا کہ میں ایسا سو کر لوگوں کی دیکھا دیکھی سے تم خود نہ گر پڑو اور اس کی احتیاط کرنا ہوگی کہ تمہاری
 گھڑی یا کوئی اور چیز جو تمہاری جیب میں ہے کہیں نکل نہ جائے۔ یہی حال اُن کے محرم چمک اور عیش باغ
 کے میلون کا ہے کہ مردان اپنے میں ایک عجیب بھیر میں پاتے جو میں شیراز پتنگ باز یا فیمنی - زرق
 برق لڑا ب معا اپنے ڈیڑھے زرد و مصباحوں کے - زردیان کا ڈیون میں سوار کسی بڑھے فیل سوار
 تما شہین سے آنکھیں لڑا رہی ہیں - فیروز گارڈ کے پیچھے دوڑتے دھام دیتے جا رہے ہیں اور اگر کچھ
 نہیں ملتا ہے تو چپکے چپکے سیکڑ دھولواتیں سناتے ہیں - فاقہ مست عاشق - رنگیلے بیکار - عورتیں خوبصورت
 بصورت - کوئی لپٹ کھوٹے بچے کو آواز دے رہی ہے - کوئی اپنے پار سے لڑ رہی ہے - کوئی کسی
 راکے مصاحب خاص - سے ناز و انداز کی باتیں کر رہی ہے - پولیس کا سٹبل - چور - اچکے چنگی کے
 مٹھو - ریلوے بازو - ٹھاکر صاحب کسی قریب کے گاؤں سے میلادیکھنے آئے ہیں - لالہ بہائی
 کسی منوبی یا تہنوں سے فارسی لغت چھانٹ رہے ہیں - انگریز آف اگر بوجیٹ سکرٹ مندر میں با
 بوائے نوٹیشن کے مسلمان ٹرکی ٹوپی ڈاٹے - بنگالی بارہمین نرم دھتیاں ہوا میں اڑاتے ہوئے
 یہ سب وہ مجمع سبکی سرشار نکو سیر کراتے ہیں جن میں ہزاروں مختلف آوازیں مٹھارے کاؤن میں آ رہی
 ہیں اور پاد و نظرت زندہ چلتے پھرتے باتیں کرتے غل مچاتے انسانوں کا ایک سمندر موجزن ہے
 اور بھولان سب پر طرہ یہ کہ اس عظیم الشان مجمع میں ہر آدمی کمالی بات چیت اور اس کے حرکات و سکنات
 سے تمہاری پہچان ہو سکتی ہو۔"

قسانہ آزاد بلکہ سرشار کی اکثر نادون کی خاص خصوصیات یہ دو چیزیں ہیں۔ یعنی (۱) لکھنؤ کی اس زبان کی سوسائٹی کی ہر ہر تصویریں کھینچنا اور (۲) شوخی و ظرافت۔ ہمارے نزدیک کسی شاعر یا ناثر نے اس سے قبل لکھنؤ کے آخری دور تمدن اور سوسائٹی کی صحیح تصویریں اس قدر جزئیات کے ساتھ کبھی نہ کھینچی ہونگی۔ سرشار پرانے رنگ کے نادون اُنکے افعال و اشغال انکے مصاحبوں اور ہم جلسوں کے سچے نقشے کھینچنے میں کمال رکھتے ہیں اور باوصف اس کے کو وہ ہندو تھے مگر سخت حیرت ہے کہ مسلمانوں کے بڑے گھرانوں کے اندرونی حالات اور بیگیا کی طرز معاشرت اور بول چال سے وہ اس طرح واقف ہیں کہ کوئی مسلمان بھی اُسے بہتر نہیں جان سکتا۔ انہوں نے ہماری آنکھوں کے سامنے سے پردہ اٹھا دیا ہے اور ہم ہندو اور مسلمان حرمسراؤں کے اندرونی حالات نہایت صفائی سے بالکل بے پردہ دیکھتے ہیں۔ انکو مختلف پیشہ ورون کی خاص خاص اصطلاحیں مختلف جماعتوں کے خاص خاص بولیاں اور اُن کا طرز ادا، دیہاتی بولی، بیگیا اور انکی منغلابون اور پیشہ زندگی بات چیت، بھٹیا سے اور بھٹیا رسی، ایفمی چند و باز، شرابی چوراچکوں کی زبان، دیہاتی گوکھے ٹھا کر دن اور پڑھے لکھے لالہ بھائیوں کا طرز تکلم۔ ان سب پر انکو کامل عبور حاصل ہے۔

سرشار کی شوخی اور ظرافت ادکا مذاق کامل، مہذب اور آزادانہ ہے۔ البتہ اسکی غالب کی سلی لطافت اور نیکی نہیں ہوتی اور الفاظ کی رو میں اور محاکات کے شوق میں کبھی وہ اس قدر بڑھ جاتے ہیں اور ادکا سمند طبع اس قدر بقیہ پوہ جاتا ہے کہ وہ فرش سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ مگر باوجود اسکے اس خاص چیز یعنی شوخی اور ظرافت میں کوئی ان کے قریب تک نہیں پہنچتا۔ کمالات لکھنے میں وہ کمال رکھتے ہیں علی الخصوص ادبی طبقہ کی بول چال انکے ٹکے بندھے فقرے انکے ضلع جگت کو وہ من و عن اور اگر دیکھیں

یہ کوئی حیرت کا مقام نہیں۔ یہ اس زمانہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول اور دلی اتحاد کا مین ثبوت ہے اور سری شال اس کی نظیر اکثر آبادی کی ہے جنہوں نے ہندوؤں کے تہوار میلے ٹھیلے یا تھک کر انکے مذہبی معتقدات تک کو کس قدر واقفیت اور تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اب جبکہ دو تون قوموں کے درمیان نفاسا نہایت اور تعصب کی ایک آگہنی دیوار قائم ہے تو یہی باتیں تعجب اور حیرت کی معلوم ہوتی ہیں۔

اس رنگ نامہ کو بے نقاب کرنے کی نسبت ہنڈت بنن ملازمین دراپنے اسی مضمون میں جس سے بعض مقامات اور نفیس کئے گئے اس طرح رقمطراز ہیں۔

”بے ادبی و گستاخی پرانے رسوم و خیالات کا استیصال دنیاوی لذتوں سے تمتع۔ موجودہ چیزوں کی ناپسندیدگی یہی سب خیالات انکے زمانہ میں لوگوں کے دلوں کو مسخر کیے ہوئے تھے اور وہ خود بھی یہی خیالات رکھتے تھے۔ پس کوئی شخص انکی سچائی اور راست بیانی پر اعتراض نہیں کر سکتا جبکہ وہ اپنے کلام کو اس رنگ میں دہرتے ہیں اور اسکو طرح طرح کی خوبون سے آراستہ بھی کرتے جاتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ اس آزادانہ تحریک کے بڑے حامی ہیں کہ جو پرانے خیالات اور قدیم رسم و رواج کو توڑنا چاہتی تھی۔ ہر سوسائٹی کے مداخل ارتقا میں ایک ایسا درجہ ضرور آتا ہے کہ جب عیوب اور غلطیوں کی اصلاح کے واسطے نظر اور متحرک اور عقل و نصیحت کے مفید ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ اور جب بدکاری کی بُرائی دکھائی دے تو یہی بہترین طریقہ ہے کہ وہ عریان کر کے دکھائی جائے۔ بہت سی غلطیاں جو وعظ و نصیحت سے اصلاح نہیں پاسکتیں اکثر دیکھائی گئی ہیں کہ وہ ایک مذاقہ جملہ سے بالکل دہل جاتی ہیں اور ایک طنز آمیز فقرہ سننے کی گولی عیوب کی تیرنہ پرواز چڑھ کر فوراً گرا دیتی ہے۔ رتن ناتھ سے جب کسی اخلاق آموز و اعظایا مولوی سے کسی پرانے خیال کے چھوٹ چھات ماننے والے سے کسی دولت پر گہندہ کرنے والے یا حسب نسب پر فخر کرنے والے سے مدبیرہ جوتی ہے۔ اور وہ انکی ہندو نصیحت کو انکی ڈینگوں اور شیخی کی باتوں کو سننے میں تو وہ ان سے بحث و مباحثہ نہیں کرتے نہ کہہیں ان سے لڑنا جھگڑنا چاہتے ہیں بلکہ صرف ان کا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ اور گو کہ تانتا ہند لوگ انکی اس ادا کو ناپسند کریں مگر باقی اور لوگ جو اس تلمذ کو دیکھتے اور انکی باتوں کو سننے میں ہنسی کے مارے لوٹ جاتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسخرہ نے اپنی باتوں سے انکے دلوں کو سوہ لیا اور اس کے بعد سے وہ لوگ جو مسخرہ کے ساتھ نہیں جکے کچھ کسی واعظ کی تقلید و تقلید پر نہیں روتے۔ پس رتن ناتھ کی نصیحت کا یہی طریقہ ہے۔ وہ مسخرہ کرتے ہیں ہنستے ہیں اور فتح پاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم انکو سوسائٹی کی برائیوں کا اک بہت بڑا مصلح سمجھتے ہیں۔ مگر وہ کسی خاص اصلاحی تحریک سے تعلق نہیں رکھتے انہوں نے کسی سپریم مصلح قوم کی طبیعت نہیں

پائی تھی وہ دل سے مسخرے اور ہنسی میں اڑا دینے والے تھے۔“

سرشار کی کیرکڑ نگاری سرشار کی کیرکڑ نگاری کے استاد ہیں مگر وہ ہر بہو لہفتے نہیں کھینچتے بلکہ اصلیت کے ساتھ مبالغے سے بھی کام لیتے ہیں اسی وجہ سے ان کے کیرکڑوں میں ڈکنس اور تھیکرے دونوں کا مجموعی رنگ پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے تمام کیرکڑوں میں جو خاص اور مزین باتیں ہوتی ہیں ان کو چن لیتے ہیں اور انہیں میں وہ وہ شگوفے پیدا کرتے ہیں جن کو پڑھ کر آدمی ہنستے ہنستے لوٹ جاتا ہے۔ ان کے کیرکڑوں کو اس نظر سے نہ دیکھو کہ وہ بالکل نیچر کے مطابق ہیں بس ان کو پڑھو اور سنو اور یہی کافی ہے۔

خوجی خواجہ بدرج الزمان معروف بہ خواجہ بدیعاً مخفف خوجی۔ وہ پُرانا ہے وقوف، مسخرو، آزاد کا ہمدرد دیار غار، کمزور و نکو دانیوالا، رنگیلا، عیاش، زلیخا، بدعاش، جسمانی اور دماغی کمزوریوں کا پوٹ، بونا جو شہ تیئیں ہرگز بونا نہیں سمجھتا بلکہ بونا کہنے سے سخت برا ماننا ہونے لگتا ہے گزشتہ کارناموں پر جو سرسراہٹ اور جھوٹ ہیں ڈینگین مارنیوالا اجمان جانے لگے لوگ اُس پر آواز سے کہیں اور پھبتیاں اڑائیں ہمیشہ اس خیال میں کہ دنیا جان بوجھ کر اس کی بڑائیوں اور خوبیوں پر خاک ڈالتی ہے اس کا مسخرہ ہیں اس کی دل لگیاں، اس کی آزادی کے ساتھ محبت و وفاداری، اُس کا اپنے چھوٹی سی تلوار لیکر تیرے بدلنا، اُس کا بات بات پر تم کمانا اس کی اپنی بزدلی چھپانے کی ترکیبیں، انہیں سب باتوں سے وہ لوگوں کے دلوں میں گھر کئے ہوئے ہے اس کے

۱ انگلستان کے گزشتہ صدی کے دو مشہور ناولسٹ گذرے ہیں۔

۲ دیلے انسان کے اس عجیب و غریب کیرکڑ کا سرشار نے جو خاک اپنے خاص رنگ میں کھینچا ہے حرفِ پل ہے گید یوں کے قبلہ گاہ پریوں کے بشت و پناہ گادویوں کی جان، بلکہ روحِ روان۔ دیوارِ حماقت کے نشیبیہ، پچھے پہلوان میانِ خواجہ بدرج الزمان صاحبِ بدرج (آجہائی) عزیز بھڑاوانی نہایت حیرانی اور غایت پریشانی سے دل ہی دل میں ٹھنڈی سانسیں بھرتے شہ گام جلنے لگے اور چونکہ ماشا اللہ ڈنڈ پیل جان اور کامل فن پہلو ان تھے یہ کیفیت یہی کہ دس قدم چلے اور تیرا نہ لگے۔ اللہ ری طاقت۔ ادل تو پستہ قامت۔ ماشہ بھر کا قد۔ دوسرے قطعِ شریف از بس نون اور نٹ کی طرح کوئی گل درست نہیں۔ اچھر طرہ یہ کہ مدت کے بعد اک چوٹی فرونی جو کسی استادِ بخار نے پیر مرد کو بطریقِ ندوی تھی زیب دست تھی پیش مشور ہے ”اچھے کے گھر تیرے باہر ہے نہ بھیرے“ کبھی دایین ہاتھ میں لی بازار والوں کی طرف

اکثر فقرے اور محملے اردو میں ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ اس عجیب غریب کیرکڑ کی آفرینش سے مراد
ہمیشہ یاد دہینے کے تمام ادب اردو اس کا مقابل اب تک پیدا نہیں کر سکا۔ وہ ادب نظریہ کی سب سے
زیادہ اور محمل اور سب سے زیادہ عجیب مخلوق ہے۔

دیکھ کر چکاں۔ کبھی بائیں ہاتھ میں لی اور دائرہ کے چلنے لگے۔ اب زمین پر قدم ہی نہیں رکھتے۔ دروغ فلک الافلاک
پر سہل اندری نجات۔ اور کیوں نہ ہو خدا نے حسن و یا تو گھوسوز۔ نور علیا کو عالم افروز۔ ایک تو گمان ڈیل جو ان
دوسرے فن سپرگی میں طاق کشی کے پہلوان۔ بالک اپنے اپنے۔ برٹ میں مشاق۔ اور خانہ جنگی میں شہر آفاق
اور سب صفوں سے بڑھ کر یہ صفت جناب باری نے عطا کی تھی کہ میدان جنگ میں بھاگتوں کے مقدمہ الجیش۔
سپلا رانا مارا بنے تھے۔ کوئی اور بھاگے یا نہ بھاگے یہ سب کے پہلے میدان چھوڑنے کی فکر کرتے تھے۔ انڈی
بہادری۔ بازار میں اس عجیب الخلقت پر جبکی نظر پڑتی ہے اختیار نہیں دیتا تھا کرواہ یا خوار اندر کی قطع ہو
اور اس بوسے پن پر اگر دائرہ اور تن تن کر چلنا اور رینڈ نا اور شکام جانا اور مصنوعی قرولی سے بھیر کر بٹانا اور بھلی طعن
دیتا تھا۔ فقرہ باز آپ جانتے زمانہ بھر کے بے فکرے انکو شگوفہ ہاتھ آیا جس گلی کو چھ کی طرف سے طوخی نکالتے
تھے رنگ انگلیان اٹھاتے تھے اور پھیون کے پھرے چلے جاتے تھے۔

(۱) اور کبھی پہلے بوسے حضرت دیکھنے کو لین ٹھوکر نہ لگے۔

(۲) آدمی کی بیٹو کا ڈانٹن ہے کیا کھٹ بٹ جا رہا ہے۔

(۳) ہکو تو چند دل معلوم ہوتا ہے (تمہقہ لگا کر)۔

(۴) کھجک کے باون اوتال کے ذریات میں سے ہے۔

(۵) اگر وہ تے تو بہت جاتے ہو کہ میں ایسا نہ ہو کہ کوئی چیت دے قرولی و ردولی پھینکے۔

(۶) ہاتھ پاؤں اٹھا کر اللہ کہتے سڈول ہیں۔

(۷) اس سے میان نہیں نرمی ادھر تو دیکھو یہ بھیڑیے کے بھٹ سے نکالے گئے ہیں سنا ابھی تک آدمی کی بولی

نہیں بول سکتے۔

۱۵ خوجی کے جملے ضرب المثل نہیں ہوئے بلکہ وہ خود ضلع جگت کی طرح شیلین بھی بولنے کا بہت شائق ہے ۱۲۔

سرشارنے اپنے نادولن سے
ان تجربوں کو خارج کر دیا
ایک خاص صفت انکی تصانیف کی یہ ہے کہ انہوں نے غیر فطری
جزد کو اپنے نادولن سے خارج کر کے انسانی زندگی کے معمولی واقعات
میں ایک غیر معمولی دلچسپی پیدا کر دی۔ مولوی نذیر احمد کا بھی یہی خصیصہ ہے۔ مگر انہیں اور سرشار
میں یہ فرق ہے کہ انکے قصے صرف اخلاقی اور نصیحت آموز ہیں جنکی غرض صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ انکو
عورتیں پڑھیں اور اسنے فائدہ اٹھائیں۔ اور اسیدو جسے انہیں دلچسپی اور حیرت انگیزی کم ہے۔ ہماری
اے میں سرشار سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے زندگی کے معمولی معمولی واقعات کو قصہ کے
پیرایہ میں بلانے کی غرض سے لکھا جو زمانہ حال کی نادولن کی اصلی اور صحیح غرض ہے۔

نقاویں کلام
سرشار کے قصوں میں مندرجہ ذیل نقاویں بتائے جاتے ہیں (۱) پلاٹ مربوط
اور منتظم نہیں ہوتے۔ فساد آزاد ایک باقاعدہ پلاٹ کا قصہ نہیں لہذا مصنف جب واقعات
میں ایک ترتیب نظام قائم کرنیکی کوشش کرتے ہیں تو ناکام رہتے ہیں وہ تمام متفرق واقعات
کو کبھی کبھار اس کے اور ان سے کبھی باقاعدہ اور مرتب پلاٹ نہ تیار کر سکے۔ یہی کمزوری انکے دوسرے نادولن
میں بھی نمایاں ہے۔ اسکی وجہ بظاہر انکی بے پروائی اور بیقاعدگی معلوم ہوتی ہے جسکی وجہ سے وہ
کوئی چیز مستقل باقاعدہ طور پر نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ایک سچے آرٹسٹ کی محنت اور شوق کیساتھ کام
کرنے سے گھبراتے تھے۔ اور اخبار کی ایڈیٹری یا اسکے واسطے قصے تیار کرنا انکو ایک بارگراں معلوم ہوا تھا۔
افسوس ہے کہ ایسے طبع اور ذہن آدمی نے بوجہ اپنے وارفتگی مزاج اور پابندی قواعد سے گھبرانے کے
اپنی خلقی طبعی و ذہانت سے پوری طرح کام نہیں لیا اور اسکی قدر نہیں کی۔ (۲) یہی سبب ان کے
واقعات میں عدم تسلسل اور ابواب میں بی ربطی کا بھی ہے اور شاید اسی وجہ سے انکے کیرکٹر دن میں بھڑکی
اور کیرنگی نہیں ہے جو قصے کے سلسلے میں سیکڑون رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ وہ وقتی ضروریات کو
مد نظر رکھتے ہیں اور کیرکٹر دیکھنے خصائص انکے دماغ میں قائم نہیں رہتے اسیدو جسے وہ انکو نباہ نہیں
سکتے۔ فطری بے جبری اور جلد بازی کی وجہ سے انکا قلم سرپٹ گھوٹے کی طرح دوڑنے لگتا ہے۔ وہ
لکھتے رہتے ہیں خواہ طبیعت حاضر ہوا نہ ہو جبکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب انکی فکر میں قوت پروا نہیں

اکثر فقرے اور محملے اردو میں ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ اس عجیب غریب کیرکڑکی آفرینش سے سرشار ہمیشہ یاد رہیں گے۔ تمام ادب اردو اس کا مد مقابل اب تک پیدا نہیں کر سکا۔ وہ ادب نظر لیانا کی سب سے زیادہ اور بخل اور سب سے زیادہ عجیب مخلوق ہے۔

دیکھ کر چکاؤی۔ کبھی بائیں ہاتھ میں لی اور دائرہ کے چلنے لگے۔ سب زمین پر قدم ہی نہیں رکھتے۔ دماغ فلک الافلاک پر ہے اور سرری نخوت۔ اور کیوں نہ خدا نے حسن دیا تو گلو سوز۔ نہ عطا کیا تو عالم افروز۔ ایک تو گران ڈیل جوان دوسرے فن سپر گری میں طاق کشتی کے پہلوان۔ بانگ اپنے بابائے۔ بوٹ میں مشاق۔ اور خانہ جنگی میں شہرہ آفاق اور سب مفتون سے بڑھ کر یہ صفت جناب باری نے عطا کی تھی کہ میدان جنگ میں بھاگتوں کے مقدمہ الجیش۔ سسپلار نامہ رہتے تھے۔ کوئی اور بھاگے یا نہ بھاگے یہ سب کے پہلے میدان چھوڑنے کی فکر کرتے تھے اور باری بہادری۔ بازار میں اس عجیب الخلقت پر جبکی نظر پڑتی ہے اختیار نہیں دیتا تھا کہ وہ ماشاء اللہ کیا قطع ہو اور اس بوئے پن پر اگر تار و تن تن کر چلنا اور اینڈ نا اور شگام جانا اور مصنوعی قرولی سے عبیر کو بٹانا اور بھی بھٹ دیتا تھا۔ فقرہ باز آپ جانے زمانہ بھر کے بے فکرے انکو شکوہ ہاتھ آیا جس گلی کو بچے کی طرف سے فوجی بھجواتے تھے لگ انگلیاں اٹھاتے تھے اور پھبتیوں کے پھرے چلنے جاتے تھے۔

(۱) ذرا سنبھلے ہوئے حضرت دیکھتے کہیں ٹوکر نہ لگے۔

(۲) آدمی کی بیٹری کا بیگن ہے کہ کٹ پٹ جا رہا ہے۔

(۳) ہکو تو چندول معلوم ہوتا ہے (جنتیہ لگا کر)۔

(۴) کھجک کے پاؤں اوتاہ کے ذریات میں سے ہے۔

(۵) اکوڑتے تو بہت جاتے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی جیت دے قرولی درولی پھینکے۔

(۶) ہاتھ پاؤں ماشاء اللہ کتنے سڈول ہیں۔

(۷) اسے میان پھین ڈری اور تو دیکھو یہ پھیرے کے بھٹ سے کاسے لگے ہیں سنا بھی تک آدمی کی بولی نہیں بول سکتے۔

۱۱ خوجی کے جلی ضرب المثل نہیں ہوئے بلکہ وہ خود ضلع جگت کی طرح ضلع بھی بولنے کا بہت شائق ہے ۱۲۔

سرشارنے اپنے ناولوں سے
ان نچرل چیزوں کو خارج کر دیا
ایک خاص صفت انکی تصانیف کی یہ ہے کہ انہوں نے غیر فطری
جز کو اپنے ناولوں سے خارج کر کے انسانی زندگی کے معمولی معمولی واقعات
میں ایک غیر معمولی دلچسپی پیدا کر دی۔ مولوی نذیر احمد کا بھی یہی خصیصہ ہے۔ مگر انہیں اور سرشار
میں یہ فرق ہے کہ انکے قصے صرف اخلاقی اور نفسیست آموز ہیں جنکی غرض صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ لاکھ
عورتیں پڑھیں اور اسنے فائدہ اٹھائیں۔ اور اسیوجہ سے انہیں دلچسپی اور حیرت انگیزی کم ہے۔ ہماری
و اسے میں سرشار سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے زندگی کے معمولی معمولی واقعات کو قصہ کے
پیرایہ میں ڈال بہلانے کی غرض سے لکھا جو زمانہ حال کی ناولوں کی اصلی اور صحیح غرض ہے۔

تفصیص کلام
سرشار کے قصوں میں مندرجہ ذیل نقائص بتائے جاتے ہیں (۱) پلاٹ مربوط
اور منتظم نہیں ہوتے۔ فائدہ آزاد ایک باقاعدہ پلاٹ کا قصہ نہیں لہذا مصنف جب واقعات
میں ایک ترتیب نظام قائم کرنیکی کوشش کرتے ہیں تو ناکام رہتے ہیں وہ تمام متفرق واقعات
کو کبھی یکجا نہ کر سکے اور ان سے کبھی باقاعدہ اور مرتب پلاٹ نہ تیار کر سکے۔ یہی بکزدوری انکے دوسرے ناولوں
میں بھی نمایاں ہے۔ اسکی وجہ بظاہر انکی بے پرواہی اور بیقاعدگی معلوم ہوتی ہے جسکی وجہ سے وہ
کوئی چیز مستقل باقاعدہ طور پر نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ایک سچے آرٹسٹ کی محنت اور شوق کیساتھ کام
کرنے سے گھبراتے تھے۔ اور اخبار کی ایڈیٹری یا اسکے واسطے قصے تیار کرنا انکو ایک بارگراں معلوم ہوتا تھا۔
افسوس ہے کہ ایسے طبع اور ذہن آدمی نے جو اپنے وارفتگی مزاج اور پابندی قواعد سے گھبرانے کے
اپنی خلقی طبعی و ذہانت سے پوری طرح کام نہیں لیا اور اسکی قدر نہیں کی۔ (۲) یہی سبب ان کے
واقعات میں عدم تسلسل اور ابواب میں بی ربطی کا بھی ہے اور شاید اسی وجہ سے انکے کیرکٹروں میں ہماری
اور کیرنگی نہیں ہے جو قصے کے سلسلے میں سیکڑوں رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ وہ وقتی ضروریات کو
مد نظر رکھتے ہیں اور کیرکٹروں کے خصائص انکے داغ میں قائم نہیں رہتے اسیوجہ سے وہ انکو نباہ نہیں
سکتے۔ فطری بے جبری اور جلد بازی کی وجہ سے انکا قلم سرپٹ گھوٹے کی طرح دوڑنے لگتا ہے۔ وہ
لکھتے رہتے ہیں خواہ طبیعت حاضر ہو یا نہ ہو جبکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب انکی فکر میں قوت پرور نہیں

مہر تیرہ زمین پر کھیلنے لگے ہیں (۳) انہیں فلسفیت اور اخلاق آموزی کی کمی ہے۔ ایسوجہ سے فساد
 اکڑاؤ کی آخری جلد اور ہشو کے بھی آخری ابواب جنہیں تعلیم نسوان، تہیاسوفی، اور ترک میوٹی وغیرہ کے
 متعلق و عطا تقریریں ہیں نہایت بیزہ اور بے اثر ہیں جب وہ اس کوچہ میں قدم رکھتے ہیں تو پھر
 وہ سرشار نہیں رہتے (۴) انہیں جذبات کی بھی کمی ہے ایسوجہ سے انکی تصانیف میں تصادیر
 و رد و غم کا پتہ نہیں۔ انکی جذبات نگاری جہاں کہیں برتی ہے مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔ اور ادھر
 ادھر کے اقوال و اشعار سے اس کی کوہ پورا کرنا چاہتے ہیں (۵) بعض جگہ اخلاق سے گری ہوئی اور
 غیر مہذب باتوں کا بھی اہتمام لگایا جاتا ہے اور فی الحقیقت انہوں نے بعض جگہ غیر مہذب اور
 سوقیانہ الفاظ استعمال کئے ہیں جن سے ہمارے اخلاقی احساسات کو ضرور صدمہ پہنچتا ہے مگر اسکے
 جواب میں انکی طرف سے دو غدر پیش ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اُس زمانہ کا جس میں وہ تھے رنگ ہی
 یہ تھا۔ دوسرے یہ کہ کسی عیب کی خرابی صرف اُسی وقت بخوبی ظاہر ہو سکتی ہے جبکہ اسکو بیان کر کے
 دکھایا جائے ورنہ لوگ اسکی اصلی حقیقت سے متاثر نہ ہوں گے (۶) اُنکے قصوں میں کیرکڑن
 یعنی اشخاص قصہ کی اتنی کثرت ہے کہ انکے کھینچے ہوئے مرتے اکثر گھج پچ ہو گئے ہیں اور واقعات
 انکی بھی اتنی کثرت ہے کہ تناسب قائم نہیں رہتا اور پڑھنے والے کی طبیعت میں دنور واقعات
 سے پریشانی پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر سچ پوچھئے تو یہ سب اعتراضات اگر صحیح بھی ہوں لے جائیں تو
 اُس عظیم الشان خدمت کے مقابلہ میں سچ ہیں جو انہوں نے اپنی تصانیف سے ادب اور
 اور سوسائٹی کی انجام دی۔ اور اُن کے جزوی نقالیس سے ہکو انعام حاصل کرنا لازم ہے۔

سرشار کا حیثیت ایک صاحب طرز کے سرشار کا حیثیت ایک مامر زبان اور ایک صاحب طرز کے
 بہت بڑا مہر ہے صاف سلیس، بامعاوہ اور زوردار عبارت لکھنے میں انکو اپنے ہمصر و نیز قریب
 حاصل ہے اور بہ حیثیت ایک صاحب طرز کے گو وہ آزاد سے دوسرے برابر ہوں مگر اور سب وہ
 ضرور بڑے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ایک ایسا طرز اختیار کیا تھا جو افسانہ نویسی کے واسطے نہایت مؤثر
 تھا اور انکی تصانیف میں لوگ انفس قصہ سے زیادہ عبارت سے دلچسپی لیتے ہیں۔ ہر چند کہ بعض آدمیوں

نے انکی زبان اور محاورات پر بھی اعتراض کئے مگر اس قسم کے اکثر اعتراضات غیر منصفانہ اور حسبِ قیاس پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ زبان میں وہ ضرور بے روک ٹوک ہیں اور کبھی ضرورت سے زیادہ صرف محاورات اور اصطلاحات کرتے ہیں مگر اسکی وجہ وہ فوری خیالات اور قدرتِ زبان کی جاسکتی ہے۔

سرشار اور سرور کا مقابلہ مرا جب علی بیگ سرور کے بیان تکلف اور آواز دہشت ہے اور سرشار کی عبارت واضح ہے تکلف اور غیرِ چل ہوتی ہے۔ سرور چیزوں کا بیان کرتے ہیں اور سرشار آدمیوں کا۔ سرور اُمیدِ بیل (خیالی) تصویریں کھینچتے ہیں اور تصویروں کے محاسن کو اُبھارتے اور معایب کو چھپاتے ہیں۔ برخلاف اسکے سرشار کی تصویریں بالکل سچی اور ہو بہو ہوتی ہیں۔ اور اچھائیاں اور برائیاں سب وہ بے تکلف ظاہر کر دیتے ہیں۔ سرور کے بیان یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک باغ میں کھڑے ہوئے ہیں۔ اسکے بچوں بچ میں ایک خوبصورت نہر جاری ہے جس میں صاف صاف موتی سا پانی بہتا ہے اور اس کے کناروں پر گلاب در ترشادے کے پھول مہک رہے ہیں سرشار ہلکے ایک عظیم الشان دریا کے پاس کھڑا کر دیتے ہیں جس میں ہوائے زور سے لہریں اٹھ رہی ہیں اور دریا کے قریب کس پاس کے جنگل سے سناٹے کی آوازیں آرہی ہیں کبھی کبھی دریا کے صاف پانی پر کوئی نجس درخواب چیز بھی بہتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ سرور کے مُرقعے ہوجہ سے دلچسپ درحسین ہیں کہ وہ اُن چیزوں سے جنکو وہ بیان کرتے تھے خود بڑی محبت رکھتے تھے اور انہیں کوئی عیب نہیں دیکھتے تھے سرشار برخلاف اسکے جس سوسائٹی کا خاکہ کھینچتے ہیں اسکو پسند نہیں کرتے بلکہ اکثر موقع پر تو اس سے نفرت ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس نفرت و ناراضی کو وہ کہیں چھپاتے نہیں پس کہا جاسکتا ہے کہ سرور قدامت پسند ہیں اور زمانہ قدیم سے تعلق رکھتے ہیں اور سرشار اس نئی تحریک کے حامی ہیں کہ جو فنون لطیفہ کو تکلف اور قدامت پسندی کے پنجہ سے چھڑا کر آزاد کرنا اور اسکو پنجر کا متعج دیکھنا چاہتی ہے اور اسوجہ سے وہ زمانہ حال اور مستقبل دونوں سے تعلق رکھتے ہیں اس مضمون کے اختتام پر ہم منشی سجاد حسین اڈیٹر اور صدر پنچ اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کی عبارت کے نمونے پیش کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو دونوں کے رنگِ طبیعت سے آگاہی حاصل ہو منشی سجاد حسین کے مشہور ناول حاجی بنگول سے وہ مقام لیا جاتا ہے جہاں ”حاجی صاحب“ اپنی

مشوقہ کنڈے والی کو یاد کر کے اسکے تصور سے اپنے دل ہی دل میں باتیں کر رہے ہیں۔ اور فسانہ آزاد
جلد چارم سے اسکے قریب قریب وہ مضمون نقل کیا جاتا ہے جہین غریبی پہنچنے سے کچھ پہلے جان
پڑی مشوقہ شباب جان درزن سے ملنے کے خیال میں بے چین ہو رہے ہیں اور اسکے متعلق آزاد
سے باتیں ہو رہی ہیں۔

(ماخوذ از حاجی بنگلول) ناظرین ذرا چلے اس وقت تنہائی میں حاجی صاحب پڑے کراہ رہے ہیں
کان لگا کر سننے تو کیا کہہ رہے ہیں۔ مگر دیکھئے دور ہی بسے نزدیک گئے اور سارا کھیل بگڑ گیا۔ آپ
کہہ رہے ہیں۔

اے نیک بخت انوس بھگو خبر نہیں کہ کوئی حاجی جان دیتا ہے۔ یوں دم توڑتا ہے۔ آپ تو
کھیتی باڑی میں جی بھلائی ہوگی یا گھڑے چلے میں پڑی ہوگی (اے تو بہ مصروف ہوگی) یا
ایلیان پیاری پیاری بنائی ہوگی۔ مگر بیان سوکھ سوکھ کر عشق کی دھوپ میں ہم کھنڈا ہوئے جاتے ہیں
تھک کر نام کر جانا چاہئے ہم نہو کنڈے جسکی آج ایسی تیز ہوتی ہے کہ تال جیتے میں عرق اور تیل اسی سے
محل سکتا ہے۔ کیا کے لئے اسی سے تیار ہوتے ہیں۔ اسے انوس۔ کیا نام کہ حضور کی محبت میں
کیسے کیسے مجھے اٹھائے۔ لوگوں کا ہر کے کھیت میں لیجا نا۔ گھوڑے پر سے گرنا عمل خالی میں
کڑی سہارا یہ سب وہ واقعات ہیں جبکہ ناول میں ذکر ہے) مگر سماجی عاشق صادق ہے جو تسلیم
در خفا کی سپرنگائے سب چڑھیں کھاتا ہے۔ ورنہ کیا نام کہ مجال تھی کیسی اٹھی تو دکھائے مارے جیون
کے سہرا کر دیا ہوتا۔ مگر نہیں عاشقی کے ضابطہ کے خلاف یہ بات تھی جس کا ذکر تم اپنے جلوہ سے
ریشک ارم بناؤ۔ وہاں کا گد با اور سور براق اور کونہ ہے اور آدمی تو ہماری آنکھ میں حورا اور غلمان
ہیں۔ دم بھر کو کوئی سسرال جاتا ہے جو تھی کھیل جاتی ہے۔ بھلا ہے کوئی مرد آج اس میدان میں
جو عشق بازی میں آپ کے حاجی کا مقابلہ کر سکے۔ ہاے میں آج کو کوڑا ہوتا اور جہان تم ہو میں وہاں ٹھیکے
قانون قانون کی صدا تاتا۔ تم بیکار نے اٹھتیں اور ہم تمہارے سر پر اٹھتے۔ ہاے تمنا ہے کہ ہم تمہارا
گائے بھینس ہوتے اور کیا نام کہ تم ہمارے گلے میں رسی باندھ کر پرانے لیجا تین۔ پھونپہر تمہارے نازک

ہاتھ پھرتے۔ تم دودھ دہتی ہو تین اور تم کو چاٹتے ہوتے۔ کیا نام لگا کر تو بیسی چلین اب تو ہم آپ کے عاشقوں میں ہو گئے۔ آج تک کبھی یہ چوٹ نہیں اٹھائی۔ مگر قسمت کا لکھا ہوا۔ اب تو ہم دنیا میں تمہارے عاشق مشہور ہو گئے۔ سب پر ہسید کھل گیا۔ میرے دل کے موڑ ہے پر ہٹو صنم تم۔ تن زار گھٹکھٹکھٹا ہوا ہے۔ آہ یہ کمر کا درد۔ تمہارے عشق کی چوٹ ہے جو سارے جسم و جان میں پھیلی ہوئی ہے۔ افسوس۔

سوختیم دسوزش مایا نام کہ کسی پر ظاہر نشد
چون چراغان شب منتاب بجایا سوختیم
ہائے سینہ میں الاؤ لگا ہوا ہے۔ ٹہس کی آگ کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہا ہے
(ماخوذ از فسانہ آزاد جلد ۴) اتنے میں ملاحون نے کہا اب ممبئی سٹن سے نظر آتی ہے سنتے ہی فوجی
کی باپھین کھل گئیں۔ چلا کر کہا یار دوزرا دیکھنا بی شتاب جان صاحب کی ففس تو نہیں آئی ہے۔
کرم بخش نامے مہری ساتھ ہوگی۔ اطلس کا چھسکا ہے اور کہا روکی پگڑیاں وردی رنگی ہوئی ہیں۔
پھیلان ضرور لٹک رہی ہوں گی۔ بی شتاب جان ہوت۔ اے شتاب جان صاحب آزاد پاشا
آواز آئی ارے یار آواز آئی ہو تو خدا کا واسطہ بتا دو۔ بی شتاب جان۔ اے کرم بخش مہری
کیا بہری ہے۔

لوگوں نے سمجھا یا کہ صاحب ابھی بندرگاہ تو آنے دیجئے بی شتاب جان اور کرم بخش
کیونکر سن لینگی۔ کہا اجی ہٹو بھی تم کیا جانو کبھی کسی پر دل آیا ہو تو سمجھو۔ اے نادان عشق کے کان
دو کوس تک کی خبر لاتے ہیں۔ اور کون کوس کڑی منزل کے کوس۔ کیا شتاب جان نے آواز
نہ سنی ہوگی واہ بھلا کوئی بات ہے۔ مگر جواب کیون نہ دیا۔ یہ پوچھو اسمین اک لم ہے پوچھو وہ کیا
وہ یہ کرج مسخوق پن نہیں اگر اتنی کچی نہو۔ اگر آواز کے ساتھ ہی آواز کا جواب دین تو بندے کی نظروں سے
گر جائیں۔ مزاجب ہے کہ ہم بوکھلائے ہوئے ادھر ادھر ہونڈتے اور آوازیں دیتے ہوں کہ بی شتاب
جان صاحب اجی بی صاحب اور وہ بخیر میاں پیچھے سے ایک دھول جائیں اور تنک کر کہیں

سوزی کا ٹاٹا کھون کا اندام نام نہین سکھ نعل مچاتا پھر تا ہے۔ شباب جان شتابان اسے بی صاحب
تیری بی کو کیا کھون۔ سوئی کہین چھ نکات رہی ہوگی۔ اور ہم دہول کھا کر کہین کہ دیکھے سرکار ابکی
دہول لگائی تو خیر چرا ہے دہول لگائی نہ تو بگڑ جائیگی۔ بس کہدیا ہے۔ اور وہ جھلا کر ایک درجائین کہ
اینباب کی لڑی گھر سے پر جا کر گرے۔ اور ساتھ ہی اس گھٹی ہوئی کھوپڑی پر ترڑاڑ دو چار اور
بھادین۔ تب ہنسر کھون۔ جانن خدا گواہ ہے اس وقت پیٹ بھرا ہے ورنہ مائے بھوک کے آنتین
قل ہوا شہر پھر ہی یقین۔ سفر اور پردیس میں ایسی چاند تار دہ پارہ کہاں ملتی جو سید ہرک دہول
پر دہول جاتی۔ اور ابھی کیا ہے پیاری ذرا تر دل ہو کر ٹھین تو پھر دایک جوتے ضرور لگانا۔ ہاں بے
پاپوش کاری کے طبیعت بے چین رہتی ہے۔

صلیہ

آزاد۔ بالفضل کیسے تو خاکسار ہی لگا دے۔

دام بابر سکھ

خوجی۔ دسکراں اے نہیں حضرت آپ کو تکلیف ہوگی۔

آزاد۔ داسکس مردود کو اپنے حساب تکلیف ہو۔ ووجود توں میں آپ جس درجہ کو پہنچ جائیں کہ پھر
عمر بھر آرام سے سوئے۔ ع نے غم و زدنے غم کالا۔ یا کیسے نقطہ سنگا ہی دون۔ گو تکلیف ہو کچھ
پر دہائین۔ اسکا کہاں تک خیال کروں گا۔

خوجی۔ میان پہلے منہ دہو آؤ۔ دلی نہیں ہے۔ ان کھوپڑیوں کے سہلانے کے لئے پریوں کے ہاتھ
چاہئے نہ کہ تم ایسے دیوزادوں کے۔

آزاد۔ خدا کرے جس وقت آپ پر پاپوش کاری کرین اس وقت ہم بھی ہوں۔ کتا جاؤں کہ ہا۔ ہے
حاضر سے لیکھا اور پھر پڑے۔ اب کی رنجک پاٹ گئی۔ اب کے خواب چٹانے سے آواز آئی۔ ان
تو ایک اور اللہ ذرا دہنک آواز جائے۔

ناصح کے سر پر ایک جائی چٹان سے پھرا تھل۔ ہے میں کراچی پڑی نہیں

اتنے میں ساحل بحر نظر آیا۔ تو خواجہ صاحب نے نعل مچایا۔ شباب جان صاحب اجی حضور کا غلام
خزندانہ آداب عرض۔ اسقدر کہہ چکے تھے کہ لوگوں نے تمہارے لگایا۔ اور خوجی متحیر ہوئے کہ یہ کیا

اسرار ہے۔ آزاد سے پوچھا اس خندہ بے محل کا کیا سبب۔ آزاد بولے آپ کی حماقت اس کا سبب ہے
 گدھ جان خود کرتے ہو اور اوپر سے ہم سے پوچھتے ہو کہ اس کا کیا سبب ہے۔ کیا فقرہ کہا تھا آپ نے ذرا پھر دیکھا
 خواجہ صاحب نے طیش کھا کر پھر وہی فقرہ سنایا۔ ابھی حضور غلام فرزند آداب عرض کرتا ہے۔
 آزاد۔ تو آپ شباب جان کے صاحبزادہ فرزند ولید ہیں۔

خوجی۔ یہ کا ہے سے۔ صاحبزادہ ہیں یا میان ہیں شوہر خاص۔
 آزاد۔ پھر یہ فرزند آداب کیسا ہوتا ہے۔ جو رو کو کوئی فرزند آداب عرض کرتا ہے تو آپ کی بیوی
 کیا آپ کی والدہ شریفہ عظیمہ ہیں؟

خوجی۔ (گا لہو نہ پتھر مار کر) اور رر رر رر غضب ہو گیا برا ہوا اور اندر تم ہو گیا سخت مصیبت میں گرفتار
 ہو گئے۔ ایسے خفیہ ہوئے کہ تو یہی بہلی۔ اے بے خفت سی خفت ہے۔ مگر چہرے کی زبان پھیل گئی
 لیکن تشفی یہ ہے کہ بدحواسی کے وقت ایسا کلمہ زبان سے نکلا۔ اور وہ بھی اپنی پیاری شباب جان کی نسبت
 جی۔ پھر درین چہ مضائقہ باشد۔ اب صفات صاف نفس نظر آتی ہے وہ دیکھئے ہوا سے زلف ہم
 و بر ہم ہوئی جاتی ہے۔

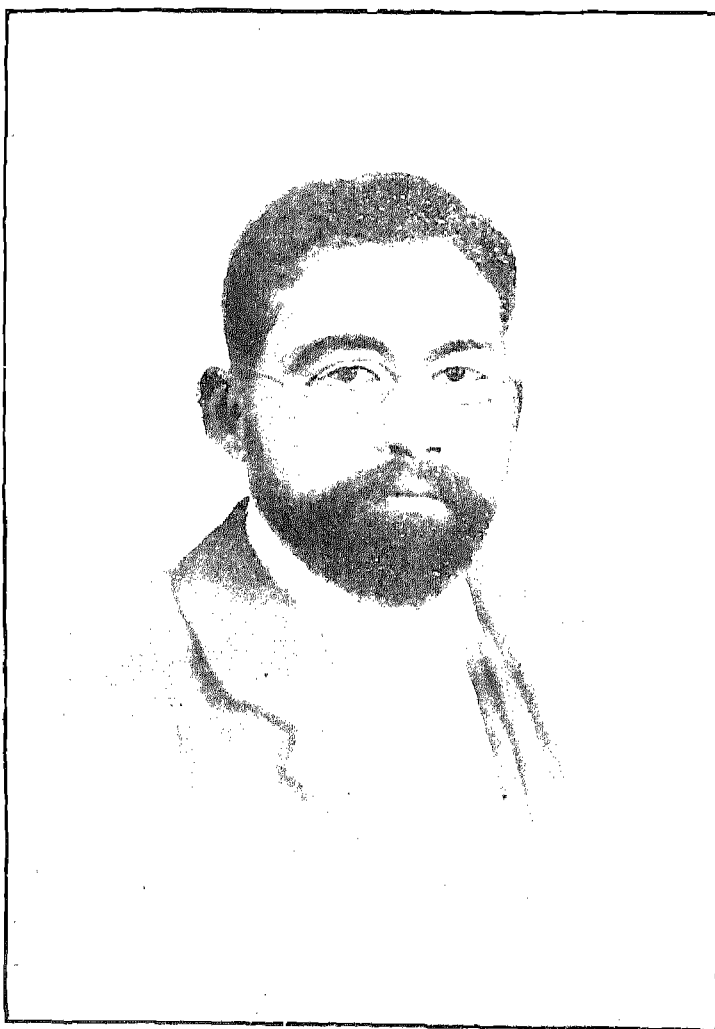
سبھک چھڑا و مشاطہ اسکی زلف پر خم کو
 خدا کے واسطے برہم نکر سیاب عالم کو
 وہ مہری سنے ڈٹی کھڑی ہے۔ آخاہ اب تو بی کر م بخش بھی بارہ پرہین۔ سرو قامت رشک شاہ
 اس جو کر دار کی مہری بھی پر یاد ہے۔ وہ ہنسی اُہو ہو ہو۔ دردندان نے مار ڈالا کیا پیارے
 دانت ہیں۔ ۷

چمک لعل بدخشان کی مٹا دے
 ترے ہونٹوں پہ ایسا رنگ پان ہے
 یاران مرز وہ باد کہ عروس مانوس من و نگار گلزار سن و صبیہ من بی شباب جان دامت حسنہ
 از جھرو کہ زر نگار مرا می بیند دی گویدے یار نام خدا ہے کشتی من۔ نا خدا آج پارہ بیڑا ہے۔

آزاد۔ یاد عزیمت جہت شعرا جہی صاحب حال۔
 خوجی۔ دست اور وہ شعر جو کائنات کے نام پہنے لکھا تھا۔
 لئے قبائے بادشاہی راست بر بالائے تو
 (مصرع ثانی حذف شد) والا سئے تو
 آزاد۔ مگر ایک غنہ پھر کھایا۔ پہلے شباب جان کو اپنی مادر مہربان بنایا۔ اب کے ایک ایسا گلہ کہا کہ
 پھر چھپ جاؤ گے زبانے لہنا ہی نہیں۔
 خوجی۔ کیا طاق ہے کہ کیا تھا۔ یہی کہا تھا نہ کہ عروس من و نگار من و صبیہ من بی منتا طین
 پھر کیا عروس نہیں یا صبیہ نہیں ہے۔
 آزاد۔ اے لعنت خدا۔ اے کجبت۔ عربی من صبیہ لڑکی کو کہتے ہیں۔ لے اب سر چٹو۔ کبھی مان نہ مانا
 کبھی لڑکی۔ اور پھر ادھر سے غرا ہے۔
 خوجی۔ (سر سٹ کر) زبان تراش ڈالنے کے قابل ہے۔ لیکن خیر گزشتہ راصلوۃ آئندہ راصلیاط
 آزاد۔ یاد وہ دیکھو سائے کیا نور کا بکا نظر آیا۔
 خوجی۔ یہی ہماری شباب جان میں۔ کیا صورت ہے ۵

چہرہ گلگون ہے گلشن تماست موزون سے سرو
 گوش نازک ہیں گل تر غنچہ گل ناک ہے
 جلوہ گر خال سیہ ہے روئے آتشاک پر
 جستمہ خورشید میں زندگی مگر تیراک ہے

مولوی عبدالغفور مراد ایک دوسری زبردست ہستی جسے اردو ناول کی اشاعت و ترقی میں بڑی اہمیت
 کی مولوی عبدالمجید تھریل ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے اردو میں اپنی ناول لکھنے قصہ کے پلاٹ اور کہیں کہیں
 کی ترقی پر توجہ کی اور نیز اپنے طرز تحریر سے ثابت کر دیا کہ صاف ہے، انش کی ہوئی زبان ہی ناول
 نویسی کے واسطے نہایت موزون ہے۔ انہوں نے ناول کو غیر مہذب اور خفیف الفاظ و مضامین سے



مولانا عبدالحکیم شوری



سید محمد رفیع خاں، رئیسِ قاضی خانہ، لاہور

پاک کیا اور اپنی وسیع مسامحات سے وہ مواد فراہم کیا جو انکی تصانیف کے کام آیا۔ وہ صرف ناولسٹ ہی نہ تھے بلکہ مورخ ڈراما نگار ادیب اور ایک زبردست جرنلسٹ بھی تھے۔

اسیائے صفحہ ۳۲۱ تک خود مولانا شمس صاحب مرحوم کے بیان کردہ حالات زندگی بھوانیوں نے بعد نظر ثانی بغرض اشاعت مجھکو عنایت فرمائے تھے اور میرے پاس موجود ہیں ورج کیے جاتے ہیں۔ چونکہ یہی حالات کم و بیش مختلف عنوانات سے مصنف صاحب نے بھی اس کتاب میں بیان کئے ہیں لہذا اصل مضمون کتاب کے بجائے اسی پر گفتگو کی گئی۔ مترجم]

جمعہ کے دن ۲۰۔ جمادی الثانی ۱۲۸۵ھ کو غدر شمس کے تین سال بعد لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ناما چونکہ دربار اودھ میں رسوخ اور معزز حیثیت رکھتے۔ تھے لہذا اودھ کے شاہی خاندان کے ساتھ انگلستان گئے اور وہاں سے واپس آکے ٹیابرج کلکتہ میں قیام پذیر ہو گئے۔ عام خاندان کو چونکہ اگلے شاہی دربار سے وابستگی تھی لہذا مولانا کے دیگر بزرگ اور والد بھی انھیں رسیوں میں بندھے ہوئے ٹیابرج کلکتہ پہنچے۔ مولانا کے والد حکیم فضل حسین صاحب عربی و فارسی میں کامل بصیرت رکھنے کے ساتھ ایک پختہ منظر طبیب تھے ۱۲۸۵ھ میں جب کہ ۹ سال کی عمر تھی کلکتہ گئے۔ اور اسی وقت سے گریا تعلیم شروع ہو گئی گو ایک ناقص طریقے پر لکھنؤ میں بھی ابتدائی تعلیم ہوئی رہی تھی۔

ٹیابرج میں ابتداء اپنے والد صاحب سے اور چند اور اساتذہ سے ابتدائی کتب فارسی و عربی پڑھیں۔ مولوی سید علی حیدر صاحب اور مولوی محمد حیدر صاحب سے کچھ معقولی و ادبی کتابیں پڑھیں مولوی مرزا محمد علی صاحب مجتہد سے چند اور پر کی منطقی کتابیں پڑھیں۔ حکیم محمد مسیح صاحب سے بعض کتب طبیہ پڑھیں۔ کچھ انگریزی بھی پڑھی مگر پڑھوٹ طور پر اور بالکل ناقص۔ اخبارات کا ذوق اسی زمانے سے پیدا ہو گیا تھا۔ کیونکہ ان دنوں اودھ اخبار میں بہ حیثیت کارسپانڈنٹ خبریں لکھ لکھ کے بھیجا کرتے تھے۔

انیس سال کی عمر میں کلکتہ سے تعلق ترک کر کے لکھنؤ کی سکونت اختیار کی۔ اور مولوی محمد عبدالحی صاحب مرحوم سے کتب درسیہ عربی ختم کیں۔ بیس برس کی عمر میں مامون کی بیٹی سے

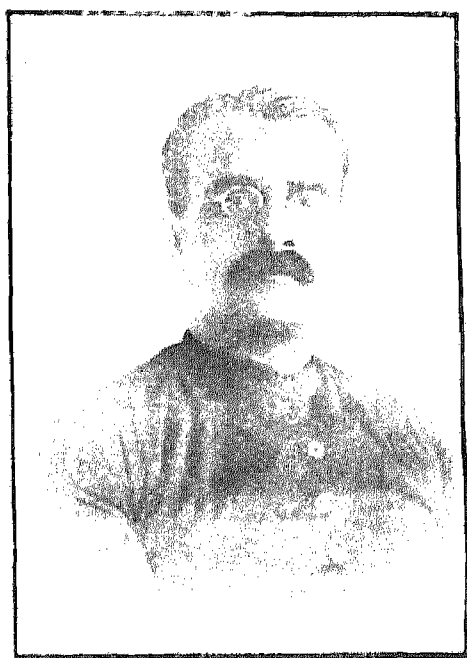
شادی ہوئی۔ اور شادی کے بعد ہی حدیث کا شوق ایسا غالب ہوا کہ وہ جلی چلے گئے اور مولوی محمد زحیر حسین صاحب محدث و ملوی کی خدمت میں حاضر ہو کے اور ان کے مدرسہ میں رہ کے حدیث کی تعلیم کمپل کو پہنچائی۔ اب اس کے بعد انھیں انگریزی کا شوق ہوا۔ اور انگریزی جانتے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ خانگی طور پر بے انتہا محنت شروع کی اور چند روز میں بقدر ضرورت ہنگامہ پیدا کر لی۔

اسی زمانے میں انھیں منشی احمد علی کسمندوی مرحوم سے صحبت ہوئی جو بعض اخبارات اور خصوصاً اودھ پنچ مین مضامین لکھا کرتے تھے۔ اور ان کا فارسیت کا مذاق بہت بڑھا ہوا تھا۔ ان کے شوق و دلانے سے بعض اخبارات میں مضامین لکھنے لگے جن میں بجاے بالکل مرئی تک ہونے کے انشا پر داری کا مذاق بڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ سلسلہ میں منشی نول کشور صاحب نے انھیں اودھ اخبار کے ایڈیٹر مل اشاف میں لے لیا۔ یہ نوعمری کا زمانہ تھا۔ طبیعت زور و روں پر تھی اعلیٰ خیال آفرینی کے ساتھ فلسفیانہ معنی آفرینی اور لٹریچر میں مذاق بڑھا ہوا تھا۔ اسی رنگ کے مضامین اس زور و شد سے لکھنا شروع کیے کہ ہر جگہ شہرت ہو گئی اور ایسی شہرت ہوئی کہ حیدر آباد میں اور بعض اور چھوٹی ریاستوں میں طلب کیے گئے۔ مگر تائب نہ کیا۔ سرسید سے گوشناسائی نہ تھی مگر انہوں نے سوج کے بجائے برسولنا کا ایک مضمون اس قدر پسند کیا کہ منشی نول کشور کو لکھا کہ میں اس مضمون میں سے کچھ اخذ کرنا چاہتا ہوں۔ لہذا صاحب مضمون سے اس کی اجازت جانتا ہوں۔

اسی زمانے میں انھوں نے اپنے ایک دوست مولوی عبدالواسطہ کے نام سے مختصر نام ایک ہفتہ وار رسالہ نکالا جس کا رنگ عبارت اس قدر دلکش اور دل فریب تھا کہ ہر طرف دھوم مچ گئی۔ اس میں اٹھارہ افسانوں میں انھوں نے مسلسل صبح کا سماں دکھایا تھا جس نے تمام صاحب ذوق لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ یہ رنگ اردو میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ اس میں فارسی کے تشبیہات و استعارات تھے مگر بندشیں انگریزی تھیں۔ گویا انگریزی عروس سخن کو فارسی وارو کا لباس پہنا دیا گیا تھا۔ اسی ضرورت سے قافیہ بندی اور رعایت لفظی بالکل چھوڑ دی۔ اور اس سے بہت پرہیز کیا



نبیاز فتحپوری مدیر رسالہ نگار



Mr. J. H. H. H.

کہ نثر میں جا بجا اشعار شامل کیے جائیں۔ ابتداً اس رنگ کے بنانے میں اکثر جگہ عبارت الجملہ جاتی تھی جس کی کچھ تو یہ وجہ تھی کہ اردو نثر میں انگریزی کی طرح علامات اوقات (نیکچریشن مارکس) نہیں ہیں۔ اور کچھ یہ کہ مولانا کا ایسا دیکھا ہوا رنگ بھی نچنگی کو نہیں پہنچا تھا۔ مگر چند ہی روز کے بعد ایسا اعتدال پیدا ہوا کہ ان کی عبارت نے خاص رنگ بکھلایا۔ اور ایسا مقبول رنگ کہ یہی طرز عبارت آج ساری اردو انشا پردازی اور اخبارات کی عام زبان پر حکومت کر رہا ہے۔

یہ اسی عبارت کی شان تھی کہ جس نے ایک دفعہ دیکھا ہے انتہا گر وہ یہ ہو گیا۔ اور فوراً اس کو اختیار کر لیا۔ افسوس کہ شاعر کے وہ اودھ اخبار اور محشر کے مضامین کسی نے غلطی نہ نہیں چھاپے اور وہ اصل پرچہ کہیں دستیاب نہیں ہوتے۔ درنہ شاید اب ہندوستان بہ نسبت سابق کے ان کی زیادہ تعداد سترہ مین منشی نو لکھنؤ کے تعلق کو چھوڑ دیا جس کا سبب یہ تھا کہ مطبع اودھ اخبار نے اپنی کار سائڈ منٹ بنا کے حیدر آباد بھیجا تھا۔ مولانا گئے مگر چھ مہینے رکھ کر واپس آنا چاہا مگر مطبع نے اس کی اجازت نہ دی۔ اور آپ خود ہی چلے آئے۔

اس زمانے میں انھوں نے اپنا سب سے پہلا ناول ”دلچسپ“ لکھا جس میں دتھون اور لین کا ایسا سماں دکھایا ہے کہ اردو زبان میں بالکل نیا اور حیرت انگیز ہے۔ مگر چونکہ اس رنگ کی پورا ادب بندی (رواج) ہنوز نہیں ہوا تھا لہذا جا بجا اچھا ہوا اور سچیدہ ہے اور اخلاق پسندی کی شان دکھاتا ہے وہ ایک ہندوستانی معاشرت کا ناول ہے جس میں عشق کی دلچسپی کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستانی خاندان زیادہ تر کن اسباب سے تباہ ہوتے ہیں۔ سال بھر بعد اس کا دوسرا حصہ شائع ہوا جو انشا پردازی کے اس نقص سے پاک تھا جو پہلے حصہ میں ہے۔ اس میں نہایت نچنگی حاصل ہو گئی ہے۔

اس کے دو سال بعد مولانا نے بنکم چند پٹجی کے ناول درگیش مندی کو اس کے انگریزی ترجمہ سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔ اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ایک چھٹا انشا پرداز ترجمہ کرے تو اس میں کیسی خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

اب پبلک مولانا کے کلام کی بے انتہا شائق تھی۔ ہر شے دست شوق پھیلا ہوا تھا کہ مولوی بشیر الدین صاحب ایڈیٹر البشیر اور منشی شاعر صلیح جٹ شاعر ملک پیام یار کے ہمدرد تھے۔ ۱۹۱۷ء میں مولانا نے اپنا مشہور رسالہ دکنگاز جاری کیا۔ اس کے شائع ہوتے ہی شوق نے سارے ہندوستان میں ایک سرگرمی پیدا کر دی اور اس کی اشاعت ہزاروں زیادہ ہو گئی۔ سہین خاص قسم کے ایسے مضامین تھے جن کے نمونے اگر کوئی ڈھونڈھے تو صرف انگریزی اعلیٰ لکچر مین مل سکتے ہیں۔ اردو کا خزانہ اس وقت تک اس سے خالی تھا کسی خیال کو موثر بنانا اور بغیر تشبیہ و استعارہ کے اور بغیر قافیہ بندی کے کسی مطلب کو دلکش و دل فریب بنانا دکنگاز کے سچے نگار ایڈیٹر کا خاص حصہ تھا۔ اس کے مضامین اس قدر پسندیدہ اور ایسے دلکش رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ سرشتہ تعلیم کو بھی بغیر اس کے کہ مولانا کو اس محکمے سے کوئی بھی لگاؤ ہو آپ کے مضامین لینے پڑے۔ اور اب ہندوستان میں اردو کا کوئی کورس نہیں ہے جس میں دو ایک مضامین تشریح کے نہ ہوں۔

۱۹۱۷ء میں دکنگاز میں ناول نویسی کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اور اس وقت سے مسلسل وہ ناول شائع ہونے لگے جن کے نام ملک العزیز درجنہا حسن انجلنا۔ مسطور موہنا وغیرہ ہیں جن میں مورخانہ شان سے قدیم دھپ واقعات کو اعلیٰ لکچر کا لباس پہنایا گیا ہے۔ یہ ناول اس قدر مقبول ہوئے کہ اس وقت تک ان کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اور ہنگ دیسی ہی باقی ہے۔ بلکہ زیادہ ہے۔

تشریح کے ناولوں اور نیز مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تاریخ کو اور خصوصاً اسلامی تاریخ کو حد سے زیادہ اسٹڈی کیا ہے۔ اور اسی وجہ سے غمنوٹوں اور ناولوں میں روز بروز خیال آرائی کا رنگ چڑھتا گیا۔ اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ صرف سادے الفاظ میں مدح و تحسین پیدا کرنے اور واقعات کو انتہا سے زیادہ دلکش بنادینے کی شان برہمی گئی۔ سان کے آخری ناولوں میں ایک ایامِ حرام ہے جس میں جاہلیت عرب کی زندہ سوسائٹی ایسی عمدگی و خوب صورتی سے دکھائی گئی ہے کہ زمانہ حیرت کرتا ہے۔ غلو و افراط مذہب اور فتنہ انداز و غیرہ میں سہین کے اسلامی دور کو ایسی خوش اسلوبی سے دکھایا

ہے کہ لوگ بار بار پڑھتے ہیں اور جی نہیں بھرتا۔

انہیں آخری ناولوں میں ناول "فروغ برین" بھی ہے اس کا پلاٹ ایران میں اور اس زمانے میں دکھایا گیا ہے جب کہ جلال طالقان اور التمرت میں باطنیوں (کسیس) لوگوں کا نذر تھا۔ اور ہزار ہا زندگان خدا اُن کے خنجر سے مارے جلتے تھے۔ اُن کے بادشاہ نے پہاڑوں میں ایک جنت بنا رکھی تھی جس میں وہ سب سامان فراہم کیا تھا جو مسلمانوں کے خیال میں جنت میں ہونا چاہیے۔ اس ناول میں عجیب حیرت ناک طریقے سے دکھایا گیا ہے کہ وہ لوگ کیونکر لوگوں کو فریب دے کے اپنا گرویدہ بناتے اور اپنی فلسفیانہ تقریروں سے انسان کو کیونکر اپنا فریفتہ کر لیتے تھے۔

تایلیٰ مذاق کے بڑے کالیکٹور کا ایک یہ نتیجہ تھا کہ مولانا اختر نے سن ۱۸۹۶ء میں مہذب نام ایک اخبار جاری کیا جس میں مسلسل علمائے اسلام کے سوانح عمری ہوا کرتے تھے۔ اس پرچے کی اشاعت بڑھتی جاتی تھی اور مسلمانوں میں نہایت مقبول تھا کہ یکا یک سن ۱۸۹۶ء میں انہوں نے دگلدارا اور مہذب دونوں کو بند کر کے حیدرآباد کا سفر کیا۔ اور وہاں ریاست میں دوسروں سے مہار کا تعلق پیدا کر لیا جس کی وجہ سے ایک مدت تک وہ ملک کی نظر سے غائب رہے۔ اتفاقاً نواب قارا املر بہادر سابق دارالامہام مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے نواب لی الدین خان انگلستان میں ایٹن کالج میں تعلیم پاتے تھے اور چونکہ بچپن سے بھیجے گئے تھے لہذا مذہب بالکل آشنا نہ تھے۔ مولانا شرکو قارا املر بہادر نے اس خدمت کے لیے منتخب کیا۔ اور سن ۱۸۹۵ء میں وہ انگلستان گئے۔ جہاں چودہ پندرہ مہینے قیام رہا۔ دو سو سو کوربین نام ایک فرانسیسی محقق سے فریچ زبان شروع کی جس میں اتنی دستگاہ ہے کہ دکشتری کی مدد سے ترجمہ کر سکتے ہیں۔ سن ۱۸۹۶ء کے آخر میں ہندوستان واپس آئے۔

سن ۱۸۹۶ء میں اپنے حیدرآباد سے دگلدار کو از سر نو جاری کیا۔ مگر گیارہ ہی مہینے تک جاری رکھ کے خود ہی بند کر دیا جس کی وجہ یہ ہوئی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی صاحبزادی جناب سکینہ کی لائف آپ نے شایع کرنا شروع کی تھی۔ اُس میں چونکہ تاریخی تحقیقات کر کے اصلی واقعات لکھے تھے وہ عام مسلمانوں میں اور خاصہ شیعہ لوگوں کے خلاف ہوئے۔ اور ایک قسم کی شورش پیدا ہوئی۔

بعض عہدہ داران گورنمنٹ نظام نے پریوٹ طور پر آپ کو ہدایت کی کہ اس مضمون کا سلسلہ رد کیجیے
 مگر آپ نے جب یہ رنگ دیکھا تو بجائے اس مضمون کے خود پرچہ بند کر دیا۔ اور اسے ۱۹ ستمبر
 پھر لکھنؤ کے جاری کیا جس میں سب کے پہلا سنی سنگینہ بنت حسین کی لائف کا بقیہ تھا۔

اس زمانے میں ریاست دکن کے تعلقات قائم تھے صرف دارالہمام مرحوم کی فیاضی اور
 سابق ہوم سکرٹری مولوی محمد عزیز مرزا صاحب کی کوشش سے آپ کو لکھنؤ میں رہنے کی اجازت
 مل گئی تھی ۱۹ ستمبر کے درمیان میں آپ واپس طلب کیے گئے نتیجہ یہ ہوا کہ دگلہ باز بند کے آپ پھر
 حیدر آباد گئے۔ اس مرتبہ جانے میں یکایک ایسے انقلابات ہو گئے کہ آپ کے تعلقات ریاست کو
 نقصان پہنچا۔ وقار الامر اہا اور وفادارت سے علحدہ ہوئے اور چند روز بعد انتقال بھی کر گئے۔ مولوی
 عزیز مرزا صاحب جن کو آپ سے خاص ہمدردی تھی منہ بھری میں ڈیپٹی کمشنری کی خدمت پر بھیج دیے
 گئے۔ نئے دارالہمام ہمارا جہ کش پرشاد بہادر کو آپ سے کوئی خاص ہمدردی نہ تھی۔ اور سٹرا کر
 جو فنانس کا انتظام کرنے کے لئے آئے تھے ان کے نزدیک ریاست کو مولانا کی ضرورت نہ تھی۔
 غرض ریاست سے جو تعلق تھا جاتا رہا۔ اور جو تعلق وقار الامر بہادر کے صاحبزادے مولانا ملک
 بہادر کی سرکاس سے تھا اسے اپنے خود ہی چھوڑ دیا۔ اور ۱۹ ستمبر میں لکھنؤ واپس آئے پھر سلیک کی خدمت
 شروع کر دی جبکہ دگلہ دار بھجوا رہی ہو اور اس وقت تک جاری ہے۔

مولانا کا رنگ عبارت اشدی کیا جائے اور اس میں خاص حیثیت سے انسان نہلک ہو تو ہم
 چلتا ہے کہ آپ نے اردو میں کیا چیز پیدا کی ہے۔ اردو کے پڑانے مرنے رد دفع کے تھے۔ ایک تو میر تقی
 دہلوی کی سادی عبارت۔ اور دوسری مرزا حبیب علی بیگ سرور کی فارسی مذاق کی رنگین اسٹیج متغنی
 عبارت۔ اس کے بعد جوا اردو کے نئے عہد پیدا ہوئے وہ حسب ذیل ہیں سر سید احمد خان مولوی محمد
 آزاد۔ مولانا ندیر احمد صاحب۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ اور مولانا محمد عبد الحکیم شرر۔ سر سید نے سادگی
 اور وہ شان اختیاری کی جو کبھی مولانا شاہ اسماعیل کے قلم نے دکھائی تھی۔ پس ہر مضمون اس طرح ادا کیا گیا
 کہ عامی سے عام شخص اس کو سمجھ جائے۔ مولوی محمد حسین کی شان یقینی کہ زبان میں تب تکلفی دردانی ہو

اور روائی کے ساتھ شاعرانہ تشبیہات و استعارات بھی بہت ہی مستدل حد تک ہوں۔ مولوی نذیر حسین
صرف روائی چاہتے تھے اور بے تکلفی میں اس قدر حد سے بڑھ گئے ہیں کہ زبان کو جب تین بنانا چاہتے ہیں
تو سوا اس کے کہ عربی یا انگریزی جملہ اور لغات داخل کر دیں اُن کا کچھ زور نہیں چلتا۔ بند نشین وہی رہتی ہیں
اور عبارت بھی وہی باقی رہتی ہے۔ پنڈت رتن ناتھ میں کوئی ایجاد ہی مادہ نہیں ہے۔ اور اگر ہے
تو صرف اتنا کہ اُن میں ظرافت کا مادہ بڑھا ہوا ہے۔ اُن کی عبارت دو طرح کی رہتی ہے۔ ایک تو
وہ جہاں وہ خود کوئی سامان کھینچنا چاہتے ہیں یا کسی کیفیت کو بیان کرتے ہیں وہاں اُن کی عبارت میں
اور سرور کی عبارت میں کوئی فرق نہیں۔ وہی قافیہ پجائی ہے۔ وہی مبالغے ہیں۔ وہی پُرانی تشبیہات
و استعارات ہیں۔ اور وہی جا بجا اور ضرورت دے ضرورت اشعار کا بھرتی کرنا ہے۔ بلکہ الفاظ بھرتی
پُرانے فارسی نثار دن کے ہیں۔ دوسری عبارت وہ جہاں عورتوں کی زبان سے وہ اُن کے خیالات
ادا کرتے ہیں۔ اس میں سوا خاص خاص لغزشوں کے وہ لکھنؤ کی عورتوں کی زبان اچھی اور بے تکلف
لکھتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ سرشار کی زبان میں کوئی جدت نہ تھی سوا اس کے کہ خلافت قیاس مضامین
کو چھوڑ دیا پرانی عبارت اور اُن کی عبارت میں کوئی فرق نہ تھا۔ شرر نے ان سب لوگوں سے علیحدہ
ہو کے یہ کمال دکھایا کہ انگریزی انشا پر داری کی خوب صورت بندشوں کو اردو میں داخل کیا۔ مگر تشبیہات
و استعارات وہی پُرانے ایشیائی رکھے۔ اُنھوں نے خیالی مضامین کو لیا۔ اور اُن میں بالکل انگریزی
جادو نگاروں کی سی خیال آفرینیاں کیں اور عجیب خوب صورتی کے ساتھ اُنھیں اردو میں کھپا دیا۔
اردو پہلے میں ابتداء یہ نیاز نگ تھا۔ انگریزی والوں کو اردو میں رہ چیز مل گئی جسے وہ ڈھونڈ رہے
رہے تھے۔ اور صرف اردو جاننے والوں کو تھوڑی وحشت کے بعد جب اُس کی چاٹ پڑی تو اُن کے
نزدیک اُس سے زیادہ دلچسپ کوئی رنگ عبارت تھا ہی نہیں۔ سرشار کا رنگ اُن کے چند
ابتدائی ناولوں پر محدود ہے اور وہ بھی جن میں پلاٹ نہیں۔ بخلات اس کے تشرکار رنگ زیادہ تر
اُن کے مضامین میں نظر آتا ہے جو اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اور جن کے سامنے کسی کو قلم اٹھانے کی
جرات نہیں ہو سکتی۔ شرر ہی نے حقیقت وہ زبان شروع کی جس کی نسبت سب کو اتفاق ہے۔ کہ

وہی جدید اردو ہے اور وہ زبان ہے جو فی الحال ملکی لٹریچر پر حکومت کر رہی ہے۔ اور جو یہ رنگ
 چمکتا اور ابھرتا جائے گا اسی قدر زیادہ نمایاں طور پر نظر کا رنگہ اردو لٹریچر پر نظر آتا جائے گا۔ سادی
 حیثیت میں وہ تین محققانہ بلکہ فلسفیانہ ہے۔ شاعرانہ خیال فرنگی کی حیثیت میں وہ شاعری کے
 رنگ میں انتہا سے زیادہ ڈوبی ہوئی ہے۔ وہ جس چیز کی تصویر کھینچتے ہیں اُس اسکاٹ کی طرح
 ناظرین کی نظر کے سامنے لاکھ کھرا کر دیتے ہیں۔ انسانی جذبات پر اس طرح اور اتنا تصرف کرتے
 ہیں کہ جس قسم کے جذبات چاہتے ہیں اپنے ناول پڑھنے والے کے دل میں پیدا کر دیتے ہیں۔
 انہماک و طبع دکھانے کے لیے انھوں نے ایسے ایسے سبکٹ لیے جن پر اُن سے پیشتر کسی نے قلم
 نہیں اٹھایا تھا۔ مثلاً "غریب کا چراغ"، "صحت برہم"، "نہیں"، "ان"، "لالہ خود رو"، "یا بگوان"
 دیہات کی لڑکی، "مخواب دوشین"، وغیرہ وغیرہ۔ ایسے مضامین کو اردو میں پہلے پہل انھیں نے
 انٹروڈیوس کیا۔ ادب پر یہ ہے کہ آج تک اُن سے بہتر کوئی نہیں لکھ سکا۔ شریچ یہ ہے کہ اردو
 لٹریچر کی دنیا میں ایک جا بکدست مقدر ہیں۔ اور جذبات انسانی پر حکومت کرنے والے بادشاہ۔
 تلمیخی ذوق پڑھنے کی بدولت مولانا اولسٹ سے ایک سو تین بن گئے۔ آپ نے دنگلدا
 میں جو تاریخی مضامین لکھے ہیں اُن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مسائل تاریخی اور
 اکثر ان سوراں ساعت کی سوانح عمری لکھ کے آپ نے ہندوستانی پبلک کی واقفیت بہت بڑادی
 ہے۔ مگر ان کے علاوہ آپ نے دو کتبیں بھی لکھی ہیں جو بہت بڑے پیمانے پر ہیں۔ ایک
 تاریخ ہند جس میں آپ نے اسلامی عہد کو عام مسلمات کے خلاف کچھ اور سی ثابت کر دیا ہے
 اور اُس کی تکمیل کے لیے عربی اور انگریزی تاریخوں کی بہت ورق گردانی کی ہے۔ دوسری تاریخ
 ارض مقدس ہے جس میں یہود کے ابتدائی زمانے سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات
 تک کے حالات بڑی تفتیح و تحقیق سے لکھے ہیں۔

مولانا کا کیرئیر یہ ہے کہ سب دور و راج کے اکثر خلاف رہتے ہیں۔ اور تحقیق و تنقید کی من
 ہے۔ تقلید سے گریز۔ اور اہل حدیث کے اصول مذہب کی طرف رجحان ہے۔ اگرچہ بعض مسائل میں



مولانا عبدالحکیم شدر

اپنی تحقیق کی بنا پر اہل حدیث سے بھی علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ آزادی کا خیال غالب ہے۔ اور جو چیز صحیح ثابت ہو جائے اس کے تسلیم کرنے اور علانیہ اس کا اعتراف کر دینے میں باک نہیں کرتے۔ علماء زمانہ کی اکثر شکایت کرتے ہیں۔ انھیں اسباب سے اکثر عوام الناس اُن سے سخت مخالفت رکھتے ہیں۔ پہلی ناراضی لوگوں کو اُن سے یہ تھی کہ مستند مایچون سے نقل کر کے شائع کر دیا کہ حضرت شہر بانو کا عقد جناب امام حسین کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے امام زین العابدین نے اپنے غلام زبید سے کر دیا۔ دوسری مخالفت وہی سکینہ بنت حسین کی لائٹ کی بنیاد پر تھی مگر سب سے زیادہ اختلاف اُس وقت ہوا جب آپ نے سن ۹۰ء میں پردہ عصمت نام ایک سالہ لکھنؤ سے شائع کیا جس کی غرض یہ تھی کہ مسلمانوں میں سے پردے کا رسم اٹھا دیا جائے۔ آپ کا دعویٰ تھا کہ پردہ اسلام میں صریح ایک سائرا در مہذب لباس کا نام ہے نہ گہر کی چادر دیواری میں بند کر دینے کا۔ یہ رسالہ برس دن تک نکلا۔ ہر جگہ سخت اختلاف ہوا۔ مگر اُس نے اپنا کام پورا کر دیا۔ اس لیے کہ اُس وقت تک اس مسئلہ کو علانیہ کوئی بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اور اب ہر جگہ ایک جماعت اس کی طرف اشارہ ہے اور پردے کے توڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔

اپریل سن ۱۹ء سے آپ نے ایک نیا پندرہ روزہ رسالہ جاری کرنا شروع کیا جس کا نام "اتحاد" رکھا اور اس کی غرض یہ تھی کہ ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات صاف کیے جائیں

مولانا کے آخر عمر یعنی تقریباً سن ۱۹۰۷ء سے ۱۹۲۶ء تک کے مزید حالات مختصر اس طرح پر تقسیم ہو سکتے ہیں (۱) دلگداز اس زمانہ میں کئی دفعہ بند ہوا اور پھر جاری ہوا اور بالکل اُن کے صاحبزادہ مولوی محمد صدیق حسن صاحب منیجر انجمن ترقی اردو اور نگاہ آباد دکن کی ڈائری میں لکھنؤ سے نکلتا ہے (۲) جب مولانا محمد علی علیہ السلام نے منیجر انجمن ترقی اردو دہلی سے نکالنے والے تھے تو سب سے پہلے انہوں نے اسکی ادارت کیواسطے مولانا کو دوسروں سے ماہوار پر مقرر کیا تھا مگر بعض وجوہ سے مولانا چند ماہ دہلی میں قیام کر کے قبل اخبار نکلنے کے لکھنؤ چلے آئے اور اخبار

مذکور سے کوئی تعلق نہیں رکھا (۳) ۱۹۱۸ء میں حضور نظام فرما کر دے دکن خلد اللہ ملکہ نے مولانا کو طلب کوئے لکھا اپنی سولخ عمری تیار کر نیکا حکم دیا تھا مگر بعد کو یہ خیال ترک کیا گیا اور بجائے اُس کے مولانا "تیار کیا سلام" لکھنے پر آمادہ کئے گئے جس کے واسطے ایک معتدبر رقم ماہوار انکو لکھو گھر بیٹھے ملتی تھی۔ یہ کتاب تین جلدوں میں تیار ہوئی جسکی پہلی جلد شائع ہو گئی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں داخل ہے۔

مولانا کے چھوٹی اور بڑی تصانیف اتنی کثرت سے ہیں کہ وہ اس خاص صفت میں اپنے تمام معاصرین پر گئے سبقت لے گئے تھے اور ان کی اس کثرت تصانیف سے وہ زمانہ قرون اولیٰ کا یاد آجاتا ہے جبکہ تصانیف کی کثرت مختلف طریقوں سے کتب تیار کر دینے میں بیان کی جاتی تھی مثلاً کسی مصنف کے تراشہ قلم سے اس کے غسل میت کو واسطے پانی گرم کیا جاتا۔ یا کسی شخص کی مصنفہ کتب کا بائیں کسی اور ٹیون پر ایک مقام سے دوسرے مقام تک لیجا یا جانا وغیرہ۔ غرض کہ مولانا کی تمام تصانیف کی اسم نویسی اس جگہ تحصیل حاصل ہے اسکے واسطے کوئی فہرست کتب یا دگلداز کے آخری اشتہاری صفحہ دیکھنا چاہئے۔ یہاں پر ہم انکے جاری کردہ اخبارات و رسائل اور انکی تصانیف کی مجموعی تعداد با اعتبار ان کے مضامین کے بتا دینا کافی سمجھتے ہیں۔

اخبارات و رسائل

۱۸۸۲ء تا اب

۱۸۸۷ء

- (۱) محشر ہفتہ وار
- (۲) دگلداز ماہوار
- (۳) مہذب ہفتہ وار
- (۴) پردہ عصمت پندرہ روزہ
- (۵) اتحاد
- (۶) العرفان ماہوار

(۷) دل افروز ماہوار

(۸) ظریف ہفتہ وار

آخر میں چند سال ہوئے ایک ماہوار پرچہ ”مورخ“ کے نام سے بھی نکالا تھا۔

تصانیف

۲۱	سوانح عمریان مثلاً ”ابو بکر شبلی“ جنید بغدادی وغیرہ
۲۸	تاریخی ناول مثلاً ایام عرب، بابک خرمی وغیرہ
۱۴	خیالی ناول حسن کا ڈاکو، غیب دان دولہن وغیرہ
۱۵	تاریخ مثلاً تاریخ سندھ، عصر قدیم وغیرہ
۶	نظم و ڈراما مثلاً شہید وفا، شب عزم، شب وصل وغیرہ
۱۸	مستغرق
۱۰۲	کل

مولانا کے مضامین ”جود لکھنا“ میں چھپے ہیں سید مبارک علی شاہ تاجر کتب لاہور نے آٹھ جلدوں میں ”مضامین تشریفات“ کے نام سے حال ہی میں شائع کئے ہیں یہ سب کتابیں نہایت دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں مگر علی الخصوص وہ جلد جس میں قدیم لکھنؤ کے حالات جو ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ”کے نام سے دکن از میں چھپتے رہے دیکھنے کے لائق ہیں اور ان لوگوں کے لئے جو لکھنؤ کی پرانی تاریخ اور دلچسپیوں کے جوہر ہیں نہایت مفید اور پُر از معلومات ہے۔

مرزا محمد امدادی رُسا
مرزا محمد امدادی بی۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی متخلص بمرزا ورسوافن شعر میں مرزا ایچ مرحوم کے شاگرد ہیں۔ مرزا صاحب جوانی میں مرزا غالب کے رنگ کو بہت پسند کرتے تھے اور دیوان غالب انکو قریب قریب کل حفظ تھا۔ مگر اب غالب کی نازک خیالیان اور عبارت آرائی انکو زیادہ مرغوب نہیں بلکہ کلام نہایت صاف سادہ اور لطیف تخیل سے معمور ہوتا ہے۔ اس صفائی اور سادگی میں وہ مومن کے متبع البتہ کہے جاسکتے ہیں۔ مرزا صاحب کی معرکہ آرا تصنیف

اٹکا ناول امر اور جان اور اسے جسکو لکھے ہوئے تقریباً پچیس برس ہوئے ہونگے۔ یہ نہایت اعلیٰ درجہ کا ناول ہے اور اسکی عبارت نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ سب سے بڑی صفت اس میں یہ ہے جو اردو کے بہت کم ناولوں میں پائی جاتی ہے، کلاس کا پلاٹ یعنی ترتیب قصہ نہایت باقاعدہ اور منظم اور اس کے کیرکٹر (اشخاص قصہ) صاف واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ہم نے کسی ناول میں اتنی دلچسپی اتنی کثرت واقعات اور فطرت انسانی کی اتنی صحیح تصویر نہیں دیکھی۔ اس میں اس زمانہ کی طرز معاشرت اور سماجی کے ہر ہونے بھونے کھینچے گئے ہیں جن میں کسی قسم کا مبالغہ یا آدر نہیں ہے۔ مرزا صاحب کی دیگر تصانیف۔ ان کے شہزیں زہار و صبح امید و رقیہ لیلی مجنون (ڈراما) اور ذات خرافہ (ناول) وغیرہ ہیں۔ مرزا صاحب بالفعل عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں ملازم ہیں۔

حکیم محمد علی حکیم محمد علی تخلص طبیب، جبکہ تھوڑا عرصہ ہوا کہ اشتغال ہو گیا، ایک مشہور ناول نگار تھے۔ ان کا ترجمہ ناول انکی تصنیف سے ہیں۔ عبرت حسن سرور۔ دیول دیوی۔ گورا۔ رام پیاری۔ جعفر و جتاسہ۔ انتر و حسینہ۔ وغیرہ بعض ناول انگریزی کتابوں کے ترجمے ہیں۔ شلائیل کا سانپ جو بالکل نیا اور نیا ہے۔ اور دیول دیوی اور جعفر و جتاسہ تارکخی ناول ہیں۔ حکیم صاحب گراہے اقران و اشغال میں متاثر تھے مگر اعلیٰ درجہ کے ناول نگار نہیں کہے جاسکتے اسوجہ سے کہ وہ زمانہ کے رنگ سے بے خبر تھے اور نہ وہ اس زمانہ یا اس سوسائٹی کے حالات سے واقف تھے جسکی وہ تصویریں کھینچتے تھے۔ فطرت انسانی سے وہ بڑی طرح باخبر نہیں اور لطیف جذبات کے بھی ماہر نہ تھے۔ عبارت میں کیرنگی ہے اور پند و نصائح سے اور یہی اسے غیر دلچسپ بنا کر دیتے ہیں۔

راشد فیضی ناول نویسی میں مولانا ذیل احمد صاحب کے صحیح جانشین کہے جاتے ہیں۔ انکی توجہ زیادہ طور عورتوں کی تعلیم و ترقی اور ان کے مصائب زندگی پر مبند دل ہے۔ چونکہ عبارت نہایت درد انگیز اور تاثیر سے لبریز ہوتی ہے لہذا مقصود غم کے لقمے مشہور ہیں۔ کثیر تصانیف میں۔ بعض مشہور تصانیف کے نام حسب ذیل ہیں۔ صبح زندگی۔ شام زندگی۔ نوسہ زندگی۔ عروس کربلا۔ زہرہ مغرب وغیرہ۔

نیاز فنجوری اردو کے مشہور و مشاق ادیب بزرگست نیاز محمد خان نیاز فنجوری۔ وطن فنجور (یو۔ پی) سال ولادت ۱۸۷۷ء۔ ابتدائی تعلیم فارسی و عربی گھر پر ہوئی پھر مدرسہ اسلامیہ فنجور مدرسہ عالیہ رام پور اور ندوۃ العلماء کے دارالعلوم میں فراغت حاصل کر کے حدیث مولانا عین القضاہ صاحب لکھنؤ سے پڑھی انگریزی تعلیم ایف اے تک پرائیوٹ طور پر حاصل کی اور ترکی زبان ایکسٹنک سے پڑھی مختلف روزانہ اخبارات میں کام کیا اب سات سال سے "نگار" ایک ادبی علمی رسالہ جاری کیا ہے جو پہلے ہویال اور اب لکھنؤ سے جاری ہے۔

تصانیف۔ صحابیات گوارہ تمدن، نگارستان، (بعض ادبی مضامین کا مجموعہ ہے) جذبات بھاشا، شہاب کی سرگزشت، شاعر کا انجام، السلۃ الشرعیۃ، عرض نغمہ (ترجمہ گیتان جلی)۔

طرز تحریر۔ آپ کا طرز تحریر سب سے علیحدہ ہے اور آپ معمولی سیدھی سادی عبارت سے نظم و نفاذ کو زیادہ پسند کرتے ہیں مگر بعض موقعوں پر جب یہ رنگ حد اعتدال سے بڑھ جاتا ہے تو عبارت بالکل اور بے لطف معلوم ہونے لگتی ہے۔ عبارت اور مضمون میں چلی دامن کا ساتھ ہے لہذا اس قسم کی عبارت کو صرف انہیں مضامین پر صرف کرنا چاہئے جو اسکے تحمل ہو سکیں مگر یہ بات ضرور قابل قدر ہے کہ اپنے قدیم طرز انشاء پر داری کو چھوڑ کر اپنے واسطے ایک نئی شاہراہ قائم کی ہے۔ آپ نے مگور کی گیتان جلی کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور رومی اور یونانی علم الاضنام سے بھی آپ کبھی کبھی فائدہ اٹھاتے ہیں یہ کیونکہ پڑا اور سائیکس اور مرکنی سیاح کی ڈائری انگریزی کے ترجمے معلوم ہوتے ہیں آپ کی بعض کتابیں مثلاً "شاعر کا انجام" اور "گوارہ تمدن" جس میں ترقی تمدن میں عورتوں کے حصہ لینے کی بحث ہے نہایت عمدہ اور دلچسپ کتابیں ہیں۔ آپ کا رسالہ "نگار" ایک نہایت مستند و زاہد رسالہ ہے جسکے اکثر مضامین جو آپ کے زور قلم کا نتیجہ ہوتے ہیں نہایت اعلیٰ درجہ کے اور پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی خواجہ حسن نظامی دلی میں ۱۲۷۷ھ میں پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی ولادت

اور گاہ فلک بارگاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں ہوئی خواجہ صاحبِ ہدایہ عمر ہی سے اخبارات میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ تک گورنمنٹ انکونٹریکٹ لکھتی رہی اور پولیس انکی نگرانی کرتی تھی۔ وہ بوجہ اپنے مرتبہ اور نیز پوجنی صافی ہونیکے بہت بااثر شخص ہیں۔ پچاس سے زیادہ کتب اور رسائل کے مصنف ہیں جن میں سے بعض بہت اچھے ہیں۔ آپ کی خصوصیت ہے کہ معمولی معمولی مضامین اور خیالات کو نہایت دلکش اور مؤثر طریقہ سے ادا کرتے ہیں اور الفاظ نئے نئے اور عجیب وضع کرتے ہیں۔ آپ کی عبارت نہایت سادہ سلیس اور دلکش ہوتی ہے مگر خیالات میں گہرائی نہیں ہوتی۔ آپ کے تقریباً دس کتابیں غدر کے بارہ میں شائع کی ہیں جن میں سے بعض ترجمہ ہیں اور بعض میں معرکہ شاہ دہلی کی اولاد کی پریشان گردیوں کے افسوسناک و عبرتناک حالات ہیں۔ آپ کی کتاب کرشن مہتی کو اہل سلام اور خصوصاً ارباب قصوں بہت پسند کرتے ہیں۔ بعض دیگر تصانیف حسب ذیل ہیں۔ سیلا دانامہ، محرم نامہ، یزید نامہ، بیوی کی تعلیم، اولاد کی شادی، جھگڑتی کہانیاں وغیرہ۔

پریم چند میدانِ قصہ گوئی کے مشہور شہسوار ہیں۔ اصلی نام دمنیت رائے ہے۔ پریم چند کے لقب سے مشہور ہیں۔ ۱۹۲۳ء سمیت سن ولادت ہے۔ آپ کے والد فشی عاقل لال بنارس کے قریب موضع بانڈے پور کے رہنے والے تھے۔ فارسی کی تعلیم تقریباً سات آٹھ برس حاصل کر کے انگریزی شروع کی اور بنارس کالج اسکول میں داخل ہوئے جہاں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ سات برس کی عمر میں ان کا اور چند برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ شروع میں آپ نے ضمیمہ تعلیم میں ملازمت کرنی تھی مگر دس دس درسیں کا سلسلہ کے بعد بھی جاری رہا۔ آپ کی ادبی زندگی ۱۹۲۸ء سے شروع ہوتی ہے جب سے آپ نے تین مضامین لکھ کر شروع کئے۔ ۱۹۳۰ء میں ایک ہندی ناول "پایا لکھا جو اندر میں پرلین" لکھا جس سے شائع ہوا۔ ۱۹۳۱ء میں "ایثار" اور ۱۹۳۲ء میں "بازار حسن" ہر دو حصہ تصنیف کئے۔ نسلِ اردو کے آپ کو ہندی میں بھی کمال حاصل ہے چنانچہ سیواسدن پریم چند رنگ بھوم اور کاپا کلب آپ کے مشہور ناول ہیں جبکہ اردو ترجمہ بھی سنایا گیا۔ مگر شائع ہونے لگا۔ ۱۹۳۵ء میں "سیواسدن" کا ترجمہ بازار حسن کے نام سے شائع ہوا۔ یہ رنگ بھوم کے ترجمہ کا پہلا حصہ جو کان بستی کے نام سے شائع ہوا ہے اور اگلے حصے میں "مغربی شائع ہو گا۔"

رنگ بھوم علیٰ الخصوص ایک نہایت دلکش ناول ہے۔ آپکا تاریخی ڈراما کر بلا رسالہ زمانہ میں بہ اقساط نکلتا رہا منشی
موصوف چھوٹے چھوٹے قصے لکھنے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ آپکے اس قسم کے افسانے
اس زمانہ کے کثیر التعداد نام نہاد ناولوں کے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہیں جو سچے ٹیکنون کو چھوٹے
پتھرون کے ساتھ ہوتی ہے۔ آپکو دیگر ناول نگاروں پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ آپ نے ہندوستانی دیہات
کے ہوہو نقشے اور یہاں کے کسانوں کے سچے سچے واقعات نہایت عمدہ طریق سے اپنے ناولوں میں
بیان کئے ہیں۔ آپ کبھی مبالغے کو اپنی تصانیف میں پاس نہیں آنے دیتے اور نہ کبھی حق اور
سچائی سے انحراف کرتے ہیں آپکی عبارت میں سید آمد اور زور معلوم ہوتا ہے لطیف استعارات
اور تشبیہوں سے عبارت کی خوبی اور بڑھ جاتی ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا آپکو اردو و ہندی دونوں
زبانوں پر عبور حاصل ہے اور ساتھ ہی اسکے جذبات و نفسیات انسانی کے بھی پورے ماہر ہیں آپکے
کلام میں کہیں ظرافت اور کہیں درد وہی رنگ دکھاتا ہے جیسے کہ وہ پ اور چاؤن۔ آپکے کیرکیر
نہایت مخصوص جیتی جاگتی تصویریں ہوتی ہیں۔ آپ کا ناول بازاجسن جو دو جلدوں میں ہے ایک
طویل کتاب ہے مگر دلچسپی میں کم نہیں ہو۔ اگر آپ کے اہل قلم کے ادبی اشتغال جاری رہے تو کچھ عرصہ میں
آپ بڑی ترقی حاصل کریں گے۔ تھوڑے عرصہ سے بوجہ اردو کی نافرمانی کے آپ ہندی کی طرف زیادہ
توجہ فرما رہے ہیں۔ آپ کے خیالات سوشل اور پولیٹیکل معاملات میں بہت اعلیٰ وارفع ہیں۔ آپ کے
مضامین ہندو مسلم اتحاد اور دور جدید جو زمانہ میں نکلے تھے خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ آپکی
تصانیف علاوہ کتب مذکورہ بالا کے پریم پبلیسی حصہ اول و دوم اور پریم پبلیسی حصہ اول و دوم چھوٹے
چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہیں۔ خواب و خیال ابھی حال میں پنجاب سے شائع ہوا اور فردوس خیال
انٹرنیشنل پریس شائع کر رہا ہے۔

سُدرشن | آپ بھی ایک مشہور افسانہ نگار ہیں اور پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ منشی پریم چند کی بعض
خصوصیات آپ میں بھی موجود ہیں مگر اتنے کم درجہ پر۔ آپ میں وہ استاد می اور ذہنی کمال نہیں ہے
اور نہ عبارت میں اس قدر ادبیت اور صحت ہے۔ آپکی تصانیف حسب ذیل ہیں۔ (۱) محبت کا انتقام

ایک انعامی رسالہ جس پر پنجاب گورنمنٹ نے پانچ سو روپیہ انعام دیا۔ پہلے ہندی میں لکھا تھا اس کے بعد اس کا ترجمہ اردو میں ہوا (۲) چند دن اسپر خواجہ حسن نظامی نے دیباچہ لکھا ہے۔ پندرہ چھوٹے چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہے (۳) بہارستان اسپر فشی پرچم چند نے دیباچہ لکھا ہے۔ یہ بھی چھوٹے چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہے (۴) و (۵) تہذیب کے تازیانے اور زہر ملا آب حیات بنکم چندر چٹرجی کے بعض مضامین اور ناول کے ترجمے ہیں۔ (۶) عورت کی محبت ایک ہنگالی مصنف کی کتاب کا ترجمہ ہے اور (۷) بیگناہ مجرم ہنگالی اور فریج کتابوں سے لیا گیا ہے (۸) سدا بہار بھول مختصر قصوں کا مجموعہ ہے۔

دیگر ناول نہیں

نی زمانا ناول نگار دن اور چھوٹے چھوٹے قصے لکھنے والوں کی اتنی کثرت ہو گئی ہے کہ ان سب کے نام بتانا بھی ایک امر محال معلوم ہوتا ہے۔ بہر طور اصحاب ذیل ان سب کو نہیں زیادہ مشہور و ممتاز ہیں۔ (۱) حامد اشتر آفسر میرٹھی جو علاوہ ایک عمدہ شاعر اور نقاد ہونے کے افسانے لکھنے میں بھی بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ انکی اکثر کتابیں سرشتہ تعلیم میں بھی داخل ہیں۔ ایک مجموعہ قصص جن میں ڈالی کا جوگ اور دیگر قصص شامل ہیں تیار ہو رہا ہے۔ (۲) مجنون کو کھڑکی (۳) احمد حسین خان ایڈیٹر شباب اردو (۴) سید عابد علی (۵) حکیم شجاع الدین (۶) مولوی ظفر حسین سپرنٹنڈنٹ پولیس مہاراجہ جاسوسی کے قصے لکھنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ آپ کے ناول نیلی چپتری بہار کی گرفتاری بہت مشہور و مقبول ہیں۔ ان کے علاوہ بعض قابل خواتین ہیں بھی اس فن کی طرف توجہ کی ہے اور صوبہ پنجاب سے بعض بہت دلچسپ قصے عورتوں کے لکھے ہوئے شائع ہوئے ہیں۔

باب

اردو ڈراما

اردو ڈراما ایک نئی بودا ہے جو سرزمین اردو پر انیسویں صدی کے وسط میں نصیب ہوا۔

گیا اور اب خوب جڑ پکڑ گیا اور نہایت تندرست اور تندرست معلوم ہوتا ہے۔

ڈراما کی عسویت محاکات یعنی نقالی کا شوق ہر قوم میں فطری ہے عام اس سے کہ وہ قوم ترقی کی معراج پر ہو یا بربریت اور مگر اہی کے گڑھے میں پڑی ہو۔ نقالی انسانی فطرت میں داخل ہے۔ البتہ بعض ممالک میں یہ فطری جوش دبا دیا گیا اور بدعت کہلایا۔ اہل اسلام اسی چیز یعنی نقالی کو جس میں ڈراما بت تراشی تصویر کشی رقص اور موسیقی سب داخل ہیں ممنوع سمجھتے ہیں۔ پس اُنکے ممالک میں فنون لطیفہ کی نشوونما اور ترقی کو گویا بدعت یا اخراجات سنت کی تاریخ سمجھنا چاہیے۔ اسی وجہ سے فارسی سے اس قسم کے کوئی نمونہ اردو کو نہیں ملے مگر خود فارسی اس نقالی کے جذبے سے محفوظ نہ رہ سکی۔ وہاں ڈراما نے پیش پلے (مشریہ) کی صورت اختیار کر لی جن میں میدان کر بلا میں حضرت امام حسین کی شہادت پر اظہار رنج و غم کیا جانے لگا۔ مذہب جو زمانہ قدیم میں عنصر غالب تھا اب ڈراما اور دیگر صناعات کو ذریعہ تبلیغ قرار دینے لگا۔ اہل یورپ اور اہل انگلستان کے مرکبل پلے (ایسے سین جن میں معجزات دکھائے جاتے ہیں) اور مسٹری پلے (ایسے سین جن میں اسرار دکھائے جاتے ہیں) جو قدیم کلیسائے مسیحی کے رسوم اور طریقہ عبادت کے منظر ہیں اس طرح سنسکرت اور ہندی کے مذہبی ڈراما جو پرائون اور دیگر مذہبی کتب ہندو سے اخذ کئے گئے ہیں اور ابراہام کو کے پیش پلے ان سب کا ماخذ وہی قدیم مذہبی اعتقاد ہیں۔ ہندوستان میں اب تک مذہب کا بہت بڑا اثر ڈراما پر ہے۔ پران اور دیگر مذہبی کتب کے قصے ڈراما کی صورت میں آکر اپنے خوبصورت پردوں اپنی دلچسپ موسیقی اور اخلاقی نتائج سے اب بھی ہزاروں آدمیوں کے دلکشی اور تفریح کا باعث ہوتے ہیں۔

سنسکرت اور ہندی ڈراما ہندوستان میں ڈراما درجہ کمال تک پہنچ گیا تھا پس قدیم سنسکرت ڈراما کو جو اپنے عروج تک پہنچ گیا تھا اردو ڈراما پر کچھ نہ کچھ ضرور اثر

۱۔ ابراہام کو جیسی میں ایک مقام ہے جہاں مقررہ اوقات پر حضرت مسیح کے حالات زندگی ناٹک کی صورت میں اس طرح دکھائے جاتے تھے جس طرح ہمارے یہاں رام لیلہ ہوتی ہے۔ ہزاروں آدمی اس مذہبی تماشے کے دیکھنے کو در و در سے آتے تھے۔ معلوم نہیں کہ اس تہذیب و تمدن کے زمانہ میں بھی اس قسم کا اجتماع ہوتا ہے یا نہیں۔

کرنا چاہئے تھا۔ مگر نہایت افسوس ہے کہ بطرح اردو فن نظم سنسکرت کے اثر سے محفوظ رہا اسی طرح
 فن ڈراما پر بھی اسکا کوئی اثر نہ پڑا۔ سنسکرت کے ان دونوں خزانوں سے اردو نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا
 جسکی وہ حقیقی وارث تھی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ سنسکرت ڈراما کا زمین دور گزر چکا تھا اور اب وہ ایک
 تنہا بیجان اور محض کتابوں میں محفوظ تھا۔ اسکے شاہکار ہندوستان کی ویسی زبانوں میں محفوظ تھے
 اسکا کھیل (اکٹینگ) ابھی موقوف ہو چکا تھا۔ شریع میں بدھ مت اور جینی ڈراما کو ناپسند کرتے تھے
 مگر اسکا یہ فائدہ دیکھ کر وہ انکے دینی مسائل کے پہیلانے کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔ وہ بھی اسکی قدر
 کرنے لگے۔ اور بدھ مت کا ڈراما تو راجہ ہرش اور اشوک کے زمانہ میں بڑی ترقی کر گیا تھا جب بدھ
 مت کو زوال اور برہمنوں کی ترقی ہوئی تو ڈراما اپنا پرانا عروج حاصل نہ کر سکا اسوجہ سے کہ غیر اقوام
 کے حطوں اور قوم کی مغلیں سے ملک میں ایک بے اطمینانی کی حالت پھیل گئی تھی۔ اب ڈراما کی طرف
 لوگوں کی توجہ کم ہو گئی اور وہ اسکی پرانی شان و شوکت جاتی رہی۔ اور جب اسے درجہ کے لوگوں نے
 اہمک کی کمپنیاں کمرل لین تو ڈراما کی رہی سہی عزت جاتی رہی۔ ایک مڑ لوگ قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھ
 جاتے تھے اور دشمنوں بھی اپنی درجہ کے بعض وقت فحش کی حد تک پہنچ جاتے تھے۔ اس بلنے
 میں اردو اپنا جنم لے رہی تھی سنسکرت ڈراما محض ایک ملکتولی چیز رہ گیا تھا اور ہندی ڈراما ادنیٰ درجہ
 کا اور ذلیل ہو گیا تھا۔ اسکے علاوہ اردو زبان ابتدائی سے فارسی کے آغوش محبت میں آگئی تھی اسکی
 سوتیلی ماں نے اسکی ماں کو کوٹنے میں بجا دیا تھا۔ فارسی مدایات فارسی محاورے فارسی تخیل اردو پر غالب
 تھے فارسی ادیب اس نوازندہ بچہ کو پیار کرتے تھے اور وہ فارسی تہذیب تمدن کے سرچشمے سے سیراب
 ہوتا تھا۔ سنسکرت ادیبوں کی غفلت اور بے توجہی کے سبب سے طفل زبان مسلمانوں ہی کی گود میں
 پلنے لگا فارسی زبان دان سنسکرت سے ناواقف تھے ایسوجہ سے سنسکرت ڈراما اور فن نظم دونوں
 بے اثر رہے۔ اگر یہ لوگ بہاؤ شا اور سنسکرت کی قدر کرتے یا اگر نڈپٹ لوگ اردو کی پرورش زیادہ
 محبت سے کرتے تو آج یہ حالت نہ ہوتی۔ اور اردو زبان اپنے اکثر نکتہ چینوں کو دندان شکن جواب دیتی
 اور ان کے غلام بن جاتا۔ مسٹر عبد اللہ مودہ صلی علی آلی سی۔ ایس۔ نے ایک غلامانہ مصنفوں میں۔



مہاشی پریم چند



پہلے رکھنا ضروری ہے جب ذیل قائم کئے ہیں۔ (۱) قدیم سنکرت ڈراما (۲) اہل ہندو کے لہجے
 مذہبی ناٹک یا مہکل پہلے اور دیوتاؤں اور دیویوں کے حالات (۳) وہ چیزیں جو ادنیٰ درجہ کے
 لوگوں میں جاری ہیں۔ مثلاً سوامیگ، نوٹکی، نقیلین وغیرہ (۴) اسلامی نظمیں اور قدیم روایات۔ (۵)
 زمانہ موجودہ کا انگریزی ڈراما اور یورپین اسٹیج کی ترقیاں۔

سنکرت ڈراما ہر چند کہ قدیم سنکرت ڈراما کا اردو ڈراما پر بہت کم اثر پڑا مگر کچھ بھی بعض مشہور
 ناٹکوں کا ترجمہ اردو میں ہو گیا ہے اور وہ کھیلنے کے قابل کر دیے گئے ہیں۔ موقوفے عرصہ سے
 ڈراما کے پڑانے قواعد بھی استعمال میں آ رہے ہیں خاص کوہ جواستدالی سین کے متعلق ہیں مثلاً ناٹک
 شروع ہونے سے پہلے ایک شخص جو سوترا یا راکھلا کہتے ہیں اپنی بیوی کے اسٹیج پر آتا ہے اور تماشہ کے
 تمام واقعات کو مختصر طور پر بتا دیتا ہے اور لوگوں کو آگاہ کر دیتا ہے کہ اب اصلی کھیل شروع ہونے والا
 ہے۔ بدو شک یعنی مسخرہ کا پاٹ بھی ضرور ہوتا ہے مگر اچھے تماشوں میں یہ بالکل علیحدہ رہتا ہے
 اور تماشہ کے اصل واقعات سے اسکو تعلق نہیں ہوتا۔

ہندو مہکل پہلے وغیرہ اس قسم کے ناٹکوں نے بھی موجودہ اردو ڈراما کے واسطے بہت کچھ مواد
 فراہم کر دیا ہے۔ انکی نسبت اردو ڈراما کے ساتھ وہی ہے جو بالمشہور ڈراما کے پڑانے قصوں اور
 سورج پوتا مارک کی قدیم یونانی مشہور لوگوں کی سوانح عمریوں کی شیکسپیر کے ناٹکوں کے ساتھ ہے
 اگر غور سے دیکھا جائے تو اردو ڈراما کی ابتدا ہی اس قسم کی ہندی چیزوں سے ہوئی تھی۔ قدیم زمانہ
 سے ہندو لوگ رام اور کرشن کے مشہور واقعات زندگی کو تیاروں کے موقع پر مندروں میں ناٹک
 کی صورت میں لوگوں کو دکھایا کرتے تھے تاکہ وہ اپنے مذہبی روایات سے واقف ہوں ان سے

۱۵ یہ دونوں انگلستان کے قدیم مورخ سولہویں صدی عیسوی میں گذرے ہیں انکے تاریخی قصوں سے جبکہ لائیکل کہتے ہیں شیکسپیر
 نے اپنے تاریخی ڈراموں میں بہت مدد لی ہے۔ ۱۶ مشہور یونانی مورخ جو ظالم شہنشاہ نیر کا معاصر تھا۔ تقریباً سترہویں صدی
 ہوا۔ اسکی کتاب "سوانح عمری" زمانہ قدیم کی اک مشہور اور مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے جس میں پچھلیاں بڑے بڑے یونانی اور
 رومی مشاہیر کے حالات بالمقابلہ نہایت وضاحت سے لکھے گئے ہیں اسکی دوسری کتاب مورلیا کی رسالوں کا مجموعہ ہے ۱۷۔

اچھی اچھی باتیں کہیں اور اپنے دیوتاؤں اور سرداروں کے واقعات زندگی سے مفید
 رامائن کے واقعات دسمبر کے زمانہ میں جبکہ رام چند جی اپنے حریف رادوں پر فتح پا کر بھارت میں
 میں واپس آئے تھے اسی قسم میں اور آجکل ایسے نامک رام نامک اور رامائن کے نام سے مشہور ہیں اور
 مذہبی لوگوں اور علی الخصوص عورتوں کو بہت پسند آتے ہیں۔ اسی طرح کرشن جی کے عاشقانہ گیت
 بھی اردو ڈراما کا جز ہیں سچ پرچھے تو جس قدر عاشقانہ اور جذباتی شاعری ہندی اور بنگالی میں لعل
 ہے اسکا زیادہ تر حصہ کرشن اور رادہ کے عشق پر مبنی ہے۔ بہت سی دہی کہنیاں جو منڈلی کھلاتی ہیں
 سہارا دہندہ راجن وغیرہ متبرک مقاموں پر چھلکے راستہ میں اپنے مذہبی گائون اور تماشوں سے لوگوں کے
 دلوں کو ملاحظہ کرتی ہیں۔ نواح اور گائون تماشوں کی جان ہے۔ اس قسم کی کہنیاں دولت مند اور تعلیم یافتہ
 لوگوں کے لئے نہیں بلکہ عوام الناس کی ڈیپ کے لئے ہیں یہ لوگ جگہ جگہ کی سیر کرتے پھرتے ہیں جان
 پہنچتے ہی فوراً ایک شیخ تیار کر لیتے اور کپڑے ادھر ادھر سے مانگ جاتے کہ مہیا کر لیتے ہیں اپنے چہرہ کو
 رنگتے اور چرخوں یا شعلوں کی روشنی میں اپنے تماشے دکھاتے ہیں اور آخر میں دو دو چار چار پیسے لوگوں
 سے وصول کرتے ہیں یہ سواک غنیمت کشمیری نے اپنی مشہور قمیض "نیرنگ عشق" میں ان جو عنوان کا جو
 وہ جگت باز کہتے ہیں خوب خاک کھا ایا ہے۔ غالباً انہیں جماعتوں سے واجد علیشاہ نے جو اپنے
 سیش پرستیوں کے لئے مشہور تھے نامک کا پہلا سبق سکھا ہوگا۔ اور وہ انکو بہت پسند آیا ہوگا
 پھر انہوں نے نامک اور وہیں خود قالم کر لئے ہیں وہ خود کہنیا اور ان کے محل کی عورتیں نہایت
 قیمتی اور ذوق برق لباس میں گویا بنا کرتی تھیں۔ ہمارے نزدیک یہ نواح اور گائون اور دو
 ہزار کا جزو لاینفک ہے انہیں وہیں منڈلیوں سے لیا گیا ہے اور مگن ہے کہ فریخ اور پراکا بھی اس پر
 کچھ اثر ہو کہ واجد علیشاہ کے عہد میں انکے یوروپین دوستوں کی وجہ سے یہ دامن مروج ہو گیا تھا۔
 سوانک نقیلین وغیرہ سوانک کی ہندوستان میں وہی حیثیت ہے جو بیٹھ کی انگریزی ڈراما
 کی ترقی کے پیشتر انگلستان میں تھی۔ سوانک ہندو متواروں کے موقع پر جلوس اور باجوں کے ساتھ نکلے
 ہیں۔ انکو ابتدائی ہندی نقالی سمجھنا چاہئے مگر غصہ ظرافت (کامک) انہیں ضرور پایا جاتا ہے۔

پڑائے زمانہ کے نقال یا مسخرے امیر لوگوں کی صحبت یا ملازمت میں رہتے تھے اور اپنی ظریفانہ باتوں اور نقلوں سے اپنے مالکوں کا دل خوش کیا کرتے تھے۔ نقالی اس زمانہ میں ایک شکل فن تھا جو خاص تربیت اور محنت سے آتا تھا اور اسکی تکمیل کے واسطے گانا ناچنا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ نقالوں کی وہی حیثیت تھی جو انگلستان میں ملکہ ایلزبتھ کے زمانہ میں اُمرائے دربار کے مصاحبین اور ملازموں کی تھی جو جماعتوں میں نکلا کرتے تھے اور اپنے گانے بجانے اور مسخرے پن سے لوگوں کو خوش کرتے تھے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہی پھر نے دلی نقال کمپیان عہد ایلزبتھ کے ترقی یافتہ ڈراما کی اصلی پیشرو تھیں۔ ہندوستان میں نقالوں کی جماعتیں طایفہ کے نام سے مشہور ہیں جو شادی بیاہ کے موقع پر یہ اجرت ملائے جاتے ہیں اور اپنے ناچ گانے اور مذاق کی باتوں سے سامعین کو محظوظ کرتے ہیں۔ انہیں پرانے زمانے کی نقلوں سے آجکل کے تماشوں کے کامک اور نقلیں ماخوذ ہیں اسلامی نظمیں اور روایات یہ اردو ڈراما کا عنصر غالب ہیں نظم و نظم عاشقانہ رنگ اور ڈراما نگاری

کے لئے ایک خاص استعداد اور موزونیت رکھتی ہے۔ قدیم ڈراما نہایت مؤثر سرپردہ اپنے موزون عاشقانہ نظموں میں ہوتے تھے۔ انکی نثر مقفے اور شعر دو وزن مؤثر ہیں۔ زبان اردو بڑی زوردار چیز ہے اسکا طرز ادا اس کے صنایع بدایع نہایت دلکش اور قابل تعریف ہیں۔ وہ رزم و بزم و وزن موقوفوں کے لئے موزون اور جذبات نگاری کے لئے بھی پوری طرح مناسب۔

انگریزی اسٹیج اس کا اثر زمانہ حال کے اردو ڈراما پر سب سے زیادہ ہے۔ اردو اسٹیج آجکل انگریزی نامکون کے ترجموں سے بھری ہوئی ہے۔ اسٹیج کی وضع تھیٹر کی ساخت پر دے لباس نشوونما طریقہ تماشہ کے تقسیم پارٹوں کا انتظام یہ سب بالکل انگریزی اصول کے مطابق اور اُسی کے زیر اثر ہیں۔

اردو ڈراما کے اقسام اردو ڈراما نقل تصانیف اور تراجم شہمیل ہے۔ اول لذر کی تعداد نسبت کم ہے اور جو میں وہ کسی پولیکل یا سوشل مسجت پر مبنی ہیں۔ تراجم کے ماخذ حسب ذیل ہیں۔

(۱) سنسکرت (۲) انگریزی یا اردو کوئی یورپی زبان بذریعہ ترجمہ انگریزی (۳) فارسی قصے

(۴) دیسی زبانین علی الخصوص بنگلہ، مرہٹی اور زیادہ تر ہندی۔

قصوں کے مضامین حسب ذیل چیزوں سے ماخوذ ہیں۔

(۱) پوران اور ہندو دیوتا (۲) فارسی اور عربی قصے (۳) ہندوستان کے مشہور قدیمی روایتیں اور

قصے (۴) انگریزی قصے (۵) سائنس حاضرہ بینی کوئی پوزیشن مسئلہ باسوشیل خرابیان۔

اُردو ڈراما پر شاہی درباروں کا اثر

سب سے پہلا اُردو ڈراما اندر دکھایا ہے جسکا امانت شاگرد ناسخ نے تصنیف کیا تھا جو محمد واجد علی شاہ مین دربار شاہی سے تعلق رکھتے تھے اور مشہور ہے کہ یہ کتاب بادشاہ ہی کے حکم سے تیار کی گئی تھی۔ ایک ہندی شاعر اناجی نے فرخ سیر بادشاہ دہلی کے عہد میں مشہور و معروف شکستہ نامک کا زبان برج بھاشہ میں ترجمہ کیا تھا مگر خود اس ترجمہ کو ڈراما سمجھنا غلطی ہے اسوجہ سے کہ مزویر ترجمہ ایک صحیح ترجمہ ہے کیونکہ دو ہونکی صورت مین ہے اور نہ انکین ڈراما کی شان باقی رہی کیونکہ اشخاص قصہ حسب طرح کڈ دیا مین دستور ہے آتے جاتے نہیں اور نہ اس مین کیر کڑ اور انکین کا کہین پتہ ہے اس وجہ سے مزویر ڈراما ہے اور نہ اس کا تعلق اُردو سے ہو سکتا ہے جیسا اور مذکورہ زمانہ شاہی مین نقالوں اور بہرہ دیوں کا جڑا رواج تھا انکی نقلوں سے لوگ خوش ہو کر ان کو انعام و اکرام سے الالال کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ محمد شاہ بادشاہ دہلی جو اپنے نالچ رنگ اور خستہ پرستیوں کی وجہ سے محمد شاہ رنگیے کے نام سے مشہور ہیں اپنے اسی شمر کے اشغال مین مصروف تھے کہ نادر شاہ کا حملہ دہلی پر ہوا۔ بہت شاہی مین غل ہو نیکیے ڈر سے کوئی شخص اس بری خبر کو اپنے ہنس سے نہیں نکال سکتا تھا۔ بہرہ ایک نقال کے ذریعہ سے یہ خبر بادشاہ کو پہونچائی گئی۔ نقلوں کی کوئی کتاب مرتب نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ حسب سورت فی البدیہہ افزائش سے فوراً تیار کر لی جاتی تھیں۔ لکھنؤ جو بادشاہان اودھ کا دارالسلطنت تھا عیش و عشرت کا مرکز بنا ہوا تھا اور علی الخصوص واجد علی شاہ کا زمانہ تو دولت ثروت، شوکت و عشرت کا بہترین دور تھا۔ اس زمانہ کی ان الفاظ مین کیا ابھی تصویر کھینچی گئی ہے تو ان دولت خورشالی فارغ البالی نالچ رنگ گانے

بچانے کے ہر طرف جیسے تھے عاشق مزاج خوش رو جوان اور حسین مسہ جبین نادنیوں کے جھگٹے تھے۔ زندگی اس مزہ سے گذرتی تھی جس طرح پھولوں کے تختہ پر باد بہاری چلتی ہے ہر طرف سرلی آوازوں سے کان لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ خیالی پرستان جسکو کوہ قاف کہتے ہیں اس سچ کے پرستان کے آگے جہاں ہزار دن لاکھوں آدمی اپنی زندگی نہایت بیفکری اور عیش و عشرت میں گزارتے تھے مات تھا۔ شاہزادے اور رؤسا و امرا و جوشا و مانی اور کامرانی کے مجسم تصویریں تھے آنکو دیکھ کر دنیاوی جاہ و جہال اور مال و منال کا صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا اسی دربار میں اردو ڈراما نے جنم لیا۔ بادشاہ اور ان کے وزراء اور مصاحبین اپنی سرت اندوزیوں کے منت نئے طریقے سوچا کرتے تھے چنانچہ ایک فرانسیسی نے جو دربار شاہی سے متوسل تھا ادرا کی تجویز پیش کی جس کا اس زمانہ میں یورپ میں عروج ہو رہا تھا جو فوراً منظور کر لی گئی اس وجہ سے کہ اس میں صد ہا حسین و مسہ جبین گائون کے لئے جن سے دربار بھرا ہوا تھا ایک اچھا مشغلہ نکل آیا اور امانت کو اسی قسم کا ایک تماشہ لکھنے کا حکم ہوا۔

اندر سبھا امانت امانت نے ۱۲۷۵ھ (مطابق ۱۸۵۹ء) میں اپنی کتاب اندر سبھا تیار کی
 جو کہ میٹھی ہے اور چونکہ اس میں گانا اور ناچ بھی شامل ہے لہذا موسیقی دار کا میٹھی ہے جو ادرا پر لکی ایک قسم ہے۔ جو نئی یہ کتاب تیار ہوئی۔ اسکے واسطے لکھنؤ کے مشہور محل قیصر باغ میں ایک اسٹیج آرتھ کیا گیا۔ مشہور ہے کہ بادشاہ خود تماشہ میں شریک ہوتے اور راجہ اندر بنتے تھے اور پر یون کا پارٹ خوب صورت حسین عورتیں کرتی تھیں جو پیکلف اور قیمتی لباس اور جہرات سے آراستہ ہوتی تھیں۔ ان تماثوں میں کسی غیر آدمی کے جانکی اجادت نہ تھی۔ یہ مسئلہ کہ آیا اردو ڈراما کی ترقی میں یورپ والوں نے کوئی حصہ لیا یا نہیں ہنوز مابہ النزاع ہے مولوی عبد الحکیم شرم مرحوم اسکو نہیں مانتے تھے ان کا خیال تھا کہ کسی یورپین نے اردو ڈراما کی ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ معاملہ تاریکی میں چھپا ہوا ہے اور اس زمانہ کی کوئی معتبر تاریخ ایسی نہیں ملتی جس سے اس پر کافی روشنی پڑ سکے مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یورپین لوگوں نے اردو ڈراما کو زمانہ حال کے مطابق بنانے اور اسٹیج کے ساز و سامان اور تیاری

میں کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لیا ہوگا۔ نذر انہی اور محمد عمر صاحبان نے اپنی کتاب ایک ساگر میں بہت سے
 ولایوں مولانا شرم مرحوم کے جواب میں پیش کئے ہیں مثلاً واجد علی شاہ کے دربار میں یورپین لوگوں کی
 موجودگی خود واجد علی شاہ کو کبھی چیزوں کا شوق اندر سبھا کی اندر دینی شہادت وغیرہ وغیرہ اور اس کے
 علاوہ خورشید جی بالی والا جو اس زمانہ میں ایک مشہور ایکڑ تھے ان کا قول بھی اسکی تائید میں نقل کیا ہے۔ مگر
 حق یہ ہے کہ بالیقین یہ نہیں کہا جاسکتا کہ واجد علی شاہ تماشہ میں کچھ حصہ لیتے تھے یا کہ اندر سبھا کا تماشا
 قیصر باغ میں ہوا تھا یا امانت نے یہ کتاب بادشاہ کے حکم سے لکھی تھی یا نہیں۔

اندر سبھا کا پلاٹ بہت معمولی ہے۔ کتاب راجہ اندک سبھا یعنی دربار کے سین سے شروع ہوتی
 ہے۔ اور قصہ اس قدر مشہور ہے کہ اس کے بیان لکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ شائع ہوتے ہی بہت مقبول
 ہوئی اور اسکی مقبولیت کا سبب ظاہر ہے یعنی یہ کہ ابتدائے دسویں اسکی شعرون اور گیتوں کی بڑے
 بڑے استادوں نے قایم کی تھیں اور اسکا سامان ظاہری یعنی پردے لباس وغیرہ نہایت پر تکلف تھا

سلطہ مری سید سوسن صاحبہ مری ایم۔ اے۔ اور گورنمنٹ کالج لکھنؤ میں پڑھتی تھیں ایک فاضلانہ مضمون میں جو سالہ
 ۱۹۰۷ء میں چھپ چکا ہے یہ ثابت کر لیتے ہیں کہ اندر سبھا قادیان کے حکم سے لکھی گئی تھی اس کا کھیل کبھی قیصر باغ میں ہوا اور
 اندر سبھا کبھی اس میں شریک ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ امانت نے اس کتاب کی شرح میں (جو انکے پاس موجود ہے) یہ لکھا ہے
 کہ یہ کتاب انکے امانت کے ایک شاگرد کے کہنے سے لکھی گئی اور اس کے ایک ٹکڑے کا طرعیہ نہایت دلچسپ اور مفصل طریقہ
 سے بیان کیا ہے۔ بادشاہ کا راجہ اندر سبھا بالکل بے اصل ہے اس وجہ سے کہ بادشاہ کو جس کا بڑا شوق تھا چنانچہ انکی تصانیف
 میں اس طرح کی چیزیں بکثرت پائی جاتی ہیں جس میں دو مختلف پارٹ مختلف لوگوں کو تفسیر کر دیتے تھے جبکہ نام بھی بتا دے
 تھے لیکن اگر یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ بہمن میں کنہیا کا پارٹ پہلے مرد کے ہیئتہ کو کسی عورت کو دیتے تھے اور
 آخر کو بھی نہیں بنتے تھے۔ جب میں کنہیا کا پارٹ خود انہوں نے کبھی نہیں یہ تو یہ بیدار عقل ہے کہ وہ راجہ اندر سبھا میں۔

اندر سبھا پر پڑنے والے کے متعلق مولانا شرم مرحوم اور سید سوسن صاحبہ دونوں کی قطعی رائے ہے کہ نذر انیسویں نے اس میں کچھ
 نہیں کیا۔ اگر لفظ پردہ ہے اسکا بڑا ثبوت دیباچہ سے تو تقریر پر پردہ جو میں کہلاتے ہیں اور تھیں مری میں لاجو بے شک یہ
 کی نفس میں وہ پردہ سبب اندر سبھا میں کبھی استعمال نہ ہوتے تھے بہت معمول پر پردے چادروں کی دھنکے ڈال دیے جاتے تھے تاکہ تماشا بین
 کو تماشا گاہ میں ایک تھمکا پردہ ہو جائے اور بہت قدر سہم ہے اسکو نذر پڑنے اور بہمن کے متعلق نہیں۔ م۔ م۔

انگی کامیابی دیکھ کر مداری لال نے ایک دوسری اندر سہا لکھی جو ادبی حیثیت سے تو امانت کی اندر سہا کی برابر نہیں ہے گو ڈراما کی حیثیت سے اس کے برابر یا اس سے بڑھ کر ہو۔ بعد کے زمانہ میں جب تھیٹر سیکل کمپنیوں کا دلچ ہو اب بھی اندر سہا کی مقبولیت میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا اور اس کو لوگ اور تماشوں سے ہمیشہ بہتر سمجھتے تھے۔ اُس کی مقبولیت اس سے ظاہر ہے کہ وہ دیوناگری۔ گجراتی۔ گورکھی اور اور مختلف زبانوں میں ترجمہ کی گئی اور اُس کے کم سے کم چالیس ایڈیشن انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہیں اُس کا ترجمہ جرمن میں بھی ہوا جو بمقام لیننرگ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اب سنا جاتا ہے کہ ایک نہایت عمدہ اور تنقیدی اوڈیشن اندر سہا کا لاہور سے نکلنے والا ہے۔

اُردو ڈراما اور پارسی ابتدا میں ہندو دیو مالا کے قصے بطور تماشے کے دکھلائے جاتے تھے انکو دیکھ کر چند پارسی نوجوانوں کے دلیں خیال آیا کہ کچھ قدیم ایرانی قصے جیسے رستم و سہراب وغیرہ کا ذکر و بھلت کیا نہ سہا کیے جائیں اور جھوٹ موٹ کے اسٹیج پر لوگوں کو دکھائے جائیں۔ ان تماشوں کو ایسے لوگوں نے بھی دیکھا جو یورپی تھیٹر دیکھ چکے تھے اور انکی نسبت اچھی رائے ظاہر کی۔ چند امیر پارسیوں نے جو کارباری قابلیت رکھتے تھے اس کام کی اہمیت کو سمجھ کر چند کمپنیاں بڑے بڑے شہروں میں مثلاً دہلی کلکتہ اور ممبئی میں انگریزی تھیٹر کی نقل میں قائم کیں۔ سب سے پہلی کمپنی سیٹھ سپن جی خرم جی کی تھی جنکو اردو اسٹیج کا ابوالا با سمجھنا چاہئے۔ یہ اردو خوب جانتے تھے بلکہ شو بھی کتے تھے رنگ اور پروین متخلص کرتے تھے اور نواب علی نقیس سے اصلاح لیتے تھے۔

اور جیل تھیٹر کمپنی رولنگ نبارسی انکی کمپنی کا نام اور جیل تھیٹر کمپنی تھی جہاں بہت عمدہ ایکٹ کرتے تھے اور نوجو شید جی بالی والا کاؤس جی کشاد و سہراب جی اور جہانگیر جی مشہور اکیٹر تھے۔ تماشوں کی زبان اردو تھی مگر لکھنؤ آڈولی کی خالص اردو زبان نہیں بلکہ ایسی زبان جو عام لوگوں کی سمجھ میں آسکے کمپنی جو کچھ تاجرانہ عرض سے قائم ہوئی تھی لہذا تماشوں میں وہی زبان استعمال کی جاتی تھی جو ممبئی گجرات بنگال عرض ملک تمام صوبہ جات ہندوستان میں بخوبی سمجھ میں آسکے تماشے اندر سہا کی تقلید میں نظم میں ہوتے تھے سینہ زاسوجہ سے کہ کالون کو خوش آئند معلوم دین اس زمانہ کے ڈراما نگار رولنگ نبارسی اور میان جیسی متخلص نہ طریق تھے۔ رولنگ

بہی میں رہتے تھے اور انگریزی تماشوں سے بھی ترجمہ کرتے تھے۔ انکا ایک تماشہ "انصاف و شہادہ" زبان گجراتی میں ۱۸۷۵ء میں بہی سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ ظریف کے بہت سے تماشے ہیں جن میں بقیہ عصمت - خدا دوست - چاند بی بی - بلبل بیمار وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ جب فرازم جی بالی کہنی کا انتقال ہو گیا تو بالی والدہ اور کاؤس جی نے اپنی اپنی کہنیاں ملحقہ قائم کر لیں۔

دکٹر رینہا کہنی طالب بنارسی کی کہنی خورشید جی بالی والدہ کی قائم کردہ تھی اور اسکا تیسرا شمارہ کے مشہور دربار دہلی کے موقع پر موجود تھا۔ خورشید جی خود ایک بہت بڑے مشہور ایکٹر تھے اور اس فن میں ان کو کمال حاصل تھا۔ اور کامک پارٹ علی النصوص خوب کرتے تھے۔ انکی ایکٹنگ میں کسی قسم کا بازاری پن یا تکلف اور آدر نہیں معلوم ہوتی تھی اور نہ انکو شرم اور جھجک تھی جس سے شیکسپیر بھی مرعوب ہو جاتا تھا انکو اسٹیج پر دیکھتے ہی لوگ ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے۔ انکی کہنی میں اور مشہور ایکٹریہ تھے۔ رستم جی بس خورشید بس مہتاب۔ اور ایک بورہین س میری سنٹن جو ہندوستانی چیز میں بھی خوب گاتی تھی۔ یہ کہنی ایک زمانہ میں انگلستان بھی گئی تھی مگر اس کا وہاں بہت بڑا نقصان ہوا جو آخر میں بہی میں پودا کر لیا گیا۔

طالب بنارسی انشی بنایک پر شاہ طالب بنارسی اسکے ڈراما نگار تھے۔ طالب شعر بھی کہتے تھے اور تاریخ و ہروی کے شاگرد تھے انہوں نے فن ڈراما کو ترقی دی اور اسکی زبان اور معنائیں کو بھی درست کیا۔ انکا انتقال ۱۹۱۵ء میں ہوا۔ انکا ایک ڈراما میل دہار ہے جو لارڈ لٹن کی اسی نام کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے اس میں مترجم نے اصل کتاب کی خوبصورتی کو بہت کچھ قائم رکھا ہے انکی دیگر تصانیف یہ ہیں۔ درم و دلاس۔ دلیر دل شیر۔ نازان۔ نگاہ غفلت۔ ہر شہنشاہ۔ گولی چند۔

دکٹر رینہا کہنی کی کہنی کے مقابلہ میں الفریڈ تھیٹر سیکل کہنی قائم ہوئی جسکو کاؤس جی کھانا دے قائم کیا تھا۔ ہندو خورشید جی کے جو ایک بڑے کامک ایکٹر تھے۔ کاؤس جی ایک مشہور ڈراما ایکٹر تھے اپنی جذبات درد و غم دکھانے کے استاد تھے۔ انکو لوگ ہندوستان کا ارونگ کہتے تھے جو حق بجانب ہے یہ شیکسپیر کے رمیوا اور ٹیمپسٹ کا پارٹ خوب کرتے تھے

اور نسل خورشید جی کے یہ بھی کامل الفن تھے۔ مرض ذیابیطس میں بمقام لاہور سلاسلہ عین انتقال کیا
انکی کمپنی کے مشہور لکچر پیئر شاہ۔ گلزار خان۔ مادھورام۔ ماسٹر موہن ماسٹر پیچیر جی۔ مس زمرہ اور
مس گوہر بھین۔ انکے انتقال کے بعد انکے بیٹے جہانگیر جی نے تھیں چار پانچ سال تک چلایا اور پھر
مملکت کے مشہور تاجر ماسٹر میڈن کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ میڈن کا انتقال سلاسلہ عین ہوا۔

احسن لکھنوی الفرد لکھنوی کے سب سے پہلے ڈراما نگار احسن لکھنوی تھے جنکا نام سید ممدی حسن ہے
اور حکیم ذاب مرزا شوق مشہور مصنف زہر عشق و بہار عشق وغیرہ کے نوے ہیں۔ احسن صاحب نہ صرف ایک
کامل ڈراما نگار بلکہ ایک شاعر خوش گو اور بہت اچھے موسیقی دان بھی ہیں۔ انکی ڈراماؤں کی زبان نہایت
فصیح اور بامحاورہ ہوتی ہے اور کیون نہ کہ زبان دان ہیں۔ انکی ایک مشہور تصنیف واقعات انیس
ہے جہین میر انیس مرحوم کے حالات زندگی نہایت صحت اور عمدگی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں ڈراما
تصانیف یہ ہیں۔ فیروز گنار۔ چند راولی۔ دلفروش۔ بھول بھلیان۔ بکا ولی۔ چلتا پرزہ۔

بتیاب دہلی احسن کے بعد الفرد لکھنوی کی ڈراما نگاری کی خدمت پیڈت نراین پرشاد بتیاب
دہلی کو سپرد ہوئی جو پیڈت ڈھارے کے بیٹے اور فن شعر میں سرور محمد خان طالب شاگرد غالب
کے شاگرد تھے کبھی کبھی اپنا کلام نظیر حسین سنی کو بھی دکھاتے تھے۔ کمپنی میں باقاعدہ کام کرتے اور میڈی میں
رہتے تھے۔ اک رسالہ موسوم بہ شیکسپیر نکالتے تھے جہین استاد زمانہ کے مشہور ڈراموں کا ترجمہ چھپتا تھا۔
یہ اب بند ہو گیا ہے۔ تصانیف حسب ذیل ہیں۔ قتل نظیر۔ مہا بھارت۔ زہری سانپ۔ فریب محبت۔ بلاین
گورکھ دھندا۔ پٹنی پرتاب۔ کرشن سدا۔ "قتل نظیر" پہلا تماشہ تھا جو بتیاب نے کمپنی کے واسطے تیار کیا تھا
اسکی مقبولیت کی شاید یہ چیز بھی ہمکلاس زمانہ میں دلی کی ایک زندگی نظیر نامی ماد ڈالی گئی تھی جسکا چرچا
لوگوں میں پھیلا ہوا تھا۔ "مہا بھارت" کا تماشہ سب سے پہلے سلاسلہ عین بمقام دہلی دکھلایا گیا جو
بہت مقبول ہوا اور اب بھی لوگ اسکو بہت پسند کرتے ہیں۔ بتیاب اس میں بڑی مہارت رکھتے ہیں
کہ مہا بھارت وغیرہ ہندوؤں کے مذہبی کتابوں سے جو دلچسپ مقامات کا خزانہ ہیں ضروری ضروری
دلچسپ واقعات چن لیتے ہیں اور انکو نہایت عمدہ اور دلفریب طریقے سے ڈراما کا جامہ پہناتے ہیں۔

انکو ہندی میں بھی بڑا عبور ہے اور انکے ہندی دوسے اور گیت نہایت شیریں اور موثر ہوتے ہیں انہوں نے متعدد تاریخی واقعات کو شلا درود پی کا دھالچ سری کرشن جی کی خون بہتی انگلی باہر سے اکیسواٹھ اپنی ساری پھاڑ ڈان اور سید اور چیتا چارون کا قصہ وغیرہ نہایت اسادی اور حسن سے اپنے ڈراموں میں باندھا ہے۔ وہ میں جس میں ساری پھاڑ نادکھایا گیا ہے بعض نکتہ چین اسکو خلا قواعد فن اور خلاصہ تہذیب خیال کرتے ہیں مگر اس میں کوئی قباحت نہیں بلکہ اس سے انتہا درجہ کلمہ اعتقاد اور محبت اور سری مہاراج کی عظمت کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ ایک اور اعتراض اُن کے تماشون پر یہ کیا جاتا ہے کہ جنت و دوزخ وغیرہ نہایت بھڑے ہیں اور دنیاؤسی طریقہ پر دکھلائے جاتے ہیں۔ اُنکے ڈراموں کے زبان بھی ایک حد تک ضرور قابل اصلاح و ترقی ہے۔ انکے بیان شرمیلی کی بہتات ہے جو بعض وقت بہت بُری معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح ہندی اور سنسکرت الفاظ کا کیا اور عربی الفاظ کے ساتھ بہت بُرے اور بے میل معلوم ہوتے ہیں اور کانون پر گران گزرتے ہیں اشعار بھی موقع و موقع مکالمے میں استعمال ہوتے ہیں اور بعض وقت بچ و غصہ کے موقع پر بھی شعری پرچہ جاتے ہیں جو بالکل خلاصہ فطرت چیز ہے۔ مگر اوجہ ان سب کیوں کے قیاب نے ڈراما نگاری میں توسیع اور ترقی ضرور کی بعض نئی افین یہ بھی کہتے ہیں کہ قیاب چونکہ آریہ سماج سے تعلق رکھتے ہیں ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں جو سائنس دہرمیوں کو ناگوار اور نا پسند ہوتی ہیں مگر ہمارے نزدیک اس کی کچھ اصل نہیں ہے۔ اگلی تماشون کے شہرت زیادہ تر اس وجہ سے بھی ہوئی کہ مشہور حسین عورتیں بہن تماشہ کرتی تھیں جنہیں یہ کہتے تھے کہ عین اور انکے کہ کٹر زبردست ہوتے ہیں اور وہ اصول ڈراما کو خوب سمجھتے ہیں۔

یونانہ ڈکینی آنا مشہور شہری ایک شخص محمد علی انڈیا می نے ایک سری کہنی الفرد کپنی کے طرز پر کولی اور اسکا نام نیو انڈیا رکھا مشہور کامیاب کیشہر سہراب جی اسکے منجر تھے جو بد کو شریک بھی ہو گئے۔ یہ کہنی اور ہر آؤ ہر بھر کے آخر کار احمد آباد میں قتل طور سے قایم ہو گئی۔ جہاں علی جو بعد کو جو ملی کہنی میں چلا گیا اور امت لال کیشو اسکے مشہور ایک شہر تھے۔ امت لال کا سس گوہر کے ساتھ تعلق ہو گیا تھا

اور یہ دون آدمی آخر میں پارس تہک منڈی میں چلے گئے جسکے مالک فرام جی اپنے امر لال کو اپنی کمپنی کا منیجر بنا لیا اور امرت لال نے چند اور آدمیوں کی شرکت سے اپنا ڈراما امرت لال امر لال کا انتقال اپنی بے اعتدالیوں کی وجہ سے عین جوانی میں ہو گیا۔

آغا حشر کشمیری آغا حشر کشمیری الاصل ہیں۔ مگر عرصہ سے ان کا خاندان بہارس میں مقیم ہے اور مثال کی تجارت ہوتی ہے۔ حشر کی ولادت امرت میں ہوئی۔ وہ نہایت ذکی الطبع آدمی ہیں۔ انہوں نے بہت سے تماشے نیوالفریڈ کے واسطے تحریر کئے جنکے پلاٹ زیادہ تر یورپی ڈراموں سے لئے گئے اور کچھ ڈرامے انکی مستقل تصنیف بھی ہیں۔ نیوالفریڈ سے ترک تعلق کے بعد انہوں نے اپنی ذاتی کمپنی موسوم بشکسپیر تھیٹر کھلی جو نقصان اٹھا کر تھوڑے ہی دنوں میں بمقام سیال کوٹ بند ہو گئی۔ اسکے بعد حشر کلکتہ چلے گئے اور میڈن کے یہاں ایک معقول تنخواہ پر ظلم کیٹر ہو گئے۔ مگر اب بھی وہ کبھی کبھی کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ بعض مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں: شہید ناز مرید شک۔ اسیر حرص۔ ترکی حور و بصورت بلا سفید خون وغیرہ بعض ہندی ڈرامے بھی لکھے۔ مثلاً سور داس۔ سیتا بن باس۔ گنگا اترن وغیرہ۔ آغا حشر کو لوگ اردو ڈراما کا مارو کہتے ہیں کیونکہ انکے یہاں مارو کا رنگ بہت ہے۔ وہ اپنے گیر کڑوں میں دو جذبات دکھاتے ہیں انکا عشق بہت گہرا اور ان کے جذبات بہت عمیق ہیں۔ وہ نشر و نظم دونوں کے استاد ہیں اور ان کا انداز بیان ایسا کہ خوب معلوم ہوتا ہے جب کہ دو گیر کڑوں سے جو ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں آپس میں مکالمہ کرتے ہیں۔ اس قسم کے سین آپ کو اسیر حرص۔ خوبصورت بلا اور سور داس میں ملینگے۔ آغا حشر کی ڈراما نگاری میں عیوب بھی وہی ہیں جو ان میں ہیں۔ یعنی جذبات کی شدت نہ کہ لطافت۔ اور فوق البہرہ رنگ بجائے اسکے رنگ ہلکے ہوں اور انہیں تال میل کا خیال ہو۔ ان چیزوں کا اثر نازک اور حساس دماغ پر بہت پڑتا ہے علی الخصوص ایسے سین جنہیں قتل و غارتگری وغیرہ دکھائی جاتی ہے۔ آغا حشر پر یہ بھی اعتراض ہے کہ ایک ہی تماشے میں دو مختلف پلاٹ قائم کرتے ہیں جس سے توجہ منتشر ہو جاتی ہے اور خاتمہ میں کمزوری اور بے راہروی پیدا ہوتی ہے۔ اکثر جاگیر شعرا کو ایشن پر ترجیح دیتے ہیں یا اشعار کو محض حسن بیان کے طور پر لکھتے ہیں

جو انمول ڈراما نگاری کے خلاف ہے۔ کبھی کبھی داسیات اور سوتیانہ دلگی اور مذاق شامل کیا جاتا ہے جس سے سین کا اثر جاتا رہتا ہے بعض اوقات بیان واقعات میں عجلت کیجاتی ہے جس سے ایکشن پر برا اثر پڑتا ہے۔ مگر باوجود ان تمام عیوب کے آغا صاحب ایک مشہور شخص میں اور انکی نصیحتیں اُردو ڈراما میں اعلیٰ درجہ رکھتی ہیں۔

دوسری کمپنیاں [مذکورہ بالا کمپنیوں کے علاوہ جو کمپنیاں قائم ہوئیں انہیں سے بعض مشہور کے نام ہم بیان کھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ (۱) اولڈ پارسی تھیٹر کل کمپنی۔ گزشتہ صدی کے آخر میں قائم ہوئی تھی سترہویں لاہور میں جل گئی۔ مگر اپنے مالک آرڈر شیرجی کی قابلیت اور حسن انتظام کی وجہ سے پھر دوبارہ قائم ہوئی (۲) جوہلی کمپنی دہلی اسکودلی کے ایک امیر آدمی نے عباس علی ایکٹر کے زیر اہتمام قائم کیا تھا۔ اس میں عباس علی گورد زریں اور جام جہان نائین پارٹ کرتے تھے۔ (۳)۔ بھارت دیا کل کمپنی میرٹھ اس میں بدھ بھگوان کا تماشا خوب ہوتا تھا تھوڑے عرصہ کے قیام کے بعد احمد آباد میں ختم ہو گئی (۴) امپریئل کمپنی اور (۵) لایٹ آف انڈیا انہیں حافظ محمد عبداللہ اور مرزا نظیر بیگ اکبر آبادی تاشہ کرتے تھے۔ حافظ عبداللہ کے بعض تماشوں کے نام یہ ہیں جشن پرتان اسٹار سسٹم۔ ستم بان وغیرہ۔ اور مرزا نظیر بیگ نے ملحدین بہار عشق۔ فساد عجائب۔ ماہی گیر وغیرہ کھئے۔

سولہویں صدی کے مشہور [علاوہ مذکورہ بالا ڈراما نویسوں کے اس زمانہ کے بعض ڈراما نویس جنکی ذرا نویس [قصائد صفت کتب خانہ انڈیا آفس میں بھی محفوظ ہیں یہ ہیں غلام حسین لطیف صاحب آباد سنیوت مشہور تھے عبد الوحید تیس جنہوں نے سنجی مدنیٹ بدادر جلسہ پر شان کھٹا فقیر محمد بیگ مصنف انجمن صحت دہلی وغیرہ۔ دینیر فیروز شاہ نوان مصنف بھول بھلیان ترجمہ شکیبیر۔ حمد حسن۔ انصاف بھیل بیچارہ میر کریمت اللہ میر عبد الماجد و مقصود علی۔ امراؤ علی مصنف البرٹ بل مارڈوین سب سے پہلا سیاسی ڈراما وجہ ترجمہ جیلٹ۔

سولہویں صدی کے [۱] منشی غلام علی دیوانہ الگزنڈر تھیٹر کل کمپنی میں میں نمایاں کردہ

اور مہرجیا۔ انکے تماشے ہیں۔ (۲) منشی محمد ابراہیم محشر انبالوی۔ حشر کے شاگرد ہیں اور آتشیں ناگ
نگاہ ناز خود پرست وغیرہ کے مصنف ہیں (۳) منشی رحمت علی مصنف درد جگر باد فاقا قاتل وغیرہ
پہلے البرٹ تھریٹر کل کمپنی کے منیجر تھے۔ اب پارس تھریٹر کل کمپنی کے ڈائریکٹر ہیں (۴) دوار کا پرشاد
افق مصنف رام نائک جو ایک بہت طویل ڈراما ہے (۵) مرزا عباس مصنف نور جہان و شاہی فرمان
وغیرہ (۶) آغا شاعر دہلوی شاگرد داغ مصنف حور حبت (۷) و (۸) لال کش چند زیاد لالہ نائک چند
ناز۔ یہ دونوں پنجابی ہیں اور اکثر ڈراموں کے مصنف ہیں جنہیں غیر مانوس ہندی الفاظ کی کثرت ہے
(۹) لالہ کنور سین ایم اے چیف جسٹس ہائیکورٹ کشمیر سابق پرنسپل لا کالج لاہور۔ ڈراما کے مشہور
نقاد ہیں۔ انکا ڈراما برہانڈا نائک بہت عمدہ ہے اس میں آسانی ستاروں کے کیرکٹر دکھائے گئے ہیں۔
(۱۰) بشیر سہائے بیاگل مصنف بدھ دیو جو بہت مقبول ہوا اس میں شانتی رس یعنی قلبی اطمینان کی بہترین
تصویر کھینچی ہے۔ یہ ان عیسوی پاک ہیرو اُردو کے اکثر ڈراموں میں پائے جاتے ہیں۔ بیاگل بھارت بیاگل
کمپنی کے روح رواں تھے جو میرٹھ میں قائم ہوئی تھی اور ایک زمانہ میں شمالی ہندوستان کی کمپنیوں میں
بہت مشہور تھی اور اسکی خصوصیت یہ تھی کہ اسکے اکثر ایکٹر بڑے لکھے اور اچھے طبقہ کے لوگ تھے۔ علیٰ طر
اس کمپنی کا ایک مشہور ایکٹر تھانسی جانیشر پشاد بایل دہلوی ایڈیٹر رسالہ زبان نے اس کمپنی کی واسطے
دو تماشے چندر گپت اور تیغ تم تیار کئے تھے۔ (۱۱) حکیم احمد شجاع بی اے ایسٹنٹ سکرٹری لکھنؤ
پنجاب ایڈیٹر رسالہ ہزارستان ایکلچے انسانہ نگار اور ڈراما نویس ہیں۔ باپ کا گناہ۔ بھارت کا لالہ۔
جانباز وغیرہ کے مصنف ہیں۔ مگر ان کے ڈراما ایڈیج پر اچھے نہیں معلوم ہوتے (۱۲) سید امتیاز علی بی اے
مصنف انارکلی ودلہن وغیرہ۔ بالفعل ریسین کے الگزمینڈر کا ترجمہ کر رہے ہیں (۱۳) سید دلاور علی شاہ
مصنف پنجاب سیل معمولی ڈراما ہے (۱۴) خان احمد حسین مصنف حسن کا بازار وغیرہ (۱۵) رادھے شام
اکثر مذہبی ڈراما۔ لکھے ہیں جو اہل ہندو میں بہت مقبول ہیں (۱۶) سدرشن خبا و فکر اور پوچکا ہے۔
ادبی سیاسی اور سوشل ڈراما اردو میں ادبی ڈراموں کی بہت قلت ہے مگر پھر بھی حسب ذیل کتابیں
قابل ذکر ہیں سیکفرن اور لوسی۔ اور قاسم دزہرہ مولفہ شوق قدوائی۔ شہید دفا مولانا خرم جرم

دکرم اسی مترجمہ مولوی عزیز نام مرحوم دوس دجا پان مولفہ مولوی ظفر علی خان - تسمیر فرانس جو یکسیر
 کے ہنری خامس کا ترجمہ ہے اور جولیس سیزر مترجمہ سید فضل حسین نصیر خشی جلالا پرشاد برقی کے یکسیر
 کے اکثر ناموں کے ترجمے حسین معشوقہ فرنگ روہیو جیوٹ کا منظوم ترجمہ ہے۔ بیادری مولفہ حکیم اظہر صاحب
 ایڈیٹر تحریک - ان کے علاوہ فشی محمد مرصاحب مترجم انیکورٹ جیون کشمیر اور فشی نور الہی نے جو نامک
 ساگر کے مشہور مصنف ہیں جو تمام ملکوں کے ڈراما کی ایک بسوطا گو سید قدرناکمل تاریخ ہے اور اس سے اس
 باب میں بہت کچھ مدد لی گئی ہے۔ اکثر صیف اور دلچسپ ڈراموں کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ انکی یہ کوشش
 نہایت قابل تعریف ہے اور ان دونوں اصحاب کو اس فن میں خاص مہارت ہو گئی ہے۔ اور ہر کوئی
 ہے کہ زیادہ تجربے کے ساتھ یہ زبان پر پوری قدرت اور فن ڈراما نگاری میں عبور حاصل کر لینگے۔
 انکی بعض تصانیف حسب ذیل ہیں (۱) روح سیاست جہین امریکہ کے مشہور پریسیڈنٹ ابراہم لنکن
 کی زندگی کے حالات اور مقصد نہایت خوبی سے ڈرامے کی صورت میں دکھایا گیا (۲) جان ظرافت فرانس
 کے مشہور ڈراما نویس بری کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے جہین کو جسون کی بہت خبر لی گئی ہے (۳) تفریق -
 مشہور جرمن شاعر اور ڈراما نویس شلر کی کتاب کا ترجمہ (۴) بگڑے دل مولی کی ایک دوسری کتاب کا
 ترجمہ (۵) ظفر کی موت - شیر لنگ کے ایک ڈراما کا ترجمہ۔

سوشل ڈراموں کے ذیل میں مولوی عبدالماجد صاحب دیابادی کا دو ڈراما جہین کم عمری
 کی شادی کی تباہی دیکھائی میں قابل ذکر ہے۔ پندت برج سوہن ڈراما تریغنی ایم۔ اے۔ جو ایک نئے شکل
 شاعر اور بہت بڑے مضمون نگار ہیں ڈرامے سے بھی ایک خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ بالفضل کشمیر میں سسٹنٹ
 تھارن سکریٹری کے عہدہ پر متنازع ہیں۔ راج ولاری اور ماری دادا آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔
 راج ولاری پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے منظور ہو گئی ہے سر کنور سین مشہور نقاد ڈراما ان دونوں
 کتابوں کی نسبت لکھتے ہیں یہ دونوں نثر ڈرامے ہمارے موجودہ سوشل اور خانگی زندگی کے بہترین
 نمونے ہیں انکے لکھنے کی غرض اصلاح معاشرت ہے اور تعلیم یافتہ مہندستان کو چاہئے کہ ان کو پڑھا
 آئندہ اخلاق کچھین ان میں طبقہ متوسط کے مردوں اور عورتوں دونوں کے صحیح خیالات و جذبات اور

بیزان کے نقابیں اور کردیاں اور ان کے عادات نہایت کامیابی سے دکھلائے ہیں طرز تحریر بہت متروخ زبان بامحاورہ، اور خیالات بہت پاک و صاف ہیں انکو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جین آسٹن کے نادولن کو برناؤ شائے ڈراما کا جامہ پہنا دیا ہے البتہ لائق مصنف میں اتنی کمزوری ضرور ہے کہ اپنی آزاد خیالی کو اسکی منطقی حد تک نہیں پہنچایا ہے۔ مولانا خرم روم نے میوہ تلخ پر وہ کی سختی کی خرابی نہ پر لکھا۔ غرض کہ زمانہ موجودہ میں متعدد ڈراما انہیں معاشرتی مسائل پر لکھے جاتے ہیں جنہیں ضحنا یا صراحتاً مغربی تہذیب کی حد سے زیادہ تقلید کا خاکہ اڑایا جاتا ہے۔

سیاسی صنف میں منشی امرو علی کا ڈراما البرٹ بل جو ۱۸۹۹ء میں بمقام لاہور شائع ہوا تھا یعنی اسوقت جبکہ مشہور البرٹ بل پر سخت مباحثہ ہو رہا تھا اور نیز ایک اور ڈراما جبین انڈین نیشنل کانگریس کے مقاصد کو بیان کیا ہے سیاسی ڈرامے کہے جاسکتے ہیں مگر یہ کوئی دلچسپا درو قیع تصانیف نہیں ہیں۔ اسطرح ترک موالات کے عروج کے زمانہ میں بہت سے نام نہاد ڈرامے سیاسی مسائل پر لکھے گئے اور ممنوع ہو گئے۔ انہیں سے کوئی قابل ذکر نہیں الا وہ جو منشی کشن چند زیان نے نجی پنجاب کے نام سے لکھا تھا۔

اُردو ڈراما کی ترقی میں جیسا اوپر بیان ہوا اندر بہا سے اُردو ڈراما کی بنیاد پڑی مگر یہ رہس کے طرز پر مختلف لوگوں نے کیا حصہ لکھی گئی نہ تو اس میں کوئی منظم پلاٹ ہے اور نہ صحیح معنوں میں کیرکٹر ہیں۔ اس کے بعد ظریف نے جدید رنگ کے ڈراما کی بنیاد ڈالی یا کم سے کم اسکی ترقی و اشاعت میں کوشش کی انکی تصانیف کی وجہ سے زبان ہندوستانی یعنی اُردو کی ہندوستان کے مختلف حصوں میں جہاں ان کے ڈراما کھیلے گئے، شہرت ہوئی لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ظریف کی غرض صرف دلچسپی اور تفریح تھی ان کے ڈراما ادبی حیثیت سے ممتاز نہیں ان کے پلاٹ اور کیرکٹر بہت کمزور ہیں انکی تحریر میں استاد ہی نہیں پائی جاتی نشر و نظم دونوں ابتدائی رنگ کی اور ناقص ہیں۔ حافظ عبداللہ اور مرزا فیض بیگ نے ظریف کی پیروی میں اپنے تماشوں میں دو دو پلاٹ الگ الگ قائم کئے۔ ان کے بعد طالب احسن نے اس فن کو ترقی دی اور زبان کو بھی ایک حد تک بہت درست کیا انہوں نے دو پلاٹوں کو ایک

کر دیا اور اسی پلاٹ میں بعض کیرکٹر دن سے سفرہ کا کام لیا یعنی کو میڈی کو بھی اسی قصہ میں شامل کیا
 معمولی گفتگو مفصلی نہیں ہوتی تھی اور نظم گیتوں کے واسطے مخصوص کی گئی کبھی کبھی گفتگو میں بھی انکو
 زور دار اور مؤثر کرنے کے لئے شعر استعمال کئے گئے گیت زیادہ تر ہندی زبان میں ہونے لگے اور
 اب ڈراما اوپر کی حد سے نکل کر صحیح ڈراما کی حد میں آ گیا کیرکٹر سازی، ایکشن اور اختتام قصہ پر زیادہ توجہ
 کی گئی۔ طالب نے سب سے پہلے فارسی الفاظ کی ہندی میں آئینش کی جستری بھر دی طریقہ یعنی ایک قصہ
 میں دو پلاٹوں کا اختیار کیا انکے خصوصیات کا بیان ان کے حالات میں مختصر ہو چکا ہے۔ بقیاب کی
 شہرت انکے دو مشہور ڈراموں مہابھارت اور رامین سے ہوئی جسکے کیرکٹر مشہور سنسکرت شاعر ساس سے
 لئے گئے جسکی تصانیف اپنی مجموعیت اور رنگینیت سے بہترین ڈراما کی جاسکتی ہیں۔ بقیاب کے نقابیں
 گو شہر سہائے نے اپنے ڈراما بدھ دیو میں دو کرنا اسکی زبان کو اعلیٰ درجہ کی ہمارا اردو نہیں ہے مگر
 پھر بھی بہت زور دار زبان ہے جہیں ہندی الفاظ کی کثرت ہے خیالات بہت پاکیزہ اور انداز بیان
 بہت دلکش ہے۔ سٹرکٹور میں نے اپنی کتاب برہانظہ نامک میں علم ہیئت یعنی ستاروں سے
 کام لیا اور ذاتی چری استاد ی اور خوبی سے ترتیب دیا۔ کیفی صاحب نے سوشل سائنس میں پر ڈراما لکھے
 "نور وطن" اور اتفاقاً باشبہ سیاسی ڈراما جن نامک ڈراما کا بھی اب رواج ہو چلا ہے اور یہ زیادہ تر
 مشہور مشہور رنگائی نامکوں کے ترجمے ہیں انکے علاوہ ہندو دیوالا اور ہندوستانی تاریخ بھی بہت کچھ
 مواد آجکل فراہم کر رہی ہے اور مغربی ڈراموں کے ترجمے بھی کثرت ہو رہے ہیں۔ اسی بنا پر کہا جاسکتا ہے
 مگر اردو ڈراما بہت کچھ ترقی کر رہا ہے۔

اردو ڈراما کے دیرینہ غلام ہونے کے سبب ہم اوپر بیان کر آئے ہیں یعنی یہ کہ سنسکرت
 اور ہندی نامک نڈال میں کیرکٹر رک ہو چکے تھے اسکے علاوہ سنسکرت نامکوں کے جو ترجمے بڑے
 جیسے قابل انگریزوں مثلاً سر دیو جی سن۔ پروفیسر ولسن اور وزیر ولسن نے کئے تھے وہ انگریزی ڈرامین
 ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کی سمجھ سے باہر تھے جو اردو ڈراما لکھتے تھے اور یہ لوگ انگریزی کے ساتھ
 سنسکرت سے بھی ناواقف تھے اور نہ اسکے جاننے کے خواہشمند تھے۔ لہذا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ

اُردو ڈراما کا صحیح وجود اسوقت ہوا جب کہ اہل مغرب کا اثر اس ملک پر ہونے لگا۔ اسکے بعد البتہ سنکرت ڈراموں نے بذریعہ انگریزی تراجم فائدہ اٹھایا جانے لگا۔

ابتدائی ڈراموں کے نقائص شروع میں ڈرامے کی بالکل ادبی حیثیت نہ تھی بلکہ وہ محض فائدے کی غرض سے لکھے بھی جاتے تھے اور لکھے بھی جاتے تھے۔ پارسی لوگوں نے جو تجارت کا خاص مذاق رکھتے ہیں اس کام کو ایک کاروبار کی حیثیت سے اختیار کیا اور جب انکی کمپنیوں کو کامیابی ہوئی تو تماشے بھی بکثرت لکھے جانے لگے جنکے ماخذ حبیب اور پرندہ پرست پرانے قصے اور افسانے انگریزی ڈراموں کے ترجمے بھی کچھ تھے۔ تماشے کی عمدگی اور تکمیل کا خیال مطلق نہیں رکھا جاتا تھا۔ کسی پرانے قصہ کے واقعات کو توڑ مڑ کر اور کچھ اشعار بطور گیت کے اور کچھ مذاق کی باتیں سنیں جو ٹکر تماشیاں رکھ لینا بس یہی کافی تھا۔ ڈراما نگار بھی اسوقت کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے زیادہ تر لکھنؤ میں سے یا ان لوگوں میں سے جنکو اس قسم کے تماشے دیکھنے کا شوق ہوتا تھا یہ لوگ منتخب کر لئے جاتے تھے۔ کبھی کبھی ایسے لوگ رکھ لئے جاتے تھے جو بیخبروں کی ہدایت کی موافق جلد بجد تماشے تیار کر دیا کرتے تھے۔ نفس ڈراما میں یہ خیابان ہوتی تھیں کہ انکے عبارت بہت سست ہوتی تھیں اشخاص ٹہا ہجائے معمولی طریقہ کے اشعار میں گفتگو کرتے تھے اور بعض اوقات غزلین کی غزلیں اس قسم کی گفتگو میں شامل ہوتی تھیں اور اشعار بھی اعلیٰ درجہ کے ہوتے تھے بلکہ نہایت معمولی اور ہمزہ۔ نہ بھی انتہاء درجہ کی مصنوعی اور غیر مکمل۔ پلاٹ اور کیڑا کھینچتے نہیں ایکشن نہایت ناہموار سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ طریقی اور کامیابی کا کبھی میل نہیں ہو سکتا ایک ہی پلاٹ میں شامل کر دی جاتی تھیں۔ اخلاقی نقطہ نظر سے بھی ڈرامے نہایت ہی اونے درجہ کے ہوتے اور مہذب اور متین لوگوں کے دیکھنے کے لائق ہرگز نہیں ہوتے تھے۔ بوسہ بازی، گلے ملول اور خوش گفتگو بے تکلف جائز تھی۔ بلکہ اس سے ہم کرے کٹ والے بہت خوش ہوتے تھے۔ ایکٹریس عورتیں زیادہ تر اونے درجہ کی زندگیوں ہوتیں قتل و خونریزی کے سین بے تکلف پیش کر دکھائے جاتے کامک پارٹ اور نقلین وغیرہ نہایت اونے درجہ کی ہوتی تھیں غرض کہ فن ڈراما جن اعلیٰ عناصر سے مرکب ہے وہ بالکل ناپید تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد انگریزی ڈراموں نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور شیکسپیر کے تماشے لوگوں کو بہت پسند آئے انہیں سے اکثر ترجمہ کے ذریعہ سے اشیع پر دکھائے جانے لگے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک میں بھی اصلیت کی تھلک تک نہیں معلوم ہوتی تھی۔ انکی مقبولیت اس وجہ ہوئی کہ بعض تاشوں کے چار چار پانچ پانچ ترجمے کیے گئے جن میں سے اکثر کا ذکر انڈیا آفس لائبریری کی فہرست میں موجود ہے ان ترجموں میں اشیا ص قصے کے نام ہو کر ہندوستانی مناسبت سے کچھ اور رکھ لئے گئے ہیں مگر اصلی کی طرح ترجموں کی سمجھ میں مطلق نہیں آئے مثلاً شیکسپیر کے مشہور تماشے ہیٹ میں وہ سین جین ہیٹ اپنے دل سے باتیں کرتا ہے مترجم صاحب بوجہ انگریزی جہانے کے اسکا صحیح مطلب بالکل نہیں سمجھ سکے مگر عبدالقدیر یوسف علی فرماتے ہیں انگریزی اشیع کا اثر ہندوستانی اشیع پر انکی بناوٹ اس کے سادہ سامان اس کے پر دون دھیر و سے پوری طرف ظاہر ہے۔ اردو ڈراما نے انگریزی ڈراما کی اندام و ہند تقلید و طریقہ سے کی۔ پہلے یہ کہ جدیدین و انگریزی ڈراما جو پراچین کہلاتے تھے اور جسکی غرض اصلی یہ تھی کہ سوسائٹی کے تمام پرانے رسم و رواج اور اخلاق و عادات کا خوب خاکہ اڑایا جائے انکی تقلید میں ابتدائی اردو ڈراما بھی اس معاملہ میں تمام پرانی چیزوں کی نسبت بہت آزاد و مہیاک ہو گیا۔ پس اس معاملہ میں انگریزی ڈراما نے اردو ڈراما کے ساتھ وہی کیا جو اٹالین ڈراما نے فرینچ ڈراما کے ساتھ اور فرینچ ڈراما نے عدد دستوریشن کے انگریزی ڈراما کے ساتھ کیا تھا۔ دوسرے ایک قسمی تقلید کی وجہ سے انگریزی دبستان ہندوستانی تھیٹر میں طالع بوگین گرنمایست ہونڈے طریقہ سے ایچ برٹن اور بری خرابی یہ ہوئی کہ اس قسم کی نئی دہنوں کے واسطے معمولی شعر لے نظمین بھی اسی انداز کی کہنا شروع کیں جسکا نتیجہ مناسبت سے سوزا گئے ہو گیا۔ یہ سب سب جیسے کوئی شخص کسی اردو شعر کو انگریزی دہن میں لکھنے اور چونکہ اس کو شش میں الفاظ ضرور ٹوٹ چوٹ جائیں گے لہذا ان کا مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ مترجموں میں نے بھی اس خیال کی تائید کی ہے۔ مگر ہماری دستان میں خرابی انگریزی اثر کے علاوہ اور چیزوں کا بھی نتیجہ ہے جسکا ذکر اوپر ہو چکا۔ بیٹے ایکسرون کا اونے طبقہ سے تعلق رکھنا۔ ڈراما نویسوں کی معمولی لیاقت۔ تماشائیوں کا اچھے بڑے میں امتیاز نہ کرنا۔ اور بالکل

تھیٹر کا اپنے نفع کی غرض سے اُن لوگوں کو خوش کرنا جن سے انہیں زیادہ آمدنی ہوتی ہے دوسری بات جو انگریزی دہنوں کے متعلق اوپر لکھی گئی یہ بالکل صحیح ہے اس سے دائمی ہندوستانی موسیقی کو جو نہایت سائنٹفک اور اعلیٰ درجہ کی ہے بہت بڑا نقصان پہونچا۔

موجودہ ڈراموں میں اصل و ترقی موجودہ زمانہ میں اردو ڈراما میں ایک نمایاں تغیر و ترقی دیکھی جاتی ہے۔ اردو ڈراما بہت تیز رفتاری سے ترقی کر رہا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اردو ڈراما پر یورپین ڈراما اور سنسکرت ڈراما اور انگریزی اور فرینچ ڈراموں کی ترنگہ نیز رنگالی گجراتی اور مرہٹی زبانوں کا بہت بڑا اثر پڑا۔ ایک شخص بنارس میں تھے جن کا نام بابو ہر شچند پر تھا۔ یہ بہارت اندر کے لقب سے مشہور تھے اور ہندی ناٹک لکھنے میں کمال رکھتے تھے۔ یہ سنسکرت سے پوری طرح واقف تھے اور مشہور کالیڈاس اور بھاسا جیوتی کے رنگ میں ان کا کلام ڈوبا ہوا تھا۔ یہ اپنے قصوں کے پلاٹ زیادہ تر پوراٹوں سے لیتے تھے جو دلچسپ ن اور فنانوں کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہیں۔ اور اب یہ سب کو تسلیم ہے کہ پلاٹ کی رستی اور قصہ کو خوبصورت بنادینے میں وہ عجب کمال رکھتے تھے۔ چونکہ یہ ہندی میں لکھتے تھے لہذا انکی تصانیف پر اس کتاب میں کوئی رائے زنی نہیں کی جاسکتی مگر اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ انکے تصانیف کا اثر اب بعد کے اردو ڈراموں پر بہت کچھ ہوا۔ مثلاً "راجہ ہر شچند" "رگینی سنگھ" "لبو اسٹیل" وغیرہ۔ بالفعل اردو ڈراما کے مضامین میں بہت توسیع کی جا رہی ہے۔ علاوہ اُن پرانے قصوں کے جن کا رواج اب تک تھا اب نہایت دلچسپ قصے سٹیج پر لائے جاتے ہیں۔ پولیس اور سوشل ڈراما بھی اب ترقی کر رہا ہے۔ قصوں کی عمدگی اور اخلاق آموزی میں بھی بہت کچھ فرق آ رہا عشق و عاشقی جو اسٹیج پر دکھائی جاتی ہے نیز وہ جذبات اور واردات قلبیہ جو کمیشن کے ذریعے سے دکھلائے جاتے ہیں بہت اعلیٰ ہوتے ہیں۔ نفسیات کی طرف زیادہ توجہ ہے۔ ڈراما کے مضامین اور سطح نظر بہت وسیع ہو گئے ہیں کیمرکٹر اور پلاٹ میں بھی ترقی ہے۔ ایکٹر دن کو اپنے افعال پر کافی توجہ دیتا ہے اور اب وہ پہلا سب سے کمپن انہیں نہیں ہے۔ خیالات اور الفاظ و وزن میں شستگی اور متانت کا لحاظ رکھا جاتا ہے نتیجہ کی عمدگی پر بھی کافی توجہ کی جاتی ہے۔ نقلوں اور کامک پارٹوں میں

وہ پہلے کی سی بد نظری اور پکڑ ہیں جو نفیس طبائع کو ہمیشہ ناپسند تھا اب نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ تعلیم اور جدید اردو ڈراموں میں اب زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔

اصلاح و ترقی کی ضرورت

مگر بائیں طرف اب بھی اصلاح و ترقی کی بہت کچھ ضرورت ہے خیالات اور زبان دونوں اب بھی بہت کچھ محتاج اصلاح ہیں۔ الفاظ میں ڈینگ ہونا چاہئے بلکہ سہویت اور اصلیت کا زیادہ خیال رکھا جائے تکلف اور تصنع سے عبارت بالکل خالی ہو۔ گفتگو کے موقع پر منفی عبارت کو معین حافظہ سہی مگر بے جوڑ معلوم ہوتی ہے اسکی جگہ بے تکلف سیدھی سادی بات چیت سے کام لیا جائے جیسا کہ موقع و محل کا تقاضا ہو۔ پلاٹ کی ترتیب تنظیم میں بھی بہت اصلاح کی گنجائش ہے۔ اسکے واسطے بہت ہوشیار اور چابکدست قلم چاہئے۔ مسخر اور مذاق کے موقع پر نفیس اور بہانہ زین سے بچنا چاہیے اور مذاق نہایت مستہر اور شائستہ ہونا چاہئے۔ اصلاح مرہبانہ بھی توجہ کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اصلی فن ڈراما نگاری سے ہمارے ڈراما نویس بھی آشنا نہیں ہیں اور ہمارے اسے میں یہ بات اسی وقت نصیب ہوگی جب کہ اس کام کو وہی لوگ کرینگے جو اس کام کے اہل ہیں اور جنکا قدرتی سیلان طبع اس طرف ہے۔ اردو ڈراما کی ترقی کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اس کا میدان عمل وسیع کیا جائے اور قابل اور اہل لوگوں کی بہت افزائی کی جائے۔ نیز یہ کہ بہترین یورپین اور انگریزی ڈرامے اور پچھلے سنسکرت، بنگ، ترجمہ کرائے جائیں۔ جسے ہمارے اہل وطن کو اصلی ڈراما کی حقیقت اور اسے آئندہ ترقی کا حال معلوم ہوگا۔ درود و تعین کے کہ یہ فن سر زمین گزشتہ زمانہ میں کس نہج تک پہنچ گیا تھا اور آج کل کی زندہ قوموں اور ملکوں میں اسکی ترقی کی کیا حالت ہے۔ اسی میں سے انکو اپنے ملک و اپنی سوسائٹی کے حسب حال جو چیزیں مناسب معلوم ہوں انکو کرنا چاہئیں مگر یہ غم نہ سب کہ ترقیوں کی کثرت سے طبع اور تصانیف و بے نہ جائیں۔ زمانہ حال کی ترقیوں کی اصلاح کے واسطے دھسپ اور شل تماشے مرتب کئے جائیں اور سوسائٹی ہی سے اس قسم کے مضامین لکھ کئے جائیں۔ اس فن کو بہتر حقارت نہ دیکھا جائے اور ہمارے علماء و فضلا اسکی تصنیف و تالیف کے ورپے نمونہ کیڑوں پر بھی ذلت کی نگاہیں نہ ڈالیں۔ ان کاموں کے واسطے زیادہ بہت اور زیادہ

سرپرستی کی ضرورت ہے پردہ کی موجودگی سے ہمارے ناولوں اور ڈراما میں جو بعض ریکب اور ذلیل باتیں پائی جاتی ہیں وہ یقیناً رسم پردہ اٹھنے کے ساتھ دور ہو سکتی ہیں کیونکہ موجودہ صورت میں سچے جذبات عشق کا اظہار ناممکن ہے۔ اگر کوئی شخص ہائیکری کا پیشہ اختیار کرے تو وہ ذات برادری سے خارج نہ کیا جائے۔ اسی طرح ڈراما نویس اور ایکٹر بھی اپنے اپنے پیشوں اور کاموں کو معزز سمجھیں۔

اردو ڈراما کا مستقبل ہر چند کہ مشین گو سچے نہیں سمجھے جاتے اور انکی رائے کو معتبر نہیں مانا جاتا مگر با انیمہ ہم یہ کہنے کے لئے تیار ہیں کہ اردو ڈراما اپنے لئے ایک روشن مستقبل رکھتا ہے جس طرح اس باب کی ابتدا مسٹر عبداللہ یوسف علی کے فاضلانہ مضمون سے کی گئی تھی اسی طرح اس کا اختتام بھی انہیں کے الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اردو ڈراما بہت زور دار ترقی کے آثار پیدا کر چکا ہے تعلیم یافتہ اور ذی دجا بہت لوگ یقیناً اس میں ایک زبردست وسیلہ قومی ترقی کا دیکھتے ہیں اور اسکی آئندہ منزل ترقی ہماری رائے میں وہی ہوگی جو ایران ایسے ملک میں ہوئی کہ جہاں صحیح فن ڈراما سے کوئی واقف نہ تھا یعنی تاریخی اور سیاسی ڈراما نگاری۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ایسے شاہکار جو شیکسپیر نے لکھے ہیں انکی تصنیف کے واسطے ابھی اک زمانہ درکار ہے اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انہیں کی سچی تقلید سے بہتر دستاویز صحیح ڈراما نگاری کا مادہ پیدا ہوگا اور اسی وقت اردو ڈراما دنیا کے بہترین ڈراموں کی صف میں ایک ممتاز جگہ پانے کا مستحق ہوگا۔

باب

زبان اردو کی جن خوبیاں اور اس کے متعلق بعض اہل اراکو کوئی قلمی رائے ہو کر ادب و ادب کا ایک خا کہ ابواب مذکورہ بالا میں کھینچی گئی اس باب میں زبان اردو سے بحث ہوگی نیز

یہ کراؤ ب اُردو کا بقا بلکہ دوسری ویسی زبانوں کے کیا مرتبہ ہے۔ اس باب کی ترتیب میں مولوی عبدالحی صاحب کے اس فاضلانہ مضمون سے بہت مدد لگی ہے جو وارڈن رپورٹ میں شائع ہوا ہے۔

اردو ایک فصیح اور شیریں زبان ہے

اور انھار مطالب کے لئے جڑی شہرت رکھتی ہے یہ تہذیب تمدن کی زبان ہے اور ناسمین خیالات اور حسیات کے نازک نازک فرق ادا ہو سکتے ہیں۔ چونکہ ناسمین اکثر دوسری زبانوں کے مخصوص الفاظ و حروف شامل ہیں مثلاً عربی فارسی ترکی سنسکرت وغیرہ لہذا یہ بہ نسبت دوسری زبانوں کے فوریہ تعلیم بننے والی خیالات کو اچھی طرح ظاہر کرنے اور تمدن و شائستگی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے زیادہ تر موزوں ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کی غماست ہے ہندو اور مسلمان دونوں سے اپنی اپنی قومی اور ملکی زبانوں کو چھوڑ کر اور

ایک تیسری زبان اختیار کر کے ایثار و اتحاد کی ایک تین مثال پیش کی اور یہ زبان گو کہ ہندوستان میں پیدا ہوئی مگر غریبی کے ذریعہ اس کی ترقی اور نشوونما کے باعث ہوئے لہذا اس سے بہتر علمی طور پر اتحاد کی تین شہوت نہ کوئی مائتقت تھا اور نہ ہے۔

بندہ وستان کی زبان عام ہے اور دھیمے معنوں میں ہندوستان ہر کی انگرازی کا دھیمے زبان عام ہے کیونکہ

ان مقامات میں بھی جہاں یہ بلی نہیں جاتی بھولی جاتی ہے۔ اور زبانوں کا یہ حال ہے کہ اپنے اپنے ملک
 ولس میں بولی کو سمجھی جاتی ہیں مگر دوسری جگہ ان کو سمجھنا دشوار ہے۔ مثلاً کشمیر میں اگر کوئی بولی جائے
 ہراتی اور سندھ میں نال تو جھلا لکھو کون سمجھے گا۔ مگر وہ زبان حکومندستان یا اردو کہتے ہیں ہر شخص اپنے
 ذاتی تجربے سے بتلا سکتا ہے کہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ اور چھپے چھپے میں بلکہ دروازہ کھلاں سے
 یہ بھی شائع شدہ زبان وغیرہ ملک میں یہ بے تکلف سمجھ لی جاتی ہے۔ ہم اپنے برادرانِ وطن سے
 معافی کے خواستگار ہیں اور کسی دوسری زبان کی توہین یا بُرائی نہیں کرنا چاہتے مگر اصل یہ ہے کہ تمام
 غیر لسانی زبانیں زیادہ سے زیادہ کسی ایک صوبے کی مخصوص زبان کسی جاسکتی ہیں اور ہر ایک
 ان الاقوامی اور صوبہ کی زبان مان لی جائے گی۔ اور چونکہ ہم دوسری زبانوں میں بہت سے اردو الفاظ

شامل ہیں اور اب اور زیادہ ہوتے جاتے ہیں لہذا ان مقامات کے رہنے والوں کو بھی جہاں اردو عام طور پر نہیں بولی جاتی اسکے سمجھنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا۔

ایک وسیع زبان ہے اردو ایک نہایت وسیع زبان ہے اور اس میں متعدد زبانوں کے الفاظ بہ کثرت شامل ہو گئے ہیں جس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ نئے الفاظ و اصطلاحات کے بنانے میں آسانی ہوتی ہے۔ مثلاً آجکل کے اردو لکھنے والے اگر مغربی سائنس پر کچھ لکھنا چاہیں تو وہ عربی فارسی سنسکرت اور انگلش وغیرہ سے بے تکلف الفاظ لے سکتے ہیں اور انکو ایک ضروری تفسیر اور مناسبت زبان کے ساتھ اپنا کر سکتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ آجکل عربی سے زیادہ استعارہ کیا جا رہا ہے جس سے کیفیت زبان اردو و مورد الزام اور غیر مطبوع ہوتی جاتی ہے۔

بعض یورپین محققین کی رائے میں صاحب مصنف "انڈین فلا لوجی" حسب ذیل رائے دیتے ہیں "میں اردو کو ایک نہایت ترقی کرنے والی اور شائستہ صورت اس بڑی اور وسیع زبان کی سمجھتا ہوں جو ہندوستان میں رائج ہے۔ اردو نہ صرف ایک وسیع فصیح معنی خیز اور جامع زبان ہے بلکہ یہی صورت ایک صورت ہے کہ جمین دریا کے گنگ کے قریب کی رہنے والی قومیں اپنی زبان کی ترقی ایک صحیح طور پر دکھلا سکتی تھیں" (دیکھو جرنل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی جلد ۳۷ متعلق ۸۶۶ صفحہ ۱) مشہور فرینچ مستشرق "گارسن ڈی ٹامی" لکھتے ہیں "اردو کی ہندوستان بھر میں وہی پوزیشن ہے جو فرینچ (فرانسیسی زبان) کی یورپ میں ہے۔ یہی وہ زبان ہے جو ملک میں بکثرت استعمال ہے عدالتوں میں اور شہروں میں جاری ہے ارباب ادب اپنی تصانیف اسی زبان میں لکھتے ہیں موسیقی دان اپنے راگ رانگین اسی زبان میں تصنیف کرتے ہیں اور اہل یورپ سے گفتگو بھی اسی میں کی جاتی ہے بھارت کا خیال ہے کہ اردو کو ہر مقام کے ہندو لوگ نہیں سمجھ سکتے مگر یہی حالت ہر ملک میں ہر زبان کی ہر مشابہت کی کسان عام اس سے کہ پرووانس یا السیس کے ہون اصلی فرینچ نہیں سمجھ سکتے۔ پس کیا یہ وجہ معقول ہو سکتی ہے کہ اردو عدالتوں اور سرکاری دفاتر سے اٹھا دی جائے؟" جارج کیمبل مصنف "انڈیا ایز اٹ ماسٹری" تحریر کرتے ہیں "میرے نزدیک یہ بہت عجیب

کہ تمام سرکاری اسکولوں میں ہندوستانی زبان ایک عام زبان کر دی جائے اور ایسی زبانیں بھی بشرط ضرورت رکھی جائیں جن میں اسکول بچے نامکمل سمجھتا ہوں کہ کوئی عام زبان کا ذریعہ کیے بغیر کام چلایا جاسکتا ہے اور چونکہ انگریزی کو ہندوستان کی زبان عام بنانا محال معلوم ہوتا ہے لہذا ہندوستانی ہی کو یہ فرض کرنا چاہیے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ہندوستان بھر کی زبان عام (انگلو افریسیا) الٹی جائیگی مستحق ہے کیونکہ یہی وہ زبان ہے جسکو ادنیٰ و اعلیٰ اور ہلکے انگریز بھی بولتے ہیں اس میں ایک خاص خوبی یہ ہے جو کبھی سری زبان میں نہیں پائی جاتی کہ دوسری زبانوں کے الفاظ بلا کسی تغیر کے یا خفیف تغیر کے ساتھ اپنے میں جذب کر لیتی ہے اور پھر وہ لفظ اسی کے ہو جاتے ہیں ۛ

مسٹر ولسٹ اسمتھ مصنف ہٹری آف انڈیا اپنی کتاب کے آخر باب میں لکھتے ہیں زبان اردو جو ہماری زبان انگریزی سے باعتبار اپنی سادگی اور قواعد صرف و نحو کی سہولت اور کثرت الفاظ کے بہت شایہ ہے ضرور اس قابل ہے کہ تمام مطالب عام اس سے کر دیں اور ان کی زبان یا فلسفیانہ یا سائنسی اس میں آئے جائیں ۛ

اردو کی نام نہاد کمائی یہ عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ زبان اردو کوئی ایسا سہولت دہنے والا نہیں کہ کسی چھپرے الحقیقت اسکونماز ہو نہ اپنے ارتقا و ترقی کی کوئی خاص تاج رکھتی ہے۔ یہ درجہ محققین اس کی طرف کم توجہ ہوئے اور ہندوستانی آئے بھی کہ بعض لوگوں کے نزدیک سمین کوئی چیز قدر قیمت کی نہیں پائی جاتی اور جب اس کا مقابلہ کلاسیکل (قدیم) اور تمدن مغربی زبانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے تو اس کی بے حقیقتی بڑی طرح معلوم ہو جاتی ہے۔ ان اعتراضات کے دو جواب دئے جاسکتے ہیں ایک یہ کہ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے وہ کوئی قدیم چیز نہیں ہے اور کسی حد یہ ادب کے یہ توقع رکھنا کہ وہ قدیم ہو اور اس کی طرح ہندو ادب خزانوں سے مملو ہو غلط فہم عقل ہے۔ اس کی دلی زندگی فارسی سے منسلک ہے اور یہ کم گزری ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ بہت جوان زبان ہے اور اگر یہی رفتار ترقی رہی تو تھوڑے ہی عرصے میں یہ ایک ایسے آداب کا مالک ہو جائے گی جو دنیا کے بہترین ادبوں سے مقابلہ کر سکیگا اور ابھی ہندوستان کی اور مروجہ زبانوں میں اس کا کوئی مقابل نہیں ہے۔

اقسام ادب اردو ادب دو بڑی قسموں میں تقسیم ہو سکتا ہے (۱) مستقل تصانیف (۲) تراجم۔
ترجمے زیادہ تر زبان انگریزی، فارسی، عربی اور شاؤنا درہندی اور سنسکرت سے اور دیسی زبانوں
میں بنگالی، مرہٹی اور گجراتی سے بھی کئے جاتے ہیں۔

تصانیف مستقل تصانیف نظم، نثر، ناول، ڈراما پر مشتمل ہیں۔ نظم اردو مختلف اقسام کی
ہے اور نہایت ہی پر لطف اور مزیدار ہے۔ لیکن ہندو نصیحت اخلاق حسن و عشق کے افلاک
مرثیہ، حمد و ثناء، بادشاہ و قتل کی تعریف، جو ظرافت، اور زمانہ حال کی نیچرل نظیروں مختلف
مضامین پر سب کچھ موجود ہیں مشہور شعراے اردو ماضی و حال میر، سودا، درویش، اختر
ذوق، غالب، اسیر، داغ، حالی، اقبال، حسرت، واکبر کے نام نامی نہایت فخر کے ساتھ پیش کئے
جاسکتے ہیں جن کے کلام کے سمجھنے کے لئے ایک خاص ذوق سلیم اور مناسبت طبیعت کی ضرورت
ہے۔ افضل نظم اردو کا بہترین انتخاب مولوی محمد الیاس برنی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن
نے ایک جدید اسلوب کے تین حصوں میں کیا ہے، اور ہر حصہ (سٹ) کا علمودہ نام رکھا ہے یعنی
(۱) معارف ملت (۲) جذبات فطرت (۳) مناظر قدرت۔ یہ تینوں حصے یا سب بارہ جلدوں پر
مشتمل ہیں۔ مولف نے ارادہ کیا ہے کہ انہیں نظم اردو کے صرف بہترین انتخابات پیش کئے
جائیں اور اس غرض سے اکثر شعراے اردو قدیم و جدید کا بہترین کلام باعتبار مضمرین منتخب
کیا ہے۔ بہر طور یہ ایک اعلیٰ درجہ کا مفید مجموعہ ہے اور کیا اچھا ہو کہ اکسین وقتاً فوقتاً اصفانہ ہوتا
رہے۔ مشہور نقار و دینین مرزا حبیب علی بیگ سردر۔ سرسید مولوی نذیر احمد مولانا شبلی مولانا آزاد
پروفیسر ذکا اللہ مولانا حالی کے نام گنائے جاسکتے ہیں اور سرشار، شرر، مرزا سوا۔ راشد الخیری
اور پریم چند سے دنیا نے انسانہ نویسی میں کون ایسا شخص ہے جو واقف نہ ہو گا۔

تراجم ترجمہ کے فعل میں بھی زبان اردو بہت مایہ دار ہے۔ دنیا کی اکثر مشہور مشہور کتابیں
نظم اور ڈراما کی اردو میں ترجمہ ہو گئی ہیں۔ مثلاً ہومر کی الیاذہما بھارت، رامین، شکنتلا، سیکھو دت
کوکر، اردو ترننگھار، ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ۔ ٹیگور کی گیتان جلی، چترالی، سیطرح، شیکسپیر کے

اکثر ڈراموں سے اردو دان پبلک جذبیہ ترجمہ کے خوب واقف ہے۔ خیر پڑن کے بعض ڈرامے
 اور ڈیٹی گرنے والاگ فیلو سودے، شیلی بائرن، اور ڈو سوتھ، اڈنٹین کی بھی اکثر مشہور مشہور نظرون
 نے اردو کا جاسہ بہن لیا ہے انسانوں اور نادون میں رینالڈس اسکاٹ، میری کا یلی، اور کانڈیل
 کی تصانیف کو لوگ بہت پسند کرتے ہیں جو کہ نہ دھڑکتی کے قریب قریب سب مادل اور ٹیگور کے بھی
 بہت سے قصے اردو میں لگے ہیں۔ ابھی تھوڑے عرصہ سے اسٹی وٹن رائیڈ، ہیکر ڈا سکرو ایلڈ
 ہرناؤشا، اور ایچ جی۔ ولس کو بھی لوگ پسند کرنے لگے ہیں۔ شماروں میں سکائے، کارلا میں اسٹائیس
 اور ایک کی مشہور تصانیف ترجمہ ہو گئے ہیں۔ فلسفہ اور نفسیات میں افلاطون، واسطو کی اکثر کتابیں ہانگیا
 کے تو ال نیکاک کے فلسفیانہ خیالات، ہرکلی کے مکالمات، اسطیج، بکن، ہیوم، کینٹ، مل، اسپنسر جیس
 اور اشاوت کی بھی بعض تصانیف اردو میں موجود ہیں۔ تاج اور سوانح عمریوں میں پلوٹارک کی مشہور مشہور
 یونانیوں اور رومیوں کی سوانح عمریوں، رالین کی تاج یونان، میری کی تاج یونان، ڈورسی کا اسپین، مل
 اسلام کی حکومت میں وائس کی تاج روس ایبٹ کی سوانح عمری، پولین بونا پارٹ گرن کی تاج انگلستان
 ہونست اسمتھ کی تاج ہندوستان، قدیم الفشن کی تاج ہندوستان، لکھن کی تاج ایران اور گرن کی
 تاج بوال سلطنت دوم، اور اسطیج اور بھی مشہور مشہور کتابیں اردو میں موجود ہیں۔ سیاسیات اور
 سیاسیات میں حسب ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں۔ اسطو کی پالیٹکس، مل کا دس سالہ لبرٹی اور پولیٹیکل
 اکنامی وغیرہ، ول کے قوانین دولت، مودلی کا میکیاولی، مارڈگرن کا پرشیا، مینی کا فرائض انسان،
 شوستر کا اتفاق ایران، ہنٹ کا مستقبل اسلام، اسطیج سیلی، ولسن، ہانک، ہوک، جونس، مائیل
 اور ولسن کی بھی بعض بعض کتابیں ہیں۔ سیاسیات کے علاوہ بعض فلسفیانہ تاریخیں بھی ترجمہ ہوئی ہیں
 مثلاً گیزر کی تاریخ تمدن، بکل کی تاریخ تمدن انگلستان، لیسان کی تمدن عرب اور تمدن ہند، لیکی کی
 تاریخ اخلاق، یورپ، ڈیویر کی تاریخ ارتقاء، یورپ، دت کی تاریخ قدیم تمدن ہند، فلسفہ تعلیم میں بھی
 اردو اساتذہ ذیل کی تصانیف سے ناواقف نہیں ہے۔ اسپنسر، ہین، فرد ہیل، شا لڈزی
 ہربٹ، مانٹی سوری، سائنس میں ڈیویر کی معرکہ مذہب و سائنس اور ڈارون، ہیکل، کھلی، لائل

گیکی۔ ٹنڈل۔ بوس۔ کیلون۔ میکسول۔ کرودک۔ اور سر آریور اللج کی جدید تحقیقاتین اردو میں آچکی ہیں قانون اور طب کا ذکر کیا رہے اسوجہ سے کہ اسکی اکثر کتابیں بضرورت ترجمہ ہوگئی ہیں۔

نذہبی لٹریچر اہل عرب و فارس کا پورا اسلامی ادب اور سنسکرت و ہندی کا ایک متعدد حصہ ترجمہ ہو گیا ہے۔ نذہبی کتابوں میں قرآن شریف۔ گیتا۔ پران۔ مہا بھارت رامائن کے ایک نہیں بلکہ متعدد ترجمے موجود ہیں۔ ایس طرح اکابر دین مثلاً پیر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عیسیٰ علیہ السلام سری کرشن۔ سریرام چندر۔ گوتم بدھ گرو نانک اور کبیر کے بھی مفصل حالات زندگی۔ نیز مقتدایان دین اور بڑے بڑے اہل دل صوفی اور رشی اور حکماء و شعراء اور نامی مورخین کے بھی حالات موجود ہیں مثلاً جوگیوں میں پشست متصوفین میں مولانا روم اور حافظ اخلاقی فلاسفہ میں غزالی اور سعدی شعراء میں فردوسی حکماء میں ابوعلی سینا۔ مورخین میں ابن خلکان اور فرشتہ وغیرہ۔

ادب اردو کے سرچشمے بالفعل ایسے سرچشمے جن سے ادب اردو کا ہر بھر ابلاغ سیراب ہو رہا ہے جن میں (۱) عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دارالترجمہ قائم ہے (۲) انجمن ترقی اردو اور نگ آباد و کن (۳) دارالغنیوں عظیم گڑھ ان تینوں جماعتوں کے حالات اپنی اپنی جگہ پر لکھے جا چکے ہیں اور یہاں انکے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ انکے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی انجمنیں اور سوسائٹیاں ادب اردو کی اشاعت و ترقی کی واسطے دلی لکھنؤ اور لاہور میں قائم ہیں۔

ہندوستانی اکیڈمی گورنمنٹ ممالک متحدہ نے صوبہ کی کونسل کی تجویزوں سے مطابقت ہو کر اپنے صوبہ میں ایک ہندوستانی اکیڈمی قائم کی ہے تاکہ اردو ہندی ادب کو انکساریان ترقی کرنے کا موقع مل سکے۔ اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اسی پر کاربند ہو کر اکیڈمی نے جو اغراض و مقاصد اپنے واسطے منصوبہ کئے ہیں انہیں سے بعض حسب ذیل ہیں۔

(۱) خاص خاص مفید مضامین پر بہترین کتابوں کے واسطے مقابلہ کے انعامات تجویز کرنا۔

(۲) اچھی اچھی اور فائدہ مند اردو ہندی کتابوں کا ترجمہ اپنے تنخواہ دار مترجموں سے کرنا اور انکو اپنی طرف سے چھپوانا اور شائع کرنا۔

(۳۰) اُردو ہندی کی ترقی کی غرض سے عمدہ تصانیف اور تراجم کے واسطے ہندوستانی یونیورسٹیاں اور اہلی انجمنوں یا دیگر مستحق اور قابل اشخاص کو مالی امداد دینا۔

(۳۱) قابل قابل اہل قلم کو اکیڈمی کی فیالرشپ (اعزازی مہربانی) کی واسطے منتخب کرنا۔
 اکیڈمی کے موجودہ نظام میں ایک کونسل اور ایک ریویو کمیٹی داخل ہیں لیکن اصلی اختیارات فیو دن کے ہاتھ میں رہیں گے جن کا انتخاب کونسل سے ہوا کرے گا۔ کونسل میں پہلے ایک پریسیڈنٹ چھ اکنل فیشیو نمبر اور تیس معمولی ممبر شامل ہیں (ان میں جنرل سکریٹری داخل ہے) جنکو شروع میں گورنمنٹ نے نامزد کیا تھا۔ اوگورنمنٹ سے ابتدا میں مبلغ پچیس ہزار روپیہ بطور امداد کے اکیڈمی کو عنایت ہوا تھا۔ اوگورنمنٹ ہی نے سر تیج بہادر سپرد کے سی۔ ایس۔ آئی کو اکیڈمی کا پریسیڈنٹ اور ڈاکٹر ناراجند پتی۔ ایچ۔ ڈی۔ کو اسکا سکریٹری مقرر کیا تھا۔

اکیڈمی کا قیام سچ پوچھئے تو اس عہد کے گورنر صاحب شہور اسکالر اور ناقد نیر سلسلہ سیر پریم سیرس کی خاص اہلی دلچسپی اور ہمدردی۔ اور ان کے روشن خیال جوان ہمت اور موقع شناس و زیر تعلیم آرنجیل رائے راجیشور بلی صاحب کی ان تھک کوششوں اور پیش بینوں اور نیز منشی و دیگر مزین صاحب نگار کی مہی بلین کا معقول نتیجہ ہے کہ یہ مبارک سیکرٹری انجمن حضرات کی محنت و جانفشانی اور حقیقی دلچسپی کی وجہ سے درجہ تکمیل کو پہونچا۔ اور انجمن کی آبیاری سے یہ شجر سرسبز ہوا۔
 اکیڈمی اپنے جدید الحظ خلیق و مترافع پریسیڈنٹ اور اپنے فاضل سکریٹری در نیز اپنے قابل مہربانی کوششوں اور گورنمنٹ صاحب کی نظر عنایت سے ضرور اک درخشاں مستقبل اور ایک بارونق مطلع نظر اپنے سامنے رکھتی ہے۔

دو کا سہ لفظ سنا ہو کہ اور گنگ آباد و جدید آباد کن بن اردو کے رسم الخط کی درستی اور درستہ کے واسطے بڑی کوششیں ہو رہی ہیں۔ یہ غرض سے انگریزین کا یہ ہوتی ہیں جنہوں نے اپنی تجاویز ملک کے سامنے پیش کی ہیں مگر سنا ہو کہ یہ رسم الخط آموزدن کے واسطے نہایت پیچیدہ و مشکل درپیشیاں کن ہو۔ اور اس سے غلط پڑنے اور غلط لکھنے دونوں کا قوی احتمال ہو مگر کہ بعض اس قسم کے نقائص کے اظہار میں غلط بیانی یا غلط فہمی ہوتی ہو تو ان ضروریات معلوم ہوتا ہو کہ موجودہ طریقہ تحریر میں جو ناقص اور کیاں میں انجمن ہند میں فن کی توجہ ضرور مبذول ہوئی اور پیش اس قسم کی خرابیاں نہیں نہ کبھی ضرور رائج ہو جائیں گی۔

انڈکس حصہ نظم

آباد ۳۷۳، ۲۷۵	آزاد ۲۸۹، ۹۰ تا ۲۹۷
آبجیات (متذکرہ) ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۷، ۱۷۸	آزاد فقیر (شکر کنی) ۸۲
۱۸۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵	آزاد کاکوروی ۲۸
آبرود (شاہ مبارک) ۲۳، ۲۸، ۳۵، ۹۴	آزاد ۲۷۷، ۱۲، ۳۱، ۳۸، ۴۰ تا ۴۰
۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴	۴۰-۱
آبرود (صفر علی خان) ۹۰، ۳۰	آسمان جاہ (دسر) ۲۸، ۲۷، ۲۷
آتش ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹	آصف (دیکھو محبوب علی خان)
۲۸۹، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷	آصفی لکاپوری ۶۸، ۷۷
آرائش معشوق (مثنوی) ۹۹	آغا شاعر دہلوی ۳۵
آزاد و در سراج الدین علی خاں ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰	آغامیر (نواب) ۲۶، ۲۷
آزاد لکھنوی ۳۵، ۳۶	آفتاب (دیکھو شاہ عالم)
آزاد مولوی محمد حسین ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰	آفتاب داغ بہر ۳۶
۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰	آگاہ ۹۲
۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰	آہ سرد (در سالہ) ۱۲
۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰	ابراہیم (نیری) ۷۸
۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰	ابراہیم عادل شاہ ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰
۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰	۷۷

۱۹۲ احمد	ابراہیم علی خان دنواب ٹونک ۳۷۳
۱۸۵ احمد آباد	۳۰۸
۳۸۵ احمد بیگ دمرزا	ابراہیم قطب شاہ ۳۶۶
۱۲۹ احمد خان ننگش	ابراہیم کاکوروی ۳۷۷
۲۵۷ احمد شاہ اہالی	ابراہیم دشوئی ۳۹۶
۱۷۲ احمد شاہ بادشاہ	ابن نشاطی ۷۰۶
۱۱۷ احمد علی خان	ابراہیم رتطب شاہ ۲۲، ۶۶، ۶۵
۶۹ احمد نظام شاہ	۷۳
۶۳ احمد نگر	ابوالفضل ۸۰
۳۷۷ اختر دمرزا محمد صادق خان	ابوالقاسم دمرزا ۷۳
۴۰۷	ابوالمظفر دیکھو ظفر
۳۵۳ اختر مینائی	ابوالمعالی ۸۵
۳۷۷ اختر دیکھو واجد علی شاہ	۳۱۵
۳۰۷ اردو درساہ	افرد دیکھو ۱۱۱
۸۱ اردو دکن	افرد ۱۲۹، ۱۳۰
۸۲ اردو کے قدیم	افرد نامہ دشوئی ۱۹۱
۳۸۳ اردو سے معالی	احسان دیکھو ۳۴۲، ۳۴۱، ۳۴۰
۸۱ ارباب زبان	احسان شاہ جہان پوری ۳۴۵
۳۷۷ اسپر نگر داکٹر ۱۷۶	احسن اربابوی ۳۳۵
۱۳۸ پنسر	احسن اشدر احسن ۱۰۳
۳۶۲ اسحاق خان دنواب محمد	احکام الفضلۃ ۷۵

بہار الدین ۸۳	بحر المحبت دشنوی ۲۳۳
بہار درنگھ ۱۷۲	بحری ۸۱
بہار در شاہ در کچھو ظفر	بخشی ۷۰
بہار علی دمیر ۱۳۶	برالدولہ ۹۲
بہار شاگرد رشک ۳۰۳	برائمنٹ ۵۱
بہار بخیراں (تذکرہ) ۱۸۹	برائوننگ (راپرٹ) ۳۵۵، ۳۹۰
بہار شان سخن ۲۷۵	برجیس قدر (برجیس) ۳۰۳
بہار و خزان ۸۳	برسانہ ۷۲
بہار ہند ۲۱	برشتہ ۴۰۷
بھاشا ۳۵	برق ۲۶۳، ۲۷۳، ۲۰۲، ۳۰۳
بھاگ متی ۶۳	۳۳۷، ۴۴۱
بھاگ نگر ۶۴	برکھارت ۳۷۸، ۴۸۰
بہار لیپور ۳۰۸	سنت سنگھ ۲۱۳
بہرام وگل ۷۲	بسل ۳۰۸
بھرت پور ۳۰۸	بقا ۲۶۲، ۳۵۳، ۲۷۷، ۳۰۶
بہرہ بیکم ۳۱۹، ۳۰۶	بلیک ورس ۳۹۸
بھوپال ۳۰۸، ۳۰۹	بلیم ہارٹ ۳۸۳، ۳۸۴، ۱۶۳، ۲۳۷
بیان دخراجہ احسن اللہ ۲۵، ۱۰۵، ۱۰۸	لمونت سنگھ ۲۸۰
۲۵۵، ۳۰۵	بنگلہ ۸
بیان دیردانی ۳۸۳	بہرہ جی ۶۳
بیان بخشایش ۲۸۱	بوستان خیال ۹۰

تلسی داس ۲۰	تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن) ۹۱، ۱۱۷، ۱۲۲
تلنگی (زبان) ۵۸، ۶۳	تذکرہ شعرائے دکن ۸۶، ۹۱
تلہر ۱۲۵	تذکرہ شورش ۱۷۷
تمکن عرب ۳۵۳	تذکرہ قاسم ۱۸۶
تنبیہ الجہال ۱۹۱	تذکرہ قدرت ۱۰۲
تنبیہ الغافلین ۱۰۱	تذکرہ لچھی نرائین ۹۱
تنویر الاشعار ۲۸۲	تذکرہ میسوی خان
تنہا (محمد علی) ۲۳۲، ۲۶۵	ترجیع بند ۱۵
توفیق (دکھیو صدیق حسن خاں) (نواب)	ترقی (مرزا محمد تقی خان) ۳۲۹، ۳۸۳
توقیر (اکبر علی خان) ۳۰۲	۳۱۳، ۳۰۶
توقیر شرف ۲۸۱	ترکیب بند ۱۵
تیغ تیز ۳۸۵	تسلین (میر حسین) ۳۵۳، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸
	۳۱۳، ۳۰۸، ۳۱۵
ٹامس مور ۱۳۱	تسلیم ۳۳۳، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰
ٹامل (زبان) ۵۸	۳۲۹، ۳۱۱، ۳۰۶، ۳۰۷ تا ۳۵۰
ٹامس صاحب ۱۵۱، ۳۵۷، ۳۷۸	تشنہ ۳۰۸
ٹانڈا ۳۰۵، ۳۰۷	تصوف ۲۸، ۵۲
ٹکلیٹ رائے (دہارا جہ) ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹	تصویر (شاہ) ۳۰۸
ٹوڈر مل ۲۱	تثیق ۳۳۳، ۳۳۵، ۳۳۶
ٹوبک ۳۰۸	تفتہ (منشی سرگوبال) ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱
ٹیننسن ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰	تفضل حسین خان (امیر) ۳۱۱

خواب و خیال دشمنی ۱۱۴۸۲ ۱۱۹۱۱	خانی خان ۱۵۱۷ ۱۹۰۱۷
خوشحال رائے ۲۹۵	خاقانی ۱۵۳ ۱۴۲۱
دارالترجمہ ۱۴۱۱ ۱۴۱۲	خاکی ۲۳۹
داغ دوکھنی ۹۲	خان آرزو دو کھنوارزو
داغ دل بہر دو سوخت ۲۸۰	خاننمان (عبدالرحیم) ۲۱
داغ (دوبوی) ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳	خاورنامہ ۱۷۶
۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳	خدیجہ سلطانہ ۱۷۶
۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳	خریطہ جواہر ۱۰۹
۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳	خسر (امیر) ۱۸۱ ۱۸۱ ۱۸۱ ۱۸۱ ۱۸۱ ۱۸۱
دال محل ۱۶۷	۳۸۵ ۱۳۹۹
داغ نگار دشمنی ۳۸۰	خلش درگاہ علی ۲۰۹
دارو (شاعر) ۱۸۸	خلق ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳
دائرہ ادبیہ ۳۳۳	نشین (مرزا ظہور علی) ۱۴۰ ۵
دبیر ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳	نشین (میر حسن) ۱۴۵
۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳	ظیل دو کھنوار علی خان ۲
۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳	ظیل (میر دوست علی) ۳۸۶
دراوڑی زبان ۸۲	ظنی نہ باریدہ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳
درختان ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳	ظنی نہ سرور ۵۰۳
دو دخواجہ میر ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳	ظنی نہ مستحیر ۱۹۳
۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳	ظنی نہ رحمت ۳۵۷
۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۳	ظنی نہ من ۳۹۶

	۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۱، ۳
ڈیج ۸	درمند (محمد فقیر) ۱۹۰، ۱۰۹
ڈراما ۴۰، ۴۱، ۵۵	درفش کاویانی ۳۸۵
	دریائے عشق ۱۹۱، ۳۳۳
ذکا (میرا ولاد محمد) ۹۰	دریائے لطافت ۳، ۳۱۳، ۲۳۲
ذکا، اللہ دمولوی ۳۹	۳۴۱
ذکر میر ۶۹، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸	دستورالفضی ۴۴، ۴۳
ذکی (نواب سید محمد ذکی) ۳۸۲، ۳۸۱، ۳۸۰	دکن میں اردو (تذکرہ) ۹۱
۳۰۷	دکنی زبان ۵۷
ذوق ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹	دلپذیر دشمنی ۸۲، ۳۳۳
۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹	دلگیر ۳۰۵، ۳۰۴، ۳۰۳، ۳۰۲
۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹	دوبیتی (دیکھو رباعی)
	دولت ۷۹
راجہ شاہ جیلانی ۲۷	دولت (جہانگیر محمد خان) ۱۰۰، ۱۰۱
راسخ ۲۷، ۲۸	دولت صاحب دغروج ۱۲، ۳۳۳
رام پور ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹	دوسرے (دیکھو نورس)
۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹	دہ مجاہد ۳۵، ۸۶
رام راؤ ۸۰	دیباچہ نغم ۵۰۵
رام کشور دہشت ۳۹۵	دیباچہ حالی ۸۵، ۴
رباعی ۱۵، ۵۵	دیوان ذوق (مرتبہ آزاد) ۶۶، ۴
	دیوان زادہ ۱۰۳، ۹۹

رتن پیم ۱۸۱	روح افزا ۱۹۲
رخشان ۱۳۰۰ ۶۹۹	رودکی ۱۸۳
رخصت عروس ۴۸۳ فٹ نوٹ	روضۃ السلام ۱۹۲
رسا دجان مرزا ۱۹۰	روضۃ الشہداء ۱۸۰ ۱۸۰ ۱۸۰
رسمی ۱۷۶	ریاض ۱۴۱
رشک ۱۳۱ ۱۳۱ ۱۳۱ ۱۳۱ ۱۳۱ ۱۳۱	ریاض الجنان ۱۳۱
۱۳۱ ۱۳۱ ۱۳۱ ۱۳۱ ۱۳۱ ۱۳۱	رنجیتہ ۱۳۱
رشید ۱۳۱ ۱۳۱ ۱۳۱	رنجیتی ۱۳۱ ۱۳۱ ۱۳۱ ۱۳۱ ۱۳۱ ۱۳۱
رضا ۱۹۲	
رعایت خان ۱۸۳	زار ۱۳۲
	زانی ۲۰۹
رموز العارفین (مثنوی) ۱۱۳	زکی ۱۳۹ ۱۳۹ ۱۳۹
زند (سید محمد خاں) ۱۳۸ ۱۳۸ ۱۳۸	زہر عشق ۱۳۶
۱۳۹ ۱۳۹ ۱۳۹	زینج نامہ ۱۳۵
زند (نواب بہار خان) ۱۳۹ ۱۳۹ ۱۳۹	زمین العابدین خان (عارف) ۱۳۸
۱۳۹ ۱۳۹ ۱۳۹	زینت المساجد ۱۰۵
زمین (دکنی) ۱۹۲	
زمین (دہلوی) ۱۳۸ ۱۳۸ ۱۳۸	سات گڑھ ۱۸۱
۱۳۹ ۱۳۹ ۱۳۹	ساطع برہان ۱۳۸
۱۳۹ ۱۳۹ ۱۳۹	ساتی (نشدت جواہر ناتھم) ۱۳۹
روپ سنگھار (مثنوی) ۱۹۲	سلا جنگ (پیر سحاق خان مومن الدولہ) ۱۳۸

سرور در لاهی (۳۹۸، ۳۹۸)	سالار جنگ (۳۹۸، ۳۹۸)
سرور در جرج علی بیگ (۳۹۸، ۳۹۸)	سالک (۳۹۸، ۳۹۸)
سرور در (۳۹۸، ۳۹۸)	سامی (۳۹۸، ۳۹۸)
سرور در (۳۹۸، ۳۹۸)	سانجر (۳۹۸، ۳۹۸)
سرور در (۳۹۸، ۳۹۸)	سانت (۳۹۸، ۳۹۸)
سرور در (۳۹۸، ۳۹۸)	سانس (۳۹۸، ۳۹۸)
سرور در (۳۹۸، ۳۹۸)	سبرس (۳۹۸، ۳۹۸)
سرور در (۳۹۸، ۳۹۸)	سحر (۳۹۸، ۳۹۸)
سرور در (۳۹۸، ۳۹۸)	سحر البیان (۳۹۸، ۳۹۸)
سرور در (۳۹۸، ۳۹۸)	سحر (۳۹۸، ۳۹۸)
سرور در (۳۹۸، ۳۹۸)	سراج (۳۹۸، ۳۹۸)
سرور در (۳۹۸، ۳۹۸)	سراج الدین علی خان (۳۹۸، ۳۹۸)
سرور در (۳۹۸، ۳۹۸)	سراج اللغات (۳۹۸، ۳۹۸)
سرور در (۳۹۸، ۳۹۸)	سرب نگه (۳۹۸، ۳۹۸)
سرور در (۳۹۸، ۳۹۸)	سرخار (۳۹۸، ۳۹۸)
سرور در (۳۹۸، ۳۹۸)	سرایه زبان اردو (۳۹۸، ۳۹۸)
سرور در (۳۹۸، ۳۹۸)	سرمه بصارت (۳۹۸، ۳۹۸)
سرور در (۳۹۸، ۳۹۸)	سرور (۳۹۸، ۳۹۸)
سرور در (۳۹۸، ۳۹۸)	سرور در جهان آبادی (۳۹۸، ۳۹۸)
سرور در (۳۹۸، ۳۹۸)	تاس (۳۹۸، ۳۹۸)

طالب آلی ۱۱۳۱ (۱۱۳۱)	صارم ۱۹۲
طالب (نواب سعید الدین احمد خان) ۱۳۹۹/۱۳۹۴	صائب ۱۱۵۱/۱۱۵۱/۱۱۵۱/۱۱۵۱
طاهر ۲۴۳	صبا ۱۲۸۰/۱۲۸۰
طبعی ۱۴۲/۱۴۲	صبح امید ۱۲۹۶
طبقات اشعار ۱۱۳۲/۱۱۳۲	صبر در شہ گوی ۱۳۱۲/۱۳۱۲
طلسم آفت (رثوی) ۱۳۰۶/۱۳۰۶	صبر رام پوری ۱۳۲۹/۱۳۲۹
طوطا رام شایان ۱۳۶۳	صدیق حسن خان (نواب میر جہوپال) ۱۳۰۰
طوطی نامہ مولوی حید بخش ۱۴۰	۱۳۱۰
طوطی نامہ غواصی ۱۴۰	صغیر بلگرامی ۱۱۳۱
طوطی منہد (دیکھو امیر خسرو)	صنعتانہ عشق ۱۳۱۵/۱۳۱۵/۱۳۱۵/۱۳۱۵
ظفر بہادر شاہ ۱۳۰۹/۱۳۰۹/۱۳۰۹/۱۳۰۹	صہبائی (مولوی انجم بخش) ۱۳۶۳/۱۳۶۳/۱۳۶۳/۱۳۶۳
۱۳۶۳/۱۳۵۵/۱۳۵۵/۱۳۵۵	
۱۳۶۸/۱۳۶۸/۱۳۶۸/۱۳۶۸	ضابطہ خان ۱۱۴۳
ظفر (ظفر بیگ) ۹۰	ضاحک دیر ۱۳۱۲/۱۳۱۲/۱۳۱۲/۱۳۱۲
ظہور الدین (دیکھو حاتم)	۱۳۱۸/۱۳۱۸/۱۳۱۸/۱۳۱۸
ظہوری ۱۳۶۲/۱۳۶۲/۱۳۶۲/۱۳۶۲	ضمیر ۱۳۱۲/۱۳۱۲/۱۳۱۲/۱۳۱۲
ظہیر (دہلوی) ۱۳۵۶/۱۳۵۶/۱۳۵۶/۱۳۵۶	۳۲۹
۱۳۹۹/۱۳۹۹/۱۳۹۹/۱۳۹۹	ضیاء ۱۳۲۵/۱۳۲۵/۱۳۲۵/۱۳۲۵
ظہیر (قاریا بی) ۱۵۳	ضیاء بخش ۱۴۰
حاجر ۱۸۰/۱۸۰/۱۸۰/۱۸۰	طالب ۱۶۳

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

فدوی لاہوری ۱۳۶، ۲۵۶، ۲۵۵، ۲۵۴	غریب (شاہد ہروی) ۳۵۱، ۳۵۰
فراق ۲۷، ۹۴، ۹۵، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱	غزالہ و ماہ پیکر (دثنوی) ۲۹۹
۲۵۰، ۲۵۲، ۲۵۱	غزالی ۱۱۳
فراقی ۹۴	غزل ۱۴، ۲۵، ۳۰، ۳۷، ۳۹
فراید (رسالہ) ۹۲	غلام رسول (حافظ)
فرخ آباد ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱	غلام علی (آزاد) ۸۹
فرخ سیر ۱۰۱، ۱۶۴	غلام مصطفیٰ (دیکھو کیرنگ)
فرد ۱۱۶	غنچہ آرزو ۱۹۲
فردوسی ۲۲۰	غواصی ۳۳، ۴۹، ۷۰، ۸۳، ۸۵، ۸۶
فرشامہ ۱۳۸	غیاث الدین بلبن ۴۷
فرسج ۸	
فرنگی محل ۲۶۴	فاخر کین ۱۲۹، ۱۳۶، ۱۳۵، ۲۵۳، ۲۵۴
فرہار ۳۳۶	فارسی ۳، ۱۵، ۱۳
فرہنگ صفیہ ۳۵۳	فارغ ۱۰۳
فریاد داغ ۲۸، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶	فایز ۶۳
فرید الدین عطار ۸۲	فایق ۲۲
فریدرک اعظم (بادشاہ جرمنی) ۱۲	فتح علی ۹۹، ۱۰۰
فسانہ عجائب ۳۶، ۳۷، ۳۸	فتوت ۹۲
فصاحت ۳۰۵	فخر ۹۲
فصیح ۳۱، ۳۲، ۳۳	فخر و درزا ۲۶، ۲۷، ۲۸
فضل حق (مولوی خیر آبادی) ۱۱، ۱۲، ۱۳	فخری ۹۳

تمبروں سے صفحات مراد ہیں

مقبل (۱۲) ۳۱۱	۳۶۵، ۳۶۸، ۳۷۳، ۳۸۳، ۳۹۱، ۴۰۵، ۴۱۵
مقدمہ شعر و شاعری ۳۸۶	۴۸۸، ۵۰۰
گنڈراؤ مرثیہ ۶۳	مضطر خیر آبادی ۱۴۰۸
گنڈ مسجد ۶۷	مضمون (شیخ شرف الدین) ۱۳۸، ۱۹۵
گھن (خاد) ۹۹	۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲
ملک شاہ ۷۱	مضمون اقدس (شہنوی) ۲۲۲
ملک محمد عباسی ۳۰	مطبع فنی نوکشیر ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸
ملکہ مصر (نقشہ) ۸۰	مطرت ۱۷
ممنون (نیر) ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵	مظہر (مزاہج بجا نان) ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۸
۲۳۷	۹۵، ۹۶، ۹۸، ۹۹
مناجات بیرونی ۳۳۸	۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷
منافذہ رحمہ و شہادت ۳۴۸، ۳۴۹	۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷
من پھول (نقشہ) ۲۵۱	منقہ عشق و دیوان قلندر ۳۰۷
منتخب دیوانہا ۳۸۹	معاملہ شہری ۳۸
منتخبات عارفانہ ۳۸۱	معاملات عشق و شہنوی ۱۷۰
منتخب نقیہ عدد ۳۳۲	معانی (دیکھو قطب شاہ)
منز و ۱۸۱	معراج نامہ ۷۸
منصور شیخ ۷۷	معروف ۳۷
منشور ول ۳۰۹	معیار (گھن گھنوا) ۱۷۰
من گھن ۸۱	مغیر شعرا و رسالہ ۳۳۳، ۳۳۴

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

انشائے سرور ۲۸	اسماعیل دمولوی شہید ۳۵۰۱۶
انوار سہیلی (ترجمہ) ۲۱	اشک دخیل علیخان ۱۱۵
دوبرام گو (جرمنی) ۱۳۳، دفن نوٹ:	افسر رحمان شد ۱۳۲۰۹۳
اردو پنج ۱۱۰۲ ۱۰۹	انسوس (میر شیر علی) ۸
ایامی ۵۹	اکبر آک آبادی ۱۰۳
	اکرام علی دمولوی ۱۱۳
بارہ ماسہ ۱۱	الغزالی ۱۶۸
باغ اردو ۹	الفاروق ۱۶۷
باغ دیہار ۷	الف لیلہ (تراجم) ۱۲۷
بحر المحبت (دشنوی) ۷۶	الکلام ۱۶۸
برق دجولا پرشاد ۱۰۳ ۱۰۷	المامون ۱۶۷
جربان الدین حاتم شاد ۳	الیاس برنی دمولوی محمد ۱۶۹
بتان حکمت ۳۰	امانت اللہ دمولوی ۱۱۵
نشن نراین در ۱۱۳، ۹۳، ۸۸، ۲۳	امراک جان ادا دناول ۱۳۸
۱۱۶، ۱۱۳	امن دہلوی (میر) ۷
یوم بارت (فہرست) ۸۹	امیات الامہ ۵۸
بنات انوش ۵۹	امیات المؤمنین ۵۸
بوستان خیال ۱۰۱	امیر خسرو دہلوی ۷
بہادر علی (دیکھو حسین)	انجمن ترقی اردو ۱۳۸، ۱۳۷
بہار بخیرن ۷۸	اندلسیہا ۱۳۸

تذکرۃ الکالمین ۸۰	ہبار دانش (ترجمہ) ۱۶، ۱۹
ترہون ناقد ہجر ۱۰۶، ۱۰۲	بتال کپپی (ترجمہ) ۱۱۲
ترجمہ بائبل ۲۰، ۱۹	بیخبر دانشی غلام غوث ۸۱
تریاق مسموم ۵۳	بیس (ترجمہ) ۱۶۷
تصانیف شر ۱۳۷	بینی نرین جہاں ۱۴۲
تصدق حین داستان گو ۱۰۰	
تقریرات ہند (مجموعہ) ۱۵۶	پردہ عصمت در سالہ ۱۳۵
تمدن عرب ۸۲	پریم چند دانشی ۱۴۰
تمدن ہند ۸۲	پند نامہ (ترجمہ) ۱۲۲
تنبیہ الغافلین (ترجمہ) ۱۴، ۳۵	سیارے لال آشوب دما سٹر ۴۸، ۴۷
تواریخ قاسمی ۴	۹۰، ۷۹
توبۃ النصوح ۵۸	تارچند ڈاکٹر ۱۷۲
تیج بہادر سپرد (ڈاکٹر) ۱۷۲	تاریخ آسام (ترجمہ) ۹
	تاریخ شیر شاہی (ترجمہ) ۳۱
ٹیلر دکتیان ۱۴۲	تاریخ فرشتہ (ترجمہ) ۱۱
ٹیلر دمسٹر پرنسپل دلی کالج ۷۹	تاریخ نادری (ترجمہ نادز نامہ) ۱۰
	تاریخ ہندوستان (مولوی ذکار اللہ)
جامع الاخلاق (ترجمہ اخلاق جلالی) ۱۵	۱۶۲
جامع القواعد ۱۹	تحسین عطا حسین خاں میر محمد ۳
جاوہرستان ۵۱	تحفہ الفسٹن ۱۹
جل ترنگ ۲	تذکرہ جہاں ۱۱

جوانا پرشاد (دکھو برق)	حیران دیر حیدر علی ۱۸
جوان دکانم علی جوان ۱۱۱	
جوش سلطان حیدر ۹۳	خرد افروز انشا ۱۳۱
جیمس مارنٹ دکتان ۱۱۵	خلاصۃ التواریخ ۱۹
	خلیل دابرہیم علی خان - نواب ۱۰
چار کشن ۱۳	خجاندہ جاوید ۹۱
چراغ علی دسولوی ۱۳۵	خواجہ امان دہلوی ۱۰۱
چشہ فیض ۱۱۹	خوجی ۱۱۸ ۱۱۷
چھاپے خانے ۳۶ ۳۵	
	دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۰۷ ۱۰۶ ۱۰۵ ۱۰۴ ۱۰۳ ۱۰۲ ۱۰۱
ساجی بقول ۱۱۰۵ ۱۱۲۳	داستان امیر حمزہ ۱۱
حانی ۱۵۵ تا ۱۵۳	در بار کبری ۱۵۱
حدائق البلاغت (ترجمہ) ۱۱۹	درگیش نندی ۱۲۹
حسرت موہنی ۹۳	دریائے لطافت ۳۰ ۲۹
حسن نظامی (خواجہ) ۱۳۹	دلیچپ ڈانول ۱۲۹
حسین دہلوی ۱۹۲	دنگلز در سالہ ۱۱۳
حفظ اللہ بن احمد ۱۱۳	دلی گاج ۷۷
حمید الدین دسولوی ۵۵ ۵۴	دو مجلس فضلی ۲
حیات ہدیر ۵۴	دیوان انور ۱۹۲
حیات سعدی ۵۳	دیوان ذوق ۱۵۱
حیدر ۵	دیوان مرین نور ۱۸۹ ۱۸۷ ۱۸۶ ۱۸۵ ۱۸۴ ۱۸۳ ۱۸۲ ۱۸۱ ۱۸۰ ۱۷۹ ۱۷۸ ۱۷۷ ۱۷۶ ۱۷۵ ۱۷۴ ۱۷۳ ۱۷۲ ۱۷۱ ۱۷۰ ۱۶۹ ۱۶۸ ۱۶۷ ۱۶۶ ۱۶۵ ۱۶۴ ۱۶۳ ۱۶۲ ۱۶۱ ۱۶۰ ۱۵۹ ۱۵۸ ۱۵۷ ۱۵۶ ۱۵۵ ۱۵۴ ۱۵۳ ۱۵۲ ۱۵۱ ۱۵۰ ۱۴۹ ۱۴۸ ۱۴۷ ۱۴۶ ۱۴۵ ۱۴۴ ۱۴۳ ۱۴۲ ۱۴۱ ۱۴۰ ۱۳۹ ۱۳۸ ۱۳۷ ۱۳۶ ۱۳۵ ۱۳۴ ۱۳۳ ۱۳۲ ۱۳۱ ۱۳۰ ۱۲۹ ۱۲۸ ۱۲۷ ۱۲۶ ۱۲۵ ۱۲۴ ۱۲۳ ۱۲۲ ۱۲۱ ۱۲۰ ۱۱۹ ۱۱۸ ۱۱۷ ۱۱۶ ۱۱۵ ۱۱۴ ۱۱۳ ۱۱۲ ۱۱۱ ۱۱۰ ۱۰۹ ۱۰۸ ۱۰۷ ۱۰۶ ۱۰۵ ۱۰۴ ۱۰۳ ۱۰۲ ۱۰۱ ۱۰۰ ۹۹ ۹۸ ۹۷ ۹۶ ۹۵ ۹۴ ۹۳ ۹۲ ۹۱ ۹۰ ۸۹ ۸۸ ۸۷ ۸۶ ۸۵ ۸۴ ۸۳ ۸۲ ۸۱ ۸۰ ۷۹ ۷۸ ۷۷ ۷۶ ۷۵ ۷۴ ۷۳ ۷۲ ۷۱ ۷۰ ۶۹ ۶۸ ۶۷ ۶۶ ۶۵ ۶۴ ۶۳ ۶۲ ۶۱ ۶۰ ۵۹ ۵۸ ۵۷ ۵۶ ۵۵ ۵۴ ۵۳ ۵۲ ۵۱ ۵۰ ۴۹ ۴۸ ۴۷ ۴۶ ۴۵ ۴۴ ۴۳ ۴۲ ۴۱ ۴۰ ۳۹ ۳۸ ۳۷ ۳۶ ۳۵ ۳۴ ۳۳ ۳۲ ۳۱ ۳۰ ۲۹ ۲۸ ۲۷ ۲۶ ۲۵ ۲۴ ۲۳ ۲۲ ۲۱ ۲۰ ۱۹ ۱۸ ۱۷ ۱۶ ۱۵ ۱۴ ۱۳ ۱۲ ۱۱ ۱۰ ۹ ۸ ۷ ۶ ۵ ۴ ۳ ۲ ۱

سیرۃ النبوی ۱۷۱	شیرنگھ سردار (۳۵)
سیرۃ النعمان ۱۶۷	شیرعلی (میر) دوکھو (نوس)
شاہ محمد قادری (سید) ۲	صبح امید (منوی) ۱۶۷
شاہ میر (سید) ۱۲	صفت اردو ۱۱۵
شبستان سرور ۱۲۳، ۱۲۷	صہبائی (مولوی) امام بخش (۸۰، ۷۸)
شبل نعمانی ۶۵ تا ۷۷	ضامن علی (درویش) ۱۹۳
شرح مرغوب القلوب ۲	ضوابط انگریزی ۱۲
خضر (مولوی) عبدالحلیم ۲۶ تا ۳۱، ۱۳۹	
شرح عشق ۲۳، ۱۲۷	
شرن الدین میرٹھی ۱۲۱	ظلم حیرت ۲۷
شعرا کبھم ۱۷۳	ظلم ہوشیار ۱۰۰
شعرا ہند ۷۵	طوطا رام شایان ۱۰۰
شکنتلا نامک (ترجمہ) ۱۱	طوطا آبائی ۱۰
شکوہ محبت ۲۳، ۳۷	طیش رحیم مرزا جان ۱۵
شامل لائق اول لائق ۲	
شمس الباق (دو کھو میر) بخی بجا پوری شاہ	ظفر علیخان (مولوی) ۲۲، ۹۳
شوق قدوائی (احمد علی) ۱۰۷	ظفر عمر (مولوی) ۱۲۲
شہرت (انتخاب الدین) ۱۵	ظفر المکد (مولانا) ۹۸
شہید (مولوی) غلام امام ۸۱	
شہید دو کھو انت (شہید مولوی)	سبب یاری (مولوی) ۷۵

غازی الدین حیدر ۳۱، ۳۲	عبدالحق دہلوی (مولوی) ۶۹
فخر الدین حسین (خواجہ) ۲۲، (دفتر نوٹ) ۲۶	عبدالحق دہلوی سکرٹری انجمن ترقی اُردو
فردوس بریں (ناول) ۱۳۱	۱۵، ۱۸
فرخ (میان) ۲۱	عبدالسلام ندوی (مولوی) ۷۵
فرہنگ آصفیہ ۶۴	عبدالغفر (شاہ) ۳۴، ۳۵
فسانہ آزاد ۱۰۹، ۱۱۳، ۱۲۳، ۱۲۶ تا ۱۲۷	عبدالغفور (مولوی) ۶۸
فسانہ عجائب ۳۴ تا ۳۶	عبدالقا در بی اسکے آئینل (مولوی) ۸۷
فطرت (مرزا محمد) ۱۵	عبدالقدیر یوسف علی ۱۴۴، ۱۶۲، ۱۶۵
فقیر محمد خاں (دیکھو گویا)	عبدالماجد دریا بادی (مولوی) ۷۷
فلر (میر) ۴۷	عبدالحمید (مولوی) ۶۶
فورٹ ولیم کالج کلکتہ ۱، ۳۴، ۳۵	عبدالحمید خاں (کرل) ۶۹
فیلن (ڈاکٹر) ۱۸، ۱۸	عثمانیہ یونیورسٹی ۱۷۱
قرآن شریف (تراجم) ۱۱، ۱۶	غزنی مرزا (مولوی) ۸۳
قصہ لقمان ۹	عطاسین خان (میر محمد دیکھو تخمین)
قند پارسی ۵۰	علی ابراہیم خان (ذواب) (دیکھو خلیل)
قواعد المبتدی ۱۹	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۳۰، ۸۶
کاظم خان (میر محمد) ۷۷	عروہ ہندی ۲۹
کاظم علی (مرزا) (دیکھو جوان)	عیان ریسر کاظم علی جوان ۱۱
	عین الدین گنج العلوم (شیخ) ۲۱
	غالب (مرزا) ۲۱، ۲۸ تا ۳۳، ۳۸

ہندب (اخبار) ۱۳۱	مرآۃ العروس ۱۵۸
ہمد و ماہ (قصہ) ۱۰	مراسلہ کشمیر ۱۰۸
میراجی بیجا پوری (شاہ) ۳	میرزا خانی کو توکل دہلی ۱۱۷
میران یعقوب ۲	مسعود حسن رضوی (سید) ۹۳، ۱۰۰ (فٹ نوٹ)
میر تقی (مصنف بوستان خیال) ۱۰۱	مسکین (میر عبد اللہ) ۱۵
میر تقی (والدہ سید احمد خان) ۳۸	مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ۶۷
میر ہدی (خط بنام) ۳۰	مطبع ٹماپ ۳۶
میکڈائل (سر اسٹونی) ۶۹	مطبع مصطفائی ۳۶
	مطبع میر حسن ۳۶
نئی لغت ۱۰۷	مطبع نوکلتر ۳۷، ۹۹
نامی دیرونیسیر ۹۳	مظہر علی خاں (دیکھو ولا)
نثر بنظیر ۹	معارف در سالہ ۸۶
نثر شرف نثار ۳۸	معراج العاشقین ۲
نذوۃ العلماء ۶۸	مفرح القلب ۹
نذیر احمد (مولوی) ۱۶، ۱۵۵ تا ۶۱	مقدمہ شعرو شاعر می ۵۳
۱۱۹، ۱۰۱	ممتاز دیر کاظم علی جوان ۱۱
نشاط العشق ۲	ممتاز حسین عثمانی (حکیم) ۱۰۳، (فٹ نوٹ)
نصیحت کا کرن پھول ۵۰	من پھول (پنڈت) ۴۷
نصیر شاہ ۱۷	منوہر لال زتشی (پنڈت) ۸۸
نگار (رسالہ) ۱۳۹	موازنہ انیس و دیر ۶۸
نوابی دربار ۱۰۷	مہدی حسن ۹۳

نوازش ۱۲۱	ہا سرائے دکنی (۱۳۸، ۱۳۷)
نوشتر وال نامہ ۱۰۰	ہاشمی فرید آبادی ۱۹۳
نوطر زمر ص ۳	ہدایت الاسلام ۱۵
نولکشور (دفنی) ۱۲۸، ۱۹۹	ہریشچندر ۱۶۳
نہال چند لاہوری ۱۲	ہفت پیکر (عرب ہفت پیکر نظامی)
نیاز فقہوری ۱۱۳۹	۱۱
نیرنگ خیال ۵۰	ہفت گلشن (ترجمہ) ۱۱۲
	ہندوستانی اکیڈمی ۱۱۷۲، ۱۱۷۱
واقعات اکبر (ترجمہ اکبر نامہ) ۱۶	ہندوستانی گرامرین ۱۱۷، ۱۱۸
وزیر دخواجہ ۳۱۲	ہیوٹ (سرجان) ۱۷۰
وقار الملک (نواب) ۱۶۹، ۱۳۵	
بوکرم اردسی ۱۸۳	یادگار غالب ۱۵۴
رہنما آستھ ۱۶۸	یلدرم (دیکھو سجاد حیدر سید)
ولاد منظر علی خاں ۱۲۱	

ہسٹری آف اُردو لٹریچر کی بابت بعض موقر اور معزز

صحاب کی قیمتی رائیں

(۱) ہنزاکلینسی سرولیم بیرس۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کے۔ سی۔

آئی۔ اے۔ ای۔ گورنر ممالک متحدہ

”میں آپ کو آپ کے کامیاب کارنامے پر مبارکباد دیتا ہوں“

(۲) ہنزاکلینسی سرولیم بیرس۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کے۔ سی۔

آئی۔ جی۔ سی۔ آئی۔ اے۔ ای۔ جی۔ سی۔ وی۔ او۔ فرمانروائے

رامپور ممالک متحدہ

”بڑی مسرت سے لکھا جاتا ہے کہ ہسٹری آف اُردو لٹریچر مصنفہ مسٹر رام بابو سکینہ

ایک عمیق مطالعہ کا پتہ دیتی ہے۔ اور اس قابل ہے کہ اس کا شمار ملک کی بہترین

اور اعلیٰ ترین تصانیف میں کیا جائے“

(۳) سر تیج بہادر پیرو کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ ایل۔ ایل۔ وی

”قابل مصنف کی اس بارہ میں ضرور داد دینا پڑتی ہے کہ کیسے مسلسل اور مربوط طریقے

سے انھوں نے زبان اور ادب اُردو کی ترقی اور نشوونما کا حال قدیم زمانہ سے لیکر

زمانہ حال تک کا سس عملہ کی سے لکھا ہے وہ اپنی رائے
 قائم کرنے میں نہایت آزاد اور اپنے اظہار خیال میں بے خوف ہیں
 ... مختصر یہ کہ کتاب نہایت اعلیٰ درجے کی ہے " (ماخوذ از تقریظ جناب موصوف)

(۴) سر شیخ عبد القادر بنی۔ اے۔ نائٹ ریونیو ممبر گورنمنٹ

پنجاب لاہور

"نہایت اعلیٰ درجہ کی کتاب ہے"

(۵) سر شیخ محمد اقبال نائٹ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ایم۔ ایل سی لاہور

"آپ نے اس کتاب کے لکھنے میں یقیناً بڑی محنت کی ہے جو اس طرح باتاؤں والی
 کہ تاریخ ادب اردو میں ایک بہترین کتاب کا اضافہ ہو گیا۔"

۶۔ ڈاکٹر ٹی کریم بلی۔ ڈی۔ لیٹ۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ ڈائریکٹر

آف اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن۔

"میں نے پوری کتاب پڑھی اور بہت لطف اٹھایا آپ نے کثیر معنویت کو
 عجیب و غریب طریقہ سے ایک جگہ جمع کر دیا میں آپ کو اس تصنیف پر دلی مبارکباد
 دیتا ہوں۔ آپ کی کتاب نہایت قابل قدر نہایت صحیح : اور نہایت دلچسپ
 ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ انگلستان آکر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری
 حاصل کرنے کی ضرورت کو شش کر سینگے۔ اور اس میں شک نہیں کہ آپ اس کے

بجا اعلیٰ درجہ میں تیار۔"

(۷) ڈاکٹر سید محمد سلیمان کیلنگ چیف جسٹس آلہ آباد ہائی کورٹ
”کتاب نہایت قابل قدر اور دلچسپ ہے“

(۸) مٹرا می ایف۔ اوپن ہیم آئی۔ سی۔ ایس کیشنر بنارس

”میں نے آپ کی کتاب جب پڑھی مجھ کو نہایت دلچسپ معلوم ہوئی۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے اس مضمون کا نہایت عمیق مطالعہ کیا ہوگا۔ اور ایک خاص قسم کی ریسرچ میں جو بہت مشکل ہے بہت وقت صرف کیا ہوگا کتاب نہایت دلچسپ دال فروز ہے۔ جسکی میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں میرے نزدیک ہر شخص جسکو ادب اردو سے لگاؤ ہے اسکی بڑی قدر کر لے گا“

(۹) مٹرا مکنزی سی۔ آئی۔ ای۔ آئی۔ امی۔ ایس۔

ڈاکٹر کرشن ششہ تعلیم ممالک متحدہ

”میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے کس عمدہ طریقہ سے ادب اردو کی نشوونما اور ترقی کا حال لکھا ہے۔ آپ کی کتاب فی الحقیقت ایک اصلی ضرورت پوری کرتی ہے اور وہ ضرور اس قابل ہے کہ اسکو ہر اسکول اور لائبریری میں

جگہ ملے“
(۱۰) ڈاکٹر تارا چند ایم۔ اے۔ ڈاکٹر آن فلاسفی (کنیٹب)

الہ آباد یونیورسٹی

”آپ کی بہتری آن اردو لٹریچر ایک ایسی کتاب ہے جس سے آپ کے عمیق مطالعہ حد درجہ کی کاوش۔ اور علمی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس قسم کی کوئی کتاب اب تک

انگریزی میں تصنیف نہیں ہوئی۔ میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے اردو شعراء و شاعروں کے متعلق معلومات جمع کرنے میں بہت کامیابی حاصل کی اور تیزان کے متعلق جو رائے قائم کی ہیں وہ بہت منصفانہ ہیں۔ ایسی کتاب زمانہ حال کے لئے بہت ضروری تھی اور میں امید کرتا ہوں کہ وہ صاحبان تنقید سے خراج تحسین ضرور حاصل کرے گی جس کی وہ پوری طرح مستحق ہے۔

(۱۱) مٹرجے سی۔ ایوالڈ فالس مصنف بدرالبدن وغیرہ جرمنی

”میں نے آپ کی عجیب و غریب کتاب ہٹری آف اردو لٹریچر کا غور سے مطالعہ کیا ادب اسکوزبان جرمن میں ترجمہ کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مہربانی کر کے اسکی اجازت عنایت فرمائیے۔“

(۱۲) لالہ سرپریم ایم۔ اے۔ مصنف خمنانہ جاوید

”اس مضمون پر یہ پہلی کتاب ہے۔ آپ ایسے قابل اور مشہور آدمی کے قلم سے اسکا لکھنا ہی اسکی عمدگی کی ثبوت دلیل ہے۔ میرے نزدیک اسکا طرز عبارت نہایت عمدہ ہے اور اسکے علاوہ اس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ آپ کی تنقیدیں بہت نمل و منصفانہ اور آپ کی رائے نہایت صائب ہوتی ہیں۔“

(۱۳) منشی پریم چند بی۔ اے۔ لکھنؤ

”ہٹری آف اردو لٹریچر مصنفہ مشررام بابو سکسینہ ام۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ایک ایسی کتاب ہے جسے حقدور غور و ناز کیا جائے گا ہے۔ اسکے مضامین کی ترتیب اسکی تنقیدین اس کی تحقیق و تلاش اور سب سے بڑھکر اسکی سلیس عبارت

نہایت عمدہ ہے۔ اس قسم کی بعض کتابیں اردو میں پہلے سے موجود ہیں مگر ان میں اکثر ایک دُرخانی ہیں۔ مصنفین اکثر تعریف و تحسین یا مذمت و عیب جوئی کے اتنا رنگا دیتے ہیں جن کی بالکل ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر سکینہ برخلاف اسکے کسی خاص اسکول کے مؤید اور کسی خاص شاعر کے طرفدار نہیں ان کی رائیں غیر جانب دارانہ عجیب ملی اور بے لاگ ہوتی ہیں۔ بلکہ اگر سچ پوچھئے تو یہی صاف گوئی اس کتاب کا بہت بڑا جوہر ہے مصنف نے اسکو انگریزی میں لکھ کر فی الحقیقت اردو پر بہت بڑا احسان کیا اسکا اردو ترجمہ بالفعل تیار ہو رہا ہے اور جب شائع ہوگا تو ادب اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگا۔

(۱۴) سید سجاد حیدر ربی۔ اے۔ رحیم الرحمن یونیورسٹی علیگڑھ

”مجھ کو حیرت ہے کہ آپ نے کتنی عظیم الشان محنت اسکی تیاری میں کی ہوگی یہ یقیناً اس مضمون پر بہترین کتاب ہے۔“

(۱۵) منشی ویانرا سن نکم۔ ایڈیٹر زمانہ ”کانپور“

”میں آپ کو اس تصنیف پر مبارکباد دیتا ہوں۔ یہ فی الحقیقت اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے اور آپ کا فخر و ناز اس پر بالکل بجا ہے جس طریقہ سے آپ نے اپنے اس منتخب کردہ کام کو انجام دیا میں اسکی دل سے قدر کرتا ہوں۔“

(۱۶) آنرےبل راجہ اووہ نراین بسریا۔ انگریز کٹیو کونسلر

ریاست بھوپال

”آپ کی اس مفرد تصنیف پر میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔“

(۱۷) مسٹر حامد افسر بی۔ اے۔ لکھنؤ

”نہایت پر مغز اور عالمانہ تصنیف ہے۔ مضمون کتاب مصنف کی وسیع نظری کا پتہ دیتا ہے امثال نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے۔“

(۱۸) مسٹر جمیل احمد قدوائی بی۔ اے۔ علیگڑھ

”برا آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ بڑی کامیابی سے آپ نے یہ کتاب تصنیف کی“

(۱۹) مرزا احسان احمد بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی۔ اعظم گڑھ

”کتاب نہایت عمدہ ہے۔ بلکہ اکثر اپنی نوع کی کتابوں سے بہتر ہے نہایت قابلِ قضا تصنیف اور ادبِ اردو کے لیے بہترین سرمایہ ہے۔“

(۲۰) مولوی عبدالحق بی۔ اے۔ ایڈیٹر اردو اور مالک بادوکن

”اس کتاب میں فاضل مصنف نے ادبِ اردو کے نشوونما کی تاریخ شروع سے لیکر زمانہ حال تک کی نہایت شرح و بسط سے لکھی ہے اور ادب کی کوئی شاخ باقی نہیں رکھی جس پر کافی بحث کر کے مکمل روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ مضمون پر بڑی قدرت معلوم ہوتی ہے۔ اور عبارت نہایت سلیس ہے بلکہ اکثر جگہ نہایت فصیح پُر جوش اور مؤثر ہو گئی ہے۔ مصنف صاحب کو ان تمام کتب اور رسائل پر جو اس مضمون پر نکل چکے ہیں کافی عبور معلوم ہوتا ہے جبکہ ادبِ اردو پر لکھا جا چکا ہے اس میں وہ سب کچھ موجود ہے۔ اور یہ تمام اصنافِ ادب پر حاوی ہے۔ لائقِ مصنف نے نہایت ناقدانہ اور عالمانہ طریق پر جس مصنف مترجم ناشر شاعر پر

بحث کی ہے اس کے تمام محاسن و معائب کو پوری طرح دکھایا ہے نہایت قابل تحسین طریقہ سے اس دور اور اس سوسائٹی کا بھی حال لکھا ہے کہ جس میں وہ شخص تھا اور نیز یہ کہ کن کن اثرات سے اس کی تصنیف متاثر ہوئی۔ انھیں وجوہ سے یہ کتاب نہایت مفید اور قابل قدر ہے۔ اس کی عبارت بھی نہایت سہستہ ہے اور فاضل مصنف نے نہایت عمدگی سے ثابت کر دیا کہ زبان اور ادب اردو ہندو مسلم اتحاد کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اس کے واقعات کا ایک خزانہ سمجھنا چاہیے کیونکہ کوئی شخص عام اس سے کہ وہ زمانہ گزشتہ کا ہو یا زمانہ حال کا اور نظم نثر یا ڈراما سے اس کا تعلق ہو اس کتاب میں اس کا ذکر فرگو گذاشت نہیں ہوا پس اس کی حقیقت تعریف و تحسین کہ اس کا ہے مذکورہ بالا رایوں کے علاوہ ذیل کے اخبارات و رسائل نے بھی نہایت عمدہ اور قیمتی رائیں اس کتاب کی نسبت ظاہر کی ہیں:

(۱) ادبی ضمیمہ ٹائمز لندن۔

(۲) مسلم ریویو کلکتہ۔

(۳) لیڈر آل آباد۔

(۴) اردو ادب نگار آباد دکن۔

(۵) زمانہ کانپور۔

(۶) شمع آگرہ۔

(۷) الناظر لکھنؤ۔

(۸) جام جمشید بمبئی وغیرہ۔

۳۷۵ ۱۹۱۵۴۳.۹
(۱۷۱۹۲) DUE DATE

From Father's Collection

۳۷۵ ۱۹۱۵۴۳.۹

